طلبہ ملک اور قوم کا بیش بہا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان سے سہارے ...) نئے انقلاب کے نقیب ہوں گے۔ ان ہی کے ہاتھوں میں کل ملک کی باگ ڈور ہوگی۔ ان ہی میں سے جہاں گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد جیسے مدبّر سیاستداں پیدا ہوں گے، وہاں ٹیگور، غالب پریم چند اور نیاز فتحپوری جیسے ادیب اور شاعر بھی بامِ عروج پہ پہنچیں گے۔ اگر آج ان کی صحیح رہنمائی کی گئی تو یقیناً کل یہ ان توقعات کو پورا کر سکیں گے جو ان سے وابستہ ہیں۔

چونکہ نئے لکھنے والوں (خصوصاً طلبہ) کی حوصلہ افزائی کے لئے ضروری ہے کہ ان کے مضامین شائع ہوں۔ اور آج کل کے اُردو پرچے نوازیدہ ادیب کے مضمون کو اپنے معیار سے گرا قرار دیکر رد کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح اُردو ادب کل کے ادیب سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا عرصے سے ایک ایسے پرچے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جسمیں انکے مضامین بھی شائع ہو سکیں۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ہم نے "شاہجہاں" کو علمی اور ادبی رنگ دیا ہے۔ اور ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس میں صرف طلبہ کے مضامین ہی ہوں بلکہ کتابت اور چھپائی بھی طلبہ ہی کے ذریعے کرائی جائے۔ اور ہم اس میں کامیاب رہے ہیں ——— اس سلسلے میں ہم آپکے قلمی تعاون اور مخلصانہ رائے کے منتظر ہیں۔

**اگر آپ ———**

**طالب علم ہیں** ——— تو کوئی مضمون (جو آپنے سیمنار کیلئے تیار کیا ہو) ترجمہ (عربی، فارسی یا انگریزی سے کیا ہو) یا افسانہ اپنے ٹیچر سے تصحیح کرا کے جلد بھیجدیں۔ اپنے نام کے آگے کلاس، کالج یا یونیورسٹی کا نام ضرور لکھئے۔

**لکچرار ہیں** ——— تو آپسے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اپنے طلبہ سے مضامین یا افسانے لکھوا کر برائے اشاعت روانہ کرائیں۔ اور اس سلسلے میں ہماری کوششوں پر اپنی رائے سے نوازیں۔ ہم ممنون ہوں گے۔

**اُردو سوسائٹی (بزم ادب) کے سکریٹری ہیں** ——— تو آپسے گزارش ہے کہ اپنی سوسائٹی کی ماہانہ رپورٹ (ادبی نششت یا مشاعرہ کا انعقاد تحریری یا تقریری مقابلہ کا نتیجہ وغیرہ) اپنے لکچرار سے تصدیق کرا کے اگلے ماہ کی پانچ تاریخ تک ہم کو بھیجدیں۔ ہم اسکو شائع کریں گے۔

**شاعرانہ ذوق کے حامل ہیں** ——— تو اپنی پسند کے اشعار اور منتخب غزلیں ارسال کریں۔ اس سے نہ صرف آپ کے ذوق کی تسکین ہوگی بلکہ دوسرے بھی روحانی غذا حاصل کر سکیں گے۔

——— ادارہ ———


جہاں

۲۵ پیسے۔ ۔۔۔ سالانہ۔ تین روپے

... ادارت

...یق صدیقی — طالب علم دلی یونیورسٹی
... الرحمٰن — " " دلی کالج
...وسف خاں — " دلی یونیورسٹی
...رف الحسن صدیقی — " "


...جہاں میں شامل تمام تر ...یں، نام، مقام، واقعات ...سی سے مطابقت محض ...اق ہے۔ جس کے لئے ناشر ...شر یا مصنف پر کوئی ذمہ ...ری عائد نہیں کی جا سکتی


ناشر — محمد عتیق صدیقی
... — اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی
...اشاعت — قاسم جان اسٹریٹ دہلی


...سم کی قانونی چارہ جوئی کے لئے ...ف دہلی کی عدالتوں سے رجوع ...ا ہو گا۔

# فتح پوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول دہلی تباہی کے راستے پر

اسکول کے امسال ہائر سکنڈری کے رزلٹ نے جو اس کی صاف شفاف پیشانی پر نہ مٹنے والا کلنک لگایا ہے، وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ سائنس کے طلبہ میں سے ایک بھی پاس نہ ہو سکا۔ اور آرٹس کے طلبہ نے بھی کوئی نمایاں طور پر کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس میں جہاں اساتذہ کی نااہلیت اور ان کی گروپ بندی کا دخل ہے، وہاں ان کی پڑھنے پڑھانے سے لاپرواہی بھی برابر کی شریک ہے۔

رزلٹ کے بعد پرنسپل صاحب کا جو عمل خون کے آنسو رُلانے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ فیل شدہ طلبہ کو دوبارہ داخلہ سے منع کر دیا۔ اور خصوصاً، سائنس گروپ کے طلبہ سے کہا کہ آپ کو صرف سائنس میں ہی داخلہ دیا جائے گا ——— کوئی ان سے پوچھے کہ جب آپ کے یہاں سائنس کی تعلیم کے لئے اسٹاف اور سامان کا مناسب انتظام نہیں ہے تو کیوں ملک کے ان نونہالوں کی زندگی تباہ کرنے پر مُصر ہیں؟ یا جب آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی بھی سائنس والے کو دوسرے مضمون میں داخلہ نہیں دیا جائے گا تو پھر لڑکوں کو کیوں دیا؟ اور باقی کو کیوں منع کر دیا؟

——— ہمارا پرنسپل صاحب اور اسکول کی گورننگ باڈی کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اسکول میں سے اس وقت تک سائنس کی تعلیم ختم کر دیں جب تک اس کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہو جاتا ——— کیونکہ اس طرح کم از کم اور طلبہ تو سائنس لے کر فیل ہونے سے بچ جائیں گے یا جن کو سائنس ہی لینی ہو گی تو وہ کسی دوسرے اسکول میں چلے جائیں گے

آخر میں ہم اسکول کے اساتذہ کرام سے مؤدبانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ آپس کے اختلافات کو ختم کر دیں۔ اور گروپ بندی اور پڑھانے میں لاپرواہی کی طرف سے اپنا رجحان ہٹا کر، صرف مستعدی سے پڑھانے کی طرف لگا دیں۔ کیوں کہ وہی ملک و قوم کی آئندہ نسل کے معمار ہیں اگر ان کی کوتاہی کے سبب نئی نسل بگڑ گئی تو قوم انھیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

# طلبہ کے لئے اخلاقی تعلیم کی ضرورت

ہندوستانی طلبہ میں بداخلاقی اور بے راہ روی کا رجحان دن بہ دن بڑھتا رہا ہے۔ ان کا اخلاق بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ ذرا سی ناگواری پر توڑ پھوڑ شروع کر دیتے ہیں ٹرینوں اور بسوں میں بے ٹکٹ سفر کرنا۔ اور اُن کی آمد و رفت میں خلل ڈالنا ان کا روزانہ کا مشغلہ بن گیا ہے طلبہ کی اس بداخلاقی اور گمراہی کو دیکھتے ہوئے ملک کے اعلیٰ طبقوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ جب تک اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم نہیں دی جائے گی، اس وقت تک طلبہ کی اصلاح ناممکن ہے چنانچہ دہلی میں اخلاقی تعلیم کی اسکیم کا افتتاح عمل میں آچکا ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ دوسری ریاستیں بھی اس کو اپنائیں گی۔

ہم اسکولوں اور کالجوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے تو زبردست حامی ہیں لیکن اس بات کے خلاف ہیں کہ جملہ مذاہب کے طلبہ کے لئے ایک ہی مذہبی کورس تیار کیا جائے بلکہ ہوتا یہ چاہئے کہ مختلف مذاہب کے طلبہ کے لئے انہی کے مذہب کی روشنی میں تیار کردہ اخلاقی کتب پڑھائی جائیں یعنی ہندو طلبہ کو ہندو دھرم، مسلم طلبہ کو اسلام اور عیسائی طلبہ کو عیسائی مذہب کی تعلیم دی جائے کیونکہ ہر مذہب کا پیرو جتنی جلدی اثر اپنے لے سکتا ہے، دوسرے مذہب سے وہ تاثر کبھی قبول نہیں کر سکتا

ہم امید کرتے ہیں کہ ماہرین تعلیم سوچ سمجھ کر ایسا نصاب مرتب کریں گے جو بغیر کسی اختلاف و الجھن کے سب کے لئے قابل قبول ہوگا ●●

پروفیسر ہمایوں کبیر

جن کی وفات عالم انسانیت کیلئے ایک عظیم سانحہ بن گئی

شیر دل خاتون ۔

وزیر اعظم اندرا گاندھی

ایس۔ کے۔ پاٹل

سرمایہ داروں کا عظیم مہرہ جو سیاست کی بساط پر پٹ گیا

شری کامراج

....... پیہم شکستوں کے بعد

# شاہ جہاں کی زندگی کا ایک دن

ہر سال دور و نزدیک سے ہزارہا سیاح دہلی وآگرہ، عہدِ مغلیہ کے محلات و عمارات دیکھنے آتے ہیں۔ ان کے حُسن و شان وشکوہ نے بے شمار قدردانوں اور فن کاروں کو متاثر کیا ہے۔ ان کی تصویریں اور میجک لالٹینوں سے دکھائی جانی والی فلمیں نہ صرف اپنے ملک کے باشندوں کے لئے، بلکہ ممالکِ غیر کے لوگوں کے لئے بالخصوص باعثِ تفریح ہیں۔

سوال یہ ہے کہ غیر ملکی سیاحوں کے لئے ان عمارتوں میں کیا جاذبیت ہے۔ وعمارات اور گنبدوں کی میناکاری اور ابھرے ہوئے نقش ونگار سے اپنے ذوق کو تسکین دیتے ہیں۔ لیکن ان کا تعلق تو فنِ تعمیرات اور سنگ تراشی کے کمالات تک محدود ہے۔ کیا انھوں نے کبھی بھی غور کیا ہے کہ یہ وسیع کمرے، کبھی ایسی ذی حیات ہستیوں کے مسکن تھے جنھوں نے مستقبل کے لئے تاریخ میں اپنا بلند مقام چھوڑا ہے۔ یہ ہال اور غلام گردشیں، زرق برق شاندار درباریوں کے وجود سے جنت نگاہ بنے رہتے تھے۔ کیا وہ اسی "ماضی" کا تصور کر سکتے ہیں جو "حال" سے بالکل مختلف تھا؟ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں ان کا تصور، ان سحر نگار ناول نویسوں کا مرہون منت ہے، جن کا خیال ہے کہ مشرقی بادشاہ ظالم، بے عقل اور مطلق العنان ہوتے تھے۔ ان میں جہل، رعونت اور فرعونیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ وہ خوشامدی قرم ساقوں کے ہجوم میں ہمہ وقت گھرے رہتے تھے، جو مفلس اور فلاکت زدہ کاشت کاروں کی جیب کا آخری پیسہ تک وصول کر لینے کے لئے تجاویز سوچتے رہتے تھے، تاکہ اپنے اور اپنے متعلقین کے عیش وعشرت اور شان وشوکت پر صرف کر سکیں۔ وہ اپنی پوری زندگی حرم میں عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں صرف کرتے تھے۔ وہ شراب میں دھت، چاپلوس درباریوں کی جھوٹی تعریفیں سنتے رہتے تھے۔ ان کو ملکی نظم ونسق کا ذرا بھی شعور نہ تھا۔ وہ روحانی قدروں سے بالکل نابلد تھے۔

عام طور پر انگریزی ناولوں میں ہندوستان کے سلاطین اور راجگان کی جو تصویریں نظر آتی ہیں، وہ یہ ہیں کہ ان کے دستار قیمتی جواہرات سے مزین ہیں۔ شان و شکوہ کے اظہار کے لئے بڑی بڑی مونچھیں اوپر کی طرف چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی آنکھوں سے خون برستا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی پیشانیاں جلال وغضبناکی کی مظہر ہیں۔ ان کی کمر میں ایک چھوٹا سا اسلحہ خانہ ہے۔ گویا وہ، "لب فرو بستہ، ابرو کشیدہ وتند و ترش نشستہ" کے مصداق ہیں۔

ہر دل عزیز سحر طراز مصنفین نے حقیقت کا خون کرکے اپنے قلم سے عام یورپین اقوام پر یہی نقش بٹھا رکھا ہے کہ عوام تاریخ سے نابلد ہوتے ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھ کر یہ ذہن نشین کر لیتے ہیں کہ مغرب کو مشرق پر ہر جہت سے فوقیت حاصل ہے۔

تاریخ کا اگر ذرا بھی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب سر تا پا غلط ہے۔ اکبرِ اعظم سے لے کر اورنگ زیب تک چار جلیل القدر بادشاہوں نے ڈیڑھ سو سال ۱۵۵۶ء سے ۱۷۰۷ء تک حکومت کی۔ اس دوران میں انھوں نے اپنے ملک کو وسعت دی، اور علوم وفنون کو حدِ کمال تک پہنچایا۔ کیا یہ سب ترقیاں عیاش وکاہل حکمرانوں کے ہاتھوں ممکن ہیں؟ کسی وسیع ملک پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ عہدِ مغلیہ میں ہر شعبۂ زندگی میں جو جو ترقیاں ہوئیں، وہ عیش پرستی و تن آسانی سے کسی طرح ممکن نہیں۔

خوش قسمتی سے معاصر مؤرخوں نے ان شہنشاہوں کے روزمرہ کے معمولات کو اپنی تاریخوں میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ آیئے ان تاریخوں کی روشنی میں ہم شاہ جہاں کے معمولات کا جائزہ لیں۔

---

# شاہ جہاں کے معمولات

صبح ۴ بجے: بیداری، عبادات اور تلاوتِ قرآن شریف۔

۶ بج کر ۴۰ منٹ: درشن دینے کے لئے نمودار ہونا۔ ہاتھیوں کی جنگ، رسالوں کا معائنہ۔

۷ بج کر ۴۰ منٹ: دیوانِ عام۔

۹ بج کر ۴۰ منٹ: دربارِ خاص۔

۱۱ بج کر ۴۰ منٹ: شاہ برج میں ملک کے اہم مسائل پر مشاورت۔

۱۲ بجے: حرم میں داخلہ، قیلولہ، نادار و حاجت مند عورتوں کو خیرات تقسیم کرنا۔

۴ بجے سہ پہر۔ عوام سے ملاقات اور نماز۔

۶ بج کر ۴۰ منٹ: دیوانِ خاص میں شام کا دربار۔

۸ بجے شب: شاہ برج میں راز داری کے اہم معاملات پر مشاورت۔

۸ بج کر ۴۰ منٹ: حرم میں داخلہ، فنِ موسیقی سے لطف اندوز ہونا۔

۱۰ بجے کتب خوانی کی سماعت۔

۱۰ بج کر ۳۰ منٹ سے ۴ بجے صبح تک آرام و استراحت۔

بادشاہ صبح ہونے سے ۳ گھنٹے قبل بیدار ہوتا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو جاتا۔ حدیث شریعت کے بموجب تہجد کی نماز ادا کرتا۔ گو یہ نماز فرائض میں سے نہیں ہے۔ بعد ازاں قبلہ رو ہو کر تلاوت کرتا۔ طلوعِ آفتاب سے قبل محل کی مسجد میں نمازِ فجر پڑھتا۔ اس کے بعد امورِ مملکت میں مصروف ہو جاتا۔

## درشن

بادشاہ قلعۂ آگرہ کے مشرقی دریچہ میں نمودار ہوتا۔ جس کا رُخ دریائے جمنا کی جانب تھا۔ یہ دریچہ جھروکۂ درشن کے نام سے موسوم تھا۔ سنسکرت میں درشن کے معنی ہیں کسی اعلیٰ مرتبت کی زیارت۔ ہر صبح زائرین دریائے جمنا کے کنارے مجتمع ہو جاتے۔ بادشاہ طلوعِ آفتاب سے ۴۸ منٹ بعد جلوہ گر ہو کر اپنی رعایا کو درشن دیتا۔ زائرین آداب بجا لاتے۔ بادشاہ ان کے سلام کا جواب دیتا۔ یہاں وہ آدھ گھنٹہ سے پون گھنٹہ تک قیام کرتا۔ یہاں بادشاہ صرف اپنا جلوہ ہی نہ دکھاتا۔ بلکہ تفریحات اور امورِ عام پر بھی غور و فکر کرتا۔ چوں کہ میدان قلعہ کی دیوار سے باہر تھا۔ اس لئے رعایا کی اس تک فریاد کی رسائی بھی ممکن تھی۔ فریادی اور دادخواہ اپنی درخواستیں بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے۔ یہ ایک ایسا طریقہ تھا کہ دادخواہوں کو نہ درباریوں کی مٹھی گرم کرنا پڑتی۔ نہ درباریوں کی سفارش کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ درخواست کے پہنچنے میں غیر معمولی تاخیر ہوتی۔ اس طرح بادشاہ اپنی رعایا سے رابطہ قائم رکھتا۔ اور ان کے دکھ درد اور جذبات سے باخبر رہتا۔ اکثر دریچہ سے ایک ڈوری لٹکا دی جاتی اور درخواستیں اس میں باندھ دی جاتیں تاکہ بادشاہ کے حضور میں فوراً پیش کی جا سکیں۔ اس طریقے کو اکبرِ اعظم نے رائج کیا تھا۔

برہمنوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو "درشنی" کہلاتا تھا۔ اس طبقے کے افراد جب تک بادشاہ کے نیک فال چہرہ کی زیارت سے سعادت اندوز نہ ہو لیتے، کسی دنیوی کام کی ابتدا نہ کرتے۔ اور نہ کچھ کھاتے پیتے۔

درشن اور درخواستوں کی قبولیت کے بعد قلعہ اور دریائے جمنا کا درمیانی میدان صاف ہو جاتا اور ہاتھیوں کی جنگ شروع ہو جاتی۔ یہ صرف شہنشاہ کا امتیازی اور خصوصی حق تھا۔ شاہزادگانِ والا تبار اور افرادِ خاندان کو بھی یہ حق نہ تھا۔ کہ وہ ہاتھیوں کی جنگ کرا سکتے۔ شاہ جہاں اس مشغلے کا بے حد شائق تھا۔ کبھی کبھی ہاتھیوں کے دو، دو جوڑ بیک وقت لڑائے جاتے۔ یہ وسیع میدان اس جنگ کے موزوں ترین اور محفوظ ترین مقام تھا۔

خوف ناک جنگی ہاتھی اور حال ہی کے گرفتار شدہ جو ابھی مانوس نہیں ہوئے تھے، بادشاہ کے حضور میں معائنہ کے لئے پیش کئے جاتے۔ پالتو ہاتھیوں کی طرح قلعے کے احاطہ میں انھیں لے جانا مناسب نہ تھا۔ اسی میدان میں ہاتھیوں کو سوار فوج پر حملہ کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ تاکہ گھوڑوں کو دیکھ کر بدکنا ختم ہو جائے۔ اسی مقام پر شاہی گھوڑوں اور امرار کے گھوڑوں کا معائنہ بھی ہوتا تھا۔

## دیوانِ عام

ان مشاغل کے بعد بادشاہ دیوانِ عام میں دربار کرتا۔ بادشاہ شہ نشین میں جلوہ فرما ہوتا۔ دائیں بائیں شاہزادے ہوتے۔ وہ اسی وقت بیٹھتے، جب انھیں بیٹھنے کا حکم دیا جاتا۔ ہال میں دیواروں کی طرف پشت کئے ہوئے امرار اور عمال حکومت اپنے اپنے منصب کے مطابق کھڑے رہتے۔ غلام شہ نشین کے قریبی ستونوں سے لگے ہوئے دائیں بائیں اپنے اپنے مقررہ مقامات پر ایستادہ رہتے۔ ان کی پشت دیوار کی طرف ہوتی۔ عمال بالا بادشاہ کی جانب رُخ کئے ہوئے اپنے منصب و مرتبہ کے بموجب صف بستہ رہتے۔ شاہی علم بردار سنہرے جھنڈے، تو غ، درفش لئے ہوئے بادشاہ کی بائیں جانب ہوتے۔

بادشاہ عقبی دروازے سے شہ نشین میں داخل ہوتا۔ درباری پہلے ہی سے دربار میں موجود ہوتے۔ اب دربار کی کارروائی شروع ہوتی۔

بخشی اور مہتمم خزانہ بادشاہ کے حضور میں، افسرانِ فوج اور منصب داروں کی درخواستیں اور رپورٹیں، پیش کرتے۔ بادشاہ، تقرری، ترقی اور تبادلوں کے احکامات نافذ کرتا۔ جن عہدہ داروں کا کسی صوبہ میں نیا تقرر عمل میں آتا، انھیں محکمہ متعلقہ کے افسرانِ اعلیٰ کے توسط سے حضوری میں پیش کیا جاتا۔ میر آتش سوار، پیادہ فوجیوں، راہداروں کے افسران خزانے وغیرہ ہم ترقی کے مستحقین کے بارے میں اپنی اپنی رائے پیش کرتے اور سفارش کرتے ترقی پانے والے عہدہ دار دربار میں موجود ہوتے۔ رخصت کئے جانے سے قبل انھیں خلعت، گھوڑوں، اسلحہ جات، اور انعام و اکرام سے نوازا جاتا۔

اس کے بعد محکمۂ صرفِ خاص کے محرر اپنے افسرِ اعلیٰ، میرِ سامان اور دیوانِ بیوتات کی معرفت اپنی تجاویز اور انتظامات پیش کرتا۔

اب بادشاہ کے مقربانِ خاص، شہزادوں، صوبہ داروں (گورنروں) فوج داروں، دیوانوں، بخشیوں، اور صوبے جات کے دیگر حکامانِ بالا کے خطوط، بادشاہ خود سنتا۔ بقیہ لوگوں کے خطوط کے خلاصے پیش ہوتے۔ جب یہ کارروائی ختم ہو جاتی تو صدرِ اعلیٰ صوبوں سے آئے ہوئے صدروں کی کارگزاریاں پیش کرتا۔ نیز بادشاہ کے حضور میں مستحق علمار، سادات، مشائخ اور صوفیار کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتا۔ بادشاہ ان کی ضروریات کے مطابق مناسب امداد یا وظائف کے احکامات نافذ فرماتا۔ امورِ خیر کے محکمہ کے بعد مناسب جاگیرات، معافی جات اور دیگر مالی معاملات کے مسائل بادشاہ کی آخری منظوری کے لئے پیش کئے جاتے۔ بادشاہ کی توجہ منعطف کرانے کے لئے بھی ایک افسر تھا، جو داروغۂ عرضِ مکرر کہلاتا تھا۔ اب شاہی اصطبل کے مہتمم بادشاہ کے حضور میں گھوڑوں اور ہاتھیوں کو معائنہ کے مقررہ ماتحت کے پیش کرتا۔ یہ دستور اکبر نے جاری کیا تھا۔ تاکہ ان ملازمین کو سزا دی جا سکے جو راتب میں کمی کر کے جانوروں کا پیٹ کاٹتے ہیں۔ اگر کوئی گھوڑا یا ہاتھی کمزور اور دُبلا نظر آتا تو ان کی دیکھ بھال کرنے والوں کی سرزنش کی جاتی۔ اسی طرح امرار کے وہ گھوڑے جو حال ہی میں شامل کر کے داغے گئے تھے۔ اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ پیش کئے جاتے۔ جانوروں کے معائنہ کی کارروائی دیوانِ عام کے احاطہ میں عمل میں آتی تھی۔ دربار دو گھنٹے طلب رہتا

(باقی آئندہ)

## ...ض احمد فیض

# غزل

فیض احمد فیض، ہند و پاک کے مشہور شاعر ہیں۔ آپ کے کلام میں رنگینی، اور خیالات کی آفرینی ہے۔ بندشیں چست ہیں، قدیم اور جدید روایات کا سنگم آپ ہی کی ذات پر ہوتا ہے۔ ذیل میں آپ کی ایک مشہور غزل دی جاتی ہے۔

ادارہ ——

---

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یاروصبا سے کچھ تو کہو!
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی صبح تیرے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گذری سو گذری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

مرسلہ —— ایچ خاتون آگرہ یونیورسٹی آگرہ

# دودھ کا دودھ

انجاس۔ بی۔ اے۔

یہ دلی کالج (ایوننگ) کے ایک طالب علم کی سرگزشت ہے۔ واضح رہے کہ ایوننگ شفٹ میں مخلوط تعلیم نہیں ہے۔

"ممّی!" ایک نسوانی آواز نے ہماری سماعت کو جھنجوڑا۔ اور ہم نے اس غیر متوقع آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھا۔ صرف یہ جاننے کے لئے کہ چھ ہی بجے ہیں نا ۔۔۔ کہیں ہم آج کالج سویرے تو نہیں آگئے۔ کیوں کہ مارننگ کلاسز چار بجے ختم ہو جاتی ہیں۔ اور مارننگ کے طلباء اور طالبات پانچ، ساڑھے پانچ تک ۔۔۔ اپنے اپنے گھروں یا اُن جگہوں کو رحلت کر جاتے ہیں، جہاں انھیں کوئی پیمانِ وفا باندھنا ہوتا ہے۔ یا ایفائے عہد کرنا ہوتا اور پھر کالج میں وطلباء وطالبات ..... جی نہیں صرف ۔۔۔ طلباء داخل ہوتے ہیں جو طالب علم کم اور استاذ زیادہ لگتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کے فرزندِ اکبر کی عمر بھی وہی ہو، جو ان کے کچھ زکی ہے۔ ان کی شخصیت کے پیش نظر یہاں یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کو پڑھانے والا کوئی اور نہیں۔ خود ان کے ہی ہونہار اور قابل برخوردار ہوں۔ اور شاید گھر کے لئے بھی واپسی دونوں کی ایک ساتھ ہی ہوتی ہو۔

گھر پہنچ کر بیٹا باپ سے سوال کرتا ہو ۔۔۔

"ڈیڈی! آج جو میں نے کلاس میں پڑھایا۔ ذرا بتایئے کہ آپ کیا سمجھے؟"

اس پر "ممّی"، کے ڈیڈی بجائے ناراض یا غصہ ہونے کے اپنے "بیٹے" کی منّت وسماجت کرتے ہوئے نہایت لجاجت سے کہتے ہوں۔

"بیٹا! خاموش رہو، دیکھو میری عزت کا سوال ہے۔ تمہاری ممّی سن لیں گی۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے، ڈیڈی! اب آپ کی عمر وہ نہیں کہ مار پیٹ کر پڑھایا جائے۔ آپ تو خوب جانتے ہیں کہ آپ کی وجہ سے مجھ کو کلاس میں اور اپنے ہم جولیوں کے سامنے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ آپ کو تو خود خیال ہو ..........." اور اس سے پہلے کہ بیٹا اپنی بات پوری کرے، تو باپ کی بیوی اور "بیٹے" کی ممّی آدھمکتی ہوں۔

"کیا ہوا بیٹا! کیا آج پھر انھوں نے کوئی غلطی کی ہے؟ معلوم نہیں یہ کیا کر کے رہیں گے!" اور اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لیکن شوہر کی جانب لہرا کر۔

"اپنا نہیں تو کم از کم بیٹے کا ہی خیال کر لیا کرو۔ آخر یہ تمہارا استاد ہے۔ تم اب کوئی آٹھ دس سال کے ناسمجھ بچے نہیں ہو۔ ماشاء اللہ چالیس پینتالیس سال کی عمر ہے۔ اپنا اچھا برا خود سمجھ سکتے ہو۔"

اس پر ممّی کے ڈیڈی اپنا سر پیٹتے ہوں، کہ وہ ایسے قابل لڑکے کے باپ ہی کیوں بنے، یا انھوں نے اپنے منے کو اتنا قابل ہی کیوں بنایا، جس کی وجہ سے موصوف کو اب شرمندگی اور ندامت سے گہری دوستی کرنی پڑی۔ کچھ باپ ایسے بھی ہوں گے، جو اپنے بیٹے سے پڑھنے کی بجائے بیٹے کے ہمراہ زیر تعلیم ہوں گے۔ یعنی وہ اپنے بیٹے کے کلاس فیلو ہوں گے۔ اس صورت میں تو والدِ محترم ہمیشہ ہی احساسِ کمتری کے شکار رہتے ہوں گے۔ اور جب کبھی وہ اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے اپنے کسی ساتھی سے یا کسی کو کہتے ہوں اور خود شیلا پرانگریزی کی فار ایڈلٹس (For Adults) فلم دیکھنے جاتے ہوں ایک روپیہ پچیس پیسے یا دو روپے کا ٹکٹ خرید کر جب وہ اندر ہال میں پہنچتے ہوں تو پچھلی قطار میں اپنے فرزندِ ارجمند کو

# مجرم

خلیل جبران

مترجم معراج الدین صدیقی۔

بی۔اے، فرسٹ ایر جامعہ کالج نئی دہلی

ایک نوجوان جس کا مضبوط جسم بھوک کے سبب نڈھال تھا، سڑک پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا ۔۔۔۔
وہ گذرتے لوگوں سے غمزدہ گا نا گا گا کر مدد کی درخواست کر رہا تھا۔ جب کہ بھوک اور احساسِ ذلت سے اُس کا بُرا حال تھا ۔۔۔۔ جب رات آئی تو اُس کے ہونٹ اور زبان تھک چکی تھی۔ مگر اُس کا پھیلا ہوا ہاتھ اس کے خالی پیٹ کی مانند اب بھی خالی تھا۔

۔۔۔۔ وہ اُٹھا اور شہر کی فصیل کے باہر آیا۔ یہاں وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف اپنی گردن کی اور کہنے لگا،
۔" اے پروردگار ۔۔۔! میں ایک امیر آدمی کے پاس نوکری کی درخواست کی مگر اُس نے میرے پھٹے پُرانے کپڑوں کی وجہ سے انکار کر دیا ۔۔۔۔ میں نے اسکول کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مگر داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ کیونکہ خالی ہاتھ تھا ۔۔۔۔ میں نے ہر وہ کام جو مجھے روٹی دے کرنا چاہا مگر سب بے فائدہ ۔۔۔۔ نا امید ہو کر میں نے بھیک کے لئے ہاتھ پھیلایا تو تیری عبادت کرنے والوں نے مجھے دیکھا اور کہا" اچھے خاصے مسٹنڈے ہو۔ خود محنت کر کے کھاؤ بھیک کیوں مانگتے ہو" ۔۔۔۔" اے رضا اور مرضی ہی کے سبب میری ماں نے مجھ کو جنم دیا۔ اور اب یہ دنیا مجھ کو میرے اختتام سے قبل ہی تیری طرف لوٹا دینا چاہتی ہے ۔۔۔۔"

پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدلے اور وہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کھڑا ہوا ۔۔۔۔ پھر اس نے درخت سے ایک موٹی اور مضبوط شاخ کو توڑا۔ اور اُسے شہر کی جانب کرتے ہوئے کہا، "میں نے اپنی زبان کی تمام قوت کے ساتھ روٹی کے لئے سوال کیا ۔۔۔ لیکن منع کر دیا گیا ۔۔۔۔ اب میں اس کو اپنے بازو کی قوت سے حاصل کروں گا ۔۔۔۔ میں نے رحم اور محبت کے نام پر روٹی طلب کی، لیکن انسانیت نے کوئی خیال نہیں کیا ۔۔۔۔ اب میں اس کو بُرائی کے نام پر حاصل کروں گا۔"

●●

اپنی تخلیقات اِس پتہ پر ارسال فرمائیں:

ماہانہ شاہجہاں گلی قاسم جان بلیماران دہلی ۶

# گلستانِ شاہجہاں کے سدا بہار پھول

**ادھ کھلے پھول** ــــــــــ جنھیں آبیاری کی ضرورت ہے ــــــــــ

اس عنوان کے تحت آپ ہر ماہ نئے اور ابھرتے ہوئے قلم کاروں کے بارے میں روشناس ہوسکیں گے۔ زیرِ نظر شمارہ میں آپ انیس الرحمٰن کے خدوخال ملاحظہ فرمائیں گے۔

**خیالات کے جھروکے سے** ــــــــــ

اس عنوان کے تحت ہم اپنے قارئین کی رائے بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے شائع کریں گے۔ ہم آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

**دل کی بات** ــــــــــ

یہ کالم آپ کی دلچسپی کے لئے شروع کیا جا رہا ہے۔ آپ کے سوالات اور اُن کے جواب اس عنوان کے تحت شائع کئے جائیں گے۔ سوالات علمی، ادبی یا مزاحیہ ہونے چاہئیں

**اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ** ــــــــــ

اس باب میں ہم پُرانے شاعروں اور ادیبوں کے حالاتِ زندگی بیان کریں گے۔ کلام اور تحریر پر بے لاگ تبصرہ بھی جو اندھی تقلید سے مُبَرّا ہوگا۔ اس وقت ہم ڈاکٹر اقبال کے چند واقعاتِ زندگی زیبِ کتابت کر رہے ہیں۔

ــــــــــ یہ عنوانات ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کے لئے جاری کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے ساتھ آپ کا تعاون اُردو ادب اور اُردو زبان پر ایک عظیم احسان کے مترادف ہوگا۔

ــــــــــ ہم آپ کے حوصلہ افزا تعاون کے متمنّی ہیں۔

**ادارہ**
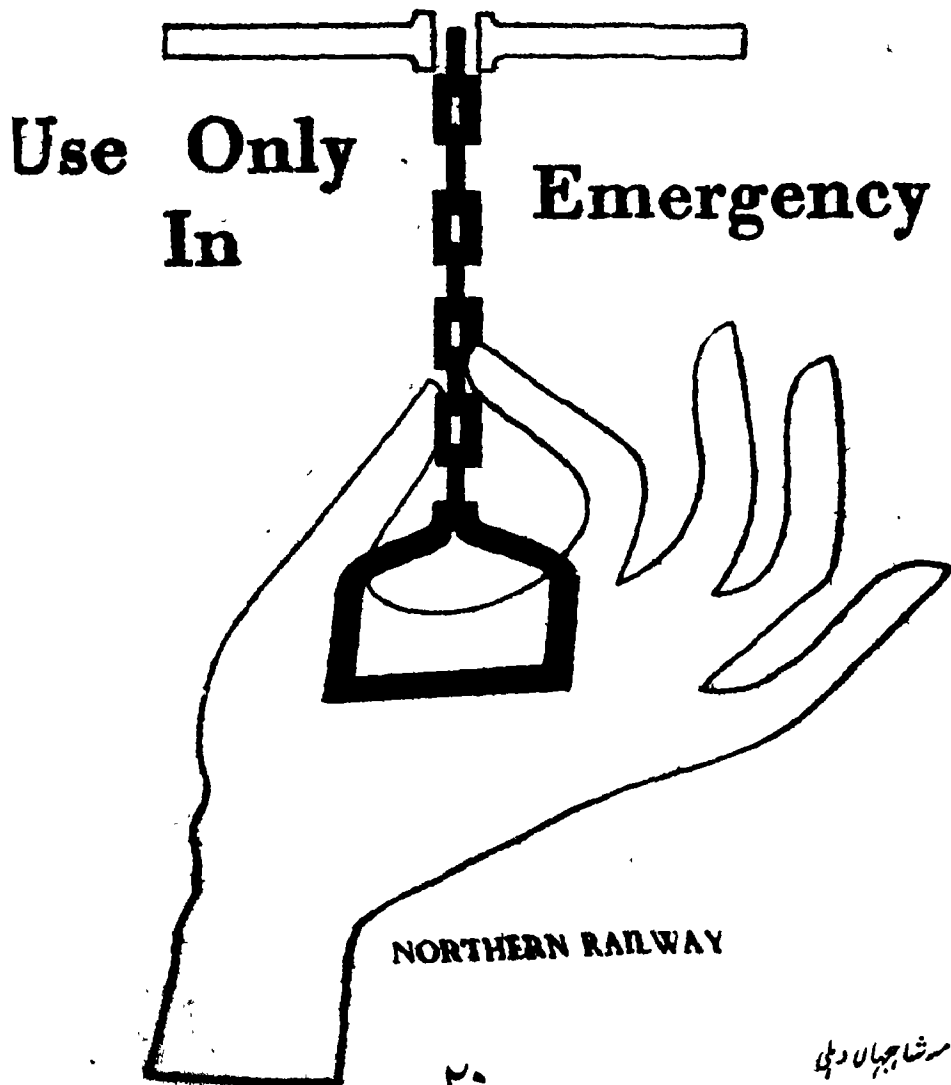
# ادھ کھلے پھول ـــــــــ جنہیں آبیاری کی ضرورت ہے

سرگرداں، دہلوی

انسانیت کا سب سے بڑا پیغام محبت ہے۔ اور اسی کو
مکمل انسان کہا جاتا ہے، جس میں محبت بدرجہ اتم موجود ہو۔
اس کا پیار سب کے لئے بلا امتیاز ملک و ملت، مذہب،
رنگ و نسل ہو۔ اور بلا تفریق ہر چھوٹے بڑے، کالے پیلے،
غریب و امیر سب کو پیار کا جام دیتا ہو۔
اس مکمل انسانیت کے حلیہ پر تو غور کیجئے۔
قد پانچ فٹ سات انچ، سینہ ۴۳ انچ، سر ویسے
[ت]و نہیں لیکن پھر بھی بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس سر کے اندر ر
[ی]درست، ذہین، ہاکارہ، اور صلاحیتوں سے بھرپور مغز ہے
[بہ]ت ہی گھنے بال ہیں، بڑے بڑے، کالے کالے، مگر ان
[کا]لے بالوں میں سو پچاس سفید بھی ہیں۔ گھر سے نکلتے ہیں
[تو] بے شک بالوں کو ترتیب دیتے ہیں، لیکن تھوڑی دیر بعد
[د]یکھئے تو پھر الجھے اور بکھرے ہوئے زلف پریشاں کی شکل
[ا]ختیار کر جائیں گے۔ تھوڑی چوڑی پیشانی جس پر
[ک]اتب تقدیر نے د جانے کیا، پھر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔
اس پیشانی میں خمار آلود چشم آہوا در ان آنکھوں میں لال
سرخ ڈورے، ناک پھیلی ہوئی، جس نے رخساروں کے
فاصلہ کو زمین و آسمان کے برابر کر دیا ہے۔ متناسب اعضاء
چھریرا بدن، دیسی گندم گوں رنگ، مونچھیں ہیں، ڈاڑھی ہے
نہیں، یعنی ابھی اگی نہیں ـــ اور عمر ـــ؟ بس بیس برس
کے لگ بھگ سمجھ لیجئے ـــــ
[پ]ر وقار بن کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن بری طرح ناکام
[ہو]تے ہیں۔ طلاقت اور بذلہ سنجی تو کا سنگم آپ ہی پر
...

[س]ب سے بڑی صفت یہ ہے کہ جس سے ملتے ہیں،
خلوص سے ملتے ہیں۔ گویا ملنے سے پہلے ہی اپنا دل نکال کر
اس کی جیب میں ڈال دیتے ہیں۔
جس طرح آزاد پیدا ہوئے تھے، اسی طرح آزاد ہیں۔
آپ کی سب سے بڑی کمزوری سگریٹ ہے۔ جب کہ
عام لوگوں کی کمزوری عورت ہوتی ہے۔ ذرا سگریٹ دکھا دیجئے
اور پھر وہ خود آپ کے پیچھے پیچھے آلیں گے۔
ہر غم کو مذاق سمجھتے ہیں۔ اسی لئے آپ ایسا قہقہہ لگاتے
ہیں گویا ساری دنیائے غم کا مذاق اڑا رہے ہوں۔
اکثر کہتے سنے گئے ہیں کہ۔ (باقی صفحہ ۲۹ پر)

# غزل کا دوسرا رخ

از ـــــ انیس الرحمٰن، بی۔ اے (آنرز، فرسٹ ایئر) دلی کالج دہلی

اصناف سخن میں ایک صنف کا نام غزل ہے۔ جس کے
معنی "عورتوں کی باتیں کرنے کے ہیں،، اگر اردو غزل کو دیکھا
جائے تو سب سے پہلے وہ اپنے معنوی اعتبار سے غلط ہے۔
کیوں کہ غزل میں اکثر محبوب کو مذکر بنایا جاتا ہے۔ غزل، جس
کا فارسی ماخذ "حکایت بہ زبان کردن" اس بات کی اجازت
نہیں دیتا کہ محبوب کو کہیں بھی مذکر مانا جائے۔ لیکن اس کے
برعکس آپ غزل میں ایسے اشعار کی بہتات پائیں گے۔ جس
میں محبوب کو مذکر ظاہر کیا گیا یا ایسا لفاظی لبادہ پہنا دیا گیا کہ
اس کی جنس کے بارے میں تعین کرنا مشکل ہو جائے۔ اور یہ
اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے" اور "غزل کے ذریعہ
کائنات کی ہم آہنگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مستقبل کا شاعر
غزل کی آواز پر آواز دیگا"

یہ ہندوستان کے دو بڑے ادیب و شاعر کی رائیں ہیں۔
رشید احمد صدیقی اور فراق گورکھپوری کے یہ اقوال سراسر غلط
فہمی پر مبنی ہیں۔

انھوں نے غزل کو بنا سوچے سمجھے اتنا بڑا درجہ دے دیا
ہے۔ حالاں کہ غزل میں صرف ذکر محبوب، وصل و فراق، ہجر
کی راتیں، عارض ولب، چشم و ابرو، جام و مینا، مے و میخانہ و
خمار و میکدہ، ساقی و رند، شیخ و برہمن، دست و بازو، قفس
و آشیانہ، چمن اور بلبل، اس کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟
محبوب نے ذرا ترچھی نظر سے دیکھا اور میر نے "دلِ
ستم زدہ کو تھام تھام لیا" سودا کو کعبہ کا ڈھانا گوارا ہے

لیکن ان کا فیصلہ ہے کہ "کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا"
درد کا یہ شعر کن جذبات کی عکاسی کرتا ہے، اس کا فیصلہ
آپ کے ہاتھ ہے۔

درد کے ملنے سے اے یار برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

ناسخ کا محبوب اپنی تابناکی میں خورشید کا ہم پلہ ہے۔
اور جس کے آگے شرمندہ ہو کر "ماہ تاباں ابر سے کہتا ہے، جلدی
آڑ کر،، آتش کی وصل کی آرزو آرزو ہی رہی۔ اور مرتے دم
تک وہ وصلِ یار کے متمنی رہے۔ اسی وجہ سے وہ غزل سرا
ہیں کہ "ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں،، ویسے بھی
آتش سب کے سامنے بے ہوش حواس اس بات کے معترف
ہیں کہ،، زبان کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے،، اور یہ
لکھ دیا ہے تاکہ سند رہے، اور بوقتِ ضرورت کام آئے ـــ
اب ذرا آگے چلیے تو غالب غم جاناں اور غم دوراں کی شدت
برداشت نہ کرتے ہوئے سب کو کوسنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ
،، دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں،، اور مومن کو اتنی
بھی فرصت نہیں کہ وہ اپنے محبوب کو دل کا حال لکھ کر بھیج دیں
بلکہ ان کی تو یہ حالت ہے کہ " ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا"
شاد کو اس کا احساس تو ہے کہ دلِ مضطر کے راز کو دکھولا
جائے۔ لیکن "کسی کا نام لینے سے ذرا تسکین ہوتی ہے" یعنی
وہ نام لے کر بھی راز افشا کرنے کے مرتکب نہ ہوئے، فانی،
منزلِ عشق پر تنہا ہی پہنچے۔ کیوں کہ "تھک تھک کر اس راہ
میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا،، ثاقب محبوب کے اشارہ

پرجان جیسی عزیز چیز کو قربان کر سکتے ہیں ۔لیکن ان کا محبوب انھیں لفٹ ہی نہیں دیتا ۔جبکہ وہ کہتے ہیں کہ "آپ کہتے تو کیا میں باہر تھا!" حسرت کو کسی کروٹ نہ چین ہے نہ قرار ہے۔ نہ جانے "اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا" آرزو اس راہ میں دل شکستہ ہوگئے ۔اُن سے بے درد صنم کے ناز نہیں اٹھائے گئے اور وہ چیخ اٹھے کہ "دکھ پر ہوئے دکھ، غم پر ہوئے غم ، جی پست ہوا دل ٹوٹ گیا" اصغر گونڈوی پر جو محبوب کی نظر پڑی تو ان کے ہوش و حواس ہی ان کا راستہ چھوڑ گئے اور وہ "اور بھی دور ہوگئے آ کے ترے حضور میں" کے مصداق بن گئے ۔ صفی پر دیوانگی طاری ہے ۔اور نہ جانے کس دھن میں ہیں کہ "کہیں رکھتا ہے ، پڑتا ہے قدم لیکن کہیں جاکر" ، اپنی حالت کی تشریح ان الفاظ میں کردی۔ اور جگر نے تو سب ہی کو پیچھے چھوڑ دیا ۔انھوں نے پائے یار پر جان دے دی ۔اور اسی کے ساتھ "عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا" ان کے ساتھ ساتھ غزل گو شعرا کا دور ختم ہوگیا۔

تو دیکھا آپ نے میر سے لیکر جگر تک سب ایک ہی مرض کے مریض معلوم ہوتے ہیں ۔ اس پورے انتخاب میں آپ حسن و عشق کے علاوہ اور کچھ نہیں پائیں گے ۔گویا وہ راگ جو میر نے گانا شروع کیا تھا، جگر تک سب اسی رنگ میں بدمست نظر آتے ہیں ۔

میر کے دور سے غزل چلی (حالاں کہ ولی پہلے شاعر ہیں، لیکن میر نے اس صنف کو آگے بڑھانے کی کوشش کی) اور جگر تک الفاظ اور بندشوں کی تبدیلی کے علاوہ اس میں کوئی ردو بدل نہیں ہوئی ۔یعنی اُن کے خیالات آج بھی میر کے خیالات کی ترجمانی یا تائید کرتے نظر آتے ہیں ۔جب کہ میر اور جگر کے درمیان دو صدی سے زیادہ فاصلہ ہے ۔ لیکن آج بھی شاعر وہی کہتا نظر آئے گا جو دو صدی پہلے میر فرما چکے ہیں۔

اس میں آپ کو انسانی زندگی سے متعلق کوئی کارگر نسخہ نہیں ملے گا ۔اور نہ مستقبل کی تعمیر میں کوئی حصہ نظر آئے گا۔

اور نہ ہی کسی شاندار و تابناک مستقبل کی طرف نشان دہی کرنے کی صلاحیت ہے ۔ سوائے عریانیت اور جذبات کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے اس صنف میں دھرا ہی کیا ہے ؟

یہ صنف ہمارے جذبات کے ساتھ بھرپور کھیلنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے ۔ لیکن ہمیں راہِ زندگی متعین کرنے میں کسی قسم کی اعانت نہیں کرتی ——— تو پھر کیا فائدہ ایسی صنف کا جو انسانی زندگی کی تعمیر میں کوئی حصہ نہ رکھتی ہو۔

ایسی صورت میں پروفیسر کلیم الدین کی یہ فردِ جرم ثابت کرتے ہوئے کہ ———

"غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے"

عظمت اللہ خان کا ———

"گردن زدنی کا حکم صادر کردیا جائے"

# پروانے

عبدالحمید قریشی
پوسٹ گریجویٹ انسٹیٹیوٹ دہلی

کالج کے کامن روم میں بحث ہو رہی تھی۔ لڑکیاں ایک دوسری پر فقرے کس رہی تھیں۔ ہر ایک دوسری کے راز اگلنے پر تلی تھی۔

جب بحث کافی گرما گرم ہوگئی تو کچھ لڑکیوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ ایک بزرگ قسم کی لڑکی نے رائے دی کہ اس طرح ایک دوسری پر الزام لگانا اچھا نہیں۔ ویسے اس کالج کے تمام میں سب کا ایک سا حال ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ سب اپنے اپنے رومان کا حال بتائیں۔ اگر کسی کا ادھورا رومانس ہو تو ادھورا ہی سنائے۔ اگر کوئی اپنی طرف سے کچھ ذکر رہی ہو اور کوئی لڑکا اس پر توجہ دے رہا ہو تو بھی سنا دے۔ تجویز بڑے زور شور سے پاس ہوگئی، لیکن ایک ترمیم کے ساتھ، اپنا اپنا راز زبانی سنانے کی بجائے سب لکھ لکھ کر ان بزرگ قسم کی محترمہ کو اپنے اپنے کاغذ دے دیں، تاکہ وہ پڑھ کر سنائیں۔ اس سے خود بتانے کی کوفت اور جھجک مٹ جائے گی۔ اور کوئی لڑکی کسی دوسری کا رومانس سن لینے کے بعد اپنی داستان میں کوئی تبدیلی نہ کر سکے گی۔

ان ہی محترمہ نے اپنے نوٹ بک کے دو ورق پھاڑے، انہیں تہہ کیا اور ان کے آٹھ چھوٹے چھوٹے پرزے بنائے۔ سے کی کا نام لکھ کر اس کو ایک پرزہ دے دیا گیا۔ ہر لڑکی ایک طرف چلی گئی۔ کوئی کرسی پر بیٹھ کر لکھنے لگی۔ کسی نے دیوار سے میز کا کام لیا اور کسی نے اپنے ہینڈ بیگ کو کاغذ کے نیچے رکھ کر لکھنا شروع کیا۔

کوئی سات آٹھ منٹ بعد، سب نے اپنے اپنے کاغذ تہہ کر کے ان محترمہ کو سونپ دیئے۔ اور ان محترمہ نے باری باری سب کے پرچے پڑھنے شروع کئے۔

"منورما لکھتی ہیں: کالج کھلا ہے تب سے اب تک رمیش چھ دفعہ سامنے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے پانچ دفعہ آنکھیں نکال کر گھورا تھا، چھٹی دفعہ مسکرا دی تھی۔"

منورما کا پرچہ سن کر سب ہنسنے لگیں۔ منورما بھی ساری کا پلو دبا کر ہنس دی۔

"شکنتلا نے لکھا ہے: دُشینت (اصلی نام: درشن) آج کل بات چیت میں کالج کی پڑھائی کا ذکر کم اور ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کرتا ہے۔"

"مس زرینہ بندوق والا نے لکھا ہے: فیروز آج کل باتیں کرتے کرتے، اَن جانے میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیتا ہے وہ اس بات کا بھی خیال نہیں رکھتا کہ ہم ہوٹل میں بیٹھے ہیں یا کسی سنیما ہال میں۔"

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ زرینہ دوپٹہ منہ میں لئے ہنسی روک رہی تھی۔

"مس منگی نے لکھا ہے۔ جمی کا دھیان آج کل پروفیسر کے لیکچر کی طرف نہیں ہوتا۔ پریڈ کا تین چوتھائی وہ میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔ شکایت: شکایت یہ ہے کہ اچھا ہوا ایک چوتھائی حصہ مجھے خود اس کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔"

ایک اور قہقہہ اٹھا جس میں منگی بھی شریک ہوگئی۔

باری باری سب کے پرچے پڑھے جاتے رہے اور قہقہے بلند ہوتے رہے۔ ٹھٹھے پڑتے رہے۔ گھٹی گھٹی ہنسی گونجتی رہی۔

آخری پرچہ دیکھ کر سب کی چیخ نکل گئی (آگے صفحہ ۴۴ پر)

خوبصورتی
اور مضبوطی
ساتھ ساتھ
ریلے
بھارت کی سب سے پسندیدہ بائیسکل

# اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ ..........

اقبال کا ایک واقعہ ہے کہ جن دنوں ڈاکٹر صاحب میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام فرما تھے اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر ایک نئے ملاقاتی آئے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کر دیا۔ کہنے لگے۔

"آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر میں کون سی گذری ہے؟"

ڈاکٹر صاحب اس سوال کے جواب میں کرسی سے اٹھے اور نو وارد ملاقاتی کی طرف اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔ دو تین منٹ میں واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی، اس کتاب کو اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا۔

"قرآن کریم"

---

ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے سید امجد علی صاحب سے دوران گفتگو فرمایا، "عظیم مفکر نطشے پر جب جذب و وجدان نے غلبہ کیا تو وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے کوئی تربیت دینے اور راہ دکھانے والا میسر نہیں آیا تھا۔
علامہ کا مشہور شعر ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اسی واقعہ کا ترجمان ہے۔

---

علامہ اقبال..... کا ایک واقعہ سید وحید الدین

صاحب بیان کرتے ہیں۔ علامہ نے فرمایا، "ایک مرتبہ فارمن کرسچین کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے دعوتِ شرکت دی۔ اجلاس کا پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم لوگ چائے پینے بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے: چائے پی کر چلے جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ہم چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے، اقبال! مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبر پر قرآن کریم کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چوں کہ انھیں صرف عربی ہی آتی تھی، انھوں نے قرآن کریم کو عربی میں منتقل کر دیا یا یہ عبارت ہی اسی طرح اتری تھی؟ میں نے کہا، یہ عبارت ہی اتری تھی۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا کہ اقبال! تم جیسا پڑھا لکھا آدمی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اتری ہے! میں نے کہا، "ڈاکٹر لوکس! یقین! میرا تجربہ ہے، مجھ پر شعر پورا اترتا ہے، تو پیغمبر پر عبارت پوری کیوں نہیں اتری ہوگی۔"

---

ایک دفعہ ایک دھوبی آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے قدیم ملازم علی بخش سے دریافت کیا "میں ڈاکٹر اقبال کو دیکھنا چاہتا ہوں" ڈاکٹر صاحب بنیان اور دھوتی باندھے صحن میں حقہ پی رہے تھے۔ علی بخش نے اشارے سے کہا "یہ ہیں ڈاکٹر صاحب" دھوبی کو علی بخش کے کہنے کا یقین نہ آیا وہ آگے بڑھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو گھر ہی کا کوئی ملازم سمجھ کر ان سے پوچھنے لگا۔ ڈاکٹر اقبال کہاں ہیں؟ میں انھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب مسکرائے ا

لہا،، بمبئی میں ہی ہوں سا تو بیٹھو آدھو پاکستہ میں آگیا۔
تنا سادہ اور بے نیاز، شہرت شہنشاہ جیسی، رہائش درویش
جیسی۔!!

---

علامہ اپنے استاد محترم مولوی میر حسن صاحب کی جو عزت اور توقیر کرتے تھے وہ زبان زد خلائق ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب تک استاد کو شمس العلماء کا خطاب نہ دلوایا۔ خود، "سر" کا خطاب لینے پر رضامند نہ ہوئے۔
علامہ نے نہایت نرم اور حساس دل پایا تھا۔ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تذکیر الٰہی کے مواقع پر اکثر آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ گھر میں بچوں کے رونے اور عورتوں کی تکلیف میں مبتلا ہونے پر بے چین ہو جایا کرتے تھے۔ ملت کی زبوں حالی تو ان کی ہر آن کی بیقراری کا سبب تھی۔ ملنسار پرلے درجہ کے تھے۔ لیکن خوددار بھی بہت تھے۔ انسانی ہمدردی دل و دماغ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(دوام)

## عدل یہ ہے کہ

۱۔ بڑوں سے بیٹوں کی طرح پیش آؤ۔
۲۔ چھوٹوں سے باپ کی طرح پیش آؤ۔
۳۔ برابر والوں کے بھائیوں کی طرح۔
۴۔ مجرم کو اس کے جرم کے بموجب سزا دو۔
۵۔ غصے میں نہ آؤ۔

(محمد کعب السلطنیؒ)

---

(پروانے کا بقیہ)

کیوں کہ یہ پرچہ بالکل خالی تھا۔ اس پر مس رما کے نام کے علاوہ ایک حرف بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔
"اس کا کیا مطلب؟" کچھ لڑکیوں نے ایک آواز ہو کر پوچھا۔
"یہ سستی سادتری ہے" ایک لڑکی نے زور سے جواب دیا۔ اس پر قہقہہ بلند ہوا۔
"پاک دامن ہے" ایک اور نے کہا۔
"نہیں نہیں ابھی بچی ہے۔ کسی نے چاکلیٹ وغیرہ پیش کیا ہوگا اس کا ذکر کرتے ہوئے شرماتی ہیں" اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔
رما کامن روم کے دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔
"کالی ہے اس لئے کوئی نہیں پوچھتا" ایک نے طنز کیا۔
"نہیں اس کے چہرے پر بالوں کا رواں کچھ گہرا ہے، وہ اس کی کامیابی میں رکاوٹ ڈالتا ہے" دوسری نے جل کر رما کا مذاق اُڑایا۔
"نہیں اس کا پاکٹ سائز اس کے رومان کی راہ کا روڑا ہے"
"اس کا مزاج اسے گھاٹے میں ڈالتا ہے......"
"میں جانتی ہوں یہ کلونت کو چاہتی ہے۔ مگر وہ اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا"
"یہ کلاس میں عینک لگا کر بیٹھتی ہے۔ اس لئے کوئی لڑکا اسے پسند ہی نہیں کر سکتا"
غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔
"تم سب غلط سمجھ رہی ہو" رما نے اتنے زور سے چلا کر کہا کہ دوسری لڑکیوں کی آوازیں دب کر رہ گئیں۔
"تو پھر اصل بات کیا ہے؟" سب نے یک زبان ہو کر چیخ کر پوچھا۔
"بات... بات یہ ہے کہ... اس چھوٹے سے کاغذ پر سب کے نام آ ہی نہیں سکتے" یہ کہہ کر رما ہنستی ہوئی کامن روم سے باہر نکل گئی۔

(بقیہ ددھو کا ددھ)
لئے۔ اب میں آپ کو کیوں بتاؤں کہ بعد میں مجھ کو مسکراہٹ کی دبی ہوئی چیز نگہوں کو بغیر تامل قبول کرنا پڑا تھا۔
"ذرا سنئے" ہم کو خاموش دیکھ کر وہی آواز پھر گونجی۔ اور اب ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مڑ گئے۔ سامنے ایک محترمہ سہمی سہمی سی، گھبرائی ہوئی ہم کو گھور رہی تھیں۔ شاید وہ ایوننگ کے طلبا واساتذہ میں گھبرا کر پاتی ہوں۔ اور اب تک ان کی نظروں سے گذرے لوگوں میں ہم ہی طالب علم نظر آئے ہوں۔ اسی لئے وہ ہم سے مخاطب ہوئی ہوں۔ اور ہم کو ان کی بے چارگی پر رحم آگیا۔
"فرمائیے۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟" ہم گویا ہوئے۔
"مجھکو رشید صاحب سے ملنا ہے" اس نے فوراً جواب دیا۔
"کیا کام ہے آپ کو ان سے؟" یہ میرا اگلا سوال تھا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ رشید ایسے شریف کے لئے کوئی لڑکی ملنے نہیں آسکتی۔
"ان سے ملنا ہے" انھوں نے ٹالنا چاہا۔
"کوئی خاص کام ہے؟" ہم اڑے رہے۔
"ج...... جی ہاں" وہ فوراً بولیں۔
"تو فرمائیے مجھے ہی رشید کہتے ہیں" ہم نے یہ جانتے ہوئے کہ پورے کالج میں رشید صرف ایک ہے، سفید جھوٹ بول دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رشید ہم سے ہمیشہ اپنی پاک دامنی کے گن گاتا تھا۔ آج اس کی پاک دامنی کا بھانڈا پھوٹ رہا ہے۔ اس کو کوئی اور نہیں ایک لڑکی بلانے آئی ہے۔ جس کو اس سے ایک ضروری کام ہے۔
"آپ سے نہیں، دوسرے رشید صاحب سے ملنا ہے" محترمہ نے فوراً کہا۔
"رشید نام کا کوئی دوسرا طالب علم تا حال کالج میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اس سال کوئی داخل ہوگا تو میں مطلع کر دوں گا۔ تشریف لے جائیے" یہ کہہ کر ہم کا قدم اور ہم سنبھالنے میں مصروف ہوگئے۔ اور اس سے پہلے کہ ہم کھنے کو تیار ہوتے وہ ایک دم چیخی ——— رشید بھائی ——— ہم نے گردن اٹھائی۔ اور سامنے سے رشید کو آتا دیکھ کر اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتا ہوا محسوس کرنے لگے۔
سوچا، اب کیا ہوگا؟ دل میں خیال آیا کہ رشید کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے، محترمہ سے معذرت کرلیں۔ مگر برا ہو دماغ کا۔ کم بخت نے وہاں ہمارا قطعاً ساتھ نہیں دیا۔ بالآخر رشید پہنچ گیا۔
"ہمشیرہ تم ——— ؟ کیسے آنا ہوا ———؟" ہم نے رشید کو اس سے مخاطب دیکھ کر کھسکنا چاہا۔ مگر ابھی دو ہی قدم چل پائے ہوں۔
"سنو!" رشید نے پکارا "ان سے ملو، یہ میری بہن ہیں۔ زرینہ بیس مارننگ میں، فرسٹ ایئر میں پڑھتی ہیں۔ اور زرینہ! یہ میرے دوست ........"
"یار! میں چلتا ہوں۔ میرا پیریڈ ہے۔ اچھا، خدا حافظ" اس سے پہلے کہ رشید ہمارا نام لے کر ہمارے جھوٹ کا عقدہ کھولے ہم وہاں سے فوراً چلے آئے۔ ●●
(اس مضمون کی دوسری قسط پانی کا پانی اگلے شمارے میں دیکھئے)

---

(بقیہ ادھ کھلے پھول)
خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
آپ کا قلم کسی بھی میدانِ صحافت میں ماہر جرّاح سے کم نہیں۔
ابھرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کی حوصلہ افزائی شاملِ حال رہے، آپ کو ان کا نام بھی معلوم ہونا چاہئے۔
نام ہے انیس الرحمٰن
مشغلہ ہے تعلیم حاصل کرنا
آپ کے بارے میں رائے ہے کہ۔
"دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں"

مخدوم زادہ مختار حسین عثمانی مختار دہلوی قیمو

آپ کی رگوں میں نیا خون دوڑ رہا ہے۔
نوجوان ہیں اور کلام بھی ادبی لحاظ سے شباب پر ہے۔
متعدد رسائل اور جرائد میں آپ کا کلام مطبوع ہو چکا ہے۔
اور ہر طرف تحسین آفریں نگاہوں سے دیکھا گیا۔
اُردو ادب کو ایسے ہی نوجوان پر
فخر و ناز ہے۔

# غزل

لے کر چلے ہیں خود کو جو دیوانگی کی سمت
دیوانہ بن کے پہنچے ہیں خود آگہی کی سمت

اپنی ترقیوں پہ بھی نازاں نہیں ہیں ہم
چلتے ہیں کب چراغ کسی روشنی کی سمت

اب یہ پتہ چلا ہے کہ دنیا ہے مُنحرف
حالاں کہ ہر اک قدم ہے مرا زندگی کی سمت

درد و الم جدائی، تصورِ تیرا ملال
جاتا نہیں خیال کسی بھی خوشی کی سمت

قسمت ہی کچھ بھلی تھی جو ہم تیرے ہو گئے
لے کر چلے تھے لوگ ہمیں گمرہی کی سمت

مختار اب نہ آنکھ سے آنسو بہائیے
شامِ فراق آنے لگی روشنی کی سمت

سرگرداں دہلوی

## محبت کی یادیں ......... ندامت کے آنسو

*خدا تم میں اور مصائب و آلام میں ہمیشہ بعد المشرقین کی سی دوری قائم رکھے* ——

انسان بھی کتنا بے وقوف ہے کہ وہ مستقبل کی بجائے ماضی کی حسین یادگاروں کو ہی اپنا سرمایۂ زندگی سمجھتا ہے۔ اور مستقبل سے بالکل بے نیاز رہتا ہے۔ حالاں کہ اُسے ماضی سے زیادہ مستقبل کی فکر کرنی چاہیئے۔ ماضی اُس کی جھولی میں سوائے حسرتوں اور آہوں کے کچھ نہیں ڈال سکتا۔ جب کہ مستقبل اُسے ایک تابناک راستہ کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ خوشیوں اور کامرانیوں سے اس کے دامن مراد کو بھر سکتا ہے۔

لیکن ماضی کے کچھ حسین لمحات ایسے ہوتے ہیں جنہیں بھلانا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے۔

تم نے بھی میرے ساتھ چند لمحے ایسے گزارے ہیں، جو میری تمام زندگی میں ایک نہ بھلانے والی چیز کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ میں اس دن کی جسارت اور گستاخی پہ بے حد نادم ہوں، اور اس کے لئے میں نے سزا بھی خود ہی طے کر لی ہے۔

وہ یہ ہے کہ اب تم سے کنارہ کشی کر لوں۔ اور میں آپ کو ہر ممکن یقین دلاتا ہوں کہ اپنے اس عہد پر سازِ زندگی کے ایک ایک تار کے بکھرنے تک کاربند رہوں گا۔ ویسے بھی بہ بانگِ دہل آپ کا اعلان ہو چکا ہے کہ "میرا آپ سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ آئندہ آپ سے تعلق رکھنا چاہتی ہوں۔" ذرا دل کے کسی گوشہ میں دیکھو، کہیں نہ کہیں میرا خلوص تمہیں پڑا ہوا

بل جائے گا۔ میں نے ہمیشہ مقدس نظروں سے دیکھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میری چاہنے جا باتوں سے آپ کو ناگواری ہوئی ہے۔ اور آپ نے یہ محسوس کیا ہو کہ میں راستہ کا پتھر ہوں جو کسی وقت بھی تکلیف پہنچا سکتا ہے۔ اور یہ سوچ کر آپ نے ترک تعلق کی ٹھان لی ہو۔ لیکن میرا خدا گواہ ہے کہ آج تک میں نے جس خلوص، تقدس اور احترام کے ساتھ آپ کے ساتھ برتاؤ کیا ہے اس کا کبھی یہ مطلب نہیں تھا کہ میں صنفِ نازک کی نظر التفات کا محتاج ہوں۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسی کوشش نہیں کی۔ اور اس کا اندازہ تو آپ کو بھی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس واقعہ کے بعد، شاید واقعہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بھولنے کی کوشش کی اور ایک حد تک کامیابی بھی آپ کو ملی۔ لیکن میں اس وقت تک اپنے دل میں عجیب سی کھٹک محسوس کر رہا ہوں کہ آپ نے معاف کیا یا نہیں ۔۔؟

مجھے اس دوستی کے انجام سے نہ تو کوئی حیرت ہے اور نہ ہی کوئی افسوس۔ البتہ اپنے آپ کو بے وقوف کہنے کو دل چاہتا ہے۔ کیوں کہ آپ اس مورتی کی طرح ہیں جو سونے چاندی کے زیورات سے آراستہ ہو، جسے صرف پوجا جا سکتا ہے، چھوا نہیں جا سکتا، اس کے قدموں میں سر رکھا جا سکتا ہے، لیکن اس سے کوئی گلہ یا شکوہ نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے بھی میں نے اس منزل پر پہنچنے کی کوشش کی، جہاں لاکھ جتن کرنے کے بعد بھی میں نہیں پہنچ سکوں گا۔ اور جب بھی اپنی حیثیت سے زیادہ بڑے اور اونچے لوگوں سے ربط ضبط بڑھایا جائے گا یا اُن سے دوستی کی کوشش کی جائے گی۔ تو اس کا انجام ایسا ہی عبرتناک اور حسرتناک ہوگا ــــــ میں کئی دفعہ آپ کی رہ گزر سے گذرا، لیکن ہمت نہیں پڑی کہ آپ سے دو دو باتیں کروں۔

خیر، اُس وقت انسان کو کتنی تکلیف ہوتی ہے، جب اُس کا اپنا کسی اجنبی سے دوستوں کی طرح بات کرے اور وہ دوست اجنبی بن کر اُس کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھے۔

میری دعا ہے کہ تمہیں زندگی میں ایسے مواقع بار بار آئیں، تب اندازہ ہوگا کہ دل کس طرح ٹوٹتا ہے ــــــ

میری اپنی بھی کوشش تھی کہ دل و جگر کی تباہی کا حال کسی کو معلوم نہ ہو، لیکن جب دل ٹوٹتا ہے، تو دل و دماغ اور روح متاثر ہوئے بنا نہیں رہتی، اور اسی روح کی تسکین کے لئے مجھے قلم اور معصوم قرطاس کا سہارا لینا پڑا۔ خدارا معاف کریں اور اچھے لفظوں کے ساتھ نہیں تو بُرے الفاظ کے ساتھ میرا ذکر آپ کے دیوان میں ہونا چاہئے ــــــ

اگر اس کو گلہ، شکوہ یا خوشامد نامہ سمجھیں تو آپ غلطی پر ہیں۔ بلکہ میں نے حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ گلہ شکوہ اور بھی دوست سے ؟ یہ میں اعترافِ شکست کے مترادف سمجھتا ہوں۔ اور یہ کبھی میری انا نے گوارا نہیں کیا ــــــ رہا خوشامد کا سوال تو میری خوددار طبیعت اس کی عادی نہیں ہے

" سچ ہے کہ جھوٹ کہنے کی عادت نہیں ہے مجھے "

ویسے بھی میرا خیال ہے کہ اگر جنسِ لطیف بے نیاز ہو تو صنفِ مخالف کو خوددار ہونا چاہئے۔

اب تو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ :۔

قسمت تو دیکھئے کہاں ٹوٹی جا کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

میری سفینۂ حیات کی ناخدا ــــــ !

اپنی زندگی کے اس سفینہ کو بیچ منجدھار میں ہونے کے باوجود اپنے سفرِ حیات کو برابر جاری رکھنے کی کوشش کروں گا۔ تم نہیں، تمہاری یادیں تو ہیں۔ میں اسی کے سہارے اپنے سازِ زندگی کے بے ترتیب اور بے آواز تاروں کو باہم مربوط رکھنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔

دونوں جہاں سے تری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

## اجازت

........ تمہارا گم کردہ

RUPEE
1962
رُوپئے
دَرختوں پر
نہیں
اُگتے !
لیکن آپ دولت کے بھنڈار جیت سکتے ہیں
جموّں و کشمیر سٹیٹ لاٹریز
پہلا انعام 2,00,000 رُوپئے
اور دو آدمیوں کے لئے 10 دِن کی کشمیر کی نشاط انگیز سیر
355 دیگر دلکش انعامات
قیمت فی ٹکٹ
1/- روپیہ
صرف
لاٹری نکلنے کی تاریخ
21.9.1969
لاٹری کے ٹکٹ ڈائرکٹریٹ جموں و کشمیر سٹیٹ لاٹری سری نگر۔ 5 پرتھوی راج روڈ نئی دہلی
جموں و کشمیر ٹریڈ ایجنسی بمبئی و امرتسر تمام سٹیٹ گورنمنٹ ٹریژریز و ہندوستان
بھر کے منظور شدہ ایجنٹوں سے مل سکتے ہیں۔
جاری کردہ۔ ڈائرکٹر آف لاٹریز۔ جموّں و کشمیر سٹیٹ سری نگر

اکتوبر ۱۹۶۹ء
جلد ۳ شمارہ ۲

# شاہجہاں

طالب علموں کا — طالب علموں کیلئے — طالبعلموں کے ذریعے

## مجلس ادارت

محمد عتیق صدیقی — طالب علم دلی یونیورسٹی
انیس الرحمن — طالب علم دلی کالج دہلی
محمد یوسف خان — " دلی یونیورسٹی
معروف الحسن صدیقی — " " "

خوش نویس — محمد نور الحق متعلم مدرسہ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی
مشیر طباعت — محمد شفیق صدیقی انڈیا کالج دہلی
طابع، ناشر — محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ — اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی
مقام اشاعت — قاسم جان اسٹریٹ دہلی

ہر قسم کی قانونی چارہ جوئی کے لئے
صرف دہلی کی عدالتوں سے
رجوع کرنا ہوگا۔

شاہجہاں میں شامل تمام تر مواد میں۔ نام، مقام، واقعات کی —
کسی سے مطابقت محض اتفاقی ہے۔
جس کے لئے ادارہ، پبلشر —
یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

پچھلا شمارہ شائع ہونے پر ہمارے اساتذہ و ساتھیوں نے جس حوصلہ افزا رویہ سے نوازا ہے —
اس کے لئے ادارہ شکر گزار ہے۔

خاص طور پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (صدر شعبہ اُردو دلی یونیورسٹی)
جناب اعزازی و جاوید صاحبان (صدر شعبہ عربی و اُردو دلی کالج دہلی)
جناب سبقی پریمی و عظیم الشان صاحبان (استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)
جناب محمد شریف و عبدالحق صاحبان (استاد پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی)
کا ادارہ بے حد ممنون ہے۔ کہ جنھوں نے اپنے گراں قدر مشوروں کے ساتھ ساتھ عملی تعاون کا بھی وعدہ فرمایا۔

ہمارے بہت سے اساتذہ و ساتھیوں نے ایک تجویز رکھی ہے کہ دہلی کے تمام اُردو، عربی اور فارسی کے طلبہ وطالبات کی ایک سوسائٹی (بزم ادب) کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اور اس کی ماہانہ یا پندرہ روزہ ایک نشست منعقد کی جائے جس میں صرف طلبہ ہی تخلیقات و مضامین پڑھیں جو بعد میں شاہجہاں میں شائع کئے جائیں۔

اس سلسلے میں عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہم اپنے ساتھیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رائے سے نوازیں۔ آیا ان کی نظر میں ایسا کرنا سودمند ہوسکیگا یا نہیں یا اس میں ترمیم و تنسیخ ضروری ہے۔ غرض جیسا وہ مناسب سمجھیں جلد مطلع کریں۔ ہم منتظر ہیں۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں ڈی۔ ٹی۔ یو۔ کے حکام سے اختلافات کے سبب طلبہ کے بسیں جلانے، پتھراؤ کرنے اور املاک کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے دلی یونیورسٹی بند کر دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں بھی ہم ساتھیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے نظریات (طلبا کی بے چینی کے اسباب اور ان کو ختم کرنے کے طریقے) بھیجیں۔

شاهجهاں کو بہتر بنانے میں آپ کا تعاون درکار ہے
ادارہ

# جمہوریت کی ترازو میں !

## سیاسی وغیر سیاسی حالات پر تبصرہ

### ڈی۔ٹی۔یو۔ اور طالب علم

ماہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں ڈی۔ٹی۔یو۔ کے اختلاف اور تصادم کے باعث دلی یونیورسٹی کو بند کرنا پڑا ——— ہم اس اختلاف اور تصادم کا ذمہ دار عام لوگوں کی طرح صرف طلبہ کو ہی نہیں ٹھہراتے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم طلبہ کے بسیں جلانے، کالج اور پبلک پراپرٹی کو نقصان پہنچانے کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ ڈی۔ٹی۔یو۔ کے سو فی صد کنڈکٹر ایسے اکھڑ دماغ ہیں جنھیں بات کرنے تک کا شعور نہیں ——— ٹکٹ کے لئے تڑاک سے بات کرنا ان کا معمول ہے۔ ضرورت پڑنے پر دست درازی ان کی عادت ہے ———
دلی ایسے تہذیب یافتہ شہر میں لچا - تو "کہد ینا بھی گالی گمان کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا تقرر یقینی طور پر یہاں کے لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ عام لوگ اس کو برداشت کر لیتے ہیں۔ مگر طلبہ چونکہ نوجوان ہوتے ہیں۔ نیا خون ہوتے ہیں - اس لئے برہم ہو جاتے ہیں۔ دوران کی اس برہمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی لوگ ان کو غیر قانونی کاموں کے لئے اکساتے ہیں - اور یہ کھیل ہی کھیل میں ایسا کام کر جاتے ہیں جو ان کو نہیں کرنا چاہئے۔

یہ ہے وہ بنیادی وجہ جو مختلف اسباب کا موجب بنتی ہے۔ بس میں سفر کرتے وقت ٹکٹ نہ لینا یقینی طور پر ایک جرم ہے۔ اور اس جرم کے مرتکب کو سزا ملنی ہی چاہئے۔ اس کے لئے قانون اور پولیس ہے۔ کنڈکٹر نہیں ——— اس کا جواب طلبہ کے لئے ہرگز یہ نہیں کہ وہ بسوں کو جلا دیں اور ان کے کارندوں سے جھگڑا کریں - پولیس پر پتھراؤ کریں۔ کالج یا باہر کی پراپرٹی کو نقصا[ن] پہنچائیں ——— یہ تمام کام تخریبی کہلاتے ہیں۔ اور اس ط[رح] کے کام ملک کے آئندہ معماروں کو زیب نہیں دیتے۔

ہم طالب علم ہیں۔ کالجوں میں پڑھنے ہی نہیں بلکہ زندگ[ی] گزارنے کا شعور سیکھنے بھی آتے ہیں۔ کیا آئندہ ہمیں آئندہ یہی س[ب] کچھ کرنا ہے ——— ؟ کیا ہم ہمیشہ اسی طرح کی تخریبی کارروائیا[ں] ہی کرتے رہیں گے ——— ؟ اگر جواب ہاں ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کے برعکس اگر ہمیں آئندہ ایک امن پسند اور خوش [حال] شہری کی زندگی گزارنی ہے۔ اور ملک کی ترقی میں حکومت کا ہا[تھ] بٹانا ہے تو ہم کو اس طرح کے کاموں سے نہ صرف احتراز کرنا چاہئے، بلکہ ایسے لوگوں کے ساتھ تعاون نہ کر کے ان کی حو[صلہ] شکنی کرنی چاہئے ——— اختلافات ناممکن امر نہیں، لیکن [ان کو] حل کرنے کا ہرگز یہ طریقہ نہیں ہے۔ بات چیت کر کے بھی اختلا[فات] دور کئے جا سکتے ہیں۔

جہاں ہم طلبہ سے پُر امن رہنے کے لئے اپیل کرتے ہی[ں] وہاں ہم ڈی۔ٹی۔یو۔ کے حکام بالا سے درخواست کرتے ہیں [کہ] ڈی۔ٹی۔یو۔ کی بسوں میں ایسے لوگوں کو کنڈکٹر مقرر کریں جو یہا[ں کی] تہذیب سے واقف ہوں - اور بات کی اونچ نیچ کو سمجھنے کا ش[عور] رکھتے ہوں۔

### فرقہ وارانہ فسادات
### ہندوستان کے سیکولر ماتھے پر کلنک

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فساد عمر میں ہندوستان

ی مسلم ممالک خصوصاً عرب ممالک کی مکمل حمایت کے باعث
یں۔ بلکہ اس کے سیکولر پیشانی پر کلنک کے ٹیکے کا بھی باعث
یا۔ جس کے سبب ہندوستان کی وقعت دنیا میں کم ہوگئی ہے۔
گذشتہ بائیس سال سے شروع ہوئے اس سلسلہ کی نئی
ماہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں احمدآباد اور گجرات کے دیگر شہروں میں
پذیر ہوئی۔ جس میں ہزاروں مائیں اپنے بچوں سے محروم
یں۔ ہزاروں بچوں سے ماں اور باپ کہنے کا حق چھین لیا گیا۔
ہزاروں سہاگنوں کا سہاگ اجاڑ دیا گیا ــــ اور
وں لوگوں کو بے گھر و بے سروسامان کرکے تاریک مستقبل
د میں ڈال دیا گیا ــــ اور جس وقت یہ سب کچھ ہو رہا
اس وقت ہماری حکومت رباط میں ہو رہی اسلامی کانفرنس
شرکت کے لئے سرگرداں تھی۔ کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات، کہ
طرف تو ہماری حکومت ہندوستانی مسلمانوں کی وجہ سے خالص اسلامی
نفرنس میں شرکت کا حق جتاتی ہے۔ اور دوسری طرف ان ہی
انکے جان و مال کے تحفظ میں لاپرواہی برتتی ہے ــــ اور جب
باط سے ناامید واپسی پر حکومت کو ہوش آیا تو وہاں فوج لگا دی
اور وہاں کی غیر جانبدارانہ انکوائری کے لئے ایک کمیشن مقرر
دیا ــــ یعنی وہی کیا جو تقریباً ہر ایسے موقع کے بعد کیا جاتا
ہے ــــ مگر سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح یہ لعنت ختم ہوسکتی ہے؟
جواب صاف ہے۔ اگر ہوسکتی تو کبھی کی ہوچکی ہوتی ــــ لہٰذا
حکومت کو اپنا یہ طریقۂ کار بدلنا چاہئے۔ اور فرقہ پرستی جیسے گھناؤنے
جرم کی سزا سخت سے سخت مقرر کرنی چاہئے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک
شخص کو کسی کو جان سے مارنے کی سزا موت ملتی ہے۔ مگر دوسرا
شخص جو سیکڑوں کی موت کا باعث ہوتا ہے کوئی سزا نہیں ملتی۔
وہ دندناتا پھرتا ہے ــــ ہمارا حکومت کو مشورہ ہے کہ وہ
ایسے شخص کو جو فرقہ وارانہ منافرت پھیلائے، بلا تفریق مذہب و
ملت سزائے موت دی جائے۔ یہ ہی ایسا طریقہ ہے جس کا نتیجہ
فوراً ظاہر ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہماری عوام سے اپیل
ہے کہ ایسے عناصر کو بے نقاب کرکے حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔
ہندوستان میں مکمل سکون، امن اور باہمی میل جول
قائم کرنے کے لئے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان میں رہنے
والا، خواہ وہ ہندو ہو مسلم، سکھ ہو یا عیسائی، وہ ہندوستانی ہے
اور ہندوستان کی ترقی میں حصہ لینا اس کا فرض ہے۔ لہٰذا انہیں
ہندوستانی ہی سمجھ کر لو۔ ہندوستانی ہی سمجھ کر دیکھو ــــ
ہندو، مسلم، سکھ یا عیسائی سمجھ کر نہیں۔ کیوں کہ جب بھی ایسا
ہوگا تو دو دلوں کے درمیان مذہب آڑے آجائے گا۔

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ احمدآباد کے طرح
کے آنسو رلا دینے والے واقعہ کی تحقیقات کرائے۔ اور اس سے
پہلے یہ واقعہ کہیں اور دہرایا جائے یہاں فساد کے ذمہ دار اشخاص
کو خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں دوسرے لوگوں کی
عبرت کے لئے سزائے موت دے۔ اور فساد سے متاثر لوگوں
کا نقصان پورا کرے۔

## دلی یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر کا تقرر

سابق وائس چانسلر ڈاکٹر بی۔ این گنگولی کے بعد جنہوں
نے چند ماہ قبل استعفیٰ دے دیا تھا۔ اب صدر شعبہ اقتصادیات
(اکنامکس) ڈاکٹر کے۔ این راج کا تقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر راج کی
عمر ۴۴ سال ہے۔ اور اس طرح وہ دلی یونیورسٹی کے سب سے
کم عمر وائس چانسلر ہیں۔

آپ گذشتہ ۱۹ سال سے یونیورسٹی سے منسلک ہیں۔
لندن سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد اور دلی یونیورسٹی سے
قبل آپ پلاننگ کمیشن اور ریزرو بینک آف انڈیا کو بھی اپنی خدمات
سے فیضیاب کرچکے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ جواں سال ہونے کے سبب طلبہ
کے مسائل و دیگر تعلیمی الجھنوں (جو اس وقت یونیورسٹی
کو گھیرے ہوئے ہیں) کو سمجھنے اور ان کو ختم کرنے میں کامیاب
ہوسکیں گے۔

”میں ہندوستان پیسہ لینے یا پختونستان کی حمایت حاصل کرنے نہیں آیا۔ بلکہ میرا مقصد ہندوستان کے عوام کو وہ درس یاد دلانا ہے جو گاندھی جی اپنی تمام زندگی دیتے رہے۔ اور جس کی خاطر اپنی جان عزیز بھی قربان کر دی“

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان

گذشتہ صفحے سے پیوستہ

# شاہ جہاں کی زندگی کا ایک دن

## دیوانِ خاص

۱۰ بجے سے کچھ قبل بادشاہ تخلیہ میں مجلسِ مشاورت منعقد
نے کے لئے جلوہ افروز ہوتا۔ یہاں بادشاہ اہم خطوط کے جوابات
د اپنے ہاتھ سے لکھتا۔ دوسرے اہم خطوط محکمہ جات کے افسران
لی یا وزراء پڑھ کر سناتے۔ جن کے جوابات بادشاہ کے زبانی
حکامات کے مطابق خطوط یا فرامین کی صورت میں لکھے جاتے۔
مسودات پڑھ کر سنائے جاتے جن میں بادشاہ ردّ و بدل، کمی و
ضافہ کرتا۔ پھر صاف ہو جانے کے بعد مہر شاہی ثبت ہونے کے
لئے حرم میں ممتاز محل کی خدمت میں بھیج دیئے جاتے۔ کیونکہ مہر برداری
کا اہم منصب انہیں سے متعلق تھا۔

**محکمہ جات** کے افسرانِ اعلیٰ خاصہ کی زمین اور فوجی
افسران کی جاگیرات کے متعلق احکامات
حاصل کرتے۔
شاہی صدقات
کے افسرانِ اعلیٰ
حاجت مندوں کی عرضداشت
پیش کرتے۔ ان میں سے بیشتر زرِ نقد معافی، وظیفہ یا روزینہ
کی منظوری پاتے۔ اس مقصد کے لئے وہ رقم صرف کی جاتی جو بادشاہ
کو جشنِ سالگرہ کے موقع پر سونے، چاندی اور جواہرات سے تلنے سے
حاصل ہوتی۔ اس میں وہ رقم بھی شامل ہوتی، جو اس موقع پر شاہ
زادگان اور امراء ردِّ بلا کے طور پر تصدق کرتے تھے۔ کچھ وقت
فن کاروں کے کام کے معائنہ میں بھی صرف ہوتا۔ شاہی عمارات
کے نقشے بھی حضوری میں پیش ہوتے۔ جنھیں دیکھ کر بادشاہ
اپنے مشورے دیتا۔ نقشوں کی منظوری کے بعد آصف خان
وزیرِ اعظم، انجینیروں کو شاہی ہدایات نافذ کرتا۔ اس کام کی
بڑی اہمیت تھی۔ کیوں کہ بادشاہ کو ذاتی طور پر طبعاً بڑا لگاؤ
تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس عہد میں ایسی عمارتیں تعمیر ہوئیں جو مستقبل
کے لئے تاریخی یادگاریں ہو گئیں۔ اس موقع پر مہتمم محکمہ عمارات و رفاہِ عامہ
مع اپنے ماہرین کے موجود رہتا۔

اس کے بعد بادشاہ اکثر شکاری بازوں اور شکار کرنے والے
چیتوں کا معائنہ کرتا۔ شہسوار احاطہ میں اپنے تربیت یافتہ، سدھے ہوئے
گھوڑوں پر اپنے شہسواری کے کمالات دکھاتے۔

## شاہ برج

**تقریباً دو گھنٹہ** اس طرح مصروف رہنے کے بعد ساڑھے گیارہ
بجے کے قریب بادشاہ شاہ برج میں داخل ہوتا۔ شدید رازداری کے امور
یہاں انجام پذیر ہوتے۔ شاہزادوں اور معتمدوں کے علاوہ کوئی شخص
بلا اذن یہاں بار نہ پاتا۔ خدام خاص بھی جب تک طلب نہ کئے جاتے،
باہر ہی رہتے۔ جن امور کا اظہار مفادِ عامہ کے خلاف ہوتا۔ ان کے
بارے میں بادشاہ وزیرِ اعظم سے تبادلۂ خیالات کرتا۔ دور دراز کے
حکامِ بالا کو اہم رازدارانہ اہمیت کے خطوط کے خلاصے لکھے جاتے
یہ خطوطِ خاصہ کی زمین اور قومی بجٹ پر مشتمل ہوتے۔ اس کارروائی
میں تقریباً پون گھنٹہ صرف ہوتا۔ کام کی کمی بیشی کے لحاظ سے وقت
میں بھی کمی بیشی ہو سکتی تھی۔

## دوپہر حرم میں

**دوپہر میں** بادشاہ حرم میں داخل ہوتا، جہاں وہ نمازِ ظہر ادا کرتا۔
خاصہ تناول کرتا۔ اور ایک گھنٹہ قیلولہ کرتا۔ عام طور سے حرم آرام و
آسائش اور عیش و مسرت کا مقام ہوتا۔ لیکن شاہ جہاں یہاں بھی،
مصروفِ کار رہتا۔ بادشاہ کی فیاضی سے مستفیض ہونے کے لئے
نادار عورتیں، بیوائیں، یتیم، زوال پذیر خاندانوں کے افراد اور
غریب علماء اور فضلاء کی صاحب زادیاں مجتمع ہو جاتیں۔ حرم کے
ناظرِ اعلیٰ ستی النساء ان کی درخواستیں ملکہ کی خدمت میں پیش کرتیں
بلکہ ان درخواستوں پر اپنی رپورٹ بادشاہ کے حضور میں پیش
کرتیں۔ بادشاہ کسی کو معافی کی زمین بخشتا۔ کسی پنشن اور امداد
مرحمت کرتا۔ اور غریب لڑکیوں کے جہیز کے لئے کپڑے، زیورات
اور نقد ادا کرتا۔ ہر روز حرم میں ایک خطیر رقم امورِ خیر میں صرف
کی جاتی۔

## بعد دوپہر - دیوانِ عام

۴ بجے کے بعد بادشاہ نمازِ عصر ادا کرتا۔ اگر ضرورت ہوتی تو کبھی کبھی دیوانِ عام میں جاتا۔ معاملاتِ ملکی پر سرسری نظر ڈالتا محل کے محافظ مع اپنے اسلحہ جات معائنہ کے لئے پیش کئے جاتے بعدازاں درباریوں کے ساتھ نمازِ مغرب ادا کرتا۔

## بادشاہ پھر دیوانِ خاص میں

دن ختم ہوجاتا، مگر اب بھی دن کا کچھ کام باقی رہ جاتا۔ دربارِ خاص میں مرصع شمع دانوں میں خوش بودار شمعیں روشن کی جاتیں۔ بادشاہ اور اس کے معتمدانِ خاص مجتمع ہوکر تقریبًا دو گھنٹہ امورِ مملکت کے مسائل پر غور و فکر کرتے۔ اس کے بعد بزمِ نشاط برپا ہوتی۔ موسیقی و مزامیر سنتا۔ اور باکمالوں کے کمالات کی قدر افزائی کرتا۔

اگر ہم دربار کے تاریخ نویسوں پر بھروسہ کرسکتے ہیں تو بادشاہ تو بادشاہ، اگر دو محو کا ایک کامیاب شاعر تھا۔ اس کے اشعار اتنے شیریں اور پُراثر ہوتے کہ صوفیانِ باصفا میں جو شریکِ صحبت ہوتے کلام سن کر ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی۔ بادشاہ دوبارہ پڑھتے۔ اس کے بعد ۸ بجے نمازِ عشاء سے فارغ ہوکر بادشاہ شاہ بُرج میں داخل ہوتا۔ اگر اب بھی اہم رازداری کے مسائل باقی رہ جاتے تو وزیرِ اعظم اور بخشیوں کی مدد سے احکامات نافذ کرتا۔ تاکہ آج کا کام کل پر نہ ٹلے۔

## حرم میں موسیقی اور کتب خانی کی سماعت

تقریبًا ۸½ بجے بادشاہ حرم میں جاتا۔ یہاں دو گھنٹہ اور کبھی کبھی تین گھنٹے فنِ موسیقی کی ماہر عورتوں سے موسیقی سُنتا اس کے بعد آرام کرہ میں جاتا جہاں کتابوں کی سماعت کرتا کرتا سوجاتا۔ کتب خوانی کا طریقہ یہ تھا کہ اچھا کتاب خواں پسِ پردہ اس طرح بیٹھتا کہ وہ کمرہ سے باہر ہوتا۔ وہ مناسب آواز سے سفرناموں، سیرتِ رسول، حیاتِ اکابر و مشائخ اور شاہانِ پیشین کی تواریخ پڑھتا۔ تزکِ تیموری اور تزکِ بابری بادشاہ کی پسندیدہ ترین کتابیں تھیں۔ بعدازاں بادشاہ دو بجے کے بعد ۲ گھنٹے کے لئے استراحت فرماتا۔

## ہر چہار شنبہ کو دربارِ عدل

یہ بادشاہ کے روزانہ کے معمولات تھے۔ جمعہ کو تعطیل ہوتی۔ عدل گستری اور معدلت شعاری جو شاہانِ مشرق کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس کے لئے چہار شنبہ مخصوص تھا۔ اس دن دیوانِ عام میں دربار نہ ہوتا، بلکہ بادشاہ "جھرکہ درشن" میں آکر کرسی عدالت پر رونق افروز ہوتا۔ کو اُس نے دانش مند، تجربہ کار، متقی، پرہیزگار اور خوفِ خدا کرنے والوں کو مقدمات کے فیصلوں کے لئے مقرر کیا تھا۔ مگر خود بادشاہ سرچشمۂ عدل و انصاف تھا۔ جہاں مقدمات کی آخری اپیل ہوتی۔ اس دن مفتیانِ شرع، قاضیانِ عدل و شعار، خداترس اور چند معتمدانِ خاص کے علاوہ کسی کی بھی باریابی نہ ہوتی۔ بادشاہ بڑی رفق و ملاطفت کے ساتھ تحقیقات و تفتیش کرتا اور شریکِ عدالت کے مشورہ سے حکم صادر فرماتا۔ مستغیث دور دراز کے صوبوں سے آکر عدالتِ عالیہ سے دادخواہ ہوتے۔ اور اگر ضرورت ہوتی کہ مقدمہ کی مقامی تحقیقات ہو تو بادشاہ صوبہ داروں کو تاکیدی حکم بھیجتا کہ حقیقتِ حال سے آگاہی کرکے خود فیصلہ کردے یا فریقین کو اپنی رپورٹ کے ساتھ دادخواہی کے لئے مکرر دارالسلطنت بھیج دیں۔

یہ تو آگرہ اور دہلی میں مقررہ دستور العمل تھا۔ اس کے علاوہ رعایا کے حالات سے باخبر رہنے بادشاہ اپنے عمل کے صوبوں کا دورہ کرتا۔ تاکہ رفاہِ عام کی صورتیں پیدا کی جاسکیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تختِ شاہی پھولوں کا بستر نہ تھا۔ بادشاہ کے فرائض تھے اور تقسیمِ اوقات تھی۔ شاہجہاں مشقت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ تاکہ اپنی رعایا کو امن، اطمینان، فارغ البالی اور خوش حال دیکھ سکے۔ انڈیا آفس لائبریری لندن کے ایک فارسی مخطوطہ میں

**مہاتما گاندھی۔** جن کی صد سالہ جشنِ ولادت پر
گجرات کے عوام نے انسانیت سوز مظالم ڈھا کر
اور درندگی کا مظاہرہ کرکے
انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

کیا گاندھی جی قبول کریں گے؟

# امن کا پیغامبر
## مجاہدِ امن کے ساتھ

مہاتما گاندھی
اور
سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان
کی ایک یادگاری تصویر
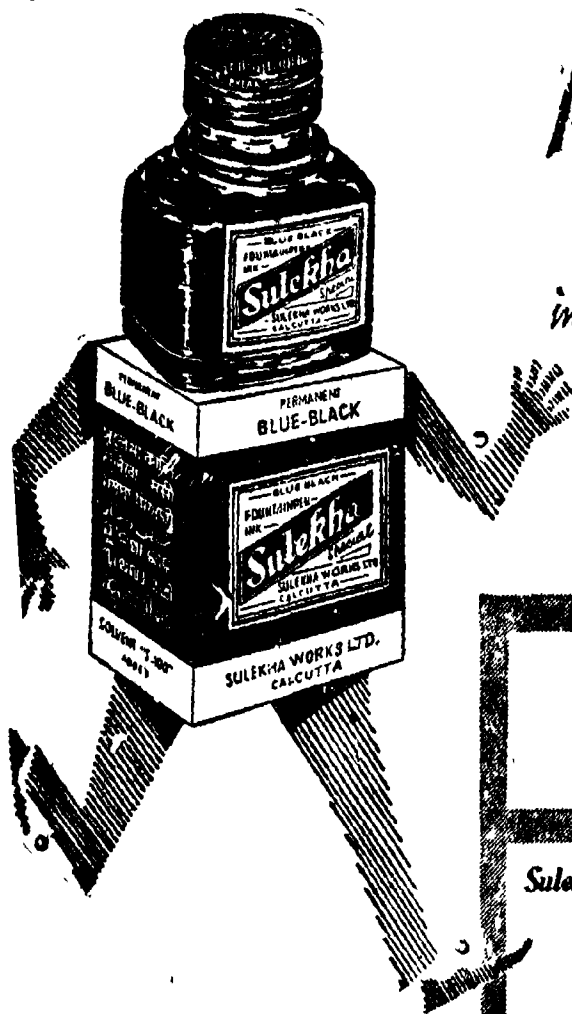
Sulekha
PERMANENT
BLUE-BLACK
SULEKHA WORKS LTD.
CALCUTTA

# سایہ

ط۔ فاطمہ
علی گڑھ یونیورسٹی

جس گاؤں میں اچھوتے موتیوں کے آب دار لڑیوں کی طرح تبسّم ہی تبسّم، خوشیاں ہی خوشیاں اور حسن ہی حسن جھلملاتا تھا۔ آج وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ پورے ماحول پر جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔ جیسے میں شہر خموشاں میں پہنچ گیا ہوں۔ اور قبر میں چین سے سونے والوں کا سکوت میرے قدموں کی چاپ سے ٹوٹ جائے گا۔ اُف! ہر گلی میں موت کا سا سکوت، ہر مکان میں اندھیرا، ہر سمت تاریکیاں، رات اتنی سیاہ، جیسے کبھی ختم نہ ہوگی۔ جس حسین دورا ہے پر میں رات کے بارہ بارہ بجے تک بیٹھا رہتا تھا۔ اور شہر کی طرف سے آنے والے تانگوں اور سواریوں کو دیکھا کرتا تھا۔ آج مجھے اپنی محبوب جگہ پر جاتے ہوئے خوف سا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ آج میونسپل کی لالٹین بھی بجھی ہوئی تھی۔ جیسے وہ لالٹین نہ ہو، کسی عاشقِ ناکام کا دل ہو۔ لالٹین یا تو جل کر بجھ گئی تھی، یا پھر جلائی ہی نہ گئی تھی۔ شہر کی ن سے آنے والے تانگوں کا شور بھی نہ تھا۔ وہ پتھر جس پر گھنٹوں بیٹھا کرتا تھا، اُسے میں نے دور سے دیکھا۔ وہ رات کی تاریکی میں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی مردہ انسان لاش پڑی ہو۔

میں گاؤں کے باہر آگیا۔ میرے اور گاؤں کے درمیان لہ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ میں پانچ فرلانگ آگے نکل گیا۔ نک میری نظر تاریکیوں میں کچھ تلاش کرنے لگی مجھے اپنی روں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ تاریکی کے باوجود مجھے ایک فرلانگ کی چیزیں صاف نظر آرہی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک سایہ آم کے گھنے درخت کے نیچے متحرک تھا، اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے فضا کی خاموشی بھی ٹوٹ گئی۔ سنسان میدان، آم کا گھنا درخت، اُس کے نیچے ایک پتلے دبلے اور لمبے قد کا سایہ۔ اور پھر فوراً ہی میرے کانوں سے ایک ایسی آواز ٹکرانے لگی جس میں شدید گھٹن کا احساس تھا۔ وہی سایہ محوِ رقص و ترنم تھا۔ بہت مدھم آواز۔ لیکن کچھ اکھڑی ہوئی سی۔

---

اُس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھوں سے تیز اور گرم لپٹیں نکل رہی تھیں۔ جیسے اُن میں کسی سے انتقام لینے کا جذبہ چھپا ہوا ہو۔ وہ سایہ بہت غمگین اور اداس معلوم ہو رہا تھا۔ میں اُس وقت جہاں کھڑا تھا، اُس کے بالکل سامنے، تقریباً ایک فرلانگ پر آم کا شاداب درخت تھا۔ آم کے درخت کی آدھی جڑیں ایک تالاب میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ آدھی تالاب سے باہر خشکی پر تھیں تالاب کافی نشیب معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ تین طرف نیچی نیچی پہاڑیاں تھیں۔ یہ تالاب سو سال پرانا تھا— کافی گہرا، صاف شفاف پانی جسے پہاڑی چشمہ کہا جا سکتا ہے۔ آم کا درخت محض دس سال پرانا تھا— اور دونوں سے کہیں پرانا یہ گاؤں تھا۔ اور اس کی آبادی۔ یہ حسین گاؤں اور یہاں کی حسین آبادی جیسے اس گاؤں کا حسن، گاؤں کے وجود سے بھی پرانا تھا۔ یا جیسے یہ گاؤں قدرت کی طرف سے حسن کا گہوارہ بنا دیا گیا تھا۔

اور یہاں کی آبادی اُن معصوم بچّوں کی طرح تھی جن کے ہاتھوں
میں کوئی نازک اور حسین کھلونا دے دیا گیا ہو۔
تالاب میں دن بھر چھوٹی چھوٹی کشتیاں تیرا
کرتیں۔ یہی تالاب آہستہ آہستہ گاؤں کی تفریح کا مرکز
بنتا گیا۔ کچھ آبادی کھیتوں میں محنت و مزدوری کے لئے چلی
جاتی۔ کچھ گاؤں میں کام کاج کے لئے رہ جاتی۔ کچھ آبادی
پہاڑیوں پر چائے کے درختوں کے نیچے دکھائی دیتی۔ اور اس
آبادی کا ایک خاص حصّہ جس کا دل اِن میں سے کسی کام میں
نہ لگتا، وہ ان کشتیوں کی زینت بنتا تھا۔ یہ آبادی وہ تھی
جس کے حُسن کی خوش بو سے پورا گاؤں معطّر تھا۔ آبادی کے
اس طبقے کے پاس دِل تھا، دماغ تھا، پیغام تھا، خوشی تھی،
تبسّم تھا، نکھار تھا، نشتر تھے اور درد تھا۔ اور یہ طبقہ رفتہ
رفتہ اِس میدان میں اتنا بڑھتا گیا کہ اِن کی زندگی اور موت
اِسی ماحول کی ترجمان بن گئی۔

---

میرے ساتھ تین دن پہلے کیا ہوا؟ جو اس گاؤں
میں پچھلے بیس سالوں سے ہوتا چلا آرہا تھا۔ جب اِس گاؤں
میں کسی نوجوان جوڑے کی شادی طے ہوتی تو اس موقعے پر
بڑا جشن منایا جاتا۔ لڑکی والوں کی طرف کوئی بہترین گانے
والی کنواری منتخب کی جاتی اور لڑکے والوں کی طرف سے
ایک اور اچھی گانے والی ایسی عورت جس کی شادی کو ایک
سال سے زیادہ نہ گذرا ہو۔ عام طور پر یہ جشن کسی پیر کے دن
سورج چھپنے سے پہلے اِسی تالاب کے کنارے منعقد کیا جاتا تھا
اِس جشن میں گاؤں کی جوان آبادی شرکت کرتی ——
اور پھر دونوں مِل کر کوئی رومانی نغمہ چھیڑتیں، جس میں ایسے
مِلے جُلے جذبات کی ترجمانی ہوتی۔ کنواری لڑکی کے کلام میں
شوق، اُمید اور محبت کی جلن ہوتی۔ اور عورت گفتگو میں
شوق اُمید اور محبت کے تجربات یعنی لڑکی کے جذبات
مثل سوال کے ہوتے۔ اور عورت اُن سوالات کے جوابات
اپنے تجربات کی روشنی میں دیتی۔ اِس موقعے پر میرے لئے
جو جشن منعقد کیا گیا وہ کتنا حسین تھا۔ اور نغمہ بھی کتنا دلفریب
اور جاں نواز تھا!

---

سورج ڈوبنے سے پہلے یہ رسم ختم ہوجاتی۔ اور پوری
آبادی قہقہوں کے سایہ میں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتی۔
اس جشن سے شادی ہونے والی لڑکی اور لڑکے کے جذبات
میں شدت پیدا ہوتی اور اس کے لئے چار دن کی مدّت دی
جاتی۔ اور اس مدّت میں یہ اندازہ لگایا جاتا کہ دونوں کے
جذبات کیا ہیں۔ عام طور پر یہ دن بہت بے چینی کے ہوتے
اُن کا سفینۂ شوق گہرے فراق کے طوفان میں ہچکولے کھایا
کرتا۔ اور دونوں کی آنکھوں میں ہر وقت نمی دیکھی جاتی۔
پانچویں دن ایک میلہ سا لگتا۔ اُس میں بڑی سجاوٹ
ہوتی —— گاؤں کی بیش تر آبادی اچھے لباس پہن کر اُس
میلے میں آتی، بڑی سج دھج کے ساتھ۔ اُس میلے کا انتظام
ہونے والے شوہر کے ذمّہ ہوتا۔ اور اُس میلے کا مقصد یہ ہوتا
کہ دولھا ہر طریقے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ اُسے
زندگی سے کتنی محبت ہے۔ وہ چھوٹی سجاوٹ، سلیقہ اور خوشی
کا دلدادہ ہے۔ اور وہ شادی ہونے کے بعد اپنی چھوٹی سی
دنیا کو خوشی، محبت اور سلیقے کی جنّت بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔
لڑکی اُس میلے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ آتی۔ اور اپنے
ہونے والے شوہر کے حُسنِ انتظام کو بہت غور سے دیکھتی۔ اُس
کی نظر ہوتی۔ ہونے والے شوہر کی پسند ہوتی۔ ماحول
بے حد پُرکشش ہوتا۔ دل میں جذبات کا ایک طوفان ہوتا۔
ہونے والے شوہر کی موجودگی کا احساس ہوتا۔ جوانی کا تقاضا
دل کے دباؤ سے مجبور ہوکر وہ نغمہ چھیڑ دیتی۔ جس کے جذبات
یہ ہوتے کہ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنے گھر کو بھی تمہاری اِس
جنّت کی طرح سجاؤں گی۔ تمہاری پسند کو اپنی پسند سمجھوں گی
تمہارے عشق سے ہمیشہ سرشار رہوں گی۔ میں وعدہ کرتی
ہوں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں قسم کھاتی ہوں آم کے اِن گھنے د
کی، اس خوش نما چشمے کی، اِن حسین پہاڑیوں کی۔ میں اِن
سب سے بے پناہ محبّت کرتی ہوں۔ مجھے وہ نغمہ کتنی اچھی
طرح یاد ہے، جس میں سانسوں کی دھمک اور لاشعور

زیر و بم کس قدر عمیق تھا۔

---

اس کے بعد اُس کی آنکھوں میں اچھوتے موتیوں کی آب دار لڑیوں کی طرح آنسو جھلملانے لگتے۔ یہ میلہ سہ پہر سے شروع ہوتا۔ اور جب آفتاب حسین پہاڑیوں کے پیچھے جاتا، تب ختم ہوتا۔

پھر ایک دن کا وقفہ ہوتا۔

یہ دن دونوں کے لئے بے حد سخت ہوتا۔ دونوں طرف آرزوؤں کا ایک ہجوم، کشمکش، الجھن، شدید فراق — رات آتی تو رنج و غم کی رات بن کر۔ لیکن اُس کی تاریکیوں میں صبحِ وصال کا پیغام ہوتا۔ دوسرے دن صبح ہر شخص نئی امنگ کے ساتھ جاگتا۔ اُس دن گاؤں کی پوری آبادی گاؤں میں موجود ہوتی۔ آج کوئی اپنے کھیتوں پر نہ جاتا۔ اور نہ کوئی اور کاروبار کرتا۔ نہ چائے کے درخت آج اُن کی روزی کا ذریعہ بنتے۔ اُن کا دل تو صرف اس خوشی سے معمور ہوتا کہ آج جذباتِ حسن کی دو لہریں ہمیشہ کے لئے مل جائیں گی۔ اُن کے ملاپ کی خوشی میں آج ہر شخص سراپا مسرت نظر آتا۔ دن بھر خوشیاں منائی جاتیں۔ یہاں تک کہ جب دن ڈھلنے لگتا، تو تمام آبادی چشمے کی طرف روانہ ہو جاتی۔ اس خوشی کا شامیانہ آم کا گھنا درخت بنایا جاتا۔ خوشنما چشمے سے رنگ و نکہت کی موجیں اُٹھتیں۔ حسین پہاڑیاں بلا فردوس بن جاتیں۔ اور پورا میدان بہشتِ بریں کا [illegible] معلوم ہوتا۔ ماہ و انجم کی قندیلوں کے علاوہ کچھ اور مشعلیں بھی ساتھ ہوتیں۔ اور تو رکی کچھ خاص شعاعیں [illegible]ن کی جوان اور حسین آبادی سے برآمد ہوتیں۔ اس [illegible]قع پر چشمے پر لاکھوں پھول برسائے جاتے۔ یہاں تک [illegible] پانی کی سطح پھولوں کی سیج معلوم ہوتی۔ گلشن کا نکھار [illegible] لاس کا کنول ہو جاتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بیلے کا ایک خوشبودار اور مدنی ہار دلہن [illegible] ہاتھ میں، اور چنبیلی کا ایک ہلکا اور نازک ہار دولہا کے ہاتھ [illegible]یں، دو حسین کنواری لڑکیاں گانا گاتا گا کر پیش کرتیں۔

دلہن والی کہتی ——

"یہ ہار نہیں، آفتاب کی کرنوں سے چھنا ہوا نور ہے۔ یوں گوندھا گیا ہے، جیسے محبوب کی بکھری اور اُلجھی ہوئی زلفیں سنواری جاتی ہیں!"

دُولھا والی کہتی ——

"میرے ہار میں ماہتاب کی ٹھنڈی چاندنی میں آسمانی تارے ٹانکے گئے ہیں۔ اس ہار کا رنگ روپ بناوٹی جھوٹا نہیں ہے۔ اس میں کہکشاں کا نور چھپا ہوا ہے"

اب کہاں ہیں وہ زمان و مکاں، کہاں ہے میکدے میں وہ پیمانوں کی کھنک، نغمہ کی بلند آواز اب کہاں ہے —؟ محض ایک تصور باقی ہے۔ کیسے یقین کروں کہ اِن کانوں نے یہ نغمہ بھی سنا تھا۔

---

گانا ختم کرنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ جاتی تھیں۔ اور دُولھا دُلھن آگے بڑھنے لگتے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں عین آم کے گھنے درخت کے نیچے ایک دوسرے کے قریب آجاتے۔ سب سے پہلے، لڑکی شرماتی، لجاتی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بیلے کا ہار محبوب کے گلے میں ڈال دیتی۔ اور سر جھکا کر کھڑی رہتی۔ یہاں تک کہ دُولھا دُولھن کے جھکے ہوئے سر کے قریب چنبیلی کا نازک ہار لے جاتا اور حسین پہاڑیوں کی طرف سر اُٹھا کر کہتا۔ اور تمام آبادی اِن جملوں کو بغور سُنتی۔ جیسے اُن کے ملاپ کا تمام دار و مدار انہی جملوں پر ہے۔

"میں حُسن کے دیوتا کے حضور سر جُھکاتا ہوں۔ اے حسن کے دیوتا! میری زندگی تیرے حوالے۔ یہ جمالِ حسن جسے تو میرے حوالے کر رہا ہے، میرے لئے تیری مقدس امانت ہے۔ جس کی میں قدر کروں گا۔ جس کی میں حفاظت کروں گا۔ اور جس کا میں کفیل ہوں گا۔ یقین رکھو! تیرے حُسن کی قسم کھاتا ہوں۔ ہمیشہ اِس شمعِ حسن کا پروانہ بن کر رہوں گا۔ اگر میں تیری اِس مقدس امانت کا کسی وقت بھی مستحق ثابت نہ ہوں تو یہ آم کا درخت، یہ چشمہ، یہ پہاڑیاں، اِن کو تو حکم دے کہ مجھے اس امانت سے جُدا کر دیں، یا یہ حسین تصویر مجھ سے

جُدا کر دی جائے۔ مجھے قطعی انکار نہ ہوگا۔ لیکن میری تجھ سے یہ التجا ہے کہ جب یہ امانت مجھ سے جُدا کی جائے تو میری زندگی میں اِس کا غم اِس حد تک تحلیل ہو جائے کہ میں اپنی دنیائے عشق کی دھڑکنیں سُنوں اور کچھ نہ کہہ سکوں۔ اِسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھوں اور چھُو نہ سکوں۔ اور ——— اور اِس کی حقیقت ایک سایہ سے زیادہ نہ ہو۔ اے حُسن کے دیوتا! اے حسین پہاڑیوں کے مکیں! اے مرکزِ حُسن، مجھے سہارا دے۔“

یہ کہہ کر ہار دُولہن کے گلے میں ڈال دیتا۔ اور تمام آبادی کو یوں محسوس ہوتا کہ آم کے گھنے درخت، خوشنما چشمے، اور حسین پہاڑیوں پر لاکھوں چراغ ایک ——— بار جل اُٹھے ———

آفتاب سے بھی زیادہ روشن!
چاند سے بھی زیادہ چمک دار!!
اور تعداد میں ستاروں سے زیادہ!!!

یہ چراغ حُسن تھے ——— یہ چراغِ مُحبّت تھے ——— یہ خالقِ حُسن کے وہ شمع تھے جس کے نُور سے ہر خانۂ دِل میں روشنی ہے۔ یہی لذّتِ آغاز ہے، اور یہی لُطفِ انجام۔ یہی وہ نورِ محبت تھا۔ یہی وہ شعاعِ عشق تھی۔ جس پر انسانیت کی بنیاد رکھی گئی ———!

لیکن افسوس! تین دن میں گاؤں کی دنیا ہی بدل گئی۔ سازِ حُسن ٹوٹ گیا۔ پرستارِ حُسن سوگ نشین ہو گیا۔ جس گاؤں میں اَچھُوتے موتیوں کی آب دار لڑیوں کی طرح تبسّم ہی تبسّم جھلملا تا تھا۔ آج وہاں اُداسی ، ہر طرف ہر درجہ کی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

یہ سایہ جو میرے سامنے تھا، کچھ اور نہ تھا۔ میری مقدّس امانت کا سایہ تھا۔ مجھ پر بربادیوں کی گھٹا جھوم رہی تھی۔ میری پوری زندگی کا سرمایہ ——— اب یہ سایہ تھا۔ جس کا فراق میری بقیہ زندگی کا عنوان بنا ہوا تھا ———!

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟!؟ اس لئے کہ میں اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا ——— میں نے گاؤں کی معصوم آبادی سے بغاوت کی۔ اُن کی سجی سجائی جنّت میں آگ لگا دی۔ اُن کا آرام چھین لیا۔ میں نے صرف اپنے گلشن ہی کو برباد نہ کیا تھا، بلکہ گاؤں کی بہشت کو اپنے قدموں سے روند ڈالا تھا۔

——— یہ سایہ تھا کہ خود میری محبوبہ تھی ———

جس کا مسکن اب آم کا گھنا درخت تھا۔ چشمہ کا تقدّس تھا۔ اور حسین پہاڑیوں کا گہوارہ تھا ——— اُف! صرف تین دن میں میرے بیلے اور چنبیلی کے پھول مُرجھا گئے تھے۔ چشمے کی سیج اُجڑ گئی تھی!

سایہ اب بھی متحرک تھا۔

اور اُس کے معصوم لبوں سے یہ جملے نکل رہے تھے۔

”اے حسین مقدّس پہاڑیو! تم گواہ ہو۔ میں باغی نہیں ——— میں ظالم نہیں ——— میں مجرم نہیں ——— میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ———

میرا محبوب ایک تیر سے دو معصوم ہرنیوں کو ہلاک کرنا چاہتا تھا ——— حُسن کی دو شمعیں ایک دل میں روشن نہیں ہو سکتیں ——— وہ گاؤں کی ایک اور کنواری لڑکی سے پیار کرتا تھا۔ اس لئے میں حسین پہاڑیوں کی ایک ڈھلان پر لیٹ گئی۔ اور چشمہ کی گہرائیوں نے مجھے ہمیشہ کے لئے قبول کر لیا ———“

سایہ کے عارض پر گلاب کا رنگ اب تک جھلملا رہا تھا۔

شاید حیا کی کچھ سُرخی اب بھی باقی تھی ———!

---

(بقیہ تو نہیں اور سہی)

”تم نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی“

نسرین آج بھی اس کی پوجا میں لگی ہوئی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ محبت زندگی میں ایک بار ہوتی ہے۔ اور صرف ایک ذات سے ہوتی ہے ——— خالد کی محبت ہوس ہے۔ اور نسرین کی محبت، محبت ہے اور کچھ نہیں۔

# ادھ کھلے پھول ـــــــــــ جنھیں آبیاری کی ضرورت ہے

انا

سرگرداں دہلوی

اس کالم میں ـــــــ اُن نئے لکھنے والوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جو باوجود اپنی بھرپور ادبی، علمی صلاحیت اور قابلیت کے گمنامی میں پڑے ہیں۔ یا بے توجہی کا شکار ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں آپ ـــــــ رشید الوحیدی صاحب جامعی متعلم ایم۔ اے فائنل۔ دہلی یونیورسٹی سے متعارف ہو رہے ہیں۔

ادارہ

خالقِ کائنات نے تخلیق اور تکمیلِ کائنات کے موقع پر ہر چیز تقسیم کی۔ حسن، شرافت، سلیقہ، خوب صورتی، بدصورتی، علم، جہل، عقل اور بدذوقی ـــــ غرض تمام چیزیں حسبِ حال اور حسبِ حیثیت تقسیم کی جا رہی تھیں ـــــ تقسیم کا طریقہ کار یہ تھا کہ ہر چیز (صفت) کا پیکر بنایا گیا تھا اور بہت بڑے بڑے ڈراموں میں انھیں رکھ دیا گیا تھا۔ مثلاً کسی کو زیادہ خوب صورت بنانا ہے تو اُسے زیادہ دیر تک حسن کے ڈرام میں ڈبویا گیا۔ اگر کسی کو ذوق کے جامے سے نوازنا ہے تو اُسی ڈرام میں زیادہ دیر تک رکھا جاتا۔

عرش پر اچانک ایک کھلبلی مچ گئی۔ کیوں کہ وہاں سے ایک پتلا اپنی جگہ سے غائب پایا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد جب دیکھا تو وہ پتلا ظرافت و مزاح کے ڈرام میں غوطہ زن تھا۔ آدم کو گندم کھانے پر دنیا بھیج دیا گیا تھا۔ لیکن جناب کو بغیر اجازت جگہ چھوڑنے پر دنیا بھیج دیا گیا۔

ایک نہایت گھنے اور بڑے آم کے درخت کے نیچے آپ نے قدم رنجہ فرمایا۔ بعد اور مقام معلوم کیا تو بتایا گیا کہ "فیض آباد" ہے۔ آنکھ کھولی تو چاروں طرف گھپ اندھیرا نظر آئے۔ ہر طاق میں تعلیم اور علم کا چراغ روشن تھا۔ اسی کی روشنی سے اپنی آنکھوں کو منور کرتے رہے۔ جب تک وہاں رہے تو صرف رشید کے نام سے پکارے جاتے رہے۔ لیکن جب اپنی آمد سے دار العلوم دیو بند کو نوازا تو رشید الوحیدی ہو گئے۔ ـــــــ اور جب دار العلوم نے آپ کو نوازا تو سیدھے سعودی عرب پہنچ گئے۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد ہی انھیں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ "دور کے ڈھول سہانے معلوم ہوتے ہیں"

بالآخر اس نگری میں آئے جسے جامعہ نگر کہا جاتا ہے یہاں آکر تعلیم پر ہمہ تن اور دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ لیکن بنیادی روش کو مضبوطی سے پکڑے رہے۔ یعنی وہی چال، ڈھال، لباس، وہی دامن و قبا، چہرہ اسلام کی بنیادی علامت کے ساتھ ملفوف نظر آتا ہے۔ بدن پر شیروانی جو سنجیدگی اور وقار کے طور پر ازل سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور ان تمام باتوں کے علاوہ ایک خاص چیز ہے جو انسان ایک مقام پر آکر چھوڑ دیتا ہے ـــــ اور وہ مقام ہے جب انسان کے قدم ازدواجی زندگی کی طلائی زنجیروں سے بوجھل ہو چکے ہوں۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اس ازدواجی زندگی کا ایک اہم جز یعنی اولاد کا وجود پذیر ہو جاتا ـــــ تو بھئی جناب! آپ کے قدموں میں رفتارِ حیات کا سر نیاز خم ہے۔ اس لئے ذرا سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتے ہیں۔ کیوں کہ میرے ادارہ ورثہ کا بوجھ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ایسی صورت میں انسان تو کیا فرشتے بھی اپنے پائے استقلال میں لغزش سی محسوس کرنے لگے۔ لیکن آپ ہیں کہ صرف چند بس ایک وہ یہ کہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہوں گا؟ اور اپنی ضد پر قائل رہوں گا۔ یہ تقدیر ہے کہ آج آپ ایم اے کے آخری سال کے آخری دورے گذر رہے ہیں۔

قدرت نے انھیں لغت پر بے پناہ عبور حاصل کرنے کی
[illegible]فت دی ہے۔ ابہام و تفہیم کا عنصر بھی آپ کی ذات میں کافی
[illegible]ا رکھتا ہے۔ نثر اور نظم دونوں میدانوں میں شہ سواری کا عزم
[illegible] ہوتے ہیں۔ اور یہ تمام چیزیں ان کو ایک کروٹ چین نہیں
[illegible]نے دیتیں۔ اسی لئے امید کی جاتی ہے کہ اردو ادب کے لئے
[illegible]ستقبل قریب میں ایک عظیم ستون ثابت ہوں گے
اس بار آپ ان کی ایک برجستہ نظم ملاحظہ فرما رہے
[illegible]یں۔ جس سے ان کی تصویر کا ایک رخ ہی اُجاگر ہوگا۔

عنقریب ہی آپ ان کی وہ فطری جبلت بھی دیکھیں گے۔ جو
انھیں ہر ماحول اور ہر طبقہ میں قبول عام کا شرف بخشتی ہے۔
ان کی مختصر جامع تعریف شاید اس طرح ممکن ہے۔
"شکل و حلیہ سے تو کوئی شیخ معلوم ہوتے ہیں لیکن دل
کسی رند سے کم نہیں"
ان سے ملاقات کے بعد ہر آدمی یہی کہتا نظر آتا ہے کہ۔
"اک روز کے ملنے پر احساس یہ ہوتا ہے
جس طرح کہ ان سے ہو برسوں کی شناسائی"

■■

رشید الوحیدی۔ جامعی۔ بی۔ اے

ایک فنکار کی تخلیق حسیں شاہجہاں　　جملہ آدابِ صحافت کا امیں شاہجہاں
اس کی بھی سیر کرو چاند پہ جانے والو　　فرشِ خاکی پہ ہے یہ عرشِ بریں شاہجہاں

حوصلہ مند جوانوں کے ارادے ہیں اٹل　　روپ میں شاہجہاں کے ہے حسیں تاج محل
فکر و احساس کے ظلمت کدۂ ویراں میں　　ہے یہ تنویرِ ضیا بار کی زریں مشعل

بادِ صرصر کے تھپیڑوں سے بچانا ہے اسے　　غنچۂ مہر و محبت سے سجانا ہے اسے
اے جواں بخت و جواں سال انیس اور عتیق　　قلبِ جمہور کی آواز بنانا ہے اسے

فکرِ صادق، دلِ پُر درد یقیں مستحکم　　تپشِ گرمیٔ احساس تمہارا ہمدم
ہم نے دیکھا ہے کہ تاریخ کا رُخ موڑ دیا　　جب بھی حالات سے اُلجھا ہے صحافی کا قلم

یوں تو جس صنف میں تم چاہو بڑا نام کرو　　مشورہ مان لو میرا بس اِک کام کرو
آدمیت ابھی محتاجِ تعارف ہے انیس　　تم زمانے میں یہی جنسِ گراں عام کرو

فکر الفاظ میں ڈھل کر جو قلم تک آئے　　اُن پہ پابندیٔ افکار نہ لگنے پائے
بک نہ جانا کہیں زردار کے ہاتھوں اے دوست　　دیکھ ناموسِ قلم پر نہ کوئی آنچ آئے

حسنِ معنیٰ کا یہ گنجینۂ گوہر کہیے　　اس صحیفہ کو محبت کا پیمبر کہیے
فکرِ درماندہ کہاں تک کرے تعریف رشید　　بس اِسے مانی و بہزاد کا ہمسر کہیے

ع ۔ صدیقی بی ۔ اے

شاہجہاں کے گزشتہ شمارے میں اس مضمون کا پہلا حصّہ "دودھ کا دودھ"......"شائع ہوا تھا ــــــ اس میں مضمون نگار نے ایوننگ کلاسز کے طلبا ر کی زندگی کی عکاسی کی تھی ۔ زیرِ نظر مضمون میں مارننگ شفٹ کے طلبار کی زندگی وافکار کی ترجمانی کی گئی ہے ــــــ دراصل یہ پورا مضمون "دودھ کا دودھ پانی کا پانی" ایوننگ اور مارننگ کے طلبہ کے ایک دوسرے کے بارے میں نظریات وخیالات کا پوسٹ مارٹم ہے جو مزاحیہ اور طنزیہ روپ میں پیش کیا گیا ہے ۔

"سنیے ــــــ !" کلاس ختم ہوتے ہی اپنے حواس مجتمع کرکے ہم نے اپنی ہی ہم کلاس ایک محترمہ کو مخاطب کیا ۔ اور دل ہی دل میں ایک گھنٹہ پہلے سے رٹے ہوئے فقرے کو دہرایا: "مجھے کل کلاس میں یہ پین پڑا ملا تھا ۔ سنا ہے آپ کا بھی پین کھو گیا ہے ــــــ کہیں یہ آپ ہی کا تو نہیں ــــــ؟" اور ہم نے کل محترمہ کے ڈیسک کے نیچے سے اٹھائے ..... نہیں ، چرائے ــــ پین کو جیب سے نکال کر ہاتھ میں دبا لیا ــــــ پین ہم نے کسی بری نیت سے نہیں چرایا تھا ، یا اس کو ذاتی مصرف میں لانا مقصود نہیں تھا ۔ کیوں کہ ہمارے قیمتی پارکر کے آگے ایک روپیہ پچیس پیسے والے اس پین کی وہی حیثیت تھی جو کناٹ پلیس میں ایوننگ نیوز (Evening News) بیچتی ہوئی غلیظ اور پھٹے پرانے کپڑوں سے کالے ہم کو نیے چارن کی ایک "الٹرا ماڈرن گرل" کے سامنے ہوتی ہے ۔ آدم کے بیٹے حوّا کی اس بیٹی سے اخبار لیتے ہوئے بھی ہچکچاتے ۔ لیکن اس کی دوسری بہن کی نظرِ التفات کے مشتاق رہتے ہیں ۔ ــ تو صاحب ہم سماج سے بغاوت کرکے کیوں اپنے قیمتی پین پر معمولی نوعیت والے پین کو ترجیح دیتے ہم نے محترمہ کے ڈیسک کے نیچے سے پین اس لئے اٹھایا تھا کہ کل جب ہم ان کو یہ پین پیش کریں گے تو یہ ہماری ممنون ہوں گی ۔ اور ہم انکساری کا دامن تھامے ہوئے ان سے کہیں گے ــــــ

"کوئی بات نہیں ، یہ تو ہمارا فرض تھا" ــــــ اور پھر اس کے بعد ــــــ اس کے بعد ہمارا پرانا خواب پورا ہو جائے گا ۔ خواب جو ہم پچھلے گیارہ برسوں سے دیکھ رہے ہیں ــــــ خواب جو ایک کالج والے سوتے جاگتے بدستور دیکھتا رہتا ہے ۔ کہ وہ بھی کسی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو کر کامیاب یا ناکام عاشقوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرالے اور وقت حساب مجنوں اور فرہاد کی صف میں کھڑا ہونے کا فخر حاصل کرکے اپنی خوش قسمتی پر ناز کر سکے ۔

کالج کی زندگی اختیار کرنے سے قبل اسکول کے زمانے میں تو چونکہ اس کو اپنے اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے اتنے ہی آثار نظر آتے ہیں جتنے کہ کالج کے دو تین ہزار طالب علموں میں سے کسی ایک طالب علم کے مل جانے یا "طالبِ شیریں" اور "طالبِ لیلے" کے نہ ملنے کے ــــــ اس لئے کالج میں آنے سے پہلے گیارہ یا اس سے زیادہ سال جو وہ دو یا تین اسکولوں میں گذارتا ہے ، گیارہ سال کی جیل کاٹنے کے مترادف سمجھتا ہے ۔ ــــــ پھر کالج میں داخل ہونے پر جیسے اس کی پرسکوت زندگی متحرک ہو جاتی ہے ــــــ جیسے وہ زندگی کے معنی سمجھنے لگتا ہے ــــــ پھر وہ اس نئے ماحول میں خود کو مدغم کرنے کے لئے پڑھائی کی طرف کم اور خود نمائی کی جانب زیادہ توجہ دیتا ہے ۔ اور اپنے پرانے کپڑوں کو خصوصاً پتلونوں کو ڈھیلا پاجامہ ثابت کرکے طلاق ابدی

دے دیتا ہے۔ اور نئے لباس میں اپنی اس زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ جو اس کے لئے تاحیات یادگار رہے۔ اور جس زندگی کے رنگین ہونے کے بارے میں وہ اسکول میں اپنے ساتھیوں سے بیشتر قصے سن چکا ہوتا ہے ——— ان قصوں کو سن کر اس کے ذہن میں آئندہ زندگی کا ایک خاکہ ابھرتا ہے اور پھر دن رات اسی رنگین زندگی کے خواب دیکھنے میں مصروف رہتا ہے ——— جب ہم اسکول میں زیر تعلیم تھے تو ہماری کلاس ایسے کمرے میں واقع تھی جس کی چند کھڑکیاں کالج میں کھلتی تھیں۔ ہم ان سے کالج کے طلبہ وطالبات کو ایک ساتھ گھومتا دیکھتے اور سوچتے کہ یہ سب اس طرح گھوم کر گویا ہمارے ساتھیوں کے سنائے ہوئے قصوں کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کر رہے ہیں ——— اور اس وقت ہم اپنے آپ کو اس قیدی پرندے کی طرح محسوس کرتے جس کا قفس گلشن میں رکھ دیا گیا ہو۔

خدا خدا کر کے ہمارے وہ دن پورے ہوگئے اور ہم کالج میں آگئے ——— اب ہماری پُرسکوت زندگی میں تلاطم پیدا ہوگیا۔ اور ہم رات دن اپنے خواب کو پورا کرنے کی تدابیر پر فکر کرنے میں مصروف رہتے ——— اور بالآخر ہم نے ایک اسکیم بنائی اور اس پر عمل کرتے ہوئے محترمہ کے ڈیسک کے نیچے سے یہ پین اٹھا لیا تھا اور اب اس کو واپس کر کے ان کے شکریئے کے منتظر تھے۔

"ذرا سنئے ——— !" ہم نے محترمہ کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر ذرا تیز آواز میں دوبارہ پکارا۔ اور اس بار ہماری آواز نے اُن کے بالوں سے چھپے کانوں میں داخل ہو کر ان کی قوتِ سماعت کو بیدار کر دیا ——— وہ "اباؤٹ ٹرن" ہو گئیں۔

"جی ——— فرمائیے ——— ؟" ہم اُن کو خود سے مخاطب دیکھ کر ایک گھنٹے پہلے سے رٹا ہوا جملہ بھول گئے۔ اور گھبراہٹ اور پریشانی کے ملے جلے عالم میں اُن سے گویا ہوئے۔

"وہ آپ ...... کا ...... یہ ...... پین ...... کل ...... مجھے ...... کلاس ...... میں ...... پڑا ...... ملا ...... تھا۔"

"اوہ ...... جی، شکریہ ———" کہہ کر وہ ہمارے ہاتھ سے پین چھین کر چلی گئیں ——— اور ہم اپنی پہلی منزل پر قدر ے کامیابی پر پھولے نہیں سمائے۔

اُس کے بعد ہم محترمہ سے قصداً بات بے بات گفتگو کرتے ——— اور کلاس میں ہمیشہ ان کے ساتھ ہی بیٹھتے۔ اور کلاس کے باہر اکثر اُن کے آگے پیچھے ہی رہنے کی کوشش کرتے ——— ہمارا یہ حال دیکھ کر ہمارے ساتھیوں نے ہمارا نام محترمہ کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا۔ ہم سمجھنے لگے کہ بس اب ہمارا خواب زیادہ دن خواب نہ رہ کر جلد ہی حقیقت کا روپ دھار لے گا ——— لیکن ہمارا یہ خیال صرف خیال ہی رہتا، اگر ہماری کئی راتوں کی ستارہ شماری اور نیند کا رقیبانہ رویہ جو اُس نے ہمارے دل و دماغ پر محترمہ کو مسلط دیکھ کر اختیار کیا۔ ہمارے اس وہم کو قوتِ اعتماد نہ بخش دیتا ——— اب ہم کو یقین کامل ہوگیا تھا۔ محترمہ اور ہم محبت کی رسّی میں جکڑ چکے ہیں۔

سال پر لگا کر اُڑ گیا۔ اور امتحان جیسے سال کے ختم ہونے کا منتظر تھا۔ اس امتحان کی وجہ سے کالج کا رنگین ماحول یکدم بے حد سنجیدہ ہوگیا۔ ہر ایک کے چہرے پر امتحان کا خوف طاری تھا ——— دیکھنے والے اُن کے خوف زدہ چہروں میں آسانی سے وہ خوف اور ڈر دیکھ سکتے تھے جو قصائی کی چھری کے سامنے ذبح ہونے والے بکرے کے چہرے پر عیاں ہوتا ہے ——— ہماری محترمہ بھی کچھ خائف سی نظر آرہی تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ فیل ہونے کا ڈر ہے۔ ہمارے پاس کچھ نایاب کتابیں تھیں۔ ہم نے محترمہ کے دل میں مزید ہمدردی یا محبت پیدا کرنے کے لئے یہ موقع غنیمت جانا اور وہ کتابیں ان کو دیدیں۔ اس کے علاوہ امتحان میں تیاری کی حسب استطاعت مدد کا وعدہ کر کے ہم نے ان کو نا امیدی کے عمیق گڑھے سے باہر نکالا وہ خوشی سے پھولی نہیں سمائیں۔ اور ہم خود کو منزل پر محسوس کرنے لگے۔

امتحان شروع ہوئے۔ پہلا پرچہ نہایت آسان تھا۔ بہت عمدہ ہوا۔ پرچے کے اختتام پر جب محترمہ سے ملاقات ہوئی تو ان کا چہرہ اُترا اُترا سا تھا۔ اور وہ بہت ہی نا امید سی نظر آرہی تھیں ——— پوچھنے پر بتایا کہ پرچہ ایک دم بکواس ہوا ہے۔ پاسنگ مارکس (Passing marks) کی بھی توقع نہیں ہے۔ ہم نے دلاسا دیا کہ بعد میں (Make up) میک اپ کر لینا ——— لیکن جیسے انھوں نے پرچہ اچھا نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ ہر پرچے کے بعد یہی ماتم [illegible] ——— پرچہ اچھا نہیں ہوا ———

Passing Marks بھی نہیں آئیں گے۔ ہم زور زور سے
اسی قسم کے جملے سنتے۔ ڈھارس بندھاتے اور اگلے پرچے میں زیادہ
محنت کرنے کو کہتے۔ اور چلے آتے۔ مگر اگلے دن پھر وہی جملہ، وہی
ناامیدی۔ اسی طرح دن گذرتے رہے۔ پرچے ہوتے رہے۔ یہاں
تک کہ صرف تین پرچے باقی رہ گئے۔

اسی دوران ایک رات جب ہم اپنے نرم نرم بستر پر پڑے
نیند کا انتظار کر رہے تھے تو ایک خیال چپکے سے ہمارے دل میں داخل
ہوا۔ اور پھر دماغ پر چھا گیا۔ اور ہم سوچنے لگے ـــــ محترمہ
کے موجودہ حالات سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کا پاس ہونا ناممکن
ہے۔ اور ہمیں فیل ہونے کا قطعاً خدشہ نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ
محترمہ فیل ہو گئیں اور ہم پاس ہو گئے تو پھر کیا ہو گا۔ کیا ہم ایک ـــ
سال کی محنت کو جو ہم نے اپنے خواب کو پورا کرنے کے لئے کی ہے،
ایک دم ضائع کر دیں گے۔ کیا ہم محترمہ سے دوری اور جدائی برداشت
کر سکیں گے۔ اور کیا یہ ہمارے لئے قابلِ برداشت ہو گا کہ کوئی دوسرا
ان کے ساتھ ہو ـــــ نہیں! ہرگز نہیں!! یہ تمام باتیں ہمارے
لئے جان لیوا ثابت ہوں گی ـــــ پھر ہم کیا کر سکتے ہیں ـــ
"تم باقی پرچے نہ دے کر فیل ہو سکتے ہو" دل نے فوراً کہا۔ "مگر ہمارا
مستقبل۔؟" دماغ نے سوال کیا۔ اور دل فوراً بول اٹھا "کیا مستقبل
کی فکر صرف تم ہی کو ہے۔ کیا تم ان لوگوں کو نہیں جانتے جو محض اپنی
محبوبہ کی قربت حاصل کرنے کے لئے ایک سال کیا لگاتار کئی سال
پرچے چھوڑ کر ضائع کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح یونیورسٹی سے ملے
پانچوں چانس (Chance) استعمال کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی پاس
ہونے کے لئے پورے پرچے نہیں دیتے۔ وہ ایسا صرف اس لئے کرتے
ہیں کہ اُن کی محبوبہ جو اُن کے ساتھ یا پچھلی کلاس میں لگاتار فیل ہو رہی
ہیں۔ اُن کے ساتھ رہیں یا ہو جائیں ـــــ اُن میں جو ذرا عقل
مند ہوتے ہیں، وہ سرے سے امتحان میں نہیں بیٹھتے۔ کہتے ہیں کہ
اگر امتحان میں بیٹھ گئے تو ہمارا ایک چانس (Chance)
ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ اگلے سال کا انتظار کرتے ہیں۔ اور
اگلے سال وہ اس سے اگلے سال کا۔ اور اس دوران ان کے جونیئر
سینئر ہو جاتے ہیں۔ اور [illegible] ان کے استادوں کی جگہ لے لیتے
ہیں۔ مگر وہ وہی [illegible] رہتے ہیں۔

ـــ وہ لوگ اپنی محبوبہ کا ساتھ حاصل کرنے یا باقی رکھنے کے لئے
یہ سب کرتے ہیں۔ تو کیا تم صرف ایک سال کی بھی قربانی نہیں دے
سکتے۔ بولو کیا تم صرف ایک سال بھی قربان نہیں کر سکتے؟ ـــ
ہمارا دل زور زور سے چیخ رہا تھا۔ دماغ ہمارا رجحانِ دل کی جانب
دیکھ کر خاموش تھا ـــ بالکل خاموش ـــ

اور پھر ہم نے محترمہ کے ساتھ فیل ہونے کے لئے باقی
ماندہ پیپرز (Papers) نہ دینے کے فیصلے پر عمل کیا۔

امتحان ختم ہو گئے ـــ کچھ دن بعد جب ہم دوستوں
کے ہمراہ رزلٹ دیکھنے کالج جا رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار فیل
ہونے پر رنج و افسوس ہونے کے بجائے دل نہایت مطمئن و مسرور
تھا۔

کالج کے گیٹ پر ہی محترمہ سے ملاقات ہو گئی۔ اُن کا مغموم
و متفکر چہرہ فیل ہونے کی غمازی کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمارا دل خوشی
سے ناچنے کو چاہا۔ مگر موقع و محل دیکھ کر ہم نے یہ کام کسی اور مناسب
وقت کے لئے ملتوی کر دیا۔ ٹھیک سلیک کے بعد ان کے کچھ کہنے سے
پہلے ہم نے دلاسا دینا شروع کر دیا۔ "انسان مقدور بھر ہی کوشش
کر سکتا ہے۔ کامیابی یا ناکامی تو قسمت کے ہی ہاتھ ہے۔"
ع: گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں ـــــ جیسے ہمدردی
بھرے جملے بولتے ہوئے غیر ارادی طور پر کالج نوٹس بورڈ تک جا پہنچے۔
ـــ اچانک ہماری نظریں بورڈ پر لگے رزلٹ پر پڑیں اور وہاں محترمہ
کا رول نمبر دیکھ کر ہم اپنے پاؤں زمین میں دھنستے محسوس کرنے لگے۔
اور جب ہم نے محترمہ کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "یہ سب
آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ آپ کے دیئے ہوئے نوٹس (Notes)
اور دلاسے۔ نے ہی میری ہمت بندھائی تھی۔ ویسے مجھے آپ کے
فیل ہونے کا بہت افسوس ہے۔" یہ کہہ کر محترمہ دوسرے پاس ہونے
طلبہ کے گروپ میں شامل ہو کر خوش گپیوں میں مصروف ہو گئیں ـــ
اب اُن کے چہرے پر ملال یا افسوس کی رتی تک نہیں تھی۔ بلکہ اس کے
برعکس خوشی سے تمتما رہا تھا۔

یہ دیکھ کر ہم کو یوں محسوس ہوا جیسے ہمارا خواب صرف خواب ہی
رہنے کے لئے عالمِ وجود میں آیا ہے۔ اور اسی روپ میں اختتام پذیر ہو
یہ خواب کبھی حقیقت بن سکیگا۔ کیونکہ [illegible] حقیقت میں [illegible]

افسانہ

# تو نہیں اور سہی

سرگرداں دہلوی

## اُن کے نام ——— جو اس کے جیتے جاگتے کردار ہیں

لکھنؤ ایکسپریس تیزی سے رات کی تاریکی اور خاموش ماحول کو چیرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں بیٹھے تمام مسافر نیند کی مرمریں آغوش سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ مگر ان ہی مسافروں میں بیٹھا خالد خیالات کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔

لکھنؤ ایکسپریس جس تیز رفتاری سے چل رہی تھی اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے اس کے سامنے عہدِ رفتہ کے ایک ایک ورق الٹتے جا رہے تھے ——— آج دو سال بعد وہ اس نگری میں واپس جا رہا تھا، جہاں اس کی محبت بلکتی رہ گئی تھی ——— وقت برابر گردش کرتا رہتا ہے۔ اور اسے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ماضی میں کیا ہوا؟ اور مستقبل میں کیا ہوگا؟ وہ اپنی دھن میں مگن تمام حالات سے بے خبر اپنے آپ کو برابر معروفِ گردش رہتا ہے۔

اُس وقت وہ اُس حسین دور کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے عہدِ طفولیت کہا جاتا ہے۔ اس عمر میں بچے تمام افکار و آلام سے بے نیاز اپنی الگ دنیا بنائے رہتے ہیں۔ تمام بچے تو مختلف کھیلوں میں اپنا وقت صرف کرتے۔ لیکن خالد اور نسرین اس عمر میں بھی ایک دوسرے کے قریب رہ کر کچھ یک گونہ سکون حاصل کرتے۔

وہ نادانی میں ہی وہ کام کر رہے تھے، جسے ان کی محبت کی پہلی اینٹ کہا جا سکتا ہے ——— خالد اور نسرین خالہ زاد بہن بھائی تھے۔ اور ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ اور یہاں سازگار ماحول ان کی باہمی میل جول پر کوئی پابندی نہیں لگا سکا۔

سنِ شعور کو جب دونوں پہنچے تو تعلیم کے میدان میں بھی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دوش سے دوش اور قدم سے قدم ملائے جا رہے تھے۔ اور رابطہ تک اسی حالتِ بے خودی و بے خبری ہی میں پہنچ گئے۔

وہ ہمہ وقت مستقبل کے لئے خیالات کی بنیاد پر حسین محلات بنانے لگے تھے۔ لیکن اچانک ان کے شاندار محل کو جسے انھوں نے وصل کے لمحات میں تیار کیا تھا، گلچیں کی نظر لگ گئی۔ اور وہ ایکدم ریت کا ایک تودہ ثابت ہوا۔ یہ وقت جو کبھی دو دلوں کو یکجا نہیں دیکھ سکتا، کسی کے گلشنِ حیات میں ابدی بہار کا پیغامبر ہوتا ہے۔ اور کسی کے نصیب میں حرماں نصیبی کے سوائے کچھ نہیں ہوتا ——— اور اس ”وقت“ کا شکار خالد اور نسرین کو بھی ہونا پڑا۔

جو بظاہر ایک وقتی سا معلوم ہوتا تھا، برابر وقت کی دیواریں ان کے درمیان حائل ہوتی رہیں ——— حالات نے اُس کو لکھنؤ جانے پر مجبور کیا۔ جاتے وقت جب وہ اس سے الوداعی ملاقات کے لئے گیا ———

نسرین اس کے سامنے سراپا حُسن بنی کھڑی تھی، اس کی لانبی لانبی پلکیں اور ان پلکوں میں پوشیدہ چشمِ غزالہ اسے دعوتِ گناہ دے رہی تھیں۔ اس کے حسین بازو جیسے صندل کی نرم و نازک جھوتی ڈالیاں ہوں، جو کسی سے ہم آغوش ہونے کے لئے بے چین نظر آ رہی ہوں۔ شدتِ جذبات اس کی برداشت پر غالب آ گئی۔ اور وہ بے اختیار والہانہ انداز میں اس کی طرف لپکا، جہاں نسرین نے اس کا خودسپردگی کے عالم میں استقبال کیا۔ دونوں ہم آغوش ہوئے

تو ایک لمحہ کے لئے آسمان و زمین اپنی گردش بھول کر ان کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ اور خالد نے اس کے لب شیریں پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ اور اس طرح انھوں نے محبت کی فتح کا اعلان کیا۔ اور اس وقت انھیں اس بات کا بھی احساس نہ رہا کہ ان کے حسین اتصال میں کوئی حارج بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہی ہوا جس کا ایسے مواقع پر خدشہ رہتا ہے۔ نسرین کی ماں کسی کام سے اس کمرے میں آئیں۔ اور یہ دیکھ کر کہ حسن و عشق باہم یکجا مدہوشی کی حالت میں کھڑے ہیں، ان کی غصہ سے بھنویں تن گئیں، شدتِ جذبات پر خود غالب آگیا۔ نسرین بری طرح خوف سے کانپ رہی تھی۔ اور خالد جذبات اور غصہ کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہو رہا تھا۔ روانگی کے وقت وہ نسرین کے اوپر الوداعی اور حسرت بھری نظر ڈالنے کے علاوہ کوئی بات بھی نہ کر سکا۔

نسرین کی ماں مشرقی ماحول کی پروردہ تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانہ کی رفتار نے ان کے خیالات میں ایک حد تک تبدیلی کی تھی۔ اور کچھ باتوں کو انھوں نے جو مشرقیت کے خلاف تھیں بخوشی قبول کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مشرقیت کی بنیادی باتوں پر اپنا ایمان رکھتی تھیں۔ پھر اس صورت میں وہ کیسے یہ گوارا کرتیں کہ حسن و عشق شادی سے پہلے ہی ہم آغوش ہوں۔ یا ایسی کسی حرکت کے مرتکب ہوں جو اُن کے مشرقی ماحول پر کلنک کا ٹیکہ بن جائے اس لئے انھوں نے سختی سے باہمی ملاقات پر پابندی لگا دی۔ اور ساتھ ساتھ سرزنش کے طور پر اس کے نرم نرم گلاب سے رخسار پر ایک چپت بھی رسید کر دیا ——— اسے شاید ان کی محبت کی پہلی نشانی کہا جا سکتا ہے۔

لیکن محبت تو اتنی ہی زیادہ پھلتی پھولتی ہے جتنا کہ اس پر پابندی لگائی جائے۔ اس "وقت" نے جو دو سال سے خالد اور نسرین کے درمیان برابر فاصلہ بڑھائے جا رہا تھا، خالد کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کہیں نسرین جو اس وقت ایم۔ اے کے پہلے سال کی طالبہ تھی، جبکہ خالد حالات کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکا اور اسے سلسلۂ تعلیم کو یہیں منقطع کرنا پڑا جہاں سے اس کے سفر کا آغاز ہوا تھا ———
وہ سوچتا رہا کہ کہیں نسرین اسے صرف اس وجہ سے نہ ٹھکرا دے کہ آج اس کے اور نسرین کے درمیان تعلیم کا بہت فرق ہو گیا تھا۔ یا وہ اسے اپنے قابل ہی نہ سمجھے ———
تمام رات وہ انھی خیالات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرا۔ اس کا بس چلتا تو فوراً پر لگا کر اپنے آشیانہ پہ پہنچ جاتا۔
گھر پہنچا اور فوراً ہی اپنی معصوم اور پاکیزہ محبت کی دیوی کو ایک نظر دیکھنے چلا گیا۔

نسرین نے جو اپنے محبوب کو اپنے سامنے کھڑا پایا تو اسے ایک دفعہ اپنی بصارت پر شک ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ کہیں یہ محض خواب تو نہیں۔ لیکن حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔ اسے کتنا جھٹلایئے پر حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اچھی طرح دیکھنے کے بعد اسے یقین آیا کہ اس کا محبوب ہی کھڑا ہے۔ وہ مسرت سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اور اسے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ خالد ابھی تک کھڑا ہے۔ اور اس نے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ اور وہ اس وقت جاگی جب کہ اس کی ماں نے خالد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ "ارے! تم کھڑے کیوں ہو؟ اس نسرین سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی کو بیٹھنے کے لئے کہہ دے۔" نسرین کی ماں اس سے لکھنؤ کے حالات، اس کی مصروفیات اور مشغولیات کے متعلق سوال کرتی رہیں اور وہ صرف ہاں، نا میں جواب دیتا رہا۔

نسرین نے چائے کی ٹرے لا کر رکھی۔ آج اس کی آنکھوں میں محبت اور خوشی کے ساتھ خوف بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کے لئے بے چین ہو گیا۔ ایک دم اس کے ذہن میں آیا کہ کہیں نسرین پر پابندی نہ لگا دی گئی ہو۔ لیکن اچانک اس کی نظر بسکٹ کی پلیٹ کے نیچے پڑی، جس کے نیچے دبا ہوا ایک سفید کاغذ کا ٹکڑا جھانک رہا تھا۔ اس نے سب کی نظریں بچا کر اس پرچہ کو اپنے کوٹ کی جیب میں رکھا۔ اور جلدی جلدی چائے کو زہر مار کر کے اس نے ملاقات کو مختصر کر دیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا، جب کہ وہ اپنے معصوم محبت کی دیوی کے حضور میں سر نیاز خم نہیں کر سکا تھا۔

اس نے راستہ میں ہی پرچہ پڑھنا شروع کر دیا۔

پیارے فرہاد!

آج میری اور تمہاری زندگی کا پہلا واقعہ ہے جبکہ بات چیت

نہ ہو سکی۔ میری اور تمہاری ملاقات پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس دن کے واقعہ پر مجھے ذرا کوئی ندامت ہے، اور نہ ہی افسوس۔ بلکہ مجھے خوشی ہے کہ ان لوگوں پر بھی عیاں ہو گیا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ دل و جان سے تمہاری، صرف تمہاری ہو جایا کرتی ہوں۔ یہ صرف وقتی پابندی ہے۔ جب تک تم پرچہ کا سہارا لے کر اپنے دل کی بات کہہ سکتے ہو۔

تمہاری شیریں

پرچہ پڑھ کر اس نے جلد سے جلد گھر پہنچنے کی کوشش کی اور لکھنا شروع کیا۔

پیاری شیریں!

آہ! میں کتنا اُداس تھا، اس کا اندازہ صرف ان کو ہو سکتا ہے جو کسی سے محبت کرتے ہیں۔ میں نے تم سے محبت کی۔ لیکن محبت جیسی پاکیزہ چیز پر یہ پابندی کیسی؟ میری سمجھ میں نہیں آتا — خیر! تمہارا پرچہ میرے لئے خضرِ راہ ثابت ہوا۔ ورنہ میں پریشانی کی خیالات کی وادی میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرتا۔ ۵ جنوری کو میرا Birth day ہے۔ تم آؤ گی نا — میرے لئے سب سے بڑا تحفہ یہی ہے کہ تم آ جاؤ اور میں تمہارے دیدار سے سیراب ہو سکوں۔ آؤ گی نا — وعدہ — باقی باتیں ملاقات پر — میری امیدوں کا مرکز! ابھی تمہیں ان پابندیوں سے نہ گھبرانا چاہئے۔ ہمیں تاریخ میں شیریں فرہاد، لیلےٰ مجنوں، ہیر رانجھا جیسا عظیم اور لازوال مقام پیدا کرنا ہے۔ ابھی نہ جانے رکاوٹوں کے کتنے پہاڑ آئیں گے۔ لیکن ہم بھی انہیں سر کرنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔

کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ

"جو ہو ذوقِ عمل پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں"

اجازت

تمہارا جانباز فرہاد

یہ خط بھیج کر اسے کچھ سکون سا حاصل ہو گیا۔ اور سالگرہ کے دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

اور آخر کار وہ دن آ گیا جس کا اسے بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ مہمان آنے لگے اور خالد ہر وہ ان کے استقبال میں — مصروف تھا، لیکن اس کی نظریں کسی اور کو تلاش کر رہی تھیں۔ مہمانوں سے ہال بھر گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل نسرین کے نہ آنے کی وجہ سے ڈوبنے لگا تھا۔ کہ اچانک اس کی نظر نسرین کی ماں پر پڑی جو پُر وقار طریقہ سے اپنے برقعہ کو سنبھالتی ہوئی آ رہی تھیں۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا — "لو جانِ تمنا بھلا ہی گیا" اور اب اس نے تہیّہ کر لیا کہ آج وہ سماج کے تمام بندھنوں کو توڑ کر اس کے ساتھ بات کرے گا — پیار کریگا اور ہم آغوش ہو گا۔

خالد نے اپنی بہن ریحانہ سے کہا "بہنو، سنو آج تم میرا ایک کام کر دو۔ تم کسی نہ کسی طرح نسرین کو آج رات اپنے پاس روک لو۔ میری اچھی بہن یہ کام ضرور کرنا ہے۔ ورنہ دیکھو، اپنے بھائی سے تمہیں ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

ریحانہ اس کام کے لئے تیار ہو گئی۔ کیوں کہ وہ اس محبت سے واقف تھی جس میں اس کے بھائی جان مبتلا ہو چکے تھے۔ اس نے اپنی خالہ سے ضد کر کے نسرین کو رات کے لئے اپنے پاس روک لیا۔

رات کا اکثر حصہ گذر چکا تھا۔ اور دونوں پیار کی آگ میں جل رہے تھے۔ انھیں کسی کروٹ چین نہیں مل رہا تھا — خالد بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کا بدن آگ کی طرح پھک رہا تھا۔ نسرین ریحانہ کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ سو تو نہ سکی تھی لیکن خوف کی وجہ سے وہ کروٹیں نہیں بدل رہی تھی۔

خالد آہستہ سے اٹھا اور اسے جا کر اٹھایا — ابھی نسرین ٹھیک طرح سے اٹھ کر چلنے بھی نہ پائی تھی کہ ریحانہ نے اسے ٹوکا "کہاں جا رہی ہو نسرین؟" نسرین کا دل دھک سے ہو گیا۔ اور اس نے فوراً بات بناتے ہوئے کہا کہ "ذرا باتھ روم جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بادلِ ناخواستہ اٹھی اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر وہ اس کی بہن کے پاس لیٹ گئی — خالد نے جو اپنی بہن کی بات سنی تو اسے سانپ سونگھ گیا۔ لیکن اچانک — خالد جو آج تک سچی محبت کا قائل تھا، اور روحوں کے باہمی اختلاط کو ہی محبت سمجھتا تھا، جنسی مریض بن گیا۔ اور اس کے منہ سے نکلا

(باقی صفحہ ۱۴ پر)
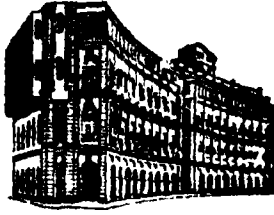
اس عنوان کے تحت پرانے ادیبوں و شاعروں کے حالات و ان کا کلام شائع ہوتا ہے۔

---

۱۹۶۷ء کا ابھی آغاز ہوا ہی تھا کہ ۴ر جنوری کو ۸۰ سالہ ایک بزرگ خاتون عطیہ بیگم فیضی نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ یہ وہ خاتون تھیں کہ ایک زمانے میں جب وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتیں تو تہلکہ مچتا تھا۔ اب جب کہ انھوں نے ایک عالم سے دوسرے عالم کو سدھارا ہے تو کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوتی۔

عطیہ بیگم کا تعلق اُس دور سے تھا جس دور میں علامہ شبلی نعمانی، سر اقبال، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر مولوی عبدالحق وغیرہ اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری کئے ہوئے تھے۔ ایسے قابلِ فخر رہنمائے قوم بھی عطیہ بیگم کی قابلیت اور علمی شخصیت کا اعتراف کرتے تھے۔ اس لحاظ سے عطیہ بیگم کی موت ایک فرد کی موت نہیں، بلکہ ایک عہد ایک تاریخ کی موت ہے۔ مرحومہ بیگم فیضی ہندو پاک کی ان نامور خواتین میں شمار کی جاتی تھیں۔ جو سچے دل سے ملک کی بہی خواہ تھیں —— و مذہبی، ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعہ ملک کی بے لوث خدمت رتی رہیں۔ وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گئیں۔ اور اپنی صلاحیت اور ذہانت کا سکہ بٹھا کر وطن، واپس آئیں۔

یورپ کی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عطیہ بیگم نے سلامی عقائد اور دینی مسائل کا بڑی گہری نظروں سے مطالعہ کیا۔ اگرچہ وہ پردہ نہیں کرتی تھیں، لیکن اسلامی تہذیب و شائستگی کی دلدادہ تھیں۔ وہ انگریزی کی زبردست ادیبہ اور خوش فکر انشا پرداز تھیں۔ اُردو، فارسی، عربی کے شاہکار پر جان دیتی تھیں۔ فارسی اور اردو کے بے شمار شعر انھیں ازبر تھے۔ جنھیں وہ برمحل استعمال کرنے کا سلیقہ بھی جانتی تھیں۔ علامہ شبلی، ڈاکٹر اقبال اور برناڈ شا سے گہرے مراسم تھے۔ اور باقاعدہ مراسلت بھی ہوتی تھی۔ یہ لوگ عطیہ بیگم کے علمی ذوق و شوق کے قدرداں تھے۔ عطیہ بیگم کو خاص طور پر موسیقی، تصویر کشی، مجسمہ سازی اور سماجیات سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان موضوعات پر انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ جو آج تک اہلِ فن میں مقبول ہیں۔

عطیہ فیضی ۱۸۸۱ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد حسن آفندی ترکی کی بارگاہ سلطانی میں، کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ترکی کے وزیر حبیب پاشا کے گھر پر ہوئی۔ جب حسن آفندی کا انتقال ہوگیا تو ان کا خاندان بمبئی آگیا۔ پھر اس خاندان کا تعلق بمبئی کی ایک چھوٹی سی ریاست جزہ کے شاہی خاندان سے ہوگیا۔

۱۹۰۳ میں عطیہ بیگم کی شادی بین الاقوامی شہرت یافتہ کے حامل مسٹر فیضی رحمین سے ہوئی۔ فیضی رحمین بھی عطیہ بیگم کی طرح ادب اور فن کے دلدادہ تھے۔ ۱۹۰۷ء میں عطیہ بیگم یورپ گئیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ڈاکٹر اقبال بھی یورپ میں تھے۔ لندن، ہائیڈل برگ اور دیگر مقامات پر اقبال، اور

عطیہ بیگم کی ملاقات ہوتی رہیں ۔ اور ان ملاقاتوں نے ، ایک دوسرے کو سچا دوست بنا دیا۔ علامہ اقبال کی کئی اصحاب سے مراسلت رہی ۔ اور وہ خطوط چھپکر کافی تعداد میں منظرِ عام پر آگئے ہیں۔ بیگم فیضی کے وہ خطوط جو ڈاکٹر اقبال نے لکھے ہیں ان میں جو خلوص اور دل سوزی ملتی ہے۔ وہ شاید ہی کسی اور کے خطوط میں ہو۔ شبلی سے ان کی نیازمندی اور اقبال سے دوستی کی بدولت ان کو نیک نامی اور نیکونامی دونوں کا سامنا کرنا پڑا۔ شبلی سے ان کی نیازمندی تو ایسا رنگ لائی کہ اردو ادب میں حیاتِ معاشقہ کا اضافہ ہوا۔ اور اقبال کی دوستی کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی کے بہت سے پہلو اس اس مراسلت کے ذریعہ دلدادگانِ اقبال تک پہنچے۔ جو ان کے درمیان ہوئی ۔ اقبال کے پڑھنے والے جانتے ہیں۔ کہ اقبال کو اپنے شعر سنانے کا شوق نہ تھا ۔ اور نہ وہ اپنے اشعار پر تنقید کرانے کے خواہش مند رہتے تھے ۔ لیکن اپنا تازہ کلام اکثر عطیہ بیگم کو خط کے ساتھ بھیجا کرتے تھے۔ اور چاہتے کہ ان کے کلام پر وہ رائے دیں۔

ایک خط میں جو انھوں نے ٹرینٹی کالج (کیمبرج) سے ۲۴ اپریل ۱۹۰۷ کو لکھا تھا ، فرماتے ہیں "میں اس خط کے ساتھ نظم بھیج رہا ہوں ، جس کے بھیجنے کا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا۔ میں شکرگزار رہوں گا اگر آپ بغور پڑھینگی اور اپنی تنقید سے مجھے مطلع کریں گی۔"

جہاں تک خطوط سے معلوم کیا جا سکتا ہے ۔ اقبال احترام کرنے کے ساتھ بے تکلفی بھی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ میں گول میز کانفرنس سے واپسی پر ایک پارٹی میں عطیہ بیگم نے اقبال کے علاوہ اور بہت سے دوسرے معزز مہمان حضرات کو مدعو کیا۔ اس پارٹی میں ہائی کورٹ کے جج مسٹر اکبر علی ، مولانا محمد عرفان ، ڈاکٹر غلام محی الدین وغیرہ شامل تھے ۔ مہمانوں سے عطیہ بیگم نے اقبال کا تعارف کرایا ۔ اور کچھ کلام سنانے کی فرمائش کی ۔ اقبال نے بہت سے فارسی شعر سنائے اور ان کا مطلب بھی بتایا۔ اور آخر میں ایک پرچے پر ایک شعر لکھا ۔ اور اس پرچے پر "پرائیوٹ" لکھا تھا۔

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے سب روا کیا کیا کچھ
کہیئے کیا حکم ہے ، دیوانہ بنوں یا نہ بنوں ؟

صرف یہی نہیں خطوط کے ساتھ اقبال نے عطیہ بیگم کو نظمیں ارسال کی تھیں ان کی شانِ نزول اور تاریخ کا صحیح یقین بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عطیہ بیگم فیضی ، ہماری قوم کی برگزیدہ شخصیتوں میں تھیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ قابلِ فخر شاعر کی دوست اور ہم خیال تھیں۔

●●

---

# غزل

**میر عمری**

اگر ہم کوچۂ جاناں سے نکل جائیں گے
عشق وارفتہ کے انداز بدل جائیں گے

ترے خط کا، تری آمد کا نہ احساں لیں گے
ہم تصور میں بلائیں گے بہل جائیں گے

آج تو اک جھلک اپنی دکھا دے ظالم
عمر بھر کے مرے ارمان نکل جائیں گے

زلفیں بکھرائے ہوئے نکلیں گے وہ جب محوِ خرام
دیکھتے دیکھتے طوفان مچل جائیں گے

اپنی نظروں سے دو اک جام پلا دے ساقی
ہیں جو بہکے ہوئے وہ پی کے سنبھل جائینگے

رنگِ گل موجِ وفا اور جوانی کا شباب
مستقل کچھ بھی نہیں سب ہی بدل جائیں گے

شبِ فرقت میں بکھر جائیں جو آنسو تیرے
سیکڑوں تارکی دیپ سے جل جائیں گے

آنکھ جب بند کرونگا تو خیالات مرے
ایک جا ہو کے حسیں جسم میں ڈھل جائینگے

مگر دنیا میں بھلا کس پہ بھروسہ کیجے
آج جو اپنے ہیں کل رنگ بدل جائینگے

حضرت امیر خسروؒ

معراج الدین صدیقی
بی ۔اے ۔ فرسٹ ایر جامعہ کالج دہلی

نوٹ: [illegible]ث صدیقی کے بقول (کتاب غزل اور متغزلین) کسی ایسی نظم جس میں یہ عورت کی زبان سے اظہار عشق ہو کو" ریختی کہتے ہیں۔ جب کہ غزل کے معنی یہ حکایت بزنان کردن" ہے ——— چوں کہ زیر نظر اشعار میں عورت کی زبان سے مرد کو محبوب و مطلوب ظاہر کیا گیا ہے، اس لئے یہ غزل کے بنیادی معنی سے بالکل الگ ہے۔

تاہم شاعر نے اسے غزل کا نام دیا ہے۔ اس لئے ہم ازراہ احترام و عقیدت اسے "غزل" لکھ رہے ہیں۔

ادارہ

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں    کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

ترجمہ:۔ مجھ مسکین جان سے بے التفاتی مت کر اور مجھ سے آنکھیں نہ چرا۔ باتیں نہ بنا۔ کیوں کہ میں مفارقت اور جدائی کی طاقت نہیں رکھتی۔ اے میری جان تو نے مجھ کو اپنے کلیجہ سے تو کبھی لگایا نہیں۔ جدائی کا سندسہ ناقابل برداشت ہے۔

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ    نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

ترجمہ:۔ شمع کی مانند میں تیرے عشق کی آگ میں جلتی اور سلگتی رہی اور ہر ذرۂ خاک کی مانند تیری بے التفاتی اور بے مہری پہ سکوت میں رہی اور کبھی تجھ مہروش کے فراق میں روتی بھی رہی اور زندگی بھی ایسی گذارتی رہی کہ نہ آنکھوں میں نیند کو جگہ دی کہ تیرے انتظار میں چشم براہ تھی۔ نیند کے لئے جگہ ہی کہاں تھی۔ اور نہ میرے جسم میں آرام کو مقام تھا کہ وہ مصروف بے چینی و اضطراب تھا۔ راحت کو جس میں بے چینی و بے قراری کی وجہ سے نہ سکون تھا۔ نہ قرار تھا۔ یہ ہیں تمہارے عشق کے انعامات۔ جو تم نے مجھے عطا کئے۔ میں نے ان کو آنکھوں اور کلیجہ میں جگہ دی۔ نیند، آرام و چین سب کچھ رخصت کیا اور تمہارے انعامات عشق کو بدل و جان ان کا جانشیں بنایا۔ مگر افسوس کہ تم نے اس کے صلے میں مجھے کبھی کلیجہ سے لگانا تو درکنار، پوچھا تک نہیں۔ پھر بھی میں ایسی بدنصیب رہی کہ نہ تمہیں کبھی ادھر کی سوجھی اور نہ تمہارے دو بول ہی مجھ تک پہنچ سکے۔ گویا وہ بھی مجھ دکھیاری سے ایسے ہی روٹھ گئے جیسے تم۔ دکھ سکھ کا مطلب ہی جانے جس نے دل لگایا ہو۔ تم کیا جانو۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف روزِ وصلش چو عمر کوتاہ    سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ترجمہ:۔ تمہاری جدائی کی راتیں ایسی ڈراونی جیسے کالی ناگن۔ لمبی ایسی جیسے معشوق کی زلفیں۔ اور تمہارے وصل کا دن ایسا چھوٹا جیسے سفر کی عمر کوتاہ۔ یا انسان کی زندگی مثل حُبابکہ۔ ایسے میں اور ایسی قلیل المیعاد حالت میں بھی تم کو نہ دیکھوں تو بتاؤ تو سہی، تم ہی انصاف کرو کہ میں اور میری ناتواں جان کس صورت میں یہ کالی بھیانک پہاڑ جیسی راتیں ہجر و جدائی میں کاٹے؟

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں — کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

ترجمہ:۔ کیا ان دو آنکھوں نے آنا فاناً میں کر دیا۔ تمہاری ہزار پُر فریب حرکتوں سے میرے دل کا تسکین و قرار کافور ہوا۔ تم نے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ اس دکھیاری کا کون ہے؟ جب کہ یہ دکھیاری تمہارے عشق کے ہاتھوں بک چکی کہ تم تک اس دکھیاری کے دو بول بھی کون پہنچا سکے گا۔ پھر بھی میں ایسی بدنصیب رہی کہ نہ تمہیں ادھر کی سوجھی اور نہ تمھارے دو بول ہی مجھ تک پہنچ سکے۔ گویا وہ بھی تمھاری طرح مجھ دکھیاری سے روٹھ گئے۔ خیر! دکھ سکھ کا مطلب؟ جانے جس نے دل لگایا ہو تم کیا جانو؟

بحق روزِ وصالِ دلبر کہ درد دارد غریب خسرو — لُبھائے راکھوں تو سُن اے ساجن جو کہنے پاؤں دو بول تیرے

ترجمہ:۔ تم جیسے معشوق کے وصل کی خاطر کہ مسافر خسرو درد و محبت رکھتا ہے۔ جن میں ایسی طاقت ہے کہ اگر تم دو بول کبھی منہ سے بوقتِ وصال زبان؛ بول لو تو تم کو موہ ہی کیا لوں گی بلکہ جیت بھی لوں گی۔

# ایک درخواست!

اس ماہ اشاعت کے لئے زیادہ تر ساتھیوں نے افسانے بھیجے ہیں۔ یقینی طور پر افسانہ بھی ادب کی ایک صنف ہے۔ اور اس سے ادب کی خدمت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ شاہجہاں کے صفحات اس سے زیادہ اجازت نہیں دیتے کہ دو سے زائد افسانے شائع ہو سکیں۔ اس لئے ہم اپنے ساتھیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نصاب سے متعلق یا معلوماتی مضامین لکھنے کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ اس سے ہمارا مطلب ہرگز کسی کی صلاحیت کو ختم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہم شاہجہاں کو طالب علموں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانا چاہتے ہیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اس میں نصابی مضامین شائع ہوں۔

# آہ! علّامہ رازؔ چاندپوری

جمیل احمد کیفؔ دہلوی

اپنے دل کو آج میں رشکِ عزاخانہ کروں
یعنی اب مملوِ شرابِ غم سے پیمانہ کروں
سانحہ وہ ہوگیا ہے چھن گیا تمکین و ہوش
عقل ہے میری پریشاں ہوگیا ہوں غم بدوش
وہ ہوا رخصت دکھائے جس نے منزل کے نشاں

جادۂ علم و ادب کا تھا جو میرِ کارواں
جسکے دستاں زر نوشتہ خامہ گوہر بار تھا
جسکی تحریروں سے کاغذ بھی غلط بردار تھا

چل دیا وہ پیکرِ اخلاص وہ شیریں بیاں
جسکے غم سے آج ہے آنکھوں سے خونِ دل رواں
جو کہ یکتائے زمانہ اور تھا یکتائے فن

گوہرِ معنی وہ چھینا ہم سے اے چرخِ کہن
بجھ گئی وہ شمعِ بزمِ نقد و شرحِ داستاں
جسکی تنقیدوں سے لرزاں تھا ادب کا آسماں

کیفؔ یہ عالم بھی ہائے کتنا رستاخیز ہے
ہر دلِ دانائے علم و فن الم انگیز ہے

# آہ! مخدوم محی الدّین

مغیث الدین فریدی
لکچرار دہلی یونیورسٹی (شبینہ کلاسز)

خبرِ رحلتِ مرحوم سے آج
جو بھی دل والا تھا مغموم ہوا
تھا وہی شمعِ شبستانِ سخن
ملک اک نور سے محروم ہوا
اپنی بربادی پہ ہنسنے والا
قوم کے درد سے مغموم ہوا
نہ جھکا جبرِ سیاست سے کبھی
نہ وہ حالات کا محکوم ہوا
خادمِ قوم و وطن تھا لیکن
محفلِ شعر کا مخدوم ہوا
رازِ تاثیرِ سخن اُردو کو
اس کے اشعار سے معلوم ہوا
باادب میں نے کہی ہے تاریخ
خدمتِ قوم سے مخدوم ہوا

## گرفت میں آگئے...؟ 'سینفورائزڈ' کی مدد لیجئے اور مسٹر شرنک کی گرفت کھول ڈالئے

**·SANFORIZED·**
REG'D TM

ٹکٹکی باندھے وہ تکتے ہیں، میں اس ...

کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی اُمنگ
جی بہا لے گیا برسات کا پہلا پانی

ہاتھ جل جائے گا چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ
آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی

رس ہی رس جن میں ہے، پھر سیل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

نہ سننا اس کو جو چپ رہ کے بھرے ٹھنڈی سی سانس
یہ ہوا کرتی ہے پتھر کا کلیجہ پانی

یہ پسینہ وہی آنسو ہے جو پی جاتے تھے ہم
آرزو لو وہ کھلا بھید وہ ٹوٹا پانی

مرسلہ: ثریا رحمان، طالبہ، گورنمنٹ کالج - اجین

**لکچرار ہیں** ـــــــ تو آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اپنے طلبہ سے مضامین لکھوا کر برائے اشاعت روانہ کرائیں۔ ہم ممنون ہوں گے۔

**طالب علم ہیں** ـــــــ تو کوئی مضمون (نصاب سے متعلق) ترجمہ (عربی، فارسی یا انگریزی سے کیا ہوا) یا افسانے اپنے لکچرار یا استاد سے تصحیح کرا کر ہمیں بھیج دیں ـــــــ مسودے کے ساتھ نیچے چھپا کوپن ضرور منسلک کیجئے۔

**اردو فارسی یا عربی کے سکریٹری ہیں** ـــــــ تو آپ سے گذارش ہے کہ اپنی سوسائٹی کی ماہانہ مختصراً رپورٹ (ادبی نشست، مشاعرہ، تحریری یا تقریری مقابلہ کا نتیجہ وغیرہ) اپنے لکچرر سے تصدیق کرا کے اگلے ماہ کی پانچ تاریخ تک ہم کو بھیج دیں۔ ہم اس کو شائع کریں گے۔

گوہرِ معنی وہ چھینا ہم سے اے چرخِ کہن
بجھ گئی وہ شمع بزمِ نقد و شرحِ داستاں
جسکی تنقیدوں سے لرزاں تھا ادب کا آسماں
کیف یہ عالم بھی ہائے کتنا رستاخیز ہے
ہر دلِ دانائے علم و فن الم انگیز ہے

قوم و وطن تھا لیکن ... معلوم ہوا
محفلِ شعر کا مخدوم ہوا
رازِ تاثیرِ سخن اُردو کو
اس کے اشعار سے معلوم ہوا
با ادب میں نے کہی ہے تاریخ
خدمتِ قوم سے مخدوم ہوا

آرزو انیسویں صدی کے باکمال شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام سے اُردو اور ہندی کے بُعد کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ ذیل میں، ان کی ایسی ہی غزل دی جارہی ہے۔ جسے اُردو داں تو کیا، ہندی داں طبقہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

رس ان آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سیکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی

آنکھ سے بہہ نہیں سکتا ہے بھرم کا پانی
پھوٹ بھی جائے گا چھالا تو نہ دیگا پانی

چاہ میں پاؤں کہاں آس کا میٹھا پانی
پیاس بھڑکی ہوئی ہے اور نہیں ملتا پانی

دل سے لوکا جو اٹھا، آنکھ سے ٹپکا پانی
آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا، ٹوٹ کے برسا پانی

پھیلتے دھوپ کا ہے روپ لڑکپن کی اٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اترے گا یہ چڑھتا پانی

ٹکٹکی باندھے وہ تکتے ہیں، میں اس گھات میں ہوں
کہیں کھانے لگے چکر نہ یہ ٹھیرا پانی

کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی اُمنگ
جی بہالے گیا برسات کا پہلا پانی

ہاتھ جل جائے گا چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ
آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی

رس ہی رس جن میں ہے، پھر سیل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

نہ سننا اس کو جو چپ رہ کے بھرے ٹھنڈی سانس
یہ ہوا کرتی ہے پتھر کا کلیجہ پانی

یہ پسینہ وہی آنسو ہے جو پی جاتے تھے ہم
آرزو لو وہ کھلا بھید وہ ٹوٹا پانی

مرسلہ: شہریار رحمان، طالبہ، گورنمنٹ کالج۔ اجین ۔

## سفید داغ سے گھبراہٹ کیوں؟

ہماری آزمودہ آیورویدک دوائی "امرت بوٹی" جو کہ سنہ ۱۹۴۶ء سے سفید داغ کی لاجواب دوا ہے صرف تین دن لگائیے۔ اور سفید داغ کا رنگ تبدیل۔ اس لمبے عرصہ میں ہزاروں فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اور ہزاروں تعریفی خطوط ہمارے پاس موجود ہیں۔ آج ہی مکمل تفصیل لکھیں۔ اور دیکھئے کہ دوائی کتنی تیز ہے۔ صرف مشہوری کے لئے ایک فائل دوائی فری تقسیم کی جا رہی ہے۔ اسٹاک محدود ہے۔ اس لئے آج ہی لکھیں۔ تاکہ سنہری موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ نقالوں سے ہوشیار رہیں۔

## بال کالے اُگائیں

ایک بھاری جد وجہد کے بعد خوشبودار آیورویدک دوائی "گریے ہارٹ" تیل تیار کیا گیا ہے جس کی تعریف بھارت کے ہر طبقہ کی طرف سے کی گئی ہے۔ تیل کے استعمال سے کچھ عرصہ میں بال کالے نکلتے ہیں ہمارے پاس کافی تعداد میں تعریفی خطوط موجود ہیں۔ اگر آپ بال کالے اگانا چاہتے ہیں تو آج ہی ایک بار آزمائش کیجئے۔

قیمت ایک بوتل -/۹ روپئے۔ تین بوتل -/25 روپئے

نوٹ:۔ بال کالے کرنے کے علاوہ یہ تیل دماغ کو طاقت دیتا اور ٹھنڈا رکھتا ہے۔ آج ہی لکھیں۔

SHANKAR CHIKITSA KENDRA P.O.
KATRI SARAI (GAYA)

## سفید داغ کا مفت علاج

عالموں نے سچ کہا ہے کہ محنت کا پھل کبھی بے کار نہیں جاتا۔ برسوں سخت کوشش، کٹھن کھوج کے بعد ہم نے سفید داغ کی دوا پر پوری طاقت حاصل کر لی ہے۔ یہ اتنی تیز ہے کہ اس کے تین دنوں کے لگانے سے داغ کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اور بہت جلد جڑ سے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتا ہے۔ آپ خود ایک بار دوا لگا کر دیکھ لیں، کہ دوا کتنی طاقت ور ہے۔ ہزاروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ابھی پروپیگنڈہ کے لئے ایک شیشی دوا مفت دی جا رہی ہے۔ جلدی کریں۔ نقالوں سے خبردار!

BRITAIN AYURVED BHAWAN P.O. KATRI SARAI
(GAYA) INDIA

# اُن کے نام ——

اس عنوان کے تحت قارئین شاہجہاں کے پیغام (جو کسی کو بھیجنا چاہتے ہوں) شائع ہوتے ہیں —— پیغام خواہ رومانی ہو یا جذباتی —— مگر تہذیب و ادب کے دائرے میں ہونا شرط ہے۔

ادارہ

اے حوّا کی بیٹیو! تم اپنے حسن پر مت اتراؤ۔ یہ حسن چند روزہ ہے۔ تصور میں لاؤ اس وقت کو جب تمہارے ان گلابی رخساروں پہ جھریوں کی بدنما کاری اپنا رنگ جمالے گی۔ اور یہ تمہارے یاقوتی ہونٹ اپنی ساری دل کشی کھو بیٹھیں گے۔ تمہاری یہ سیاہ زلفیں جنہیں بدلی سے خطاب کرنا ابھی تم پسند کرتی ہو سفید ہو جائیں گے۔ تمہاری شکل سے لوگ نفرت کریں گے۔ تب تمہارا دل عجز و انکساری سے اُتر آئے گا۔ تمہارے دماغ سے حسن کا غرور ڈھل جائے گا۔

لیکن وہ وقت اور ہوگا۔ اس وقت کوئی کسی قیمت پر بھی نظر التفات نہ کرے گا۔

اور پھر تم یاد کروگی اور کہوگی۔

ع:۔ کیسے کیسے دلِ نازک کو دکھایا ہم نے

محمد یوسف خان
متعلم پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ

---

اے دوست —— !

چاند اسی بنا پر زیادہ خوب صورت نظر آتا ہے۔
کہ وہ منوّر اور شفاف پیشانی کی مانند دکھتا ہے۔

اور بجلی کی چمک ——،

اسی لئے نظارہ سوز سمجھی جاتی ہے کہ اس پر تیرے بے نقاب ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

گلاب کا پھول ——،

اسی لئے زیادہ دل پسند اور خوش نما معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیرے بھرے ہوئے حسین رخساروں کا ہم رنگ ہوتا ہے۔

اور اس کی خوشبو ——،

تیرے ہی تنفس کی عطریت میں بسی ہونے کے باعث اتنی محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے۔

اور —— ہیرا

وہ بھی صرف اسی لئے زیادہ قیمت پاتا ہے کہ اس میں تیرے خوب صورت دانتوں کی چمک اور سفیدی موجود ہوتی ہے۔

اور اے دوست —— ! پھر ان ہرنوں کو کون پوچھتا؟
—— جو بستیوں اور آبادیوں سے دور —— صحراؤں اور بیابانوں میں آوارہ پھرا کرتے ہیں۔

اگر ان کی آنکھیں —— تیری آنکھوں سے مشابہت نہ رکھتیں۔

اور شراب کی مستی —— ؟

کون جانتا —— اگر تیری نگاہوں کی سکر باشیاں معلوم نہ ہوتیں۔

اور چنگ و رباب کی موسیقی اور نغمہ ریزی سے کون دل بستگی رکھتا۔؟

اگر ان میں تیری شیریں آواز کا سا ترنم موجود نہ ہوتا۔

اے دوست —— !

ان تمام چیزوں نے تیری ہی ہستی سے فروغ و شہرت حاصل کی ہے۔ تیری ہی ذریعہ اور واسطے سے یہ چیزیں متعارف ہوئیں اور ان کی صفات کا اظہار ہوا۔

لیکن —— اے دوست ——!

میں سوچتا ہوں کہ اگر تو نہ ہوتا ——

تو ——— پھر ———؟


عبدالحمید

متعلم دلی یونیورسٹی دہلی۔


---

اے دوست ———!

تجھے کیا معلوم ———؟

کہ جب میں تجھے دیکھتا ہوں۔

اس وقت میری روح، میری آنکھوں میں کھنچ آتی ہے۔

اور جب میں تیری آواز سنتا ہوں۔

اس وقت میرے کانوں میں سمٹ آتی ہے۔

——— اور میں بالکل بے جان و بے حس سا ہو جاتا ہوں۔

لیکن اے دوست!

تجھے کیا معلوم؟

کیونکہ "چاہنے" اور "چاہے جانے" میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔

زمین اور آسمان کا

موت اور زندگی کا

بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ

لیکن اے ست تجھے کیا معلوم؟


اے رحمان فاروقی

دہلی کالج دہلی


---

ہر لطف سے عزیز ہے دردِ جگر مجھے

رہنے دے میرے حال پہ اے چارہ گر مجھے

ہر فرد سے تمہارا پتہ پوچھتا ہوں میں

اے کاش دیکھتی ہو تمہاری نظر مجھے

یہ میرا عکس ہے کہ نظر آرہے ہو تم!

دیتا ہے آئینہ بھی فریب نظر مجھے

اب کیا سمجھ کے آپ چراتے ہیں یوں نظر

اپنا کہا تھا آپ نے کیا سوچ کر مجھے

کیا وہ اسی چمن میں کہیں چھپے ہوئے

کیوں مسکرا رہا ہے چمن دیکھکر مجھے


محمد مزمل خاں چمن

طالب علم پوسٹ گریجویٹ انسٹیٹیوٹ دہلی

دُھوپ
چھاؤں
ہے
دُنیا

# خیالات کے جھروکے سے

اس میں قارئین کی رائے اور مشورے شائع کئے جاتے ہیں۔ اس ماہ یوں تو بے انتہا قارئین کے خطوط موصول ہیں۔ مگر ہم جگہ کی قلت کے سبب چند خطوط کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں۔
ہم ان اساتذہ اور ساتھیوں کے بے حد شکر گزار ہیں جنھوں نے ہم کو بذریعہ ڈاک یا براہ راست اپنی رائے اور مفید مشوروں سے نوازا۔

ادارہ

---

رسالہ افسانوں، مضامین اور غزلوں سے مزین ہے۔ اور معقول ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت پر اگر توجہ دی جائے تو، اچھا خاصہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اشتہارات سے پتہ چلتا ہے کہ رسالہ مستحکم طریقہ سے چل رہا ہے۔

(ڈاکٹر محمود قادری اسعد — روزنامہ الجمعیۃ دہلی
۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء)

---

عزیز مکرم

ماہنامہ شاہجہاں ستمبر کا شمارہ ملا — شکریہ
خوشی ہے کہ آپ اور آپ کے چند ساتھیوں نے ایک اچھے کام کا آغاز کیا ہے۔
سرورق کو اسی اہتمام کے ساتھ جاری رکھئے۔ عنوانات پسندیدہ ہیں۔ مگر 'اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ' اور اس کے ساتھ — محل نظر ہے' شاہجہاں کی زندگی کا ایک دن' — تاریخی مضمون ہے۔ مگر مضمون نگار کا نام نہیں شائع کیا گیا۔ اس میں حقیقت کو افسانہ بنانے والی چند کتابوں کی نشان دہی اور شاہجہاں کے معمولات جس تاریخ سے اخذ کئے ہیں اس کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ قاری کا ذہن Facts and Fictions میں الجھا رہے گا۔
کتابت کی غلطیاں کسی بھی جریدہ کے معیار کو تباہ کر سکتی ہیں۔
ص ۱۸، اور ص ۳۱ کو پروف ریڈر نے غور سے نہیں پڑھا۔
'ادھ کھلے پھول'، یا 'نئی نسل کے فنکار' کے تحت ہونہار طلبہ اور طالبات کا تعارف، تصویر اور کارنامہ مستقل طور شائع کیجئے۔
اپنے اس ادبی میگزین کو امن، انسان دوستی اور زندگی کی شادمانی کا ترجمان بنائیے۔ اس کو ادامر و نواہی سے بچائے رکھئے۔
میں نے اس کا دلچسپی سے مطالعہ کیا ہے۔ آپ کا رجحان حوصلہ اور عمل مبارک باد کا مستحق ہے۔

خیر اندیش
سیفی پریمی۔ استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

---

رسالہ پڑھا۔ مجھے طباعت، کتابت، تصویریں، انتخاب سب پسند آیا۔ صحیح تنقید یہ ہے کہ ٹائٹل شایان شان نہ رہا۔ شاید! مغل بادشاہ شاہجہاں کی روح اس لباس سے خوش نہ ہوئی ہو۔ وہ تو بہت ہی ذوقِ جمیل اور حسنِ لطیف کا مالک تھا۔ خدا کرے نقشِ ثانی اور بہتر ہو۔

رشید الوحیدی — متعلم دہلی کالج دہلی

---

مکرمی! سلام مسنون

آپ لوگوں کا رسالہ دیکھا۔ پڑھ کر از حد خوشی ہوئی — او

وصیت سے مجلس ادارت کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ طلبا بھی کوئی صحافت کی دنیا ہے۔ طلبا کے لئے یہ بہت معیاری رسالہ ہے۔ اگر اسی قسم کے رسالے شائع ہوتے رہا کریں۔ طلبا کے اخلاق پر اچھا اثر پڑے گا۔

ناچیز
شہناز انجم
بی۔ اے، فرسٹ ایئر۔ جامعہ کالج، نئی دہلی،

---

محترمی!

رسالہ نظر سے گذرا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اس لئے کہ یہ طالبعلموں کا رسالہ ہے۔ اور میں بھی ایک طالب علم ہوں۔ اس کی کامیابی پر آپ لوگوں کو مبارکباد دیتی ہوں۔

ویسے تو تمام لوگ آج کل کے طلبا سے پریشان ہیں۔ لیکن اگر طلبا کا ذہن مطالعہ اور صحافت کی طرف مڑ جائے تو شاید لوگوں کی پریشانی دور ہو جائے۔

آج کل کے طلبا کے ذہن میں چونکہ کوئی تعمیری نقشہ نہیں رہتا اس وجہ سے وہ تخریب ہی کو زندگی کا نقشہ سمجھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ

تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

میں چاہتی ہوں کہ اسکول کے طلبا کو بھی حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔

بارگاہِ ایزدی میں دعا ہے کہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور آپ کی محنت رنگ لائے۔

عطیہ روحی
بی۔ اے فرسٹ ایئر جامعہ کالج نئی دہلی

---

محترمی!

۔۔۔ دہلی کے طالب علموں کی گرد آلود تصویر کا دوسرا رُخ اتنا صاف و شفاف دیکھ کر تعجب سا ہوتا ہے۔ کیونکہ طالب علموں کا دوسرا رُخ بڑا ہی بھیانک ہے۔ لیکن آپ لوگوں کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ قبول فرمائیں۔ اور مجھے امید ہے کہ شاہجہاں آپ لوگوں کے ہاتھوں میں رہا تو دن دونی رات چوگنی ترقی کریگا۔ اردو ایک نیا موڑ لیکر ابھریگی۔

معراج الدین صدیقی۔ بی۔ اے فرسٹ ایئر جامعہ کالج نئی دہلی

جلد ۳ — نومبر، دسمبر ۶۹ء شمارہ ۵، ۳، ۴

# شاہجہاں

طالب علموں کا — طالب علموں کیلئے — طالب علموں کے ذریعہ

فی پرچہ پچیس پیسے — سالانہ تین روپے



شاہجہاں میں شامل تمام تر مواد میں نام، مقام، واقعات قلمی فرضی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات، واقعات سے ان کی کوئی مطابقت محض اتفاق ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔


مشیر طباعت۔ محمد شفیق صدیقی آف انڈیا کالج دہلی

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ۔ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

مقام اشاعت

قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی ۶


# نوکِ وپلک

گذشتہ شمارے میں ہم نے کچھ اساتذہ اور ساتھیوں کی دیکھی تجویز دہلی کے اردو، فارسی اور عربی طلبا کی ایک سوسائٹی بنائی جاتے اور اس کے زیر اہتمام ہر ماہ ایک ادبی نشست منعقد کی جائے جس میں طلبا اپنی تخلیقات و مضامین پڑھیں (جو بعد میں شاہجہاں میں شائع کئے جاتیں) کے سلسلے میں قارئین کی رائے طلب کی تھی مگر ہم بڑے افسوس کے ساتھ یہ لکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ لہذا ایک بار پھر اپنے ساتھیوں سے اس کے لئے درخواست کرتے ہیں اس امید کے ساتھ کہ اب وہ اپنی رائے سے سرفراز کریں گے۔

گو اس ماہ کافی سالانہ خریدار بنے ہیں مگر پھر بھی اپنے ساتھیوں سے اپیل کرتے ہیں وہ شاہجہاں کو عام کرنے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں اور اپنے احباب کو اس کا سالانہ خریدار بننے کی تلقین کریں۔ گرانی کے اس دور میں شاہجہاں کا چندہ صرف برائے نام رکھا گیا ہے اور ایسا صرف طلبا کی آسانی کے لئے کیا گیا ہے۔ کہ وہ بہ آسانی سالانہ خریدار بن سکتے ہیں۔ دوسرے اپنے شہر کی مختلف لائبریریوں اور اسکول اور کالج جہاں اردو پڑھائی جاتی ہو کے نام اور پتے بھیجیں ہم ممنون ہوں گے۔

(ادارہ)

# جمہوریت کی ترازو میں

## سیاسی و غیر سیاسی حالات پر تبصرہ

جب سنڈی کیٹ کی شہ پر صدر نجلنگپا نے مرکزی وزیر
... فخرالدین علی احمد اور سابق مرکزی وزیر جناب سبرامنیم
ورکنگ کمیٹی کے یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو ہونے والے اجلاس سے پہلے
... ورکنگ کمیٹی سے برطرف کر دیا تو کانگریس پارٹی کی اندرونی
... جنگی نے ایک نیا موڑ لیا۔ اس پر احتجاج کرتے ہوئے محترمہ
... وزیر اعظم اندرا گاندھی اور ان کے حامیوں نے اس اجلاس
... نہ صرف بائیکاٹ کیا بلکہ اسی دن الگ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ
... زیر صدارت محترمہ اندرا گاندھی کی اور اس میں کانگریس کا
... صدر منتخب کرنے کے لئے ۲۲، ۲۳ نومبر ۱۹۶۹ء کو دہلی میں آل انڈیا
کانگریس (AICC) کا ایک خاص اجلاس بلانے کا
فیصلہ کیا اور پھر ریلوے کے مرکزی وزیر مسٹر رام سبھاگ سنگھ
کے کابینہ سے مستعفی ہو جانے کے بعد دونوں گروپوں میں مزید
... کو پیدا ہو گیا۔ میسور کے وزیر اعلیٰ مسٹر ویریندر پاٹل اور
... کانگریس کے لیڈر مسٹر کے سی ابراہام کی کوششوں
سے دونوں لیڈروں صدر نجلنگپا اور محترمہ اندرا گاندھی
... نومبر ۱۹۶۹ء کو اختلاف دور کرنے کے لئے ملے۔ مگر صدر
نجلنگپا کی برطرف شدہ ممبروں کو واپس لینے کی ضد نے اس
ملاقات کو بھی ناکام بنا دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی
دونوں گروپوں میں مفاہمت کی امید بھی ختم ہو گئی اب
دونوں گروپ ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے
میں مصروف ہیں اور دونوں ہی اپنے ساتھ اکثریت کے
دعویدار ہیں۔

سنڈیکیٹ گروپ اب اس بات کی تیاری کر رہا ہے
پارلیمنٹ کھلنے پر محترمہ اندرا گاندھی کے خلاف عدم اعتماد
... پاس کر کے ان کو وزارت عظمیٰ سے الگ کرا دیں
... سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو محترمہ گاندھی
... وزارت عظمیٰ برقرار رکھنے کے لئے مخلوط حکومت بنائیں گی
اور یا پھر پارلیمنٹ توڑنے کے لئے صدر جمہوریۂ ہند سے
درخواست کریں گی — موجودہ حالات و رجحانات کے
پیش نظر یہ کہنا قطعاً غلط نہیں ہوگا کہ اکثریت محترمہ
اندرا گاندھی کے ساتھ ہے مگر چونکہ یہ سیاست ہے اور
اس میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ کل کیا ہوگا لہٰذا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

## طلباء اور ڈی۔ ٹی۔ یو

۱۰ ستمبر ۱۹۶۹ء میں ڈی۔ ٹی۔ یو اور طالب علموں کے
درمیان اختلاف اور تصادم کے سبب دلی یونیورسٹی
بند کر دی گئی تھی — اس دوران دلی یونیورسٹی کے طلباء،
اساتذہ اور ڈی۔ ٹی۔ یو کے نمائندگان کی میٹنگ ہوئی اور
اس لعنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی تدابیر پر غور و فکر کیا
گیا — اور فیصلہ کیا گیا کہ یونیورسٹی کے لگنے کا وقت کم کر دیں
یعنی ساڑھے آٹھ بجے صبح سے پہلا پیریڈ شروع کیا جائے اس
کے لئے یونیورسٹی نے ایک سوالنامہ چھپوایا ہے اور ہر
طالب علم کو اس کی رائے اور مشورہ حاصل کرنے کے لئے
دیا ہے اس کا فیصلہ تو بعد میں ہی کیا جائے گا طلباء کی اکثریت
کی جو رائے ہوگی اسی پر عمل ہوگا — دوسرے بس اسٹاپ
پر طلباء کی بدعنوانیوں کو ختم کرنے اور ڈسپلن قائم کرنے
کے لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ چند خصوصی اسٹاپ پر طلباء
اور ڈی۔ ٹی۔ یو کے نمائندے دن میں بھیڑ کے وقت (صبح آٹھ
سے دس بجے تک اور پھر دو بجے سے چار بجے تک) موجود
ہوں اور وہاں طلبہ کو ڈسپلن میں رہنے کی تلقین کریں —
آجکل اس پر عمل ہو رہا ہے اور خلاف توقع یہ تجربہ کامیاب
رہا ہے۔ خاص طور پر یونیورسٹی (مارس نگر) کے
بس اسٹاپ پر جہاں شریف طلباء و طالبات کو بس پکڑنے

کے لئے ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا تھا یہ انتظار جہاں لیبور کی کمی کی وجہ سے تھا وہاں شر پسند طلباء کی ہلڑ بازی اور دھکم پیل کے سبب بھی تھا۔ اور اب اس عمل کے سبب یا بھرنے کے لئے چند منٹ درکار ہوتے ہیں۔ اس لیے ہمارے جواں سال وائس چانسلر ڈاکٹر محمد امین الدین براج مبارکبادی کے مستحق ہیں جنہوں نے اس مستقل لعنت کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کر دیا۔

## احساسِ ذمہ داری

ایک مثل مشہور ہے کہ "اگر چور کو کسی چیز کا نگہبان بنا دیا جائے تو وہ چیز چوری نہیں ہو سکتی" اصحاب اقتدار نے بھی حالیہ تصادم کے بعد (جو طلباء اور ڈی، ٹی، یو کے عملے کے درمیان ہوئے تھے) ایک اسکیم مرتب کی ہے جس کی رو سے نظم و نسق سنبھالنے میں طلبا کا تعاون حاصل کیا ہے۔ ہر اس بس اسٹاپ پر جہاں طلباء کی فراوانی رہتی ہے طلباء ہی ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی ڈی، ٹی، یو کے ذمہ داران بھی طلباء کا ہاتھ بٹاتے ہیں کسی بھی فرد یا قوم کو اگر اس کی ذمہ داری کا احساس دلا کر کچھ ذمہ داریاں ان کے کاندھوں پر ڈال دی جائیں تو وہ کبھی بھی کسی تخریبی کارروائی کی طرف دھیان نہیں دے سکتے

ہم اس اقدام کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ طلباء کا یہ احساس ذمہ داری انھیں کچھ کر دکھانے کا موقع دے گا۔

## بزم ادب اور کالج

جولائی کے دوسرے ہفتہ میں تقریباً تمام کالج کھل جاتے ہیں اور چند دن بعد ہی تعلیمی سال بھی شروع ہو جاتی ہے لیکن ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں مختلف سوسائٹیوں کے علاوہ بزم ادب ہمیشہ کس مپرسی کا شکار رہتی ہے تعلیمی سال جب آدھے سے زیادہ گذرتا ہے تب کہیں جا کر بزم ادب کی افتتاحی تقریب عمل میں آتی ہے بعض دفعہ تو ایسا ہوا ہے کہ بزم ادب کی ابتدائی اور اختتامی تقریب ایک ساتھ انجام پذیر ہوئی ہیں۔ ایک خاص بات جو ہم اپنے ساتھیوں سے کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ طلبا کی قدیم روایات پر چلتے ہوئے آج کے طالب علم جو رویہ اپنائے ہیں وہ کچھ غلط سا ہے یہ درست ہے کہ اگر طلبا کی مجلس میں شور و غل کے بجائے سکون و امن ہو تو یہ "مجلس" طلبا کی نہیں علماء کی "مجلس" کہلائے گی لیکن پھر بھی کسی کو اتنی داد دیناکہ اس کے حوصلے پست ہو جائیں اس فنکار کے ساتھ ناانصافی ہے جو مستقبل میں ایک عظیم فنکار کی صورت میں نمودار ہو سکتا ہے اس لئے داد ایسی دینی چاہیئے کہ جو حوصلہ شکن نہ ہو بلکہ حوصلہ افزا ہو۔

---

**نوٹ**

مہینوں کے اندراج کی غلطی کو ختم کرنے کے لئے اس بار دو ماہ (نومبر دسمبر ۱۹۷۹ء) لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن سالانہ خریداروں کے لئے یہ ایک ہی ماہ کا شمارہ گنا جائے گا۔ اگلا شمارہ جنوری ۱۹۸۰ء کا دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منظر عام پر آ جائے گا۔

ایڈیٹر

اپنے مضامین اور تخلیقات صفحہ ۳۲ پر چھپے کوپن منسلک کرنے کے بعد روانہ کریں۔ بغیر کوپن کے آپ کا مضمون یا تخلیق قابل غور نہ ہو گا۔

## اڈیٹر کے قلم سے

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں بینک نیشنلائزیشن پر ایک سیمنار ہوا۔ مائیک پر یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ہیں سامعین دیگر طلبہ کے علاوہ نواب آف رامپور جناب مرتضیٰ علی خان دیکھے جا سکتے ہیں۔

سنت فتح سنگھ — ۲۰ نومبر سے غیر معینہ بھوک ہڑتال کا اعلان "جوان ڈرائے بھگنے سے اور بوڑھا ڈرائے مرنے سے"

شریمتی اندرا گاندھی،
جو اس نازک دور میں ملک کی باگ ڈور نہایت خوبی سے سنبھالے ہوئی ہیں

محمد یوسف خاں متعلم پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی

# اردو کے انگریز شعراء

## وہ انگریز اور ڈچ جنہوں نے اردو شاعری میں کمال دکھایا

---

### کپتان الیکزینڈر ہیڈرلی۔ آزاد

ان کے والد مسٹر جیمس ہیڈرلی فرانسیسی تھے۔ جن فرنگستانیوں
ہ عالم ثانی کے زمانہ میں ہندوستان خصوصاً دہلی کو اپنا وطن
لیا۔ ان میں سے مسٹر ہیڈرلی بھی تھے انہوں نے شادی بھی یہیں کی ان کے
بیٹے تھے۔ طامس ہیڈرلی اور الیکزینڈر ہیڈرلی اسی زمانہ میں گو
لطنت پر زوال تھا۔ لیکن اردو شاعری کمال جانب قدم بڑھا
تھی۔ اور حکام برطانیہ انگریزوں کو ہندوستانی زبان سے واقف
شنا کرنے کے لئے اردو شعراء اور اردو اہل علم کی قدر افزائی
ے۔ ان صحبتوں سے الیکزینڈر ہیڈرلی کو بھی شعر و سخن
ا ہو گیا۔ اور سب سے پہلی غزل اس نے ۱۸۴۳ء میں کہی
ی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ وہ آزاد تخلص کرتے تھے۔ ان کی زندہ
نگین مزاجی نے ان کی صحبت کو مرجع ارباب مذاق بنا لیا
ب زین العابدین خان عارف سے اصلاح لیتا تھا۔ آغاز
میں مسٹر ہیڈرلی آگرہ چلے گئے۔ طب سے بھی اچھی واقفیت
یہ مفت دیتا تھا۔ اور اہل علم کی قدر دانی بھی کرتا تھا
رت بڑھتی اور دولت گھٹتی گئی۔ آخر مجبور ہو کر ملازمت
ی الور ریاست الور میں کپتان ہو گئے۔ ۷ رجولائی ۱۸۶۱ء
انی میں بعمر ۳۲ سال انتقال کیا۔ ان کے بڑے بھائی طامس
نے جو ریاست بھرت پور میں ڈپٹی تھے، آزاد نے دوستوں
سے ان کا متفرق کلام جمع کر کے ترتیب دیا۔ اور ۱۸۶۳ء
کرایا۔ نہایت رنگین طبیعت مضمون آفرین اور نکتہ سنج
شاعر تھا۔ کلام کا کچھ خلاصہ ذیل میں درج ہے:۔

واعظوں سے جو سنا کرتے تھے جنت کا نشان
جبکہ تحقیق کیا کوچہ جانان نکلا
کیا کہوں اس کا شب ماہ میں عالم آزاد
وہ فلک پر یہ زمیں پر مہ تاباں نکلا

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

کچھ پاؤں میں طاقت ہو کہ دشت نوردی
ہاتھوں سے مزا دیکھو ذرا جیب دری کا
تیروں کی جراحت جو مرے سینہ میں کم ہے
باعث ہے ستمگر یہ تیری کم نظری کا
جہلم کو عیادت کے لئے وہ مری آئے
آزاد کچھ کا نہ بھی ہے بے خبری کا !

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

زہر قاتل ہے دوا درد محبت کے لئے
تھا مرا فیصلہ ایک دربن جو درماں ہوتا

٭ ٭ ٭ ٭

سن چکے حال بس ترا آزاد
ہم سے آگے سنا نہیں جاتا

٭ ٭ ٭

جس کوچہ جاناں کا خریدار رہوں میں
مفت بھی دے تو نہ لوں باغ خیال اے واعظ
ہم وہ آزاد زمانہ ہیں کہ اکثر اوقات
ذکر بت کرتے ہیں مسجد میں بھی ہاں اے واعظ

جب سے پایا دشمنوں نے پاؤں کا میرے سراغ
سر کے بل چلتا ہوں تب سے کوئے جاناں کی طرف

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ہے سجدہ ادھر فرض جدھر رخ ہے ہمارا
کاشانہ ترا قبلہ ہے اور قبلہ نما ہم
ہیں شمع صفت انجمن دہر ہیں آزاد
سرگرم رہ وادیٔ اقلیم وفا ہم

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

پردہ ہمارا خاک اڑانے میں رہ گیا
آئے نظر کسی کو نہ گرد و غبار میں
بھولے نہیں ہیں تنگی کاشانہ یاد ہے
کرتے ہیں شکر لیٹ کے کنج مزار میں

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

گر کوئی بلاتا ہے تو کہتے ہیں یہ صنم سے
آزاد کو محفل میں نہ بلواؤ تو آؤں

٭ ٭ ٭

کب سے ہیں زنداں میں ہم دیکھو تو گھس گھس کے تمام
طوق آدھا رہ گیا زنجیر آدھی رہ گئی

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

قانع ہوں اسیر عشق میں جو خشک و تر ہے
کھانے کو داغ پینے کو خون جگر ملے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اہل جنت کے لئے ہیں نہ وہ رضواں کیلئے
جو مزے آج ہیں حاصل ترے درباں کے لئے
سر کو وحشت میں پہاڑوں سے بچا کر لایا
در و دیوار سر کوچۂ جاناں کے لئے

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

## مسٹر اکسیٹن ڈسلوا مفتون

پرتگال کے رہنے والے تھے۔ اکبرآباد کی ہوا راس آئی اور توطن اختیار کر لیا۔ مرزا عنایت علی ماہ اکبرآبادی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ تذکرہ سخن شعراء میں جو ۱۲۸۱ھ کی تصنیف ہے آپ کے شعر ذیل میں درج ہیں ؎

نکالوں کس طرح پہلو سے ٹکڑا اس کے پیکاں کا
کہ مدت میں گذر دل میں ہوا ہے آج مہماں کا
گہے دماغ میں ہے گاہ دل میں گہہ لب پر
بھٹکتی پھرتی ہے گھبرا کے جسم زار میں روح
عجب ترے کشتہ کا دیوانہ پن ہے
نہ ثابت لحد ہے۔ نہ تار کفن ہے

٭ ٭ ٭

## اینی بلاکیر تخلص۔ ملکہ

مسٹر بلاکیر سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکتہ جو خالص انگریز تھے۔ یہ شاعرہ ان کی دختر تھی۔ ۱۲۸۱ھ میں جس کو اکسٹھ سال کا عرصہ گذرتا ہے ڈپٹی عبدالغفور صاحب نساخ مصنف "تذکرہ سخن شعراء" سے اصلاح لیتی تھی۔ صاحب سخن شعراء اسی انگریز لیڈی کے حالات لکھتے ہیں۔ "یہ نازک بدن قوم انگریز سے ہیں۔ موسیقی میں اچھا دخل رکھتی ہیں۔ ستار خوب بجاتی ہیں۔ کلکتہ میں رہتی ہیں اور کبھی کبھار شعر کہتی ہیں۔ اور راقم الحروف کو دکھاتی ہیں"۔ آج سے چند سال پیشتر ان کی زندگی کا پتہ چلتا تھا۔ تمام ہندوستان میں حسن اور راس کے گانے کی فیس ایک ہزار روپے روزانہ تھی —— ہندوستانی زندگی اور طرز معاشرت کا اس پر بہت اثر تھا۔ یہ عنفوان شباب میں ہی مسلمان ہو گئی تھی۔ تذکرہ سخن شعراء میں چار شعر درج ہیں۔ دو یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام
میں نے نالہ جو کبھی رات سر شام کیا
آہ و زاری نہیں سنتے بخدا رالتوں کو
اس صنم کو ملکہ نے ہی مگر رام کیا

٭ ٭ ٭ ٭

## طوماس

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ تذکرہ گلشن بے خار میں:

ن ۱۲۵ھ کی تصنیف ہے اور جس پر مومن غالب اور آزاد نامور
شعرائے قدیم نے تعریفیں لکھی ہیں۔ طوماس کے متعلق لکھتے ہیں کہ طوماس
مخلص فرنگی زاد ایست مشہور بہ خان صاحب شاگرد شاہ نصیر نمونہ
کلام میں صرف ایک شعر لکھا ہے۔ وہی درج کیا جاتا ہے۔

سودا ہے زلف یوسف ثانی کا اسقدر
روتے ہیں ہم کھڑے سرے بازار زرد رو

* * * *

## مسٹر کلاڈلیس بکیسٹر نظم

نجم مرحوم لکھنوی کے شاگرد رشید رفیق الدولہ دبیر الانشا
محمد ظہیر الدین خاں۔ ظہیر واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے
میں ایک قابل شاعر تھے۔ ان کے نامور فرزند منشی محمد محمود احمد
نب حمد لکھنوی سے نظم کو فخر تلمذ تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں اپنے
دکی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

شاگرد نظم حمد سے استاد کا ہوں میں
شاعر جہاں میں جس کے برابر کہیں نہیں

پیام عاشق ۱۸۹۷ء ۱۸۹۸ء ۱۸۹۹ء جنوری
پ کو چند غزلیں نظر سے گذر رہی ہیں ان میں سے چند ایک
ب اشعار درج کئے جاتے ہیں ؎

ہوئی ویران کو یہاں آتے آتے
الہی گئے وہ کہاں آتے آتے

ابھی عمر جتنی ہے اتنی ادائیں
ابھی آئیں گی شوخیاں آتے آتے

ہوئے دن ہی کے بستر غم سے اٹھے
اب آئے گی تاب و تواں آتے آتے

اب تو نالے مری اس بات پہ آمادہ ہیں
جور پہ جور دو بیداد پہ بیداد کریں

ہم وہ صابر ہیں کہ ہرگز نہیں اف کرنے کے
عرش پہ جا کے ترے ظلم کی فریاد کریں

چلو نظام دربار پہ سر پھوڑ آئیں آج
دھوم ہو جائے نیا فتنہ فریاد کریں۔

جب ذرا چلتے ہیں سو فتنے بپا کرتے ہیں
اور ہو گی مرے اللہ قیامت کیسی

دام تزویر جبتیں واعظ کے نہ آنا اے نظام
کوچہ یار کے ہوتے ہوئے جنت کیسی

بھیجنے والا ہی خط کا جا چکا دنیا سے جب
نامہ بر اب خط کا تو نے کر جواب آیا تو کیا

لاش پر اب تشنہ دیدار کے روتے ہو کیوں
جب تڑپ کے مر گیا پھر اب آیا تو کیا

نظام سے بھی کون ہے کیا کام ہے
آپ کے در پر جو وہ خانہ خراب آیا تو کیا

سادگی سے پوچھتے ہیں مرے مر جانے کے بعد
نظام کیسا ہے کہاں ہے کچھ خبر آئی نہیں

نظارہ ہی نہ کرتے وے جب اپنی بیخودی
پھر کیا کریں ہم آکے تری جلوہ گاہ میں

جب جاؤ آستان پہ دربان کہتے ہیں
سرکار سو رہے ہیں ابھی خوابگاہ میں

دل چرا کے خود مرا سمجھانے بیٹھے ہیں مجھے
جانے دو کیا مال تھا جاتا رہا جاتا رہا

* * * * *

درد پہلو میں کسی طرح سنبھلنے نہ دیا
کوششیں کیں تو بہت دل کے سنبھلنے کے لئے

روز و شب کرتے ہیں فریاد اسیران قفس
خود تو کیا دم بھی نکلتا ہے ترسنے کیلئے

* * *

## مسٹر جان شور

حسب ذیل حالات حضرت ساغر نے اپنے حافظہ سے
اضافہ کئے ہیں۔

آپ قوم کے انگریز تھے اور زمانہ غدر سے بیشتر ہی میرٹھ
میں سکونت اختیار کر چکے تھے۔ آپ صاحب جائیداد تھے
ہندوستانی شرفا سے بڑا ربط و ضبط رکھتے تھے۔ اور ان کی

صحبت سے آپ کا طرز معاشرت ہندوستانی ہو گیا۔ اور ان کے بعض ہم جلیس سے آپکو اردو شاعری کا شوق پیدا ہوا اور بعض مستند شعراء دہلی سے مشورہ کرتے تھے۔ شاعری کی خداداد قابلیت تھی۔ کلام نہایت شستہ اور دلکش تھا۔ صاحب دیوان ہیں آپ کا کلام "دیوان شوخ" کی شکل میں طبع ہوا تھا۔ کلام کا نمونہ اس وجہ سے ہدیہ ناظرین نہیں ہو سکتا کہ حافظہ میں نہیں ہے

## مرزا سلیمان شکوہ گارڈنر تخلص فنا

آپ کے بزرگ برطانیہ میں ادکا نرکے بیرونٹ تھے جس کی اولاد سے کرنیل گارڈنر بہت مشہور ہوئے جنہوں نے کھمبات فتح کیا۔ آپکے گھر میں نواب کھمبات کے خاندان کی ایک لڑکی پڑ گئی تھی جس نے آپ سے اس شرط پر شادی کی کہ اس کے بطن سے جو اولاد پیدا ہو اسے عیسائی خاندان میں نہ بیاہا جائے کرنیل گارڈنر نے جنگ بھوٹان اور برہما میں بھی شرکت کی آپ نے اپنے نام پر ایک ہندوستانی رسالہ "گارڈنرز ہارس" کے نام سے بھرتی کیا تھا۔ جو ابتک اسی نام سے انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں داخل ہے۔ ۴۸ سیر وزنی گھنٹہ کرنیل گارڈنر برہما سے جنگ ختم کرکے ہندوستان واپس آئے تو آپکے رسالہ میں پنڈت بھیم سین رسالدار تھے۔ پنڈت جی ایک گھنٹہ کسی بودھ مندر میں سے اپنے ہمراہ لائے۔ کرنیل صاحب کو دریائے کالندری کے کنارے ایک مقام اسقدر پسند آیا کہ اس نے وہیں قیام کیا اس مقام کا نام ابتک "چھاؤنی" مشہور ہے اور وہ ضلع ایٹہ میں واقع ہے۔ جس میں کرنیل صاحب کی اولاد ابتک آباد ہے چھاؤنی کے نزدیک ایک گاؤں نداؤ نامی ہے۔ جہاں پنڈت بھیم سین نے سکونت اختیار کی وہ گھنٹہ جو ۴۸ من وزنی ہے ابتک اس مکان میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے پاس پنڈت جی کا پورا بت ہے۔ جو بڑے تنومند شخص کا بت معلوم ہوتا ہے۔

مرزا سلیمان شکوہ گارڈنر کا طرز معاشرت بالکل ہندوستانی تھا۔ اور چونکہ ان کے خاندان کا رشتہ دہلی کے مغلیہ خاندان کے خاندانوں۔ اودھ کے شاہی خاندان کے شاہزادوں اور فرخ آباد کے نواب کے خاندان جو "بنگش" خاندان کہلاتا ہے

ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ ہندوستانی رہبروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ بڑے فیاض اور قابل شخص تھے۔ ان کی جود وسخی کی داستانیں اضلاع بدایوں۔ فرخ آباد۔ ملین پور۔ علیگڑھ میں نہایت مشہور ہیں۔ عام طور پر آپ "فنا صاحب" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ گو کسی کی شاگردی نہیں اختیار کی۔ لیکن منشی امیر احمد مینائی صاحب۔ امیر لکھنوی کے کلام سے خاص انس رکھتے تھے۔

## جان صاحب

لکھنؤ۔ دہلی آگرہ کے اکثر شعرا نے مرزا صاحب کی مہمان نوازی اور فیاضی سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ مرزا ماہ اکبرآبادی بھی کچھ عرصہ آپکے دامن دولت سے وابستہ رہے اور لکھنؤ کے مشہور ریختی گو جن کا مستورات کی زبان میں "دیوان جان صاحب" موجود ہے۔ چھاؤنی آخری عمر میں آئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ انکی قبر ابتک وہاں موجود ہے جان صاحب کے کلام سے ایک رباعی ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے نذر ہے۔

اے بوا ہوتی جو میں حضرت شبیر کے ساتھ
مارتی سنئر موئے کو کسی تدبیر کے ساتھ
مر بھی جاتی تو شہید وفا کی بلائیں لیکر
حشر کو اٹھتی بڑی عزت و توقیر کے ساتھ

مرزا صاحب بڑے علم دوست تھے اور فنا تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام سے جو یاد رہ گیا ہے حسب ذیل ہے۔

پوچھا دل سے کہ کب وصل کا ساماں ہوگا
بولا جس روز کفن میں تن عریاں ہوگا
آج تو شوق سے پی خون جگر اے غم یار
ناشتہ کل کو کباب دل بریاں ہوگا
خواب سے وہ بت بے پیر جو منہ کھول اٹھا
شمع خاموش ہوئی مرغ سحر بول اٹھا

آپکے بڑے لڑکے مرزا اقبال گارڈنر بھی بڑے اچھے شاعر تھے آپکے خاندان میں مسٹر ایرٹ گارڈنر شاعر بڑے اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں جو ۱۹۰۵ء میں لاہور میں چیریٹی ماسٹر رہے تھے۔

سبرامنیم سابق مرکزی وزیر جنکی ورکنگ کمیٹی سے برطرفی کانگریس
میں موجودہ کرائسس کا سب سے بڑا سبب ہے۔

کامراج ـــــ نئے کامراج پلان کی جستجو میں
"نیا جال لائے پرانے شکاری"

ئ۔بی چوہان
ریمتی اندرا گاندھی کے دست راست

غلام محمد صادق کشمیر کے وزیر اعلیٰ
جنہوں نے علی الاعلان محترمہ اندرا گاندھی کی حمایت کرنا شروع

سیّد مظفر سعید متعلم دلّی یونیورسٹی

# پیار کی قیمت

اس نے اپنے داہیں ہاتھ سے آنکھوں پر چھجہ بنا کر دور وادی میں نظر دوڑائی پہاڑ کی چڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ اب کچھ دور چلنے کے بعد ڈھلان شروع ہو جائے گی اور پھر گاؤں دوری کتنا رہ جائیگا! دھوپ کی تیزی میں کمی کی آنے لگی تھی اس نے کمر پر لدے ہوئے گٹھر کا رستہ جو اس کی ٹھوڑی پر اٹکا ہوا تھا جھٹکا دیکر ٹھیک کیا۔ بس تھوڑی دیری کی تو بات ہے پھر وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوگا اور ماں اس کی بلائیں لے رہی ہوگی اور اس کی خوشی کی چیخیں سن کر آس پڑوس کی عورتیں بھی نکل آئیں گی اور اس کے چاروں طرف گھیرا بنا کر جمع ہو جائینگی اور ایک شور مچ جائیگا۔ لیکن اس کی نگاہیں نوان کے سروں پر سے ہوتی ہوئیں کچے پکے چھوٹے چھوٹے مکانوں پر سے گذرتی ہوئیں سب سے پیچھے سے جھانکتے ہوئے دومنزلہ مکان کی کھڑکیوں میں کچھ ڈھونڈتی ہوں گی اور وہ بھی تو وہیں کسی کھڑکی میں کھڑی ہو گی اور وہیں کھڑی خوشی سے جھوم رہی ہوگی ——— اس کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور وہ بھی تو اسی طرح ایک دم مسکرا اٹھتی تھی جیسے ایک دم ہنسی اس کے ہونٹوں سے پھوٹ پڑی ہو ——— اور پھر جب وہ ماں کے قدموں میں سونے چاندی کے زیورات اور کپڑے کے تھانوں کا ڈھیر لگا دے گا اور نوٹوں کی گڈیاں اس کے ہاتھوں میں تھمائے گا اور کہے گا !

"جاؤ ماں! جاؤ۔ لے جاؤ یہ سب مال و دولت اور ڈھیر کر دو نمبردار کے سامنے اور اسے بتا دو کہ اب تمھارا لال بھی تینا کا ایسے ہی حقدار ہو گیا ہے جیسے چندراپور کے بنئے کا موٹا بھدّا اور بیوقوف لونڈا جس کے پاس سوائے دولت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور ہاں میرے پاس تو اب دولت بھی ہے اور تینا کا پیار بھی۔ اس کا اب نہ جانے کیا حال ہوگا۔ وہ تو جب میرے جانے کی بات سن کر ہی گم سم ہو جاتی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگتے تھے۔ لیکن اب تو اس کے ہونٹوں کی ہنسی رو کے نہ رکے گی۔ اور یہ سوچتے سوچتے وہ خود بھی مسکرا اٹھا۔

سورج دیوتا کا سنہری رتھ تیزی سے اپنے پچھمی محل کی طرف جارہا تھا۔ درختوں اور ٹیلوں کے سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ اس نے تیزی سے قدم اٹھانے شروع کر دیئے تھے۔ ساتھ ہی اس کا دماغ پرانی یادوں کی وادی میں بھٹکنے لگا۔

گاؤں کے جھونپڑوں اور کچے پکے گھروں سے باہر بڑے بوڑھے درخت کے نیچے جب گاؤں کے سارے بچے جمع ہوتے تو تینا اور راجو کی جوڑی سب سے الگ ہی دکھائی دیتی۔ تینا نمبردار کی بیٹی تھی لیکن اس کا دل اپنے اونچے سے مکان میں نہ لگتا وہ کسی نہ کسی طرح آیا مائی یا ماں کی آنکھ بچا کر باہر نکل آتی اور بڑ دادا کے نیچے پہنچ جاتی۔ جہاں اور بچوں کے ساتھ راجو بھی اس کی راہ تکتا ہوتا۔ اسکے بغیر تو کھیل میں مزہ بھی نہ آتا تھا اور اس کے آتے ہی جیسے سب میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ سیب جیسے لال لال گالوں اور سنہرے بالوں والی وہ ننھی سی گڑیا تھی بھی بہت پیاری۔ پھر قسم قسم کے کھیل کھیلے جاتے۔ کبھی آنکھ مچولی کبھی اونچ نیچ۔ کبھی بڑ دادا کی داڑھی کے بال پکڑا پکڑ کر جھولا جاتا اور دادا بھی بچوں کی خوشی میں شریک جھومتے رہتے۔ کبھی گھر گھر کا کھیل کھیلا جاتا پھر شادی ہوتی جس میں دولہا ہمیشہ راجو اور دلہن تینا بنتی۔ راجو جو شاید بچوں میں سب سے

زیادہ خوبصورت اور ذہین تھا، سب سے زیادہ غریب تھا۔ وہ اس کھیل میں سب سے زیادہ دلچسپی لیتا اس کا باپ عرصہ ہوا خدا کو پیارا ہو چکا تھا اس کی ماں نمبردار کے گھر میں اوپر کا کام کر کے اپنا اور اپنے راجو کا پیٹ پالتی اور مستقبل میں اس کے بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھا کرتی۔ دن چھپ جاتا لیکن یہ دلچسپ کھیل جب ہی ختم ہوتے جب بچوں کی مائیں ان کو زبردستی پکڑ پکڑ کر لےجاتیں یا نینا کی آیا اس کو ڈھونڈتی ہوئی ادھر آنکلتی اور اس کو زبردستی لے جاتی۔

سورج نکلتا اور ڈوبتا رہا اور زندگی کی گھڑیاں بیتتی چلی گئیں بڑے دادانے پرانے بچوں کی جگہ نئی نئی صورتیں دیکھیں تو انھیں یاد آیا کہ پہلے بچے بڑے ہو کر کھیتوں میں اور گھروں میں پہونچ چکے ہیں راجو کی ماں نے زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا بڑی مشکلوں سے بچائے رکھا تھا وہ اب اس میں کھدائی کر کے، دھرتی ماں سے اپنا حصہ مانگتا رہتا۔ دونوں کا گذارا اس چھوٹی سی زمین کی آمدنی سے پورا نہ ہوتا اس لئے راجو اکثر نمبردار کی زمینوں پر کام کرنے چلا جاتا۔ کڑی محنت و مشقت نے اسے ایک خوبصورت اور سڈول جسم کا مالک بنا دیا تھا وہ اپنی تمام مشکلات ہمت کے ساتھ جھیلتا اور مصیبتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا رہتا اس کی مسکراہٹ جہاں اس کے ساتھی نوجوان لڑکوں میں ایک نیا جذبہ اور امنگ پیدا کرتی وہاں اس کا تصور ہی گاؤں کی کنواریوں کے دلوں میں گدگدی پیدا کرتا۔ گھروں کی کوٹھریوں میں یا ایک دوسرے گھر میں کھلی ہوئی کھڑکیوں میں یا کنویں کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈیوں میں چلتے ہوئے اس کی باتیں کی جاتیں۔ اس کی روزمرہ کی باتیں سناتیں اس کو دیکھ کر ان کے دل دھڑکنے لگتے آنکھوں میں چمک آجاتی اور گالوں پر سرخی دوڑ جاتی اور وہ دانتوں سے ہونٹ نے لگتیں مگر راجو — وہ تو اپنی ہی دنیا میں گم رہتا اس کے سینے کی گہرائیوں میں تو ایک ہی صورت بسی تھی کھیت میں ہل چلاتے ہوئے اوپر نیچے ہوتی ہوئی مٹی میں، نالیوں میں گڑ گڑاتی کرتے ہوئے کل کل کرتے بہتے ہوئے پانی میں کٹائی کرتے ہوئے گنڈاسوں کی دھاروں میں اسے اسی صورت کی پرچھائیاں نظر آتیں اور رات تو قیامت ہی ہوتی۔ سپنوں میں وہ کسی دوسرے ہی دیس پہونچ جاتا جہاں پھولوں کی شہزادی نینا اس کا ہاتھ پکڑے اپنے محل کے باغ میں ٹہلتی ہوتی اور چاروں طرف سنہری سنہری روشنی کھیلی ہوتی جس میں ان گنت خوشبوئیں تیرتی ہوئیں لیکن کبھی کبھی اس کے سامنے حقیقت کا بھیڑیا اپنے دانت کھولے آجاتا جو غرا غرا کر اس کو اس کی اور نینا کی حیثیت کا فرق یاد دلاتا۔ تب اسے احساس ہوتا کہ نینا اس سے کتنی بلند ہے اس کی پہونچ سے کتنی دور ہے لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا نوعمر اور پر حوصلہ دل اس کو تسلی دیتا "اونہہ مجھ میں کمی ہی کیا ہے میرے مقابلہ میں تو گاؤں میں کوئی لڑکا نہیں سب مجھے آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اگر میرے پاس دولت نہیں تو کیا ہیں کچھ بھی نہیں۔ صرف دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔ اور پھر میرے پاس تو نینا کا پیار بھی ہے اس سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے"۔ اور ناامیدی کے اندھیاروں میں ڈوبتا ہوا دیا جلنے لگتا۔

اور سولہ سال کی معصوم اور بھولی بھالی نینا جس کی کوئی خواہش کبھی رد نہ کی گئی تھی، راجو کو اپنا اور صرف اپنا سمجھے بیٹھی تھی اسے پورا یقین تھا کہ راجو ہمیشہ کے لئے اس کا ہو جائیگا اس کے دل میں کبھی کسی وسوسے کا گذر بھی نہ ہوتا وہ اپنی ہم جولیوں میں جب راجو کے متعلق سرگوشیاں سنتی سنتی تو ان کی بے وقوفی پر دھیمے سے مسکرا دیتی "اونہہ انھیں کیا معلوم کہ وہ کسی کا نہیں صرف میرا ہے۔ یہ تو اس کے خواب دیکھتے ہی دیکھتے مر جائیں گے"۔

راجو کام کرتے کرتے تھک کر کھیتوں کے پرے پہاڑی چشمے کے کنارے جا بیٹھتا جہاں سے نمبردار کے گھر کا پچھواڑہ قریب ہی تھا اور تھوڑی ہی دیر میں نینا بھی اچھلتی کودتی اس کے برابر آبیٹھتی دونوں پانی میں پیر ڈالے بیٹھے دنیا بھر کی باتیں کیا کرتے چشمے کے صاف شفاف پانی کی طرح ان کے دل بھی پاک تھے۔

انھوں نے کبھی ایک دوسرے سے اپنی محبت نہیں جتائی تھی اور شاید وہ اس لفظ کو جانتے بھی نہ تھے بس ایک احساس تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ہیں دونوں کی یہ چاہت کسی بھی آمیزش سے پاک تھی۔ چشمے کے کنارے اُگی ہوئی جھاڑیوں پر کھلنے والی ننھی منی کلیاں ان کی پاکیزگی کی قسم کھاتیں۔ پانی کی ہلکی ہلکی لہریں ان مقدس روحوں کے پاکیزہ پیروں کو چوم چوم کر بہتی رہتیں ہر طرف محبت کا نور پھیل جاتا تب اچانک راجو کو اپنے کام کا خیال آجاتا یا نینا کو اس کی پکار سنائی دیتی اور یہ سہانا طلسم ٹوٹ جاتا

چشمہ کا کنارہ سونا ہو جاتا اور جھاڑیاں پھر کسی ایسے ہی منظر کو دیکھنے
کے انتظار میں اونگھنے لگتیں۔
جب راجو کی ماں نے اس کی عمر کے تئیس جاڑے گن لئے اسے
گھر میں بہو کی کمی بری طرح کھلنے لگی۔ وہ ہر وقت ایک موہنی سی سلونی
گویا سی دُلہن کے دھیان میں گم رہنے لگی۔ پھر اس نے ادھر ادھر نظر
دوڑانی شروع کی۔ راجو اور نینا کے بارے میں اسے سب کچھ معلوم تھا
لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ راجو کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکیگی
اسے یہ بھی معلوم تھا کہ نینا کی بات چنداں پور کے بنئے کے اکلوتے
بیٹے سے آ رہی ہے جو خوبصورت تو کیا ہوتا کھدّا اور بیوقوف بھی ہے
اور اس کی عادتیں بھی اچھی نہیں ہیں لیکن اس میں سب سے بڑی خوبی
یہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی تمام دولت کا تنہا وارث ہے۔ راجو کی ماں
جانتی تھی کہ نمبردار اس رشتہ کو بڑی خوشی سے منظور کرلے گا اور اس
کی موجودگی میں کسی دوسرے رشتہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے
گا لیکن جب راجو نے صاف کہدیا کہ وہ شادی کریگا تو نینا سے
ورنہ شادی ہی نہیں کریگا۔ تو اس کی ماں نے نمبردار کے یہاں
جانے کا ارادہ کر ہی لیا۔
زمیندار نے اس کی بات سنی۔ یہ بڑھیا تھی تو غریب مگر کام بہت
ایمانداری اور محنت سے کرتی تھی اور یہ راجو کی ماں تھی جو نینا میں بیٹا
کا دوست تھا وہ اگرچہ نینا کو گندے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے
منع کیا کرتا لیکن راجو کی عادتیں دوسرے بچوں کی طرح نہیں تھیں
اس لئے وہ زیادہ سختی بھی نہیں کرتا تھا اس لئے اس نے اس کی ماں
سے زیادہ بُرا برتاؤ نہ کیا بلکہ بڑی نرمی سے اسے سمجھایا کہ یہ بات ناممکن ہے
اور راجو کو یہ بات اپنے سر سے نکال دینی چاہیئے اس کے لئے گاؤں میں
لڑکیوں کی کیا کمی ہے راجو کی ماں چپکے سے واپس آ گئی اور اتنے ہی سکون کے
ساتھ راجو نے بھی یہ بات سن لی اس کے دل میں کبھی کبھی چبھنے والا کانٹا
اس وقت زور سے چبھا۔ اس کے اندیشے بیکار نہیں تھے۔
اس نے چلتے چلتے سر اٹھا کر دیکھا سورج کا سنہری تھال سامنے
پہاڑ کی چوٹی پر لٹکا تھا اس نے قدم تیز کر دیئے اور ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ
یہیں قریب ہی کہیں نینا نے اسے شہر جانے کے لئے وداع کیا تھا اس کی
کٹورہ سی آنکھوں میں ننھے ننھے موتی چمکنے لگے تھے مگر ہونٹوں پر ایک
مسکراہٹ تھرتھرا رہی تھی اور اسی مسکراہٹ نے اس کے سینے میں عزم
اور حوصلہ بھر دیا تھا اور وہ ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ شہر
روانہ ہو گیا تھا جہاں اسے دن رات محنت کر کے روپیہ کمانا اور پھر لا کر
نمبردار کے آگے ڈھیر کر دینا تھا تاکہ اس کو اس کی زندگی مل سکے۔ اس کی
نینا اس کی اپنی بن سکے۔ پھر اس کی نظروں کے سامنے شہر کی رونقیں، چمک
دمک اور شور و شغب سے بھرپور زندگی کی پرچھائیاں گذرنے لگیں جن
کے بیچ اس نے پانچ طویل سال گزارے تھے اور دن رات ہر طرح کا
کام کر کے جو کچھ جوڑ دیا تھا آج اسے اپنی پیٹھ پر لادے شاداں و فرحاں
گھر لوٹ رہا تھا۔ اس کی کمر پر تھیلہ نما گٹھری تھی جو پہاڑی اون کی بنی ہوئی
تھی اور اس میں بندھا ہوا پٹہ راجو نے سر کے اوپر سے گذار کر ٹھوڑی
پر رکھا تھا۔ سامان اس طرح لادنے کا یہ طریقہ اس نے اپنے بڑوں
سے سیکھا تھا۔ پہاڑ کی اونچائی چڑھنے اور ڈھلان پر اترتے ہوئے جا بجا
اس کو ٹھوکریں لگتیں جس سے گٹھری کے بوجھ سے ٹھوڑی پر رسی کا دباؤ
زیادہ ہو جاتا لیکن اس وقت اسے یہ سارا بوجھ بالکل بے وزن معلوم
ہو رہا تھا۔ اس گٹھری کے بوجھ سے ٹھوڑی پر رسی کا دباؤ زیادہ ہو جاتا
لیکن اس وقت اسے یہ بوجھ بالکل بے وزن معلوم ہو رہا تھا۔
اس گٹھری میں اس کی تمنائیں تھیں اس کے حسین سپنے تھے
اس کے سامنے چمکتے ہوئے دن تھے نینا کا ساتھ تھا اور خوشی
ہی خوشی تھی۔
ایک موڑ سے مڑتے ہی اس کے سامنے اس کا گاؤں آ گیا۔ اس کا
اپنا گاؤں! مگر یہ کیا؟ گاؤں میں جا بجا روشنی ہو رہی تھی ایک طرف
سے ڈھول کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ایک بڑے
پتھر سے اسے ٹھوکر لگی۔ اس نے سہارے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ
مارے وہ گاؤں کا نظارہ کرنے میں اتنا گم تھا کہ اسے یہ بھی خیال نہ
رہا تھا کہ وہ موڑ کے اس خطرناک حصہ پر آ گیا ہے جہاں ایک تنگ
راستے کے دونوں طرف گہرے کھڈ ہیں اور ایک پہاڑی نالا بہتے پورے
زور کے ساتھ بہتا ہے اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور دوسرے
ہی لمحے گٹھری کی رسی ٹھوڑی پر سے پھسل کر اس کے گلے پر آ رہی دوسری طرف گٹھری کے
بوجھ کا زور پڑا اور وہ اس کے زور میں پیٹھ کے بل لڑھکتا چلا گیا دوسرے ہی لمحے دور
نیچے نالے کے گہرے پانی میں کسی چیز کے گرنے کا دھماکہ سنائی دیا۔ پانی ایک بار بلند
تیزی سے اوپر اچھلا اور کپڑے سمول پر آ گیا ڈھولک کی تھاپ پہاڑوں کی
چوٹیوں سے ٹکرا ٹکرا کر چاروں طرف پھیل رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا
جیسے فطرت کا دل اچانک زور زور سے دھڑکنے لگا ہو ——— !
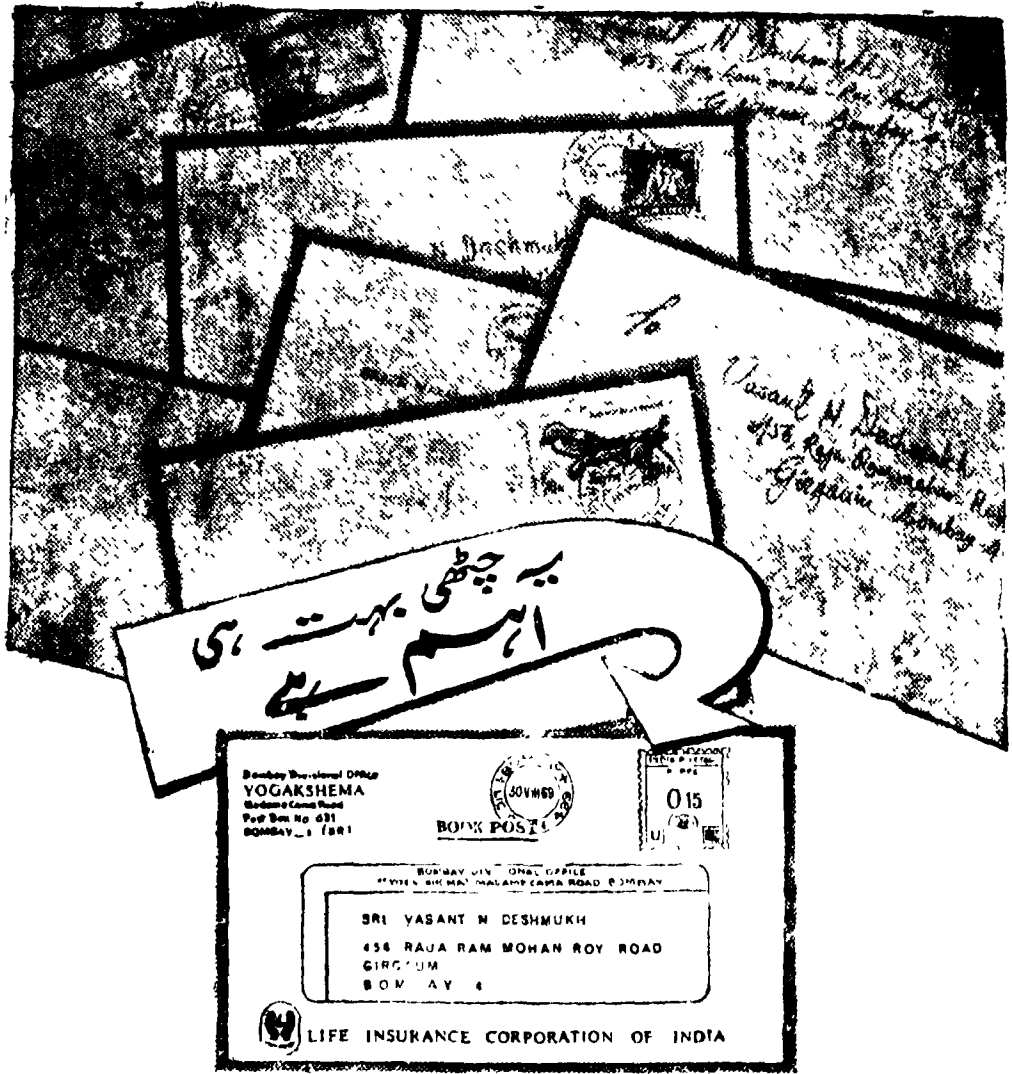
معروف الحسن صدیقی (متعلم دلی یونیورسٹی دلی)

# جدید فارسی شاعری کی چند خصوصیات

جب ہم کسی متمدن یا ترقی پذیر قوم کا بتدریجی جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ قوموں کی تشکیل اور ارتقار میں ادب کا مقام ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ ادب نے بعض مرتبہ وقت کے تیز دھاروں کو اسطرح موڑ دیا ہے کہ جس کا اندازہ بھی مشکل ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ادبی اقدار اور رجحانات میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے بھی موڑ آئے ہیں۔ کہ جو کام بڑے بڑے مذہبی رہنما سیاسی لیڈر اور افواج نہ کر سکیں۔ وہ کسی بھی ادبی تخلیق نے انجام دید یا قوم اور ملک کی ترقی میں ادبی فنکار ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور انہیں بھی شاعر کو اولیت حاصل رہی ہے۔ ایک سیاسی لیڈر کسی خاص مقصد کو لیکر اٹھتا ہے۔ عوام کی ہمنوائی بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اور بیشتر اپنے مشن کی تکمیل کے بعد اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کی شہرت اور مقبولیت بھی متاثر ہونے لگتی ہے اور عوام اپنی راہیں بدلنے لگتے ہیں۔ ایک مذہبی رہنما مذہب کی آڑ لیکر عوام کے جذبات جیتنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن صرف ادبی فنکار کی ایسی حیثیت ہے کہ اس کی تخلیقات سے عوام بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں اور ان حقائق کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو کسی تخلیق میں پیش کیے گئے ہیں اور وہ انجانے طور پر اسپر عمل پیرا بھی ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح فن اور فنکار زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ اور اس کی تخلیقات برابر مستقبل کے لئے مشعل رہ بنی رہتی ہیں۔

شاعر کیونکہ عام انسان کے مقابلہ میں حساس دل اور بیدار ذہن لیکر پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ معاشرہ کی ہر کمزوری اور مستقبل کی ہر ضرورت کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اور پھر اپنا یہ احساس پیغام کی صورت میں عوام کو دیتا ہے۔ جب یہ پیغام عوام تک آتا ہے تو سب کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اسی معاشرہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس لئے عوام اس کے پیغام کو خوشآمدید کہکر اس کے دوش بدوش نظر آتے ہیں اس طرح ایک جدیدی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جو تغیر کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ عام طور پر فنکار کی آواز سماجی بھیڑیوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اور ارباب حکومت تلملا اٹھتے ہیں۔ اس وجہ سے فنکار کو قدم قدم پر آلام و مصائب سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور کبھی کبھی بات دار و رسن تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن فنکار انجام سے بے نیاز اپنا عمل جاری رکھتا ہے اور اس کے فن کی چند خصوصیات ہی اس کو جاوید بنا دیتی ہیں۔ ہر زبان و آداب ادب میں ایسے فنکار وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنھیں آج بھی ہم احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں انگریزی ادب میں شیکسپیر کیٹس، شیلے اردو میں اقبالؔ، حالی اور فارسی میں، حافظ سعدی۔ بہار اور لاہوتی وغیرہ کی جیتی جاگتی مثالیں ملتی ہیں۔ جنھوں نے اپنے لئے مخصوص راہیں متعین کیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ عوام کے نظریات میں تبدیلی رونما کی۔ زیر بحث موضوع کیونکہ صرف جدید فارسی کی چند خصوصیات ہیں اسوجہ سے مناسب ہوگا کہ اس طوالت اور تفصیل سے قطع نظر صرف جدید فارسی شاعری کا جائزہ لیکر تجزیہ کیا جائے کہ فارسی کے جدید شعراء نے ایران کی ترقی میں

شاعر کا کتنا بڑا ہاتھ ہے اور آج کا ترقی
پذیر ایران کافی حد تک لاہوتی کی یہی آواز ہے جس کی
خواہش اس نے اپنی اس نظم میں کی ہے۔

در اصل ایران کی ترقی کا آغاز مشروطیت سے شروع
ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جس سے ہر شعبہ زندگی
متاثر ہوا اور مستقبل کے لئے نئی نئی راہیں کھلیں اور روز بروز
ترقی کے امکانات روشن ہوتے گئے۔

فارسی شاعری میں جدید رجحانات کی ابتدا جن عناصر
کی رہین منت تھی۔ ان میں اخبارات کی اشاعت کو بھی ایک
خاص اہمیت حاصل ہے۔ مشروطیت کے ساتھ ایران میں
اخبارات کی ایک کثیر تعداد منظر عام پر آئی۔ ان میں بیشتر کا
میلان ادبی تھا اور بعض ایسے بھی تھے جنھیں خود شعرا نکالا
کرتے تھے۔ اس طرح ایرانی شاعر ملکی سیاست سے بھی کافی
حد تک قریب ہو گیا۔ اور ان اخبارات کے ذریعہ شاعری
میں سیاسی رجحانات کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور اس دور
میں ایسی نظمیں کہی گئیں جو سماجی اور سیاسی میلانات کی
ترجمانی اور نمائندہ ہیں۔

جدید فارسی شاعری ایک طرف سیاسی اور سماجی موضوعات
سے مستفید ہوئی ہے تو دوسری طرف اس نے شخصی کیفیات
اور ذاتی تجربوں کے اظہار پر بھی کافی زور دیا ہے۔ یہ رجحان
شاعر کی داخلی شخصیت کا آئینہ دار ہے اور ان تاثرات
کو پیش کرتا ہے جو مشاہدہ نفس اور دروں بینی
(          ) سے حاصل
ہوئے ہیں۔ مایوسی اور افسردگی اس کی نمایاں خصوصیات میں
سے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر ایک ایسے روحانی
کرب میں مبتلا ہے جس کا اسے کوئی حل نظر نہیں آتا۔ یہ
بہ صورت ہمیں کئی فارسی شعراء میں نظر آتی ہے۔ لیکن خاص
طور پر "نہار" کی افکار پریشاں قابل ذکر ہے۔ جس میں پہلے
پہل اس کیفیت کا اظہار ہوا ہے اور وہ پوری پوری ترجمانی
کرتی ہے۔

جدید شعراء نے فطرت کی عکاسی کی ہے اور خوبصورت
منظر نگاری سے اپنا ایوان شاعری آراستہ کیا ہے۔ یہ منظر نگاری
دو اہم خصوصیت کی حامل ہے۔ اول یہ کہ اسمیں فطرت
کے مختلف اور گوناں گوں پہلو دکھلانے کی کوشش کیگئی
ہے۔ دوسری یہ کہ اس کا اکثر و بیشتر شاعر کے اپنے جذبات
سے گہرا ربط و تعلق ہوتا ہے۔ کلاسکی شاعری میں فطری
منظر نگاری کا کوئی الگ وجود نہیں تھا۔ وہ عموماً کسی
نظم کا کوئی حصہ ہوئی تھی مثلاً اکثر اسے قصیدے میں
تشبیب کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جدید شاعری
نے فطرت کی عکاسی کا اپنا ایک علیحدہ مقام متعین
کیا اور اسے فروغ دیا۔ رشید یاسمی پرویز ناتل
خانمری اور فریدوں تولّلی مجموعی جدید ایرانی شعرا نے
فطرت سے کافی ہم آہنگی اور قرب کا ثبوت دیا ہے وہ
وہ مختلف نظریوں اور زاویوں سے فطرت کا مشاہدہ
کرتے ہیں۔ اور اس کا دائرہ اظہار کبھی پرانے شعرا کے
مقابلہ میں زیادہ صاف اور وسیع ہے۔

دور حاضرہ کی فارسی شاعری میں موضوع کی تبدیلی
کے ساتھ ساتھ اسالیب میں بھی تجربے کئے جاتے رہے
ہیں۔ اس قسم کے تجربات کی حیثیت ایک عرصہ تک محض
ضمنی تھی۔ اور شاعر اپنے اظہار جذبات کے لئے عام طور
پر روایتی اسالیب کا سہارا لیا کرتا تھا۔ لاہوتی
اور نیما یوشیج نے سب سے پہلے نئے اسالیب کی
طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور ان کے استعمال کو اپنے فن
کا شعوری مقصد بنایا۔ اسطرح فارسی شاعری میں جدید
اسالیب کا سہرا انھیں کے سر ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گذرا فارسی میں ایک نئے اسلوب
کا اضافہ ہوا ہے جس کو آزاد نظم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے
ایران میں اس جدید اسلوب کو بھی معمولی مقبولیت حاصل
ہوئی ہے اور نئی نسل کے اکثر شعرا اسمیں نظمیں کہہ رہے
ہیں۔ موجودہ دور میں غیر مقفی شاعری کو بھی رواج ملا
ہے۔ لیکن بعض اسناد سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قدیم ایرانی
ادب میں اس قسم کی شاعری کا وجود تھا۔ لیکن وہ ادبی

کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

دورِ حاضرہ کا ایرانی شاعر معاشرے کے نقاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنے ملک کے گوناگوں مسائل کا سنجیدگی سے جائزہ لیکر انھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی تنقید میں اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے وہ اپنے وطن عزیز کو دنیا کے دوسرے متمدن ممالک کے برابر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں جمود ترقی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس وجہ سے وہ حرکت کا خواہشمند ہے وہ چاہتا ہے کہ ایران میں سیاسی اور سماجی جمود ختم ہو کر ملک تجدد اور تغیر کی راہ پر گامزن ہو کر ترقی کی منازل طے کرے۔ چنانچہ اسی جذبے نے ایرانی شعرار کو اشعار کے نشتر دئے تاکہ وہ ان کے ذریعہ معاشرے کی جراحی کریں اور اس فاسد مادّے کو نکال پھینکیں جو ترقی کی راہوں میں حائل ہے۔ چنانچہ آپ نے اس بعد ان کی ترجمانی بہار اپنی نظم کہنہ "شش ہزار سالہ" میں اسطرح کرتا ہے جس سے اس کے جذبات کی آئینہ داری ہوتی ہے۔

ای کودک عہد پہلوانی　　　دی بچۂ روزگار سی ردس
ای کام گرفتہ از جوانی　　　در عہد سپند بار کاؤس
ای رستہ بخر خسروانی　　　از جنگ صد انقلاب منحوس
ہاں عہد تجدد است دانی　　　کز علقہ و بند عہد ملموس
ہنگام شکستن و فرار است

ایران میں شعرار کے یہاں تجدد کی یہ خواہش مختلف موضوعات میں ظاہر ہوئی۔ مثلاً مذہبی رواداری جدید تعلیم اور سب سے زیادہ آزادیٔ نسواں جس کو شاعر کسی بھی ملک وقوم اور معاشرے کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتا ہے ایران میں۔ ایران میں موجودہ صدی کے شروع ہی سے عورتوں کے حقوق کے متعلق خیالات میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے جدید تعلیم کا ارتقا ہوا وہ تعصبات کمزور ہوتے گئے۔ جو صنف نازک کے لیے عام تھے اور جن کے ماتحت عورت کو کمزوری و کمتری کا درجہ دیکر سماجی زندگی سے دور رکھا جاتا تھا۔ معاشرے میں اسکی کوئی حیثیت و منزلت نہ تھی اس کی زندگی چہار دیواری میں محدود بچوں کی ولادت اور پرورش ملتا ہی تھی۔ جنگ عظیم کے بعد یہ احساس شدت سے ہوا کہ ملک کی ترقی اور بہبودی کے لئے عورتوں کو سماجی حقوق دینے ضروری ہیں۔ چنانچہ اس جنگ کے بعد سے ہی آزادی نسواں کے جذبہ کو تقویت ملنی شروع ہوئی۔ آخرکار اسطرف خصوصی توجہ ہوئی۔ اور ایران میں پردے کا رواج ترک کر دیا گیا تجدد و تغیر کی دوڑ میں جہاں سیاسی لیڈر، سماجی رہنما اور اس قسم کے دوسرے لوگ پیش پیش رہے ہیں وہاں ایرانی شاعر بھی سب کے دوش بدوش نظر آتا ہے اور مقصد کے حصول کے لیے شعرار کی خدمات کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تحریروں نے نہ صرف عورت کو اس کی بے بسی، لاچاری اور زبوں حالی کا احساس دلایا بلکہ اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے حالات کا تدارک کرے اور اپنی آزادی کے لیے جد و جہد کرے۔ اور میدان عمل میں آکر اپنے حقوق تسلیم کرائے لاہوتی نے اپنی نظم "بدختر ایران" میں اس رجحان کی ترجمانی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے اور ایرانی عورت کو اس کی زبوں حالی کا احساس دلاتے ہوئے مستقبل کے لیے درس دیا ہے اور بتلایا ہے کہ اس کی فلاح اس میں ہے کہ وہ مردوں کے دوش بدوش میدان عمل میں آئے۔ یہی نئے دور کا تقاضہ ہے۔ چنانچہ لاہوتی اسطرح مخاطب ہے۔

اندران دور تمدن صنما لائق نیست
دلبری چون تو ز آرائش دانش بکنار
ننگ باشد که تو در پردہ خلقی آزاد
شرم باشد که تو در خواب جہانی بیدار
ترک چادر کن و مکتب برو و درس بخوان
شاخۂ جہل ندارد ثمری جز ادبار
دانش آموز و از احوال جہان آگہ شو
وین نقاب سیہ از روی مبارک بردار

مذکورہ اشعار میں لاہوتی نے جس انداز میں ایرانی عورت کو خطاب کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

اعتبار سے مقبولیت حاصل نہ کرسکی تھی۔ یہ جدید شعرا ہی کا کارنامہ ہے کہ جو سنجیدگی سے غیر مقفیٰ شاعری کے امکانات دریافت کرنے اور اس کی ادبی حیثیت منوانے کی جدوجہد کررہے ہیں۔

جدید فارسی شاعری میں زبان کی سلامت پر بھی توجہ کی گئی ہے۔ شعرا کی کوشش ہے کہ عربی کی نامانوس اصطلاحات کو ترک کرکے فارسی کے عام فہم الفاظ سے کام لیا جائے۔ زبان کے سلسلے میں ایک رجحان یہ بھی ہے کہ شاعری کو عامیانہ اور بازاری بول چال سے آشنا کیا جائے اور اسمیں ایسے الفاظ وکلمات لائے جائیں۔ جو روزمرہ میں داخل ہوں۔ قیام مشروطیت کے بعد جب اخبار و رسائل میں لکھنے کا چرچا ہوا اور شعرا نے عوام کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اسوقت سے رفتہ رفتہ مذکورہ طرز بھی رواج پا رہا ہے۔ کیونکہ یہ عوام کی زبان وجذبات سے ہم آہنگ ہے۔

# ادھ کھلے پھول ——— جنھیں آبیاری کی ضرورت ہے

از

## سرگرداں دہلوی

اس عنوان کے تحت آپ ان نئے لکھنے والوں سے متعارف ہوتے ہیں جو باوجود اپنی علمی اورادبی صلاحیت اور قابلیت کے تعر گمنامی میں پڑے ہیں یا بے توجہی کا شکار ہیں زیر نظر شمارہ میں آپ صباح الدین اختر شہزاد صاحب متعلم ایم اے دہلی یونیورسٹی سے متعارف ہو رہے ہیں ——— (ادارہ)

ہر کالج اور یونیورسٹی میں آپکو کچھ طالب علم ایسے ملیں گے جو اکیلے نہیں چلتے بلکہ ان کے ساتھ کم ازکم پندرہ بیس طلبا کی ٹولی ہوتی ہے جسے پارٹی تو نہیں البتہ منڈلی ضرور کہا سکتا ہے۔

اب اس منڈلی کے سربراہ کی دو خصوصیت ہو سکتی ہیں اوّل یہ کہ وہ اس طرح گھوم پھر کر خود غرضی میں مبتلا، جاہل اور ناکارہ رہنا چاہتا ہے بلکہ وہ اپنی پوری منڈلی کو بھی اسی ڈگر پر چلانا چاہتا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ لیڈر طالب علم کلاس سے نکلتے اور ادھر خواہش مندان ملاقات نے دست درازی نہیں بلکہ قدم درازی کی اور ابھی وہ کلاس سے مکمل طور پر نکلنے بھی نہ پایا کہ بیس پچیس طلبا نے ان کے اردگرد گھیرا ڈالکر چلنا شروع کر دیا یہ صرف اس لئے کہ وہ کلاس میں اپنی قابلیت کا سکہ جمائے رہتا ہے خوش اخلاقی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اور خندہ پیشانی کی گلپاشی کرنا اس کا مذہب ہے انسانیت کی خدمت اور اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک اس کا مسلک ہے —

تو آیئے آج آپ ایسی ہی شخصیت سے متعارف ہوتے ہیں ۸ جولائی ۴۸ء کو روبکاری کے لئے دنیا میں بھیجدیا گیا گھر والوں نے آپ کو ابتدا ہی میں پالنے میں ڈالکر آپ کے پاؤں دیکھ لئے تھے اس لئے مزاج کے مطابق تعلیمی راستے دکھلائے گئے چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ ہوئے تھے کہ والد محترم حضرت علیم اختر مظفر نگری نے اپنے مزاج اور اسلامی حکم کے مطابق مسجد کا دروازہ دکھایا لیکن تھوڑے ہی دن بعد چٹائی بچھنے کا بہانہ اور گلہ کر کے اس جگہ سے (چھٹکارا) نجات حاصل کر لی یا یہ کہئے کہ مسجد پاک ہو گئی۔

اب آپ کا رخ ایک تاریخی اسکول فتحپوری مسلم اسکول کی طرف ہوا لیکن اس جگہ کو بھی آپ کی زیادہ دیر کی رفاقت مقدور نہ تھی اس لئے اپنا ڈیرہ (لینہ) اٹھا کر ڈپٹی نذیر احمد اور محمد حسین آزاد وغیرہ کے اسکول اینگلو عربک میں داخل ہو گئے یہیں پر آپکے عہد طفولیت کے ایام گذرے یہاں تک کے دور شباب نے سنجیدگی کے شکنجے میں جکڑ دیا۔

عہد طفولیت ختم ہوا اور دور شباب انگڑائیاں لیتا ہوا سر پر آ پہنچا۔

ثانوی تعلیم ختم کر کے اس کالج (دہلی کالج) میں داخل ہوئے جہاں کبھی غالب مرحوم کو مسند استادی پیش کی گئی تھی دہلی کالج میں اپنے مزاج اور اطوار کے مطابق بہت جلد احباب کا ایک وسیع حلقہ بنالیا۔ کالج کا کوئی ادبی فنکشن ہو یا غیر ادبی (یعنی سیاسی زور آزمائی یا تفریحی) سب میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں (امام نہیں تو کم ازکم اس مقتدی کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں جو

پہلی آبا جماعت نماز پڑھنے کا عادی ہو) جب تک آپ اس ہنگامہ میں شریک ہوں وہ ہنگامہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک سال کیلئے کالج کی بزم ادب کا سکریٹری بنا دیا گیا۔

جہاں آپ کی وہ تمام انتظامی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں جس کی صرف ایسے آپ ہی سے توقع کی جا سکتی تھی۔ لگاتار تین سال تک صنف نازک سے نبرد آزمائی کے بعد قسمت نے عین نتیجہ کے وقت دھوکا دیدیا یعنی محترمہ صنف نازک صاحبہ نے آپکو تعلیم کے میدان میں چت کر دیا اور ہوش آیا تو لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ ؎ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں"۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس صنف سے طاقت آزمائی کی کوشش کی جو ہمارے پر دادا صاحب مرحوم (آدم) کو جنت سے نکلوا کر باز آئی ہم اور آپ کیا؟ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ اسی لئے اب گھات لگائے بیٹھے ہیں کہ ایک مرتبہ تو اپنے اس حریف (صنف نازک) نامراد سے بدلہ لے لیں۔ جو ہر موقعہ پر آپکو زک دے جاتا ہے۔

اب آپکے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہوگا آپ بھی کہیں گے کہ یہ جامع صفات اور کمالات ہیں کون؟ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ پہلے ان کو تمام خصوصیات کے ساتھ آپکے سامنے کاغذی پیرہن میں پیش کر دوں۔

آپ ایک اچھے شاعر کے فرزند ہیں اس لئے انہیں پیدائش کے فوراً بعد خدا کا نام سنانے کے بجائے والد ماجد کے دیوان کے چند اشعار گوش گذار کرائے گئے اور پھر کچھ اشعار شہد میں ملا کر گھٹی کے بہانے چٹائے گئے تیل کی مالش کے بجائے ان کے نرم و نازک کول مصبدن پر حضرت علیم اختر مظفر نگری کے دیوان کی روح مل گئی اور پھر کچھ اوراق باقیماندہ رہے ان میں سے کچھ کو نیچے بچھا دیا گیا اور کچھ ان کے اوپر ڈال دیئے گئے

تو جناب ایسی صورت میں کیوں نہ وہ ایک کامیاب شاعر بنتے ان کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک کم از کم پچاس غزلیں ہندوستان کے مختلف رسائل اور جرائد کی زینت بن چکی ہیں اور یہی نہیں بلکہ ان کی شہرت نے ہندوستان کی سرحد کو بلا پاسپورٹ اور ویزے کے پار کر لیا۔ اور پاکستانی جوہر شناس اپنے اخبار اور جرائد کو ان کے کلام سے مزین کرتے رہے۔

اس مرتبہ شاہجہاں کے دربار میں درباری شاعر کی حیثیت سے تشریف لا رہے ہیں

"با ادب با ملاحظہ ہوشیار"

حامل صفات، جامع کمالات کا اسم گرامی ہے صباح الدین اختر ورثہ میں بنے اور شہزاد دوستوں نے بنا دیا۔
نام کی ترکیب اس طرح کیجئے۔

— صباح الدین + اختر + شہزاد = ایک ابھرتا شاعر — جو ماضی سے نالاں ہوتے ہوئے مستقبل کے خوش آئند لمحات کا منتظر ہے۔

ایک موقع پر کیا خوب شعر کہا تھا، ملاحظہ فرمایئے۔

دل دھڑکتا ہے تو پیغام سکوں ملتا ہے
اک زمانہ میں یہ انداز جنوں ملتا ہے

پڑھتے ساتھ ساتھ سر دھنیئے اور داد دیجئے۔ اس سرگرداں کو جو آپ کی خاطر دریائے ادب میں ہزار بار غوطہ زن ہو کر اس گوہر آبدار کو آپکے سامنے پیش کر رہا ہے

ان کی مکمل تعریف اس طرح ممکن ہے۔

حسن ہے ذات مری، عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

---

انتظار ان کا عبث اے دل مشتاق نہ کر
وہ کسی اور کے مہمان بنے بیٹھے ہیں

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
تم سے دل کو لگا کے دیکھ لیا

---

# دو غزلیں

شہزاد اختر

غیروں سے سوا اُن کا ستم دیکھ رہے ہیں
ایسا بھی رہِ عشق میں ہم دیکھ رہے ہیں

پیراہنِ گل اشک سے نم دیکھ رہے ہیں
خوشیوں کو پسِ پردۂ غم دیکھ رہے ہیں

کیا ہوگی انھیں پیچ و خمِ زیست کی پرواہ
جو لوگ تیری زلف کے خم دیکھ رہے ہیں

منتظر ہے قیامت کا مجھ کو دمِ رخصت
مڑ مڑ کے وہ دیدۂ نم دیکھ رہے ہیں

اے گردشِ تقدیر کریں تجھ سے گلہ کیا
جو تو نے دکھایا وہی ہم دیکھ رہے ہیں!

کیا دل میں شہزاد لائے تھے ہم ارمان
حسرت سے مگر دستِ کرم دیکھ رہے ہیں

---

آپ کو اپنا بنانے کے لئے
میں نے الزام زمانے کے لئے

رازِ غم اُن سے چھپانے کیلئے
پی لئے اشک دکھانے کے لئے

دے دیا کاتبِ قسمت نے مجھے
غم کا عنوان فسانے کے لئے

اب بھی آتی ہے نسیمِ سحری
اُن کا احساس دلانے کے لئے

دیکھنا ان کا مجھے ایک نظر!
بن گیا فسانہ زمانے کے لئے

شہزاد اب روٹھنا نادانی ہے
وہ خود آئے ہیں منانے کے لئے

پطرس بخاری

اس عنوان کے تحت پرانے ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور ان کا کلام یا نمونہ نثر شائع کیا جاتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں اردو کے مشہور ظرافت نگار پطرس بخاری کا مزاحیہ مضمون "کتے" نقل کیا جا رہا ہے — پطرس جدید اردو ادب کے مزاح نگاروں میں ایک امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے مغربی طنز و مزاح کا بہت گہرا مطالعہ کیا اور دلکش، فنی چابکدستی کے ساتھ انگریزی اثرات کو اردو کے مضامین میں نمایاں کیا — یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ پطرس نے بہت کم لکھا ہے ان کے مضامین کا بس ایک مختصر مجموعہ (پطرس کے مضامین) شائع ہوا ہے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی — یہ کتے کیا کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے اب جناب اگر وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے ۷ بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے ۶ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے کل ہی کی بات ہے کہ رات کے گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دے دیا ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے۔ اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ کر لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر آرڈر پکارا مگر ایک موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھئے میاں اگر تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جاکر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آکر سوتوں کو جگانا کونسی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں اکثر تو ان میں ایسے قوم پرست ہیں کہ کرتے پتلون دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابل تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے اس کے علاوہ ایک اور بات ہے یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لیکر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی کہ عش عش کرتے لوٹ آئے جونہی بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں ہی کھڑے کھڑے ہلکی سی بخ کر دی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر بخ کر دی چوکیدار کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر نہ سر نہ پیر تان پہ تان لگائے جاتے ہیں بے تالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں گھمنڈ اس بات کا ہے کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن ہم سے قسم لے لیجئے کہ ایسے موقعوں پر ہم نے کبھی ستیہ گرہ سے

جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں جب چلتا ہے تو اس کی مسکینی
اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ
کے ساتھ لگی ہوتی ہے سڑکوں پر بیچوں بیچ غور و فکر کیلئے لیٹ
جاتا ہے ۔ اور آنکھیں بند کرلیتا ہے شکل بالکل فلاسفروں کی سی
اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے کسی گاڑی والے نے مسلسل بگل بجایا
گاڑی کے مختلف حصوں کھٹکھٹایا لوگوں سے کہلوایا خود دس بارہ دفعہ
آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا
صورتحال کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں کسی نے ایک چابک
لگادیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھکر ایک گز
پرے جا لیٹے اور خیالات کے سرے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں
سے پھر شروع کردیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے ہی لیٹے
سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے ایسی چھچھوری چیز مل کیلئے راستہ چھوڑ دینا وہ
فقیری کے شان کے خلاف سمجھتے ہیں رات کے وقت ہی کتا اپنی خشک
پتلی سی دم کو بحد امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے اس سے محض خدا
کے برگزیدہ بندے کی آزمائش مقصود ہوتی ہے جہاں آپ نے غلطی
سے اس پر پاؤں رکھ دیا انھوں نے غیظ و غضب کے لہجے میں
آپ سے پرسش شروع کردی۔ بچہ فقیروں کو چھیڑتا ہے نظر نہیں
آتا کہ ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں" بس اس فقیر کی بددعا سے
اسی وقت راستہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب
نظر آتے رہتے ہیں کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں
اور جانے نہیں دیتے آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوائن میں
اٹکے ہوتے ہیں اگر خدا مجھ کو کچھ عرصہ کے لئے اعلیٰ قسم کی کاٹنے اور
بھونکنے کی طاقت عطا فرمادے تو [illegible] انتقام میرے پاس کافی
مقدار میں ہے رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لئے کسولی پہونچ جائیں
ایک شعر ہے ع

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزق گدا را

یہی وہ خلاف فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لئے باعث ننگ ہے
انگریزی میں مثل ہے بھونکتے ہوئے کاٹا نہیں کرتے بجا سہی لیکن
کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب کہ بھونکنا بند کردے
اور کاٹنا شروع کردے ۔ ——

## تیرے بغیر

محمد یونس ارشد بلرام پوری

ہر مسرت آج ہے نذرِ خزاں تیرے بغیر
لٹ رہا ہے زندگی کا کارواں تیرے بغیر

کون ہوتا ہے کسی کا جانِ جاں تیرے بغیر
زندگی ہے زندگی سے بدگماں تیرے بغیر

اک سہارا ہے کہ تیری یاد ہے تسکین جاں
ورنہ دل کا لٹ چکا تھا کارواں تیرے بغیر

تجھ سے کیا چھوٹے کہ برگشتہ زمانہ ہو گیا
ہم ہیں دل ہے اور جورِ آسماں تیرے بغیر

پیکرِ غم نقشِ حسرت ایک تصویرِ جنوں!
سامنے کس کے ہو شرحِ داستاں تیرے بغیر

دل کو میں روتا ہوں دل روتا ہے میرے حال کو
کشمکش میں ہے میری عمرِ رواں تیرے بغیر

ہیں بہاریں بھی چمن بھی غنچہ و گل بھی مگر!
جیسے آزردہ ہو رنگِ بوستاں تیرے بغیر

بے نیازِ جادۂ منزل رہا میرا جنوں!
یعنی میں پھرتا رہا بے خانماں تیرے بغیر

یوں تو ہیں دنیا میں ارشد کے بہت پرساں حال
کون ہوتا ہے کسی کا جانِ جاں تیرے بغیر

منہ موڑا ہو تو شاید آپ اس کو تعلی سمجھیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ہاتھ میں ضرور رکھنی چاہیئے کہ دفع بلیات ہے لیکن ہم خواہ مخواہ کسی سے عداوت پیدا کرنے نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے۔ اگر آپ ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگالیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے یہ البتہ ٹھیک ہے کہ ایسے موقعہ پر کبھی گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سروں کے سوا کچھ نہیں نکلتا اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہوتی تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقعہ پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اتر جائیگی اس کی جگہ شاید آپ دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے باہر آرہے ہیں چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں اور نوشتنی کا عالم بھی ہے اس لئے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سرے بھی ہوگئے۔ تو کوئی یہی سمجھے کہ انگریزی موسیقی ہے اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی ذرا تصور تو ملاحظہ ہو آنکھوں نے رہ بھی اتنا تصور کیا ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا یہ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے چھڑی کی گردش کم ہوتے ہوتے ایک مناسب اعتدال پر آگئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہوگئی۔ لیکن کیا مجال کہ ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہو طلب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا یعنی کسی کتے نے ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگذشت کی بجائے ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ یہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو"

لیکن ع کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے میں مصر ہیں سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بوڑھوں سب ہی کو تعلق ہے اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کو بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک" اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیروں سے بندھا ہونا چاہیئے" لیکن یہ کم بخت دو روزہ سہ روزہ دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے نیچے آکر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔۔۔ اب اگر یہ خاکسار ہی موٹر چلا رہا ہو تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی ان کی جان بخشی تھوڑی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قوا کو معطل کر دیتی ہے خصوصاً جب کسی دوکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر تبلیغی کام شروع کر دے تو آپ ہی کہئے کہ ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں۔۔۔؟ ہر ایک طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیر لب) بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی سکنات ہماری) اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے۔

اگرچہ یہ مجھے بھی معلوم نہیں کہ اگر ایسے موقعہ پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک قابل نفریں رہی ہے اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہدے کہ عالیجناب سڑک بند ہے تو خدا کی قسم ہم بغیر چوں و چرا کئے واپس لوٹ آئیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپتے گزار دی ہیں لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ اور متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا کمینہ حرکت ہے (قارئین کرام کی خدمت عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز میں نہ پڑھا جائے مجھے کسی کی دل شکنی منظور نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں کتے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا عموماً اس کے

# زخمِ تمنّا

سید مظفر حسن
متعلم دلّی کالج دہلی

وہ سمندر کے کنارے ماہیٔ بے آب کی طرح مچلتی ہوئی لہروں سے کھیل رہا تھا۔ بال آوارہ بادل کی طرح پیشانی پر بکھرے ہوئے۔ اُلجھے اُلجھے سے بال گریبان چاک۔ خاکِ پریشاں جیسے خزاں کی بدنصیبی کا عالم اُس پر بھی طاری ہو۔ مترنم صبا رکے ننھے ننھے قطرے سیمیں چہرے پر ٹھہرے ہوئے چاند کی نیم مدھم روشنی سے دمک رہے تھے جیسے تاروں کا کارواں آنکھ مچولی کھیل رہا ہو

میں سبک رفتار دبے قدموں اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی، میری آہٹ پاتے ہی وہ چونک پڑا۔

"اوہو، نیلما ——— تم ——— آؤ" سر اٹھائے ہوئے درد کے سانچے میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ پریشان گردیدہ نظر آرہا تھا۔ امید کے سپنوں میں کھویا ہوا۔ جہاں راحت کی چھاؤں بے ارادہ منزل سے دور ہو چکی تھی۔ وہ ایسی ٹھکرائی ہوئی محفل کا پروانہ تھا جہاں شمع کی بے زبانی نے اس سے زبان درازی کی تھی۔ وہ، ایسے چمن کا عندلیبِ بہار تھا جہاں گلوں نے اس کے ساتھ ——— بے وفائی کی تھی۔ اس کے سارے خواب قصرِ دل کے نیچے دب دب کر اپنا دم توڑ رہے تھے۔ وہ بیش بہا آنسو آنکھوں کی سیاہ شگاف سے ڈھل ڈھل کر نیچے گر رہے تھے۔

اُس کے ماضی کا ہر راز میرے سینے کی پُراسرار وادیوں میں پرورش پا رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ پتھر کی مورتی بنا آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ پھر وہ اچانک بے خیالی سے چونکا۔ جیسے اس کے خاموشی کے طلسمِ حیات کو کسی نے توڑ دیا۔ وہ ساحل سے ہٹ کر خشکی میں بیٹھ گیا۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ریت کو ہاتھوں میں مسلتا رہا۔

"ان دنوں تم کیا رہے ہو دلیپ؟" ——— میں نے پوچھا۔

"بس یوں ہی بمبئی کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا ہوں ——— لیکن شکر ہے ابھی تک کوئی کنکر نہیں نکلا!"

اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا۔

سرد آہ بھرتے ہوئے اُس نے کہا "نیلما ——— تم؟"

افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم میری حیاتِ گذشتہ جو ریگ رسوا سا کی طرح اِدھر سے اُدھر بے قرار گھوم رہی ہوئی ہے برسوں کی واقف ہو۔ کسی داستان کسی کہانی کا چکیدہ موڑ کوئی نقش خمیدہ تم سے چھپا نہیں۔ اور تم ان واقعات سے بھی بخوبی آشکارا ہو جب بہت دن ہوئے ایک معمولی سی چنگاری نے میرے سینے میں جگہ پائی تھی۔ میرے پہلو میں سما لیا تھا اور اپنی گرمائی سے میرے تمام جسم کو لالہ زار داغوں سے مالا مال کر دیا تھا۔ جب میں نے اس کی نیل کنول لمبی لمبی آنکھوں میں اپنی تصویر کی جھلک دیکھی تھی تو خوشی سے خود رفتہ ہو گیا تھا۔

"لیکن تم اس کا خیال اپنے دل سے کیوں نہیں نکال دیتے؟" ——— میں نے کہا۔

اس نے تم سے بیوفائی کی چپکے سے دامن بچا کر نکل گئی وہ بری تھی۔ لوگ اس پر انگلیاں اٹھایا کرتے تھے۔ اس کے خیالات کی گرد جو تمہارے دل و دماغ کے دامن پر جمی ہوئی ہے اسے جھاڑ کیوں نہیں دیتے۔ اب وہ تمہیں برہا کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جلتا چھوڑ گئی ہے۔

"وہ بُری نہیں تھی۔ بُرا تو میں ہوں ———" اس نے کہا ——— سنو نیلما ——— انسان کی بُرائیوں کے ساتھ ساتھ اس کی اچھائیوں پر بھی نظر کرنی چاہئے۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کی تمام خوبیوں کو پسِ پشت ڈال دو۔ فراموش کر دو۔ اور از سرِ نو اس کے عیبوں کو گننا شروع کر دو۔ وہ تمہاری نظروں میں ———

کیوں کہ وہ غریب دکھوں کے جال سے کبھی آزاد نہ تھی۔ ہر چند زمانے کی گردش دل آزاری کا شکوہ اُس کے ہونٹوں پر ضرور تھا۔ لیکن شکایت کبھی نہیں کی۔ مگر میری نظروں سے اس کا بھولا پن دیکھو۔ وہ زمانے کی سرمستیوں رنگینیوں ساغر و مینا کا سنجوگ پائل کی جھنکار غرقاب اور چور جوانی سے بالکل الگ۔ ان تمام رہگذر سے بھی دُور تھی۔

جہاں وحشی اور ہوس کے درندے عقاب کی طرح جھپٹنے والے بیٹھے ہوں وہ سراپا سادگی سے معمور۔ آنچل شانوں سے سرک کر قدموں کو چومنے سے تشنہ لب رہ جاتا۔ شاخِ گل کی طرح خمیدہ کمر۔ نوکیلی گھنی پلکیں۔ نرگسی آنکھوں میں خاموش سمندر ٹھہرا ٹھہرا۔ قدموں تک پڑیں زلفیں جنھیں دیکھ کر میں جی ڈسے بے جان ہو گیا تھا۔ جیسے تمام بدن میں زہر سرایت کرنے لگا تھا۔ اُس کی ہلکی سی مسکان سے بجلیاں چمک پڑتیں۔ باریک ہونٹ جیسے پہلی تاریخ کا ماہِ نو۔ اُس کے انگڑائی لینے سے لہروں میں بلا کا جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ معصوم کلی میری آرزوؤں کے پھول کھلنے سے پہلے مرجھا گئے۔ اس نے میرے لئے ہر طرح کا ظلم و جبر برداشت کیا۔ زمانے کی مطلق پرواہ نہ کی۔ ماں باپ کی نظروں سے چھپ کر مجھ سے ملنے آتی۔ نہ جانے اُس نے میرے خاطر کیا کیا مصائب و آلام سر پر اٹھائے۔ اور اُف تک نہ کی۔

وہ افسردہ رنج و ملال کی پرانی تصویر بن گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے تھے۔ جیسے چراغ بے زلیست کو حاسد ہوا اُس کے مُنہ پر طمانچے مار مار کر بجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ لیکن میں چپ چاپ امرت کا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ میں نے بات کا پہلو بدلنے کی ہر چند کوشش کی مگر وہ خود رفتگی کے عالم میں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرج دلاتے ہوئے کہا "گزرے ہوئے دن کی طرح۔ جو گزر گیا اسے بھول جاؤ! بھولی بھٹکی یادوں کی دیواروں سے سر ٹکرانا ہوش مندی کا تقاضا نہیں۔" اپنے آپ کو سنبھالو۔ پھر سے نئے جیون کا آغاز کرو۔

"یہ میرے بس کی بات نہیں۔ دل کے معاملات میں میرا کوئی دخل نہیں —— مجھے کہنے دو نیلما ——" اس نے کہا۔ میرا مداوا دکھ ہی تو ہے۔ اور پھر میرے پاس متاعِ غم کے سوا رکھا کیا ہے۔

جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

شام کا دامن آہستہ آہستہ سمٹتا جا رہا تھا۔ بادلوں کے ارد گرد ہلکی شفق مسکرا رہی تھی جیسے کسی نے شاخ کے چہرے پہ سُرخ رنگ کا بُورا مل دیا ہو۔

سورج کی کرنیں زیادہ تیز تھیں بلکہ دل کو گُدگدا رہی تھیں۔

فضا میں ایک شراب کی سی مستی گھلی ہوئی تھی۔ دور جہاں سمندر کا کنارہ تصور سے بھی دور تنے آغوش سے لہروں پہ کرنوں کی چمک پڑ رہی تھی جیسے لاتعداد چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جوشِ مسرت سے اوپر آتیں اور کبھی ڈر کر تہہ میں چلی جاتیں۔ سیاہ فام ماہی گیر کچھ کنارے پر اور کچھ چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیوں میں سوار جو ہوا کے تیز رُخ پر آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں ایک بے خصی دُھن میں گنگناتے جاتے۔ جال کو اس خوبصورتی کے ساتھ پانی میں پھینکتے۔ مانو میرا دل اس میں اُلجھ کر رہ گیا ہو۔ اور گھائل پنچھی کی طرح تڑپ رہا ہو۔ میں کنارے کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے ایک تصویر نادیدہ سطحِ آب پر جھکی جال پھینک رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ دیکھو! یہ کشتی عجیب سی زندگی اور کتنی مختصر سی دنیا ہے۔ جہاں امیری غریبی کا نام و نشان تک نہ ہو۔ انسان اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کسی نہ کسی صورت میں ذریعہ معاش تلاش اور اختیار کرتا ہے۔ یہ بھوک بھی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ یک بیک اس لڑکی کی نظریں میری طرف غائر ہوتی چلی گئیں۔ سگریٹ کا دھواں چہرے کے آگے چھوڑتے ہوئے اس کی نظروں سے میں نے اپنے آپ کو بچانا چاہا۔ لیکن وہ تیر کی طرح دل میں بیٹھتی چلی گئیں۔ وہ بار بار جال کی آنکھوں میں سے دیکھتی۔ اور پھر مدبھری ہنسی کے ساتھ سر جھکا لیتی۔

"باپو —— میں ابھی آئی ——" اس نے کہا۔

اور وہ بال کو جھٹک کر میرے قریب آئی اور بولی۔

ہلکی سی جھپکی کے ساتھ —— "کیا چاہئے بابو ——؟ کیا مچھلی چاہئے بابو ——"

"ہاں مچھلی —— ایسی مچھلی جو بولتی بھی ہو اور پھرتی بھی ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے ساڑی کا کنارا دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابو —— ایسی مچھلی تو ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔"

"سچ ——" میں نے کہا۔

"ہاں بابو۔ بالکل سچ ——" اس نے کہا۔

"اچھا بتاؤ تمہارا نام کیا ہے" میں نے پوچھا!

"ہمارا —— ہمارا نام —— ہونہہ ہونہہ —— ہمارا نام

پاروتی ہے پاروتی۔

"تم ہمارا نام کیوں پوچھ رہے ہو بابو" اس نے سوال کیا۔

"بس یوں ہی ——" میں نے جواب دیا۔ اچھا یہ بتاؤ پارو تم یہ مچھلیاں کہاں بیچا کرتی ہو۔ میرا مطلب تمہارا باپ!

"ارے پاروتی نام ہے ہمارا پارو نہیں۔ اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل کمسن بچے کی طرح باتیں کرتی۔

"لیکن میں تو تمہیں پارو ہی کہوں گا۔ سمجھی" میں نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

"کیوں بابو ——" اُس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے کہا۔

اس لئے کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو —— اور پارو نام تم جیسی چنچل ہرنی پاک دامن پر بہت اچھا لگتا ہے —— میں نے کہا۔

وہ سر جھکائے گم سم کھڑی رہی اتنے میں اس کے باپو نے آواز دی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے پانی میرے چہرے پر عقیدت بھری نظروں سے پھینکا جیسے میری نظر اُتار رہی ہو۔

"اچھا بابو اب میں چلوں ——" اس نے میری ٹائی کھینچتے ہوئے کہا۔

ارے میں تو بھول ہی گئی بابو —— لفظی بازار میں۔

میں اُس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔

دن مست بہاروں کی طرح بیت رہے تھے۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جہاں ملاقات کی شام ساحل کی گود میں نہ گذرتی۔ وہ ہوتی اور میں۔ حسین خوابوں کے رشتہ کو مضبوط کرتا رہا۔ اور کرنا چاہتا تھا تاکہ بیری جگ کے ظالم اور تلوار سے بھی زیادہ تیز ہاتھ اُسے کاٹ نہ دیں۔ اس کے سائے بھی دور رہنا چاہتا تھا بادلوں کے اس پار جہاں پلکوں کے رہ گذر سے دو چمکتے ستارے نیند میں ڈوبے چاندی لوری دیتی اور چاند ساز بجاتا۔ لیکن کاتبِ تقدیر نے میری زندگی کے ورق پر کچھ اور ہی لکھ دیا تھا۔ اپنا چاہا کبھی پورا نہ ہوا۔ وہی ہوا جو بھگوان نے چاہا۔ ایک روز وہ ساحل پر ساکت واُداس کھڑی تھی۔ ساری کا دامن بھی کہیں تھا۔ بال بھی بکھرے ہوئے۔ رخساروں پر نم آلود دو لکیریں۔

اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے کہا ——

"ارے پگلی کہاں تھی اتنی دیر سے" دیکھ میں تیرے انتظار میں ایک ایک پہر کو گنتا رہا۔ وہ آبدیدہ ہوگئی۔ اُس کی آواز بھرّا گئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا لہجہ ایک دم سسکیوں میں تبدیل ہوگیا۔ اور میرے سینے سے لپٹ گئی۔

"بابو جی مجھے بچالو بابو جی —— میری دنیا لٹ رہی ہے۔ مجھے اس گہرے بھنور سے نکالو بابو جہاں میری ارمانوں کی کشتی کو زبردستی ڈبویا جا رہا ہے۔ میری محبّت میری خوشی کو قید کیا جا رہا ہے"

اُس کے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"اچھا کچھ بتا تو سہی نادان کیا ہوا ——"

"بابو جی میں —— میں کل —— کل میری شادی!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میرے لغزش کھاتے پیروں کو اپنے ناتواں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔ ایسا لگا جیسے محبت کی سخت و مضبوط زنجیریں میرے پیروں میں ڈالدیں گئیں۔ سوچنے لگا اب زندگی ان گرفت سے کبھی آزاد نہ ہو سکے گی۔

من ہی من میں سوچنے لگا محبّت کا گلا گھونٹ دوں۔ یا ماں باپ کی عزت مان مریادا کو پھولوں کی سیج تلے مسل دوں۔ دماغ کی کیفیت بالکل خالی جام کی طرح تھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ اس سے کیا کہوں۔ اتنے میں اُس نے جھنجھوڑ دیا۔

"بابو جی جواب کیوں نہیں دیتے ——" وہ بڑی دھیمی آواز میں بولی۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میرے باپو سے ——"!

میں گھبرا سا گیا —— اپنی خیریت کو چھپا رہا تھا۔

"نراش نہ ہو پارو ——" میں نے دھیرج بندھاتے کہا۔ کل تجھے ضرور بیاہ لاؤں گا۔ تجھے مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا میں تیرے باپو سے کل ملوں گا۔

وہ کچھ کہے بغیر لڑکھڑاتے قدموں واپس چلی گئی۔

دوسرے روز جب اس کے گھر پہنچا۔ وہ اگنی پرکشا کے (بندھنوں) یا بندھنوں میں بندھ چکی تھی۔ اپنی بربادی کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میری آشاؤں کی بستی مٹ چکی تھی۔ اپنی خوشبو

کو خود میں نے غم کا لباس پہنا دیا تھا۔ وہ پاپی من کا فریب یہ گناہ میں لتھڑی ہوئی زندہ لاش۔ آنسوؤں کی برسات عمر بھر ہوتی رہے گی تب بھی دھول نہ ہو سکے گا۔

"نیلما اب تم جاؤ ——" رات کافی ہو چکی ہے۔" اس نے اپنی دمعاد ختم کرتے ہو کہا۔

"ابھی وقت بہت ہے دلیپ ——" میں نے کہا۔

"نہیں نیلما —— یہ وقت گذرتا رہے گا۔ اور جو گذر گیا گذر گیا۔ اس نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔" وہ میری طرف کمر کئے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میں اس کی ادیبانہ اور شاعرانہ گفتگو کو سنتی رہی۔

کچھ کہنا بھی چاہتی پھر ڈرتی کہیں میرے سوالوں کا جواب اس کے پاس ایک ہی ہو گا —— ؟

آخر اپنے جی پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"دلیپ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے —— میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن آج تک تم سے کہہ نہ پائی۔ کیوں کہ تم کسی اور کو چاہتے تھے۔ اور میں تم کو! لیکن آج بھی یہ جذبات کی آگ میری جوانی جلائے جا رہی ہے۔ میں تم کو وہی پیار وہی محبت دونگی میرا تن من دھن سب تمہارے لئے ہے۔ دلیپ میں تمہارا غم بانٹ لوں گی۔ وہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ دوران تمام باتوں کا جواب ایک ہی تھا۔

"نیلما زندگی میں پھول ایک بار کھلتا ہے۔ بہار ایکبار آتی ہے۔ محبت ایک بار ہوتی ہے۔ دل ایک بار ملتے ہیں۔ میں تم کو وہ سب کچھ کہاں سے دے سکوں گا۔ اور پھر میرے پاس تمہارے لئے کچھ بھی تو نہیں۔ اور پھر یہ کون نہیں چاہتا اس کی زندگی میں بہار ہو۔ خوشی ہو۔ ہمدردی دوستی ضروری ہے۔ جیسے زندگی بھر نبھاؤں گا۔ میری جان کسی بھی وقت تمہارے کام آسکے تو بھی انکار نہیں۔ لیکن مجھ سے میری بے خودی نہ چھینو۔ وہ عشق ہی کیا جو کامیاب ہو جائے۔

اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ اور لمبے لمبے کش بھرنے لگا۔ اور ٹکٹکی باندھے لہروں کو تکتا رہا۔ میں اپنے جذبات پر قابو کئے۔ زخم تمنا سینے میں چھپائے آہستہ آہستہ واپس چلی آئی۔

••

عامر قدوائی

اے میری زہرہ جبیں، ماہِ مبیں، جانِ وفا
اور کچھ دیر سہی تلخیٔ مے ناب کا ذکر
پھر تو اس بزم سے جانا ہی پڑیگا مجھ کو
پھر نہ جانے کبھی ہم ایک جگہ ہوں کہ نہوں
پھر نہ جانے کبھی یہ رُت یہ سماں ہو کہ نہ ہو
جانے پھر کون جلائے تیری محفل میں چراغ
جانے پھر تیرے چراغوں میں جلے کس کا لہو
جانے پھر کون بنے پیکرِ تخئیل تیرا
اور دو چار سہی بادۂ زہر آب کے گھونٹ

اے میری زہرہ جبیں، ماہِ مبیں، جانِ وفا
میں نے سوچا تھا کہ یہ حسنِ خداداد تیرا
میری الفت کے سمن زار میں پروان چڑھے
یوں نہ رسوا ہو یا اس طرح سے بازاروں میں
لیکن اے دوست یہ رنگین طبیعت تیری
دعوتِ عام کی دلدادہ یہ فطرت تیری
غرقِ طغیانیٔ حالاتِ محبت تیری
یعنی تکمیلِ خیالات ہے جنت تیری
یہ تیرا ذوقِ تن آسانی، یہ عیش و عشرت
تیری بے باکیٔ جذبات کا پابند شعور
میری چاہت میری الفت پہ ہیں رسوائی کے داغ
اِس لئے آج ہمیں پھر سے بچھڑنا ہو گا
آخری وقت ہے چل جا پھر اک دورِ شراب

اے میری زہرہ جبیں، ماہِ مبیں، جانِ وفا

# اگر آپ!

**لکچرار ہیں** — تو آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اپنے طلبہ سے مضامین لکھوا کر برائے اشاعت روانہ کرائیں۔ ہم ممنون ہوں گے

**طالب علم ہیں** — تو کوئی مضمون (نصاب سے متعلق) ترجمہ (عربی، فارسی یا انگریزی سے کیا ہوا) افسانے اپنے لکچرار یا استاد سے تصحیح کرا کر ہمیں بھیج دیں اپنے مسودے کے ساتھ نیچے چھپا کوپن ضرور منسلک کیجئے۔

**اردو فارسی یا عربی کے سکریٹری ہیں** تو آپ سے گذارش ہے کہ اپنی سوسائٹی کے زیر اہتمام ہونے والی فنکشن (ادبی نشست، مشاعرہ، تحریری یا تقریری مقابلہ وغیرہ) کے بارے میں مطلع کریں۔ ہم اسکی رپورٹ شائع کریں گے۔

یہاں سے کاٹیے

جناب ایڈیٹر صاحب!

ماہنامہ شاہجہاں دہلی

میں ایک مضمون / افسانہ / غزل بعنوان ......... بھیج رہا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو اس کو کسی قریبی اشاعت میں شامل کر کے ممنون فرمائیں ورنہ واپس کرنے کی زحمت فرمائیں۔ واپسی کے لیے ٹکٹ ساتھ ہیں۔ نام:۔

گھر کا پتہ

یہاں سے کاٹیے

# ایک درخواست ــــــــ !

اشاعت کے لئے زیادہ تر ساتھیوں نے افسانے بھیجے ہیں۔ یقینی طور پر افسانہ بھی ادب کی ایک صنف ہے۔ اور اس سے ادب کی خدمت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ شاہجہاں کے صفحات اس سے زیادہ اجازت نہیں دیتے کہ دو سے زائد افسانے شائع ہو سکیں۔ اس لئے ہم اپنے ساتھیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نصاب سے متعلق یا معلوماتی مضامین لکھنے کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ اس سے ہمارا مطلب ہرگز کسی کی صلاحیت کو ختم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہم شاہجہاں کو طالب علموں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانا چاہتے ہیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اس میں نصابی مضامین شائع ہوں۔

# اُن کے نام

اس عنوان کے تحت قارئین شاہجہاں کے وہ پیغامات جو کسی "کو" بھیجوانا چاہتے ہوں۔ شائع کئے جاتے ہیں۔ پیغام خواہ رومانی ہو یا غیر رومانی مگر تہذیب و ادب کے دائرے میں ہونا ضروری ہے۔

● — شاید زندگی بیت جائے گی لیکن تم میرے دل کی دھڑکن کو محسوس نہیں کروگی۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے دل ہی دل میں تمہاری پرستش کرتا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کیا میری محبت یکطرفہ تو نہیں کیونکہ تم ہو کہ ایک بت کی طرح چپ چاپ اور بے حس اور خاموش رہتی ہو۔ اور میں ہوں کہ شمع کی طرح آنسو بہاتا پگھلتا رہتا ہوں۔ کیا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی بھی احساس یا جذبہ نہیں ہے۔؟ اگر نہیں تو پھر بھی میں تمہیں چپکے ہی چپکے پیار کرتا رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

—— ریاض جامعی متعلم جامعہ ملیہ

● — مجھے معاف کردو۔ میں نے تمہارے ساتھ دھوکہ کیا ہاں میں اپنے وعدوں کو نہ نبھا سکی اور بزدل بن گئی — مجھے اپنے والدین کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑا۔ [illegible] اس لئے پرائی اور تمہارا [illegible] تم کہتے کہ اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے [illegible] یہ ہے کہ تمہارے خطوں کا پلندہ والدین کے ہاتھ لگ گیا اور پھر انہوں نے جلدی ہی میری مرضی جانے بغیر — اور میں تمہارے لئے پرائی ہوگئی ہمیشہ کے لئے — اگر ہو سکے تو مجھے معاف کردینا — ..........

متعلمہ دلی کالج دہلی

● — شوق کی ایک نئی بزم سجانے کے لئے
اپنی ناکام محبت کو نبھانے کے لئے
یاد کرنے کے لئے یاد نہ آنے کے لئے
تم سے چھپ کر میں بہت دور چلا جاؤں گا

لے عالم — متعلم خالصہ کالج دہلی

● — اچھوتی تمنا —

پیاری پیار —
میری سفینہ حیات کی ناخدا، مجھے بیچ منجدھار میں بے یار و مددگار اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہو، میں تمہارا ازل سے متلاشی ہوں لیکن تم آج تک مجھے نہ مل سکیں، کیا یہی انصاف ہے تمہارا، تمہارا چاہنے والا دربدر بھٹکتا پھر رہا ہے اور تم کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دنیا کی رنگینی سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ کہاں گئے تمہارے وہ وعدے جو تم نے مجھ سے کئے تھے، کیا اسی طرح وعدے وفا ہوتے ہیں ؟ کیا میری وفا کا صلہ یہی ہے کہ میں تڑپتا رہوں اور تم محو تماشا ہو۔ اگر یہ سب میری وفاؤں کا صلہ ہے تو مجھے اپنی وفا پہ ناز ہے تم جفا کئے جاؤ، تمہیں یہی زیب دیتا ہے۔ تمہارا

عبداللطیف متعلم مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

● — میری مچلتی آرزو —

خدا [illegible] تمہارے گلشن حیات کو دور خزاں سے محفوظ رکھے،
ایک [illegible]
[illegible] گا۔
[illegible]
شکوہ کرتا ہوں — میں نے تمہاری پوجا آج تک [illegible]
کہ تم سے کسی قسم کا کوئی لالچ ہو۔ تم پر میرا خط پڑھنا بھی شاق گذرتا ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی خط نہ لکھوں گا۔
اب ایک التجا ہے کہ مجھ سے بھول جانے کا مطالبہ نہ کرنا کیوں کہ تمہاری یاد ہی تو میری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اور تمہیں یاد رکھنے کیلئے میں اپنے آپ کو بھول چکا ہوں۔ تمہارا - اے آر فاروقی
متعلم دہلی کالج دہلی

تبدیلی رجحانات کے پیش نظر لوگ یہ جاننے کے لئے بے چین ہیں کہ آج کا جوان ذہن زندگی کے مختلف پیراؤں کو کس زاویے سے دیکھتا ہے — کس انداز سے سوچتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کو کس طرح گذارنا چاہتا ہے۔ طلبہ چونکہ جوان ہوتے ہیں اور نئے رجحانات کے حامل بھی — اسی لئے آج کے افکار و رجحانات کی ترجمانی کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے — زیر نظر شمارے میں محمد مزمل متعلم پوسٹ گریجویٹ (انسٹی ٹیوٹ دہلی) کے خیالات شامل ہیں آئندہ کے لئے دوسرے ساتھیوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھکر بھیجیں نیز یہ ملحوظ خاطر رہے کہ جواب مختصر اور جامع ہوں۔ اپنے جوابات کے ساتھ اپنا نام کلاس کالج / یونیورسٹی اور گھر کا پتہ ضرور لکھیں

— ادارہ —

نوٹ:- صاحب الرائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں ہے

اپنے خطوط اس پتہ پر بھیجیں۔ (افکار نو) ماہنامہ شاہجہاں - گلی قاسم جان دہلی ۶

س:- ہندوستان میں جمہوری نظام کہاں تک کامیاب ہے؟

جواب:- ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان میں جمہوری نظام مکمل طور سے ناکام ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں کے نظام کو درست کرنے کے لئے کسی ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے۔

س:- فرقہ پرستی کے تدارک کے لئے نوجوانوں کا کیا کردار ہونا چاہئے؟

جواب:- نوجوانوں کو جذبات کی رو میں نہیں بہنا چاہئے انھیں جوش کے ساتھ ہوش سے بھی کام لینا چاہئے، کیونکہ آج کے نوجوان کل کے علمبردار بنیں گے۔

س:- اردو کی ترقی کے لئے نوجوانوں کو کیا اقدام کرنے چاہئیں؟

جواب:- اردو زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس کے جاننے والے پورے ملک میں ہیں کسی خاص طبقہ یا فرقہ سے اس کا تعلق نہیں۔ اردو کے مسئلہ کو حل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے کوشش کی جائے حتی الامکان اس کا استعمال کیا جائے۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ زبان کسی قوم کا ورثہ نہیں ہوتی۔

س:- ایک بیوی کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے یا نہیں اگر ہے تو کیوں؟

جواب:- اگر تعلیم یافتہ بیوی ہو تو آنے والی نسل کی پیدائش و پرداخت میں مکمل تعاون ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ حادثہ سے دوچار ہونا پڑے تو یہ بہ آسانی اپنی زندگی گذار سکے موجودہ حالات کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ تعلیم نسواں کی طرف توجہ دی جائے۔

س:- شادی کرنے میں ماں باپ کی مرضی کو دخل ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب:- ماں باپ کی مرضی کا دخل ایک حد تک جائز ہے اپنی پسندیدگی کا خیال رکھنا ان کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ زندگی لڑکے اور لڑکی کو گذارنی ہے ان کی ہٹ دھرمی کبھی جانکاہ حادثہ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔

س:- عشق کے بارے میں کیا خیال ہے؟ عشق ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے؟

جواب:- عشق ہو جاتا ہے یہ ایک فطری امر ہے۔ جو انسان اپنے ساتھ ازل سے لایا ہے۔

س:- عشق کی کامیابی جسمانی اتصال کو کہا جاتا ہے یا ذہنی ارتباط کو —؟

جواب:- ذہنی ارتباط ہی عشق کی کامیابی ہے۔ اور دو روحوں کا آپس میں ملنا عشق کی معراج ہے۔

محمد مزمل۔ متعلم ایم اے اردو پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ دہلی، گھر کا پتہ ۱۳۱ کوچہ تال عطار چاندنی چوک دہلی

# خیالات کے جھروکے

اس میں قارئین کی رائے اور مشورے شائع کئے جاتے ہیں۔ یوں تو بے انتہا قارئین کے خطوط وصول ہوئے ہیں مگر ہم جگہ کی قلت کے سبب چند خطوط کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں۔ ہم ان اساتذہ اور ساتھیوں کے بے حد شکر گزار ہیں جنہوں نے ہم کو بذریعہ ڈاک یا براہ راست اپنی رائے اور مفید مشوروں سے نوازا۔

ادارہ

مکرمی تسلیم۔

ستمبر کا ماہنامہ شاہجہاں دیکھا۔ بہت پسند آیا اور اچانک ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ کہ کیا ہم طلباء بھی ادبی تخلیقات کی طرف اس سنجیدگی سے توجہ کر سکتے ہیں ــــ مگر اس ماہ یعنی اکتوبر کا شمارہ دیکھ کر اس بات کی تردید ہو گئی کیونکہ اس میں افسانے، مضامین اور دوسری تصانیف گزشتہ شمارے کے مقابلہ میں زیادہ معیاری تھیں ــــ اللہ سے یہی دعا ہے کہ اس کا معیار دن بدن ملند سے بلند تر ہوتا جائے اور طلباء شاہجہاں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہیں ــــ نیز دلی کے تمام اردو طلبہ کی سوسائٹی بنانے کا خیال اچھا ہے اس کے لئے منظم طریقے سے کام کرنا چاہیے۔

محمد انجم متعلم دلی کالج دہلی

---

قابل ستائش مدیر!

اکتوبر کا شمارہ دیکھا اور اسی دن سے نومبر کے شمارہ کا منتظر ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ طلباء اتنے سنجیدہ ہو کر کسی تعمیری کام کی طرف متوجہ ہوں، اس بد ذوقی کے دور میں آپ کا عزم قابل داد ہے۔ اردو کو ایسے ہی فرزندان کی ضرورت ہے۔ جو اسے لازوال حیثیت دے سکیں۔

مضامین انتہائی شستہ زبان میں ہیں اور آپ کا انتخاب اور مستقل عنوانات کو دیکھ کر سر دھننے کو جی چاہتا ہے

مجھے امید ہے کہ مستقبل قریب میں یہ رسالہ اردو کے عظیم جرائد کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ خیر اندیش

عتیق الرحمٰن

ڈبرو گڑھ (آسام)

---

برادر عزیز ــ!

خدا تمہیں اور تمہارے رسالہ کو خزاں آلود فضاؤں سے محفوظ رکھے کیا رسالہ ہے! یقین نہیں آتا کہ تم اس زمانہ میں ایسی ہمت کر سکو گے، نہایت کامیاب کوشش ہے مضامین کے انتخاب سے تمہاری عقل مندی اور سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔

کوشش کئے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے سامنے مشکلات کا ایک وسیع میدان ہو۔ لیکن عزم مستحکم کے ساتھ بے خطر انہیں عبور کئے جاؤ۔ تمہارا

خالد شمیم - نینی تال

# سکڑے ہوئے لباس سے آپ کی شان میں فرق آتا ہے؟
# "سینفورائزڈ" کو ساتھ لیجئے اور مسٹر شرنک کو مار بھگایئے

·SANFORIZED·
REGD TD MK

آپ کا لباس کبھی سکڑ کر ننگ نہ ہوگا اگر وہ ایسے سوتی یا سُوت ملے کپڑوں سے بنا ہے جن پر "سینفورائزڈ" کی چھاپ ہوتی ہے۔ یہ ٹریڈ مارک آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی قابلِ اطمینان گارنٹی ہے۔ "سینفورائزڈ" چھاپ والے کپڑے کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ "سینفورائزڈ" کا شہرت یافتہ نام بھارت میں بنے ہوئے کپڑے کی برآمدگی بڑھانے میں قابلِ قدر امداد کرتا ہے۔

رجسٹرڈ ٹریڈ مارک "سینفورائزڈ" کے مالکان کلیوٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹیڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس اے میں قائم شدہ) نے جاری کیا۔ اس ٹریڈ مارک کا استعمال صرف اس جانچ کئے ہوئے کپڑے پر کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو سکڑنے کی مقررہ کسوٹی پر پورا اترتا ہے

## بزم آرائیاں

# میں بھی حاضر تھا وہاں

ان صفحات میں قارئین کی دلچسپی اور ادبی ذوق کی تسکین کے لئے دہلی کے مختلف کالجوں کی اردو، فارسی، اور عربی سوسائٹیوں کی ماہانہ رپورٹ شائع کی جائیگی
ماہِ رواں میں آپ کروڑی مل کالج اور دہلی کالج کے ادبی فنکشن کی ایک جھلک دیکھ سکیں گے

ریحان الحق بی کام ام اے ریسرچ اسکالر

## "اپنے فنکار سے ملئے" کروڑی مل کالج

۲۹ اکتوبر ۶۹ء کو شام ساڑھے تین بجے کروڑی مل کالج کے سیمنار روم میں "اپنے فنکار سے ملئے" پروگرام منعقد ہوا جس میں ملک کے نامور شعرا، مشاہیر ادبا، اہل علم اساتذہ اور اہل ذوق طلبا نے شرکت فرمائی صدارت کے فرائض ڈاکٹر ظہیر احمد صاحب صدیقی نے سرانجام دیئے۔

پروگرام کی ابتدا کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب صدر شعبہ اردو نے اس سیمنار کی غرض و غایت افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے آج کے مہمانان خصوصی حضرت شمیم کرہانی، اور جناب شہاب جعفری کا مختصر تعارف کروایا اور پہلے شمیم صاحب اور اس کے بعد شہاب صاحب سے درخواست کی وہ اپنے حالات زندگی اور ادبی و سیاسی نظریات سے سامعین کو بطور خود آگاہ فرمائیں۔

شمیم صاحب نے اپنے حالات زندگی بتاتے ہوئے کہا کہ انہوں نے پہلا شعر چودہ پندرہ سال کی عمر میں کہا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۲۹ء میں اپنے وطن موضع کرہان ضلع اعظم گڑھ میں ہم ایک جھیل میں نہا رہے تھے تو آسمان پر بادل گھر آئے نہاتے ہوئے یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا ؎
دیکھ کر میکدے پر ابر بہار، رند مفلس کی آنکھ بھر آئی۔

انہوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے انگریزی زبان و ادب کی عظمت کا اعتراف کیا اور کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ میں انگریزی ادب کا زیادہ مطالعہ نہیں کرسکا ہوں لیکن ان کی تقریر کے دوران بار بار انگریزی کے مشاہیر شعرا و ادبا کے خیالات و نظریات اور ان کے افکار کے حوالوں نے یہ بات سامعین پر بالکل آشکارا کردی کہ ان کی انگریزی ادب پر کتنی گہری نظر ہے۔

آخر میں انہوں نے حاضرین کی فرمائش پر اپنی دو غزلیں اور ایک نظم "کفشدر" سے سامعین کو محظوظ و مستفید فرمایا۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے حاضرین سے فرمایا کہ وہ فنکار سے متعلق سوالات کریں جب کسی نے سوال نہ کیا تو خلیق صاحب نے خود اردو غزل کے نئے موڑ سے متعلق ایک سوال پوچھا جس کا شمیم صاحب نے پرمغز جواب عنایت فرمایا

اسی دوران عہدیداران بزم ادب نے حاضرین کو "لذت کام و دہن کی آزمائش" میں مبتلا کر ڈالا۔ چائے وغیرہ کا دور چلتا رہا اور لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر چائے کی چسکیوں کے ساتھ آج کی اس دلچسپ نشست پر تبصرہ کرنے لگے۔ چائے کے اس پر تکلف دور کے بعد شہاب جعفری صاحب سے درخواست کی گئی کہ اب وہ حاضرین

ماہنامہ شاہجہاں نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء

سے خطاب فرمائیں۔
شہاب صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا کے لئے اپنے دوستوں کی ایک دلچسپ شرارت کو ذمہ دار قرار دیا انہوں نے فرمایا کہ کم عمری ہی سے انہیں مشاہیر شعراء کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور وہ بیت بازی میں ماہر تھے۔ کسی مشاعرہ میں ان کے احباب نے شہاب صاحب کا تعارف بھی بحیثیت شاعر کرا ڈالا۔ اور شہاب صاحب نے بھی اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے وہیں مشاعرہ گاہ میں غزل کہہ کر سنا ڈالی۔

اس کے بعد انہوں نے ترقی پسند تحریک اور جدید شاعری اور اس کے جدید رجحانات سے متعلق ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی اور طلباء کی جانب سے بعض اشکالات کا جواب بھی مرحمت فرمایا۔ اور بعد میں انہوں نے بھی اپنے کلام سے سامعین کو دعوت فکر عطا فرمائی دونوں شعراء کی تقاریر کے دوران اردو کے کہنہ طنز و ظرافت نگار جناب فرقت کاکوری صاحب نے اپنے برجستہ جملوں سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔

آخیر میں ڈاکٹر کامل قریشی صاحب اور ظہیر احمد صاحب صدیقی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اسی کے ساتھ یہ دلچسپ نشست تین گھنٹہ کے بعد اختتام پذیر ہوئی

## بزم ادب دہلی کالج کے زیر اہتمام مقابلہ غزل سرائی

یکم نومبر کو دہلی کالج ہال میں کالج کی بزم ادب کی طرف سے "مقابلہ غزل سرائی" کا رنگا رنگ پروگرام منعقد ہوا جس میں دہلی کے مختلف کالجوں کے گیارہ طلبا اور طالبات نے اردو کے مشاہیر شعراء کی غزلیں ترنم سے سنا کر سامعین سے زبردست داد تحسین حاصل کی۔

راقم الحروف اگرچہ وقت سے پہلے کالج پہنچ گیا تھا لیکن ایک مخلص دوست کے اصرار پر غزلوں میں زبان کا چٹخارہ تلاش کرنے سے پہلے "بھائی جان" کے یہاں زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے جانا پڑا۔ "بھائی جان" کے یہاں نشست اتنی "چٹپٹی اور مزیدار تھی" کہ وہاں کافی تاخیر ہو گئی جب اس یادگار پارٹی سے فارغ ہو کر ہال کی طرف رخ کیا تو وہاں پروگرام شروع ہوئے دیر ہو چکی تھی اور اس حسین شام کی غزل کا پہلا مقطع ہال میں گونج رہا تھا۔

اسٹیج پر درمیان میں ڈاکٹر ظہیر احمد صاحب صدیقی کرسی صدارت پر رونق افروز تھے۔ داہنی طرف ایک میز پر سبک اور نازک "میر ٹرافی" شیشے کے ایک کیس میں رکھی ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ ہی رنگین کاغذوں اور رو پہلی کرن میں لپٹے ہوئے انعامات کے پیکٹ دعوت غزل سرائی دے رہے تھے۔ اسٹیج کے بائیں طرف سفید چاندنی پر محمد اقبال سکریٹری بزم ادب اور شہزاد اختر اسٹیج سکریٹری تشریف فرما تھے۔

تاخیر سے پہونچنے کی بنا پر ہال آخری سرے پر جگہ ملی جہاں سے پورے ہال کا جائزہ لینا بالکل آسان تھا میں نے اپنی نشست سنبھالتے ہی ہال پر ایک طائرانہ نظر ڈالی بائیں طرف آگے بورڈ لگا ہوا تھا "مہمان" اس کے بعد "طالبات" کی نشستیں تھیں۔ داہنی طرف طلباء بیٹھے ہوئے تھے جنکی نگاہیں بے اختیارانہ اپنے بائیں طرف بار بار اٹھ رہی تھیں بالکل اگلی نشستوں میں جناب ریاض عمر صاحب جناب آلم پرویز صاحب اور جناب این رضوی صاحب کاغذ قلم کے ہتھیاروں سے لیس مقابلہ میں حصہ لینے والوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کو تیار بیٹھے ہوئے تھے۔

اسٹیج سکریٹری نے سب سے پہلے محمد اکرام صاحب دہلی کالج (ایوننگ) سے درخواست کی کہ وہ اسٹیج پر تشریف لاکر غزل چھیڑیں۔ اس کے بعد دہلی کالج (ایوننگ) کے نجم الحسن صاحب نے اپنی ترنم ریزی سے سامعین کو مسحور کر دیا۔ اس کے بعد ہندو کالج سے مس ریشم سود اور مس اروڑہ، دہلی کالج (مارننگ) سے مس فیروزہ، دہلی یونیورسٹی سے مس انیس بیگم۔ کالج سے مس شانتا بخشی اور مس رکسم کپور نے اپنے اپنے کالجوں کی نمائندگی کی

دہلی کالج اپنی بعض دیرینہ روایات اور خصوصیات

کی بنا پر دور دور مشہور ہے اور غالباً انہی روایات کی وجہ سے لیڈی سری رام کالج اور کروڑی مل کالج کی ٹیمیں مقابلہ میں شرکت نہ کر سکیں۔ جب ایک محترمہ اپنی نہایت سریلی اور باریک آواز میں غزل سرا تھیں تو پچھلی نشستوں سے بالکل انہی کے لہجہ میں آواز آئی "ی ..... یاؤں" ایک قہقہہ ابھرا اور ہال میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ پھر جب ایک مولانا اسٹیج پر تشریف لائے تو ان سے خلاف توقع ایک ادبی حرکت سرزد ہوتے دیکھ شور برپا ہو گیا ابھی پہلا ہی مصرعہ پڑھا گیا تھا کہ پھر پیچھے سے آواز آئی "آمین" بہرحال سامعین کی توقع کے خلاف غزل خاصی کامیاب گئی لیکن اس کے بعد اسٹیج پر آنے والوں کا اور برا حشر ہوا سامعین نے غزل کے ساتھ سُر میں سر ہلانا شروع کر دیئے مجبوراً اناؤنسر صاحب کو سامعین سے گذارش کرنا پڑی کہ وہ کالج کی پچھلی روایات و اقدار کا لحاظ کرتے ہوئے مہمانوں کا اعزاز و اکرام فرمائیں۔ لیکن شور و غل ہوا اناؤنسر صاحب کی کمزور و ناتواں آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی منتظمین کا کہنا یہ ہے کہ اس شور و غل کی ایک بڑی وجہ مائک کی خرابی بھی تھی

بہرحال مقابلہ ختم ہوا، جج صاحبان فیصلہ کرنے کے لئے ہال سے اٹھ کر چلے گئے اس دوران میں سامعین کے اصرار پر مس انیس بیگم اور شاہد احمد نے ایک ایک غزل سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ اتنے میں جج صاحبان واپس تشریف لے آئے اور فیصلہ صدر کے حوالے کر دیا گیا انہوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں خواہش ظاہر کی کہ اگر انہیں سامعین کی صف میں بیٹھ کر غزل سننے کا موقعہ فراہم کیا جاتا تو وہ اور زیادہ محظوظ ہوتے اس کے بعد انہوں نے دلی کالج سے اپنے دیرینہ تعلقات اور پچھلے پروگراموں کا تذکرہ کرتے ہوئے فنکشن کی کامیابی پر سکریٹری بزم ادب کو مبارک باد پیش کی۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ اتنی "داد" کہ "بیداد" نہ ہو جائے یہ طلبا کا حق ہے اس کے بعد انہوں نے ججوں کا متفقہ فیصلہ سنا دیا۔

پہلا انعام۔ نجم الحسن دہلی کالج (ایوننگ) دوسرا انعام مس فیروز ناظری دلی کالج (مارننگ) تیسرا انعام مس اندرا ہندو کالج۔ ان کے علاوہ مس شاشتا اور مس رفیق سود کو اسپیشل انعامات کا مستحق قرار دیا گیا اور ٹرافی کا حقدار دلی کالج (ایوننگ) آخر میں ڈاکٹر شمیم نکہت لیکچرار شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی نے اپنے دست مبارک سے انعامات تقسیم کئے اور اس طرح بزم ادب کا یہ افتتاحی فنکشن بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔

مابنامہ شاہجہاں دہلی نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء

## جامعہ کالج میں بزم ادب کا افتتاح

مورخہ ۵ نومبر ۱۹۶۹ء کو بزم ادب جامعہ کالج کا افتتاحی جلسہ زیر صدارت پروفیسر ضیاء الحسن صاحب پرنسپل جامعہ کالج منعقد ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد اکرم فرسوری صاحب صدر بزم ادب نے مختصر سی تقریر کی پھر نفیس قمر صاحب نے اپنے کلام سے حاضرین کو لطف اندوز کیا۔ سہیل صاحب بی، اے سکنڈ ایر۔ عطیہ فاروقی بی، اے فرسٹ ایر سکریٹری بزم ادب، ناصر ممتاز اسٹوڈینٹ انجینئرنگ کالج جامعہ ملیہ اور مقبول صاحب بی، اے سکنڈ ایر نے نغموں سے حاضرین کو مسحور کیا جناب انوار علی سوز صاحب لیکچرر جامعہ ملیہ نے طلباء کی درخواست پر ایک نظم عنایت فرمائی نظم کی سادگی اور پُرکاری نے سماں باندھ دیا۔ محمد نایاب تھرڈ ایر نے مختصر سی تقریر فرمائی جس میں آئندہ کے پروگرام کی طرف نشاندہی کی جناب صدر اور محترم پرنسپل صاحب نے نہایت پرسوز انداز میں عموماً نئی نسل کی خصوصاً جامعہ کالج کے طلبا کی زبان و ادب سے بے پرواہی اور تعلیمی دلچسپیوں سے غفلت کا ذکر کیا آپ نے فرمایا جذبے اور شوق کی ضرورت ہے انسان خود بخود عام زندگی میں زبان و ادب اور تعلیم و فن کی راہ ہموار کر لیتا ہے۔ آپ نے طلباء کو بتایا ضرورت اس قسم کی محفل سجانے سے پوری نہیں ہو جاتی بلکہ روزمرہ کی زندگی میں کسی مقصد کوشش اور عقیدہ بنانے کی ضرورت ہے صدر صاحب کی تقریر نے حاضرین اور ذمہ داران بزم ادب کو بہت حوصلہ اور آئندہ کام کرنے کی لگن عطا کر دی۔

طالب علموں کا — طالب علموں کیلئے — طالب علموں کے ذریعہ

جنوری سنہ ۱۹۷۰ء
جلد نمبر — ۴
شمارہ نمبر — ۱
قیمت
فی پرچہ — پچیس پیسے
سالانہ — تین روپے



# نوک پلک

لیجئے! شاہجہاں کے نئے روپ کا چوتھا شمارہ حاضر ہے — ان چار ماہ میں ملک کے طول و عرض سے جو
حوصلہ افزا رویہ ہمیں ملا ہے، اس کے لئے ہم ممنون ہیں۔ اور یقین دلاتے ہیں کہ اگر ہمیں اپنے اساتذہ و
تعیوں کی رہنمائی و سرپرستی حاصل رہی تو ہم اس کو طلبہ کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید
سکیں گے۔

اُردو صحافت کی تاریخ شاہد ہے کہ شاہجہاں سے پہلے کوئی جریدہ ان مقاصد کے ساتھ ظہور پذیر
ہوا، جن کا یہ حال ہے — خاص طور پر اب جب کہ ہندوستان میں اردو پُر آشوب
رسے گذر رہی ہے۔ ایسا رسالہ نکالنا ایک انہونی سی بات ہے — نکالتے وقت ہمارے
ن میں بھی یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ کیا طلبہ اس وقت، جبکہ وہ سیاسی پارٹیوں کے آلۂ کار
ہوئے ہیں۔ اور ان کے ذہن تخریبی کارروائیوں کی طرف مائل ہیں — یہ پسند کریں گے —؟
پہلا شمارہ منظرِ عام پر آتے ہی ہمارے اس خیال کی تردید ہوگئی — اور ہم یہ فیصلہ کرنے پر
ر ہوگئے کہ اُردو سدا بہار ہے۔ اور اس پر خزاں کا قطعًا اطلاق نہیں ہوتا — اس کا ثبوت آج کے اُردو طلبہ
جنہوں نے شاہجہاں کی آواز کو لبیک کہہ کر اپنے غیر ادبی اور غیر شائستہ ہونے کو جھٹلا دیا۔

ادارہ ●●

نظر شمارے میں شامل تمام افسانوں میں تمام مقام و
نعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے
ن کے لئے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں ہیں۔

مشیر طباعت: محمد شفیق صدیقی متعلم اینگلو عربک کالج دہلی
ایڈیٹر پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر: محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی ۶

قائم اشاعت: قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی نمبر ۶

راجدھانی میں سیاہ

# اعلیٰ پرنٹنگ

## بلیماران

معیار۔ نفاست اور اعلیٰ کارکردگ

- روزانہ، ویکلی اخبارات، رسائل، کالج میگزین، پور
- مختلف رنگوں کی چھپائی ہلان کے ساتھ آفسٹ کے ما
- بیرونی کام کے سلسلے میں کتابت، طباعت، بلاک۔

رنگین لیتھو چھپائی کیلئے

ــــے پریس

دھلی

متیازی حیثیت رکھتا ہے

ل اور کتابوں کی طباعت کا معقول انتظ

جاتی ہے

ــ اور دیگر سہولیات خصوصیت کے ساتھ مہیا کی جاتی ہیں ۔

ایکمرتبہ ضرور خدمت کا موقع دیجئے

# خلوص اور دیانت کی تلاش

رشید الوحیدی متعلم دلی یونیورسٹی دہلی

نوٹ: چونکہ مضمون نگار سماج کے ہر طبقہ کی کمزوریوں کا پردہ چاک کرنے میں کسی ماہر جراح سے کم نہیں ——— زیر نظر مضمون میں بھی مضمون نگار نے سماج کے گھناؤنے ناسور پر سے پردہ اٹھایا ہے ——— بعض ذہن جن پر اس مضمون کی زد پڑے گی، وہ کراہ اٹھیں گے۔

ادارہ

"دادا جان! آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟" شمیم نے بڑھکر ایک بڑے میاں سے سوال کیا جو لاٹھی ٹیکتے ہوئے بڑی مشکلوں سے راستہ طے کر رہے تھے۔

"بیٹا!" بڑے میاں نے شمیم کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "میں خلوص اور دیانت خریدنا چاہتا ہوں۔ جہاں بھی ملے گا، جتنے پیسوں میں ملے گا خرید لوں گا۔ کیا تم میری مدد کروگے؟"

شمیم بڑے میاں کی بات تو نہ سمجھ سکا، مگر نہایت ادب سے بولا۔

"بابا! یہ تو میں جانتا نہیں کہ خلوص کہاں ملے گا، کتنے کا ملے گا، اور دیانت کہاں ملے گی۔ بلکہ میں نے تو اپنے گھر کے بڑوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ دنیا میں اب خلوص کہاں، مگر میں، بہرحال آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ چلئے تشریف لے چلئے۔"

اور وہ دونوں دیانت و خلوص کی تلاش میں روانہ ہوگئے۔

دادا نے چپکے سے شمیم کو ایک تھیلی تھما دی۔ سب سے پہلے انھیں سامنے بڑی سی مسجد میں جانا تھا۔ تاکہ وہ ظہر کی نماز پڑھ لیں۔ اور مسجد کے امام صاحب سے معاملہ کریں۔ شاید ان کے پاس خلوص ہو تو کسی کا بھلا ہو جائے۔ جماعت تیار تھی۔ دونوں وضو کر کے شریک ہوگئے ——— نماز ختم ہوتے ہی محلے کے ایک بڑے میاں کھڑے ہوئے۔ اور انھوں نے اعلان کیا بھائی، نمازیو! یہ ہماری مسجد میں مؤذن صاحب آج سے مقرر کئے گئے ہیں۔ ان کے کھانے کا بندوبست محلے والوں کو کرنا ہے۔ پھر سردی آگئی ہے۔ ان کا لحاف بھی بنوانا ہے۔ جو کچھ پیسہ، دو پیسہ، روپیہ دو روپیہ ہو سکے لحاف کے لئے دیتے جانا ———

اور ہاں، بھائیو! امام صاحب کا کل جوتا چوری ہو گیا ہے۔ ان کو نیا جوتا خریدنا ہے۔ اس کے لئے بھی اللہ کے نام پر دیتے جانا۔

شمیم نے دادا جان کو اور دادا جان نے شمیم کو دیکھا۔ اور دونوں اٹھکر مسجد سے باہر آگئے ——— دادا کہنے لگے۔

"ہائے افسوس امامت اور مؤذنی بھی سودے بازی ہوگئی ہے"

شمیم نے دادا کی تھیلی کو جس میں شاید کافی روپے تھے حفاظت سے رکھ لیا۔ اور اب دونوں شہر کے مدرسے میں پہونچے اور سیدھے بڑے مولانا صاحب کے پاس جو مدرسہ کے صدر مدرس اور مہتمم تھے پہونچ گئے۔ مولانا صاحب ایک دوسرے مولانا سے مخاطب تھے ——— اور گفتگو کچھ یوں ہو رہی تھی۔

"بھائی، مولانا خیر الدین صاحب ——— ! آپ نے کلکتہ سے مدرسے کے لئے سو روپیہ چندہ کیا ہے۔ ۲۰۰ آپ کا کمیشن اور بھائی، کچھ آخر مجھے بھی تو لینا ہے۔ اس لئے ۴۴

میں نے مدرسے میں جمع کر دیا ہے۔ ۲۰۰ اپنی کارگزاری میں لگا لیا ہے ـــــ

مولانا خیرالدین صاحب فرما رہے تھے۔

"جناب میں نے جو گلا پھاڑ پھاڑ کر تقریریں کی ہیں۔ نمازِ جمعہ کے بعد اور جمعہ سے پہلے خطبوں میں آپ کے دینی مدرسے کا تعارف کرایا اس کا کچھ نہیں ـــــ؟"

مولانا نے انھیں اس پر راضی کر لیا کہ اچھا اگلی بار آپ کو انعام بھی دیا جائے گا ـــــ دین اور دینی تعلیم کی خرید و فروخت دیکھکر ـــــ شمیم نے دادا جان کی لاٹھی انھیں تھما دی۔ اور دونوں باہر آگئے۔ راستے میں کالج کی بڑی بلڈنگ پڑتی تھی۔ دونوں گھنٹے بجاتے کالج کی عمارت میں جا پہونچے۔ اور ایک کلاس میں پہنچ گئے۔ ابھی یہ لوگ دروازے ہی پر پہونچے تھے کہ لڑکے شور مچاتے ہوئے باہر نکلنے لگے "سر (Sir) آج پریڈ نہیں لیں گے، سر آج پریڈ نہیں لیں گے ـــــ"

تھوڑی دیر بعد ایک صاحب منہ میں سگریٹ دبائے ہوئے بیگ ہاتھ میں لٹکائے ہوئے، اپنے ساتھی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے نکلے۔

"یار، بڑی بوریت ہوتی ہے کلاس میں، اچھا ہوا تم آگئے۔ کل ریمش آگیا تھا، کچھ موڈ ٹھیک ہوگیا تھا۔ آؤ! سامنے کانٹین میں چلتے ہیں۔ اسٹوڈنٹ بھی پڑھنا نہیں چاہتے اور رکھا ہی کیا ہے۔ کورس ہی تو پڑھانا ہے۔ ایکسٹرا پریڈ لے لیں گے، چند دن میں صاف۔ کونسا ہمیں ایگزامینیشن ہال میں پیپر کرنے ہیں۔ لڑکے بھی چھپے ہوئے نوٹ نئی سڑک سے لاکر کوشچن پڑھ کر پیپر تو کر ہی لیں گے ـــــ اور یہ کہتے ہوئے بابو جی کینٹین میں ایک میز پر جا بیٹھے۔ جہاں اور دوسرے لکچرر محفل جمائے بیٹھے تھے۔

دونوں گنگناتے ہوئے "ہائے رے قوم کی زبوں حالی"

اور شمیم دادا جان کو کنکھیوں سے دیکھتا ہوا سہارا دے کر باہر لان پر آگیا۔ اور دونوں سڑک پر آگئے ـــــ

شام ہونے کو تھی، چلتے چلتے ایک جگہ مجمع دیکھکر دونوں رک گئے ـــــ جناب بابو ہری ہرپرشاد اور جناب مولانا لنگور الحق صاحب ممبر پارلیمنٹ ہندوستان کی غریبی، جہالت اور ضروریاتِ زندگی کی کمی پر نہایت ہمدردانہ تقریر کر رہے تھے۔ یہ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ اور جب جلسہ ختم ہوا تو یہ دونوں لپک کر اُن کے پاس پہونچ گئے۔ مگر سکریٹری نے روک دیا۔

"صاحب سے ٹائم لیکر کوٹھی پر ملنا"

شمیم نے کہا۔

"اچھا بھائی تو ٹائم دے دو"

"کوٹھی پر آؤ۔ پروگرام دیکھکر ٹائم دیا جائے گا"

دوسرے دن ـــــ دادا جان اور شمیم، دونوں کوٹھی پر پہنچ گئے ـــــ وہاں لائن لگی ہوئی تھی۔ غریب، پھٹے حال عورت، مرد، بہت سے لوگ صاحب سے ملنے آئے تھے۔

صاحب تو فلیٹ کے اندر گم تھے۔ اُن کا روئے جمال تو کیا نظر آتا۔ کبھی کبھار پردہ ہلنے سے سامنے دفتر کا ہال نظر آتا ـــــ تو وہی کل والا سکریٹری ٹانگ پر ٹانگ دھرے سگریٹ پھونکتا ہوا نظر آجاتا۔ اور کبھی کبھار باہر جھانک کر دیکھ لیتا ـــــ اتنے میں اُس نے فون اُٹھایا اور فوراً رکھ دیا۔ اور پھر باہر آکر اعلان کیا۔

"صاحب کام سے جا رہے ہیں۔ آج نہیں مل سکیں گے"

اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سفید گاڑی آکر رکی ـــــ صاحب بیٹھے اور چل دیئے۔ شمیم اور دادا جان، کل کی تقریر ذہن میں یاد کرنے لگے۔

دادا جان نے کہا۔

"بیٹا! ذرا بابو ہری ہرپرشاد کے یہاں چلیں"

مگر شمیم نے بتایا۔

"دادا جان! اس گاڑی میں وہ بھی بیٹھے تھے"

اور شمیم ایک دم دفتر میں یہ کہتا ہوا گھس گیا۔

"ذرا معلوم تو کروں کہاں گئے ہیں صاحب؟"

تھوڑی دیر میں واپس آکر دادا جان کو بتایا کہ۔

بابو ہری ہرپرشاد اور مولانا لنگور الحق نے شرکت میں ایک شکر کا مِل کھولا ہے۔ اور ایک موٹروں کا کارخانہ قائم

کیا ہے۔ آج اسی سلسلے میں بہت سے وزیروں کی دعوت تھی۔ وہ اسی میں گئے ہیں۔" دادا پسینہ پونچھ کر آگے بڑھ گئے۔

دونوں چلے جا رہے تھے۔ راستے میں چوراہے کے پاس چار مستعد پولیس کے سپاہی نظر آپڑے۔ چاروں نہایت چستی سے اپنے کام میں مصروف نظر آئے۔ جیسے انھیں اپنی ڈیوٹی کے علاوہ دنیا میں کوئی کام نہ ہو۔ کوئی بس یا ٹرک اگر اوور لوڈڈ یا رونگ سائیڈ سے گذرتی ہوئی ملی اُن کی نظر سے بچ کر نہیں جا سکتی تھی ——— شمیم نے دادا جان سے کہا۔

"دادا جان! اگر ملک کا، دنیا کا ہر آدمی اس طرح، خلوص سے، ایمانداری سے اپنی ڈیوٹی پوری کرے تو چند دن میں تو ملک کی کایا ہی پلٹ جائے۔"

دادا جان کی آنکھوں میں ایک چمک سی تھی ——— بولے۔

"ہاں بیٹا! میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں۔ آؤ، چلیں، ان سے سودا کریں۔"

ابھی وہ دونوں ایک پولیس والے کے پاس پہونچے ہی تھے کہ ایک دیوار کی طرح آسمان تک سامان سے بھرا ہوا ٹرک گذرا۔ اور سپاہیوں کو دیکھ کر ڈرائیور نے بالکل انجان بن کر بالکل مخالف سمت سے ٹرک نکالنا چاہا۔ مگر زوردار سیٹی بجی اور تین سپاہی لپک کر ٹرک کا نمبر نوٹ کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر ٹرک والے نے سڑک سے ایک طرف کو ٹرک روک دیا۔ دادا جان اور شمیم دونوں ٹرک کے پاس پہونچ گئے۔ مگر بظاہر انجان سے بنے رہے ——— شمیم نے دادا جان کو اشارہ کیا۔

"دادا دیکھئے سپاہی چالان کر رہا ہے۔ مگر ہائیں، یہ کیا؟"

دادا جان نے دیکھا۔ ڈرائیور کا دروازہ آدھا کھلا آدھا بند تھا۔ سپاہی کا ہاتھ ڈرائیور کی سیٹ پر رکھا ہوا ہے وہ کچھ اشارے کر رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے، کچھ کرارے نوٹ جیب سے مٹھی میں، اور پھر مٹھی سے جیب میں پہونچ گئے۔ مجرم کی جیب سے افسر کی جیب میں ——— اور ٹرک ایک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اور ٹرک کی گھڑگھڑاہٹ میں ڈرائیور نے ایک موٹی سی ماں کی گالی سپاہیوں کو دی۔

"لے جاؤ، بادشاہو! یہ مال ٹرک سے اترتے ہی اس کے دوگنے بنا لوں گا۔"

ڈرائیور اور شمیم، ڈرائیور کی بات تو نہ سُن سکے مگر ایک حیرت ناک، حسرت ناک نظر سپاہیوں پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

دونوں پیاسے تھے۔ راستے میں ایک جگہ نل کے پاس ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ گلاس ان کے پاس اور ایک بڑے ٹب میں برف پڑا ہوا تھا ——— ایک بورڈ پر لکھا تھا۔ "سیٹھ لیسین اور سیٹھ مکندی لال کی طرف سے راہگیروں کے لیے۔"

شمیم نے بڑھ کر دو گلاس پانی لیا۔ اور جب پانی پی کر چلنے لگے۔ تو بڑے میاں نے روکا۔

"میاں، کچھ پیسے تو دیتے جاؤ!"

"ارے بھائی، یہ تو مفت کا انتظام ہے۔"

"ہاں، میاں! مفت جس نے انتظام کیا ہے، اُسے ثواب ملے گا۔ ہمیں تو پیسہ دیتے جاؤ۔"

اور پانچ، سات پیسے رکھوا ہی لیے۔

دونوں خلوص اور ایمانداری ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے تھے۔ اتفاق سے گورنمنٹ کی بس سامنے سے آتی ہوئی نظر پڑی ——— شمیم نے دادا کو تیار کر لیا۔ اور ہاتھ اُٹھا کر بس روک لی ——— دونوں بس پہ بیٹھ گئے۔

کنڈکٹر نے پوچھا۔

"ہاں، بھئی! کہاں کا ٹکٹ چاہئے؟"

شمیم نے کہا۔

"نخاسہ بازار کا دو ٹکٹ دینا۔"

"۸۰ پیسے نکالو!"

ابھی شمیم پیسے ہی نکال رہا تھا، کہ کنڈکٹر آگے بڑھ گیا اور دوسرے مسافروں کو ٹکٹ دینے لگا ——— شمیم نے کئی بار آواز بھی دی۔

"ہاں، بابو صاحب۔ آیا بابو صاحب۔" کہتا رہا۔ مگر ٹکٹ نہ دیا ——— آخر نخاسہ آگیا۔

شمیم نے پھر کہا۔
"لائیے ٹکٹ، یہ ہیں ۸۰ پیسے"
اس نے ۵۰ پیسے شمیم کو واپس کر دیئے۔ اور کہا۔
"جاؤ میاں! تھوڑے ہی میں کام بن گیا"
اور ٹکٹ دیئے بغیر جانا چاہا۔ مگر دادا نے روک لیا۔
"میاں، یہ لو ۵۰ پیسے اور ۴۰، ۴۰ کے دو ٹکٹ دیدو"
اور تب اس نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے ٹکٹ حوالے کر دیئے۔

شمیم نے کہا۔
"دادا جان! اب تو آپ بہت تھک گئے ہیں۔ اور امید بھی نہیں ہے کہ اس دنیا میں آپ کو خلوص و دیانت مل سکیگا۔ اب تو یہ جنس بازار سے اُٹھ گئی ہے۔ اور اگر کہیں ہے تو وہ ڈر کے مارے بازار میں لاتا نہیں۔ کیوں کہ اب اس کی پوچھ نہیں ہے ــــــ اس لئے چلئے، گھر چلیں"
دادا جان، مایوس تو نہیں ہوئے۔ مگر تھک گئے تھے۔

بولے ــــــ
"بیٹا! میں تو یہ نہیں کہوں گا، کہ خلوص اور ایمانداری اور دیانت داری، دنیا سے بالکل ختم ہو گئی۔ ہاں، اتنا افسوس ضرور ہے کہ اب اس دنیا میں کسی طبقہ میں بھی اس کا چلن نہیں رہا"
اب شمیم نے، دادا کو ان کی تھیلی واپس کر دی۔ اور ان کے گھر چھوڑ کر اجازت لی۔
شمیم مڑا ہی تھا کہ دادا نے آواز دی۔
"بیٹا! مجھے بالکل مایوس نہ کرو۔ اس میں سے آدھی رقم دو ہزار تم لیتے جاؤ۔ میں نے دو دن میں جہاں تک بھی خلوص و دیانت کو تلاش کیا، نہ پایا۔ مگر خدا کا شکر ہے، کہ ابھی یہ دولت فنا نہیں ہوئی۔ کہیں کہیں مل جاتی ہے ــــ اور دو دن تو وہ میرے ساتھ ہی رہی۔ اور وہ تم ہو"
شمیم نے روپیہ واپس کرتے ہوئے جواب دیا۔
"دادا جان! اگر خلوص میرے پاس ہے، تو مجھے بڑی خوشی ہے، مگر خلوص کی کوئی قیمت نہیں"

اور وہ چلا گیا۔

## غزل

مختار عثمانی، متعلم جامعہ ملیہ اسلامیہ

گرو وہ شغل جسے کشتی بھی کہہ نہ سکیں
غموں کا نام تو غم ہے خوشی بھی کہہ نہ سکیں
گلا نہ ہو جو ہو دار و رسن نصیب ہمیں
ہے وہ مقام جسے زندگی بھی کہہ نہ سکیں
کرم کیا ہے کچھ ایسا ترے رفیقوں نے
کہ جس کے بعد جسے زندگی بھی کہہ نہ سکیں
کچھ اس طرح سے مٹے ہم تمہاری راہوں میں
یہ اہلِ دہر جسے آگہی بھی کہہ نہ سکیں
ابھی ابھی تو چمن کی طرف سے گزرا ہوں
کلی کچھ ایسی ہنسی ہے ہنسی بھی کہہ نہ سکیں
یہ راہِ عشق ہے مختار کیا کہوں ورنہ
وہ ایسے ملتے ہیں دشمن بھی کہہ نہ سکیں

# مقطع

محمد انجم
متعلم دلی کالج دہلی

غزل اُردو اور فارسی شاعری کی مایۂ ناز صنف ہے۔ اور فنی اصولوں کے اعتبار سے مقطع غزل کا ایک ضروری حصّہ گردانا گیا ہے۔ غزل کے صد رنگ موتیوں کی لڑی میں آخری موتی یہی ہے۔ یہی ان نازک خیالات اور نازک تر احساسات کا اختتامیہ ہے جنھیں کسی کی رسا طبیعت نے ایک بحر اور ایک زمین میں موزوں کیا۔ یہیں پر وہ بات قطع ہو گئی جس کے رنگا رنگ جلوے مطلع کی جلو میں سامنے آئے تھے۔

پُرانے سخن فہم جب کسی غزل کے پیرایۂ آغاز یعنی مطلع کی تعریف کرتے، تو کہتے تھے "یہ مطلع، مطلع آفتاب ہے"۔ اس استعارے کو اگر طول دیا جائے تو مقطعے کو اسی مطلع آفتاب کا زوال یا غروب سمجھنا چاہئے۔ اُردو اور فارسی غزلوں کے بے کراں دفتر پر ایک نظر ڈالئے تو بہت سی جگہ یہ استعارہ حقیقت کے روپ میں دکھائی دیگا۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اکثر شعراء غزل اسی ترتیب سے کہتے ہیں جس ترتیب میں وہ پڑھنے سننے والوں کے سامنے آتی ہیں تو مقطعے کا شعری زوال بھی فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ کیونکہ اس مفروضہ کے مطابق پیرایۂ آغاز یعنی مطلع پر کافی طبیعت لڑتی ہے۔ اس کے بعد اور خیالات، مضامین، قافیے اور ردیف کی رعایتوں، دل کی کیفیتوں کا ذکر ہوتی ہیں۔ اور پھر کہیں غزل کے آخری فنی جزو یعنی مقطعے کی باری آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وجدان زوال پذیر ہے۔ جذبات کا خروش اور خیالات کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ اور طبیعت کی اُمنگ کافی سے زیادہ اظہار پا چکی ہے۔ اسی لئے آخری شعر میں چاہے دل کی کیفیت کہو، یا خیالات کا جوش دکھاؤ، اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاؤ، یا کوئی مضمون بندی کرو، پڑھنے سننے والوں کے لئے اس کا لازمی تاثر یہی ہے کہ غزل ختم ہوئی۔ اب شاعر اجازت چاہتا ہے۔

لیکن عام غزلوں کے مقطعوں کی کمزوری پر یہ مفروضہ حجت کا حکم نہیں رکھتا۔ وجہ یہ ہے کہ شعراء کا تخلیقی عمل ہمارے سامنے نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ فارسی میں سنائی اور سعدی سے لیکر سعید نفیسی اور اقبال تک اور اردو میں میر تقی میر سے لے کر فراق گورکھپوری تک، ہر شاعر نے اسی ترتیب میں غزلیں کہیں جس ترتیب سے وہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ غزل کی داخلی شہادت بھی اس مفروضے کے خلاف بڑی زبردست دلیل ہے۔ اور وہ شہادت یہ ہے کہ غزل کے مضامین کا آپس میں شاذ ہی کچھ تعلق ہوتا ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ ایک کُلِّ واحد ہے۔ جس کا دوسرے سے صرف یہی تعلق ہے کہ دوسرے شعر کی طرح وہ اُس غزل کے کُلِّ واحد کا ایک جزو ہے —— اس فردیت اور کلیت کے پیشِ نظر تخلیقی عمل میں غزل کے شعروں کی تقدیم و ترتیب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے مطلع آخر میں سوجھا یا پانچ کا کوئی شعر سب سے پہلے ذہن میں آیا۔ اور زمین کی شگفتگی نے غزل پوری کروائی۔

اس حجت اور قاطع حجت کے باوجود اگر آپ غزلوں کے بے کراں سرمائے پر ایک نظر ڈالیں تو بہت سے شعراء ایسے ملیں گے جنھوں نے غزل کے ایک ضروری حصّے یعنی مقطعے پر اِلّا ماشاءاللہ زیادہ توجہ نہیں کی۔ اردو میں بہت کم شعراء ایسے ملتے ہیں جنہوں نے غزل کے اس لازمی جزو کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ لیکن مقطعوں پر کچھ کہنے سننے سے پیشتر یہ بہتر ہوگا کہ ذاتِ مقطع پر کچھ روشنی ڈال جائے۔ اور اس کے تاریخی اور نفسیاتی پہلو کا کچھ تذکرہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اردو شاعری کو غزل کی ہر پہلو سے مکمل صنف فارسی سے ہاتھ آئی۔ شعرِ ایران نے غزل کے جمالیتی اور تخئیلی لوازمات کے ساتھ مقطعے کی میراث بھی اُردو کو دی۔ چنانچہ فارسی شاعری کی تقلید میں اُردو شاعری غزل سے شروع ہوئی۔ اُدھر فارسی شاعری عرب کی تقلید میں قصیدے سے شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ قصیدے کی تشبیب کو قصیدے سے قطع کیا گیا تو ایک طرح سے غزل کی داغ بیل پڑی۔ مگر قصیدے کی تشبیب ایک سلسلہ بند چیز تھی۔ جب یہ سلسلہ بھی موقوف ہوا تو غزل کا وجود توثیق ہو گیا۔ چنانچہ فارسی شاعری کے ولی دکنی یعنی رودکی کے زمانے میں غزل کی صنف مستقلاً وجود میں آ چکی تھی۔ مگر غزل کی

اصل ترقی اُن صوفیوں کے ہاتھوں ہوئی جنھیں مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے غزل کے ساغر و مینا درکار تھے۔ متقدمین میں یہ دور تصوف کا ہے۔ جہاں حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ نے غزل کو خاص زندگی بخشی۔ یہ زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے۔ اس کے جلد ہی بعد ایشیا پر خونریزی اور تباہی کا وہ طوفان امنڈ آیا جسے عبرت بینوں نے قہر خداوندی اور تاریخ دانوں نے یورش "تاتار" کا نام دیا۔ اس فتنے سے سلطنتیں زیر و زبر ہو گئیں۔۔ رستے بستے شہر مٹ گئے۔ ہستی بھاتی آبادیاں مٹ گئیں۔ اور ہر وہ چیز فنا ہو گئی جس پر ملکیت کے جذبے سے سرشار ہو کر فانی انسان فخر کر سکتا تھا۔ چنانچہ قصیدے کا چراغ گل ہوا۔ اور چونکہ طبیعتوں میں ایک قسم کی انفعالیت گداز، احساسِ فنا اور بے ثباتی در آئی۔ اس لئے غزل ہی ان جذبات کا ذریعہ قرار پائی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سعدی نے غزل میں اپنی پیمبری کا جھنڈا گاڑا۔

رودکی کے زمانے میں غزل کی صنف اگر مستقلاً وجود میں آ چکی تھی تو ظاہر ہے کہ غزل کا ایک فنی لازمہ یعنی مقطع بھی رائج ہو چکا تھا۔ لیکن دولت شاہ، آتشکدہ، خلیل اور خود پروفیسر براؤن اس بارے میں خاموش ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے رودکی کے نامور معاصر دقیقی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ لیکن متقدمین کے دوسرے دور یعنی سنائی وغیرہ کی غزلیں مقطعوں کے ساتھ ہیں۔ اور ان کے بعد تو آج تک ہر غزل اس فنی لازمے سے بہرہ ور نظر آتی ہے۔ عربی شاعری جو فارسی کے لئے مثال بنی، اس بحث سے خارج ہے کیونکہ قصیدے میں مقطعے اور پھر غزل کے مقطعے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے قطعی طور پر یہ حکم نہیں ہوتا کہ فارسی غزل میں مقطعے کا رواج کب سے ہوا۔ اور کیونکر ہوا۔ صرف ایک نفسیاتی توجیہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ مقطع یعنی شاعر کے نام والا شعر اسی جذبۂ ملکیت کا ایک اظہار ہے۔ جو پہلے پہل گلہ بانی کے دور میں انسان کے ذہن میں نمودار ہوا۔ گلہ بانی کے بعد انسان نے چراگاہوں کو چھوڑ کر زرعی زمینوں کا سہارا لیا۔ تو یہ جذبۂ ملکیت اور نمودار ہوا اور جاگیرداری کے دور میں بالکل مستحکم ہو گیا۔ ایرانی شاعری اسی دور سے شروع ہوتی ہے۔ جب ایرانی کافی متمدن ہو چکے تھے، چنانچہ شاعری پر بھی ملکیت کے اس جبلی اور نسلی خاصے نے اپنی مہر چھوڑی۔ امتیاز اور پہچان کی سہولت کے لئے لکھنے والوں اور سننے والوں نے یہ مہر ذاتی قبول کر لی۔ اس وقت چھاپہ خانے اور پریس تو تھے نہیں کہ قلمی تحریریں یا ادبی دستاویزیں اس طرح سے محکم مانی جائیں کہ ان میں دوسرا ترمیم یا تحریف ذکر سکتا۔ اور اب جبکہ چھاپہ خانے اور طباعت نے اس قدر عروج پا لیا ہے۔ ترمیم یا تحریف یا بیجا تصرف پر سوائے اپنی ضمیر اور یا نداری کے اور کیا قید رہیں ہے؟ خیر زمانے کے حالات، ذرائع آمد و رفت کی کم مائیگی اور سب سے زیادہ یہ کہ ملکیت کے اس نسلی خاصے نے شعری کاوشوں پر اپنی یہ مہر لگا دی! پھر وسط ایشیا کی چراگاہوں سے گڈریوں کا ایک غول اٹھا جنھیں خیوا کے خوارزم شاہیوں کی ایک اوچھی سی بات نے نعل در آتش کر دیا تھا۔ منگولوں کے یہ ٹڈی دل جب عجم پر چڑھ دوڑے ہیں تو یہ افسانوی سرزمین کم سے کم چھ خانوادوں کی سلطنت، ان کے کلچر، ان کی ثقافت اور تمدن سے مالا مال ہو چکی تھی۔ منگولوں کے لشکروں نے بڑے اہتمام اور باقاعدگی سے ان تمام آثاروں کو مٹانا شروع کیا۔ بارہ برس تک خوارزم شاہیوں کے "خدنگِ آخریں" جلال الدین خوارزم شاہ نے اس ٹڈی دل سے ٹکر لی۔ اور اس کشت و خون کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوا کہ ایران تہ و بالا ہو گیا۔ متمدن ایرانیوں کی ملکیتیں اور ان کے ملک کے جذبے، وحشی منگولوں نے خاک و خون میں ملا دیئے ——— یہی زمانہ فارسی غزل کے عروج کا ہے۔ ہاری ہوئی طبیعتوں نے اپنی انفعالیت کو غزل میں آسودہ کیا۔ اور مادمن کا وہ جذبہ ذہنی اڑانوں اور خالی خولی باتوں میں اور بھی رواج پایا جسے مادی دنیا میں چنگیزی تلواروں نے فنا کی نیند سلا دیا تھا۔ اب یہ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ جاگیر، یہ محل، یہ ملک میرا ہے۔ اب صرف یہی کہنے کی تاب رہ گئی تھی کہ یہ کتاب میں نے لکھی ہے، یہ غزل میری ہے۔ اس ذہنی قلابازی، دماغی ہیجان یا تخیلی اڑان کا مالک میں ہوں !!!

آپ اس استنباط سے یہ نہ سمجھیں کہ فتنۂ تاتار کی بدولت ہی مقطعے رواج پائے اور یہ کہ اس سے پہلے فارسی غزل میں

ان کا رواج نہ تھا۔ میری عرضداشت صرف یہ ہے کہ تاتاری حملوں سے پہلے ایرانی شاعری میں، غزل اور قصیدہ مکرمہ کی چیزیں تھیں۔ چنگیزی حملوں کے بعد جب دربار ہی نہ رہے تو قصیدے کون سنتا۔ چنانچہ جب حوصلہ نہ رہا تو داد و دہش بھی گئی تو قصیدہ کون لکھتا۔ چنانچہ غزل اور صرف غزل ہی کا دور رہ گیا۔ اور فارسی غزل، اپنے فنی لوازموں تخیلی پنہائیوں، اور تمام تر رعایتوں کے ساتھ منظرِ عام پر آئی۔ طبعی شکست خوردگی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اسی کو اظہار کا ذریعہ قرار دیا تو لازمی طور پہ اس پر اپنی مہرِ ذاتی بھی چھوڑی یا دوسرے لفظوں میں لوگوں کے لئے یہ سراغ مہیا کیا کہ یہ لفظی تصویریں جو ابھی آپ کے سامنے پیش ہوئیں، میری تھیں، اس کے نیچے میرے دستخط موجود ہیں۔ ملاحظہ کیجئے!!

میں عرض کر چکا ہوں کہ شعراء ایران نے غزل کی ہر پہلو سے مکمل صنف اُردو کو میراث میں دی۔ چنانچہ اردو شاعروں نے فارسی غزلوں کے نمونوں پہ ہی غزلیں کہنی شروع کیں اور تکمیلِ غزل، امتیاز، اور باہمی سہولت کے لئے مقطعوں کی پابندی بھی کی۔ ہندوستان والوں کے سامنے اس مہرِ ذاتی کا جواز شاید یہی نہیں تھا کہ فارسی غزل کی تقلید لازمی ہے۔ بلکہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان کی اپنی شاعری میں بھی اس مہرِ ذاتی کا رواج موجود تھا۔ مہاکوی کالیداس، تلسی داس، سورداس، بہاری کوی، ودیاپتی، چنڈی داس، امرو، کبیر، میرا راتی، میراں بائی، چندربردائی۔ سب نے اپنے اپنے شعری کارناموں پر اپنے نام کی مہر ثبت کی تھی۔ ان کی تقلید میں غیر ہندوستانی شعراء مثلاً حضرت امیر خسرو، عبدالرحیم خان خاناں، رس خان، شاہ برکت اللہ، پریمی بلگرامی، ملک محمد جائسی وغیرہ نے بھی اپنی دوہوں، بھجنوں اور گیتوں میں اپنا نام آخری مصرع میں شامل کیا۔ چنانچہ جب ہندوستانیوں نے ریختہ کے بولوں میں اپنے دل کے ٹکڑے موزوں کئے تو مقطع غیر ارادی اور مسلّم طور پر ہی موزوں ہوتا رہا۔

اتنی باتوں کے بعد، میں اسی عرضداشت کی طرف لوٹتا ہوں کہ اگر آپ اردو غزلوں کے بے کراں سرمائے پر ایک نظر ڈالیں تو بہت سے شعراء ایسے ملیں گے جنہوں نے غزل کے اس ضروری حصّہ یعنی مقطعے پر الّا ماشاء اللہ زیادہ توجہ صرف نہیں کی بہت کم شعراء ایسے ہیں جنہوں نے اس پیرایۂ اختتامیہ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ ان کے مقطعوں کو دیکھ کر چند باتیں ذہن میں آتی ہیں:۔

(۱) مقطعے کی خوبی یہی ہے کہ تخلص سے معنوی طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔ کیوں کہ تخلص ہی مقطعے کو غزل کے دوسرے شعروں سے ممیز کرتا ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ تخلص ایک خارجی عنصر ہے جو اس خاص مضمون کے دائرے میں بحیثیت جزوِ مضمون کے شامل نہیں۔ اس لئے اگر اسے جزوِ مضمون بنا کر پیش کیا جائے تو مقطعے کی خصوصیت بھی قائم ہو جاتی ہے اور پیرایۂ اختتامیہ کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔ یہ رعایتیں اکا دکا مثالوں کی حیثیت سے تو قریب قریب ہر شاعر میں نظر آئیں گی۔ کیوں کہ ہر تخلص بھر حال ایک بامعنی لفظ ہے۔ جو کسی نہ کسی مضمون کا جزو یا محور بن سکتا ہے۔ لیکن تخلص کی اس معنویت کو پرانوں میں صرف مومنؔ اور جدید دور میں مرحوم فانیؔ اور نوحؔ ناروی نے اپنا مستقل شعار بنایا۔ اور اس طرح اپنے مقطعوں کو ایک خاص حیثیت دی۔ مومنؔ نے ہر جگہ اپنے نام اور تخلص کے ساتھ معنوی نباہ کیا ہے۔ ان کے ہاں اس رعایت سے مضمونوں کی بوقلمونی بھی کافی ہے۔ لیکن نوحؔ ناروی سوائے طوفانِ نوح اور اس کے چند پہلوؤں یا تلازموں کے اور کوئی بات پیدا نہ کر سکے۔ مومنؔ کی چند مشہور مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومنؔ ایسا نہ کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

اُس بُت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومنؔ کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا
تو نے مومنؔ بتوں کو کیا جانا

مومنؔ اس بُت سے بگڑنا ہی نہ تھا
بن چکی بات خدا سے تیری،

(باقی اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

# دنیا کے ایک براعظم میں سات سو زبانیں بولی جاتی ہیں

## افریقی زبانوں پر عربی کا اثر

سید
ذوالفقار علی متعلم
دلی یونیورسٹی
دہلی

افریقہ تہذیبی اور تمدنی حیثیت سے پسماندہ ہے اور اس کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی شمال اور وسط کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے تاریخی دائرہ اثر میں آ گئے ہیں قبائلی زندگی سے آگے نہیں بڑھی اس لئے ہر قبیلہ اپنی اپنی بولی بولتا اور اس کی حفاظت کو اپنے جداگانہ وجود کی ضمانت کے طور پر ضروری سمجھتا ہے زبان اور چھوٹی موٹی بولیوں کے اس انبوہ میں سے "چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند" کے مصداق مختلف نظریات کا انبار لگ گیا ہے۔

### افریقی زبان کی بنیادی تقسیم

ایک ماہر لسانیات افریقی زبانوں کو تین بنیادی مجموعوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی۔

۱۔ سامی

۲۔ حامی

۳۔ ابتدائی افریقی جس کی دو شاخیں

(الف) نیگرو اور (ب) علاوہ نیگرو لیکن سلیجمن، ایم طاہر آر۔ ایچ کسٹ ان کے چھ اصل بیان کرتے ہیں یعنی

۱۔ سامی

۲۔ حامی

۳۔ نیم بانٹو

افریقی نسلوں کی انواع، ان کی تقسیم محل وقوع اور تعداد کے بارے میں اس خلاصہ کو زیر نظر رکھنا مطالعہ کے لئے مفید ہوگا۔

**خلاصہ**

(الف) سامی

۱۔ عرب ..... ۴٫۹ کروڑ

۲۔ قدیم عرب وغیرہ ..... ۵۲ لاکھ

۳۔ قبطی ..... ۲۵ لاکھ

۴۔ بربر ..... ۸ لاکھ

۵۔ بیلی ..... ۴ لاکھ

۶۔ خالص حامی ..... ۲ کروڑ

۷۔ حامی شاخیں (دیگر زبانیں) ..... ۷ کروڑ

(ب) دیگر اقوام ..... ۱۹٫۵ کروڑ

۱۔ نیگرو ..... ۱۶٫۱ کروڑ

۲۔ بش مین ..... ۱۷ لاکھ

۳۔ ہاٹن ٹاٹس ..... ۴ لاکھ

افریقہ کی زبانوں کے بارے میں افریقہ کی نسلوں کی طرح ماہر لسانیات میں نہ صرف اختلافات پایا جاتا ہے بلکہ یہ اختلاف نسلوں کے اختلاف کے برخلاف شدید تر ہے اس کی ایک توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ دنیا کی دو ہزار زبانوں میں سے تنہا صرف افریقہ میں سات سو کے قریب ایک ہزار رنگ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی حیثیت عملی اصطلاح میں زبان سے زیادہ بولیوں کی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ

۱۔ [illegible]

۴۔ نیگرو
۵۔ بنٹو
۶۔ ہاٹن ٹاٹس

لیکن موخرین میں ویسٹران کو پانچ شاخوں میں تقسیم کرتا ہے۔

۱۔ سوڈانی
۲۔ بنٹو
۳۔ حامی بشمول بُدو نملاتی سامی اور ہاٹن ٹاٹ
۴۔ بشمین اور
۵۔ سامی لیکن ڈاکٹر ڈی ویسٹرمین نے ۱۹۲۵ء میں ان کو پھر تین اصل انواع میں تقسیم کیا، یعنی ——

(۱) کوہسان، بشمول بش مین اور ہارٹن ٹاٹس

(۲) نیگرو، بشمول سوڈانی۔ بنٹو اور نیلی اور (۳) حامی سامی

بعد کے ایک عالم جے اے گرین برگ نے ۔ ۵ ـ ۱۹۴۹ء میں ان کو ۳ اصل انواع اور ان کی ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا اس کی لسانی تقسیم کو امریکی جغرافیہ نویس ڈڈلے اسٹامپ نے اپنی کتاب میں شائع کیا جس پر اس کی رائے زنی کی نوعیت یہ تھی۔

" جوزف گرین زبانوں کو سولہ خاندانوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن ان میں سے چند کو بہت ہی کم لوگ بولتے ہیں اجمالی طور پر نیگرو بنٹو افریقہ کو ایک ہی خاندان نائیجرین کانگو کی زبانیں بولنے والا بتایا گیا ہے اور تقریباً پورا منطقہ افریقہ میں خاندان کی مرکزی شاخ ہے گرین برگ کا نقشہ السنہ جنوبی افریقہ میں ایک وسیع دائرہ کو ایک خاندان ظاہر کرتا ہے کیوں کہ ان زبانوں میں آخر میں داخل ہیں پٹے بلی کی بنٹو زبانیں ہیں۔ اس قسم کی زبانیں پائی جاتی ہیں جنھیں گرین برگ کے نقشے کے مطالعہ کے وقت ہمیں اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے کیونکہ کلہاری کی ہیٹنو نا اور بکو تا زبانیں بنٹو ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے پورے شمالی افریقہ میں افریقی ایشیائی حامی (سامی) زبانیں بولی جاتی ہیں دیگر چھوٹی چھوٹی زبانیں جو مخلوط خون کی وجہ سے خاص طور پر زبان کی ارتقائی شکلیں ہیں۔

لیکن مذکورہ بالا تمام تقسیموں کو ناکافی مواد کا نتیجہ قرار دے کر انٹرنیشنل افریقن انسٹیٹیوٹ نے افریقی زبان کے کتابچے میں افریقی زبانوں کو ۳۴ زبانوں میں تقسیم کرنے کا کام انجام دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر بھی وہی بنیادی اعتراض وارد ہوتا ہے جو اور تقسیم پر کیا گیا ہے اصل مشکل اس سے پیدا ہوتی ہے کہ فی مواد جو اکثر صورتوں میں غیر صحیح بھی ہے زبانوں کی تقسیم کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس تقسیم کی غلطی واضح ہے کیوں کہ اس میں عربی زبان کا کہیں تذکرہ نہیں جو اس وقت افریقہ کی نہ صرف سب سے بڑی مقبول اور متمدن زبان ہے بلکہ حقیقی معنوں میں واحد علمی زبان ہے باقی زبانیں چاہے وہ حامی ہوں یا نیگرو یا بنٹو در اصل مقامی اور قبائلی بولیاں ہیں اصلی زبانیں (ام السنہ) نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ بربر زبان کو جو سامی اور عربی ہی کی ایک شاخ ہے افریقہ میں ایک زبان بھی تھی جس کا رسم الخط عربی ہو یا اس کا اپنا کوئی رسم الخط کبھی رہا ہو سری لیون میں ایک رسم الخط کا وجود بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے متعلق بھی شبہ کیا جاتا ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ مغربی استعمار کے بعد عربی زبان کے بڑھتے ہوئے نفوذ اور مقبولیت کو روکنے کے لئے عیسائی مشنریوں کے مشورہ سے افریقی زبانوں کا ایک مصنوعی رسم الخط ایجاد کیا گیا چنانچہ مغربیوں کی کوششوں سے پہلے افریقہ میں صرف عربی رسم الخط یا عربی الخط کے مقامی نمونے پائے جاتے ہیں مثلاً سوالیہ میں عثمانی خط یا سواحلی زبان کا عربی رسم الخط بھی زبان ہے اور جس کا لارڈ ہیلے لنگوا فرینکا قرار دیتا ہے اس کا رسم الخط عربی ہے جس کے بارے میں مستند رائے یہ ہے کہ یورپیوں کی آمد سے پہلے ہاؤسا ایک عربی زبان ہے جو اس وقت عربی رسم الخط کی صورت میں لکھی جاتی ہے اور اب وہ دیسی ادب کی حامل ہے اور اس میں قابل لحاظ لسانی معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔

اسی طرح سومالی زبان کے بارے میں جس کا رسم الخط عثمانی ہے یہ شہادت ملتی ہے کہ صوتی اور صرفی و نحوی حیثیت سے یہ زبان انتہائی مکمل زبان ہے۔

تیسری زبان سواحلی ہے جس کا رسم الخط عربی ہے یہ مشرقی افریقہ کی لنگوا فرینکا مانی جاتی ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ بڑے عرصہ سے یہ ادبی زبان ہے کلاسکی سواحلی زبان میں اس کا کافی لٹریچر موجود ہے۔ جو زیادہ تر نظم میں ہے۔

الغرض یورپی طاقتوں اور ان کے مسیحی مبلغوں کی آمد سے پہلے افریقہ میں علمی زبان صرف عربی تھی اور رسم الخط بھی عربی تھا یا عربی

باقی صفحہ ۳۱ پر

# سعدی شیرازی

# ایک شاعر ایک سخن گو

از قلم
نجمہ خاتون صدیقی
متعلمہ
دلی یونیورسٹی
دھلی

مشرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی ایران کے آسمان ادب کا وہ درخشاں ستارہ ہے جس کی بدیع نظم و نثر نے فارسی زبان کو فصاحت کے درجہ کمال کو پہونچا دیا اور جس نے بلاغت کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

سعدی تقریباً سنہ ۶۰۶ھ میں بمقام شیراز پیدا ہوئے سعدی نے ابتدائی تعلیم شیراز میں حاصل کی اور اس کے بعد بغداد روانہ ہوگئے انہوں نے مشہور مدرسہ نظامیہ اور دوسری علمی حلقوں میں کسب علوم و فضائل کیا۔ جوانی ہی سے بے چین روح رکھتے تھے کسی ایک جگہ پابند ہو کر نہ رہے ساری دنیا میں گھومنا اور لوگوں کو دیکھنا چاہتے تھے۔

شوق جہانگردی کے سوا ان کا وطن ایران مغلوں کے ہجوم میں گرفتار اور فارس خوارزمشاہیوں اور اتابکوں کی اماد کی کشمکش میں مبتلا تھا اس لئے ان کا دل اپنے وطن سے اچاٹ ہوگیا اور پھر انہوں نے جہانگردی شروع کردی اور ۳۰ سے ۴۰ سال کی مدت مسافرت ہی میں گزار دی بغداد شام اور مکہ سے لیکر شمالی افریقہ تک گھومتے رہے مختلف شہر اور گونا گوں ملتوں کو دیکھا۔ مختلف مذاہب اور فرقوں سے واقفیت حاصل کی غالباً اس مسافرت کا آغاز غیاث الدین خوارزم شاہی کے حملہ فارس کے سال یعنی سنہ ۶۲۲ھ سے ہوا اگر گلستان کی بعض حکایتیں حرف شاعرانہ ہی نہیں ہیں تو سعدی نے کاشغر ہندوستان اور ترکستان بھی دیکھا ہے۔

اس طولانی سفر اور آفاق و انفس کی سیر کرنیکے بعد یہ جہاں دیدہ شاعر تجارب معنوی اور افکار عالیہ کی ایک دنیا لئے ہوئے شیراز واپس آیا۔ اس زمانے میں یہاں ان کا ممدوح اور سرپرست اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی (۶۲۳ — ۶۶۸) حکومت کرتا تھا اور ہر طرف امن و امان قائم ہوگیا تھا اس لئے فرماتے ہیں۔

چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم
پلنگان رہا کردہ خوی پلنگی
چنان بود در عہد اول کہ دیدم
جہانی پر آشوب و تشویش و تنگی
چنین شد در ایام سلطان عادل
اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

سعدی ان چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں بلکہ ابتدائی جوانی میں ہی اپنی شہرت کا غلغلہ سنا سعدی نے اس زمانے میں یعنی سنہ ۶۵۵ھ میں بوستان نظم کی چنانچہ فرماتے ہیں۔

ز ششش صد فزون بود پنجاہ و پنج
کہ من گفتم این نامبردار گنج

اس کے ایک سال بعد گلستان تصنیف کی ان دو تصانیف کے سوا ان کے قصائد غزلیات قطعات ترجیع بند رباعیات مقالات اور عربی قصائد بھی ہیں۔

آنے والی نسلوں نے سعدی کا بہت اثر قبول کیا دنیا میں ان کی بہت زیادہ شہرت ہوئی اور انہوں نے خاص طور پر مشرقی اور ایرانی ادبیات پر گہرا اثر چھوڑا ہے یہی وجہ ہے کہ ایران کے بے شمار عالموں اور دنیا بھر کے فاضلوں نے ان کی بزرگی کے اعتراف میں گونا گوں عنوانوں کے تحت عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں۔

لسان الغیب خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

استاد سخن سعدیست نزد ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

امیر خسرو دہلوی اس طرح ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

جلد سخنم دارد شیرازہ شیرازی

سعدی نہ صرف ایران بلکہ تمام اسلامی ممالک اور تمام عالم ادب و علم میں اپنے زمانے سے لیکر اتبک گنتی کے چند بڑے بڑے نامور شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور ہر جگہ ان کے افکار و اشعار عقیدت سے آنکھوں سے لگائے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کی کتاب گلستان سلاطین ہند اور سلاطین عثمانی کے درس میں رہی ہے اس عظیم المرتبت شاعر کی وفات ۶۹۱ھ اور ۶۹۴ھ کے درمیانی سالوں میں خود ان کے وطن شیراز میں ہوئی اور وہ اسی شہر میں دفن ہوئے۔

## (سبک و فکر)

سعدی نے شعر کی تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے اور حق یہ ہے کہ ہر صنف سے خوب عہدہ برآ ہوئے ہیں سعدی کے قصائد پر رونق سادہ اور بے تکلف ہیں ان کا موضوع خدا کی حمد و ثنا، پند و نصیحت مرثیہ اور مدح ہے وہ خصوصیت جو سعدی کے قصائد کو ایک امتیاز خاص بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت ہی شگفتہ اور دلپذیر انداز میں اپنے بادشاہوں اور امیروں کو عدل و نیکوکاری کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور انہیں بیدار کرنے سے نہیں چوکتے ہیں اس طرح ان کی دلبرانہ نصیحتیں ادبیات ایران میں بلکہ تمام دنیا کی ادبیات میں اپنا نظیر نہیں رکھتی ہیں انھیں ملک ایران کی فکر آزاد اور ہمت بلند کی ایک دلیل سمجھنا چاہیئے کیوں کہ ایرانی شاعر نے آج سے تقریبًا سات سو سال پہلے جب کہ ساری دنیا تاریکی جہالت اور اندھیرے میں غرق تھی اپنے زمانے کے حکمرانوں کے راستے پر ایک چراغ ہدایت روشن کیا اور حقائق کو نہایت بے باکی کے ساتھ ان کے سامنے بیان کیا جو زور اور زر دونوں کے مالک تھے جیسا خود فرماتے ہیں۔

نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ
سخن ملکی است سعدی را مسلم

نہ صرف ان کے مدحیہ قصائد پند و نصیحت اور ہدایت کے طرز پر ہیں بلکہ قصائد کے قصائد صرف پند و نصیحت پر لکھے ہیں مثلاً

خوشست عمر دریغا جاودانی نیست
پس اعتماد برین پنج روز فانی نیست

---

رفند بچہ زیر خاک تن ما جہاں شود
وآنہا کہ کردہ ایم یکایک عیاں شود

سعدی نے ستھری عبارت سے قصیدے کو فصاحت بخشی اور اسے چمکایا ان کی زیادہ تر توجہ لوگوں کے خیالات کی درستی ان کے اخلاق کی صفائی حق پروری کی طرف مرکوز رہی ہے شاعری میں سعدی کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مدحیہ قصیدے کو جتنا نظر انداز کیا اتنی ہی غزل کو آرائش بخشی۔ سعدی نے غزل کو احساسات کی تعبیر کا ذریعہ بنایا سچ تو یہ ہے کہ آئین سخن سرائی میں سعدی نے دماغ کے ساتھ دل کی اور احساسات کے ساتھ خرد کی جنگ و جدل کا تماشہ عجیب پرلطف طریقہ پر دکھایا ہے اس میں عشق و ذوق شور و شوق تخیل کی بلند پردازی، نکتہ پردازی اور مضمون آفرینی کو اپنے کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ بلا مبالغہ سعدی اور ان کے بعض ہم عصر و بعض ظہیر کے بعد غزل فارسی کے اقسام شعر میں ردیف اول میں شمار ہونے لگی۔

سعدی کا اگلا امتیاز بھی یکتا ہے وہ ان کی شیریں اور رواں نثر ہے جو ہر طرح ان کی نظم کے ہم پلہ ہے سب سے اچھا نمونہ ان کی کتاب گلستان ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایرانی ادبیات کا گل سرسبد ہے انہوں نے الفاظ کے حسن انتخاب حسن وزن اور تناسب کو فارسی عبارت میں خوب بٹھایا ہے اس طرح انہوں نے شیخ عطار وغیرہ کے دفتر پر گویا خط بطلان کھینچ دیا ہے ان کی عبارتیں آب رواں کی طرح رواں، آہنگ جاناں کی طرح جاذب، شیریں گوش نواز اور دلفریب نکلی ہیں۔ جیسے:۔

"نہ ہر کہ بقامت مہتر بقیمت بہتر" "توانگری بہنر است نہ بمال و بزرگی بعقل است نہ بسال"۔ "گوہر اگر در خلاب افتد ہم چنان نفیس است وغبار اگر بر آسمان رود ہم چنان خسیس" و "خانہ دوستان بروب و در دشمنان مکوب"

گلستان درحقیقت پند و نصیحت اور تہذیب اخلاق تہذیب نفس پر لکھی ہوئی کتاب سعدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے حقائق کو طول طویل استدلال اور طول کلام کے بغیر از راہ تمثیل

باقی صفحہ ۲۷ پر

# ادھ کھلے پھول ــــ جنھیں آبیاری کی ضرورت ہے

از سرگرداں دہلوی

اس عنوان کے تحت قارئین شاہجہاں کو ان اُبھرتے ادیبوں اور شاعروں سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ جو مستقبل قریب میں اُردو کے عظیم ستون ثابت ہوں گے۔ زیرِ نظر شمارہ میں سید مظفر صاحب (ساجد میاں) کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ آپ دلی یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے طالب علم ہیں۔ اگلے شمارہ میں آپ ناہید تاج قریشی صاحبہ سے متعارف ہوں گے۔ جو دلی کالج میں آنرز کی طالبہ ہیں۔

شمیم کرہانی نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ۔

گلشن سے شمیم آخر کس طرح گذر جائیں
ہر پھول یہ کہتا ہے میں پیار کے قابل ہوں

آپ ذرا گلشنِ ادب سے گذر کر تو دیکھیں ہر طرف حسین اور خوب صورت مہکتے پھول نظر آئیں گے۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو اور خوش نما رنگت آپ کا دل موہ لینے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن ہر پھول کی قسمت ایسی کہاں کہ وہ حجلۂ عروسی کی زینت بنیں۔ نئی نویلی دلہن کے سہاگ میں مہک ہی مہک پیدا کر دیں۔ بلکہ کچھ پھول تو کھلتے ہی صرف اس لئے ہیں کہ مزاروں کی زینت بنیں۔ پھول ایک جگہ خوشبوؤں میں اضافہ کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف ماتم گساروں کے لئے وجہِ تسکین بنتا ہے۔ اسی طرح گلستانِ ادب میں یوں تو ہزاروں پھول اپنی خصوصیات کی بنا پر قابلِ قبول ہیں۔ لیکن کسی نے ذرا بھی خود نمائی کی کوشش کی اور گلچیں کی نظر لگی۔ اور بہت سے پھولوں کا کام تو صرف موسمِ بہار کی خوشگواری میں اضافہ کرنا ہے۔ انھیں خود نمائی مقصود نہیں۔ پھر بھی گلچیں کی نظر سے بچنا مشکل ہے۔

یوں تو آپ کی دلچسپی کی خاطر سرگرداں کو اسم با مسمیٰ بننا پڑتا ہے۔ اور جب وہ اپنے مدعا کا راہئے اظہار کسی کے سامنے کرتا ہے، تو ہر ایک اپنے آپ کو قابل جتاتا ہے کہ اسے متعارف کرایا جائے۔ لیکن آپ کے جذبات اور امیدوں کا خیال کرتے ہوئے کسی ایسے ہی پھول کو چننا پڑتا ہے جو حقیقتاً میں گلستانِ شاہجہاں کو مہکا سکے۔

تو آئیے! آج آپ اس پھول کو دیکھئے۔ اور دیکھئے، کہ کہاں تک وہ اپنے اس دعوٰی میں پورا اترا ہے۔

نام ہے، مظفر سعید، صرف ادبی نام، عرفِ عام میں اس افسانہ نگار کو ساجد میاں کے نام سے پکارتے ہیں ــــ حلیہ کے اعتبار سے بالکل مولوی۔ لیکن عمل کے لحاظ سے بالکل برعکس۔ مطلب یہ کہ مولوی کو اس زمانہ میں کسی بکری سے تشبیہ دی جا سکتی۔ جسے جہاں جی چاہے باندھ دیجئے ــــ اور وہ حرفِ شکایت تک زبان پر نہ لائے۔ یا بالکل زاہد خشک، جسے مسجد کے علاوہ اور کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ اور اس لحاظ سے آپ بالکل مولوی نہیں۔

نئی نئی تشبیہات دینے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور افسانہ جذبات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے میں کسی دلربا سے کم نہیں۔ ایک مرتبہ افسانہ شروع کرنے کے بعد ممکن نہیں کہ بغیر ختم اور ذرا ٹھہرئے چھوڑا جائے۔ ماہِ گذشتہ آپ نے ان کا افسانہ "پیار کی قیمت" پڑھا۔ اور اب ان کا نیا شاہکار افسانہ "دل ہی تو ہے" ملاحظہ فرمائیں۔

اب تک جتنے افسانے لکھے (علاوہ پیار کی قیمت) سے

ںیویں صدی،، کی نذر ہوئے۔ اوراب شاہجہاں کے مستقبل میں ہمیں اورآپ کوان سے بہت سی امیدیں
ق کی زینت ہورہے ہیں۔ رکھنی چاہئیں۔

# دل ہی تو ہے ۔۔۔!

سید مظفر سعید متعلم
دلی یونیورسٹی دہلی

آج کا دن کتنا حسین ہے یا شاید مجھے ہی ساری کائنات رنگین اور خوشیوں سے بھرپور نظر آرہی ہے۔ ہوا میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے چمکیلی سفید دھوپ بکھری ہوئی ہے اور اس سردی کے موسم میں کتنی اچھی لگ رہی ہے یہ چڑیا بھی تو کتنی خوش ہے جو ابھی ابھی برآمدے کے تار پر آکر بیٹھی ہے اور پھدک، پھدک کر چہچہا رہی ہے شاید یہ بھی میری خوشیوں میں شریک ہے اور میں بھی کتنا خوش ہوں آج میری منزل قریب آگئی ہے میرے خواب پورے ہو رہے ہیں آج میرے راستہ کی رکاوٹ دور ہو رہی ہے۔

آج طاہرہ کی شادی ہے شام کو برات آنے والی ہے پورے گھر میں چہل پہل ہے نیچے محلہ کی لڑکیاں اور عورتیں جمع ہیں بچے ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا تنہا، خلاؤں میں جھانک رہا ہوں جہاں مجھے رنگین لہریے ناچتے نظر آرہے ہیں۔ میں تنہا ہوں لیکن کائنات کی خوشیاں میرے ساتھ ہیں ہر چیز مجھے مسکراتی نظر آرہی ہے میز پر رکھی ہوئی شازیہ کی بڑی تصویر بھی تو مسکرا رہی ہے اس کے حسین گلابی ہونٹوں سے مسرتوں کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔ میں بے اختیار تصویر کو اٹھا لیتا ہوں۔

"اب تم مجھ سے دور نہیں رہیں شازی! آؤ میری آنکھوں میں سما جاؤ جو تمہارا تصور لئے راتوں جاگی ہیں۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں کھو جاؤ جو تمہاری آہٹوں پر دھڑکتا ہے۔ میری روح میں مل جاؤ جس کا وجود تمہارے بغیر نا ممکن ہے۔

میں تصویر آنکھوں سے لگا لیتا ہوں"۔ میرے ماضی کے حسین ساتھی! اب میرا مستقبل تمہاری مسکراہٹوں سے ان حسین ستاروں سے روشن ہو جائیگا۔ اور دوسرے ہی لمحے میرے سامنے بچپن کی حسین گڑیا شازی اچھلتی کودتی آجاتی ہے بیتے دنوں کی یادیں میرا ہاتھ پکڑ کر ماضی کے دھندلکوں میں لے جاتی ہیں۔

کچھ ایسی ہی روشن اور چمکیلی صبح تھی لیکن میری زندگی کا تاریک دن طلوع ہوا تھا میری پیاری ممی مجھ سے روٹھ گئی تھیں اور میں اس وسیع دنیا میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا تھا پاپا کو تو میں نے دیکھا ہی نہ تھا۔ ممی بتاتی تھیں کہ ایک حادثہ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے بعد ممی نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی اور پھر میری تعلیم و تربیت میں خود کو گم کر دیا تھا انھوں نے مجھے کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا لیکن گھر کی تنہائی کی وجہ سے میری طبیعت تنہائی پسند اور سنجیدہ ہو گئی تھی میری آنکھوں میں چھائی سنجیدگی کی وجہ سے لوگ مجھے زیادہ عمر کا سمجھتے۔ میری دلچسپیاں اپنی ذات تک محدود تھیں اسکول میں میرے ساتھی میری عزت کرتے یا شاید رعایت کرتے تھے کیوں کہ میں جسمانی طور پر بھی کمتر تھا اور جس دن میری ممی مجھ سے اچانک رخصت ہو گئیں مجھے معلوم ہوا کہ اس دنیا میں میری ممی کے علاوہ میرے ایک ماموں بھی تھے ان کے بارے میں ممی نے کبھی کوئی تذکرہ کیا تھا نہ وہ خود ہی ہمارے یہاں آئے تھے لیکن اس وقت شاید مجھے بے یار و مددگار اور تنہا دیکھ کر انھیں خون کے اس رشتہ کا خیال آگیا تھا جو نہ معلوم کس وجہ سے ٹوٹ گیا تھا چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔

وسیع لان سے گزر کر جب کار کوٹھی کے پورٹیکو میں پہنچی اور میرے

،کار کا دروازہ کھول کر ماموں نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا تو میں جھجکتے ہوئے قدم باہر رکھا اور دوسرے ہی لمحہ میرے کانوں میں زور سے سیٹی بجی۔ میں بوکھلا کر پیچھے ہٹا تو کار کے کھلے دروازے سے ٹکرایا۔ کار کا دروازہ کھلتا چلا گیا اور میں زمین پر لڑھک گیا۔ ساتھ ہی میرے کانوں میں زوردار قہقہہ گونجا میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور اس قہقہے کی طرف نظر گھمائی وہاں ایک چینی گڑیا کھڑی تھی اس کے سنہرے بال تھے سیب جیسے گال اور چمکیلے چھوٹے چھوٹے دانت تھے ہنسی اس کے منہ سے موتی جھڑ رہی تھی میں ابھی اسے دیکھ ہی رہا تھا اس کی ہنسی نے میرا غصہ کافور کر دیا تھا کہ اسی وقت ایک طرف سے ہلکی سی آواز سنائی دی" بدتمیز شازیہ! مہمان سے مذاق کرتے ہیں؟"
دیکھو ان کے چوٹ نہ لگ گئی ہو گی" میں نے اس ہمدرد آواز کی طرف مڑ کر دیکھا تھی تو وہ بھی ایک گڑیا ہی لیکن چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور نگاہوں میں ہمدردی تھی اسی وقت شازیہ میری جیب ٹٹولنے لگی۔

یہ تھی شازیہ اور طالعہ سے میری پہلی ملاقات۔

طالعہ میری ہم عمر یا شاید کچھ بڑی ہی تھی بہت خاموش اور کم گو نظر آتی تھیں شازیہ ان کے برعکس تھی اس کی آنکھوں میں ہر وقت شرارت کی بجلیاں کوندتی رہتیں شروع شروع میں تو میں اس کی شرارتوں سے خوفزدہ بھی ہوا پھر جلد ہی ہم بے تکلف ہو گئے تھے۔ اس گھر میں کوئی لڑکا نہیں تھا شاید میرے ماموں یہی خلا پر کرنے کے لئے مجھے لے آئے تھے۔

دو چڑیاں لڑتی ہوئی میرے سامنے آ گریں اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ہم تینوں بھی تو اس طرح اس وسیع اور اونچے ستونوں والی کوٹھی میں لڑتے جھگڑتے اور ساتھ کھیلتے تھے پائیں باغ میں امرود کے پیڑ کی ڈال ہماری بیٹھک تھی اور کچے پکے امرود ہماری من پسند چاٹ گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں ہم ممانی کی آنکھ بچا کر باہر نکل آتے اور سنسان باغ میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے پھرتے۔ میری تنہائی کا احساس ختم ہو گیا تھا [illegible] بلکہ مجھے ماموں اور ممانی کی طرف سے پیار کا خزانہ ملا تھا جس نے

ماں باپ کی کمی کا احساس ختم کر دیا تھا ان دونوں کے شفقت بھرے سائے میں ہم زندگی کی حسین راہ کو طے کرتے رہے اور یوں بچپن کی سرحدیں پھلانگ شباب کی دہلیز تک پہنچ گئے۔ شعور کی پختگی نے ہمارے درمیان تکلف کی ہلکی سی دیوار کھڑی کر دی تھی لیکن یہ تکلف صرف طالعہ تک ہی محدود تھا شازیہ تو اب بھی اپنی شوخیوں سے باز نہ آتی گھر کے کونے کونے میں اس کے چنچل قہقہے گونجتے رہتے اور زندگی سے بھرپور قہقہے ہی مجھے سب سے زیادہ پسند تھے۔

ان قہقہوں کو سن کر زندگی کی تلخیوں کا احساس مٹ جاتا جو کبھی کبھی انجانے میں مجھے گھیر لیتی تھی۔ روح میں ایک تازگی محسوس ہوتی اور امنگیں جوان ہو جاتیں ایک طرف شازیہ پہاڑی نالے کی طرح شوخ اور چنچل اور طوفانی تھی دوسری طرف طالعہ کسی جھیل کی طرح پرسکون اور خاموش ---- اس کے قریب میں آسودگی اور سکون محسوس ہو جاتا لیکن ساتھ ہی ویرانی اور سناٹے کا بھی احساس ہوتا جس سے دم گھٹنے لگے میں تو زندگی کا متلاشی تھا زندگی میں ہلچل چاہتا تھا۔ ویرانی اور خاموشی سے اکتایا ہوا تھا اس لئے لاشعوری طور پر آہستہ آہستہ شازیہ میرے دل میں گھر کرتی چلی گئی۔ طالعہ کی جھکی جھکی نگاہیں مجھ سے کچھ کہتی نظر آتیں اس کی لمبی لمبی پلکوں کے سائے میں محبت کے دیئے جلتے دکھائی دیتے۔ لیکن میرا دل تو شازیہ کی پر ہنگامہ شخصیت میں کھو چکا تھا اگرچہ اس کی نگاہیں جذبات سے عاری ہوتیں اور اس کی حرکات و سکنات سے کسی جذبے کا اظہار نہ ہوتا لیکن مجھے اس کی یہی لاپرواہی پسند تھی۔ میں اسے اپنا خیال کر چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میری محبت اس کے دل میں قدم جما چکی ہے۔

طالعہ اس سال بی۔ اے سے فارغ ہو چکی تھی اور شاید تعلیم سے مکمل طور پر فارغ ہو جانے کا ارادہ کر چکی تھی کیونکہ اس نے آگے داخلہ لینے سے انکار کر دیا تھا ساتھ ہی گھر میں اس کی شادی کے چرچے ہونے لگے تھے۔ میرا ایم ایس سی کا آخری سال تھا۔ ممانی جان نے کئی مرتبہ مجھ سے خاص طور پر طالعہ کی شادی کی بات چیت کی ان کا انداز [illegible] پکار کر کہتا

تھا کہ وہ میری طرف سے کسی پیش قدمی کی منتظر ہیں اور وہ تو مجھے حکم بھی دے سکتی تھیں۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کا مرہون منت تھا۔ میں جس قابل بھی ہوا تھا صرف انھیں کی مہربانی کی بدولت۔ ورنہ نہ معلوم میں کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہوتا۔ لیکن میں اس پیش کش کو کس طرح قبول کر لیتا میرے دل کی دنیا تو شازیہ نے آباد کر رکھی تھی۔ اور اس میں اب کسی بھی صورت سے طالعہ کے لئے گنجائش نہیں تھی ہم سب حسب معمول ملتے۔ گھنٹوں باتیں کرتے ہنستے لڑتے جھگڑتے باہر جاتے لیکن طالعہ اب میرا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگی تھی۔ کالج سے واپسی پر مجھے اپنے کمرے کی سجاوٹ اور ترتیب میں اسی کی خوشبو آتی۔ ہر چیز اس کے ہاتھوں کے لمس کی شکایت کرتی۔ کھانے پینے میں میری پسند کا خیال رکھا جاتا گلدانوں میں میری پسند کے پھول مہکتے وہ خود ہمیشہ میری پسند کے رنگوں کے کپڑے پہنتی میری پسند کی خوشبو استعمال کرتی لیکن نہ معلوم کیوں میرے دل میں ان سب چیزوں کو دیکھ کر الجھن سی ہوتی۔ اس کے لئے میرا برتاؤ روز بروز روکھا ہوتا گیا۔

میں اخلاقاً اس سے ہنسنے بولنے کی کوشش کرتا لیکن دلی بیزاری میری باتوں سے عیاں ہو جاتی اس کی آنکھوں میں حیرت اور شکایت کے ملے جلے جذبات ابھرنے لگتے۔ وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتی اس کی گھنیری پلکوں پر اداسی چھا جاتی اور میں لاپرواہی سے اٹھکر چلا جاتا کتنا ظلم کرتا تھا میں اس پر!

لیکن وہی تو تھی جو میری اور شازیہ کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی اس کا گھر بسنے سے پہلے میں شازیہ کے لئے اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں بھی اس کے لئے مناسب بر کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ جب کبھی میں موقع پا کر ان سے کسی مناسب لڑکے کا ذکر کرتا وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگتیں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتیں۔ اور لڑکے سے متعلق تفصیلات پوچھنے لگتیں۔

نیچے بچے ایک دم شور مچانے لگے ننھے میری سوچوں کا دھارا ٹوٹ گیا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا بہت سے بچے گھیرا بنا کر دوڑ رہے تھے۔ اور کھیل پورے زور و شور کے ساتھ جاری تھا۔ میں تھوڑی دیر تک انھیں دیکھتا رہا میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی جا کر انہیں میں مل جاؤں اور خوب قہقہے لگاؤں اسی وقت سامنے کے کمرے سے شازیہ نکلی اس نے سلیٹی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اندھیری رات کے ستارے کی طرح چمک رہی تھی — میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں برآمدے سے پیچھے ہٹ گیا تاکہ اچھی طرح اس کو دیکھ سکوں لیکن اس کی نظر مجھ پر پڑ ہی گئی۔ اس نے اوپر دیکھا پھر بڑی لاپرواہی سے بچوں کی طرف متوجہ ہو کر انہیں ڈانٹنے لگی اور وہ اور بھی زیادہ شور مچا مچا کر اس کے چاروں طرف گھومنے لگے مجھے اس کا یہ انداز کچھ غیر فطری سا معلوم ہوا کم از کم اس وقت تو اسے میری طرف متوجہ رہنا چاہئے تھا تاکہ میں اس کو اچھی طرح دیکھ سکتا۔

"اونہہ! وہ تو ایسی ہی لاپرواہ ہے۔ یا شاید لاپرواہی ظاہر کرنا چاہتی ہے چاہے کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہو میں بڑی دلچسپی کے ساتھ اسے بچوں کے ساتھ الجھتے دیکھ رہا۔ پھر وہ واپس چلی گئی۔ ایک بار بھی تو اس نے سر اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ ایک ہلکا سا غبار میرے دل پر سے ہو کر گزر گیا۔" اس کی جگہ اگر طالعہ ہوتی تو وہ شاید کچھ دیر اور ٹھہر جاتی میں نے کمرے میں آ کر ایک کتاب اٹھائی اور یونہی اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن میرا دماغ کتاب سے دور کہیں بھٹک رہا تھا۔

اس روز جب طالعہ نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تو میں نے فوراً شازیہ کو بھی دعوت دے ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ طالعہ کچھ بجھ سی گئی تھیں اور پھر اتفاق سے جب سینما ہال میں، میں اور شازیہ ایک ساتھ بیٹھے اور طالعہ کو شازیہ کے بعد والی سیٹ ملی۔ تو وہ بالکل چپ چاپ بیٹھی فلم دیکھتی رہی۔ واپسی میں بالکل خاموش رہی اور جب میں نے ایک کپ کافی کے لئے چلنے کی پیش کش کی تو اس نے فوراً سر میں درد بتا کر معذرت کر لی

اور ہم تینوں کو واپس آنا پڑا۔

اور اسی شام کو کھانے کی میز پر جب طالعہ نے

ک۔ میری طرف بڑھائی جسے یقیناً اسی نے پکایا تھا اور میں نے
ہیں سے ایک چمچہ لیا اس وقت طالعہ میری طرف داد طلب
اہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے میری تعریف کا ایک جملہ اس
لئے کائنات کی دولتوں سے بڑھکر ہوگا لیکن میں نے شازیہ
طرف دیکھا۔

"تم بھی تو کبھی کچھ پکا کر دکھاؤ شازی"

"اونہہ! ہمیں کیا ضرورت ہے پکا پکا کر دکھانے کی"۔
شازیہ نے مونڈھے اُچکا کر لاپرواہی سے جواب دیا۔ طالعہ
پھر چونک سی پڑی اور میں کھسیانہ ہو گیا۔

شازی کی یہ لاپرواہی اور لاابالی پن ہی تو مجھے حد درجے
عزیز تھا۔ وہ مجھ سے جتنی لاپرواہی برتتی میں اتنا ہی اس کے
قریب ہوتا جا رہا تھا۔ ہر طرح اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش
کرتا اور طالعہ کے مقابلہ میں اس کی حمایت کرتا لیکن اس کی بے نیازی
برقرار رہتی اور مجھے دن بدن یقین ہوتا گیا کہ یہ بے نیازی بلا
سبب نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک ادائے دلنواز
تھی۔ اور شاید وہ میری اس پسند کو بھانپ گئی تھی۔

ڈاکٹر خورشید یوں بھی ایک شاندار اور پرکشش
شخصیت کے مالک تھے۔ اور مجھے شاید اس لئے زیادہ
اچھے لگے کہ وہ طالعہ کے طلبگار بنکر آئے تھے وہ میرے
راستے کا پتھر ہٹانے آئے تھے ماموں اور ممانی کی تجربہ
کار نگاہوں نے بھی انھیں ہر طرح موزوں اور مناسب پایا۔
اور منظوری دیدی۔ میں اپنی خوشی میں گم ہو کر جب طالعہ کو یہ
خبر پہنچانے گیا اور ڈاکٹر کی شاندار تصویر اس کے ہاتھوں میں
تھمائی تو وہ ایک دم بھونچکی سی ہو کر مجھے دیکھتی رہ گئی۔
اس کی گہری اُداس نگاہوں میں حیرت تھی جو بعد میں شکایت میں
بدل گئی وہ کچھ دیر میرے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی
رہی پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر حسرت چھا گئی اور جب
میں نے اس سے اس کی رائے معلوم کی تو اس کی پلکیں جھک
گئیں اعان میں دو موتی آکر اٹک گئے۔

"آپ کی پسند مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے"
اس کی آواز کے درد کو محسوس کر کے مجھے اپنے اوپر غصہ آگیا میں
اتنا کٹھور کیوں ہو گیا تھا کیا اس تک اطلاع پہنچانے کیلئے
میں ہی رہ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے شازیہ نے میرے ذہن
کے دریچوں سے جھانکا اور میں نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو
بات صاف ہوگئی ورنہ بے چاری غلط فہمی میں گھلتی رہتی۔ میں
نے آہستہ سے کہا۔

"مبارک ہو"۔ اور خاموشی سے باہر آگیا۔

برات آنے میں کچھ دیر تھی۔ میں یونہی بلا مقصد گھومنے لگا
شازی کے کمرے میں جا نکلا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ
طالعہ کے پاس تھی اور اس کے جلد واپس آنے کی کوئی امید نہیں
تھی۔ میں میز پر پڑی ہوئی مختلف کتابوں اور رسالوں کو دیکھتا
رہا۔ میری نظریں کتابوں اور رسالوں کے انتخاب کی داد دے رہی تھیں،
یہ سب زندگی سے بھرپور کتابیں تھیں ان میں قہقہے اور مسکراہٹیں
تھیں لطیفے اور کارٹون تھے۔ سب سے اوپر کنہیالال کپور کی
"شیشہ و تیشہ" کھلی پڑی تھی دو تین کتابوں کے نیچے ایک خوبصورت
سی نیلے رنگ کی جلد کا کونہ نظر آ رہا تھا میں نے کوئی شعری مجموعہ
سمجھکر اسے اٹھا لیا دیکھا تو شازیہ کی ذاتی ڈائری تھی ۔۔۔ میں
نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند
تھے صرف ایک دروازہ کھلا تھا جو راہداری کی طرف کھلتا تھا
"اگر وہ آ بھی گئی تو اسے آتا دیکھکر میں فوراً چھپا ہی لوں گا"۔
ذرا دیکھوں تو اس نے میرے متعلق کیا لکھا ہے؟

دھڑکتے دل اور کانپتی انگلیوں نے ڈائری کے
ریشمی اوراق پلٹنے شروع کر دیئے جگہ جگہ کالج میں لڑکوں
اور لڑکیوں کی شرارتوں کے واقعات مزاحیہ اشعار اور
لطیفے لکھے ہوئے تھے مجھے اکتاہٹ ہونے لگی اسے
صرف ان ہی باتوں سے دلچسپی ہے۔ میں نے سوچا ۔۔۔
۔۔۔ اچانک ایک قریبی تاریخ والا صفحہ سامنے آگیا اور اسے
دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ اس پر پنسل سے میری ایک خوب
صورت سی تصویر بنی ہوئی تھی نیچے لکھا تھا

"بے چارے مسٹر معصوم"

میں نے گھبرا کر ورق پلٹا۔ ادھر اس پر تو بہت کچھ لکھا
ہے! میں نے بڑے اشتیاق سے پڑھنا شروع کر دیا۔

"آج کل سلیم بھائی بڑے خوش نظر آرہے ہیں۔ آپی کا رشتہ کیا آیا ہے انھیں جیسے کوئی دولت مل گئی ہے۔ بڑی خوشی خوشی شادی کے انتظام میں مصروف ہیں۔ ساتھ میں مجھے بھی لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن میں ٹال دیتی ہوں۔ ان کی حرکتیں کچھ پراسرار ہیں۔ (میرا دماغ سائیکی سائیں کرنے لگا) وہ سمجھتے ہیں کہ میری پیاری آپی کو دکھ پہنچا کر وہ مجھے جیت لیں گے آپی کتنی چاہتی تھیں ان کو لیکن وہ تو میری ہی فکر میں ہیں اگر وہ میرے دل میں جھانک لیں اور اس میں شاکر کا بسیرا دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو۔ اُف! کیسی مشکل ہو جائے گی اس وقت جب انھیں معلوم ہوگا کہ میں شاکر کے علاوہ کسی دوسرے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ شاکر ہے بھی کتنا اچھا۔ کوئی دلچسپی ہے جو اس میں نہ ہو۔

لڑکیاں بھی تو اسے ہر وقت گھیرے رہتی ہیں۔ اور ہلینز میں تو وہ اتنا جچتا ہے کہ بس دیکھتے ہی جاؤ لیکن وہ میرے علاوہ کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں ایک یہ سلیم صاحب ہیں۔ ہر وقت لبو رتی صورت لئے ہوئے ہر وقت خیالوں میں گم جیسے ان کی ذات کے علاوہ کسی دوسرے کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حروف میری نظروں کے سامنے گڈمڈ ہونے لگے ڈائری گرنے کی آواز سے چونک کر میں نے اوپر دیکھا کھڑکی میں سے چمکیلا نیلا آسمان نظر آرہا تھا جس کی بے کراں وسعتوں میں ایک اکیلی چیل بے مقصد چکر لگا رہی تھی۔ بس ۔ ۔ ۔ !

۴

ایسے ہی گراں بہا تجربوں کو سعدی نے نہایت موثر اور دلکش عبارت میں بیان کر دیا ہے کہ اس سے بہترین اخلاق اور اجتماعی اصولوں کا ایک نفیس مجموعہ اور بہترین ادب فارسی کا ایسا نمونہ عالم وجود میں آیا ہے جس کا مطالعہ "بدون تردید متعلمان را بکار آید و مترسلان را بلاغت افزاید" ۔۔۔ ۔۔۔!

بقیہ شیخ سعدی

بڑی پیاری اور میٹھی عبارت میں بیان کر دیا ہے۔ مثلاً کسی کو صبر کی تلقین کرنا چاہتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں۔

بچشم خویش دیدم در بیابان
کہ آہستہ سبق بردا ز شتابان
سمندبادپا از تگ فرو ماند
شتربان ہم چنان آہستہ می راند

اور معیشت میں نظم و ترتیب قائم رکھنے کے متعلق فرماتے ہیں

چون دخلت نیست خرچ آہستہ ترکن
کہ می گویند ملاحان سرودی
اگر باران بکوہستان نبارد
بسالی دجلہ گردد خشک رودی

اسی طرح سعدی وحدت کی بلندی سے اس انسانیت کو جو آج کی طرح تفرقہ بندی میں گرفتار تھی۔ یگانگت اور اتحاد کی یوں صدا دیتے ہیں۔

بنی آدم اعضای یک دیگرند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوی بدرد آورد روزگار
دگر عضوہا را نماند قرار

اس شاعر بزرگ نے انسان کی ان ظاہری خود پسندیوں کو طفلانہ بتایا ہے کتاب بوستان کا موضوع بھی تربیت۔ اس سے ظاہر ہے کہ سعدی اجتماعی اور اخلاقی مثنوی کے ماہر اور با کمال ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ استاد سعدی شیرازی کے آثار نظم اور نثر دونوں میں ایسے عقائد اور افکار کے مظہر ہیں جو ان ایک عمر کے تجربے غور و فکر، آفاق و الانفس کے مطالعہ سیر و سفر، مختلف قوموں سے ملنے اور تاریخی واقعات مشاہدے سے حاصل ہوئے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

در اقصای عالم بگشتم بسی
بسر بردم ایام با ہر کسی
تمتع ز ہر گوشہ یافتم
ز ہر خرمنی خوشہ یافتم

آئندہ

رپورتاژ

# "رنگین ہے شمیم اب تک پیراہنِ جاں اپنا"

شاہد احمد متعلم دہلی کالج دہلی

معمول کے مطابق کالج میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر نوٹس بورڈ پر پڑی موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا بزم ادب، اور اس کے نیچے اس بات کا اعلان تھا کہ جو طلبا پکنک پر جانا چاہیں وہ ۱۴ نومبر تک سکریٹری کے پاس چھ روپے اپنی اینٹری فیس کے طور پر جمع کرا دیں نوٹس بورڈ کے لگانے کے بعد سکریٹری اور ان کے ہمنواؤں میں تو ابھی سے کنٹری بیوشن کے لئے بھاگ دوڑ شروع ہو گئی اور انہوں نے ابھی سے طلبا اور ای سی ممبران سے کنٹری بیوشن کے لئے دریافت کرنا شروع کر دیا لیکن صاحب اسٹوڈنٹس کے لئے نخرے دکھانے کے مواقع بار بار تو آتے نہیں اس موقع پر نخرے نہ کریں تو پھر کب کریں گے۔ اس ناز و ادا اور نخرے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اسٹوڈنٹس پکنک پر جانا نہیں چاہتے بلکہ یہ تو صرف تھوڑی منت کرانے اور اپنا حق جتانے کی بات ہوتی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ کالج میں سب سے محبوب پکنک بزم ادب ہی کی مانی جاتی ہے جس کا انتظار عید کی طرح کیا جاتا ہے۔

لیجئے ۱۴ نومبر کا دن بھی آ پہنچا اور ایک نیا نوٹس بورڈ لگایا گیا کہ آج کنٹری بیوشن کی آخری تاریخ ہے اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے ہماری کلاس کی ای سی ممبر نے بھی ہم سے پکنک پر جانے کے لئے ۶/ روپے طلب کئے لیکن صاحب ہم پہلی مرتبہ کہاں دینے والے تھے ٹال گئے دوسرے دن ہم لائبریری میں کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے کہ انہوں نے آ کر گھیر لیا اور پھر تو ۶ روپے دینے ہی پڑے۔ لیجئے آپ تو ہم بھی پکنک پر جانے کے لئے باؤنڈ ہو گئے اپنے کچھ ساتھیوں کو ساتھ لیا اور ان کا کنٹری بیوشن بھی سکریٹری کے پاس جمع کرا دیا سکریٹری سے پکنک پر جانے والے طلبا کی لسٹ لیکر دیکھی تو بڑا اچنبھا ہوا کیوں کہ پکنک پر جانے والے طلبا کی تعداد سو سے اوپر پہونچ چکی تھی اور سب سے زیادہ حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ اس لسٹ میں ایسے ایسے طلبا کے نام شامل تھے کہ جن کو کبھی ایسے کسی پروگرام میں شرکت کرتے نہ دیکھا تھا۔

بزم ادب کا سکریٹری بننا بھی بلائے جان ہے تمام ذمہ داریاں غریب سکریٹری پر تنہا ڈال دی جاتی ہیں
پکنک کے لئے بھی جتنے کام تھے سب سکریٹری کے ذمہ ہیں وہ بیچارہ عجیب پریشانی میں مبتلا ہے کبھی ادھر باورچی کے لئے سامان اکٹھا کر رہا ہے تو کبھی اس سوچ میں غرق ہے کہ تندوری روٹی کہاں پکوائی جائے۔ خیر چھوڑیئے اس غریب کا تو سارا مزہ کرکرا ہو ہی جاتا ہے اس پر جو کچھ بیت رہی ہو مگر یہاں تو بالکل چاندرات کی سی کیفیت ہے فوٹو گرافی کے لئے تیاری کی جا رہی ہے اور کیمرے بھی ایک نہیں بلکہ کئی ہیں چلو صاحب کیمروں کا تو انتظام ہو گیا لیکن ان کے لئے ریلیں اس وقت کہاں سے مہیا کی جائیں۔ کیوں کہ ہفتہ کا دن ہے اور ساڑھے سات بجنے والے ہیں۔ تھوڑی بھاگ دوڑ کے بعد ریلیں بھی آ گئیں"۔ اب کھیلنے کے لیا رکھا جائے تاش کی گڈی تو میں رکھ ہی لوں گا چھوٹے ٹرانسسٹر کا بھی انتظام کر لیجئے بس کافی ہے۔

خیر جناب جوں توں کرکے صبح ہوئی ۸ بجے کا ٹائم دیا گیا تھا لیکن بھئی آج کل وقت کی پابندی کون کرتا ہے اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تیار ہو کر ۹ بجے کالج پہنچا۔ گیٹ پر جاوید صاحب ہمارے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ اور دوسرے دو لیکچرار جناب تنویر احمد علوی اور نیاز صاحب کھڑے تھے سلام علیکم۔
لیجئے صاحب ۹ بج چکے لیکن ابھی تک کچھ ہی طلبا کالج پہونچ پائے ہیں مگر یہ کیا دیکھتے دیکھتے ادھر سے ادھر سے ہر طرف سے طلبا آنا شروع ہو گئے اور ۱۵ منٹ کے اندر اندر تقریبا

> آپکو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
> میں وہی ہوں کہ جسے تم نے چاہا تھا کبھی
>
> — مظہر امام

قریب سب طلبا کالج پہونچ گئے۔ بسیں بھی تیار کھڑی تھیں اب انتظار ہے تو سکریٹری کا۔ سکریٹری کا ہی نہیں بھئی انتظار تو کھانے کا کیا جا رہا ہے۔

طالبات زرق برق لباس میں ادھر اُدھر پھر رہی ہیں ایک دوسرے کے کپڑوں اور ان کے سلیکشن پر تبصرے کئے جا رہے ہیں لیجئے سکریٹری صاحب بھی رکشا پر لدے پھندے آ گئے ہیں پیچھے پیچھے ایک اور بھی رکشا ہے اس پر بھی کچھ سامان لدا ہوا ہے

دس بج چکے ہیں بسوں پر سامان رکھا جا رہا ہے لیجئے وہ دیکھتے ہی دیکھتے بسیں طلبا سے کھچا کھچ بھر گئیں۔ بسیں کالج کے گیٹ سے باہر نکل رہی ہیں اور طلبا خوشی کے نعرے لگا رہے ہیں کان پڑے آواز سنائی نہیں دے رہی۔ بس کی رفتار تیز ہو گئی اور اب ہم شہر کے ہنگاموں سے دور ہوتے جا رہے ہیں سنسان سڑکوں پر بسیں تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہیں کبھی ایک بس آگے تو کبھی دوسری بس اس کے قریب سے زناٹے کے ساتھ گذر جاتی ہے اور شور کرنے والے طلبا پیچھے رہ جانے والی بس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔

نومبر کا مہینہ ہے بھیگی بھیگی سی فضا دونوں طرف پھیلتے ہوئے سایہ دار درخت ہر طرف دیہات کا سارا ماحول بس کی رفتار مدھم ہو گئی کیوں کہ کچی سڑک شروع ہو گئی ہے فرید آباد کی پہاڑیاں ہمارا استقبال کر رہی ہیں یہ اونچی نیچی پہاڑیاں یہ پتھروں کے محل کس قدر پُر تصویر منظر ہے کچھ دیر کے لئے میں تصورات کی دنیا میں کھو گیا " میرے کچھ ساتھی اگلی بس میں تھے کاش وہ بھی اس وقت میرے ساتھ ہوتے اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اور ان کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہے۔ افق کی سی دوری ہے ——— میں اور کچھ دیر اپنے خیالات میں کھویا رہتا اگر قریب سے آنے والی آواز مجھے چونکا نہ دیتی " کیا اترنے کا ارادہ نہیں ہے " میں اس وقت اپنے خیالات میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ یہ بھی ہوش نہ رہا کہ بس رک چکی ہے اور ہم منزل پر پہونچ چکے ہیں ——— بس سے نیچے اُترنے پر معلوم ہوا کہ دو بسیں ہم سے پہلے ہی پہونچ چکی ہیں ——— جھیل کی طرف روانہ ہوئے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے فرید آباد کا حسن اور جھیل کے کنارے کی رونق بڑھتی ہی جا رہی تھی ——— کچھ مسافت چلنے کے بعد بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی جو ہم سے پہلے والی بسوں سے یہاں پہنچ چکے تھے۔

ناشتے کے پیکٹ تقسیم کئے جا رہے ہیں ——— کچھ طلبا ادھر ادھر گھوم رہے ہیں کچھ دوست جھیل میں پڑی ہوئی کشتیوں میں جا بیٹھے اور بہت سے ایسے ہیں جو کنارے پر بیٹھ کر ہی خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور خود دوسروں کے لئے ایک خوبصورت منظر پیش کر رہے ہیں۔

لو بھئی سکریٹری صاحب ادھر ہی آ رہے۔ تشریف لا رہے ہیں " خیر تو ہے " ؟ " ہاں میاں خیریت ہے " غرض اتنی ہے کہ دس منٹ کے بعد کھانے پر تشریف لے آیئے " بہت اچھا حضور اور کوئی خدمت " شکریہ "

دسترخوان بچھ چکا ہے۔ سالن کی ڈشیں کچھ لوگوں کے پاس پہونچ چکی ہیں۔ اور کچھ ابھی راہ دیکھ رہے ہیں۔ لیجئے پورے دسترخوان پر رونق سالن کی بھرپور سپلائی ہو گئی ہے " مگر یہ اس وقت خاموشی کیسی کوئی نہ کوئی موضوع تو کھانے کے وقت بھی جاری رہنا چاہیئے ——— لیجئے صاحب منہ میں نوالہ جانے کی دیر تھی ایک نئے موضوع کی ابتدا ہو گئی سالن کے مزے پر تبصرے ہو رہے ہیں۔

ایک طرف سے آواز آئی بھئی یہ سالن کس نے پکایا ہے پیچھے سے آواز آئی کسی دلجلے کے ہاتھ کا پکا ہوا ہے۔ قریب میں بیٹھے ہوئے دوسرے صاحب بولے یہ گوشت کہاں سے لیا تھا۔ جواب میں آواز آئی کسی عاشق کے ہاں کا معلوم ہوتا ہے ایک دوسرے صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا عاشق بھی پکا ہوا اور اس پر سب ہنس پڑے غرض ہر طرف سے کچھ نہ کچھ آوازیں بلند ہوتی رہیں کوئی کہہ رہا تھا کہ نمک زیادہ ہے تو کسی کو یہ کہتے سنا گیا کہ مرچ کم ہے یہاں بھی غریب سکریٹری کی ہی مصیبت تھی کیوں کہ ہر بات کا ذمہ دار سکریٹری ہی کو ٹھہرایا جا رہا تھا ———

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کھانے سے بالکل بے نیاز ہو کر فوٹو گرافی میں مشغول ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر اس کے بعد ان کو فوٹو کھینچنے کا موقع نہیں ملیگا۔ چلو بھئی چھوڑو اس میں بھی کوئی بھید ہوگا ——— ارے ارے یہ کیا یہ صاحب تو کھانا کھاتے

کھانے کے بیچ میں ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بھی اپنا کیمرہ سنبھال لیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھی کوئی خوبصورت ماڈل نظر آگیا ہے جسے وہ کیمرے میں بند کرلینا چاہتے ہیں۔

ایک دستر خوان اٹھ چکا ہے — جو طلبا کھانا کھا چکے ہیں وہ اپنا ادھر ادھر گھومنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے — کچھ پاس پڑی ہوئی دری پر تاش کھیل رہے ہیں۔ اور کچھ سستانے کے لئے لیٹ گئے ہیں۔ —

اور جاوید صاحب کی تجویز ہے کہ مندر چلا جائے لیجئے مندر کا پروگرام بنا اور پھر ایک دم سب اٹھ کھڑے ہوئے اور جاوید صاحب کی رہنمائی میں مندر کی طرف چل نکلے۔ مگر ارے یہ کچھ لوگ پیچھے کی طرف کیوں جا رہے ہیں اوہ اب پتہ چلا کہ مندر چلنے سے پہلے تھوڑا میک اپ درست کرلیا جائے سیڑھیوں سے اتر کر نل ہے وہاں منہ دھویا جارہا ہے اب بال بنانے کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے آئینہ تو ہے نہیں ارے لو وہ بھی حل ہوگیا۔ پاس ہی موٹر کار کھڑی ہے اس کے شیشے میں دیکھ کر بال سنوار رہے ہیں۔ لیجئے پھر یہ باقی لوگ بھی مندر کی طرف چل نکلے — تمام راستہ اونچی نیچی پہاڑیوں اور سنگ زاروں پر ہے منزل تک پہنچنے کا لطف تو ایسے ہی راستوں سے گزرنے کے بعد ہی آتا ہے مگر صاحب مندر تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں — لو بھئی مندر بھی آگیا۔ کس قدر سکون ہے یہاں۔ طلبا ادھر سے ادھر نکلتے ہوئے سوتوں کے پانی سے منہ دھو رہے ہیں۔ اور یہ کیا دیکھتے ہی دیکھتے محفل جم گئی جاوید صاحب نے ایک غزل چھیڑ دی دو لڑکوں نے ایک مزاحیہ پروگرام پیش کیا۔ اور پھر تالیوں کی گونج کے ساتھ سب کھڑے ہوگئے کیوں کہ اب شام ہو چلی ہے۔

قافلہ — مندر سے واپس لوٹنا شروع ہوا اور پھر سب لوگ واپس جھیل کے کنارے پہونچ گئے — جھیل بھی اس وقت کس قدر پرسکون ہے ہر طرف سکوت چھایا ہوا ہے سورج غروب ہو رہا ہے یہ منظر بھی کتنا دلکش ہے — چائے تیار تھی لوگ چائے پی رہے ہیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے پکنک کا سامان پھر بسوں پر لادا جارہا ہے ہاتھوں میں گرم گرم چائے کے گلاس جیسے ٹھنڈے ہو چکے ہیں —

تمام طلبا بسوں پر بیٹھ چکے ہیں بسیں اپنی راہوں کی طرف واپس لوٹ رہی ہیں — آخری بس میں کچھ زیادہ ہی لوگ گھس آئے ہیں۔ سب سے آگے دروازے کے پاس نیاز صاحب اور ریحان تشریف فرما ہیں۔ کچھ لڑکے پاس ہی کھڑے ہیں جن کو بیٹھنے کی جگہ نہیں مل سکی —

اندھیرا بڑھتا جارہا ہے — منزل قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ سڑکوں پر دونوں طرف بجلی کے بلب روشن ہیں یہ منظر بھی کتنا دلکش معلوم ہورہا ہے بسیں واپس کالج گیٹ میں داخل ہورہی ہیں — اور طلبا ان میں سے نیچے اتر رہے ہیں۔

کتنی جلد بیت گئے یہ پر کیف لمحات کس قدر رنگین تھے وہ لمحات کتنی دلکش تھیں وہ گھڑیاں جو آج ہم نے ساتھ گزاریں کاش ایسے دن بار بار آئیں۔

اس خیال کے آتے ہی دن بھر کی خوشگوار تفریح کا راستہ کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور شمیم کرہانی کا یہ شعر گنگناتے ہوئے میں بھی گھر کی طرف چل پڑا ؎

رنگیں ہے شمیم اب تک پیراہن جاں اپنا
ہم رات گزار آئے کس خواب کی باہوں میں

## بقیہ:۔ افریقی زبانوں پر عربی کا اثر

ماخوذ مشتاً عربی زبان کا تھا اس کو صاف کی تعداد کیا ہے۔ اس نقطہ نظر سے افریقہ میں مروج زبانوں کا نقشہ یہ ہے کہ عربی زبان افریقہ کی سب سے بڑی زبان ہونے کے علاوہ شمالی اور کسی حد تک وسطی اور مشرقی افریقہ کی سرکاری زبان بھی ہے۔

## عربی زبان

مصر۔ لیبیا۔ تیونس۔ الجزائر۔ مراکش۔ موریشانیہ جمہوریہ، جمہوریہ سوڈان اریٹیریا اور زنجبار میں تنہا یہی زبان عام اور مقبول ہے اس طرح مشرق میں بحیرہ احمر کے ساحل، جوان سے لیکر زنجبار تک اور شمالی افریقہ کے تمام ممالک نیز وسط افریقہ میں بحیرہ احمر سے لیکر بحر اوقیانوس تک ان کا راج ہے اس کے بولنے والے پونے سات کروڑ کے لگ بھگ ہیں اور یہ تعداد دنیا میں عربی بولنے والوں کی تعداد کے نصف سے زائد ہے۔ لیکن شمالی وسطی اور مشرقی افریقہ کے مذکورہ بالا عرب ممالک کے علاوہ سوڈانی حبشی علاقوں میں عربی زبان کا اثر نمایاں ہے جہاں کا ذریعہ تعلیم ہے اور ثقافتی زندگی کا وسیلہ بھی چنانچہ افریقہ کے ایک ماہر جکسن لکھتا ہے سوڈان۔ ریاندگو۔ بہیارا سراکوں تنگھائی غلافی ہاؤسا۔ کنوری کے علاقوں کی اقوام اکثر اسلام کو کلاً یا جزاً قبول کر چکی ہے لیکن ان کی زبانیں گو ابھی باقی ہیں لیکن اس علاقے کے بڑے حصے میں اب عربی زبان سے اور جو دینی اور تعلیم کی زبان کی حیثیت سے ایسا ہی مقام اور وقار رکھتی ہیں جیسا کہ قرون وسطی میں لاطینی زبان کو حاصل ہے۔ گویا ایک طرح سے اب عربی زبان کا محور جزیرۃ العرب اور مشرق وسطی سے جانب افریقہ منتقل ہو چکا ہے علمی حیثیت سے بھی افریقہ ہی کا ایک ملک مصر اور اس کا دارالحکومت قاہرہ اب عربی زبان اور ادب کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے قاہرہ کا عرب پریس قاہرہ کی عربی نشرگاہ (صوت العرب) اور مصر کی جامعت 'ازھر' (الازہر) عربی زبان کے سب سے بڑے سرچشمے ہیں اس طرح عربی براعظم افریقہ کی سب سے بڑی اہم اور ترقی یافتہ بن چکی ہے اور جس طرح انگریزی زبان اپنے مرز بوم انگلستان سے باہر امریکہ میں طاقتور ہے اس طرح عربی بولنے والے اب اصل عرب علاقے سے زیادہ افریقہ میں پائے جاتے ہیں افریقہ میں عربی زبان کی مقبولیت اور عام رواج کا ایک طرح کا بہت گہرا اور دور رس اثر پڑا ہے جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے۔ افریقہ میں مغربی اقوام کی آمد سے پہلے چوں کہ کوئی مقامی رسم الخط موجود نہیں تھا۔ اس لئے عربی زبان نے افریقی زبانوں کو عربی رسم الخط اور عربی کے علمی الفاظ و مصطلحات عطا کرکے کم از کم اس کی تین چار اور علمی و ادبی حیثیت سے بلند زبانوں کو پیدا کرنے میں حصہ لیا ہے یہ زبانیں تین ہیں :۔

(۱) ہاؤسا ؛

(۲) سومالی ؛

(۳) سواحلی ؛

ان کے منجملہ ہاؤسا اور سواحلی زبانیں افریقہ کی وہ زبانیں ہیں جو اس براعظم کی عربی کے بعد سب سے بڑی اور ترقی یافتہ زبانیں گنی جاتی ہیں اور جن کے بولنے والوں کی تعداد کم و بیش سات کروڑ ہے ان زبانوں کے بنانے میں عربی زبان کی غیر معمولی طاقت اور اس کے فیضان کا اندازہ اس امر سے بھی ہو سکتا ہے کہ جیسوں چھوٹی چھوٹی بولیوں کو ان کے ذریعہ ایک کر دیا گیا ہے اور طرح مشترک زبانیں بنتی چلی گئی ہیں اور اسی طرح عربی زبان اور رسم الخط کے ذریعہ اس براعظم کو پہلی دفعہ ایک متحدہ قومیت اور ملت کا تصور ملا ہے یہ عربی زبان اور اسلام کا افریقہ پر ایک عظیم الشان اور نمایاں احسان ہے کہ جس سے اغیار بھی انکار نہیں کر سکتے یہاں اس امر کو یاد دلانا بھی مفید ہوگا کہ عربی رسم الخط حرکت ناں دیکھو پیا کا رسم الخط دونوں سامی رسم الخط کی شکلیں ہیں اور ماہرین کے نزدیک دنیا کا قدیم ترین رسم الخط بھی عربی ہے۔

"یہ عام طور پر مسلمہ امر ہے کہ تحریری رسم الخط پہلے پہل تیرہ سو اور بارہ سو سال قبل مسیح میں ایک سامی قوم (غالباً فونیقی) نے ہی استعمال کیا تھا اور اس وقت دنیا کے بڑے حصے میں حروف تہجی کا جو نظام مروج و مستعمل ہے اس کے ماخذ و سرچشمہ کا سرا یہیں تک پہونچتا ہے۔"

مختصر یہ کہ افریقہ میں خالص عرب زبان اور عربی سے ماخوذ و متاثر زبانوں کے بولنے والوں کے مثلاً فائی سنگالی جرمیلی اور ڈ خاصکر کی تعداد تقریباً ساٹھ فی صدی ہے لیکن اگر اس میں فرک کو بھی شریک کر لیا جائے تو دو تہائی ہو جاتی ہے عربی زبان کی تحتی زبانوں میں ہاؤسا اور سواحلی زبانیں بھی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد کے بعد

۔ زبان کا درجہ اونچا ہے جو حبش اور ریٹیریا میں بولی جاتی ہیں جس
تعداد تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے یہ زبان بھی عربی کی ہم خاندان ہے کیونکہ
ں کا رسم الخط بھی عربی سے ماخوذ ہے چنانچہ اس سلسلہ میں امیہ۔
نکیب ارسلان لکھتے ہیں :۔

عربی زبان اور لغت نیز حبشی (امحرک) زبان اور لغت میں
ی مشابہت ہے جس سے ثابت ہوتا ہے حبشی زبان و لغت
امی زبانوں میں سے ہے اور اس کا رسم الخط عربی کی طرح دائیں سے
یں لکھا جاتا ہے اس کی تصدیق خود حکومت ایتھوپیا کے سرکاری
رجمان بھی کرتے ہیں۔

" ایتھوپیا کی امحراک زبان عبرانی عربی اور سامی زبانوں سے مشابہ
ہے"

اسی طرح اریٹیریا اور حبش کی زبان کے بارے میں ایک اور مصنف
کی رائے یہ ہے ۔

بعد ازاں جنوبی عرب کے تارکان وطن کی ایک نئی موج آئی
یعنی تسیریوں نے پہاڑی میدانی قوم میں سامی ثقافت کو مضبوطی سے
متمکن کر دیا اور اس کے ساتھ گیز کی کلاسکی ایتھوپی زبان کو بھی۔

سینیگالی (افریقہ کے مغربی کنارہ پر ساحل بحر اوقیانوس میں جو نیگرو
نسل کا وطن کہلاتا ہے ہاؤسا کے بعد دوسری بڑی زبان ہے اور اس
کے بولنے والوں کی تعداد کم و بیش ساٹھ لاکھ ہے یہ سینیگالی اور مالی
نیز متصلہ علاقوں میں عام ہے۔

مغربی افریقہ میں سینیگال کے پڑوس میں عروبی زبان بولی جاتی
ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد سینیگالی سے کسی قدر کم اور پچاس
لاکھ کے لگ بھگ ہوں گی۔

ہاؤسا زبان کے علاقہ میں متصل نائیجیریا کے مغربی حصے میں عروبہ
قوم آباد ہے ان کے علاقہ کو عربستان کہا جاتا ہے ان کی زبان کا نام
بھی عروبہ ہے اس نام سے ہمارا قیاس تھا کہ یہ قبیلہ اور زبان بھی عرب
قوم اور زبان کی نشاندہی کرتی ہے چنانچہ اس قیاس کی تصدیق تاریخ نائیجیریا
کے مصنف سر ایبن برنس کی شہادت سے بھی ہوتی ہے ۔

" یہ دعویٰ عام ہے کہ عروبہ اصلاً مکہ سے آئے تھے لیکن بہت
سارے افریقیوں کے نزدیک مکے سے مراد صرف مشرق ہے اور اس
روایت سے لازماً یہ مفقود نہیں کہ وہ فی الاصل اسلام کے مقدس شہر
مکہ ہی سے آئے تھے!

مذکورہ بالا زبانوں کے علاوہ جنوبی افریقہ میں بور زبان بھی پائی
جاتی ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد ایک سے زائد نہیں ہے بلکہ
ایک مصنوعی خط ہے یہ زبان رہوڈیشیا ٹرانسوال شمال سواری لینڈ
میں بھی بولی جاتی ہے جنوب ہی میں دو چھوٹی زبانیں بھی پائی جاتی ہیں
جو افریقہ کے قدیم نسلوں یعنی بش میں اور ہاٹن ٹاٹس کی زبانیں ہیں ان دونوں
کی مجموعی تعداد بھی ۲۰ لاکھ لگ بھگ ہو گی جس میں بش میں ۱۶ لاکھ اور ہاٹن ٹاٹس
۴ لاکھ ہوں گے)

مڈغاسکر کے جزیرہ اور اس کے متصلہ جزائر میں حضرمی سادات
کی حکومت جب دوسری صدی ہجری سے لیکر ساتویں صدی ہجری تک رہی تھی
کسی عہد میں قائم ہوئی تو یہاں کی اقوام تحریر سے بالکل ناواقف تھیں اس
لئے مسلمانوں نے انہیں عربی رسم الخط کا عطیہ دیا اور اس کے بعد عام طور
پر یہاں کے لوگ عربی رسم الخط استعمال کرنے لگے الغرض عربی رسم الخط
کا عمل دخل اس علاقہ میں اتنا قوی تھا کہ جب فرانس نے یہاں اپنا قبضہ
کیا اور اپنے سکے ڈھالے تو اس پر عبارت عربی زبان ہی میں کندہ تھی۔
اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد کم و بیش پچاس لاکھ ہو گی ۔

ہاؤسا زبان اسی نام کی قوم کی زبان ہے جو اپنی تجارت اور تبلیغی
دینی حمیت کے لئے مشہور ہے یہ شمالی نائیجیریا، نائیجیریا، کیمرون
اور دیگر متصلہ علاقوں میں بولی جاتی ہے اس کے بولنے والے کسی طرح
تین کروڑ سے کم نہیں اس کا رسم الخط بھی عربی ہے یہ کئی مدجن خالص
نیگرو زبانوں کو ملا کر بنائی گئی ہے اور اپنے لٹریچر کے لحاظ سے یہ
مغربی افریقہ میں سب سے فائق اور اپنی مائل زبان سواحلی کی جو مشرقی
افریقہ میں مروج ہے ہم مرتبہ بھی جاتی ہے ۔

سواحلی :۔ یہ زبان بھی ہاؤسا کی طرح عربی کی ہی فیض یافتہ زبان
ہے جو زنجبار اور ٹانگانیکا میں عام ہے اس کے علاوہ بلجیم کانگو، رونڈا
اور رونڈی اور کینیا کے علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے یہ چالیس نیگرو زبانوں
کو ملا کر بنائی گئی ہے اور اس میں عربی کے کثیر الفاظ اور اصطلاحات کا بھی
اضافہ کیا گیا ہے جس سے وہ بڑی مالا مال ہو گئی ہے
اس میں بعض دیگر ایشیائی زبانوں کے الفاظ بھی ترکیب میں یہ اپنی
ساخت اور وضع میں اردو سے مشابہ ہے اس کا رسم الخط بھی عربی ہے
اور اس کے بولنے والوں کی تعداد تین کروڑ ہے ۔ (باقی ص ۳۳ پر)

یہ مشرقی افریقہ کی سب سے بڑی زبان اور افریقہ کی تین بڑی
زبانوں کا ۲ میرہ ہے اور اس کا لٹریچر بھی کافی ہے۔

سواحلی :- یہ زبان بھی عربی کی فیض یافتہ ہے اور اس کا رسم الخط
بھی عربی ہے اس کے بولنے والے سواحلیہ میں پائے جاتے ہیں،
جن کی تعداد ۳۰ لاکھ کے قریب ہے مذکورہ بالا زبانوں کے علاوہ
بے شمار بولیاں الگ ہیں جو افریقہ کے مختلف حصوں میں ان گنت
قبائل بولتے ہیں لیکن ان کا کوئی رسم الخط نہیں ہے اس لئے اس اجمال
تذکرہ میں ان کا ذکر بخوف طوالت چھوڑ دیا گیا ہے۔

آخر میں اس امر کی طرف بھی قارئین کی توجہ مبذول کرانا ضروری
سمجھتا ہوں کہ عربی زبان اور اس کے زیر اثر زبانوں کے بولنے والوں
کی تعداد سے یہ امر بخوبی واضح ہے جس طرح مذہبی دائرہ میں اسلام
افریقہ کا غالب مذہب بن چکا ہے اسی طرح لسانی دائرہ میں بھی
عربی زبان افریقہ کی مقبول ترین اور وسیع ترین زبان کا مقام حاصل
کر چکی ہے۔ ٭٭٭٭٭



گلشن سے شمیم آخر کس طرح گزر جائیں۔
ہر پھول یہ کہتا ہے میں پیار کے قابل ہوں
(شمیم کرہانی)

## افسانہ

ناہید تاج قریشی
طالبہ دلی کالج دہلی


(زیر نظر افسانہ دلی کالج دہلی کے تخلیقی سیمنار میں پڑھا گیا اور پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا)

---

گھنٹے نے رات کے دو بجائے اور وہ چونک پڑی۔

"اوہ! تو دو بج گئے۔ اور میں ابھی تک جاگ ہی رہی ہوں" وہ اپنے آپ ہی بڑبڑانے لگی۔ جب فیصلہ میں نے خود ہی کیا تھا تو یہ تڑپ اور جلن کیسی؟ یہ خلش کیوں یا اللہ میری مدد کر۔ ...... کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو جو امیدیں میں نے دلائی ہیں ان کو میں خود ہی ختم کر دوں"۔

اور وہ گھبرا کے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی باہر حد نظر تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے دماغ کو کچھ پرسکون کرنے لگے اور وہ یونہی باہر اندھیرے میں گھورنے لگی ___ جیسے اندھیرے میں کچھ دیکھنا چاہ رہی ہو ..... یا جیسے بیتے ہوئے حسین لمحوں کو تلاش کر رہی ہو۔

..... جانے کہاں کھو گئے تھے وہ لمحے .... کتنے حسین۔ شب و روز ہوتے تھے وہ بھی جب وہ اور احمر ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ تمام دنیا سے بے خبر وہ پہروں بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کیے جاتے ..... انھیں خیال بھی نہ آتا کہ انھیں اس طرح دیکھ کر کوئی بے چین ہو گیا ہے .... ہاں آذر انھیں ساتھ ساتھ دیکھ کر اسی طرح تڑپ اٹھتا تھا جیسے ... جیسے آج کہیں احمر تڑپ رہا ہوگا یا جیسے آج سمیر مضطرب ہے

احمر سمیرا اور آذر تینوں بچپن کے دوست تھے۔ اور رشتے کے بہن بھائی بھی احمر سمیرا کے چچا کا لڑکا تھا تو آذر خالہ کا

گھر پاس ہونے کی وجہ سے تینوں ہر وقت ساتھ رہتے ساتھ اسکول جاتے ساتھ واپس آتے اور ساتھ کھیلتے مگر بچپن کا یہ ساتھ بڑے ہونے تک نہیں نبھ سکا احمر اور آذر ایک دوسرے سے کٹے کٹے رہنے لگے اور وجہ؟ ___ وجہ صرف سمیرا تھی ___ سمیرا جو احمر کی طرف جھکتی جا رہی تھی۔ جسے آذر کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی اور جب آذر نے یہ محسوس کیا تو وہ خود بھی کنارہ کش رہنے لگا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس محبوب ہستی کی راہ کا روڑہ بنے اگرچہ ان کے مشترک قہقہے اس کے کان میں لاوا بنکر گرتے ان کی باتیں اس کی روح کا زخم ہو جاتیں۔ مگر وہ خاموش رہتا ان دونوں سے الگ تھلگ مگر ان کے آس پاس ہی۔

اور سمیرا کو شاید کبھی یہ پتہ بھی نہ چلتا کہ آذر اسے اس حد تک چاہتا ہے اگر وہ ایک روز اتفاقیہ اس کی ڈائری نہ پڑھ لیتی ... مگر اس کے بعد بھی اس نے کیا کیا۔ ..... اس دن کے بعد سے تو وہ آذر سے اور نفرت سی کرنے لگی تھی۔ پھر اسے ڈر بھی لگتا کہ کہیں آذر اسے اور احمر کو الگ الگ نہ کر دے۔ آخر وہ تھا تو اس کی خالہ کا ہی بیٹا۔

یکایک ہوا زور کی چلی اور کھڑکی کے کواڑ ایک آواز کے ساتھ بند ہو گئے۔ وہ ان خیالات سے چونک پڑی گردن کو زور سے جھٹکا دیا۔ جیسے تمام پچھلی یادوں کو جھٹک دینا چاہتی ہو ایک گلاس پانی پی کر وہ پھر بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن بیتی یادوں نے پھر یلغار کر دی اور وہ سوچنے لگی ___ میں بیکار ہی آذر کو برا سمجھتی تھی وہ ایسا تو نہیں۔ ... میں نے اسے کتنا غلط سمجھا وہ تو

قابل پرستش ہے مگر ... مگر کاش میں احمر کو بھلا سکتی ......
اس کی یاد کو ذہن سے کھرچ سکتی ..... احمر تم کیوں خلش بنکر
میرے دل میں جم سے گئے ہو ...... اب جبکہ میں تمہاری نہیں
صبح میں آذر کی ہوجاؤں گی — ذہنی اور قانونی طور پر ... پھر
.... پھر احمر تم میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے ... میں کیسے
تمہیں بھلاؤں اور یہ تو آذر کے ساتھ زیادتی ہے کہ اب میں کسی
اور کے بارے میں اس طرح سوچوں" وہ آہستہ آہستہ اس
طرح بڑبڑانے لگی جیسے احمر اس کے سامنے کھڑا ہوا اور وہ
اس سے باتیں کررہی ہو ....

.... نہیں میں آذر کی ہوں — میں اب خلوص دل اور
خلوص نیت کے ساتھ آذر کی خدمت کروں گی اور اس کی
تمام محرومیوں کی تلافی کروں گی اس کے جلتے زخموں پر
اپنے پیار کا سایہ رکھدوں گی — لیکن ... لیکن آج
یہ میرے زخم کیوں رس رہے ہیں ..... میرے دل میں یہ
جلن کیسی کون میری یہ جلن دور کرے گا ..... میرے زخموں
پر کون مرہم رکھے گا۔

ایسے خیالات سے گھبرا کر وہ پھر اٹھ بیٹھی — وہ پچھلی
باتوں کو بھول جانا چاہتی تھی۔ بیتی یادوں کو حرف غلط کی طرح
مٹا دینا چاہتی تھی مگر یہ یادیں تو جیسے اس کے ذہن سے
چپک کر رہ گئی تھیں۔ وہ بے بسی سے سوچنے لگی — میں کتنی
مجبور ہوں ...... کاش کوئی مجھ سے یا ماضی چھین لیتا
.... کاش میری قوت یادداشت ختم ہوجاتی — یا —
یا وہ حادثہ نہیں ہوا ہوتا — حادثہ — جس نے حالات کو یکسر
بدل دیا تھا — زندگی کا رُخ موڑ دیا تھا۔

کتنی حسین تھی وہ شام۔ جب وہ اور احمر نہر کے کنارے
بیٹھے باتیں کررہے تھے ...... تمام دنیا سے بے خبر
— اپنی ہی دنیا میں سرشار ..... انھیں تو پتہ بھی نہیں
تھا کہ کہیں آس پاس ہی سے دو آنکھیں انھیں حسرت سے
تک رہی ہیں — ہاں آذر آج بھی ان کے پیچھے چلا آیا تھا
— اپنی ناکام تمناؤں اور حسرتوں کو سمیٹے ہوئے
اچانک اسے نہر میں نہ جانے کیا نظر آیا جسے دیکھنے کیلئے
وہ جھکی تھی — پھر ایک درد کی آواز آئی "غڑاپ"
اور جب اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی اسکے ارد
گرد بہت سے لوگ جمع تھے ان ہی میں اسے آذر اور
احمر بھی اپنی پریشان صورتیں لئے نظر آئے اور پھر اسے
احمر کی زبانی ہی معلوم ہوا تھا اسے احمر کے وہ جملے اب بھی جوں
کے توں یاد تھے — "سمیرا تم نہر میں گر گئیں اور
اس سے پہلے کہ میں صورت حال کا اندازہ لگا سکوں۔ جانے
کدھر سے آ کے آذر نے ایکدم پانی میں چھلانگ لگا دی۔
..... اور خدا کا شکر ہے کہ تم بچ گئیں"

یہ سب سنکر اس نے بڑے دکھ سے سوچا تھا۔
" احمر تم ..... جس پر مجھے اتنا اعتماد تھا صورت حال کا
ہی اندازہ لگاتے رہے چاہے میں ڈوب جاتی اور وہ احمر
جسے میں قابل اعتنا بھی نہ سمجھتی تھی اپنی جان کی پرواہ نہ کرکے
مجھے بچالایا۔

اور اسی لمحے نے ایک نئے فیصلے کو جنم دیا — فیصلہ
جس نے حالات کا رخ موڑ دیا تھا ... جس نے تین قسمتوں کو
بدل دیا تھا۔

اس فیصلے سے باز رکھنے کے لئے اسے احمر نے
کتنا سمجھایا تھا — کتنی خوشامدیں کیں تھیں مگر وہ اپنی جگہ
اٹل رہی خود آذر نے کہا تھا۔

" سمیرا تم سوچتی ہو کہ اس طرح تم میرے احسان
کا بدلہ اتار دوگی ..... مگر میں نے تو تم پر کوئی احسان
ہی نہیں کیا۔

...... میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہوگا —
میں صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں ..... تم ہنسی خوشی
احمر کے ساتھ زندگی گزارو یہی میری دعا ہے"

ان ٹوٹے پھوٹے بے ربط سے جملوں سے اس کے
ذہنی ہیجان اور انتشار کا صاف پتہ چل رہا تھا اور وہ سوچنے
لگی۔

تم عظیم ہو آذر۔ تمہارے احسان کا بدلہ تو میں اتار بھی
نہیں سکتی۔ اور بہت سے لوگوں نے بھی اسے سمجھایا کہ تم احمر

سے بہت نزدیک آچکی ہو اب کسی اور کے ساتھ شاید ہی خوش رہ سکو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو وقتی جذبہ ہے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو ــــ مگر وہ ترکچھ اور سوچنے سمجھنے کے لئے تیار ہی نہ تھی وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی اور آج صبح اس کا نکاح تھا ــــ آذر کے ساتھ

پھر اب یہ تڑپ اور جلن کیسی ۔ ۔ ۔ یہ خلش کیوں ۔ ۔

۔ ۔ ۔ احمر ۔ ۔ ۔ احمر ۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو ۔ ۔ ۔ میں صبح آذر کی ہو جاؤں گی ــــ میری دنیا سے چلے جاؤ احمر ۔ ۔ ۔ ۔ یا خدا یہ آج مجھے کیا ہو رہا ہے۔

دور کہیں سے فجر کی آذان کی آواز آئی اس کے منہ سے نکلا "یا اللہ میری مدد کر ــــ مجھے خلش سے نجات دلا دے مولا" ــــ اور اس نے نڈھال ہو کر سر تکیے پر ٹیک دیا۔

# افکارِ نو

تبدیلیٔ رجحانات کے پیشِ نظر لوگ یہ جاننے کے لئے بے چین ہیں کہ آج کا جوان ذہن ، زندگی کے مختلف پیرایوں کو کس زاویئے سے دیکھتا ہے ——— کس انداز سے سوچتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کو کس طرح گذارنا چاہتا ہے ——— ؟ طلبہ چونکہ جوان ہوتے ہیں، اور نئے رجحانات کے حامل بھی ——— اس لئے ان کے افکار و رجحانات کی ترجمانی کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا جارہا ہے ——— زیرِ نظر شمارے میں محمد ظفر بخشی متعلم دلی کالج دہلی، (ایوینگ) کے خیالات شامل ہیں۔ آئندہ کے لئے دوسرے ساتھیوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھ کر بھیجیں۔ نیز یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ جواب مختصر اور جامع ہوں۔ اپنے جوابات کے ساتھ اپنا نام کلاس کالج، یونیورسٹی اور گھر کا پتہ ضرور لکھیں۔

(ادارہ)

نوٹ :- صاحبِ الرائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔

اپنے خطوط اس پتہ پر بھیجیں :- "افکارِ نو" ماہنامہ شاہجہاں، گلی قاسم جان، دہلی ۶

س ۱ :- ہندوستان میں جمہوری نظام کہاں تک کامیاب ہے ؟

جواب :- جمہوری نظام دیگر ممالک کے مقابلے میں صرف ہندوستان ہی میں کامیاب ہوا ہے۔ یہاں عقائد اور مذاہب کی کثرت ہے۔ زبان، رہن سہن بھی جُدا ہیں۔ یہی اس کی کامیابی کا کھلا ثبوت ہے۔ لیکن بد قسمتی سے چند غیر ترقی پسند عناصر نے جمہوری نظام کو بدنام کرنے کی حتی الامکان کوشش کی، اور لوگوں کے دماغ بدظن کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ اور اثر بھی چھوڑا۔

س ۲ :- فرقہ پرستی کے تدارک کے لئے نوجوانوں کا کیا کردار ہونا چاہیئے ؟

جواب :- اپنے مستقبل کی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے فرقہ پرستی کا مواد ذہنوں سے بالکل دھو دینا چاہیئے۔ اور سیکولرازم کی حفاظت کے لئے مسلسل و مناسب جدو جہد و پُر امن سمجھوتہ بھی ضروری ہے۔

س ۳ :- اردو کی ترقی کے لئے نوجوانوں کو کیا اقدام کرنا چاہیئے ؟

جواب :- غیر اردو داں طبقہ کو اردو کی طرف راغب کرنا۔ اور ضروری خدمات پیش کرنا، یقیناً اردو کی خدمت کرنا ہے۔ بشرطیکہ خود بھی ادب سے روشناس رہے۔ یہی بہتر قدم ہے۔

س ۴ :- ایک بیوی کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو کیوں ؟

جواب :- تعلیم یافتہ بیوی بلاشبہ ایک نعمت ہے۔ تعلیم ہی ایک ایسی بیش بہا نعمت ہے جس سے دل و دماغ کے دریچے کھلتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے کوئی دشواری، دشواری نہیں رہ سکتی، بلکہ خود حل تلاش کرلیتی ہے۔ خالی تعلیم ہی سب کچھ نہیں۔ نیز تعلیم کے ساتھ ساتھ سلیقہ مندی، شوہر کی فرماں برداری اور امورِ خانہ داری سے واقفیت ایک بیوی کے لئے سونے پر سہاگہ ہے۔ اور وہ تب ہی ایک اچھی نسل کی معمار ثابت ہو سکتی ہے۔

س ۵ :- شادی کرنے میں ماں باپ کی مرضی کو دخل ہونا ضروری ہے، یا نہیں ؟

جواب :- شادی کے معاملے میں ماں باپ کی مداخلت بجا ہے۔ چونکہ وہ ہر پس و پیش سے آشنا ہوتے ہیں۔ اور سنجیدگی سے ہر اونچ نیچ پر نظر اور معاملے کی تہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اتنے اختیارات کے ساتھ والدین پر لازم ہے کہ وہ اولاد کے جذبات بھی مجروح نہ ہونے دیں۔ بلکہ والدین ان کی خوشنودی حاصل کر کے رشتہ طے کریں، تاکہ ایک خوشگوار زندگی میسّر ہو سکے۔

س ۶ :- عشق کے بارے میں کیا خیال ہے، عشق ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے ؟

جواب :- عشق نہ ہوتا ہے اور نہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ خود بخود ابھرتا ہے

بقیہ صفحہ ۳۸ پر

اس میں قارئین کی رائے اور مشورے شائع کئے جاتے ہیں — اس بار وصول ہوئے بہت سے خطوط میں سے جگہ کی قلت کے سبب چند خطوں کے اقتباسات شائع کر رہے ہیں ہم ان اساتذہ اور ساتھیوں کے بے حد شکر گزار ہیں جنہوں نے ہمیں بذریعہ ڈاک یا براہ راست اپنی رائے اور مفید مشوروں سے نوازا ہے

ادارہ

"طلبا کی یہ خود اعتمادی بہر حال قابل داد اور لائق مبارکباد ہے، محدود صفحات ہونے کے باوجود ہر قسم کے مضامین کے لئے شاہجہاں کا دامن کشادہ ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ماہنامہ ہر اعتبار سے لائق پذیرائی اور مستحق حوصلہ افزائی ہے۔"

دہلی کے ہفتہ وار پیام مشرق کے تبصرے کا اقتباس۔ (۷ نومبر ۵۹ء)

● — تازہ شمارہ قدرے بہتر ہے۔ مضامین بھی خاصے معیاری اور طلبا کے لئے سود مند ہیں۔ خاص طور پر "جدید فارسی کی چند خصوصیات" اور "اردو کے انگریز شاعر"۔ البتہ اس بار پروف ریڈر کی نظر سے بہت سی غلطیاں چوک گئی ہیں جو دوران مطالعہ گراں گزرتی ہیں۔ لہٰذا ملتمس ہوں کہ اس طرف خصوصی توجہ فرمائیں۔

اکرام الدین متعلم یونیورسٹی علیگڑھ

● — کافی انتظار کے بعد جب شاہجہاں ملا تو ایک ہی نشست میں سارا پڑھ ڈالا —

اس بار مضامین یقیناً معیاری ہیں مگر کتابت کی غلطیاں بہت بری معلوم ہوئی ہیں اور صفحہ ۲۴ نے دو جو غلط چھپاں کر دیا گیا ہے تو مضمون کا سارا لطف کرکرا کر دیا۔ آئندہ اس کی احتیاط رکھئے۔

سہیل صدیقی اعظم گڑھ

● — نیا عنوان "افکار نو" پسند آیا۔ "شان" کے نام پرانا اسٹائل ہے جو اب ختم ہو جانا چاہیئے۔ کیوں کہ ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

— مس ریحانہ طالبہ دہلی کالج دہلی

●—

مدیر محترم!

شاہجہاں نظر نواز ہوا، یقیناً آپ داد کے مستحق ہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا تمام طلبا مرض عشق کے مریض ہیں جو آپکو "ان کے نام" کا سہارا لینا پڑا۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں عشق ان فرسودہ روایات کا حامل نہیں رہا ہے۔ اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اس عنوان کو ختم ہی کر دیں۔ — محمد ذکی بجنور

بقیہ افکار نو

کیوں کہ اس کے اثرات انسانی فطرت اور جذبات میں ابتدائے آدم سے موجود ہیں۔

س ۱:۔ عشق کی کامیابی جسمانی اتصال کو کہا جاتا ہے، یا ذہنی ارتباط کو؟

جواب ۱:۔ ذہنی ارتباط ہی عشق کی کامیابی ہے۔ دو روحوں کا ملن عشق کی معراج ہے۔

محمد ظفر بخشی متعلم دہلی کالج (ایوننگ) دہلی
گھر کا پتہ:۔ ۲۶۶۰ محلہ نیاریان اجمیری گیٹ دہلی ۶

مرتبہ : ریحان الحق ایم۔ اے بی کام

اس عنوان کے تحت آپ ہر ماہ مختلف کالجوں کی اردو، فارسی اور عربی سوسائٹیوں کے زیر اہتمام منعقد ہونیوالے پروگراموں کی ایک جھلک ملاحظہ فرماتے ہیں اگر آپ کسی سوسائٹی کے سکریٹری ہیں تو ہمیں اپنے یہاں ہونیوالے فنکشن کی قبل از وقت اطلاع دیں تاکہ آپکے فنکشن کی رپورٹ آپکے "شاہجہاں" میں دی جاسکے۔

ادارہ

## بزم ادب دہلی کالج کے زیر اہتمام .....

پچھلے مہینے دلی کالج کی بزم ادب نے دو دلچسپ فنکشن منعقد کئے پہلے ۱۵ نومبر کو تخلیقی سیمینار ہوا جس میں طلبا اور طالبات نے اپنے تخلیق کئے ہوئے افسانے مضامین اور رپورتاژ پڑھے اور پھر ۲۰ کو انٹر کلاس مقابلۂ بیت بازی ہوا جس میں آئندہ ہونے والے انٹر کالج مقابلۂ بیت بازی میں کالج کی نمائندگی کرنے کے لئے "تین بیت باز" منتخب کئے گئے۔

## تخلیقی سیمینار میں مقالے، افسانے، رپورتاژ.....

نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی یا "شاہجہاں" کی زبان میں — ان کھلے پھولوں کی آبیاری کے لئے یہ ایک صحتمند سلسلہ پچھلے تین سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے نئے لکھنے والے اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں اور سب سے اچھی تین تخلیقات کو بزم ادب انعامات سے نوازتی ہے۔

محمد رفیع الدین صاحب (منتظم مقالات) نے کرسی صدارت سے ایک ایک "خالق" کو بلاکر اس کا تعارف کروایا اور اپنی تخلیق سنانے کی دعوت دی سب سے پہلے شاہد احمد نے "رنگیں ہے شمیم اب تک پیراہن جاں اپنا" کے عنوان سے ایک دلچسپ رپورتاژ پڑھا اس کے بعد میں سلطانہ بیگم نے ایک افسانہ پڑھا۔ پھر قمر عباس نے "فانی کا فکر و وجدان" کے عنوان سے اور عبدالعزیز نے "فراق کا وجدانی شعور" پر مقالے پڑھے۔ آخر میں مس ناہید تاج قریشی نے اپنا افسانہ "خلش" پڑھا جو اپنے تاثر کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا (یہ افسانہ اس شمارہ کی زینت ہے)

بعد میں جج صاحبان نے اس افسانے کو پہلا اور "فراق کا وجدانی شعور" کو دوسرا اور "فانی کا فکر و وجدان" کو تیسرے انعام کا مستحق قرار دیا۔

جب ایک محترمہ اپنا افسانہ پڑھ رہی تھیں تو افسانہ کی طوالت آواز کی مدھم اور پڑھنے کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے سامعین نے اسی بحر میں طبع آزمائی شروع کردی۔ ایک آواز آئی — "کیا تلاوت ہو رہی ہے؟" دوسری آواز "ججوں کو دیدیجئے وہ خود ہی پڑھکر فیصلہ کر دیں گے" تیسری "ارے بی بی! رفتہ رفتہ میں کیوں ہلکان ہو رہی ہو؟" آخر کار شور اتنا بڑھا کہ ڈاکٹر یونس صاحب جعفری اور سید غلام سمنانی صاحب جو جج کے فرائض انجام دے رہے تھے انہوں نے طلبا سے خاموش رہنے کی درخواست کرتے ہوئے یہ استفسار کیا کہ "ہم آپکو سنیں کہ افسانہ نگار کو؟" شور کچھ کم ہو گیا لیکن جب افسانہ ختم ہوا تو ایک طویل سرد آہ کے ساتھ آواز آئی "اللہ تیرا شکر ہے"۔

راقم الحروف کی رائے میں سامعین کا یہ رویہ انتہائی غیر صحتمندانہ بلکہ معاندانہ ہے۔ فنکار اپنے "نوک چکاں خامہ" سے "خون دل"

ہا انگلیاں ڈبوکر ایک "فن پارہ" تخلیق کرتا ہے جو عین ممکن ہے کہ شاہکار" یا "شہ پارہ" نہ ہو یا سامعین کی زبان میں "بور" ہی کیوں نہ ہو لیکن سامعین کو اس کی ہجو اور ہوٹنگ کرنے کا حق کسی طرح بھی حاصل نہیں ہے۔ اگر کوئی مشہور یا ادبی شخصیت کوئی "بور" چیز پیش کرے تو ایسا کرنا سراسر جائز ہے بلکہ میرے نزدیک تو مستحق ہے لیکن ایک نئے لکھنے والے کی اس طرح دل شکنی کہ وہ ہمت ہار بیٹھے اور آئندہ لکھنا ہی بند کر دے کسی طرح بھی مناسب نہیں

## ۔۔۔ اور مقابلہ بیت بازی کے پروگرام سے طالبات کا واک آؤٹ

آئندہ ماہ (دسمبر) کو ہونے والے "انٹر کالج مقابلہ بیت بازی" کے لئے دلی کالج کی نمائندگی کرنے والی ٹیم کا انتخاب کرنے کیلئے بزم ادب نے ۲۰ نومبر کو انٹر کلاس مقابلہ بیت بازی کا اہتمام کیا جس میں مختلف کلاسز کے ایک درجن سے زائد طلباء نے حصہ لیا۔

چونکہ پروگرام بہت جلدی میں منعقد کیا گیا تھا اس لئے اس میں بعض دلچسپ اور مضحکہ خیز واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے تو جب کمرہ طلبا اور طالبات سے بھر گیا تو جج کی تلاش ہوئی اس لئے کہ بزم ادب کے ایک مستقل کرم فرما سنانی صاحب کو بخار تھا، ضمیر صاحب کو (جن کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے) کچھ اور مصروفیات درپیش تھیں۔ بہر حال ایک جج یونس صاحب کو موجود تھے ہی "گندم نہ رسد تو بھس غنیمت است" کی مصداق اقبال صاحب (سکریٹری بزم ادب) اور ان کے معاون شہزاد صاحب کی نظر راقم الحروف پر پڑی اور بندہ کو "گھواؤ" کر کے جج کی کرسی پر پہنچا دیا گیا۔

بزم ادب کے فنکشن طلبا اور طالبات میں بیحد مقبول ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمرہ یا ہال" بالکل ہاؤس فل" ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے سامعین کے لئے ہوٹنگ کرنا بھی آسان ہو جاتی ہے چنانچہ یہی ہوا جیسے ہی یونس صاحب نے رواجی شعر سے

بیت بازی شروع ہوتی ہے بفضل کریم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

پڑھ کر سنایا۔ اور آغاز کیا۔ ہوٹنگ شروع ہو گئی اور رفتہ رفتہ شور اتنا بڑھا کہ شعر سننا ناممکن ہو گیا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بول رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا "فری اسٹائل" مقابلۂ بیت بازی ہو رہا ہے آخر کار ایک بیچ کی چند لڑکیاں کھڑی ہوئیں اور کمرہ سے واک آؤٹ کر گئیں۔ "بھیڑ چال" پر عمل کرتے ہوئے باقی تمام طالبات نے بھی ان کی پیروی کی بعض طلبا بھی جن کی دلچسپیاں چلی گئی تھیں کمرہ چھوڑ گئے تھے اور وہاں صرف ساٹھ ستر باذوق طلبا باقی رہ گئے۔

بہر حال اس کے بعد مقابلہ بہت پُرسکون انداز میں ایک گھنٹہ سے زیادہ دیر تک جاری رہا اور دونوں پارٹیاں بغیر کوئی پوائنٹ بنائے ہوئے برابر رہیں۔

انٹر کالج مقابلہ میں نمائندگی کیلئے شاہد احمد (اول) شاہد مجیب (دوم) اور عبدالرحمٰن (سوم) کا انتخاب کیا گیا۔

## فیکلٹی آف آرٹس کی جانب سے ڈاکٹر عابدی صاحب کے پروفیسر ہونے پر خطبہ افتتاحیہ

دہلی کے مختلف کالجوں کے اردو فارسی اور عربی کے اساتذہ اور اہل ذوق طلبا و طالبات کا ایک نمائندہ اجتماع ۱۵ دسمبر کو ٹیگور ہال تشوریل بلڈنگ میں منعقد ہوا صدارت وائس چانسلر صاحب کو فرمانا تھی۔ لیکن وہ مصروفیات کی بنا پر تشریف نہ لا سکے اور ڈاکٹر سروپ سنگھ صاحب پرو وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے صدارت کے فرائض سر انجام دیئے دوسرے قابل ذکر اصحاب میں محترم مرزا محمود بیگ صاحب، جناب منظور حسین صاحب موسوی پرنسپل دلی کالج، جناب جاوا صاحب ڈائریکٹر اسکول آف فارن لنگویجیز موجود تھے۔

چوں کہ یہ بات یقینی تھی کہ روزہ افطار کا وقت مقالہ کے دوران ہو جائیگا۔ اس لئے منتظمین نے پلاسٹک کی تھیلیوں میں کھجوریں پہلے ہی تقسیم کر دی تھیں بہر حال سروپ سنگھ صاحب کی تعارفی تقریر سے پروگرام شروع ہوا انہوں نے اپنی تقریر میں ڈاکٹر عابدی صاحب کے مختصر حالات زندگی بتاتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

اس کے بعد محترم ڈاکٹر امیر حسین صاحب عابدی نے "اندو پرشین

ریچر میں ہندوستانی عناصر" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز
قالہ پڑھا۔ اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب نے ایران سے آکر
ہندوستان میں بس جانے والے اور خود ہندوستان کے فارسی
عرا اور ادبا کی تخلیقات میں جو ہندوستانی عناصر پائے جاتے
ہیں ان کا تجزیہ بڑے محققانہ انداز میں فرمایا۔
اس کے بعد شکریہ پر یہ علمی مجلس ختم ہونے پر چائے وغیرہ
سے حاضرین کی تواضع کی گئی۔

## بزم ادب (پوسٹ گریجویٹ ایوننگ انسٹی ٹیوٹ) میں اردو کے مشہور شاعر اختر الایمان کی آمد

بزم ادب پوسٹ گریجویٹ ایوننگ انسٹی ٹیوٹ کی جانب
سے ۶ نومبر کو ڈاکٹر عابدی کی صدارت میں اردو کے مشہور شاعر
اختر الایمان کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا مہمان خصوصی کے
تاخیر سے تشریف لانے کے سبب یہ جلسہ ایک گھنٹہ تاخیر سے
ساڑھے سات بجے شروع ہو سکا۔

سب سے پہلے صدیق الرحمن صاحب قدوائی نے اختر الایمان
صاحب کا تعارف کرواتے ہوئے ان کے مختصر حالات اور ادبی
خدمات سے حاضرین کو روشناس کروایا۔ اس کے بعد بزم ادب کے
سکریٹری اشفاق صاحب نے مہمان خصوصی کے سامنے بزم ادب
کی مختصر رودادِ سناتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر حسن نے
ان کی شاعری اور شریف صاحب نے ان کی زندگی پر روشنی ڈالی
بعد اختر الایمان صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ تشریف لائیں
اور اپنے کلام سے محظوظ فرمائیں۔ انھوں نے مختصر مگر جامع تقریر
فرمائی جس میں اپنی عزت افزائی پر شکریہ ادا کیا اور چار پانچ نظمیں
بھی پیش کیں۔

ان کی نظم "آوارہ لڑکا" خصوصیت سے پسند کی گئی تقریباً
ڈیڑھ گھنٹہ بعد شکریہ کی قرارداد کے ساتھ بزم ادب کا افتتاحیہ
ختم ہوا۔



## انجمن فارسی پوسٹ گریجویٹ ایوننگ انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح

پوسٹ گریجویٹ ایوننگ انسٹی ٹیوٹ کی انجمن فارسی کی افتتاحی
فنکشن ۸ نومبر کو آرٹس فیکلٹی میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر انصاری
صاحب نے صدر جلسہ ڈاکٹر عابدی کو شعبہ عربی فارسی کا صدر
منتخب ہونے پر دلی تہنیت پیش کی اور اس بات پر زور دیا کہ
فارسی کے نصاب میں تبدیلی لانے کی سخت ضرورت ہے اس
کے بعد سکریٹری انجمن فارسی عبدالقادر صاحب ہاشمی نے انجمن کا
تعارف کروایا اور صاحب صدر کا خیر مقدم کیا جس کے جواب میں۔
پرپولیس والوں کی جانب سے محمد سجاد عثمانی صاحب نے شکریہ
ادا کیا۔ اس کے بعد صدر مجلس محترم پروفیسر عابدی صاحب نے
اپنے حالیہ دورہ ایران کے تاثرات اپنے دلچسپ انداز میں بیان
فرمائے اور بھگوت سروپ صاحب کے شکریہ کے ساتھ یہ مجلس اختتام
پذیر ہوئی۔ ○○○

طالب علموں کا۔ طالب علموں کیلئے۔ طالب علموں کے ذریعے

فروری ۱۹۷۰ء

جلد نمبر ——— ۴
شمارہ نمبر ——— ۲
قیمت
فی پرچہ ——— پچیس پیسے
سالانہ ——— تین روپئے




# نوکِ پلک

ہر ماہ کی طرح اس ماہ بھی ساتھیوں نے اشاعت کے لئے زیادہ تر افسانے ہی بھیجے ہیں۔ ہم اس سے پہلے بھی عرض کر [چکے ہیں] کہ فی الحال شاہجہاں کے صفحات دو سے زائد افسانوں کی اجازت نہیں دیتے ——— دوسرے چونکہ ہم شاہجہاں [کو طلبا] کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانا چاہتے ہیں ——— اس لئے ہم اپنے ساتھیوں سے درخواست کرتے ہیں [کہ وہ] نصاب سے متعلق معلوماتی یا ادبی مضامین لکھنے کے بلئے طرف زیادہ توجہ دیں ——— ضروری نہیں کہ وہ مضامین اردو کے [نصاب] سے متعلق ہوں ——— مثلاً اس بار ایک انگریزی ناول کی تلخیص شائع کی جا رہی ہے ——— یہ ناول دہلی کے ہائر سکنڈ[ری کے نصاب] میں داخل ہے۔ اور آئندہ ماہ آپ دلی یونی ورسٹی میں۔ بی۔ اے۔ میں پڑھائے جانے والے انگریزی ڈرامے ARMS AND THE MAN کی اردو تلخیص ملاحظہ فرمائیں گے۔

اب تک جن ساتھیوں کے افسانے موصول ہو گئے ہیں وہ سب نمبر آنے پر باری باری شریکِ اشاعت [ہوتے] رہیں گے۔ اس سلسلے میں ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ یاد دہانی کرانے سے احتراز کریں۔

ادارہ

زیرِ نظر شمارے میں شامل تمام تر افسانوں میں تمام مقام و واقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں ہیں۔


مشیرِ طباعت:۔ محمد شفیق صدیقی "قلم انڈیا کا[ر]"
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر:۔ محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ:۔ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی ۶

مقامِ اشاعت:۔ قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی نمبر ۶

## ادب و معلومات



## تراجم



## طنز و مزاح



## افسانے



## منظومات



## مستقل عنوانات



تزئین — غضنفر زیدی
متعلم آرٹس انسٹی ٹیوٹ
جامعہ نگر نئی دہلی

کتابت — محمد نورالحق،
متعلم مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

# جدوجہد آزادی کے دور میں برصغیر کی اردو صحافت

عتیق صدیقی متعلم دلی یونیورسٹی دہلی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں صحافت و سیاسیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے ان ملکوں میں شاید ہی کوئی اخبار ایسا ہوگا جو سیاست میں اپنا ایک مستقل مسلک نہ رکھتا ہو اور اس مسلک پر جوش عصبیت کے ساتھ قائم نہ ہو اس کے دو سبب ہیں پہلا یہ چونکہ ہمارے یہاں سیاسیات کے متعلق رائے عامہ کی تربیت کا اور کوئی ادارہ یا وسیلہ نہیں ہے اس لئے یہ کام صرف اخباروں کو ہی انجام دینا پڑتا ہے۔ دوسرے جن لوگوں نے بیسویں صدی عیسوی میں سیاست اپنائی وہ اردو صحافت کے قصر رفیع کے بھی معمار تھے۔ مولانا محمد علی نے "ہمدرد" نکالا اور وہ اس مشترک سیاست کے خالق بھی تھے۔ جو ۱۹۲۰ء کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" نے ذہنوں میں جو انقلاب پیدا کیا اور انگریزی سامراج کو جس طرح بے نقاب کیا وہ انگریزوں کے خلاف پہلی باقاعدہ فکری بغاوت تھی۔ اردو داں طبقہ کے سامنے جب سعد زاغلول پاشا اور انور پاشا کے مجاہدانہ و حریت پرورانہ کارنامے آئے اس نے دماغوں کے بند دریچے کھول دیئے اور اس طرح تحریک آزادی کو وہ سازگار فضا ملی جس کا نتیجہ آزادی کا ملنا تھی۔

۱۹۲۸ء میں برصغیر پرشور جذباتی تحریکوں سے بڑی حد تک فارغ ہو کر خالص سیاست کی طرف متوجہ ہوا اور ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں ہندوستان کے آئندہ دستور و آئین کے متعلق اپنی اپنی وسعت و استطاعت کے مطابق رائے عامہ کو منظم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئیں — کانگریس نہرو رپورٹ کے مطابق آئین مرتب کر رہی تھی۔ سائمن کمیشن سے تعاون اور مقاطعہ کی کشمکش جاری تھی۔ مسلم لیگ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے دستور ہند میں اپنے اکابر کے مطابق حقوق کے تحفظ کا مطالبہ پیش کر رکھا تھا — بالآخر حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو لندن آنے کی دعوت دی۔

اس زمانہ میں لاہور سے روزنامے انقلاب، زمیندار، سیاست، بندے ماترم، ملاپ، پرتاپ اور کیسری نکل رہے تھے۔ ان میں زمیندار سب سے پرانا اخبار تھا اور یہ نہرو رپورٹ کی حمایت میں سرگرم تھا سیاست مسلم لیگ کا ہمنوا تھا اور انقلاب مسلمانوں کی حمایت اور ان کی سیاسی تعلیم و تربیت میں پیش پیش تھا۔ باقی تمام اخباروں کی پالیسی کانگریس کے زیادہ نزدیک تھی۔ ان روزناموں کے علاوہ ہفتہ وار پرچے گرو گھنٹال پارس۔ "تہذیب نسواں" اور پھول کے علاوہ "خدمت" ہفتہ وار رسائل بھی تھے ان میں "تہذیب النسواں" جو عورتوں کیلئے تھا اور پھول جو بچوں کا تحفہ ہر شائع اور دلچسپ پرچے تھے اور ادبی رسائل کا تو کچھ شمار نہ تھا جن میں ہمایوں، مخزن، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، عالمگیر اور شاہکار نمایاں تھے۔

دہلی سے کئی روزنامے نکلتے تھے جن میں مشرق پہلے ہی بند ہو گیا تھا اور مولانا مظہر الدین مرحوم کے زیر اہتمام تیج اور وحدت قابل ذکر ہیں۔ تیج کانگریس کی حمایت کرتا تھا اور وحدت مسلم لیگ کا۔ روزنامہ الامان اور ہفتہ وار ریاست دہلی کے مشہور اخبار تھے۔ ——— مراد آباد، بدایوں، بجنور وغیرہ سے بعض چھوٹے چھوٹے ہفتہ وار اخبارات نکلتے تھے۔ لکھنؤ میں حقیقت، حق اور سید جالب مرحوم کا اپنا ہمدم اور عہد جدید جاری ہوئے۔ بجنور سے مدینہ اور نجات نکلتے تھے مدینہ کانگریس کا سرگرم حامی تھا۔ ۔۔ کلکتے سے دو اچھے روزنامے عصر جدید اور ہند جدید کے نام سے جاری تھے۔ ہند جدید کانگریس کا ہمنوا تھا عصر جدید مسلم لیگ کا حامی تھا کلکتے سے ہلال، انقلاب، الہلال اور امیل اور دوسرے چھوٹے چھوٹے دیگر روزنامے جاری تھے ان میں اکثر کانگریس کی حمایت کرتے تھے۔ حیدر آباد دکن سے صحیفہ اور رہبر دکن تو مدت سے جاری تھے ان میں قاضی عبد الغفار کے روزنامہ پیام کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ اخبارات زیادہ تر کانگریس اور قوم پرستی کی طرف مائل تھے حیدر آباد سے چند ہفتہ وار پرچے بھی نکلتے تھے مگر ان کا سب کا تعلق عثمانیہ سے تھا۔ مدراس سے قومی رپورٹ اور بعض ہفتہ وار اخبار نکل رہے تھے اس کے بعد کانگریس کی حمایت میں لکھنؤ سے قومی آواز، دہلی سے انجام، لاہور سے نوائے وقت، احسان اور شہباز جاری ہوا اور سندھ و بلوچستان سے استقلال، تنظیم اور پاسبان وغیرہ ہفتہ وار

پرچے جاری ہوئے۔

کشمیر میں صحافت کا آغاز بہت دیر سے ہوا۔ ویسے تو وہاں اخبار نویسی کا شاہانہ طریقہ رائج تھا لیکن ان اخبارات کا مقصد صرف بادشاہوں اور راجاؤں کو مختلف لوگوں کے حالات سے باخبر رکھنا ہی ہوتا تھا یہ خفیہ ذرائع سے مہیا کی ہوئی خبریں عوام کی دسترس سے باہر تھیں۔ لیکن جب ہندوستانی تحریک آزادی کی لہریں ریاست میں پہونچیں تو اس وقت وہاں کے لوگوں نے بھی اخبارات کی اشاعت کے لئے کوششیں کرنا شروع کیں لیکن ناکام رہے۔ اور پھر کشمیری اہل قلم لاہور دلی سیالکوٹ لکھنؤ۔ آگرہ وغیرہ کی طرف پھیل گئے۔ اور انہوں نے وہاں سے کشمیریوں کیلئے اخبارات نکالے جن میں "کشمیر گزٹ" اور "بہار کشمیر" قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں بڑی کوشش اور کد و کاوش کے بعد لالہ ملک راج صراف کو جموں سے اخبار "رنبیر" کے اجرا کی اجازت ملی۔ لیکن یہ اخبار ۱۹۲۸ء میں عتاب کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء میں وادی کشمیر کا پہلا اخبار برادران پریم ناتھ بزاز "وتستا" جاری ہوا اس کے بعد مختلف منزلوں سے گزرتی ہوئی کشمیری صحافت سست رفتاری سے آگے بڑھتی رہی۔ ہندوستان کی آزادی کے وقت وہاں اخبارات کی تعداد بہت محدود تھی۔

جب ملک آزاد ہوا تو اسکے ساتھ ساتھ ہندوستان اور پاکستان الگ الگ صفحہ عالم پر نمودار ہو گئے۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں جہاں ہند پاکستان کے درمیان آبادیوں کا تبادلہ ہوا۔ وہاں اداروں اور کاروباروں کا بھی تبادلہ عمل میں آیا۔ دہلی سے انجام اور جنگ کلکتہ سے عصر جدید کراچی چلے گئے اور وہاں ترقی کی۔ ان کے عوض لاہور سے روزنامہ ملاپ۔ پرتاپ۔ ویر بھارت۔ بندے ماترم۔ سیر بھارت اور اجیت ہندوستان آ گئے۔ پرتاپ دہلی اور جالندھر سے۔ ملاپ دہلی اور حیدرآباد سے پربھات امرتسر اور ویر بھارت جالندھر سے جاری ہوئے۔ ہندوستان میں یوں تو ہر زبان کی صحافت انگریزی صحافت سے متاثر ہوئی۔ لیکن اردو صحافت نے انگریزی صحافت کا اثر قبول کرنے کے باوجود اپنی ایک راہ بھی نکالی خبروں کی جو اہمیت انگریزی صحافت میں ہے وہ ایک زمانہ تک اردو صحافت میں نہیں رہی۔ اردو صحافت کا انداز بہت دنوں تک عوامی سے زیادہ علمی و ادبی رہا۔ روزنامہ ہمدرد کے صفحۂ اوّل پر خبروں سے زیادہ لمبے چوڑے علمی۔ ادبی اور تاریخی مضامین چھپتے تھے۔ روزنامہ زمیندار کا حال بھی ایک زمانے تک یہی رہا۔ دہلی سے ایک زمانہ میں روزنامہ پیغام نکلتا تھا جس نے صفحۂ اوّل پر بلند پایہ علمی و تاریخی مضامین چھاپنے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ لیکن تحریک آزادی کے سبب سیاست کا زور جیسے جیسے بڑھا اور ہندوستان کی سیاست عوامی ہوتی گئی ویسے ویسے علمی و تاریخی مضامین کی جگہ خبریں لینے لگیں نامہ نگاری کی اہمیت بڑھنے لگی۔ اور خبر رسانی کے ذرائع و وسائل میں توسیع کی گئی۔ اسی طرح اردو صحافت میں اداریہ نگاری (ایڈیٹوریل) بھی ایک زمانے تک مضمون نویسی تک محدود رہی۔ مگر انگریزی صحافت میں ایڈیٹوریل کا جو رنگ ہوتا ہے اس سے اردو صحافت ایک مدت تک محروم رہی مگر بعد میں۔ سیاست۔ بلقان، تحریک خلافت۔ سول نافرمانی اور تحریک ترک موالات کے سلسلے میں جتنے موڑ آئے اردو اخبارات نے دوسرے اخبارات سے زیادہ ان موڑوں سے ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کی اور ترقی پسندی اور صحت مند رجحانات کا پورا ساتھ دیا۔ اس لئے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اردو صحافت نے دلیش بھگتی۔ ترقی پسندی اور حریت خواہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا اور آج ہندوستان آزاد اور ترقی پسند ہے تو اس میں اردو صحافت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دو قومی نظریہ کی تحریک کو اردو اخبارات کے ایک حصے سے مدد ملی لیکن یہ تو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو اخبارات ہندوستان کی اچھی یا بری سیاست بنانے میں فیصلہ کن حصہ لیا اس سلسلہ میں دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ دو قومی نظریہ یا نظریہ پاکستان کو بڑھاوا دینے والے اخبارات کی بہت کمی تھی اور جن اردو اخبارات نے قومیت متحدہ یا متحدہ ہندوستان کے مقصد کی وکالت کی۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دہلی کا الجمعیۃ بجنور کا مدینہ۔ لکھنؤ کا قومی آواز اور لاہور کے شہباز۔ زمزم اور انقلاب جو ایک وسیع دائرہ اثر کے حامل تھے ہرگز ہندوستان کا بٹوارہ نہیں چاہتے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں جن اردو اخبارات نے تقسیم ہند کی وکالت کی ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اور وہ اردو صحافت کے ہندوستان گیر نقشہ پر کوئی خاص مقام نہیں رکھتے تھے۔

●●

جدھائی میں

سیاہ و رنگین لیتھو چھپائی کیلئے

# لی پرنٹنگ پریس

## بلیماران۔ دہلی

نفاست اور اعلیٰ کارکردگی میں امتیازی حیثیت رکھ ہے

— روزنامہ، ویکلی اخبارات، رسائل، کالج میگزین، پوسٹر، ہینڈبل

اور کتابوں کی طباعت کا معقول انتظام ہے

— بیرونی کام کے سلسلے میں کتابت، طباعت، بلاک، بائنڈنگ، بکنگ ا

دیگر سہولیات خصوصیت کے ساتھ مہیا کی جاتی ہیں۔

— مختلف رنگوں کی چھپائی ملان کے ساتھ آفسٹ کے مانند کی جاتی ہے

ایکمرتبہ ضرور خدمت کا موقع دیجئے۔

# مقطعے

محمد انجم - دلی کالج دہلی

(گزشتہ سے پیوستہ)

---

مرحوم فانی کا تخلص اپنے اندر درد، مستی، غم مرگ، اور ان کے جان خراش تلازمات کا ایک دفتر رکھتا تھا جو اُن کے شعری میلان کے عین مطابق تھے۔ چنانچہ انھوں نے دل کے دکھڑے سناتے وقت ان تلازموں اور اپنے شعری میلان کے ساتھ اُن کی مطابقت کا بیشتر جگہ پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ہی اپنے بیان میں یہ خوبی رکھی کہ مومن یا نوح ناروی کی طرح تخلص کی معنویت کو صاف صاف اُجاگر نہ کیا۔ گویا انھوں نے مقطعے کے مضمون میں تخلص کے معنوی پہلو کو ایک ہلکی جوت کا درجہ دیا اور مضمون کی بڑی روشنی کو ہی سامنے رکھا۔

مثلاً:-

آج روزِ وصالِ فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

عمر بھر نزع کے عالم ہی میں گذری فانی
زندگی کا نہ ہوا موت پہ احسان کوئی

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانی بلائے مرگ سے غم کیجئے غلط
اب جستجوئے راحتِ دنیا نہ کیجئے

خود تجلیؔ کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے اُن کے مقابل نہیں ہونے پاتے

یہ تو ہوا مومن اور مرحوم فانی ذکر، نوح ناروی کے بارے میں مجھے یہ معذرت طلب کرنا ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان کی مثالیں جمع نہیں کر سکا۔ ان کا دیوان بھی آسانی سے دستیاب نہ ہوا، چنانچہ ان کا ذکر مجھے مثالوں کے بغیر صرف اس مشہور حقیقت کے بل پر ہی کرنا پڑا کہ انھوں نے اپنے تخلص کی معنویت کو اپنے مقطعوں میں ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

(۲) مقطعوں میں ایک دوسری خوبی خطابیہ انداز کی ہے بعض شعراء نے اپنے کلام میں اکثر و بیشتر جگہ اس انداز یا اس قسم کے تذکرہ سے مقطعے کے معنوی حسن میں کافی اضافہ کیا ہے۔ اس کی مثالیں اچھے شعراء میں کافی ملتی ہیں۔ مگر میر صاحب کے ہاں خاص طور پر دقیع ہیں۔ میں صرف انھی کی کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں:-

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جوں شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

کیا کہیں میر جی ہم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں، لہو پیا کرتے ہیں

میر صاحب کو دیکھئے تو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

اُن کے نزدیک کچھ نہیں عزت
میر جی یوں ہی خوار ہوتے ہیں

میر سدا بیحال رہو ہو، مہر و وفا کرتے ہیں
ہم نے عشق کیا سو حضرت، یہ کیا اپنا حال کیا

مرگ کا وقفہ اس رستے میں کیا ہے میر سمجھتے ہو
یارے ماندے راہ کے ہم ہیں کوئی دم کو سو لیں ہیں

منھ سے کیا میر جی تھا، ہم کو ہوش تھے کیا کر گئے
جی سے ہاتھ اٹھائے گئے، پھر اس سے دل اٹھا کر

کل کہتے ہیں اس بستی میں میر جی مشتاق آ مرتے ہیں
تجھ سے کیا ہی جان کے دشمن وے بھی محبت رکھتے تھے

ان شعروں میں خطابیہ انداز میں سارا پوٹ یا دو ، اس مطلب میں نہاں ہے جس میں میر صاحب کا کوئی ثانی نہیں۔ انھوں نے ہر جگہ اپنے آپ کو بڑی عزت آبرو، بڑی تمکنت سے یاد کیا ہے۔ اسی لئے میر صاحب، میر جی اور بعض جگہ تو میر جی صاحب کے لفظ استعمال کئے ہیں۔

(۳) مقطعوں کی خصوصیتوں کو دیکھتے ہوئے تیسری

بات یہ ہے کہ بعض شعراء نے مقطع کو مقطع نہیں، بحیثیت شعر کاوش سے لکھا ہے۔ ویسے تو آپ کو ہزاروں مقطعے ایسے مل جائیں گے جو شعر کی حیثیت سے عمدہ ہوں۔ مگر میرا روئے سخن صرف اُن شاعروں کی طرف ہے جنھوں نے قریب قریب ہر غزل کا مقطع خاص توجہ اور کاوش سے لکھا ہے۔ اس لئے اگر اُن کی غزلوں کا انتخاب کرنے بیٹھیں تو اچھے شعروں میں اُن کے مقطعوں کا شمار بھی لابدی ہوگا۔ شاید یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے مقطع کی صحیح اسپرٹ کو سمجھا ہے۔ اور اسی لئے انھوں نے اپنا پیرایۂ اختتامیہ صرف ایس قدر نہیں رکھا کہ غزل ہو چکی، اب اجازت دیجئے۔ ان شاعروں میں مصحفی، مرزا غالب، نواب مصطفےٰ خان شیفتہ اور ریاض خیرآبادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میر صاحب اور مرحوم فانی نے بھی اس ذیل میں کچھ کم خونِ جگر نہیں کھایا۔ مگر سب سے پہلے مصحفی کے تین مشہور مقطعے سُنئے:۔

اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلّی والیاں

تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ
ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

اے مصحفی یہ دورِ خزاں بھی گزر گیا
یوں تو اسی سے آپ نے دل تھا لگا لیا

نواب مصطفےٰ خان شیفتہ، قربان علی بیگ سالک، میر مہدی مجروح، سید حسین تسکین، ظہیر، انور اور مولانا حالی کی طرح اس دور میں پیدا ہوئے جب مومن، ذوق، غالب کا طوطی بول رہا تھا۔ اپنے دوسرے ہم عصر شعراء کی طرح انھوں نے بھی ایک چھوڑ دو دو کی شاگردی کی۔ لیکن چونکہ انھیں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ دل اور زیادہ نافذ ذہن عطا ہوا تھا، اس لئے انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ ان تین صاحب کے کمالوں کے سامنے یا ان کے جلد ہی بعد اور کسی غزلگو کا چراغ جلنا مشکل ہے۔ اس لئے بہت بہت جلد انھوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ اس لئے اُن کا اردو دیوان بہت مختصر ہے۔ یعنی ادح سے لیکر تمت تک صرف ۱۰۹ صفحے ہیں۔ لیکن ان ۱۰۹ صفحوں میں آپ کو ایک بات ہر جگہ نظر آئے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کا ہر مقطع اچھا ہے۔ ان میں خطابیہ انداز یا نداکرنے کا بولتا جادو بھی ہیں۔ مقطع بحیثیت شعر بھی خوب ہے۔ اور دو ایک جگہ تخلص کی معنویت سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ سنئے:۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ایسی رغبت ہے کیا قتل گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اسکو تو لو تم سے محبت نکلی!!

تکلیف شیفتہ ہوئی تمکو مگر حضور
اس وقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

میری خاطر سے چلو شیفتہ واں
غیر ان سے تمہیں نفرت ہی سہی

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذّت گناہ میں

دشمن کہیں گیا نہ ہو آنکھوں سے شیفتہ
اس کی گلی میں آج نشانِ قدم نہیں

اب کے ارادہ ملکِ عدم کا ہے شیفتہ
گھبرا گئے کہ ایک جگہ بسر کیا کریں

لگ جاؤ اب تو گلے سب چلے گئے
اِک شیفتہ رہا ہے سو وہ کچھ مُخل نہیں

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرتِ زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اس نوبہارِ حُسن کو بدنام مت کرو
تھی شیفتہ کے پہلے ہی شورش دماغ میں

شیفتہ کی مثالیں بیشمار ہیں۔ لیکن ابھی ریاض کا تذکرہ باقی ہے، جنھوں نے مقطعوں پر خاص طور سے توجہ کی۔ نقل ہے کہ حضرت ریاض مطلع اور مقطع خاص طور پر کاوش سے کہا کرتے تھے۔ کہتے تھے آغازِ کلام تو اچھا ہونا چاہیے — اور اگر انجام اچھا نہ ہو تو سمجھ لو آخرت خراب ہوئی۔ چنانچہ اُن کے ہاں اکثر مقطعے بحیثیت شعرِ غزل کے انتخاب شعروں بلکہ بیت الغزل

کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مثلاً:

کیا جانے کیوں رقیب بنا تھا گلے کا ہار
صورت میں وہ ریاض سے اچھا تو کچھ نہ تھا

کیا کام ریاض آنے کو سو بار بہار آئے
ہم کو یہ حسین جھولنے پھلنے نہیں دیتے

اب مجھ پیر خرابات کا ہے حکم ریاض
جا کے آباد کرے مسجد ویران کوئی،

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں،

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید
ہائے یہ نور کی شکل اور گنہگاروں میں

کہاں وہ نور کی صورت وہ نور کی آواز
ریاض کون سنائے غزل یہ گا کے مجھے

دے گیا وہ داغ غم یہ کون ریاض
ہم غم دیرپا کو روتے ہیں!!!

اٹھوا دو میز سے مے و ساغر ریاض جلد
آتے ہیں ایک بزرگ پرانے خیال کے

کس نے دیکھا ہمیں کوچے میں حسینوں کے ریاض
مفت بدنام ہوئے ہم کہیں آئے نہ گئے

ریاض کی ان مختصر اور مشہور مثالوں کے بعد کچھ مقطعے میر صاحب اور مرحوم فانی کے سنئے:-

میر:-

کہنا جس سے جو کچھ ہوگا سامنے میر کہا ہوگا
بات نہ دل میں پھر گئی ہوگی منہ پر میر آئی ہوگی

میر کے دین و مذہب کا پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھے کب کا ترک اسلام کیا

تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

آب حسرت آنکھوں میں اس کی تو شاید پھرتا تھا
مرنے شاید خواہش دل کی آج کوئی پھر حسرت کی

دیدے اس اندیشے نے اکام رکھا ہے میر ہمیں
پاؤں چھوئیں تو اس کے ہم تو وہ بھی ہاتھ دیگا

خاک سے میر کیوں نہ کلیاں ہوں
ہم پہ تو آسمان پھوٹا ہے

## فانی:-

فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں کانپتا ہے ہاتھ مرے چارہ سا[ز]

خود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پا[تے]

اک عمر پرستارِ شب ہجر رہے
اے زلف سیہ ماتم فانی ہیں بکھ[ر]

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے [کا]

فانی بلائے مرگ سے غم کیجئے غلط
اب جستجوئے راحت دنیا نہ کی[جئے]

مرزا غالب اور اقبال کے اردو اور فارسی مقطعوں کی نسب[ت]
کچھ کہنا زیادہ وقیع معلوم نہیں ہوتا۔ عہد آفریں شاعروں کا کلا[م]
ویسے ہی عام ڈگر سے بہت بلند اور بہت الگ ہوتا ہے۔ اس [لیے]
ان سے یہ امید بھی کی جاتی ہے، کہ انھوں نے پیرایۂ اختتا[م]
کے مؤثر ہونے پر بھی ضرور دھیان دیا ہوگا۔ مگر یہ یاد رہے
اُن کے شاعرانہ کمال میں کوئی عظیم الشان اضافہ نہیں۔ ا[گر]
اگر انھوں نے اپنے اختتامیہ پیرائے صرف اجازت اور دا[د]
تک ہی محدود رکھے ہیں تو بھی اس سے ان کے شاعرانہ عظم[ت]
میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ مقطعے، زیا[دہ]
سے زیادہ رہ جاتے ہیں، جن سے ان مہتابوں کے حسن [میں]
چنداں اضافہ ہونے کا امکان نہیں۔

●●

اپنی تخلیقات کے ساتھ صفحہ نمبر ۴۱ پر چھپا کوپن ضرور منسلک کیجئے۔ ادارہ

افسانہ

# بکھرے سپنے

از ریحان الحق ایم اے۔ بی کام

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

"بیتے ہوئے پلوں ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے"

ایسے ہی لمحات میں مجھے اکثر اس حسین اور پُرفریب شام کی یاد آتی ہے جب غزالہ مجھ سے پہلی بار ملی تھی کالج سے چھٹی ہو جانے کے بعد میں لائبریری میں بیٹھا رئیس احمد جعفری کا بار بار پڑھا ہوا ناول" اندھا" کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک ایک مترنم آواز کانوں سے ٹکرائی

"ایکسیوزمی"!

میں نے دیکھا۔ غزالہ میرے قریب کھڑی تھی۔

"جی آپ نے مجھ سے کچھ فرمایا؟" میں نے اپنے کانوں پر شبہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو زحمت تو ہوگی ذرا مجھے غالب کی یہ غزل سمجھا دیجئے کل میں کالج نہ آسکی تھی،" ——— اس نے کہا۔

"تشریف رکھئے" میں نے ناول کا اختتام پڑھتے ہوئے کہا۔

...... اور جب میں غزل سمجھا چکا تو وہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی ——

... اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ دن گذرتے رہے اور ہم رفتہ رفتہ اتنے نزدیک آگئے کہ کالج سے کبھی وہ میرے گھر آجاتی اور کبھی میں اس کے بنگلہ پر چلا جاتا۔ اس کے والد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے اور غزالہ ان کی اکلوتی بیٹی :

"بھیا! ..... بھیا!! ...... بھیا!!!"

اتنی دیر سے پکار رہی ہوں نہ جانے کہاں کھوئے کھوئے رہتے ہو، پکارتے پکارتے تو میرا گلا خشک ہو گیا" نجمہ نے کمرے میں داخل ہو کر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا اور میرے تصورات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"کیا ہے؟ کیوں چیخے جا رہی ہو؟"

"میں چیخ رہی ہوں یا تم ہی کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھے ہو"۔

"بات کیا ہے؟ کچھ کہو بھی تو؟"

"اتنی دیر ہو گئی کچن سے آوازیں دیتے ہوئے کہ چائے بن گئی ہے۔۔۔ چائے بن گئی۔ لیکن تمہارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی" اس نے مجھ سے روٹھتے ہوئے کہا۔

"خدا ہر ایک کو ایسی اچھی بہن دے، دفتر سے آکر ابھی میں نے کپڑے بھی نہیں بدلے اور چائے تیار ہو گئی" میں نے اسے منانے کے لئے کہا اور اس کے سر پہ ایک ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہولیا

نجمہ کے ہاتھ سے پیالی لیکر میں نے ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ میرے منہ نے مختلف زاویے بنانے شروع کر دیئے

نجمہ نے چائے میں شکر کے بجائے نمک گھول دیا تھا۔ نجمہ قہقہے لگا رہی تھی اور میں ایک مرتبہ پھر ماضی کی یادوں میں غرق ہو چکا تھا۔ اکثر غزالہ بھی میرے ساتھ یہی شرارت کرتی تھی۔

شفق نے شام کی رنگینی کو اجاگر کر دیا تھا غزالہ اور میں مخملی گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ غزالہ نے چائے بنا کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"چائے پیجئے"

"میں نظر سے پی رہا ہوں ......" میں نے اس کی جھیل سے زیادہ گہری نیلگوں آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے خوابناک انداز میں کہا اور اس کی حسین پلکیں جھک گئیں۔

"آپ نے "فرائڈ" کے نظریہ خواب" پہ نوٹس نہیں دیئے" اس نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی مکمل نہیں۔ کالج میں لے لیجئے گا"

"اچھا" ——

"آپ نے اگنا مکس کے کورس تنقل کر لئے ہوں تو میرا فائل واپس کر دیجئے۔"

"اوہ! میں تو بالکل بھول گئی۔ پھر لے لیجئے گا"

"بہت اچھا۔ لیکن یہ بھولنے کی عادت اچھی نہیں" میں نے اسے شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس طرح ہم دونوں رفتہ رفتہ قریب سے قریب تر ہوتے گئے دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو کر محبت کے حسین راگ چھیڑتی رہیں میں اکثر سوچتا تھا کہ غزالہ کے آنے سے پہلے میری زندگی کیسی ویران اور بے کیف تھی۔

"ار..... رے...... بھیا...... ! تمہیں کیا ہو گیا ہے ـــــ کس سوچ میں ہو۔ دوسری پیالی ٹھنڈی بھی ہو گئی اور تم یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو"

"ہوں...ں..... ں" میں نے تصورات اور خیالات کی دنیا سے نکل کر اپنے چھوٹے سے گھر کے بے ترتیب باورچی خانے میں آتے ہوئے چائے کی پیالی کو ہاتھ لگایا تو وہ واقعی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"کتنی مرتبہ کہا ہے کہ آفس کی باتیں آفس ہی میں سوچا کرو۔ دن بھر آفس میں موٹے موٹے رجسٹروں پر جھکے رہنے کے بعد گھر آتے ہو تب بھی ڈیبٹ کریڈٹ کے چکروں میں کھوئے رہتے ہو"

بیچاری نجمہ کو کیا معلوم کہ اس کا بھائی آفس کے اکاؤنٹس میں کھویا رہتا ہے یا کہیں اور۔

"اچھا جلدی سے دوسری چائے بناؤ" میں نے اس کی تقریر سے بچنے کے لئے کہا۔

"تمہاری نوکر نہیں ہوں"

"بہن تو ہو"

"بھابی چائے بنا کر پلایا کریں گی۔ بھیا اب تم جلدی سے شادی کر لو"

"کیوں کیا بھابی سے لڑنے کو جی چاہ رہا ہے؟"

"میں کیوں لڑنے لگی۔ میری کوئی بہن نہیں میں تو انہیں اپنی بہن بناؤں گی"

اس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور میں چائے کی چسکیاں لینے لگا

"بھیا اب تم شادی کر ہی ڈالو سہرے کے پھول تو سفید ہونے لگے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو سسر صاحب تم ہی سے آ کر پوچھیں کہ صاحب لڑکا کہاں ہے؟"

نجمہ نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے جھینپ مٹانے کیلئے لپک کر اس کی چٹیا پکڑ لی۔

"اوئی..... ی"

"اچھا میں جا رہا ہوں" میں نے چٹیا چھوڑتے ہوئے کہا۔

"دلہن تلاش کرنے؟" اس نے پھر جملہ چست کیا۔

"نہیں تمہارے لئے دولہا تلاش کرنے" اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ چہرہ گلنار ہو گیا۔ اور میں گھر سے باہر نکل پڑا۔

باہر سڑکوں پر خوب چہل پہل تھی۔ ہر طرف ریشمی اور رنگین آنچل لہرا رہے تھے میں ان پر رونق سڑکوں کی رنگینیوں سے گزرتا ہوا پارک کے ایک خاموش اور سنسان سے گوشے میں جا کر بیٹھ گیا میں نے اس درخت کو دیکھا جس پر کبھی ہم دونوں نے اپنے نام لکھے تھے اور جہاں میں نے اپنے تصورات کی حسین دلکش اور رومانی محفلیں سجائی تھیں۔

ـــــ ایک دن ہم دونوں کالج لان پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے

"ڈیڈی کا لکھنؤ ٹرانسفر ہو رہا تھا لیکن انہوں نے میرے امتحان تک یہیں رہنے کی اجازت لے لی ہے" اس نے بتایا

"تو کیا امتحان بعد آپ بھی چلی جائیے گا؟" میں نے افسردہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں"۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"بھول تو نہ جائیے گا؟" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"امتحان میں صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے" اس نے میری بات کو ٹالتے ہوئے، فکر مند لہجہ میں کہا۔

"تو کیا بات ہے؟" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"میری انگلش بہت ویک ہے اور نوٹس بھی تیار نہیں"

"تو ہسٹری اور اردو کے نوٹس آپ مجھ سے لیکر کاپی کر لیجئے گا"

"اور پولز کے نوٹس نہیں بنائے آپ نے"

"بنائے تو ہیں لیکن وہ کوئی خاص نہیں"

"وہ بھی دکھا دیجئے گا"

"بہت بہتر"

امتحان قریب آ گئے تھے۔ غزالہ اکثر مجھ سے کچھ سمجھنے کے لئے اپنے بنگلہ پر بلوا بھیجتی ہم رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ ایک روز پڑھائی ختم کرنے کے بعد ہم دونوں کھڑکی کے قریب کھڑے ہوئے باہر پائیں باغ میں مخملی گھاس اور رنگ برنگے پھول پودوں کو دودھیا چاندنی میں نہائے ہوئے دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اس نے تجویز رکھی۔

"آیئے پارک میں چلیں"۔

"چلئے"۔

اور ہم دونوں پارک میں آکر چاندنی میں نہا گئے۔

"دودھیا چاندنی میں یہ گلاب کا پھول کتنا خوبصورت لگ رہا ہے"

"یہ پھول آپ کی زلفوں میں زیادہ خوبصورت لگے گا" میں نے پھول توڑ کر اس کے جوڑے میں لگاتے ہوئے کہا۔

اس کا چہرہ گلاب ہو گیا۔ اس نے شرما کر گردن جھکا لی اور اپنے دوپٹے سے کھیلتے ہوئے تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولی

"دیکھئے چودھویں کا چاند کتنا حسین لگ رہا ہے"

"میرے چاند سے زیادہ حسین نہیں" میں نے بدستور اس کو دیکھتے ہوئے خشمگیں انداز میں کہا۔ اور وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے چاند کو چھپا لیا۔

"کل آپ عکس کے نوٹس لیتے آیئے گا" اس نے ننگ آکر موضوع بدلا۔

"جو حکم حضور کا"

"حکم نہیں درخواست ہے"

"اگر آپ نے "سندم اینڈ لیش" کی کتاب سے استفادہ کر لیا ہو تو واپس کر دیں"

"ار۔۔۔رے وہ کتاب تو پڑھنا میں بالکل بھول ہی گئی"

"بس ایک دن اسی طرح مجھے بھی نہ بھول جائیے گا" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

غزالہ نے اپنی جھکی ہوئی پلکوں کو اوپر اٹھایا اس کے لب کپکپائے

"بھلا کوئی اپنی روح کو بھی بھلا سکتا ہے؟"

میں اس کے اس مختصر لیکن جامع جملے کے کیف و سرور میں کھو گیا اور فرط مسرت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

———— اور جب رزلٹ آیا تو غزالہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی تھی اور میں ۔؟۔۔۔ میں تھرڈ ڈویژن میں۔ میں نے ٹیلیگرام سے غزالہ کو مبارکباد بھیجی اور اس نے بھی جواب میں شکریہ کا تار بھیجا۔

کلاک ٹاور سے نو بجے کا سائرن بجا تو میں نے تصورات کی پرچھائیوں کو ذہن سے ہٹا کر دیکھا کر باغ میں بالکل سناٹا ہو گیا تھا، جاڑے کی اس سرد رات میں صرف میں ہی اکیلا باغ کے اس سنسان گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ اور پھر میں بھی اٹھ کر باہر آ گیا۔

سڑک پر اپنے خیالات میں گم چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک جانی پہچانی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"جمیل!۔۔۔۔آ۔۔۔آپ؟"

میں نے حیرت سے دیکھا غزالہ میرے قریب ہی کھڑی تھی

"ار۔۔۔رے۔۔۔غزا۔۔۔لہ۔۔۔آ۔۔۔آپ؟"

"ان سے ملئے میرے شوہر کیپٹن شفیق"

"مبارک ہو" میں نے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔

"اور یہ کالج میں میرے کلاس فیلو تھے ۔ جمیل صاحب"

"آپ نے اپنی شادی میں مجھے انوائٹ بھی نہیں کیا؟"

میں نے اپنے درد کو چھپانے کے لئے مسکراتے ہوئے اس سے شکایت کی۔

"بھول گئی تھی"

"بھول گئی ۔۔۔یقیں۔۔۔یں۔۔۔ بھول جانا تو آپ کی پرانی عادت ہے" میری آواز نہ جانے کیوں بھرا گئی

"اچھا پھر ملیں گے"

"ہاں۔۔۔گڈ نائٹ!"

"ہاں۔۔۔نائٹ!"

وہ دونوں قریب ہی کھڑی خوبصورت کار میں بیٹھ کر چلے گئے اور

میرے جنوں کی بات جو مانیں کام نئے فنکار کریں
وقت کی ظالم تاریکی پر لوح و قلم سے وار کریں

دور رہے کچھ ذکر نہ چھیڑا پھر بھی بھول چلے ہیں تمہیں
اب تو یہی منزل باقی ہے یادوں سے انکار کریں

دور رہیں تعمیر کی باتیں وقت کے تیور کہتے ہیں
فن کی دیواروں کو ڈھا دیں تاج محل مسمار کریں

گل کا حسن صبا کی آہٹ کرنوں کی نرمی سخن
پہلے یہ سب جمع تو کر لیں پھر انکو بیدار کریں

کیا بتلائیں ہم سے وہ عابد بنتے ہیں کیوں غیر ہوئے
مظلوموں سے ظلم کے بانی کیسے آنکھیں چار کریں

عابد کرمانی متعلم دلی کالج دہلی
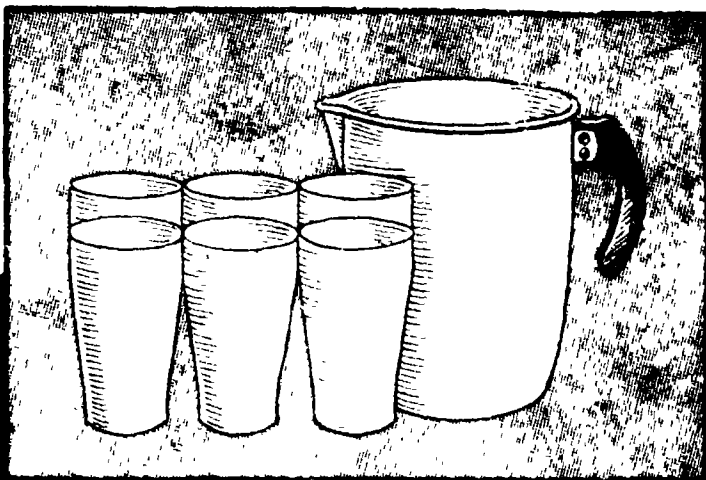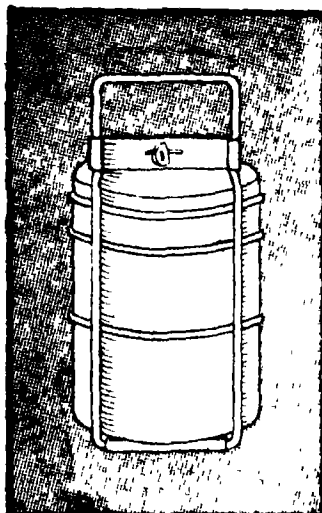
TRADE MARK
SMW
Supreme
A NAME
TOWERING ABOVE OTHERS
IN QUALITY & WORKMANSHIP
IN HOUSE HOLD WARES

# ادھ کھلے پھول ـــ جنھیں آبیاری کی ضرورت ہے

(از۔ سرگرداں دہلوی)
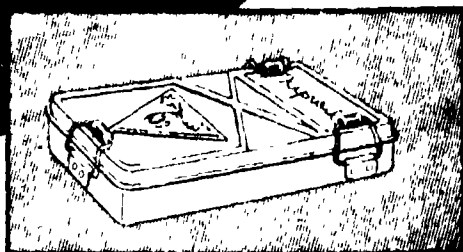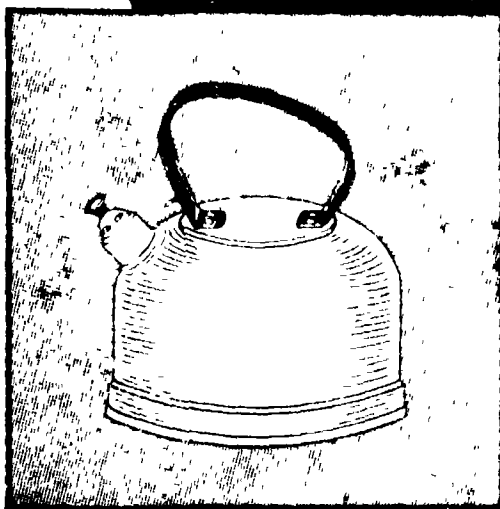
اس عنوان کے تحت ان اُبھرتے ادیبوں اور شاعروں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جو مستقبل میں اُردو کے عظیم ستون ثابت ہونگے ـــــــ اس مرتبہ آپ دلی کالج دہلی کی طالبہ مس ناہید تاج قریشی سے متعارف ہو رہے ہیں آپ اُردو آنرز فائنل میں ہیں۔ اگلے ماہ آپ دلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ریحان الحق سے متعارف ہوں گے۔

آجتک آپ اس صنف سے متعارف ہوکر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہے جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا یعنی آدم جسے خدا نے اپنے دستِ مبارک سے بنایا اور فرشتوں کو حکم سجدہ دیکر آدم کو فرشتوں پر فضیلت دیتے ہوئے اشرف المخلوقات کا لقب مرحمت فرمایا۔ اب باری اس مادام کی آئی جسے عرفِ عام میں حوا کہا جاتا ہے اور میری زبان میں "پسلی توڑ" آپکے وجود میں آنیکا بھی عجیب واقعہ ہے۔ خداوند قدوس نے تو اس صنف کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اسکی وجود میں آنیکے مراحل اپنے سامنے ہی طے کرا دیتے، بلکہ حکم ہوا "کن"۔ اور بس آپ نہ بیدوں کی طرح اسی کی منتظر تھیں فوراً اور کہیں موقع نہیں ملا تو حضور دادا مرحوم (آدم) کی بائیں پسلی توڑتی ہوئی نمودار ہوگئیں، نہ کوئی فرشتوں کا گارڈ آف آنر پیش کیا گیا اور نہ ہی حوروں اور دوسرے عمال نے آپکو ... آمدید کہنے کی زحمت گوارہ کی اور جناب آتے ہی ہمارے ... سادے دادا (دادا آدم) بہکانے لگیں "اللہ میاں نے حضرت آدم سے کہا دیکھو یہ گیہوں کا دانہ مت کھانا لیکن محترمہ حوا صاحبہ مرحومہ نے ادائے دلربائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا "کھا بھی لو نا" اور ہمارے دادا جان آگئے ان کے جھانسے میں، نتیجہ آپکے سامنے ہے اب بیچارہ مرد تو اس منحوس کی زد میں آگیا "کرے کوئی بھرے کوئی" اور بنتِ حوا نہ صرف ہمارے گھروں پر راج کر رہی ہیں بلکہ اب ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ہمارے دل و دماغ پر بھی راج کرنیکی سوچ رہی ہیں تو لیجیے آج آپکو ایسی ہی بنتِ حوا سے متعارف کرا رہا ہوں۔ جو ہمارے دل و دماغ پر حکومت کرنے کے علاوہ نوکِ قلم سے ہمارے نازک احساسات اور جذبات پر نشتر زنی فرما رہی ہیں۔ آپ کا نام ہے ناہید تاج قریشی۔ بالترتیب پڑھتے چلے جائیے پہلے اپنا نام، پھر والد محترم کا نام اور پھر قبیلہ کا نام جس سے آپ تعلق رکھتی ہیں۔

ولادت کا سہرا مراد آباد کے سر رہا اور پرورش کا بوجھ دہلی کے نازک کاندھوں پر ڈالا گیا جب بابی "توتم" اور روٹی "اوٹی" کہنے کے قابل ہوئیں تو انگلی پکڑ کر ایک پرائمری اسکول میں پہنچا دی گئیں اور جب ...... جب کانوں میں بندے پہننے کے قابل ہوئیں تو ایک ہائر سیکنڈری اسکول میں داخل کرا دیا گیا وہاں ایک دفعہ ریاضی کی استانی صاحبہ نے ایک سوال کیا کہ بتاؤ دو اور دو؟ آپ نے جھٹ سے جواب دیا کہ آٹھ، اور جب استانی نے خشمگیں نگاہیں ڈالتے ہوئے مزید کہا دو اور دو آپ نے قلم اور کاپی کی مدد سے ان دو ہندسوں کو جمع کر کے اس کا جواب بڑے فخریہ انداز میں بتایا "دو اور دو پانچ ہوتے ہیں"۔ جسکی وجہ سے محترمہ ریاضی صاحبہ آپ کی چوٹیا پکڑ کر اسکول کا دروازہ دکھا دیا ...... گھر پہنچیں اور پھر جب "ریاضی" کا غصہ ختم ہوا تو ـــــ ہائی اسکول علیگڑھ سے پاس کر کے اب رخ کیا جامعہ کالج نئی دہلی کی طرف اور دیا وآپ ... میں داخل ہوگئیں اور یہاں سے آپ نے ...

...یٹرن میں پاس کر کے دہلی کالج کی ... اپنا نام لکھوانے پہنچ گئیں
بی۔ اے کے تیسرے سال میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کی مشغولیات
اس طرح ہیں۔

ہر رات کو ختم کاپی اٹھا کر ٹیڑھی ترچھی لکیریں کھینچنا اور انہیں
بک میں رکھ کر صبح کالج پہنچنا اور اپنی سہیلیوں سے زبردستی داد
وصول کرنا اور نہ دینے کی صورت میں منہ بسورنا۔ اچانک موڈ
بدلنا اور پھر مسکرانا اور مسکراتے چلے جانا مسکراہٹ کو قہقہوں میں
تبدیل کر دینا۔ اور پھر اس ہنسی کو بریک لگا کر سنجیدگی کا جامہ اوڑھ لینا
سامنے سے کسی کو آتے ہوئے دیکھنا تو نظریں نیچی کرنا اور پھر کنکھیوں سے
دیکھنا لائبریری کی کتابوں کے لئے دیمک بن جانا اور پھر لائبریری سے
چند کتابیں رکھ کر واپس گھر پہنچنا۔ پہنچتے ہی والدین پر احسان جتانا
آتے ہوئے چھوٹے بھائی بہن پر دھونس جمانا کتابیں لیکر بیٹھ جانا اور
پڑھائی کا ڈھونگ رچانا۔ سہیلیاں آ جائیں تو پڑھنے کا بہانہ نہ
کرنا اور جب اس پر بھی سہیلیاں نہ جائیں تو بیٹھے بیٹھے سو جانا
اور آنے والی سہیلیوں کو دور کرنا گھبرا کر آنکھ کھولنا اور پھر [illegible]
انداز میں معذرت طلب کرنا اور اس طرح ان سب سے چھٹکارا حاصل
کرنا۔ پڑھتے پڑھتے سو جانا۔ اور آنکھ کالج کے گیٹ پر کھولنا
اور اپنی ردا [illegible] اور...... اور.. اگر کوئی
ملنے آ جائے تو ہلکی تواضع کرنا کافی ہے یا ..................
........ چاہئے ہے (حسب نوعیت)

اکثر ایسی خواہش کرنا کہ ہر خواہش پر دم نکلے کسی فلم کو دیکھنا
اور اسکی ہیروئن کو گھوڑ سواری کرتے ہوئے دیکھ کر مچلنا اور
پھر نتیجہ پر غور کرنا اور گھوڑ سواری کے خیال کو یکسر بدل دینا۔
اپنے سراپا پر غور کرنا اور حقائق کی دنیا میں لوٹ آنا وغیرہ وغیرہ۔

گزشتہ ماہ آپ ان کا افسانہ "خلش" ملاحظہ فرما چکے تھے اور اس
مرتبہ آپ ان کی نئی تخلیق پڑھیں گے بازدید اور اب ان کو کاغذ
پیراہن میں زیب تن کر کے سرگرداں اس شعر کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں

معصوم آرزو کو پکارو نہ کہہ کے عشق
اس جاں فزا خلش کو کوئی نام تو نہ دو

افسانہ
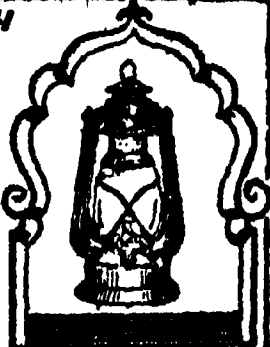
# بازدید ——— ناہید تاج قریشی (اردو آنرز فائنل)

طالبہ دلی کالج دہلی

"کیا واقعی اطہر کا کوئی خط اس وقت کی ڈاک میں نہیں ہے؟"

امی ابا سے پوچھ رہی تھیں۔

واقعی اطہر نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ میں اس کو پے بہ پے پانچ، چھ خط لکھ چکی تھی۔ مگر کسی کا جواب نہیں آیا۔ کہیں خدانخواستہ اس کو کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا۔ اس خیال سے ہی میں پریشان ہو اٹھی۔ اور خدا سے اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگی۔ یکایک میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب......

کالج میں ہمارا پہلا دن تھا۔ میں کلاس میں جھجک اور خوف کی ملی کیفیت لئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کلاس میں یا تو لکچرار کی آواز گونج رہی تھی، جو رول نمبر پکار رہے تھے۔ یا طالب علموں کے جواب دینے کی آواز تھی...... جب میرے بالکل برابر سے "یس سر" کی آواز ابھری تو میری نگاہیں بے اختیار اُدھر اٹھ گئیں۔ اور میں اُسے حیرت و استعجاب کے عالم میں دیکھتی رہ گئی۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ مجھے اس طرح گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی حیران نظروں سے مجھے تک رہا ہے۔ میرا یہ انہماک اس وقت ٹوٹا جب لکچرار نے میرا رول نمبر پکارا۔ لیکن اس کے بعد میں میری نگاہیں بار بار اُس کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔

دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی میں دیکھنے لگتی تھی۔ شاید وہ بھی میری اس غیر معمولی دلچسپی کو محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ جب بھی میری نگاہ اس کی طرف اٹھتی وہ لبوں پر ہلکا سا تبسم لئے میری ہی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ اور میں جھینپ کر نگاہ جھکا لیتی۔ کئی بار میں نے اس سے بات کرنے کی بھی کوشش کی۔ مگر ہمیشہ جھجک کر رہ گئی۔ چاہنے کے باوجود بھی کبھی اسے مخاطب نہیں کر پائی۔

ایک روز میں سر جھکائے، اپنے ہی خیالوں میں محو، کومن روم کی طرف جارہی تھی۔ کہ ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"سنئے!!"

میں چونک کر مڑی تو سامنے وہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"مجھے اطہر کہتے ہیں۔" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

ایک لمحہ کے لئے میں سراسیمہ سی ہو گئی۔ پھر بڑی مشکل سے گھبراہٹ چھپاتی ہوئی بولی۔

"میرا نام قدسی ہے۔"

دو تین منٹ تک ہم یوں ہی کھڑے رہے۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا بولا جائے۔ پھر بغیر کچھ کہے سنے میں کومن روم کی طرف بڑھ گئی۔ اور وہ بھی پلٹ گیا۔

آہستہ آہستہ اجنبیت ختم ہوتی گئی۔ اور ہم دونوں کافی حد تک گھل مل گئے۔ بلکہ پھر تو ہمارا زیادہ تر وقت ساتھ ہی گذرتا۔ اگر کسی دن اطہر کالج نہ آئے تو میں پریشان ہو جاتی۔ اور اگر میں کبھی کالج سے غیر حاضر ہوتی تو دوسرے دن وہ سوالات کی یورش کر دیتے۔

ایک دن ارادی یا غیر ارادی طور پر اطہر اپنی ڈائری میرے پاس چھوڑ گئے۔ میں نے اٹھالی۔ وہ گھر جا چکے تھے۔ لہٰذا دوسرے روز واپس کرنے کے خیال سے میں وہ ڈائری گھر لے گئی۔ شام کو جب میں پڑھنے بیٹھی۔ تو پڑھتے پڑھتے بے خیالی میں وہ ڈائری اٹھالی۔ اور یوں ہی بے مقصد صفحے الٹنے پلٹنے لگی۔ ایک جگہ اپنا نام دیکھ کر چونک پڑی۔ اور یہ سوچے بغیر کہ کسی کی ڈائری پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔ میں پڑھنے لگی۔

قدسی کتنی اچھی ہے۔ شاید وہ بھی مجھے اتنا ہی پسند کرتی ہے۔ مگر میں اس سے یہ کیسے کہوں کہ.........

"اُف، میرے خدا!" میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ایک لمحے تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ اگر اطہر سامنے ہوتا۔ تو شاید میں

اس کے تھپڑ مار دیتی۔ لیکن پھر جتنا سوچا قصور سوا سر اپنا ہی نظر آیا۔

دوسرے دن میں کالج نہیں گئی۔ ایک سہیلی کے ذریعہ اسے گھر بلوایا۔ وہ آیا تو اپنا ذہنی انتشار چھپاتے ہوئے میں نے اس کا استقبال کیا۔ اور اندر لے گئی۔ لیکن وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ اور حیران و جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی یہ حیرانی بجا بھی تھی۔ سامنے دیوار پر لگی اس سے بے انتہا مشابہ تصویر بھی اس کی اس حیرانی پر مسکرا رہی تھی۔

"بیٹھ جائیے"، میں نے بڑے سکون سے کہا۔

"میں نے آج آپ کو اس لئے بلایا ہے اطہر! یہ تصویر میرے بھائی کی ہے —— میرا اکلوتا اور چہیتا بھائی ظہیر۔ جسے دو سال قبل موت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھ سے جدا کر دیا۔ اطہر! جب میں نے پہلے دن آپ کو دیکھا۔ تو مجھے یوں لگا، جیسے قدرت کو میرے حال پر رحم آگیا ہے۔ اور اس نے مجھے میرا بھائی واپس کر دیا۔ اطہر کیا آپ مجھے بہن کہنا پسند کریں گے؟"

اطہر کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ سکتے کے سے عالم میں پھٹی پھٹی نظروں سے ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

اچانک مجھے نہ معلوم کیا ہوا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر میں نے اطہر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اور دیوانہ وار کہنے لگی "اطہر! میرے بھائی! ...... میرے بھیا! خدا کے لئے اب مجھے چھوڑ کر مت جانا...... بھیا، اب مجھ سے نہ روٹھنا! ....... دیکھو نا دو سال سے میں بھائی کے پیار کے لئے ترس رہی ہوں..... اطہر! کہہ دو میں تمہارا بھائی ہوں۔ ......... خدا کے لئے اطہر کہہ دو......... کہہ ........ دو"

اطہر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ سر جھکائے، آہستہ آہستہ مجرموں کی طرح بولا۔

"قدسی مجھے معاف کر دو........ اُف تمہیں میں نے کتنا غلط سمجھا۔ تمہاری پاک محبت کو میری حماقتوں نے کتنا گندہ رنگ دے دیا تھا۔ قدسی خدا کے لئے مجھے معاف کر دو..... میری بہن"

"بھیا! میرے بھیا!!"

"میری بہن! میری قدسی!!"

"قدسی! لو، اطہر کا خط آگیا"

امی کی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

●● ——————

(بقیہ بکھرے سپنے)

اور میں لڑکھڑاتا ہوا واپس آکر اپنے بستر پر گر پڑا رات بھر کروٹیں بدلنے اور عمر بھر سسکنے کے لئے۔

دور کسی کی پردرد آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی ؎

"خوشی دیدی تمہیں اور غم گوارا کر لیا میں نے"

# لبادے کے پیچھے

خلیل جبران
مترجم: معراج الدین متعلم جامعہ کالج نئی دہلی

آدھی رات کے لگ بھگ اچانک ریچل کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ بستر پر پڑے پڑے اپنے کمرے کی چھت پر نامعلوم چیز کو گھورنے لگی۔ اس نے ایک آواز سنی جو زندگی کی سرگوشیوں سے زیادہ ہلکی تھی —— سفید پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے زیادہ نرم اور فضا کے پیغامات سے زیادہ گہری .......... اس نے اس کے دل میں امید اور ناامیدی بھر دی —— خوشی اور غم سے سرشار کر دیا۔ —— زندگی کے لئے پیار بیدار کر دیا —— موت کی آرزو بھی پیدا کر دی —— ریچل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور لمبی آہ کے ساتھ کہا۔

"سویرا وادی کے بالکل اختتام پر پہنچ گیا ہے۔ اب ہم کو سورج کی طرف جانا اور اس سے ملنا چاہئے۔ —— اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ گویا انہوں نے ایسا نفس کے زخم کی تکلیف بڑھ جانے کے سبب کیا ہو ——

اسی لمحے ایک پادری اس کے پاس پہنچا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑا جو برف کی طرح ٹھنڈا تھا —— اور جب اس نے پراسرار انداز میں اپنی انگلیاں اس کے سینے پر رکھیں۔ تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ صدیوں سے ساکت و جامد ہو۔ اور اس (پادری) کے دل کے راز کی طرح خاموش ہو ——

مقدس باپ نے ناامیدی سے اپنا سر جھکا لیا —— اس کے ہونٹ حرکت میں آئے۔ جیسے وہ مقدس لفظ کہنا چاہتے ہوں ........ جن کو رات کے اندھیرے میں چھپی ویران وادیوں نے دہرایا ——

اپنے سینے پر صلیب بنانے کے بعد پادری نے کمرے کے ایک تاریک گوشے میں بیٹھے شخص کی جانب دیکھا۔ اور پھر رحم اور ہمدردی کے لہجے میں گویا ہوا ——
"تمہاری محبوبہ روشنی کے عظیم دائرے میں پہنچ گئی ہے۔ آؤ میرے بھائی، ہم جھکیں اور دعا کریں ——"

غم سے نڈھال شوہر نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی کھلی آنکھیں نہ دکھائی دینے والی چیز کو گھور رہی تھیں —— تب اس کے چہرے کے جذبات بدلے۔ گویا وہ نامعلوم خدا کے بھوت کو پہچانتے ہوئے دیکھ رہا ہو۔ پھر اپنے آپ کو سنبھال کر اپنی بیوی کی بستر کی جانب نہایت احترام سے چلا۔ اور مقدس پادری (جو ماتم، دعا، اور صلیب بنانے میں مصروف تھا) کے پاس ہی جھک گیا —— مقدس باپ نے مغموم شوہر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت آہستگی سے کہا ——

"میرے بھائی! برابر کے کمرے میں جاؤ کیونکہ تم کو آرام کی سخت ضرورت ہے ——"

اس نے فرماں بردارانہ طریقے سے اٹھ، اور دوسرے کمرے میں جا کر اپنے تھکے ہوئے جسم کو ایک چھوٹے سے بستر پر ڈال دیا —— چند ہی لمحوں بعد وہ نیند سے اس طرح ہم آغوش تھا۔ جس طرح بچہ اپنی مہربان و پیاری ماں کے رحمدل بازوؤں میں پناہ لیتا ہے۔

پادری بیچ کمرے میں ایک بت کی مانند کھڑا رہا۔ اور ایک عجیب کشمکش نے اس کو گھیر لیا —— اور پھر اس نے پہلے جوان عورت کے ٹھنڈے جسم کی طرح دیکھا۔ اور پھر اس کے شوہر —— جس نے اپنے آپ کو نیند کی لالچ (بھوت) کے حوالے کر دیا تھا —— کے درمیان کا پردہ ہٹا دیا —— ایک گھنٹہ جو ایک صدی سے زیادہ طویل۔ اور موت سے زیادہ خوفناک تھا —— گذرنے کے بعد بھی پادری جدا ہوتی

روحوں کے درمیان کھڑا رہا ——— ایک جو سردی کی معیت
کے بعد آنے والی بہار کا خواب دیکھ رہی تھی۔ اور دوسری
جو ہمیشہ کے لئے آرام کر رہی تھی۔

پھر پادری جوان عورت کے جسم کے نزدیک
آیا ——— اور ایسے جھکا جیسے وہ مذبح کے سامنے
(آگے) عبادت کر رہا ہو ——— اس نے عورت کا
ہاتھ اٹھایا۔ اور اپنے لرزتے ہونٹوں پر رکھ دیا ———
پھر اس نے موت کے ہلکے گھونگھٹ سے بچے چہرے
کی جانب دیکھا ——— اس کی آواز رات کی طرح خاموش
شگاف کی مانند گہری اور انسان کی امیدوں کی طرح
ہچکچاہٹ سے بھری تھی ——— اور وہ آواز میں رو
پڑا ——— "

"میری روح کی دلہن، اے ریچل ——— میری
بات سنو! اب میں بولنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ کیونکہ
موت نے میرے ہونٹ کھول دیئے ہیں۔ تاکہ میں وہ راز
جو زندگی سے زیادہ گہرا ہے تم پر افشاں کر دوں۔
تکلیف نے میری زبان کے پَر کھول دیئے ہیں ———
اور اب میں تم پر اپنے رنج و دکھ کا اظہار کر سکتا
ہوں۔ جو تکلیف سے زیادہ تکلیف دہ ہے ———
اے آسمان و زمین کے درمیان منڈلاتی پاک
روح، میرے دل کی چیخ سن ——— ذرا اس
نوجوان کی طرف توجہ دے جس نے تیری خوب صورتی
کے خوف کے سبب درختوں کے پیچھے سے تجھے گھورتے
ہوئے، کھیت سے تیرے آنے کا انتظار کیا۔
اب پادری کی آواز سن جو خدا کی خدمت کر رہا
ہے۔ اور جو تمہارے خدا کے شہر میں پہنچ جانے
کے بعد بھی تم کو بغیر کسی شرم کے پکار رہا ہے۔
اپنے پیار کو چھپا کر میں نے اپنی محبت کی طاقت
کو ثابت کر دیا ہے۔"

اس کے بعد مقدس باپ نے محبت اور تکلیف
کے اپنے دل کے تمام راز ——— اور سالوں
کی خلش کو انڈیلتے ہوئے عورت کی پیشانی، آنکھوں
اور گلے پر تین طویل، گرم اور خاموش بوسے ثبت کر
دیئے۔

پھر اچانک وہ کمرے کے تاریک گوشے
میں ہو گیا۔ اور جانکنی کی حالت میں ایک
خزاں رسیدہ پتے کی مانند فرش پر گر پڑا
——— جیسے عورت کے ٹھنڈے چہرے کے لمس
نے اس کے اندر کے جذبۂ ندامت کو بیدار
کر دیا ہو، ——— تھوڑی دیر بعد اس نے
اپنے آپ کو سمیٹا۔ اور اپنے بندھے بازوؤں کی
طرف جھکا ——— پھر اس نے ہلکے لہجے میں
سرگوشی کی۔

"اے خدا! میرے گناہ کو معاف کر دے
——— میری کمزوری کو معاف کر دے ———
اے پروردگار ——— میں اب اور زیادہ اس
کو ظاہر کرنے سے نہیں رک سکتا تھا۔ جس کو
تو جانتا تھا۔ سات سال سے میں نے گہرے راز
کو دل کی گہرائیوں میں چھپائے رکھا تھا ———
یہاں تک کہ موت نے اس کو مجھ سے جدا کر دیا
——— اے خدا ——— ! اس خوفناک اور خوب
صورت یاد کو چھپانے میں میری مدد کر جو تیری
ناراضگی کے عوض زندگی میں رنگینیاں لاتی ہے۔
مجھے معاف کر دے، اے میرے خدا ———!
میری کمزوری کو معاف کر دے۔"

جوان عورت کی لاش کی طرف دیکھے بنا وہ اس
پر ماتم اور آہ و زاری کرتا رہا۔ یہاں تک کہ، دن
نکل آیا ——— اور دن کی روشنی نے دو خاموش
لاشوں پر ——— ایک میں محبت اور مذہب کی
کشمکش۔ اور دوسرے میں زندگی اور موت کا
سکون آشکارا کرتے ہوئے۔ ایک امید افزا پردہ
ڈال دیا۔

●●

# بہاری لال کے سپنے پورے ہوگئے ایل آئی سی کی مدد سے

بہاری لال کی چھوٹی موٹی کھیتی باڑی تھی معمولی آمدنی ہونے پر بھی وہ کچھ نہ کچھ رقم بچاتا تھا. فصل نکلنے کے زمانے میں ایک بیمہ ایجنٹ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ ایجنٹ کی باتوں سے متاثر ہوا اور اس نے ۵۰۰۰ روپیوں کی ایک میعادی بیمہ پالیسی لی۔ اب اس کی میعاد ختم ہونے والی ہے۔ اس رقم سے وہ اپنے کھیت میں پانی کا پمپ لگانا چاہتا ہے اور باقی رقم سے کھیتی باڑی کا دوسرا سامان خریدنا چاہتا ہے۔ خاندان کی سلامتی کے ساتھ ساتھ بہاری کے سپنے بھی پورے ہوگئے۔

آپ بھی بہاری لال کی طرح سمجھداری سے کام لیجئے اور اب کی فصل پر بیمہ پالیسی لے لیجئے۔ آج ہی بیمہ ایجنٹ سے ملئے۔ آپ کی ضروریات کے مطابق وہ بیمہ کا پلان بتلائیں گے۔

## بیمۂ زندگی سلامتی کے لئے بے مثال ہے!

# گردش

حسین اختر مُراد
متعلم دلی پبلک کالج
نئی دہلی

انگریزی ادب کے مشہور اور عظیم ناول نگار "CHARLES DICKENS" کے مشہور ناول ناول "گریٹ ایکسپکٹیشن" "GREAT EXPECTATION" کی تلخیص۔

پپ "PIP" غریب ماں باپ کا بیٹا تھا اُس کے والدین اس کی بہن کے پاس اُسے چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس کی بہن اُس سے بیس سال بڑی تھی جس کی شادی "جو گارگیری" (JOC GRGERY) نام کے لوہار سے ہوئی تھی یہ بڑی بد مزاج عورت اپنے چھوٹے بھائی اور نیک شوہر پر بڑی زیادتی کرتی تھی۔

پپ جب سات سال کا ہوا تو ایک دن وہ اپنے گاؤں کے قبرستان میں گیا وہاں ایک ایسے قیدی سے اس کی ملاقات ہوئی جو فرار ہو کر چھپا ہوا تھا۔ قیدی کا نام "ایبل میگ وچ" (A BEL MAG WITCH) تھا۔ قیدی نے بچے کو بڑی بری طرح جھڑک کر کہا کہ میں بھوکا ہوں جاؤ اپنے بہنوئی کی بھٹی سے ایک ریتی لے آؤ اور کچھ کھانے کو بھی اور اگر نہ لائے تو میں تم کو جان سے مار ڈالوں گا۔

پپ نے اپنے بہنوئی کے گھر سے ریتی اور کھانا چرایا اور علی الصباح قیدی کے پاس پہونچ گیا قیدی اُسے پا کر بہت خوش ہوا اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور ریتی سے پیروں کی بیڑی کاٹ ڈالی "جو" "JOE" کا چچا "پمبل چک" (PUMBLECHOOK) شہر میں اناج کا ایک بڑا تاجر تھا وہ اکثر "جو" کے خاندان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس کی مالکہ مکان ایک دولت مند شراب فروش کی لڑکی تھی۔ اس کا نام "مس ہے وِشم" (MISS. HAVISHAM) تھا۔ اس کا محبوب اُسے شب عروسی کو ہی چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اس واقعہ سے "مس ہے وشم" کے دل کو ایسی چوٹ لگی کہ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ مستقبل میں وہ گوشہ نشینی اختیار کرے گی اور مردذات سے بدلہ لیگی۔ اسی خیال سے اُس نے ایک کمسن اور بیحد خوبصورت لڑکی کی پرورش کرنا شروع کر دی جسکا نام "ایسٹیلا" "ESTELLA" تھا تاکہ وہ مردوں سے ان کے دل کو توڑ کر اپنی مالکن کا بدلہ چکا سکے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنا تجربہ پپ پر کیا۔

"پمبل چک" نے پپ کا تعارف "مس ہے وشم" سے کرایا "مس ہے وشم" نے پپ کا ایسٹیلا سے تعارف کرا دیا اور چاہا کہ دونوں میں خوب پیار ہو جائے تاکہ وہ اسکے دل کو توڑ سکے۔ ایسٹیلا کی خوبصورتی کے چرچے "مس ہے وشم" پپ سے خوب کرتی تھیں۔ اب وہ اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے آیا کرتی تھی ایسٹیلا کے ہی یہاں ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس نے ایسٹیلا کے ایک اور چاہنے والے "ہربرٹ" (HARBERT) کو کشتی میں ہرا دیا۔ لیکن پپ اپنی اس فتح کے بدلے میں ایسٹیلا نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ اس واقعہ کے باوجود بھی وہ اس سے پیار کرتا رہا۔ وہ جتنا بھی ایسٹیلا کے بارے میں سوچتا اُتنا ہی اُسے اپنے قریب تر محسوس کرتا وہ ایسٹیلا کو حاصل کرنے کی غرض سے اپنے کو جلد سے جلد ایک مکمل انسان بنانا چاہتا تھا۔

ایک سال بعد پپ کو اپنے بہنوئی "جو گارگیری" کے پاس لوہار کا کام مل گیا "مس ہے وشم" نے پپ کو کام سکھانے کے لیے پچیس گنی دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ابھی وہ کام اچھی طرح سیکھ بھی نہ پایا تھا کہ اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے روپیہ ملنا شروع ہو گیا۔ پپ کو یہ خبر ایک وکیل "جیگرز" (JAGGERS) نے

سے دی لیکن مسٹر جیگرج نے پپ کو تعلیم کے لیے روپیہ دینے والے
کے نام کو بتانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تمھارا سرپرست تم کو ایک
مرد شریف کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے اور تم سے بہت سی
امیدیں وابستہ رکھے ہوئے ہے۔

پپ نے مسٹر جیگرج کے یہاں کام کرنا بند کر دیا اور پپ
کو لندن میں مسٹر "میتھیو" (MATHEW) کے پاس تعلیم حاصل
کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس نئے ماحول میں آنے کے بعد
پپ اپنے بہنوئی "جو" کو بالکل بھول گیا جو اب اکیلا رہ گیا تھا
پپ کی بہن بھی مر چکی تھی۔

پپ ہمیشہ یہی سوچا کرتا تھا کہ اس پر یہ شفقت اور مہربانی
کرنے والی "مس ہے ویشم" ہی ہیں۔ لیکن دراصل یہ شخص وہی
قیدی میگوچ تھا جو کہ آسٹریلیا (AUSTRALIA)
میں نیو ساؤتھ ویلس (NEW SOUTHWALES)
نام کی جگہ چلا گیا تھا۔ اور وہاں وہ بھیڑوں کا کاروبار کرکے امیر
آدمی بن گیا تھا۔ پپ لندن میں ایک شریف آدمی کی طرح زندگی
گذارنے لگا لیکن وہ "مس ہے ویشم" کے گھر جا کر ایسٹیلا
سے برابر ملا کرتا۔ اب اس کی دوستی لندن میں لوگوں سے بڑھنے
لگی خاص کر ہربرٹ سے اور جیگرج کے کلرک "ویمک"
(WEMMICK) سے۔

جب پپ ۲۳ برس کا ہوا تو اس کو ساری دولت دینے
کی غرض سے میگوچ لندن آیا۔ جب پپ کو یہ معلوم ہوا کہ اس
کی سرپرستی کرنے والا قیدی میگوچ ہے تو اس نے مزید روپے
لینے سے انکار کر دیا۔ اور میگوچ سے کہا کہ آپ اب یہ ملک چھوڑ
کر چلے جائیے۔ میں آپ کو حفاظت سے باہر بھیجنے کا بندوبست
کرتا ہوں اور یہ سفر آپ دریا میں کشتی کے ذریعے طے کریں گے۔

پپ کا ڈر درست ہی نکلا۔ میگوچ کا ایک قیدی ساتھی
"کمپیسن" (COMPEYSON) تھا جو میگوچ سے بغض اور
کینہ رکھتا تھا آخر کار یہ ہوا کہ جب میگوچ کو بھیجا جانے لگا تو
اسے گرفتار کر لیا گیا اور عدالت نے اس کو موت کی سزا دی
اس کی تمام جائیداد گورنمنٹ نے اپنے قبضہ میں لے لی اور
پپ پہلے کی طرح مایوس اور ناامید ہو گیا۔

پپ نے اپنے محسن اور سرپرست میگوچ کو حفاظت
سے باہر بھیجنے کا جتنا کام کیا اس پر پانی پھر گیا اور اسی سے
پپ قرضوں تلے دب گیا اب وہ اور بھی پریشانیوں میں مبتلا
ہو گیا طبیعت بھی خراب رہنے لگی۔ جب پپ کے بہنوئی "جو"
کو ان تمام باتوں کا حال معلوم ہوا تو وہ بھاگا ہوا پپ کے
پاس آیا اور اس کا تمام قرض چکایا اور اس کی تیمارداری کی۔

پپ اب تندرست ہو چکا تھا۔ تندرست ہونے کے بعد
سب سے پہلے "سٹیس ہاؤس" (SATIS HOUSE) میں
گیا۔ وہاں پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ "مس ہے ویشم" مر چکی
ہیں اور ان کی تمام جائیداد نیلام ہو چکی ہے۔ یہ سب دیکھنے
کے بعد وہ اپنے گھر گیا وہاں بھی اسے تازہ خبریں ملیں کہ "جو"
اور "بڈی" (BIDDY) کی آپس میں شادی ہو گئی ہے کچھ دن
وہاں رہ کر وہ پھر واپس آ گیا اور وہاں وہ اپنے دوست ہربرٹ
کے ساتھ ایک فرم میں کام کرنے لگا۔

گیارہ سال بعد وہ اپنے وطن پھر واپس آیا۔ وہاں اس نے
بہت تغیرات پائے "جو" کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہو
چکی ہے۔ پپ یہ تہیہ کر چکا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کنوارا ہی رہیگا
لیکن جب بڈی نے ایسٹیلا کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں نے
اس کے ماضی کے تمام رنگین خواب پھر سے ایک ایک کرکے گنوانے
شروع کر دیئے۔ اسی دوران میں ایسٹیلا کا بیرحم شوہر مر چکا
تھا۔ یہی نہیں بلکہ ایسٹیلا کا دل بھی بدل چکا تھا۔ اب وہ ماضی کی
بے درد ایسٹیلا نہ تھی بلکہ ایک درد آشنا محبت کی پیاسی
عورت تھی اس نے پپ سے شادی کی درخواست کی پپ نے
بخوشی منظور کر لی۔

پپ اور ایسٹیلا کی جدائی کا زمانہ ختم ہوا۔ وہ دونوں
اپنے پرانے ویران گھر سے نکلے جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی
تھی اور ایک نئی اور سنہری زندگی کی طرف چل پڑے

●●

ترک صحرا پہ نہیں ختم مرا عزم جنوں
توڑنی ہے ابھی دیوار گلستاں مجھ کو

جوشؔ ملسیانی

مزاحیہ

# آنرز روم

یوسف قریشی، متعلم دلی کالج دہلی

آئیے آپ کو دلی کالج کی لائبریری کے آنرز روم کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ایک روز ہمارا بھی دل چاہا کہ لائبریری سے فائدہ اٹھائیں اور وہاں جا کر تھوڑا بہت پڑھ لیں۔

خیر صاحب! لائبریری میں داخل ہوئے۔ اور سیدھے آنرز روم کی طرف رُخ کیا۔ کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ وہاں کا ماحول نسبتاً کچھ زیادہ پرسکون ہوگا۔

جیسے ہی ہم کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ چند سیٹوں کے علاوہ سب گھری ہوئی تھیں۔ بیچ میز پر اچھی خاصی کتابیں اور چند " Silence " لکھے ہوئے لکڑی کے بورڈ منتشر پڑے تھے۔ جن کو سب حاضرین بآوازِ بلند پڑھ رہے تھے۔ خاموشی میں سب کا مل کر ایک ساتھ " Silence " گنگنانا واقعی فضا میں ترنم پیدا کر رہا تھا۔ ہم یہ سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے ایک خالی کرسی کی طرف بڑھے۔ برابر بیٹھے ہوئے صاحب کو ہماری اِس حرکت پر بہت غصّہ آیا۔ اور ہماری طرف حقارت اور معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ ہم نے ان صاحب سے نہایت نرمی سے پوچھا۔

"کیوں صاحب! کیا بات ہے؟"

یہ سُن کر وہ بھڑک ہی تو گئے کہنے لگے۔

"آپ کو دکھائی نہیں دیتا کہ یہاں کوئی بیٹھا ہے۔ یہ اتنی کتابیں بھی آپ کو نظر نہیں آ رہی ہیں؟!"

بڑی حیرت ہوئی کہ کتابیں اپنے آپ کو خود پڑھتی ہیں! بہرحال شرمندہ منہ لئے، ہم ایک دوسری خالی کرسی کی طرف بڑھے۔ اور اپنی غلطی سے جو تجربہ ہوا تھا اس کی روشنی میں برابر والے صاحب سے پوچھا۔

"کیوں صاحب! کیا یہاں بیٹھ جائیں؟ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے؟"

یہ سُن کر انھوں نے ہماری طرف ایسے دیکھا، جیسے ہم کوئی فقیر ہوں۔ اور ان سے کھانے کے لئے سوال کیا ہو۔ انھوں نے بنا کچھ جواب دیئے سر اپنی کتاب پر جھکا لیا۔ اور یہ سوچ کر کہ "خاموشی نیم رضا ہوتی ہے!" ہم ڈرتے ڈرتے کرسی پر بیٹھ گئے۔

چند منٹ بعد فضا میں ایک زور کی 'کھٹ' ہوئی۔ اب جو دیکھا تو ایک صاحب نے Silence لکھا لکڑی کا بورڈ اپنی کتابوں کی لاٹ پہ دے مارا۔ اور باہر جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس پہ Silence نہیں "اللہ کے سپرد" لکھا ہے۔ تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کرسی سے کوئی آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ ایک صاحب نے کرسی کھسکائی ہے۔ ابھی دماغ میں اسی کی آواز گونج رہی تھی۔ کہ ایک صاحب بہت ہی خوش ہنستے، اچھلتے، کودتے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور آگے بڑھے۔ دو تین کتابیں شلف ہی میں الٹ پلٹ کیں۔ اور پھر دو کتابیں نکال کر کھٹاک سے کرسی پر براجمان ہو گئے۔ ابھی انھیں بیٹھے ہوئے آدھا ہی منٹ ہوا تھا۔ کہ وہ بجلی کی رفتاری سے اٹھے اور یہ جا وہ جا۔ خدا معلوم وہ کتابیں انھوں نے کس لئے اٹھائی تھیں۔ کیا یہ کوئی رسم تھی؟ جو انھوں نے ادا کی۔ جس کا انھیں ٹائیٹل دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

میرے برابر ہی دو لڑکے کسی بہت دل چسپ گفتگو میں محو تھے۔ قصّہ غالباً کسی صنفِ نازک کا تھا۔ کیونکہ دونوں کی دل چسپی کا ٹھکانا نہ تھا۔ اسی درمیان ان میں سے ایک صاحب کا قہقہہ نکلا۔ اب انھیں ذرا ادھر اُدھر کا خیال آیا۔ چور نظروں سے جو دیکھا۔ تو سب لوگ انھیں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے انگریزوں کا دیا ہوا ہتھیار استعمال کیا۔ یعنی Sorry کہا۔ اور چپ ہو گئے۔

ان سب باتوں نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کہ یہاں سے زیادہ سکون سبزی منڈی میں مل جاتا ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک دردناک چیخ سنائی دی۔ مگر فوراً ہی انکشاف ہوا کہ وہ چیخ نہیں بلکہ چھینک تھی۔ جو ایک سردار جی لے گئے تھے۔

بڑی حیرت ہوئی چھینک کیا تھی، ایک طوفان تھا، زلزلہ تھا، قیامت
تھی۔ اگر یہ واقعی چھینک تھی، تو یقیناً کوئی سالانہ چھینک تھی ممکن
ہے سردار جی سال بھر میں بس ایک ہی چھینک لیتے ہوں۔ اور اگلی
پچھلی ساری کسر پوری کر لیتے ہوں۔ اس چھینک سے کمرے کی فضا
بالکل بدل گئی جتنے لوگ وہاں موجود تھے سب سردار جی کی طرف
دیکھنے لگے۔ کچھ کو بہت سخت غصہ آیا۔ مگر جگہ کی نزاکت کا لحاظ رکھتے
ہوئے وہ غصے کو ٹھنڈے پانی کا گلاس سمجھ کر پی گئے۔ کچھ خالی خالی
نظروں سے ان کو دیکھنے لگے۔ اور اس کے برعکس کچھ لوگ تو اس
حرکت سے بہت خوش نظر آرہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
وہ آنکھوں آنکھوں میں "مکرر" کی درخواست کر رہے ہوں۔ سردار جی
سب لوگوں سے نظریں ملاتے، ہنستے ہنساتے کھیلتے کودتے،
اور میز کا چکر لگاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد
انکشاف یہ ہوا کہ چھینک سالانہ نہیں بلکہ روزانہ ہے۔ اور اکثر
دن میں ایک سے زیادہ بار آجاتی ہے۔ اور اس طرح سردار
جی وہاں بیٹھے ہوئے روتے دلوں کو ہنساتے اور سنجیدہ
دلوں کو رلا جاتے ہیں۔ سردار صاحب کے باہر چلے جانے
کے کچھ منٹ بعد تک ان کی شان میں قصیدہ و مرثیہ دونوں
ہوتے رہے۔ اور پھر سب لوگ پڑھنے لگے۔

ایک سین اور ملاحظہ فرمائیے۔

سامنے کی تین سیٹوں پر تین صاحب جن کا تعلق غالباً
کامرس ڈیپارٹمنٹ (Commerce Dept.) سے تھا،
اپنا حساب کتاب کھولے ہوئے تھے۔ بیچ والے صاحب
باقی دونوں کو غالباً حساب کا کوئی سوال سمجھا رہے تھے۔
مگر ان کی صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ابھی وہ خود
اس mood میں ہیں کہ انھیں کوئی سوال سمجھائے۔
حساب کتاب کے اس شور و غل نے ایک صاحب کی
رگ برداشت کو برداشتہ کر دیا۔ انھوں نے انگریزی
میں ان سے خاموش رہنے کی درخواست کی۔ جو رد کر دی گئی۔
مگر بات آگے بڑھ گئی۔ اور تو تکار تک نوبت آپہنچی۔
ملی جلی انگریزی اور شریفانہ اور غیر شریفانہ انداز میں لڑائی ہونے
لگی ملاوٹ والی انگریزی سن کر میرے ذہن میں فرقت
کاکوروی صاحب کا ایک مصرعہ گونج گیا۔ اور میں مسکرانے
لگا۔

ع ۔ ہندی میں انگلش بولئے

اس کے علاوہ وہاں جو نظارے مجھے دیکھنے کو ملے۔ وہ
کچھ اس طرح تھے۔

ایک صاحب نے برابر والے صاحب سے پوچھا۔
"Excuse me ۔ آپ یہاں کب تک بیٹھے ہیں؟
یہ کتابیں رکھی ہیں۔ میں ابھی آیا۔"
مگر صاحب اچھا ہے کوئی قسم لے لیجئے۔ ہم نے پھر انھیں
واپس آتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک صاحب نے کمرے کے دروازے سے ہی وہاں
بیٹھے ہوئے چند لوگوں کو اتنی زور سے Hallo کیا، کہ
سب کا مطالعہ دھرا رہ گیا۔ مگر وہ سب لوگوں سے بے نیاز
و بے پرواہ آگے بڑھ گئے۔

ایک صاحب نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے صاحب سے
زور سے پوچھا:۔
"حامد صاحب! پانچویں پیریڈ میں کتنی دیر ہے؟
کیا تم attend کروگے؟"
پھر وہ خود ہی بولے۔
"چھوڑو میاں کون بھئی attend کرے۔ مسٹر شرما
بور کرتے ہیں۔"
اب آپ ہی بتائیے وہ خود کسے بور کر رہے تھے۔

کمرے میں ہی ایک فلمی لیلیٰ مجنوں ایک دوسرے سے
شکوے شکایت کر رہے تھے۔ جن کو دیکھنے کے لئے تماشائی
بھی وہاں موجود تھے۔

اسی درمیان لائبریری کے کارکنان میں سے ایک صاحب
اندر تشریف لائے۔ ان کو دیکھ کر وہاں والوں پر وہ کیفیت
طاری ہوئی جو چینی کی بلیک مارکیٹ کرنے والوں کی راشننگ
انسپکٹر (Rationing Inspector) کو دیکھ کر ہوتی ہے۔
بات تھی بھی کچھ ایسی ہی۔ اس وقت وہ کسی انسپکٹر سے کم نہ
تھے۔ کسی دل جلے نے جس کو کمرے میں باوجود آرٹس کا اسٹوڈنٹ

ہونے کے سیٹ نہیں ملی تھی۔ بآلآخر شکایت کردی تھی۔ تلاشی لینے پر لائبریری انسپکٹر کو پتہ یہ چلا کہ وہاں پر موجود لوگوں میں سے صرف تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کے پاس ہی Identity card موجود تھا۔ یہاں ہم آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ لائبریری میں داخلے کے لئے Identity card لازمی ہے۔ پانچ طالب علم ایسے بھی برآمد ہوئے، جن کا تعلق Pass Course سے تھا۔ اور وہ وہاں ناجائز طور پر تشریف فرما تھے۔

اس کے بعد جو ہوا اس کی تفصیل لکھنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جن لوگوں کو انسپکٹر صاحب اپنے ساتھ آنرز روم سے باہر لے گئے وہ شاید اس مصرعہ کو مزید یاد کر رہے ہوں۔

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

کمرے میں ہی ایک صاحبہ اپنی سہیلی کے کپڑوں، اور Combination کی تعریف کر رہی تھیں۔

ایک اور صاحبہ بھی اپنی سہیلی سے رازدارانہ طور پر یہ جو ہم نے اتفاق سے سن لیا، بتا رہی تھیں کہ سکنڈ ایر کا کوئی لڑکا انھیں آتے جاتے دیکھ کر ہنستا ہے۔

قصہ مختصر وہاں وہ ماحول تھا جو کسی تفریح گاہ یا اور کسی پبلک پلیس (Public Place) پر ہوتا ہے۔ باتیں ہی باتیں باتیں ہی سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کو کسی کے Disturb ہونے، گھورنے، غصہ کرنے یا برا ماننے کی پرواہ نہیں تھی۔ نہ معلوم کہاں کہاں کے قصے چھڑے ہوئے تھے۔ اور لوگ آتے تھے۔ بیٹھتے تھے۔ (آرام کرتے تھے) اور چلے جاتے تھے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے یہ شعر یاد آ گیا۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور سارے جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

یہ سب مناظر جو میں نے وہاں دیکھے ان سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ غلطی سے کسی نے آنرز روم کا بورڈ کامن روم کے دروازے پر لگا دیا ہے۔

●●

دشمنِ مومن ہی رہے بت سدا
مجھ سے میرے نام نے یہ کیا کیا!

# آسٹریلوی ٹیم کا دورۂ ہند ——— قمر عالم

آسٹریلوی ٹیم نے نومبر ۱۹۶۹ء سے دسمبر ۱۹۶۹ء تک ہندوستان کا دورہ کیا۔ اور پانچ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ جس میں سے تین آسٹریلیا نے، ایک بھارت نے جیتا۔ اور ایک میچ برابر رہا۔

آسٹریلوی ٹیم کا دورۂ ہند بہت اہمیت رکھتا تھا۔ کان پور کا ڈرا اور دلی ٹیسٹ نے آسٹریلوی ٹیم کو اس کا احساس کرادیا کہ ہندوستانی بلے باز آسٹریلوی باؤلرز کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ وشواناتھ اور اجیت واڈیکر کی بلے بازی ان کے لئے چیلنج تھی۔ میلٹ اور گلیسن کی باؤلنگ دلی کے ٹیسٹ میں ناکام رہی۔ اور بھارت نے جس طرح دلی ٹیسٹ جیتا۔ اس نے بھارتی کھلاڑیوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کردیا کہ وہ ہر شکل میں ہمت سے ہر چیلنج کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ مگر جس طرح بھارت نے دلی ٹیسٹ جیتا تھا۔ اسی طرح وہ کلکتہ ٹیسٹ ہار گیا۔ اور کمزور بلے باز اور فیلڈنگ نے شکست کے کنارے لا کھڑا کیا۔ کلکتہ میں بھارتی ٹیم اپنا کھیل نہ دکھا سکی۔ اور نہ ہی ان کی بلے بازی اور باؤلنگ کارآمد ثابت ہوئی۔

اس ٹیسٹ سے پبلک کو بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ اور امید تھی کہ بھارتی ٹیم مدراس میں اچھا کھیل دکھائے گی۔ مگر ۲۴۹ رن کے لیڈ نے بھارتی ٹیم کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ پہلی اننگ میں تو پٹودی نے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ مگر ۱۵۳ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پہلی اننگ میں ۹۵ رن کی لیڈ رہی۔ دوسری رننگ میں بھارتی ٹیم کی بہترین باؤلنگ نے یہ احساس تو پیدا کردیا تھا کہ بھارت یہ میچ جیت سکتا ہے۔ مگر ریڈ پاتھ کی شاندار بلے بازی آسٹریلوی ٹیم کو ہار سے بچا لے گئی۔ اور بھارت کے لئے ۲۴۹ رن کی لیڈ چھوڑ دی۔

بھارتی ٹیم نے کھیل کی شروعات کی ہی تھی کہ جلد ہی اس کے دو دوالی چیتن چوہان اور اشوک منکڈ ایک اور گیارہ کا مجموعی اسکور بنا کر آؤٹ ہوگئے۔ مگر وشواناتھ اور اجیت واڈیکر کی شاندار بلے بازی نے پھر سے یہ احساس دلانا شروع کردیا کہ اگر بھارتی بلے باز اسی طرح کھیلتے رہے تو بھارتی ٹیم اس میچ کو جیت لے گی۔ وشواناتھ اور واڈیکر نے مل کر ۱۰۲ رن بنائے مگر واڈیکر کیچ آؤٹ ہوگئے۔ واڈیکر کا وکٹ گرنا تھا کہ بھارتی ٹیم کے وکٹ ایک کے بعد ایک گرنے شروع ہوگئے۔ میلٹ اور میکنزی نے شاندار باؤلنگ کرکے بھارتی ٹیم کو ۱۷۱ رن پر آؤٹ کردیا۔ اور اس طرح آسٹریلیا نے یہ پانچواں میچ ایک کے مقابلہ تین سے جیت لیا۔ جس میں ایک برابر رہا۔

کپتان پٹودی نے ٹیسٹ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "ہم نے ایک اور موقع کھو دیا۔ ہماری فیلڈنگ اچھی نہیں ہوئی"۔ اگر بھارتی ٹیم اچھی فیلڈنگ کرتی، تو امید تھی کہ میچ جیت لیتی۔ کئی اچھے کیچ ہمارے کھلاڑی نہ پکڑ سکے۔ جو کہ کارآمد ثابت ہوتے۔ بھارتی بلے باز ہمت اور اطمینان سے کھیلے تو اچھا اسکور کرسکتے تھے۔ اور میچ جیت سکتے تھے۔

آسٹریلوی ٹیم میں سب سے زیادہ اسکور چیپل کا رہا۔ اس کے علاوہ آسٹریلوی ٹیم کے کھلاڑی نے اس سیریز میں چار سنچریاں ماریں۔ جن میں اسٹیکپول (۱۰۳) پال شیہن (۱۱۴) چیپل (۱۳۸) اور والٹرس (۱۰۲) شامل ہیں۔

تین ہندوستانی بلے بازوں نے ۹۰ سے اوپر اسکور کیا۔ ان میں کپتان پٹودی ۹۵ رن بمبئی ٹیسٹ میں، اشوک منکڈ ۹۷ دہلی میں اور اجیت واڈیکر ۹۱ (ناٹ آؤٹ) ہیں۔

بھارتی کھلاڑی وشواناتھ نے سنچری بنائی۔ جس میں انھوں نے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اس سیریز میں پانچ پارٹنرشپ سو سے اوپر ہوئیں۔ جس میں بھارت اور آسٹریلیا دونوں شامل ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ رن چوتھے وکٹ پر کپتان پٹودی اور اشوک منکڈ نے بنائے جو کہ ۱۴۶ تھے۔

بمبئی میں کھیلے گئے اس میچ کی یہ خصوصیت تھی کہ اس نے پٹودی اور سورتی کی پہلی ۱۲۸ رن کی پارٹنرشپ کے ریکارڈ کو توڑ دیا۔ جو کہ برسبین میں ۶۸-۱۹۶۷ء میں کھیلا گیا تھا۔

بھارتی باؤلرز میں بیدی کی باؤلنگ مجموعی طور پر سب سے اچھی رہی۔ جب کہ بیدی نے ۲۱ اور پرسنا نے ۲۶ وکٹ لئے۔ پرسنا نے ۲۶ وکٹ ۶۷۲ رن دے کر اور بشن سنگھ بیدی نے ۳۴۲ رن دے کر لئے۔ باقی وکٹ سورتی۔ امرناتھ سولکر اور گوہا نے لئے۔

بھارتی بلے بازمیں سب سے زیادہ رن وشواناتھ نے بنائے اور اسی طرح بالترتیب واڈیکر، منکڈ، سولکر، پٹودی اور انجنیر کی بیٹنگ اچھی رہی۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| وشواناتھ | 47.41 | امرناتھ | 16.00 |
| واڈیکر | 37.83 | امرائے | 12.33 |
| منکڈ | 35.70 | سرڈیسائی | 11.50 |
| سولکر | 29.67 | اگھون | 10.8 |
| پٹودی | 24.44 | گنڈوترا | 10.50 |
| انجینیر | 23.40 | بورڈے | 10.00 |
| بیدی | 17.25 | چوہان | 10.00 |
| سورتی | 8.50 | سرسنا | 8.62 |
| گوہا | 4.00 | عابد علی | 2.50 |

آسٹریلوی بلے بازوں میں سب سے زیادہ چیپل کا اسکور رہا۔ اس کے بعد اسٹیکپول، والٹرس اور ریڈپاتھ نے اچھا اسکور بنایا۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| چیپل | 46.28 | کونولی | 16.00 |
| اسٹکپول | [illegible]6.00 | مشین | 11.50 |
| والٹرس | [illegible].86 | میلٹ | 10.33 |
| ریڈپاتھ | [illegible] | میٹیر | 10.14 |
| لاری | 34.14 | میکنزی | 9.86 |
| فری مین | 29.00 | گلیسن | 3.76 |
| شیہن | 28.85 | | |

وشواناتھ اور چیپل تناسب کے حساب سے دونوں ٹیموں میں اونچا مقام پا گئے۔ اور اس سیریز میں وشواناتھ سب سے آگے نکل گئے۔
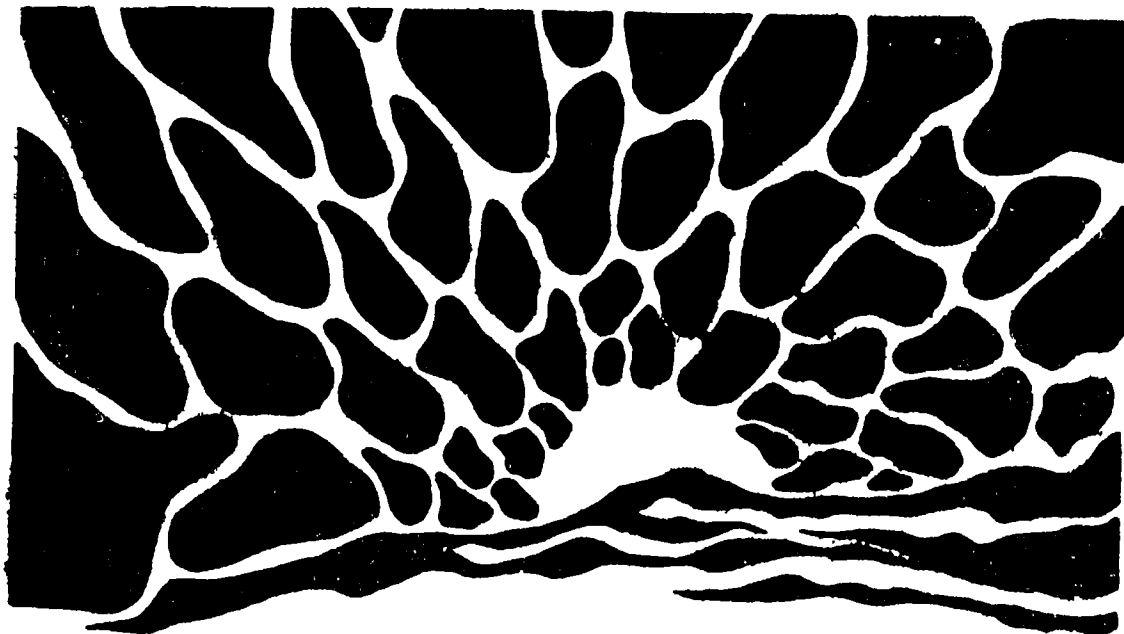
آسٹریلوی باولرز میں میلٹ نے سب سے زیادہ وکٹ لئے۔ انھوں نے ۴۔۲۹۸ اوور پھینکے جن میں ۱۲۸ میڈن رہے۔ اور ۵۳۵ رن دے کر انھوں نے ۲۸ وکٹ لئے۔ جبکہ بھارتی کھلاڑی پرسنا نے ۲۸۶ اوور پھینکے۔ جن میں ۱۰۷ میڈن رہے۔ اور ۶۷۲ رن دے کے صرف ۲۶ وکٹ لئے۔ اس طرح میلٹ نے اس سیریز میں اچھا مقام پیدا کر لیا۔ ان کے علاوہ مکنزی نے ۲۱ وکٹ لئے۔ جب کہ انھوں نے ۲۔۲۴۲ اوور پھینکے جن میں ۷۳ میڈن رہے اور ۳۴۳ رن دیئے۔ ان کے علاوہ کونولی نے ۱۷ وکٹ۔ اسٹیکپول نے ۳ وکٹ۔ اور میٹین نے بالترتیب ۳ وکٹ لئے۔ ان کے علاوہ آسٹریلیا کی طرف سے چیپل، والٹرس اور لاری نے باؤلنگ کی۔ مگر کوئی وکٹ نہیں لیا۔

بھارتی ٹیم کی طرف سے عابد علی، منکڈ، وشواناتھ، اشوک گنڈوترا، واڈیکر اور پٹودی نے باؤلنگ کی مگر کوئی وکٹ نہیں لیا۔

---

آسٹریلوی ٹیم کے کپتان لاری مشہور کارٹونسٹ محمد حیدر کی نظر میں۔

# اُن کے نام

اس عنوان کے تحت قارئین شاہجہاں کے وہ پیغامات شائع کئے جاتے ہیں جو "وہ کسی" کو بھجوانا چاہیں ـــــ پیغام خواہ رومانی ہوں یا جذباتی۔ مگر ارسال کرتے وقت خیال رہے کہ تہذیب وادب کے دائرے میں ہوں۔

ـــــ گنگا کا یہ کنارہ ـــــ خاموش یہ فضائیں۔
ایسے میں کاش تم بھی ـــــ میرے قریب ہوتے
کچھ انتظار ہوتا
ذکرِ شباب ہوتا

رام ناتھ کول۔ نئی دہلی
متعلم میرٹھ یونیورسٹی

---

تم نے کہلوا دیا ہے کہ میں تم کو اور خط نہ لکھوں۔ اور نہ ہی تم سے ملنے کی کوشش کروں ـــــ تمہارا بڑا احسان ہوتا۔ اگر تم اس کے ساتھ ایک زہر کی پڑیا بھی بھیج دیتیں ـــــ یہ کہتے ہوئے کیا تم کو یہ خیال نہ تھا کہ اگر میں نے تم کو خط نہ لکھا ـــــ تم سے نہ ملا ـــــ تو زندہ نہیں رہ سکتا ـــــ اگر مجھ کو اپنی زندگی میں تمہارا سہارا نہ ملا تو میں اپنی زندگی کو موت کے حوالے کر دونگا ـــــ اب آخری بار سنو! یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ اگر تم نے اس کا بھی جواب نہ دیا تو خدا کی قسم تم مجھے کبھی دیکھ نہیں پاؤ گی۔

اے۔ رحمان
دلی کالج دہلی

---

آج میں یہ راز تم پر آشکارہ کرنے کے لئے مجبور ہوں کہ میرا تمہاری طرف مائل ہونا ـــــ تم پر جان چھڑکنا ـــــ کالج

---

میں تمہارے ساتھ رہنا ـــــ اور تم سے محبت کرنا ـــــ یہ ان دو محبت کرنے والوں کی محبت نہیں جس کا اختتام ہو ایک گھوڑے پر ہوتا ہے اور دوسری ڈولی میں ـــــ اس کے برعکس میری محبت اس پاک محبت پر مبنی ہے جس کے اختتام پر ایک ڈولی میں ہوتی ہے اور دوسرا پرنم آنکھوں سے اپنی بہن کو جدا کرتا ہے ـــــ

شاہدہ پروین علی گڑھ
طالبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

---

میں نے سنا ہے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اسی وقت سے بے چین ہوں ـــــ میں عیادت کے لئے آنے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہا ـــــ خدارا تم ہی کوئی ملنے کی تدبیر کرو ـــــ تاکہ پریشانی ختم ہو سکے ـــــ

عبداللطیف علی گڑھ
متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

---

دوست تم کل بھی نہیں آئے۔ اور حسبِ عادت تم نے وعدہ نبھانے کی عادت کو برقرار رکھا ـــــ تمہاری انہی عادتوں کے سبب اگر میں تم کو "مدگنوار" کہتا ہوں تو کیا غلط ہے ـــــ تم جانتے ہو کہ آج وقت کی کیا قیمت ہے ـــــ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے ـــــ

کیا تم اس آدمی کی بے چارگی اور مجبوری کا اندازہ لگا سکتے ہو جو کسی کے انتظار میں تیار بیٹھا ہو ——— اور خاص طور پر جب مقررہ وقت بھی گذر چکا ہو ——— کیونکہ اس وقت اس کی حالت نہایت قابلِ رحم ہوتی ہے ——— وہ نہ دین کا ہوتا ہے۔ اور نہ دنیا کا ——— خدا کرے یہ موٹی سی بات تمہاری "گنوار" اور "اُجڈ" عقل میں داخل ہو سکے۔

محمد یوسف خان دہلی
متعلم دلّی یونی ورسٹی دہلی

---

عید کے دن جو تم نے سوئیوں میں چینی کے بجائے نمک ڈال کر بھجوایا تھا اور میں بھی محترم چچا جان کے احترام اور تمہاری شرارت کو ناکام بنانے کے لئے جان بوجھ کر کھاتا چلا گیا ——— تمہارا خیال تھا کہ میں ایک چمچہ کھا کر پیالہ رکھ دوں گا۔ اور آخ تھو، آخ تھو کرتا ہوا باہر دوڑوں گا ——— مگر میں نے ایسا نہیں کیا ——— جانتی ہو کیوں ———؟ اس لئے کہ باہر جا کر بھی تم سے ملاقات نہ ہوتی ——— بلکہ اور دور ہو جاتا ——— کیونکہ مجھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ تم باہر نہیں ہو بلکہ وہیں کمرے میں ایک پردے کے پیچھے چھپی اپنی شرارت کی کامیابی پر فخر کرنے اور میرے منہ کے زاویے کے نظارے کے لئے کھڑی تھیں ———

محمد حسین دہلی
متعلم میرٹھ یونی ورسٹی

---

اس دن جب میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ تمہارے گھر گیا ——— اور تم نے اپنا جذبۂ مہماں نوازی بروئے کار لاتے ہوئے "کافی" سے تواضع کی ——— اس کے لئے ہم بے انتہا ممنون ہیں ——— شکریہ

محمد جمیل خاں دہلی
متعلم دلّی یونی ورسٹی دہلی

# مشورے

معروف الحسن صدیقی (متعلم دلی یونیورسٹی دہلی)

زندگی تشنہ کام ہوئی جاتی ہے
داستانِ محبت عام ہوئی جاتی ہے
بہتر ہے ہوش و خرد کی منزل سے گذر جا
یہ ہوش و خرد دام ہوئی جاتی ہے

---

نا سوچ انجام محبت کیا ہو گا
فکر کی حد سے گزر بہاروں پہ نظر کر
شبِ سیاہ کی موت ہے تابندہ صبح
طوفان کی گود میں رہ کناروں پہ نظر کر

---

راہ محبت میں کوئی نہیں راہ رو
اس منزل سے ہمیں تنہا گذرنا ہو گا
تو رفیقِ سفر اور میں فرشِ راہ گذر
اک ساتھ ہی جینا ہے ساتھ ہی مرنا ہو گا

---

یوں نظر اُٹھا کہ دستِ قاتل میں
لرزتی ہوئی شمشیر پگھل جائے
تیرا عمل وہ عمل ہو جس سے
کاتبِ بخت کی تحریر پگھل جائے

---

# افکارِ نو

تبدیلیٔ رجحانات کے پیشِ نظر لوگ یہ جاننے کیلئے بے چین ہیں کہ آج کا جوان ذہن، زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کس زاویے سے دیکھتا ہے ۔۔ کس انداز سے سوچتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کو کس طرح گذارنا چاہتا ہے ۔؟ طلبہ چونکہ جوان ہوتے ہیں اور انکے رجحانات کے حامل بھی ۔ اسی لئے ان کے افکار و رجحانات کی ترجمانی کیلئے یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے ۔ زیرِ نظر شمارے میں محمد رفیع چمن (دہلی کالج دہلی) کے خیالات شامل ہیں آیندہ کے لئے دوسرے ساتھیوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب لکھ کر بھیجیں نیز یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جوابات مختصر اور جامع ہوں اپنے جوابات کے ساتھ اپنا نام کلاس کالج/یونیورسٹی اور گھر کا پتہ ضرور لکھیں ۔ ——— ۔ ادارہ

نوٹ :۔ صاحبِ الرائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں ہے ۔

اپنے خطوط اس پتے پر بھیجیں : (افکارِ نو) ماہنامہ شاہجہاں، گلی قاسم جان بلیماران دہلی ۶

---

س :۔ ہندوستان میں رائج طریقۂ تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے میں آپ کیا کیا چیزیں ضروری سمجھتے ہیں اور کیوں ۔؟

جواب :۔ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم انتہائی ناقص ہے ۔ اور طلباء کی بے چینی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کیونکہ کسی طالب علم کو تعلیم ختم کرنے کے بعد کسی نوکری کی امید نہیں ہوتی لہٰذا وہ ذہنی طور پر پریشان رہتا ہے اور یہی پریشانی اسکو غلط راستے پر ڈالتی ہے ۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ حکومت تعلیم کے دوران کچھ دستکاریاں بھی سکھانے کا انتظام کرے اور سالانہ امتحان کو ختم کرکے سال بھر کی کارکردگی پر پاس یا فیل کیا جائے ۔ اسطرح طالب علم سال بھر محنت کریگا ۔ یہ نہیں کہ امتحان سے تین مہینے پہلے سال بھر کا کورس پڑھا اور امتحان دیدیا ۔

س :۔ بے روزگاری کو ختم کرنے میں حکومت اور نوجوانوں کا کیا کردار ہونا چاہیے ۔۔۔۔ ؟

جواب :۔ بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نوجوان دستکار بنیں اور کرسی پر بیٹھ کر ہی کام کرنے کا خیال ترک کرکے ملک کی ترقی میں نمایاں کام انجام دیں اور حکومت کو چاہیئے کہ وہ نوجوانوں کیلئے دستکار بنتے ہی آسانیاں مہیا کرے اور ان کو ہر طرح کا تعاون دے

س :۔ کیا شادی کرنے میں والدین کی مداخلت ضروری ہے ۔؟

جواب :۔ میری نظر میں والدین کی مرضی ضروری نہیں ۔ کیونکہ آئندہ زندگی لڑکے اور لڑکی کو گذارنی ہے نہ کہ والدین کو ۔۔۔ لیکن پھر بھی ماں باپ کی مرضی اگر مل جائے تو سونے پر سہاگہ بصورتِ دیگر لڑکے اور لڑکی بغاوت کرنے میں حق بجانب ہیں ۔

س :۔ ایک بیوی کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے یا نہیں ۔؟

جواب :۔ یقیناً بیوی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے ایک لڑکا کا میاب بیوی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ وہ پڑھی لکھی ہو کیونکہ اس طرح وہ بچوں کی پرورش و پرداخت پر خصوصی توجہ دے سکتی ہے ۔ دوسرے موجودہ مہنگائی کے دور میں وہ نوکری کرکے اپنے گھر کی اقتصادی حالت اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں شوہر کے ساتھ تعاون کر سکتی ہے

س :۔ عشق کی کامیابی آپکی نظر میں جسمانی اتصال ہے یا ذہنی ارتباط ۔۔۔ ؟

جواب :۔ میری نظر میں تو عشق کی کامیابی ذہنی ارتباط ہے ۔ مگر آج کے سائنسی دور نے جسمانی اتصال کے حامیوں ہی کے لئے کامیابی کے راستے ہموار کئے ہیں ۔

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

پی این بی میں آپ کی بچت کے باعث ...
زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قرضوں کی
سہولتیں دی جا رہی ہیں

ان کے
باورچی خانے
کی ضروریات
کے لیئے

ان کے
دواخانوں میں کام آنے
والے آلات کی
خریداری کیلیئے

ان کا
کاروبار بہتر بنانے اور
خریداروں کو اچھی
خدمات مہیا کرنے کیلیئے

ٹرانسپورٹ آپریٹروں کو

نئے
اسکوٹر اور نئی ٹیکسی
گاڑیاں
خریدنے کیلیئے

ماہروں اور انجنیئروں کو

نئے نئے
پروجیکٹ شروع
کرنے کے
لیئے

اگر بالفرض محال، اوپر کی فہرست میں آپ کا شمار نہیں ہوتا مگر آپکو مالی دشواریوں کا سامنا ہے تو آپ ہم سے فوراً ملیئے۔ ملک بھر میں آپ کی خدمت بجا لانے کیلیئے ہماری چھ سو سے زیادہ شاخیں موجود ہیں

بچت کیجیے... زیادہ سے
زیادہ پی این بی میں
اپنا روپیہ بچایئے

**پنجاب نیشنل بینک**

۱۸۹۵ء سے لگاتار قومی خدمت انجام دے رہا ہے

کسٹوڈین : ایس، سی، تریکھا

قارئین شاہجہاں کے خطوط کے اقتباسات شائع کئے جاتے ہیں ___ ہم ان اساتذہ اور ساتھیوں کے بے حد شکر گذار ہیں۔ جنھوں نے ہمیں بذریعہ ڈاک یا براہ راست اپنی رائے اور مفید مشوروں سے نوازہ ___ ادارہ

ماہنامہ "شاہجہاں" کے پچھلے تین ماہ کے شمارے نظر نواز ہوئے یوں تو ہندوستان کے طول وعرض میں ہر میعاد و منصب کے اردو رسائل و جرائد کی کمی نہیں لیکن یہ رسالہ طلباء و طالبات کے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنیکی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے' علمی ادبی کساد بازاری کے اس دور ایسے زمانہ میں جس میں قحط الرجال ہو آپکا یہ حوصلہ مند اقدام ہر طرح سے مستحسن اور ہر اعتبار سے ستائش و تعریف کا مستحق ہے' یہ ایک تمدنی و ثقافتی بحران اور افراتفری کا دور بھی ہے' ضرورت ہے کہ نوجوان ذہنوں کی رہنمائی صحیح اور مناسب خطوط پر کیجائے' امید ہے کہ "شاہجہاں" کے ذریعہ یہ اہم فریضہ بھی ادا ہو جائے گا۔

مجھے نثر کے حصہ کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے اس وقت میرے معروضات کا تعلق شعری حصہ سے ہے جسے میں "شاہجہاں" کے مجموعی معیار سے فروتر پایا۔ پچھلے کسی شمارہ میں جو غزلیں اشاعت پذیر ہوئی تھیں ان میں بحور و اوزان کی غلطیاں تھیں۔ اس جانب اگر خاطر خواہ توجہ نہ دیگئی تو بحور و اوزان اور فن و عروض کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ ہاں آپکے رسالہ کی علمی و ادبی شہرت پر غلط اثر پڑ سکتا ہے۔

اس رسالہ کو صرف افسانوں اور انشائیوں ہی تک محدود نہ رکھئے بلکہ اس میں ایسے مقالات و مضامین بھی شائع ہونے چاہئیں جو کہ ہمارے موجودہ ہمارے قوم کی تاریکیوں کو دور کر سکیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی ایسا کوئی نازک موقع آیا ہے تو شعراء و ادباء نے ایک عظیم کردار ادا کیا ہے' یہ شعراء و ادباء آپ ہی میں سے پیدا ہونگے اور آپ ہی کے ہاتھوں میں مستقبل کی شان کار ہوگی' اپنی نگاہوں کے سامنے علم و فن اور حیات انسانی کا وہ معیار اعلیٰ رکھیئے جسے اپنا کر گدائے میکدہ بھی فلک پر ناز اور ستاروں پر حکم کرتا ہے'۔

آخیر میں اقبال کے دو شعر سن لیجئے جو شاید میرے مافی الضمیر کا کسی حد تک اظہار کر سکیں ؎

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است
بال بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

دگر است آں کہ برد دانہ افتادہ زخاک
آنکہ گیرد خورش از دانہ بر وین دگر است

اچھا اب اجازت دیجئے۔ فقط والسلام۔

خاکسار سید غلام سمنانی
دہلی کالج (ایوننگ) دہلی

● ___ آج کے سائنسی و ترقی یافتہ دور میں جبکہ فاصلوں کو گیا وقت کے لمحات کو بھی سکیڑ کر رکھ دیا گیا ہے ___ تو ایسے دور میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہے ___ لہٰذا شاہجہاں کے مطالعہ کے وقت مضامین تلاش کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ بچ سکتا ہے اگر آپ شروع یا آخر میں مضامین کی ایک فہرست بھی شامل کر دیں۔

-

ایم ظفر بخشی متعلم دلی کالج (ایوننگ) دہلی
رام ناتھ کول - متعلم میرٹھ یونیورسٹی
صلاح الدین - حیدرآباد
- - - - - اور بہت سے ساتھی

نوٹ:۔ اس ماہ سے فہرست شائع کیجا رہی ہے ___ ادارہ
آئیے صفحہ ۳۸ پر

بقیہ — میں بھی حاضر تھا وہاں۔

آخر میں صدر محترم نے حافظ منیر اور ساجد میاں کے مقالوں کے تشنہ گوشوں پر روشنی ڈالی اور فنکشن کی کامیابی پر تمام طلبہ کا شکریہ ادا کیا اور بعد میں حاضرین کو لجنۃ الادب کی طرف سے پرتکلف چائے پیش کی گئی۔ اس طرح تقریباً ڈھائی گھنٹہ کامیابی سے چلنے کے بعد یہ دلچسپ نشست ختم ہوئی۔

●

اگر آپ کے اسکول / کالج میں
شاہجہاں
نہیں جاتا — تو ہمیں اس کا
نام، پورا پتہ اور وہاں کے اردو
طلبہ کی تعداد لکھ کر بھیجیں۔
— ہم ممنون ہوں گے۔
ادارہ



● —— جنوری کا شمارہ دیکھا۔ اس بار مضامین اور دوسری تصانیف کا معیار پہلے سے بہتر ہے — دوسرے اس بار شاہد احمد کی لکھی ہوئی رپورتاژ پڑھنے کو ملی۔ ایسے مضامین کو زیادہ جگہ دیں جو دلچسپ بھی ہوں اور سود مند بھی ——

شمس الحق — متعلم جامعہ کالج نئی دہلی

● —— شاہجہاں کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا کتابت کی غلطیاں اب بھی کچھ ایسی ہیں جو نظر کو کافی ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ گزارش ہے کہ انکی طرف خاص توجہ دیں۔ مضامین ویسے خاصے دلچسپ ہیں۔ سید مظفر سعید کا افسانہ "دل ہی تو ہے" اور شاہد احمد کا رپورتاژ بہترین ہے شمیم اب تک "پیراہن جاں اپنا" کا فی پسند آئے۔ میری طرف سے مبارکباد —

صوفیہ سلطانہ — علیگڑھ

● —— جنوری کا شمارہ دیکھا — شاہجہاں طلباء کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں جو رول ادا کر رہا ہے وہ قابل ستائش ہے — اس بار مضامین معیاری بھی ہیں اور دلچسپ بھی خاص طور پر شاہد احمد کا رپورتاژ اور سید مظفر سعید کا افسانہ اس شمارے کی جان ہیں۔

مہتاب احمد جامعہ کالج دہلی

● —— تازہ شمارہ پڑھا۔ یقیناً یہ پہلے سے نہ صرف اچھا ہے بلکہ بہت عمدہ ہے اور جہاں تک مضامین وغیرہ کا تعلق ہے تو میں یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ

گلشن سے شمیم آخر کس طرح گزر جائیں
ہر پھول یہ کہتا ہے میں پیار کے قابل ہوں

کیونکہ ناہید تاج کی "گلشن" مظفر سعید کا "دل" اور شاہد احمد کا "پیراہن" سب ہی نہ صرف دلچسپ اور معیاری ہیں بلکہ دل پر بھی اثر کرنے والے ہیں۔

نجم الرزیا شمیم — علیگڑھ

---

(باقی افکار نو ۳۵ سے آگے)

س: کیا طلبا کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے ؟
جواب: جی نہیں — طلبا صرف طلبا ہیں جن کا کام صرف پڑھنا ہے۔ انھیں سیاست کے سایے سے بھی بچنا چاہیے — (محمد رفیع چمن متعلم بی اے سکنڈ ایر، ذاکر حسین کالج)

گھر کا پتہ: ۱۴۱۹ روڈ گران اسٹریٹ لال کنواں دہلی ۶

...ئب اعزازی نے زینت بخشی.

... سے پہلے فنکشن کے انعقاد میں تاخیر کا سبب بتاتے ہوئے اسپیکر انیس الرحمٰن نے کہا کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے اس فنکشن کو دو مرتبہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس لئے اتنی زیادہ تاخیر ہو گئی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آج کے اس فنکشن سے سامعین مستفید اور فیضیاب ہوسکیں گے۔ آخر میں انھوں نے حافظ ضمیر الدین متعلم عربی آنرز سیکنڈ ائر کو اپنا مقالہ "دنیا میں عربی زبان کی اہمیت" پڑھنے کی دعوت دی — انھوں نے انگریزی میں لکھے اپنے مقالے کو نہ صرف نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھا بلکہ مقالے کے اختتام پر رضوان الحق، عبد اللہ اسلم اور راقم الحروف کے اشکالات کے جوابات نہایت برجستگی کے ساتھ بہت شستہ انگریزی میں دیے۔

اس کے بعد ام۔اے۔ پریویس کے طالب علم ساجد میاں (جن کے افسانے آپ سید منظور سعید کے قلمی نام سے

حافظ صبیر ... کالج کے ایک عراقی طالب علم خلیل ابراہیم صاحب نے تخلیقی افسانہ فصیح و بلیغ عربی زبان میں انتہائی روانی سے سنایا۔ سامعین کے عربی زبان و ادب اور خاص طور پر لب و لہجہ پر قدرت نہ ہونے کے سبب حاضرین کا ایک محدود طبقہ ہی اس سے محظوظ ہو سکا۔

اس کے بعد صاحب صدر نے عبد الحق صاحب لکچرار شعبہ عربی دلی یونیورسٹی کا تعارف کرواتے ہوئے ان کو دعوت سخن دی۔ عبد الحق صاحب نے اپنی مختصر عربی تقریر میں آج کے فنکشن کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کی اور اس قسم کے اجتماعات کی اہمیت، انکی افادیت اور ان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ایسے پروگرام ہوتے رہنے چاہیئے تاکہ طلبہ اور اساتذہ کو ایک دوسرے سے گھل مل کر استفادے کے مواقع زیادہ زیادہ حاصل ہو سکیں۔

آگے صفحہ ۴۸ پر

# نوک پلک

اس ماہ ہم کو ملک کے کئی کالجوں سے "غزل سرائی" یا گانے کے مقابلے کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں — ترنم کے آرٹ ہونے میں ہم کو کلام نہیں ہے۔ مگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس آرٹ کی نشوونما کے لئے تعلیمی اداروں کے باہر بھی کافی مواقع ہیں۔ دوسرے یہ طلبہ کے لئے تعلیمی نقطۂ نظر سے بھی غیر مفید ہے۔ اس صورت میں ان مقابلوں کی حیثیت تضییعِ اوقات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

ضروری ہے کہ ایسی چیزوں میں مقابلے کرائے جائیں۔ جو طلبہ کے لئے نہ صرف تعلیمی لحاظ سے کارآمد ہوں بلکہ عام زندگی میں بھی نہایت اہم ہوں — اس سے طلبہ جہاں اس کی تعلیمی افادیت سے مستفید ہوں گے، وہاں وہ عام زندگی میں بھی اس کی اہمیت سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ مثلاً Extempore افسانہ نگاری کا مقابلہ — کسی خاص موضوع پر مضمون نگاری کا مقابلہ — کسی خاص کتاب (نصابی یا غیر نصابی) پر تنقید کا مقابلہ — وغیرہ وغیرہ۔

ان مقابلوں سے جہاں طلبہ میں ان چیزوں کا شوق پیدا ہوگا۔ وہاں باصلاحیت طلبہ کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی — ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی مذکورہ اصناف کی عام زندگی میں اہمیت سے منکر نہیں ہو سکتا۔

ادارہ

زیرِ نظر شمارے میں شامل تمام تر افسانوں میں نام و واقعات قطعی فرضی ہیں۔ اور کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر یا مصنف پر ذمہ داری نہیں۔

مشیرِ طباعت: محمد شفیق صدیقی متعلم انڈیا کالج
ایڈیٹر پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر: محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ: اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران
مقامِ اشاعت: قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی

**لکچرار ہیں** ——— تو آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اپنے طلبہ سے مضامین لکھوا کر برائے اشاعت روانہ کرائیں۔ ہم ممنون ہوں گے۔

**طالب علم ہیں** ——— تو کوئی مضمون (نصاب سے متعلق) ترجمہ (عربی، فارسی یا انگریزی سے کیا ہوا) یا افسانے اپنے لکچرار یا استاد سے تصحیح کرا کر ہمیں بھیج دیں ——— اپنے مسودے کے ساتھ نیچے چھپا کوپن ضرور منسلک کیجئے۔

**اردو، فارسی یا عربی کے سکریٹری ہیں** ——— تو آپ سے گذارش ہے اپنی سوسائٹی کی ماہانہ مختصر رپورٹ (ادبی نشست، مشاعرہ، تحریری یا تقریری مقابلہ کا نتیجہ) اپنے لکچرار سے تصدیق کرا کے مہینے کے اختتام سے قبل ہم کو بھیج دیں۔ ہم اسکو شائع کریں گے۔

یہاں سے کاٹئے

جناب ایڈیٹر صاحب!
ماہنامہ شاہجہاں دہلی

میں مضمون / افسانہ / غزل بعنوان ........ بھیج رہا ہوں۔
اگر مناسب سمجھیں تو اس کسی قریبی اشاعت میں شامل کر کے ممنون فرمائیں۔
ورنہ واپس کرنے کی زحمت فرمائیں۔ واپسی کے لئے ٹکٹ ساتھ ہیں۔
نام ........ کلاس و کالج / یونیورسٹی ........
گھر کا پتہ ........

یہاں سے کاٹئے

جناب عبدالحلیم صاحب ندوی
[illegible]ہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

# عربی ادب میں افسانہ نگاری!

عربی زبان میں صحیح معنوں میں مختصر افسانے کا تصور پہلی جنگ عظیم کے بعد آنا شروع ہوا۔ اس کے دو محرک تھے، پہلا یہ کہ عربوں نے شاید پہلی مرتبہ مغربی ادب کا براہ راست یا ترجمہ کے ذریعہ مطالعہ کیا دوسرا محرک عربی اخبارات ورسائل کا اجراء اور بڑی تعداد میں شائع ہونا۔ اور ہر خاص وعام کا دلچسپی اور شوق سے پڑھنا ہے ان اخبارات ورسائل نے دلچسپ اور ہلکے پھلکے افسانے شائع کئے جن میں طبع زاد اور ترجمے دونوں قسم کی کہانیاں شامل تھیں۔

عربی سماج میں خاص طور سے تین مسئلے ایسے تھے، جن کو حل کئے بغیر سماجی زندگی صحیح اصولوں پر استوار نہیں ہوسکتی تھی، ایک سماجی انصاف۔ دوسرا افراد کے باہمی تعلقات، تیسرا اخلاقی برائیوں کی اصلاح جدید عربی افسانہ نگاروں نے ان تینوں مسئلوں کو اپنا موضوع بحث بنایا اور اپنے اپنے انداز سے ان کو حل کرنے کی کوشش کی۔ عربوں نے اگرچہ مختصر افسانے کے فن اور تکنیک کو سیکھا مغرب سے مگر عمارت کھڑی کی بالکل اپنی ہی اینٹ اور گارے سے لباس ضرور بنایا۔ مغرب کی تقلید میں مگر کپڑا بنا اپنے ہی سوت کپاس سے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے عربی ادب میں افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس نے اپنے ماحول اپنے معاشرے اور اپنی ہی تہذیب وتمدن کو اپنا محور بنایا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ عربی افسانے نے تھوڑے ہی عرصے میں وہ ترقی کر لی، جس کی شاید دوسری قوموں کے ادب میں مثال مشکل سے ملے گی۔

عربی افسانہ نگاروں میں تین قسم کے مکتبۂ فکر ملتے ہیں۔ ایک مکتب خیال تو وہ ہے جس کی بنیاد تخیل پسندی پر ہے۔ اس مکتب خیال کے افسانہ نگاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں اثر انگیزی اثر پذیری، انفعالیت اور جذباتیت نمایاں نظر آتی ہے۔ اس مکتب فکر کے افسانوں میں خطابت کا اسلوب نمایاں ہے۔ دوسرا مکتب فکر حقیقت پسندوں کا ہے۔ جس کی کوششوں اور کاوشوں کو عربی افسانہ کو آگے بڑھانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ اس گروہ کے علم برداروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں فنی گہرائی دقت نظر۔ وسعت خیال اور افکار وخیالات میں پختگی ملتی ہے۔ تیسرا مکتب خیال ان نوجوان ادیبوں کا ہے جن کی نگارشات اور ادبی کاوشوں میں زمانہ حال کے فنی میلانات اور عصر حاضرہ کی رائج تکنیک اور جدید طرز نگارش واسلوب کا عکس نظر آتا ہے۔

تخیل پسند افسانہ نگاروں میں سب سے اہم اور ممتاز شخصیت مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کی ہے۔ ممکن ہے المنفلوطی کی کہانیاں مغربی افسانوں کی تکنیک کے مطابق نہ ہوں۔ نیز ان میں فن کی وہ باریکیاں نظر نہ آئیں۔ جو اردو افسانوں میں نظر آتی ہیں اور واقعات اور کردار میں وہ گہرا ربط جو ترقی یافتہ ادب کے افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہاں مقصود ہو۔ کہیں کہیں تانا بانا بھی ڈھیلا ڈھالا ملے گا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی ادب کے دور جدید میں وہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے مروجہ فن افسانہ نگاری کے اصولوں پر کہانیاں لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ اس کو ترقی دی اور آنے والوں کے لئے راستہ ہموار کیا

مصطفیٰ منفلوطی زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے زمانے کی پیداوار ہیں۔ ولادت: ۱۸۷۶ء، وفات: ۱۹۲۴ء ان کے سامنے اس زمانے اور نظام کی خرابیاں اور ان سے پیدا شدہ برائیاں جو سماج کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھیں۔ پوری طرح عیاں تھیں، وہ خود العبرات کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ انسان انسان پر ظلم کر رہا ہے۔ دنیا اور سماج مصیبت زدوں اور مظلوموں سے بھری پڑی ہے۔

میرے جیسے بے کس کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ بس ایک دل دردمند اور چشم بینا ہے۔ دل پر جب چوٹ پڑتی ہے تو آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں پرونے لگتی ہیں، اس امید میں کہ شاید

# انتظار

عامر قدوائی
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

یہ حسین رات اور یہ تارے
یہ جواں چاندنی یہ زرپارے
یہ سلونے سہانے نظارے
آکہ اب انتظار ہے تیرا

نغمۂ بے قرار باقی ہے
اک سرودِ بہار باقی ہے
جانے کب کا خمار باقی ہے
آکہ اب انتظار ہے تیرا

انجم و ماہتاب کی باتیں
اک مجسّم شباب کی باتیں
یہ چھلکتی شراب کی باتیں
آکہ اب انتظار ہے تیرا

رات رانی کی دلنشیں خوشبو
محفلوں میں وہ رقصِ جام و سبو
اور وہ تیری آنکھ کا جادو
آکہ اب انتظار ہے تیرا

جانے کب ساعتِ وصال آئے
شامِ فرقت کو کب زوال آئے
یعنی تجھ کو میرا خیال آئے
آکہ اب انتظار ہے تیرا

گردشِ کائنات تھوڑی ہے
ہو چلی صبح، رات تھوڑی ہے
یوں تو کہنے کو بات تھوڑی ہے
آکہ اب انتظار ہے تیرا

جھلملاتے ہیں آسماں پہ نجوم
زندگی پر اداسیوں کا ہجوم
اک تمنا سو وہ بھی ہے موہوم
آکہ اب انتظار ہے تیرا

یہ شفق جیسے آسمان خونبار
آخری نغمہ ہائے بلبلِ زار
ٹوٹ جانے کو ہے امید کا تار
آکہ اب انتظار ہے تیرا

ختم ہو جائے گا یہ افسانہ
پھر وہی غم، وہی یہ ویرانہ
پھر گریباں بدستِ دیوانہ
آکہ اب انتظار ہے تیرا

●

# دورِ حاضر کا عظیم شاعر فراقؔ

انیس الرحمٰن
دلی کالج دہلی

شاعر کی آواز ایک صدی کی آواز ہوتی ہے۔ وہ اپنے احساسات کی لطافت، جذبات کی شدت اور حسنِ اظہار کی ندرت سے دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ اور پھر اس سے فضا میں عجیب نغگی سی بکھر جاتی ہے۔ وہ انسانی رموز کے باریک نکات کی تشریح بڑے دلچسپ پیرایہ میں کرتا ہے۔ عقلِ انسانی جن گتھیوں کو سلجھانے میں اپنی کوتاہ دستی کا اعتراف کرلیتی ہے شاعر اُسے اپنے مترنم کلام میں بآسانی حل کر دیتا ہے۔

شاعر کے بارے میں ڈاکٹر اعجاز حسین اس طرح رقمطراز ہیں ــــــ

"شاعر بہرحال انسان ہے۔ وہ خوبی اور خرابی کا مرقع ہے۔ اس میں ملکوتی صفات بھی ہیں مگر زیادہ نہیں۔ زندگی میں کم لمحے ایسے آتے ہیں، جب شاعر محض شاعر ہوتا ہے۔ زیادہ تر وہ اپنے سماج، حالات، رسوم وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سب سے بلند ہستی پر کم ہی اپنے کو پاتا ہے۔ عموماً وہ اس مرتبے سے پست ہو کر محسوسات کو پیش کرتا ہے۔ زبان صرف اس کو اپنی خصوصیات کا سہارا دے سکتی ہے۔ اس کو سوچنے کا طریقہ بتا سکتی ہے۔ مگر اس کا تخیل اور پرواز نہیں باندھ سکتی۔ وجدان اور سرشاری کا انحصار، احساس و ادراک پر ہے۔"

اردو کی خوش نجتی ہے کہ اسے اپنی کم سنی سے اچھے اور اعلیٰ فنکار ملتے رہے۔ عربی زبان کے بعد اگر کوئی زبان اپنے متاعِ حیات پر ناز کرسکتی ہے تو وہ صرف اردو ــــــ یہ الگ بات ہے کہ دورِ جدید نے انگریزی ادب کی اہمیت کہیں زیادہ کر دی ہے۔ اور اردو بھی اپنے پرستاروں کا ایک وسیع حلقہ رکھتی ہے۔ اردو کی تدریج و ترقی میں شاعر کا جتنا ہاتھ ہے۔ کسی اور کا نہیں۔ اردو جب مسند نشیں تھی تو قدرتی طور پر اس کے مدّاح لاتعداد تھے۔ لیکن اس بے سامانی اور زمانہ بدوشی کے عالم میں بھی شاعر ہی اس کی بقا اور استحکام کا ذمہ دار ہے۔

فراقؔ میں صرف یہی خوبی ہے کہ وہ ایک شاعر ہیں "محض شاعر" انھوں نے ہمیشہ جس زاویہ نگاہ سے عشق و محبت کو دیکھا اور سوچا ہے، وہ اپنی جگہ منفرد ہے۔ اور اسی شانِ انفرادیت کی وجہ سے فراقؔ ایک عظیم شاعر ہیں۔

وہ جب سرشار ہوتا ہے تو عام شعرار کی طرح والہانہ کیفیت خمار کے عالم مائل بہ انحطاط نہیں بلکہ مائل بہ پرواز ہوتی ہے۔ وہ اس وقت بھی عام ذہنوں سے ہٹ کر بات کہتے ہیں۔

فراقؔ دیکھ بدلتی ہے منزلِ آفاق
کہ مہر و ماہ کی میں باگ موڑ سکتا ہوں

فراقؔ میں حوصلہ ہے، ہمت ہے، امنگ ہے، ترنگ ہے، وہ اپنی آواز کو کسی اعجاز سے کم نہیں سمجھتے۔

ہے زیر و بم میری لے کا حریف ضرب کلیم
بلند و سخت چٹانوں کو پھوڑ سکتا ہوں

فراقؔ نے جس طرح نفسیاتی کش کش کو محسوس کیا ہے، دورِ حاضر کا کوئی شاعر اس کشمکش کو پوری طرح محسوس نہ کر سکا۔ فراقؔ نے عشق کو سراپا نیاز نہیں بنایا۔ اور وہ متضاد حالتوں

کا شکار رہے ہیں۔ وہ معشوق پر ہلکے ہلکے طنز بھی کرتے جاتے ہیں۔
اور اپنی بے چینی کا اظہار بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ
تو معشوق کو کھل کر برا کہنے لگتے ہیں۔ معشوق کی دھمکی کو بڑی
دیدہ دلیری سے منظور کر لیتے ہیں۔ انھوں نے جس انداز سے
معشوق سے برہمی اور خفگی کا اظہار اور اپنی خودداری کا ثبوت
جس غیورانہ انداز سے دیا ہے، اُردو ادب سوائے کلام داغ
کے اور کسی کو مثال میں پیش نہیں کر سکتا

انھوں نے ہجر کی کیفیت کو جس انداز سے محسوس کیا ہے،
کوئی اور شاعر ان کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔

وہ جس طرح یاد کے پردے میں اپنے محبوب کو بھول کر
خود فریبی میں مبتلا ہوئے ہیں کوئی اور شاعر اس کی جرأت
بھی نہ کر سکا۔

فراق کے کلام میں شوخی ہے۔ تیکھا پن ہے۔ لیکن
بسا اوقات وہ سنجیدگی کے جامہ میں زیب تن نظر آتا ہے۔
غرضیکہ فراق کی شاعری نے ان کو جاوداں بنا
دیا ہے۔ جگر مراد آبادی نے کہا تھا کہ جب ہم لوگوں
کو لوگ بھول جائیں گے، اس وقت بھی فراق کی یاد
تازہ رہے گی۔

ذیل میں فراق کے کچھ اشعار پیش ہیں۔ جو عشق،
ہجر، درد، یاد اور انجام کے بارے میں ان کی بلندی
تخیل کے آئینہ دار ہیں۔

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

مرتبہ دیکھ خاک آدم کا
یہ مقامات مہر و ماہ نہیں

قطع کر لے تعلقات کہ ہم
قائل دید گاہ گاہ نہیں

یہ کہو تغافل حسن ہے کوئی کارسازی غم کرے
کہ جو آج دل سے نکل گئی وہ دعا ترا ب اثر بھی ہے

اے دل درد سے یوں نہ تڑپ
کچھ تو سنبھل اے مرد کی ذات

سنا ہے اہلِ محبت کو اک شکایت ہے
یہی کہ حسن میں اتنی نہ بے خودی ہوتی

چمن سے اہلِ خواب ناز سونے کو یوں تو سو چکے
کٹنے کو یوں تو کٹ گئے رنجِ شب انتظار کے

حالِ انجام عشق کیا کہیے
اب تو ہم بھی لگے ہیں پچھتانے

اکثر راتوں کو یہ کہہ کہہ کر اک درد کا مارا روتا ہے
سچ ہے کہ محبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی تقصیر نہیں

یہ کہہ کر میں کرتا ہوں عرض تمنا
نگاہِ محبت کے دھوکے نہ کھانا

یوں تو ترا ستم بھی تھا وجہ نشاطِ زندگی
یوں تو ترے کرم نے بھی غم دیا بارہا دیا

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ خوش ہونا محبت میں
کبھی مشکل نہیں ہوتا، کبھی آساں نہیں ہوتا

نگاہِ اہلِ دل سے انقلاب آئے ہیں دنیا میں
یقیں رکھ عشق اتنا بے سروساماں نہیں ہوتا

بجا ہے ضبط بھی لیکن محبت میں کبھی رو لے
دبانے کے لئے ہر درد اے ناداں نہیں ہوتا

فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ ساز درد ہیں لیکن
یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

تجھے یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں
محبت ہے شاید تجھے بھول جانا

اسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں
کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

محبت میں میری تنہائیوں کے ہیں کئی عنواں
ترا آنا، ترا ملنا، ترا اٹھنا، ترا جانا

زاق ین ہے، نہ رسم و راہِ دیریں بند ہیں لیکن
کسی سے اب وہ پہلی سی ملاقاتیں نہیں ہوتیں

آ ہی جاتی ہے مگر پھر بھی مرے درد کی یاد
گرچہ ہے ترکِ محبت میں بھی آرام بہت

سید محمد رضا بلگرامی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی

# چارہ ساز!

ڈاکٹر بھیا کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ سجے ہوئے ہال میں پہونچی تو ایک لڑکے کو فضا میں نغمے بکھیرتے دیکھا — وہ پیالوں پر بیٹھا جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔ خوبصورت گھونگھریالے بالوں کی لٹ پیشانی پر جھول رہی تھی اور چمکتی ہوئی آنکھیں شریر ہونے کے ساتھ ہی ذہانت کا ثبوت بھی دے رہی تھیں شمع نے اس پر ایک نظر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ مکس پارٹی میں وہ پہلی بار شریک ہوئی تھی۔ بسمل بھائی کا اصرار تھا کہ شمع کو میری سالگرہ میں ضرور لانا اور ڈاکٹر بھیا نے دوست کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے شمع کی منت سماجت کی تھی۔ آخر شمع کو ماننا پڑا۔ آنے کو تو وہ چلی آئی۔ لیکن اسے اس نئے ماحول میں گھٹن اور وحشت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پردے کی قید سے آزاد تھی۔ لیکن اس کا ماحول اتنا آزادانہ تھا۔ جتنا کہ بسمل بھائی کے یہاں کا۔ یہاں تو لڑکے لڑکیاں سبھی مغربی لباس میں نظر آ رہے تھے۔ ایک لڑکی پر تو اس کی نگاہ جم کر رہ گئی۔ وہ صرف ایک گاؤن پہنے ہوئے تھی جو لطف سینے سے شروع ہوتا تھا۔ وہ سر دتھا پھر بھی شمع کو شرم سے پسینے آ گئے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مردوں کی نگاہیں اس عریاں لڑکی پر نہیں۔ بلکہ اس پر ہیں اچانک ہی پیالوں پر نغمے بکھیرنے والے کی نظر عنایت پر پڑی اور وہ گیت ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔ ساتھ ہی کئی نگاہیں اس کا تعاقب کرنے لگیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کون ہے جس نے آکر اس شاعر کو نغمے سے بے نیاز کر دیا ہے۔

"ارے روفی تم یہاں کیسے" ڈاکٹر احمد نے سوال کیا۔

"حسینوں کی محفل میں صرف تمہیں ہی شریک ہونے کا حق حاصل ہے کیا؟

" قہقہے فضا میں گونج گئے "۔

"یہ مطلب نہیں آج میں پہلی بار تمہیں بسمل کے ہاں دیکھ رہا ہوں"

"یہ محض اتفاق سمجھو" روفی نے سگرٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ پاس ہی کھڑی شمع نے دھوئیں سے بیزار ہو کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

روفی پر اس ادا کا خاص اثر ہوا۔ اور سگرٹ بیچارا جوتے کے نیچے مسل دیا گیا۔ اس کے بعد باتوں کا سلسلہ جاری کیا۔

"ہاں تو دوست تم جانتے ہو مجھے خطرات میں گھر جانا کتنا پسند ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں کار بہت تیز چلاتا ہوں اتفاقاً بسمل صاحب کل میری کار کے نیچے آتے آتے بچ گئے۔ انھیں نئی زندگی ملی اور مجھے جیل سے چھٹی ملی اور اس کے ساتھ ہی دونوں دوست بن گئے۔

"اچھا" عنایت نے جیسے سب کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

"عنایت یہ ہماری بھابی —"

روفی ابھی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ عنایت نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

شمع کے چہرے پر شفق پھوٹ پڑی۔

"نہیں بھائی یہ میری خالہ زاد بہن ہیں۔

اور یہ میرے شاعر دوست مسٹر روفی! وہ شمع سے مخاطب ہوئے۔ چائے کے بعد ہال میں مغربی گانوں کی دھنیں بجنے لگی اور اس عریاں لڑکی کے پیر ہلنے لگے جیسے وہ گانے کی دھن پر ناچ رہی ہو۔

بسمل عنایت کو گھسیٹ کر لے گیا وہ اپنی منگیتر سے

اس کی ملاقات کرانی چاہتا تھا۔ شمع اصرار کے باوجود اس
کے ساتھ نہ جا سکی اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ روفی بھی اس کے
قریب ہی آکر بیٹھ گیا۔ ہال میں کئی جوڑے ناچ رہے تھے اور
شمع انکو دیکھنے کے بجائے آنکھیں نیچی کئے بیزار سی بیٹھی تھی
اسے ڈاکٹر بھیا پر غصہ آرہا تھا۔ گھر جا کر وہ بھیا سے خوب
ہی لڑے گی۔ وہ بھی عمر بھر یاد کریں گے وہ دل ہی دل میں کہہ رہی
تھی۔

"آپ اس ماحول میں اجنبیت کیوں محسوس کر رہی ہیں؟"
روفی نے پوچھا جواب دینے کے بجائے شمع نے اس کی طرف
دیکھا۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ یہی سوال میں آپ سے کروں
تو ——؟

اتنے میں وہ عریاں لڑکی روفی کے پاس آکر بولی۔
مسٹر آپ ڈانس نہیں کریں گے؟"

"جی نہیں"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا۔"

"اوہ مائی گوڈ" وہ قہقہہ لگاتی ہوئی بولی۔ اس دنیا میں
ڈانس نہ آنا بھی بہت بڑا جرم ہے۔

تھوڑی دیر بعد مسعود نے روفی سے پوچھا۔
"تم نے مس قریشی کے ساتھ ڈانس کرنے سے انکار کیوں
کیا؟"

"اس لئے کہ مجھے ڈانس نہیں آتا اس نے جواب دیا۔
مسعود پھر بولا —"جھوٹ مت بولو۔ اس وقت تم
کسی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہو۔ اس کا اشارہ شمع کی طرف
تھا۔ کیا رعنا کے یہاں کا ڈانس بھول گئے" اور اتنا کہہ کر
مسعود چلا گیا۔

آخر شمع نے سکوت کو توڑا۔ "آپ کو جب ڈانس آتا
ہے تو چلے کیوں نہیں گئے۔ اس بیچاری کا دل نہ ٹوٹتا" شمع نے
طنز کیا۔

"بیچاری۔ وہ ہنسا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو وہ بیچارہ
بنا چکی ہے۔ شمع میں، زندگی کو حقیقت کے شکل میں دیکھنے کا عادی
ہوں اور یہ ڈانس کی دنیا اور کلب کی دنیا مجھے پسند نہیں۔ جہاں
پر بناوٹ ہے۔ آج میرے ساتھ کوئی لڑکی ناچ رہی ہے کل
کسی دوسرے کے پہلو میں ہے۔

عنایت کے آجانے سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس نے
روفی سے گھر آنے کا وعدہ لیا اور دونوں دوست رخصت
ہو گئے۔

عنایت صرف امتحان کے دوران خالہ امی کے گھر رہتا
تھا۔ باقی دن ہوسٹل میں گذارتا تھا۔

دوسرے دن جب روفی عنایت کے گھر پہونچا۔ تو
روفی نے کہنا شروع کر دیا "بھئی شمع تو مجھ سے سخت ناراض
ہیں۔"

"کیوں" عنایت نے پوچھتے ہوئے پانی کا گلاس منہ میں
لگا لیا۔

"اسے سوسائٹی کے یہاں کا ماحول بالکل پسند نہیں آیا
واقعی تم نے انہیں لے جا کر غلطی کی۔ میں نے محسوس کیا
کہ وہ محفل میں گھبرائی سی بیٹھی تھی۔"

"میں سمجھتا تھا کہ تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس ماحول کو پسند
کرے گی۔"

"لیکن دوست تعلیم ایک الگ چیز ہے اور آزادی الگ
ایک تعلیم یافتہ لڑکی ضروری نہیں کہ آزاد بھی ہو۔"
عنایت نے محسوس کیا۔ شمع کا نام لیتے وقت روفی
کی آنکھوں میں خاص چمک ابھر آتی تھی یہ دیکھ کر وہ مسکرانے
لگا۔

"شمع کہاں ہیں؟ روفی نے پوچھا۔
اپنے کمرے میں عنایت قہقہہ لگاتے ہوئے بولا
بلاؤں اسے؟

نہ جانے وہ دل میں کیا خیال کرے گی"
عنایت خالہ امی کے پاس گیا اور بولا
"خالہ امی — وہ ذرا —"
ہاں ہاں — بوکھلا کیوں رہے ہو بیٹا۔ وہ ہنس کر بولیں
"بات یہ تھی کہ میرے ایک دوست شمع کے افسانے

پڑھتے ہیں۔

ذرا اس سے ملنے یہاں تک چلے آئے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔

ہاں ہاں بلالو"

اور تھوڑی ہی دیر بعد شمع ڈرائنگ روم میں پہونچی روفی نے کھڑے ہوکر سلام کیا۔ لیکن شمع جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتی رہ گئی اور پھر اس نے عنایت بھائی کی طرف دیکھا۔ جو یہ جھوٹ بول کر کہ ثریا تم سے ملنے آئی ہے۔ اسے یہاں لے آئے تھے۔

آنکھوں میں غصہ ابھر آیا پھر بھی وہ اخلاقاً وہاں بیٹھ گئی۔

"عنایت!"

بھئی آج ایک شعر یاد آگیا" روفی نے سگریٹ ہاتھ میں گھماتے ہوئے اور اسی پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ پھر ایک دم گھبرا کر اس نے سگریٹ واپس جیب میں ڈال لیا

"کیا ـ ؟ عنایت بولا۔

"سنادوں ؟"

"ضرور"

تو سنو!

یہ ادائے بے نیازی تجھے اے بے وفا مبارک
مگر ایسی بھی بے رخی کیا جو سلام تک نہ پہنچے"

عنایت ہنسنے لگا روفی خاموش بیٹھا رہا۔ اور شمع کٹ کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ روفی نے اسی پر چوٹ کی ہے

"تمہاری شاعری کا کیا حال ہے ؟" عنایت نے پوچھا

"کل تک خیالوں خوابوں کی دنیا میں بھٹک رہا تھا لیکن اب میری خیالی محبوبہ حقیقت کا روپ دھار چکی ہے میں تو اسے من میں بسا بیٹھا کاش وہ بھی مجھے دل کے کسی کونے میں جگہ دے سکے

روفی انکھیوں سے شمع کی طرف دیکھتے۔ فقرہ پورا کیا اور اٹھتے ہوئے عنایت سے اجازت مانگی۔

روفی کے چلے جانے کے بعد شمع کے دل میں ایک عجیب خیالات کا جال بن گیا تھا۔ لیکن اس نے ان باتوں پر قابو پالیا تھا۔

"دوسرے دن روفی نے آتے ہی شمع کے یہاں کا ریڈیو کھول دیا۔ فلمی گیتوں کا پروگرام ہو رہا تھا۔

فلم "درد" کا گانا شروع ہوا۔ میوزک سن کر روفی نے شمع سے پوچھا اچھا بتایئے کون سا ریکارڈ ہے۔

یہ بتا ہی نہیں سکتی۔ ثریا نے جواب دیا۔

واہ بتا کیوں نہیں سکتی"

"یہ افسانہ نہیں ظالم میرے دل کی حقیقت ہے"

"مجھے تم سے محبت ہے"۔

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا" ۔ روفی نے کہا

کیسے نہیں ہو سکتا ؟

شرط لگایئے" شمع بولی

"کاش ایسا ہو سکتا" ــــ روفی نے جذباتی بن کر کہا شرط لگانے کی ضرورت نہیں۔

کئی قہقہے فضا میں گونج گئے۔ شمع شرما کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ ظالم کن کن اداؤں سے گھائل کرتا ہے چپکے سے اس نے کہا اور گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ـ ادھر روفی کے کانوں میں صرف ایک فقرہ گونج رہا تھا۔

"مجھے تم سے محبت ہے" مجھے تم سے محبت ہے"

"ڈاکٹر بھیا"

"ہوں"

"ڈاکٹر بھیا"

ہوں۔ ہوں وہ کتاب پر نظریں جمائے بولا

"ڈاکٹر بھیا ـ!! شمع چیخ پڑی

"کیا ہے"

"ٹھیک" ــــ بغل میں وہ ہاتھ دبائے کھڑی رہی میں ڈاکٹر بھیا ـ ڈاکٹر بھیا کہتے کہتے تھک گئی اور جناب ہیں کہ "ہوں" ہوں کہتے نہیں تھکتے۔ واہ یہ بھی کوئی بات کرنے کا ڈھنگ ہے۔

"خدا کے لئے اب کہہ بھی ڈالو کیا کہنا ہے ؟"

"بہت ضروری کام کر رہے ہیں کیا ؟" — وہ عنایت کے سامنے کچھی میز پر جا کر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر دور پھینک دی۔ عنایت مسکرانے لگا۔

"یہ آپ کے چور روفی صاحب ہیں۔ بالکل گرگٹ لگتے ہیں قسم خدا کی"

"نئے خطاب پر آداب عرض کرتا ہوں" روفی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا

شمع شرمندہ ہو کر بھاگ گئی۔ عنایت اور روفی ہنسنے لگے۔ ایک دن شمع باغ میں پھول توڑ رہی تھی۔ وہاں روفی بھی آگیا۔ بولا — !

"شمع — !"

"جی — بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"آپ کے تغافل کو حیا سمجھوں ؟"

"یہ تو محض سادہ دلی ہے آپ کی" وہ بے پروائی سے بولی۔

"آپ کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ؟"

شمع نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ نظریں اوپر اٹھا دیں۔

روفی کو ان آنکھوں میں نہ جانے کیا نظر آیا کہ پاس ہی گلاب کے پودے میں سے ایک پھول توڑ کر اس نے شمع کی طرف بڑھا دیا۔

"خیال رکھئے یہ پھول مرجھا نہ جائے"

"شکریہ" کہہ کر شمع نے پھول ہاتھ میں لے لیا۔

"کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے" روفی نے شمع کو چڑانے کی غرض سے کہا۔

شمع نے پھول کو پیر کے نیچے مسل دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چل دی۔ روفی نے کئی آوازیں دیں لیکن اس پر اثر نہ ہوا۔ اگلے دن ڈاکٹر بھیا آتے ہی اس سے باتیں بنانے لگے۔

"شمع تم پاگل ہو گئی ہو کیا ؟"

"کیوں کیا ہوا"۔ تیوری پر بل چڑھاتے ہوئے بولی۔

روفی کے ساتھ تمہارے ایسے سلوک کو کیا سمجھوں ؟ اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے —"

"کچھ بھی نہیں"

"آپ انکی وکالت کرنے آئے ہیں کیا ؟"

"تمہارا دل پسیج جائے تو مجھے وکیل سمجھ لو — روفی۔"

"ڈاکٹر بھیا بس کیجئے خدا کے لئے میں روفی کے متعلق ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی"۔ وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہوئے بولی۔ خدا کے لئے آپ چلے جایئے۔

پھر وہ بیمار ہو گئی کئی بار اس نے ڈاکٹر بھیا کو بلایا لیکن وہ شمع سے ناراض تھے۔ آج خالہ امی کے حکم نے انھیں مجبور کر دیا — سب سے پہلے خالہ امی سے ملاقات ہوئی وہ برس پڑیں۔ بہن کتنے دنوں سے بیمار ہے۔ تمہیں پرواہ نہیں تو یہ آجکل خون کیسے سفید ہو گئے ہیں؟"

"خالہ امی — اچھا تو ہے خون کا سفید ہونا — وہ خالہ امی کے گردن میں جھول گیا۔

"ہاں شمع کہاں ہے" اوپر اپنے کمرے میں

عنایت جلد جلد سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہونچ گیا شمع کی آنکھیں دروازے کی طرف تھیں۔ وہ رک کر بولا"

"اجازت ہو تو کمرے میں داخل ہونے کی جرات کروں ؟"

شمع نے اس کی طرف سے کروٹ بدل لی۔

"بہت ناراض ہو گیا بھیا سے ؟" وہ شمع کی مسہری پر ہی بیٹھ گیا — وہ خاموش رہی۔

بھئی کیا بتاؤں پچ مچ میں بہت مصروف تھا گذشتہ کئی دنوں سے روفی بھی ہسپتال میں داخل ہے۔

کیا ہوا روفی کو ؟" وہ بے اختیار بولی

"فی الحال تو بخار کھانسی ہے۔ علاج نہ ہوا تو ٹی بی T.B کا خطرہ ہے۔

"پھر آپ ان کا علاج کیوں نہیں کرتے۔

پاگل مانتا ہی نہیں —۔ کہتا ہے۔ اگر میں مر بھی جاؤں تو کون ہے۔ میرے لیے آنسو بہانے والا دعا

پھینک دیتا ہے ۔ سامنے دوا پلادو تو پی لیتا ہے۔ ورنہ نرسوں کو کیا پڑی کہ خوشامد کریں۔ سوچ رہا تھا۔ یہاں لے آؤں۔ لیکن پھر خیال آیا خالہ امی ضعیف اور تم اتنا سے بے رخ ـــ خدا کسی کو بے سہارا نہ کرے۔ عنایت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ انھیں خشک کرنے لگا

بیچارے کے دل میں کتنی آرزوئیں اور امیدیں تھیں وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔ عنایت، میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا ایک گھر بساؤں جس میں محبت کرنے والی بیوی ہو ننھے منے بچے ہوں۔ چھوٹا سا باغ ہو۔ لیکن اس کی یہ آرزوئیں ختم ہو گئیں۔ شمع خدا کی قسم بے ہوشی میں کئی مرتبہ اس کے لبوں پر تمہارا نام نکلا ہے۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا بھی شمع کون ہے۔ آپ اسے یہاں لے آئیے۔ میں نے ارادہ کیا۔ لیکن تمہاری بے رخی دیکھکر جرات نہ ہو سکی۔

"ڈاکٹر بھیا ـــ اس کے منہ سے نکلا اور وہ پھوٹ پڑی۔

"شمع کیوں رو رہی ہو ـــ ؟" عنایت شمع کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا ـــ

ڈاکٹر بھیا ـــ" روفی کو یہاں لے آئیے ـــ !

وہ سسکیوں کے درمیان بولی ـــ

"سچ" عنایت کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں ـ

"ہاں ـــ ہاں"

شمع میں سچ کہتا ہوں کہ روفی اب ضرور اچھا ہو جائے گا ـ اسے تندرست ہونا ہی پڑے گا۔ میری شمع کے لیے ـ ننھی بہن کے لیے"

شمع مسکرانے لگی ـــ آنسو بہا کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ دل کا غبار نکل چکا تھا۔ وہ خود کو بالکل تندرست محسوس کر رہی تھی۔

عنایت نے شمع کی پیشانی چومی اور روفی کو لینے چلا گیا ـــ

●●

# امیر اور فقیر

مصطفیٰ لطفی المنفلوطی
مترجم:۔ سید ذوالفقار علی
(ایم۔اے۔پریویس) دلّی یونی ورسٹی دہلی

کل میں ایک پریشان حال فقیر کے پاس سے گذرا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنا ہاتھ پیٹ پر اس طرح رکھے ہوئے ہے، گویا کہ وہ اپنے پیٹ کی تکلیف کا شکوہ کر رہا ہے۔ میں نے اس کے حالِ زار پر رحم کھاتے ہوئے اس کی تکلیف دریافت کی تو اس نے بھوک کی شکایت بتائی۔ چنانچہ میں نے کسی قدر اس کی بھوک کی تکلیف دور کرنے کی کوشش کی۔ پھر اسے چھوڑ کر میں اپنے رئیس اور خوش حال دوست سے ملنے چلا گیا۔ وہاں مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ بھی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ اور وہی تکلیف بتا رہا تھا جو اس بدحال فقیر نے بتائی تھی۔ میں نے اس کی حالت دریافت کی تو اس نے بدہضمی کی شکایت بتائی۔

اس پر میں نے سوچا کہ اگر یہ مالدار اپنی ضرورت سے زیادہ خوراک اس فقیر کو دے دیتا تو دونوں میں سے کوئی بھی پریشان حال اور شاکی نہ رہتا —— اس کے لئے یہ مناسب تھا کہ وہ اتنی ہی غذا استعمال کرتا جس سے اس کی بھوک مٹ جاتی۔ اور ضرورت پوری ہو جاتی —— لیکن افسوس ——! اس کی خودغرضی حد سے بڑھ گئی۔ اور اس نے اپنے دسترخوان کی رونق بڑھانے کے لئے فقیر کی پلیٹ بھی اپنی طرف کھینچ لی۔ جس کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے اسے بدہضمی کی سزا دی تاکہ ظالم کو اس کا ظلم راس نہ آئے۔ اور اس کے لئے زندگی خوش گوار نہ ہو سکے۔ اور اس طرح یہ مشہور مثل اس پر صادق آگئی۔ کہ "امیر کی بدہضمی، فقیر کی بھوک کا انتقام ہے"

طاقت ور لوگ کس قدر ظالم اور سخت دل ہیں۔ کہ وہ اپنے نرم گدّوں پر آرام کی نیند سوتے ہیں۔ اور ان کا پڑوسی جو شدید سردی سے کانپتا اور تکلیف سے آہیں بھرتا ہے۔ ان کی نیند میں خلل انداز نہیں ہوتا —— وہ طرح طرح کے میٹھے اور نمکین کھانوں سے بھری میز پر بیٹھا ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی تکدّر پیدا نہیں ہوتا۔ کہ اس کے بہت سے اقربا ایسے ہیں، جو اس دسترخوان کے بچے ہوئے ٹکڑوں کے لئے بھوک سے بیتاب ہیں —— بلکہ ان امیروں میں ایسے بھی ہیں، جن کے دل میں نہ رحم و مہربانی کا گذر ہے۔ نہ حیا اُن کی زبانوں کو گرہ لگاتی ہے۔ چنانچہ وہ فقیروں کے سامنے، انھیں ستانے کے لئے اپنی خوش حالی کے قصّے بیان کرتے ہیں۔ اور اپنے زر و جواہر کی گنتی کرانے کے لئے ان سے مدد لیتے ہیں۔ تاکہ غریب کا دل توڑ دیں۔ اور اس کی زندگی بے کیف بنا دیں۔ گویا کہ وہ اپنی ہر بات اور ہر حرکت سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ:۔

"ہم امیر ہیں۔ اس لئے خوش نصیب —— اور تم فقیر ہو —— اس لئے بدبخت اور بدنصیب ہو —— !!"

میں انسان کو انسان سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا —— تاآنکہ وہ احسان سے کام نہ لیں۔ اس لئے کہ میں انسان اور حیوان کے درمیان جو حدِّ فاصل قائم کر سکتا ہوں، وہ احسان ہی ہے۔ مجھے یہاں تین قسم کے انسان ملتے ہیں۔ پہلی قسم کے ایسے انسان کی ہے، جو کسی پر احسان اس لئے کرتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ احسان کرانا چاہتا ہے۔ وہ ایسا ظالم اور جبّار ہے کہ وہ احسان کا مطلب صرف یہ سمجھتا ہے، کہ انسان کو غلام بنا لے۔ دوسرا وہ انسان ہے جو اپنے اوپر احسان کرتا ہے۔ دوسروں پر احسان نہیں کرتا۔ اس لالچی اور خودغرض انسان کو اگر معلوم ہو جائے کہ سیّال خون کسی عمل سے سونا بھی بن جاتا ہے۔ تو وہ اس سونے کو حاصل کرنے کے لئے تمام انسانوں کو ذبح کر دے گا۔ تیسری قسم کا وہ انسان ہے جو نہ اپنے ساتھ احسان کرتا ہے۔ اور نہ دوسروں

آگے صفحہ ۲۱ پر

# ادھ کھلے پھول

جنھیں آبیاری کی ضرورت ہے

از سرگرداں دہلوی

"اس عنوان کے تحت ان ابھرتے ادیبوں کو اور شاعروں کو متعرف کیا جاتا ہے جو مستقبل میں اردو کے عظیم ستون ثابت ہوں گے۔
اس ماہ آپ دلی یونی ورسٹی کے ریسرچ اسکالر جناب ریحان الحق صاحب سے متعارف ہو رہے ہیں ——
اگلے ماہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے طالب علم عامر قدوائی صاحب کا تعارف پیش کیا جائے گا۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ کا یہ سرگرداں اپنی دھن میں مگن چاوڑی بازار سے گذر رہا تھا۔ اچانک سڑک پر بھیڑ نظر آئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے رکشا، تانگہ اور کاریں قطار اندر قطار نظر آنے لگیں۔ پہلے تو یہی سوچا کہ ہندوستان تو مجموعۂ عجائب ہے۔ اور یہاں رہنے والی پوری مخلوق عجیب حرکات کی مرتکب ہوتی ہے۔ مثلاً آپ اپنے دوستوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔ راستے میں آپ کے کسی دوست نے جھک کر دیکھا —— اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر بھیڑ نظر آئے گی۔

تو جناب پہلے تو دل نے بھی سوچا کہ سوائے حماقت کے کچھ نہیں۔ لیکن شیطان نے بہکا ہی دیا۔ اور ہم دیکھنے لگے۔ آگے ایک سائیکل تھی اور پیچھے ایک حسرت ستم زدہ تھی۔ سائیکل کا ہینڈل نہ معلوم کہاں تھا۔ اور اس کے دوسرے اعضا بھی قیامت کا ظاہری نمونہ پیش کر رہے تھے۔ ادھر سائیکل والا اپنے ہینڈل اور پیڈل پر جگہ جگہ خراشیں دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی پتلون بھی گدی پر سے پھٹ کر نہ جانے کہاں گئی تھی۔

سب کی طرح ہم نے بھی سوچ لیا کہ یہ کار سے ٹکرانے یا ہم سری کرنے کا انجام ہے۔ اور ہم نے عام آدمی کی طرح کسی سے معلوم کر کے کہ "یہ کیا ہو گیا؟ یا کیسے ہو گیا؟" جہالت کا ثبوت نہیں دیا۔ پھر بھی کسی کے معلوم کرنے پر سائیکل والے نے جواب دیا کہ ——
"جناب میں سیدھا سادھا سائیکل چلا رہا تھا کہ، اچانک کوئی چیز جس کے چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ لگا تھا۔ بدن پر شیروانی سی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی۔ میری سائیکل کے سامنے ......... اور پھر نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔"

سائیکل والے کا یہ جواب سن کر ہمارے کان کھڑے ہوئے اور آنکھیں تلاش کرنے لگیں ایسے حلیہ والے کو۔ لیکن جناب! ہماری آنکھوں نے کوئی کام کیا نہ کانوں نے۔ اور ہم اسی خیال میں فلاں فلاں و پیچاں کالج پہنچ گئے۔ کالج کے عین وسط میں بالکل اسی حلیہ کے ایک صاحب کھڑے تھے۔ لیکن ان کا چہرہ کسی اور طرف تھا۔ اس لئے ایک دفعہ پھر اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکامی نظر آ رہی تھی کہ ان کا چہرۂ انور ہماری طرف ہوا۔ اور میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ ارے! ریحان الحق صاحب، آپ کب آئے؟ ہم نے سوال کیا۔ بس ابھی چلا آ رہا ہوں۔ ہمارا تجسس اور بڑھ گیا۔ اور پھر سوال گیا۔ کیا

باقی ہے

کوئی معرکہ سر کر کے آر ہے ہیں؟ جواب دیتے ہوئے فرمانے لگے۔
"کوئی معرکہ تو نہیں۔ البتہ ایک سائیکل والے نے ہمارے منہ آنے کی کوشش کی تھی۔ سو اس کا مزہ اس نے چکھ لیا۔"
اور پھر گفتگو کا ایک اک دھاگہ کھلتا چلا گیا۔ اور پھر ذہن اچانک ماضی کے اس باب کی طرف مڑ گیا۔ جب ایک طرف پوری دنیا کو آگ کے شعلوں میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ انسان انسانیت کا خون بہا رہے تھے۔ اور اسی ہنگامہ خیز دور میں آپ کی تشریف آوری ہوئی۔ یعنی یکم جنوری ۱۹۴۲ء یہی وہ سال ہے، جسے جنگِ عظیم دوئم کا سال کہا جاتا ہے۔
جب آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو خالص مذہبی اور مشرقی ماحول میں پایا۔ ذرا بڑے ہوئے تو ایک قریبی مکتب میں داخل کر دیا گیا۔
اس کے بعد مدرسہ کریمیہ (جو ایک مشہور درسگاہ ہے) میں پہنچا دیئے گئے۔ پھر اینگلو عربک اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں دلی کالج میں "بی کام" میں داخلہ لیا۔ اور "بی کام" کرنے کے بعد دوبارہ بی۔ اے عربک آنرز میں داخلہ لیا۔
اس کورس کو مکمل کرنے کے بعد ایم۔ اے عربک، دلی یونیورسٹی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور آجکل ریسرچ اسکالر ہیں۔
آپ کی دلی کالج سے دس سال سے زائد وابستگی ایک معنی رکھتی ہے۔ آنے والا دلی کالج کا مؤرخ آپ کے نام کے بنا تاریخ مکمل نہیں کر سکتا۔
اکثر آپ کے کلاس فیلو اسی کالج میں لیکچرار کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور آپ آج تک اپنی تعلیمی تشنگی کو ختم کرنے کے لئے اسی ادارہ سے ایک طالب علم کی حیثیت سے وابستہ ہیں۔
گذشتہ ماہ آپنے انکا افسانہ "بکھرے سپنے" پڑھا تھا۔ اور اس دفعہ آپ انکا تازہ افسانہ "یہ خلش کہاں سے..." ملاحظہ فرمائیے۔
اور اب مجھے اگلے مہینے کی دس تاریخ تک سرگرداں رہنے کے لئے اجازت دیجئے۔

آپ کی تعریف اسی طرح کی جا سکتی ہے کہ:۔
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یو لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

●●

---

بقیہ

## امیر اور فقیر

صفحہ نمبر ۱۹

کے ساتھ ——— اور یہ احمق بخیل ہے۔ جو اپنا پیٹ مار کر صندوق کا پیٹ بھرتا ہے۔
رہ گئی انسان کی چوتھی قسم جو دوسروں کے ساتھ احسان کرتا ہو۔ اور اپنے ساتھ بھی احسان کرتا ہو۔ تو میں اسے نہیں جانتا۔ اور نہ میں اب تک ایسے شخص سے مل سکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسی قسم کے انسان کو یونانی فلسفی دیو جانس کلبی دن میں چراغ لے کر ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اور جب اس سے کسی نے پوچھا کہ کیا چیز تلاش کر رہے ہو۔ تو اس نے جواب دیا تھا۔ "انسان کو تلاش کر رہا ہوں"

●●

---

بقیہ افکار نو

از صفحہ ۳۵

تعلیم کے ممکن ہے بشرطیکہ تربیت ٹھیک ہو۔
س۔ عشق کی کامیابی ذہنی ارتباط ہے۔ یا جسمانی اتصال؟
ج۔ ذہنی ارتباط ہی عشق کی ابتداء ہے، اس کی انتہا خدا معلوم ویسے بقول غالب
"دل کے بہلاوے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"
شمیم احمد انصاری۔ ۲، ہوسا آفتاب ہال مسلم یونیورسٹی
علیگڈھ (یوپی)

—— — :x: ——

# یہ خلش کہاں سے ہوتی ......

از اے۔ بی۔ کام

ایک نئی بات ہوئی

اور وہ

رہ گئے۔ کالج کی رومان پرور فضاؤں میں ایک مہیب سناٹا چھا گیا۔ آج کے واقعہ پر سب ہی کو حیرت تھی ہر طرف اسی کا چرچا تھا۔ طلبا کالج کے "شجر تمنا" کے نیچے، ریڈنگ روم، لائبریری، کامن روم اور حد یہ ہے کہ کلاسوں میں بھی اسی واقعہ پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کچھ یہی حال اندر گرلز کامن روم میں تھا۔ لڑکیاں بھی مختلف ٹولیوں میں بٹی ہوئی آج کے واقعہ پر حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ واقعہ ہوا کیسے۔"

"بیچاری فرزانہ سنے گی تو کیسے برداشت کر پائے گی۔"

"نہ معلوم کیوں یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ ایسا ہوا ہو گا"

—— لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ واقعہ صبح کالج کھلتے ہی پیش آیا تھا۔ پروین جیسے ہی، کالج میں داخل ہوئی اس نے شاہد کو اپنی طرف گھورتے ہوئے پایا۔ وہ حیرت زدہ آگے بڑھتی چلی گئی لیکن شاہد نے آوازہ کسا "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں" اور پھر جب شاہد نے اس کا راستہ روک کر بھونڈے فلمی انداز میں اظہار عشق کی کوشش کی تو وہ ضبط نہ کر سکی اور طمانچے کی زوردار آواز سے کالج کی پرسکون فضاؤں میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح فوراً پورے کالج میں پھیل گئی اور ذرا سی ہی دیر میں کالج کے چپہ چپہ پر اسی واقعہ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ جو سنتا وہ حیرت زدہ رہ جاتا اور بار بار اسی بات کی تحقیق کی جاتی کہ کیا واقعی شاہد ہی نے یہ حرکت کی تھی؟

شاہد کالج میں پچھلے چار سال سے زیر تعلیم تھا۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ ہر اچھے طالب علم کے لئے باعث رشک اور کالج کے لئے وجہ افتخار تھا اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کالج کے سوشل پروگراموں کی جان تھا تقریری مقابلہ ہو یا علمی مباحثہ، بیت بازی ہو یا غزل سرائی، ڈرامہ کا اسٹیج ہو یا کھیل کا میدان وہ ہر جگہ اپنی ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔ اپنے اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کی وجہ سے وہ طلبا اور اساتذہ میں یکساں مقبول تھا۔ آج سے پہلے کسی نے اسے کسی لڑکی پر آوازہ کسنے تو کیا کسی لڑکی کو گھورتے تک نہیں دیکھا تھا وہ خوبرو، لمبا تڑنگا۔ فٹ بال کا بہترین کھلاڑی اگر چاہتا تو عیش کرتا اور خوب کھل کھیلتا مگر اس نے اپنے دامن کو ان تمام آلائشوں سے محفوظ رکھا تھا۔ اس چار سال کے عرصہ میں وہ کالج کا محبوب بن گیا تھا۔

—— اور پھر کسی اچھوتے لمحہ میں فرزانہ اس کی زندگی میں داخل ہو گئی شاہد کے بلند و اعلیٰ کردار کی وجہ سے کسی کو بھی یہ بات ناگوار نہیں گذری لیکچرارز تک ان کے اس پاکیزہ جذبے کی قدر کرتے تھے اور منتظر تھے ان کی شادی کی خبر کے۔ سب کو معلوم تھا کہ شاہد کو اس کی بیوہ ماں نے اس شادی کی اجازت دیدی ہے۔ اور فرزانہ کی قریبی سہیلیوں کے علم میں بھی یہ بات تھی کہ فرزانہ عنقریب اپنے والد سے اس سلسلہ میں تذکرہ کروانے والی ہے۔ لیکن آج کے اس واقعہ نے سب کی امیدوں پر اوس ڈالدی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں کالج کے ماحول پر ایک پرہول سناٹا طاری ہو گیا۔ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی ہر شخص کو فرزانہ کا انتظار تھا۔ سب ہی اس بات کے منتظر تھے کہ دیکھیں فرزانہ اس واقعہ کو کس انداز سے لیتی ہے اچانک اس خاموشی میں ایک زبردست جھٹکا ہوا۔ سامنے سے فرزانہ کا بھائی سراج آ رہا تھا وہ اپنا غصہ ضبط کرتا ہوا شاہد کے پاس پہنچ کر گرجا۔

"اگر تم اتنے ذلیل ہی تھے تو تم نے میری بہن کے ساتھ محبت کا ڈھونگ کیوں رچایا تھا؟"

"محبت! ہنہ —— مجھے پہلے فرزانہ پسند تھی لیکن اب پروین اچھی لگتی ہے"

شاہد نے بالکل لوفروں کے سے انداز میں کہا۔

"کیا؟" سراج کے منہ سے بے اختیار نکلا اور آس پاس کھڑے ہوئے طلبا بھی شاہد کے کردار کی یہ پستی دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

"حیرت کیسی؟ — اگر تمہیں کچھ اور دیکھنا ہے تو شام کو میرے گھر آکر ان لڑکیوں کے فوٹو بھی دیکھ لینا جنھیں میں اس سے پہلے پسند کر چکا ہوں۔" شاہد نے اسی طرح ڈھٹائی سے کہا جواب میں سراج نے اس کا گریبان پکڑا ہی تھا کہ درد میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

"بھائی جان! گھر چلئے" فرزانہ اپنے بھائی سے مخاطب تھی پرویز کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ فرزانہ آگئی ہے تو وہ دوڑتی ہوئی معذرت کرنے چلی آئی۔

"فرزانہ بہن مجھے معاف کردو۔ میری وجہ سے ......"

"...... ایک بہروپئے کی حقیقت سامنے آگئی" فرزانہ نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ آس پاس کھڑے ہوئے لڑکوں کے چہروں پر مسکراہٹیں کھیلنے لگیں۔ مگر شاہد کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اور متغیر چہرہ دیکھ کر سب ہی حیرت زدہ رہ گئے۔ اگر شاہد کے عزیز ترین دوست جمیل نے آگے بڑھ کر اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو شاید وہ لہرا کر گر ہی پڑا ہوتا۔ جمیل نے بگڑتی ہوئی صورت حال کا اندازہ کرتے ہو شاہد کو اس کے گھر پہنچانے ہی میں عافیت سمجھی فرزانہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ واپس جا چکی تھی

شاہد اور فرزانہ دونوں کی غیر موجودگی میں چہ میگوئیوں کا طوفان پھر اٹھ کھڑا ہوا

"کوئی خاص بات ضرور ہے جسے چھپایا جا رہا ہے۔"

"دونوں ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے تھے۔"

"یہ کیسا معمہ ہے؟ یہ شاہد افسردہ کیوں ہو گیا تھا۔"

"پرسوں ہی تو فرزانہ نے اپنی خالہ زاد بہن کے ذریعہ والدین کو اپنی پسند سے آگاہ کیا تھا۔ اور شادی کی اجازت چاہی تھی" فرزانہ کی ہمراز شمیم نے سہیلیوں کو بتایا۔

"مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا کہ شاہد اس حد تک گر سکتا ہے۔"

"آدمی کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔"

...... اور پھر رفتہ رفتہ کالج کی فضا پرسکون ہوتی گئی۔ ہر شخص شاہد کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ اسے مطعون کر رہا تھا۔ واقعی اس نے حرکت بھی تو ایسی ہی کی تھی۔ روشنی کے عظیم ستون کی پستی کسی کو بھی پسند نہیں آئی تھی۔ لیکن نفسیات کے پروفیسر سروپ کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ صبح اس واقعہ کو دیکھنے کے بعد اپنے ڈیپارٹمنٹ میں پہنچنے پر جب انھوں نے اگلے لیکچر کے لئے نفسیات کی موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی کرنے کی کوشش کی تو ذہن نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ نہ معلوم کیوں انھیں آج صبح کے واقعہ میں اپنے ماضی کی پرچھائیاں سسکتی ہوئی نظر آرہی تھیں وہ بار بار بڑبڑا رہے تھے۔

"خدا کرے ایسا نہ ہو — ایسا نہ ہو۔"

وہ سوچ رہے تھے "کہیں ایسا نہ ہو کہ شاہد حالات سے مجبور ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو پروفیسر سروپ ایک بار پھر مر جائیگا۔ نرمل کو ایک مرتبہ پھر موت آجائے گی۔"

آخر اس خلش نے پروفیسر سروپ سنگھ کو چین نہ لینے دیا۔ انھوں نے اپنے چپراسی کو بھیج کر دفتر سے شاہد کا پتہ منگوایا اور اپنے کمرے سے دعا کرتے ہوئے نکلے۔

"خدا کرے ایسا نہ ہو — ایسا نہ ہو۔"

جب پروفیسر سروپ سنگھ شاہد کے گھر کے قریب پہنچے انھیں سڑک پر ہی سے نظر آگیا کہ شاہد کے سرہانے اس کا عزیز ترین دوست جمیل بیٹھا سر دبا رہا ہے۔ پروفیسر جب کمرہ کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے تو انھیں شاہد اور جمیل کی باتیں سننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ انھیں جمیل کی آواز صاف سنائی دی۔

"میں یقین نہیں کر سکتا"

"تم یقین کرو یا نہ کرو۔ حقیقت وہی ہے جس کا صبح میں اظہار کر چکا ہوں۔" شاہد نے جواب دیا۔

"دیکھو شاہد تمہیں فرزانہ کی قسم۔ سچ سچ بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے۔"

"قسم مت دو جمیل! قسم مت دو" شاہد نے جوش میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بتاؤ تاکہ اس ناٹک کی کیا حقیقت ہے؟ یا پھر فرزانہ کی قسم کھا کر تم یہ کہہ دو کہ تمہیں اب فرزانہ سے محبت نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر سکوت طاری رہا۔ اور پھر شاہد کی جذبات سے پُر سسکتی ہوئی آواز پروفیسر کو سنائی دی۔

"ہاں واقعی یہ ایک ناٹک تھا۔ فرزانہ کے والد فرزانہ کی بغاوت سے گھبرا کر میری محبت کو خریدنے کے لئے کل رات یہاں آئے تھے لیکن غریب لوگ محبت بیچا نہیں کرتے۔ قربانی دیتے ہیں۔ میں نے بھی قربانی دی ہے۔ اور ایسی قربانی کہ فرزانہ کے سامنے ایک "بہروپئے" کی حقیقت کھل گئی ہے۔

اندر کمرے میں سسکیاں ابھر رہی تھیں اور باہر پروفیسر سروپ سنگھ اپنی آنکھوں کے گوشوں کو صاف کرتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ آخر وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا۔ شاہد مجبور نکلا — ایک بار پھر سروپ سنگھ مر گیا۔ ایک بار پھر نرمل کو موت آگئی۔

پروفیسر کی خلش دور ہو چکی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس جا رہے تھے جیسے آج وہ دوبارہ نرمل کی لاش کو شمشان گھاٹ پر شعلوں کی نذر کر کے آ رہے ہوں۔ (مرکزی خیال ماخوذ)

●●

دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے اپنے باپ سے بڑھ کر پیارا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ اور باپ کے لئے بچی ہی سب کچھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی بچی کی خوشیوں اور مسرتوں کے لئے آج اور مستقبل میں اس کی شادی کے لئے کافی رقم جمع کر رکھی ہے ــــ بیمۂ زندگی کی صورت میں۔

آپ کی شفقت میں آپ کی بچی کا یقین آپ سے کچھ چاہتا ہے ــــ اور آپ بیمۂ زندگی کی صورت میں اُس کی خواہش پوری کر سکتے ہیں، بس ایک شادی کی بیمہ پالیسی لے لیجئے۔ اور اُس میں لگتا بھی کیا ہے! خدانہ کرے آپ کو کچھ ہو جائے! ایسی حالت میں میعاد پوری ہونے پر اسے بیمے کی پوری رقم مل جائے گی۔ اس بات کا سوال ہی نہیں کہ آپ نے پریمیم کی کتنی قسطیں ادا کی تھیں۔

اگر آپ اپنی بچی کو زندگی بھر شادماں دیکھنا چاہتے ہیں تو اُسے بیمۂ زندگی کا تحفظ دیجئے۔

## آپ بیمۂ زندگی پر بھروسہ کر سکتے ہیں

# چاہ باپ کی
# چاہ بیٹی کی

لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

PNB/LIC 54·69·URDU A

# انتظارِ سحر

غضنفر زیدی

شبِ خموش کی تاریکیوں سے گھبرا کر
میں انتظارِ سحر
جب بھی کرنے لگتا ہوں
کسی کی دید کا ارماں
کسی سے ملنے کا
مگر یہ سوچ کر
وہ بے وفا کبھی میری
شبِ فراق کی بے تابیاں
نہ سمجھے گی
نہ مجھ سے بات کرے گی
نہ مجھ کو دیکھے گی
میں سوچتا ہی رہوں گا کہ اجنبی ہوں میں
میں انتظارِ سحر پھر کبھی نہیں کرتا
میں دل کے داغ جلاتا ہوں
سونی راتوں میں
شبِ خموش یہی ہے
یہی سحر میری

پہلی قسط ـــــ

# ہتھیار اور انسان

عین - صا

”یہ جارج برنارڈشا کے مشہور انگریزی ڈرامے ARMS AND THE MAN کی تلخیص ہے ـــــ مذکورہ ڈرامہ ہندوستان کی مختلف یونی ورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔“

رینا ایک خوب صورت، رومانی اور جذباتی دوشیزہ ہے۔ اس کے وا[لد] میجر پٹکاف اور منگیتر میجر سرجئیس سارانوف بلغاریہ کی فوج میں شامل ہیں۔ بلغا[ریہ] پر سربیا نے فوجی یلغار کر رکھی ہے۔ اور وہ دونوں اپنے وطن عزیز کے دفا[ع] کی خاطر محاذ جنگ پر گئے ہوئے ہیں۔

ایک رات رینا تاروں بھری رات سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے کمرے سے نکل کر بالکونی پر کھڑی تھی۔ سامنے بلقان کی برف سے ڈ[ھکی] ہوئی چوٹیاں ستاروں کی روشنی میں چمک رہی تھیں ـــــ وہ ا[پنے] ہی خیالات میں محو تھی۔ کہ اچانک اس کی ماں کیتھرین اندر داخل ہوئیں اور اس کو ٹھنڈے موسم میں کمرے سے باہر کھڑی دیکھ کر متعجب ہوئیں۔ ا[ور] تھوڑی ڈانٹ کے بعد کہا کہ بلغاریہ نے سربیا کو شکست فاش دیدی ہے اور عظیم الشان فتح کا سہرا اس کے منگیتر سرجئیس کے سر بندھا ہے۔ یہ خب[ر] سن کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ تمام زندگی خیالی شہزادوں اور بہادروں کے خواب دیکھتی رہی ہے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ان خوابوں کی تعبیر سرجئیس کے ذریعہ رونما ہوگی۔ اس کی ماں کو بھی اپنے ہونے والے داماد کی اس بہادری پر گھمنڈ تھا ـــــ اتنے میں ان کی خادمہ لوکا کمرے میں داخل ہوئی۔ اور ان کو بتایا کہ سربیا کے ...

فوجی شہر میں گھس آئے ہیں۔ اور بلغارین فوجی ان کا پیچھا کر رہی ہیں۔
اس لئے کسی بھی وقت گلی میں فائرنگ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا کسی ناخوش گوار
واقعہ سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ گھر کی تمام کھڑکیاں بند کر لی جائیں
یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں بند کرنی شروع
کر دیں۔ اور جاتے وقت اس نے رینا کو آہستہ سے بتا دیا کہ اس کے باہر
جھانکنے کے لئے اس نے ایک کھڑکی کی کنڈی نہیں لگائی ہے۔
کیتھرین اور لوکا کے کمرے سے باہر جانے کے بعد رینا نے سرجئیس
کی تصویر اٹھائی۔ اور انتہائی وجد کے عالم میں اس سے محوِ گفتگو ہو گئی ——
اس کے بعد اس نے تصویر اسی جگہ رکھ دی۔ اور بستر پر لیٹ کر ایک کتاب
پڑھنے لگی۔ مگر چونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے محبوب کی خیالی تصویر رقص
کر رہی تھی اس لئے وہ پڑھ نہ سکی۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھی کہ اچانک باہر
سڑک پر فائرنگ کی آواز نے رات کے سناٹے کو مکدر کر دیا۔ اس نے خوفزدہ
ہو کر شمع کو گل کر دیا۔ اور کمرہ تاریکی میں نہا گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے کمرے
میں کسی کی موجودگی محسوس کی۔ کوئی شخص اس کھلی کھڑکی سے کمرے میں داخل
ہوا —— رینا چیخی :۔
”کون ہے ؟“
جواب میں نو وارد نے ریوالور نکال لیا۔ اور رینا کو خاموش رہنے
کے لئے کہا۔ بصورت دیگر مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ رینا کو معاملے کی تہ
تک پہنچنے میں ذرا دیر نہ لگی سدو برف، کیچڑ اور خون میں لت پت سربین فوجی
تھا۔ اس نے کہا بلغارین اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اور چونکہ وہ مرنا نہیں چاہتا
اس لئے اس کے کمرے میں پناہ لی ہے۔ رینا نے کہا کہ کچھ فوجی موت سے ڈرتے
ہیں۔ نو وارد نے کہا کہ سب ڈرتے ہیں۔ اور یہ فوجی کا فرض ہوتا ہے۔ کہ جب تک
وہ اپنی جان بچا سکتا ہے، بچائے۔ اس کے بعد رینا نے باہر جانا چاہا
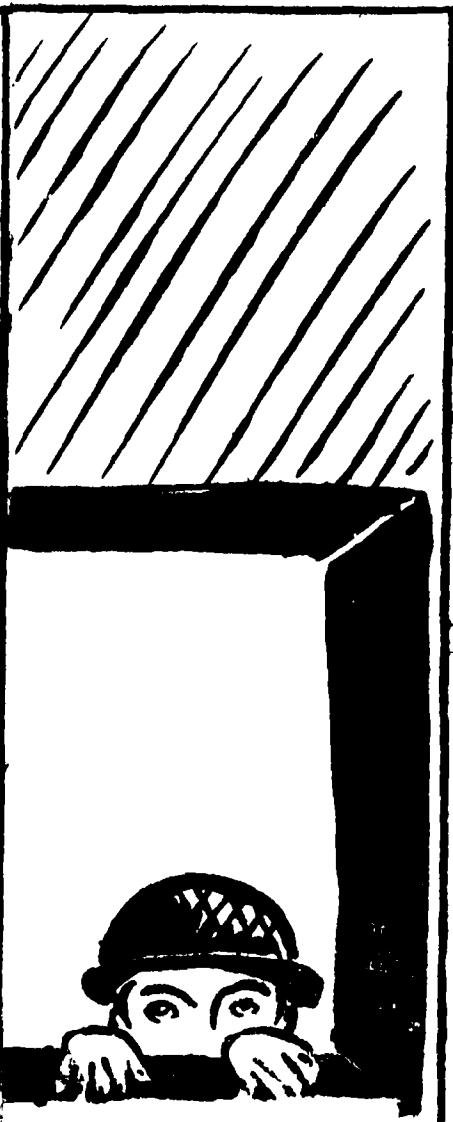
مگراس نے رینا کے گاؤن کو قبضہ میں لے لیا۔ تاکہ وہ شب خوابی کے لباس میں باہر نہ جا سکے۔ رینا اس بے جا مداخلت پر بھنّا ہی تو گئی۔ مگر ایک ہٹے کٹے فوجی کے آگے عورت ذات کر بھی کیا سکتی تھی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اجنبی نے فوراً بھانپ لیا کہ دستک دینے والے بلغاریہ کے فوجی ہیں۔ اور وہ اس کی تلاش میں وہاں پہنچے ہیں۔ اس نے رینا کو مزید تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اس کا کوٹ واپس کر دیا۔ اور خود اپنے دشمنوں سے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ جرأت اور دلیری کا یہ مظاہرہ دیکھ کر رینا کے جذباتِ متنفر ہمدردی اور قدر و منزلت میں تبدیل ہو گئے۔ اور اس نے اجنبی کو بچانے کا تہیّہ کر لیا۔ چنانچہ اس کے کہنے پر وہ اجنبی پردے کی اوٹ میں جا کھڑا ہوا۔ رینا نے دروازہ کھول دیا۔ بلغاریہ کے فوجی اندر داخل ہو گئے۔ انھوں نے کمرے کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ اور بالکونی بھی جا کر دیکھی۔ جب ان کا اطمینان پورا ہو گیا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ تو وہ معذرت کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔

فوجیوں کے ساتھ کیتھرین اور لوکا بھی کمرہ میں آ گئی تھیں۔ کیتھرین کو کوئی شبہہ نہ گذرا۔ لیکن لوکا کی تیز نگاہوں نے پردہ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا، کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میز پر رکھے ہوئے ریوالور کو دیکھ کر اس کا شبہہ اور بھی تقویت پکڑ گیا۔ اور جاتے جاتے اشاروں، کنایوں سے رینا کو بتا گئی کہ اسے اس کا راز معلوم ہو گیا ہے۔ جب سب لوگ کمرے سے باہر گئے تو اجنبی پردے کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ اور کمالِ بے نیازی سے رینا سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی گفتگو بالکل بے رنگ تھی۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ رنگینی اور رومانیت تو اس آدمی کو چھو کر بھی نہیں گئی۔ جب رینا نے اس کو بھوک مٹانے کے لئے چاکولیٹ کریم کی کچھ ٹکیاں دیں تو اس نے بتایا کہ میں لڑائی کے دوران اپنے پاس کارتوسوں کے بجائے چاکولیٹ رکھتا ہوں۔ تو رینا

کو تعجب ہوا۔ اور اس نے اپنے مہمان کا نام ہی چاکولیٹ کریم سپاہی رکھ لیا۔

دوران گفتگو بات کا رُخ لڑائی کی طرف پھر گیا۔ اجنبی نے بلغاری فوج کے افسر کو (جو حُسنِ اتفاق سے رینا کا منگیتر سرجئیس ہی تھا) جی بھر کر بے نقط سنائیں۔ اجنبی کا خیال تھا۔ کہ سرجئیس نے سربین توپ خانے پر اپنی گھوڑ سوار فوج سے حملہ کر کے نہایت حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی یقیناً دوسری دنیا میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے سربیا والوں کو غلط قسم کا گولہ بارود فراہم کر دیا گیا تھا۔ اس لئے نہ صرف سرجئیس اور اسکے ساتھی موت کے گڑھے میں گرنے سے بچ گئے، بلکہ سربیا والوں کو عبرتناک شکست دینے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ جب رینا نے اسے بتایا کہ سرجئیس اس کا منگیتر ہے تو اسے بہت ندامت ہوئی۔ لیکن اپنی بات پر وہ بھی اڑا رہا۔ اس پر رینا کو بہت غصہ آیا۔ اور وہ اس سے کہنے لگی۔ کہ:۔

"تم فوراً ہی میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ! جس نل کو تم پکڑ کر اوپر چڑھے تھے۔ اسی کے سہارے واپس چلے جاؤ!"

یہ سُن کر اجنبی کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ کہنے لگا:۔

"نیچے تو اب مجھ سے اُترا نہیں جاتا۔ تم دروازہ کھول کر شور مچا دو۔ لوگ خود ہی مجھے پکڑ لے جائیں گے۔ اور بعد میں ہلاک کر دیں گے۔" رینا کو ایک بار پھر اس پر رحم آیا۔ اور پھر اس کو اپنے کمرے میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اس کے بعد رینا نے اس کو اپنے خاندان کے بارے میں بتایا کہ وہ میجر پٹکاف کی بیٹی ہے۔ اور ان کا خاندان شریف، امیر اور عزت دار ہے اور اپنے مہمانوں کا خاص خیال رکھنا اس کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اس کے ساتھ رینا نے اُس کو یقین دلایا کہ وہ اس کو ہر قیمت پر بچالے گی —— ایک ... کے ... رات گذارنے کو مناسب سمجھتے ہوئے وہ اپنی ماں کیتھرین کو ... کرنے کمرے کے باہر چلی گئی —— جب وہ کیتھرین کو لے کر کمرے میں ... تو اجنبی سو رہا تھا —— •• پہلا ایکٹ ختم ہوا۔ باقی کے لئے اگلے شمارے کا انتظار کیجئے۔

# کھیل کود

انز: قمر عالم

## ڈیورنڈ کا ایک تاریخی دن

ڈیورنڈ ٹورنامنٹ کی تاریخ دلچسپ کھیلوں اور سخت مقابلوں سے بھری ہوئی ہے۔ ڈیورنڈ کپ نصف صدی تک مسلسل فوجی ٹیموں کے حصے میں آتا رہا۔ لیکن ایک دن ایسا بھی آیا جب محمڈن اسپورٹنگ نے ان کی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔

مقابلہ سخت تھا۔ برطانوی رجمنٹ" فائنل میں مقابلہ پر تھی۔ وائسرائے بھی اس میچ کو دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ محمڈن اسپورٹنگ کو ... سپورٹ حاصل تھی۔ اور اس میچ کا ریفری ایک سابق کپتان ... نام سنگھ تھا۔ اس میچ کو دیکھنے کے لئے لوگ سائیکلوں اور تانگوں پر ہزاروں کی تعداد میں دہلی کے ارد گرد سے بھی آئے تھے

محمڈن اسپورٹنگ جو اس وقت بنگال کی چیمپئن تھی اور ... کپ کی فاتح تھی پہلی بار ڈیورنڈ کے فائنل میں کھیل رہی تھی۔ یوں تو اس سے پہلے بھی غیر فوجی ٹیمیں فائنل تک پہنچیں مگر فائنل اٹھانے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکی۔ میچ آخر کار شروع ہوا۔

علی حسین نے محمڈن اسپورٹنگ کی رہنمائی کی۔ جمعہ خان اور باچی خاں ڈیفنس میں کھیل رہے تھے۔ باچی خاں گرم مزاج آدمی تھا۔ اس کی مڈبھیڑ سیمی فائنل میں ویلش رجمنٹ کے کھلاڑی سے ہو چکی تھی۔ عثمان رشید خاں اور معصوم ... میں کھیل رہے تھے۔ جب کہ نور محمد۔ کریم۔ حافظ رشید۔ صابو اور رحمان فارورڈ لائن میں تھے اور برطانوی ڈیفنڈر پر بھرپور حملہ کرتے تھے۔ حافظ رشید بہترین اسکورر تھا اس کے شارٹ فرسٹ ٹائم اور تیز تھے۔ ادھر صابو کے پاس بہت خوبصورت تھے۔ نور محمد نے پہلا گول ہاف ٹائم سے کچھ دیر پہلے کیا لیکن کچھ ہی منٹ کے بعد مخالف ٹیم کے وارسین نے ایک گول کر کے میچ برابر کر دیا۔ صابو نے کھیل ختم ہونے سے دس منٹ قبل دوسرا گول کیا اور اس طرح اس گول سے محمڈن نے یہ میچ جیت لیا۔ محمڈن اسپورٹنگ واحد ہندوستانی ٹیم تھی جو غیر فوجی ہوتے ہوئے ڈیورنڈ کے فائنل کو اٹھا رہی تھی۔ یہاں سے محمڈن اسپورٹنگ کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اس میچ کے جیتنے پر کئی رائیں ظاہر کی گئیں مخالف ٹیم چھ دن میں پانچوں دن مسلسل کھیل رہی تھی اس کو میچ میں آرام کے لئے کوئی وقفہ نہیں ملا تھا جتنے بھی میچ کھیلے وہ سب سخت مقابلے کے تھے جبکہ محمڈن اسپورٹنگ کی پوری سائڈ آسان تھی اور ان نے تمام میچ آسانی سے جیت لئے بہر حال کچھ بھی ہو محمڈن اسپورٹنگ نے پہلی بار اس کپ کو اٹھا کر ڈیورنڈ کی تاریخ میں اپنا نام لکھوا ہی لیا

محمڈن اسپورٹنگ آج بھی ہے اس کا نام زندہ ہے مگر اس کے کھیل میں جو جمود آ گیا ہے۔ اس کو ختم کرنے کیلئے اگر اس میں نیا خون شامل کیا جائے تو محمڈن پہلے کی محمڈن بن سکتی ہے اس کی سپورٹ کھلاڑیوں کی مسلسل پریکٹس اور کوچنگ کو لیکر ... نئے طرز پر کیا جائے تو یہ بنگال کی ٹیم پھر سے اپنے کھیل کا لوہا منوانے میں ضرور کامیاب ہو گی۔

# مجھ جیسے سگریٹ نوش ہر مہینے ۱۰۰ کروڑ سے زیادہ یہ سگریٹ بڑے شوق سے کیوں پیتے ہیں؟

## بے شک چارمینار کے ذائقے کی وجہ سے!

ہم چارمینار سگریٹ پینے والے ہر سال ۱۲۰۰ کروڑ سے زیادہ چارمینار سگریٹ اس وجہ سے طلب کرتے ہیں کہ ان میں ایک خاص خوبی ہے۔ وہ خوبی ہے ذائقہ۔ چارمینار میں یہ ذائقہ آتا ہے اس خالص تمباکو سے جسے بڑی احتیاط کے ساتھ کاشت کیا جاتا ہے اور جسے ماہر بڑی ہوشیاری سے تیار کرتے ہیں۔

جی ہاں، ہم میں سے لاکھوں چارمینار کے ذائقے کے گرویدہ ہیں (اس میں جھوٹ کی کوئی بات نہیں کہ بھارت میں ہر مہینے ۱۰۰ کروڑ سے بھی زیادہ چارمینار سگریٹیں پی جاتی ہیں)۔

10 CIGARETTES
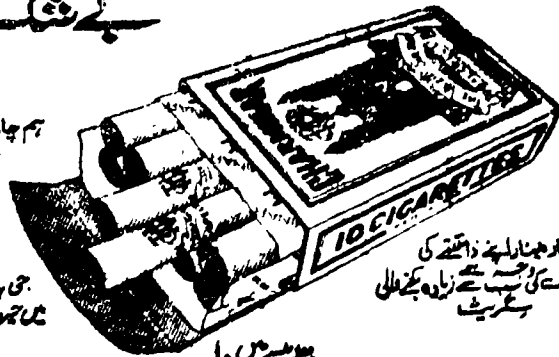
چارمینار اپنے ذائقے کی وجہ سے بھارت کی سب سے زیادہ بکنے والی سگریٹ

پیسے میں ۱۰

VSC/C-3

مرتب ــــ نامہ بر
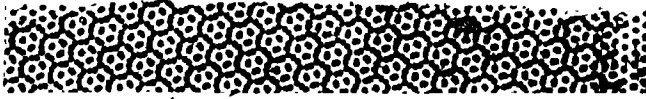
"قارئین کے وہ پیغامات جو وہ کسی کو پہنچانا چاہتے ہیں شائع کئے جاتے ہیں ــــ
ــــ پیغام خواہ رومانی ہوں یا جذباتی مگر بھیجتے وقت خیال رکھیں کہ وہ تہذیب
اور ادب کے دائرے میں ہوں۔"

●ــــ

تم نے ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا تھا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے ــــ اور سب سے بڑی سزا کیا ہے ــــ؟ میرے خیال میں سب سے بڑا گناہ اپنی محبت کا اقرار کرنا ہے ــــ اور سب سے بڑی سزا کسی کو اسکے ماضی کی یاد دلا دینا ہے۔ ــــ

بقول شاعر : یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

سید محمد راشد بی. اے جامعی
ہوشنگ آباد ــــ ایم.پی.

●ــــ

کیا تم کو معلوم ہے کہ اس دن مشاعرے کے پنڈال سے تمہارے چلے آنے کے بعد مجھ پر کیا گذری ــــ؟ میں بہت دیر تک تمہارے خیالات میں گم صُم پتھر کی مورتی بنا ساکت و جامد تمہاری خالی سیٹ کی جانب دیکھتا رہا.... دیکھتا رہا.... د ے کہ ت ا ـ ر ہ ا ـــ اور پھر میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ــــ میرے اس طرح دیکھنے نے کہیں تم کو ناراض تو نہیں کردیا ــــ جو تمہارے جلدی اٹھ جانے کا باعث بنا ہو ــــ۔

اے. صدیقی دہلی
متعلم دلی یونی ورسٹی دہلی۔

●ــــ

بہت سا خلوص، بے کراں محبت ــــ!
آج میں اپنے وعدے اور تمہارے حکم کے پیشِ نظر دوسرا خط لکھ رہا ہوں. پہلا خط ابھی تک میری نظروں کے سامنے ہے اور تم تک نہ پہنچنے کا گلہ کر رہا ہے۔ اسکا گلہ یقیناً قابلِ اعتنا ہوتا اگر مجھے اپنی کوتاہ دستی کا احساس نہ ہوتا ــ میں اس وقت دہلی سے سینکڑوں میل دور ہوں لیکن میری روح، عقل وفہم وفراست سب تمہارے گرد مصروف طواف ہیں اب

اسے تم تیرہ بختی پر محمول کرو یا خوش بختی پر ۔۔ بس اس پر بھی نازاں ہوں کہ میں نہیں تو میری روح تو تمہارے گرد گردش میں ہے ـــــ لیکن اس کے باوجود ۔۔ ع

تیرے اشارے پہ جیتے ہیں اور مرتے ہیں ــ + ــ مگر وہ ہم ہیں کہ پھر بھی وفا شعار نہیں

رات کا وہی جان لیوا وقت ۔ تنہائی سانپ بن کر ڈسنے کو آتی ہے ۔ اور سکون اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہیں ۔ میرے چاروں طرف عجیب سا سناٹا ہے ۔ سب سو رہے ہیں اور میں تارے گننے کی کوشش کرتا ہوں تو وہاں دماغ اور نظر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ۔ اور دل کی بات لبوں پر یوں ظہور پذیر ہوتی ہے کہ . . . . .

ع شب فراق کی تنہائیاں ارے توبہ ــ + ــ چلے بھی آؤ کہ اب تاب انتظار نہیں.

ایکے زبان زد ہونے کے بعد بھی جب دلِ مضطر کو کسی پہلو قرار نہیں ملتا تو صرف دل کے بہلا دے کے لئے . . . . .

ع ملا ہی کرتا ہے اک لطفِ زندگی اس میں ــ + ــ فراقِ یار سے اچھا تو وصلِ یار نہیں

اب تمہاری حالت کیا ہوگی ۔۔؟ اسکا مجھے اندازہ نہیں ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ۔ تمہاری حالت میری جیسی نہ ہوگی ۔ اور ہو بھی کیسے سکتی ہے ۔۔؟ تم قدرت کا ایک حسین شاہکار ہو جسے صرف دور سے دیکھا جا سکتا ہے ۔۔ جسے دیکھ کر خالق کائنات کے مکمل کاریگر ہونے کا معترف ہونا پڑتا ہے ۔۔ لیکن جسکے حصول سے پہلے ہی اپنا تنگ دامنی اور کوتاہ دستی پر نظر جاتی ہے تو بے اختیار یہ سوچتا ہوں کہ " کہیں میں نے کسی سراب کے پیچھے تو اپنا کاروان حیات نہیں ڈال دیا ۔۔؟" پھر جوں ہی تمہاری شوخ و شنگ نظریں اور یاسمین دلنشین کی سی مسکراہٹ میری نظروں میں آتی ہے تو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ . . . . .

ع نثار کیوں نہ کروں تجھ پہ اپنا قلب و جگر
جہاں میں تجھ سا کوئی جبکہ طرح دار نہیں.

تمہارا دل سے معترف
" . . . . . . . . . . . "
متعلم دلی کالج دہلی .

---

مجھے معاف کر دینا ـــــ میری عزیز ترین سہیلی ـــــ تمہاری شادی میں شریک نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں تم سے ناراض ہوں ـــ یا خدا نخواستہ مجھے تمہاری یہ شادی ناپسند تھی ـــــ اس کے برعکس میری عدم موجودگی صرف اس وجہ سے تھی کہ میں تم کو اپنے سے جدا ہوتے دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی تھی.

ریحانہ سلطانہ الہ آباد

# افکارِ نو ...

تبدیلیٔ رجحانات کے پیشِ نظر لوگ یہ جاننے کیلئے بے چین ہیں کہ آج کا جوان ذہن زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کس زاویے سے دیکھتا ہے۔
اسلئے ان افکار اور رجحانات کی ترجمانی کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ میں شمیم احمد انصاری (متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے خیالات شامل ہیں۔
آپ اپنے افکار بھیجئے وقت اختصار کا دامن تھامے رکھیں۔

س۔ ہندوستان میں رائج طریقۂ تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے میں آپ کیا کیا چیزیں ضروری سمجھتے ہیں اور کیوں؟

ج۔ ہندوستان میں یہ طریقۂ تعلیم بالکل ناکام ثابت ہوا۔ ایک سو بیس سال کے عرصہ کا سروے کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ یہاں صرف ۲۹ فیصد لوگ خواندہ ہیں۔ یعنی ۲۹ فیصد لوگ انگوٹھا ٹیک نہیں ہیں جبکہ ۷۱ فیصد لوگ انگوٹھا ٹیک ہیں۔ اگر ہماری تعلیم کی رفتار یہی رہی تو ہندوستان کو مکمل تعلیم یافتہ ہونے کے لئے کم از کم پانچ صدیوں کی مدت درکار ہوگی۔ اس لئے موجودہ تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلی آنا ضروری ہے کم از کم ثانوی درجہ تک تعلیم لازمی اور فری کی جانے دوسرے علمی زندگی کے ساتھ طلباء کو عملی تعلیم دینا بھی ضروری ہے

س۔ بے روزگاری کو ختم کرنے میں حکومت اور نوجوانوں کا کیا کردار ہونا چاہیئے؟

ج۔ ہندوستانی آبادی کا ۸۰ فیصد حصہ غیر شہری علاقوں میں رہتا ہے۔ اور ہندوستان کے بے شمار دیہات ایسے ہیں جہاں اگر تعلیم یافتہ بے کار نوجوان پہنچ کر کام کرنا شروع کر دیں تو یہ نہ صرف حکومت کے ساتھ تعاون ہوگا۔ بلکہ ملک کی خدمت کے ساتھ ساتھ بے روزگاری کی لعنت دور کرنے میں کامیابی ہوگی طلبا کو اکثر زراعت پر زور دینا چاہیئے۔ اور حکومت کو ایسے عملی نوجوانوں کے زندگی سہولیات فراہم کرنی چاہیئے۔

س۔ کیا شادی کرنے میں والدین کی مداخلت ضروری ہے؟

ج۔ کاش آج کا نوجوان اگر اپنے متعلقین کو سامنے رکھے تو وہ کبھی یہ بات نہیں سوچ سکتا کہ شادی کے معاملات والدین کی مداخلت ضروری ہے۔ ماں باپ کس ارمان اور آرزوں کو اپنے بچے سے وابستہ کرکے اس کی پرورش کرتے ہیں اور جب شادی کا موقعہ آتا ہے تو والدین کو مکھی کی طرح نکال دیا جاتا ہے۔

اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ وہ والدین کی صف میں ہو۔ اور اس کی اولاد اس کی کوئی حیثیت نہ سمجھے۔ پھر بھی والدین کو لڑکے لڑکی کی مرضی کو بھی ملحوظ نظر رکھنی چاہیئے۔

س۔ کیا ایک بیوی کیلئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے؟

ج۔ بالکل نہیں۔ کیونکہ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جو اخلاق تہذیب نہ سکھاتی ہو۔ ایک بیوی کا تہذیب یافتہ ہونا جتنا ضروری ہے اتنا تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں ہے، اور تہذیب بغیر

باقی صفحہ ۲۱ پر

TRADE
SMW
MARK
Supreme
A NAME
TOWERING ABOVE OTHERS
IN QUALITY & WORKMANSHIP
IN HOUSE HOLD WARES

قارئین شاہجہاں کے خطوط کے اقتباسات شائع کئے جاتے ہیں ــــ شاہجہاں پڑھنے والوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ اس کو بہتر سے بہتر بنانے میں اپنی رائے سے نوازیں ــــ (ادارہ)

● "میگزین شاہجہاں" نظر سے گذرا۔ بہت خوب ہے۔ آپ کی کاوش کا عمدہ ثمر ــــ طالب علموں کی صلاحیات اُجاگر کرنے اور اُن کے ذہن کو تقویت دینے میں آپ کا رسالہ معاون ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی آپ کا یہ قدم قابلِ تحسین ہے۔

(گلشن آرا نیچریس، ہیڈ مسلم گرلز اسکول دہلی)

● اگر مس ناہید قریشی نے اپنے نوکِ قلم سے سرگرداں صاحب اور ادارہ کے ہم جنسوں کے نشتر لگانے شروع کر دیئے ہیں تو یہ تو ان کا اور ان کی ہم صنفوں کا پیدائشی اور فطری حق ہے (اور اس صنف سے نشتر بھی سہہ لی جائیں تو برے نہیں جو اپنے پیچھے میٹھی میٹھی کسک چھوڑ جاتے ہیں) لیکن سرگرداں صاحب نے اس نشتر کی چبھن سے بلبلا کر جو رویہ اختیار کیا ہے وہ نہ صرف میرے لئے بلکہ اکثر قارئین کے لئے ناگوار ہوگا آپکے عنوان ــــ "ادھ کھلے پھول" جنھیں آبیاری کی ضرورت ہے سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اب ان کملائے نیم شگفتہ کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ انھیں ان ابتدائی سیڑھیوں پر سہارا پاکر اونچی منزلوں تک پہنچنے کا موقعہ مل سکے ایک تعلیمی ماحول میں ایسی سرگرمیاں بہت مفید بلکہ ضروری ہیں۔

اس سلسلہ میں میری تو یہ ہے کہ تعارف کرتے ہوئے اس نو آموز قلم کار کی فنی خامیوں اور کمزوریوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ آئندہ اسے ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے اپنی اصلاح کا موقعہ ہے۔ اُمید ہے سرگرداں صاحب بے لوث اور مخلصانہ مشورہ کو شرف قبولیت بخشیں گے۔

(مظفر سعید۔ دہلی یونیورسٹی)

● گذشتہ تین ماہ سے ماہنامہ شاہجہاں کے مطالعہ کا شرف حاصل کر رہا ہوں اُردو دشمنی اور فحاشی کے اس دور میں شاہجہاں جن اصولوں اور مقاصد کو لے کر میدان عمل میں آیا ہے وہ قابل قدر ہیں۔

میں تنقید برائے تنقید کا قائل ہیں۔ اور اسی لئے گذشتہ تین ماہ سے بالکل خاموش تھا لیکن تازہ شمارہ دیکھکر بہت مایوسی ہوئی کہ آج بھی کتابت کی غلطیوں کی بھرمار ہے۔ دوسری چیز "خیالات کے جھروکے سے" کے کالم میں جناب سید غلام سمنانی صاحب نے بالکل درست فرمایا ہے کہ اگر شعری حصہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کی گئی تو بحور واوزان اور فن عروض کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ہاں ہمارے اس محبوب جریدہ کی علمی وادبی شہرت ضرور متاثر ہو سکتی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ موصوف کے مشورہ کی قدر کریں گے اور شاہجہاں کے حصہ منظومات پر خاطر خواہ توجہ فرمائیں گے۔

"ادھ کھلے پھول۔۔۔۔" کے کالم میں اس مرتبہ محترم سرگرداں دہلوی نے مس ناہید تاج قریشی کا تعارف تو کم کرایا ہے البتہ صنف نازک کی تاریخ اور صفات زیادہ بیان فرمائی ہیں۔ میرے خیال میں مذکورہ عنوان کے تحت یہ کچھ مناسب نہیں ہے۔

مارتن

حالیہ شمارہ سے آپ نے ترجمہ و تلخیص کا جو سلسلہ شروع
ہے۔ وہ بہت دلچسپ اور مفید ہے۔ امید ہے کہ مستقبل
آپ اس کو جاری رکھیں گے اور انتخاب کو مزید مفید بنائیں گے۔

خالد ندیم بلدوانی

— جب کشتی طوفان میں گھر جاتی ہے اور خدا کو اسے بچانا
تا ہے تو کوئی نہ کوئی ناخدا اسے بچا ہی لیتا ہے خاموشی کسی
فان کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور طوفان کچھ نہ کچھ اثر ضرور
تا ہے۔ قومیں بھی ایسے مراحل سے گذرتی ہے خاموشی
فان، تباہی، نشاۃ الثانیہ "شاہجہاں" ایسے طوفان
ہے جن کا نتیجہ قوم کو مفلوج کرنا ہوتا ہے بچا سکے گا۔
میری تمام تر کوششیں اور دعائیں اس کی کامیابی کے
لئے ہیں۔
خدا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جن میں سے ایک میں
ہی کامیاب کرے۔

کشتیاں سب کی کنارے لگ ہی جاتی ہیں
ن کا ناخدا نہیں ان کا خدا ہوتا ہے

آپ کا خادم۔ سید راشد جامی

— طویل انتظار کے بعد اور بہت کوشش سے جب فروری
شمارہ ملا تو ایک ہی نشست میں پورا ختم کر دیا ..... یہ شمارہ
پچھلے شماروں سے کچھ بہتر ہے۔ خدا کرے "شاہ جہاں" اسی
طرح سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔
کتابت کی غلطیاں کبھی کبھی بہت گراں گزرتی ہیں۔ اس
تو کئی جگہ "نے" کے بدلے "کے" لکھا ہے۔ اس خامی کو
دور کریں کسی سے ذرا سا بے تکلف ہونا یہ مطلب نہیں
ہوتا کہ اس کا نظریہ کچھ اور ہے۔ ناہید تاج صاحبہ نے "بازدید"
اس پہلو کو بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ دوسرے
دیبوں کو بھی چاہیے کہ وہ عشق محبت کے علاوہ کسی
دوسرے پہلو سے افسانہ لکھیں"

خلوص کیشش۔ آئی یو۔ جاوید
کے۔ جی، کے کالج۔ مراد آباد یو، پی

— اکثر کرم فرماؤں نے اس مرتبہ "دیر کھلے پھول" کے بارے
میں لکھا ہے۔ میں ان کی غلط فہمی دور کرنا اپنا فرض سمجھتا
ہوں۔ "خاکہ کشی" تذکرہ نویسی" اور تنقید میں بہت نمایاں
فرق ہے۔
"خاکہ کشی" میں انسان کی ذاتیات سے بحث کی جاتی
ہے۔ اس کے اوصاف اور عیوب پر نظر ڈالنا خاکہ نویس
کا فرض ہوتا ہے، تبصرہ اور تذکرہ ادیب اور نقاد کا
کام ہے۔ خاکہ نویس کا نہیں اور چونکہ مذکورہ عنوان کے
تحت ان ادیبوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جو ادب کے
میدان میں نووارد ہوتے ہیں۔ اور جن کا کوئی ادبی سرمایہ
نہیں ہوتا اس لئے ان کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ تنقید یا
تبصرہ اسی صورت ممکن ہے۔ جبکہ وہ صاحب تصانیف
ہوں۔ (سرگرداں)

اس عنوان کے تحت" مختلف تعلیمی اداروں کی ادبی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔

—— اُردو، عربی، فارسی، سوسائٹیوں کی سکریٹری صاحبان سے درخواست ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کے زیر اہتمام ہونے والے فنکشن کی قبل از وقت اطلاع دیں۔ یا مختصراً رپورٹ ہمیں ارسال کریں۔ ہم ممنون ہوں گے۔

## لجنۃ الادب کے زیر اہتمام مولانا عبداللطیف صاحب

### (صدر شعبہ عربی دلی کالج) کی صدارت میں بزم مقالات

کرسمس کی چھٹیوں کے بعد کالج دوبارہ کھلنے پر دلی کالج میں لجنۃ الادب (عربی لٹریری سوسائٹی) کے زیر اہتمام ایک سنجیدہ ادبی نشست ہوئی جس کی صدارت شعبہ عربی کے صدر محترم مولانا عبداللطیف صاحب اعظمی نے فرمائی۔

ابتدا میں صاحب صدر نے اس نشست میں پڑھے جانے والے مقالات پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی افادیت اور اہمیت پر زور دیا۔ اس کے بعد انیس الرحمٰن صاحب (سکریٹری لجنۃ الادب) نے "معلقات" پر اور راقم الحروف نے "ڈاکٹر طٰہٰ حسین" پر انگریزی میں مقالات پڑھے اور طلباء کے اشکالات کا جواب دیا۔ بعد ازاں ایک ایرانی طالب علم خلیل ابراہیم نے عربی میں "عرب اسرائیل جنگ" پر عربی موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا جسے بہت

آخر میں صاحب صدر نے اول الذکر دونوں تشنہ گوشوں کی تشریح کی اور خلیل ابراہیم صاحب کا مختصر اُردو میں ترجمہ فرمایا اور پھر جلسے کے دور نشست ختم ہوئی۔

## دلی کالج کی انجمن فارسی کے افتتاحی فنکشن میں علامہ غلام مصطفیٰ کا "امیر خسرو اور ان کا عہد" پر بصیرت افروز مقالہ

کئی مرتبہ پروگرام ملتوی ہونے کے بعد اللہ اللہ کر کے جنوری کو وہ ساعت نیک آ ہی گئی کہ جب انجمن فارسی

حزب مخالف کی رہنمائی میں بول چکی ہیں۔ دہلی کالج کی ٹیم سے قبل سکریٹری ڈبیٹنگ سوسائٹی نے دونوں ٹرافیوں کا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ "مرسلین ٹرافی" کالج کے ایک طالب علم محمد مرسلین کے انتقال پر اس کے چند دوستوں نے دی تھی تاکہ ان کے مرحوم دوست کی یاد ہر سال منائی جاتی رہے۔ اور "یوسف فیروز ٹرافی" بھی کالج ہی کے ایک سابق طالب علم یوسف فیروز صاحب جو آج کل کلکتہ کے مشہور تاجر ہیں انھوں نے مرحمت فرمائی تھی۔

بہر حال دلی کالج (مارننگ) کے علاوہ دلی کالج ایوننگ سے شمس الحق صاحب عثمانی اور محمد اکرم صاحب، جامعہ کالج سے عقیل الحسن صاحب اور اکرم فرشوری صاحب کے، ایم، کالج سے شبیہ احمد صاحب اور محمد ہارون صاحب، دلی یونیورسٹی سے جعفر عباس صاحب ہندو کالج سے محمد جمیل صاحب اور کالج آف آرٹس سے مختار الزماں صاحب نے اپنے اپنے کالجوں کی نمائندگی کی۔

اس کے بعد فوراً ہی آل انڈیا مرسلین ٹرافی ڈبیٹ شروع ہو گئی جس کا موضوع تھا "مقامی زبانوں میں تعلیم دینا ملک کی یکجہتی کے لئے خطرناک ہے" دلی کالج سے موضوع کی موافقت میں لیاقت مرزا صاحب اور مخالفت میں عبد اللہ اسلم صاحب نے تقریر کی اس کے بعد دلی کالج (ایوننگ) کے۔ ایم کالج، دلی یونیورسٹی کی مندرجہ بالا ٹیموں کے علاوہ سیفیہ کالج بھوپال سے شفیق درانی صاحب اور عبد الخالق صاحب صدیقی، شیعہ کالج لکھنؤ سے ذوالفقار حیدر صاحب اور آفتاب حسن صاحب، انوار العلوم کالج حیدرآباد سے اسلم فرشوری صاحب اور غوث پاشا صاحب حمیدیہ کالج بھوپال سے راشد سعید خاں صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اختر الواسع صاحب اور ظفر یاب جیلانی اور علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے آئی۔ آر قدوائی اور فضیل وارث صاحب نے اپنے اپنے اداروں کی نمائندگی فرمائی۔

مقابلہ ختم ہونے پر جج صاحبان نظر کار کی قسمت کا فیصلہ کرنے چلے گئے اس دوران میں صاحب صدر جناب شیو پرشاد صاحب (صدر شعبہ اردو دلی کالج) نے اپنا خطبہ صدارت اور لکھنؤ کی ٹیم کے شرکاء نے ایک ایک غزل مرحمت فرمائی اتنے میں سید ضمیر حسن صاحب لکچرار شعبہ اردو نے نتائج کا اعلان اور ڈاکٹر ظہیر احمد صاحب صدیقی (ریڈر دلی یونیورسٹی) نے اپنے دست مبارک سے انعامات تقسیم فرمانا شروع کر دیئے۔

آل انڈیا مرسلین ٹرافی ڈبیٹ کا پہلا انعام عبد اللہ اسلم کو عطا کیا گیا۔ دوسرے انعام کا مستحق اختر الواسع صاحب کو قرار دیا گیا اور تیسرا انعام فضیل وارث صاحب کو ملا۔ ٹرافی کے ایم کالج کو ملی اور پہلا انعام شمس الحق عثمانی صاحب کو، دوسرا انعام جعفر عباس صاحب کو اور تیسرا انعام محمد ہارون صاحب کو دیا گیا۔

## دولت حسین اسکول میں مشاعرہ

دولت حسین مسلم انڈین ہائر سکنڈری اسکول یونین کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ بتاریخ یکم فروری ۱۹۷۰ء بوقت ۸ بجے شب منعقد ہوا جس کا افتتاح آنریبل جسٹس ایم، این شکلا صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد نے کیا۔ اور صدارت کے فرائض راجکماری سوج کلا سنہا صاحبہ نے انجام دیئے۔ مشاعرہ نہایت پرسکون خوشگوار اور ادبی فضا میں دو بجے شب تک جاری رہا۔ الہ آباد کے تعلیم یافتہ اور باذوق لوگوں کی بہت بڑی تعداد سامعین پر مشتمل تھی مندرجہ ذیل شعرائے کرام نے اپنی پر کیف تخلیقات سے سامعین کو محظوظ کیا۔

حضرت نشور واحدی۔ پروفیسر سید احتشام حسین قمر بجنوری ماہر الحمیدی تال لکھنوی راحم کانپوری اور دیگر مقامی و غیر مقامی شعرائے کرام۔

انڈیا کالج دہلی
کے
پرنسپل جناب کے۔ ایل۔ اروڑہ
کالج
کے سالانہ فنکشن میں۔

(رپورٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

فنکشن منعقد ہوا۔ سکریٹری انجمن فارسی نے ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی (لیکچرار شعبۂ اُردو) سے کرسیٔ صدارت کو زینت بخشنے کی درخواست کی جسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا گیا۔

سب سے پہلے ڈاکٹر محمد یونس صاحب جعفری (صدر انجمن فارسی) نے صاحب مقالہ جناب سمنانی صاحب کا تعارف اپنے مخصوص پُرلطف انداز میں کرواتے ہوئے فرمایا۔ کہ سمنانی صاحب اگرچہ دلی کالج ایوننگ میں انگریزی کے لیکچرار ہیں لیکن ان کو عربی فارسی اور اُردو ادب پر نہ صرف گہری نگاہ ہے بلکہ وہ خود بھی اپنی فارسی اور اردو غزلوں اور نظموں سے ادبی سرمایہ میں گرانقدر اضافے کر رہے ہیں اس کے بعد صدر انجمن فارسی نے سمنانی صاحب سے اپنا مقالہ پڑھنے کی درخواست کی۔ سمنانی صاحب نے اپنے مقالہ Khusro And His Time میں فارسی کے مشہور شاعر خسرو کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ خسرو کا دور انتشار اور بدنظمی کا دور تھا۔ اور ایسی فضا "غزل" کے لئے ساز گار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خسرو کی غزلوں میں غزل اپنی معراج پر نظر آتی ہے سمنانی صاحب نے مقالہ کے "اشاروں" کی دلیل اور ان کی وضاحت میں خسرو کے اشعار سے مثالیں دیں لیکن فارسی اشعار کا ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے ان اشعار کو صرف چند "نکتہ سنج" حضرات ہی سمجھ سکے۔

سمنانی صاحب کے اس بصیرت افروز مقالہ کے بعد۔

ایک ایرانی طالب علم خلیل ابراہیم صاحب نے فارسی میں ایران کے موجودہ سیاسی حالات پر ایک مقالہ پڑھا جس میں شاہ ایران کی مذہبی اور تعلیمی پالیسیوں کی تعریف و توصیف کی۔ بعد ازاں صاحب صدر کی پُرمغز تقریر پر یہ علمی محفل اختتام پذیر ہوئی۔

راقم الحروف کو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ اس مفید علمی مجلس میں اگرچہ ایک اچھی خاصی تعداد میں اہل ذوق حضرات موجود تھے مگر پھر بھی یہ تعداد پچھلے برسوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ جو طلبا سردی کی شدت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے وہ تو واقعی مجبور تھے (اور مظلوم بھی اس لئے کہ سکریٹری صاحب نے حاضرین کو صرف چائے سموسہ پر ہی نہیں ٹرخایا بلکہ لوا ئلڈ انڈوں سے بھی ان کی خاطر کی) اور جو طلباء اپنی "بدذوقی" کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تو وہ "قابل معافی" ہیں ان سے نہ کوئی گلہ نہ شکایت۔ "لیکن" فائنل ایئر کے وہ طلباء جو "امتحان کے قرب" کی وجہ سے شریک نہ ہوئے انھیں میں "محروم" ہی کہوں گا۔ اس لئے کہ سمنانی صاحب کا مقالہ دراصل انہی کے لئے تھا اور انہی کے امتحان کے نقطۂ نظر سے انتہائی کارآمد۔

## ڈبیٹنگ سوسائٹی (دلی کالج) کے زیر اہتمام انٹر کالج یوسف فیروز ٹرافی اور

## آل انڈیا مسرّت سلیم ٹرافی اُردو تقریری مقابلے!

۳۱ جنوری ۱۹۷۰ء کا دن راقم الحروف کے خیال میں اس موسم سرما کا سرد ترین دن تھا۔ سودا کے مشہور قصیدے

سے "سردی اب کے برس ہے اتنی شدید

صبح کو نکلے ہے کانپتا خورشید"

سردی میں سورج کانپتا ہوا ہی سہی نکلتا تو ہے لیکن بادل اور کہر کی وجہ سے اس دن تو صبح تا شام اس کانپتے کپکپاتے سورج کی بھی شکل نظر نہیں آئی۔ سودا کی قصیدے کے تمام ناقابل یقین اور ناقابل عمل "مبالغے" "عین الیقین" اور بالکل "حقیقت" ہو گئے تھے۔ ایسی شدید سردی میں چند سرپھرے اپنے کالج اور اپنے شہر (بلکہ اپنے لحاف) چھوڑ کر نہ صرف یہ کہ دلی کالج کے سرد ہال میں جمع تھے بلکہ اپنے زور بیان کی گرمی سے حاضرین کو "گرمانے" کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں میں چائے صرف بیدار رہنے پر ہی پیتا ہوں لیکن اس دن چند احباب کے ساتھ چوتھی پیالی چائے پینے کے بعد جب میں ہال میں پہنچا تو مقابلہ شروع ہوئے دیر ہو چکی تھی تو معلوم ہوا کہ انٹر کالج یوسف فیروز ٹرافی کا یہ تیسرا مقرر ہے جو اسٹیج پر سردی سے کانپ رہا ہے۔

اس سے قبل ہی کالج کے تینوں روحانی جوب ۔۔۔ اور مس ۔۔۔

# انڈیا کالج، بھاگیرتھ پیلیس چاندنی چوک دہلی ۶ میں سالانہ فنکشن!

## (گرلز ونگ) زیرِ صدارت، سابق ائر چیف مارشل سردار ارجن سنگھ،

## رسم افتتاح شری ویشوبندھو گپتا ایڈیٹر روزانہ تیج دہلی۔

## (بوائز ونگ) زیرِ صدارت شری رام گوپال شال والے ممبر پارلیمنٹ

## رسم افتتاح شری جنار دھن گپتا ممبر میٹرو پالیٹن کونسل

پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی انڈیا کالج کا سالانہ جلسہ بڑی شان و شوکت سے منایا گیا جس کی صدارت ہندوستان کے ہر دلعزیز سابق ایئر چیف مارشل سردار ارجن سنگھ نے کی۔ سب سے پہلے کالج کی لڑکیوں نے سردار صاحب کو گارڈ آف آنر دی۔ اس کے بعد جونہی سردار صاحب ہال میں داخل ہوئے لڑکیوں نے تالیاں بجا کر پرجوش سواگت کیا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے شری ویشوبندھو گپتا ایڈیٹر روزانہ تیج نے صدر صاحب کو ہار پہنا کر سواگت کیا بعد میں کالج کے پرنسپل شری کے۔ ایل اروڑہ نے صدر صاحب کا سواگت کیا اور شری ایچ۔ ایس گپتا نے صدر صاحب کی خدمت میں ایڈریس پڑھا اور پرنسپل صاحب نے صدر صاحب کو پیش کیا۔

اس کے بعد کالج کی لڑکیوں نے شاندار کلچرل پروگرام پیش کئے اور قومی ترانے گائے سب سے [illegible] پروگرام پیلنز میں ہوا۔ [illegible] مس اوشا دھوا مس نیلما مس مدھو جین کے نام قابلِ ذکر ہیں اس کے بعد کالج کے پرنسپل شری کے۔ ایل اروڑہ نے کالج کی سالانہ رپورٹ پڑھی صدر صاحب نے اپنی تقریر میں کالج کی [illegible] رفتار ترقی نتائج کی تعریف کی۔ اور انعام پانے والے بچوں کو انعام دے کر ان کو مبارکباد دی آخر میں پرنسپل صاحب نے صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

انڈیا کالج چاندنی چوک دہلی گرلز ونگ کے سالانہ جلسے کا ایک منظر (بائیں سے دائیں) شری جنار دھن گپتا (ممبر میٹرو پالیٹن کونسل) شری ویشوبندھو گپتا (ایڈیٹر روزانہ تیج دہلی) سابق ایئر چیف مارشل سردار ارجن سنگھ شری کے۔ ایل اروڑہ پرنسپل

لڑکوں کا سالانہ جلسہ شام پانچ بجے شروع ہوا سب سے پہلے رام گوپال شال والے ممبر پارلیمنٹ کا سواگت کالج کے پرنسپل شری کے۔ ایل اروڑہ اور شری رام پرکاش گپتا کونسلر نے کیا۔

شری ایچ۔ ایس گپتا نے صدر صاحب کی خدمت میں ایڈریس پڑھا جس میں ان کی سماجی مذہبی اور سیاسی میدانوں میں کی گئی ان کی شاندار خدمات کی پُرزور تعریف کی گئی اس وقت ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ [illegible] نے کہا۔ کہ شری رام گوپال نے ایک شاندار فیلڈ مارشل کی طرح مصیبت [illegible] پبلک کی شاندار رہنمائی کی اس کے لئے [illegible] کی طرف سے انہیں مبارک باد دی گئی بعد میں کالج کے لڑکوں نے [illegible] رکھا جس کو صدر صاحب نے بہت پسند کیا بعد میں انعام تقسیم کئے گئے۔ اور اپنی تقریر میں طالب علموں کو سادہ زندگی گذارنے پر زور دیا آخر میں پرنسپل صاحب نے صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ●●

اپریل سنہ ۱۹۷۰ ع
جلد ——— ۴
شمارہ ——— ۴
فی پرچہ ——— پچیس پیسے
سالانہ ——— تین روپئے




# نوک پلک

ہم پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں کہ شاہجہاں کو ہم محض افسانوں اور غزلوں کا پلندہ نہیں بنانا چاہتے۔ بلکہ ہماری خواہش ہے کہ افسانوں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ نصابی اور ادبی مضامین بھی زیادہ سے زیادہ شائع کریں تاکہ یہ حقیقت میں طالب علموں کے لئے مفید ثابت ہو سکے ———

مگر یہ لکھتے ہوئے ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ساتھیوں نے اس طرف توجہ نہیں دی ———

——— زیر نظر شمارے میں امتحان کے قرب کی وجہ سے ARMS AND THE MAN کی اردو تلخیص کا باقی ماندہ تمام حصہ دیا جا رہا ہے۔ تاکہ امتحان کے نقطۂ نظر سے طالب علموں کے لئے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکے ———

مستقل کالم "ادھ کھلے پھول ......" اس مرتبہ شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔

ادارہ

زیر نظر شمارے میں شامل تمام تر افسانوں میں نام، مقام و واقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے۔ جسکے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں ہیں


مشیر طباعت :- محمد شفیق صدیقی متعلم انڈیا کالج ڈ
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر :- محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ :- اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی ۶

مقام اشاعت :- قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی نمبر ۶

## ادب و معلومات



## تراجم و تلخیص



## افسانے



## منظومات



## مستقل عنوانات



## تزئین

غضنفر زیدی } آرٹس انسٹی ٹیوٹ
اطہر پرویز } جامعہ نگر نئی دہلی

## کتابت

محمد نور الحق ——— مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

لکچرار ہیں ——— تو آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے۔ کہ اپنے طلبہ سے مضا

لکھوا کر برائے اشاعت روانہ فرمائیں۔ ہم ممنون ہوں گے۔

طالب علم ہیں ——— تو کوئی مضمون (نصاب سے متعلق ترجمہ (عربی، فارسی یا انگ

سے کیا ہوا) یا افسانے اپنے استاد یا لکچرار سے تصحیح کرا کر ہمیں بھیج دیں۔

——— اپنے مسودے کے ساتھ نیچے چھپا کوپن ضرور منسلک کریں۔

اردو، فارسی یا عربی کے سکریٹری ہیں ——— تو آپ سے گذارش ہے

اپنی سوسائٹی کی ماہانہ مختصراً رپورٹ (ادبی نشست، مشاعرہ، تحریری یا تقریری مقابلہ کا نتیجہ

[illegible] لکھا [illegible] [illegible] بہتر [illegible] میا جاتا ہے۔

اس کے زمانے میں غزل کی صنف مکمل طور پر منظرِ عام پر آچکی تھی، عنصری خود کو رودکی سے کمتر سمجھتا ہے اور اس کی غزلوں کو اپنی غزلوں سے بہتر مانتا ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے ؎

غزل رودکی وار نیکو بود
غزلہائے من رودکی وار نیست

رودکی نے غزل کو کافی ترقی دی۔ اس کی غزلوں میں راحت، روانی اور شستگی بدرجہ اتم موجود ہے ؎

[illegible] گیا جفا کا بیان ہوتا ہے۔
سب سے پہلے حکیم سنائی نے غزل کو فروغ دیا ان کے کلام میں پختگی، برجستگی اور صفائی پائی جاتی ہے خیالات اور طرزِ ادا میں کہیں کہیں جدت اور ندرت بھی عیاں ہے۔ کلام میں جوش و سرمستی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے مثلاً ان شعروں میں ؎

۱- چوں دو عالم زیر پایت نطع شد ہائے بکوب
چوں زدکوں اندر دو دست جمع شد دستی بزن

## مستقل عنوانات



## تزئین

غضنفر زیدی
اطہر پرویز
آرٹس انسٹی ٹیوٹ جامعہ نگر نئی دہلی

## کتابت

محمد فرمان — مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

# "ارتقائے غزلِ فارسی"

نعیم الدین
دلّی یونیورسٹی دہلی۔

عشق و محبّت انسانی سرشت میں داخل ہے جہاں انسان ہے عشق بھی ہے اور چونکہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے کبھی خالی نہیں ہو سکتی لیکن ایران میں یہ خصوصیت اور تمام ملکوں سے زیادہ پائی جاتی ہے یہاں مدتِ دراز کے تمدّن نے انسانی جذبات کو نہایت لطیف اور زود اشتعال بنا دیا تھا اس لئے تھوڑی سی تحریک سے یہ شعلہ بھڑک اٹھتا تھا اور دل و دماغ کو آتش فشاں بنا دیتا تھا اسی وجہ سے ایران میں جتنی عشقیہ شاعری کو ترقی ہوئی اور کسی صنفِ سخن کو نہیں ہوئی۔

ایران میں شاعری کی ابتدا قصیدے سے ہوئی اور ابتدا میں غزل جوشِ طبع سے نہیں بلکہ اتمامِ شاعری پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی۔ قصیدے کی ابتدا میں عشقیہ اشعار کہنے کا دستور تھا اس حلقہ کو علیحدہ کر لیا گیا جسکو "غزل" کا نام دیا گیا۔ گویا کہ قصیدے کے درخت سے ایک شاخ کاٹ لی گئی جسکا نام غزل پڑا۔

فارسی شاعری کا آدم رودکی تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کے زمانے میں غزل کی صنف مکمّل طور پر منظرِ عام پر آ چکی تھی، عنصری خود کو رودکی سے کمتر سمجھتا ہے اور اس کی غزلوں کو اپنی غزلوں سے بہتر مانتا ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے ؎

غزل رودکی وار نیکو بود
غزلہائے من رودکی وار نیست

رودکی نے غزل کو کافی ترقی دی۔ اس کی غزلوں میں فصاحت، روانی اور شستگی بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

ببردہ نرگسِ تو آبِ جادوے بابل
کشادہ غنچۂ تو بابِ معجزِ عیسےٰ

کیونکہ رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی اس لئے اس کے کلام کو تیسری صدی کی یادگار سمجھنا چاہئے۔ چوتھی صدی کا مشہور شاعر دقیقی تھا۔ جسکی بہاریہ غزل بہت مشہور ہے ؎

در افگند اے صنم ابرِ بہشتی
زمین را خلعتِ اُردی بہشتی

جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی
بجائے نرمی و ماے درشتی

اگرچہ غزل قصیدے سے الگ چیز ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غزل کا اصلی عنصر قصیدہ ہے۔ قصیدہ میں ممدوح کی تعریف ہوتی ہے غزل میں معشوق کی۔ قصیدے میں ممدوح کی جود و سخا، جبروت و اقتدار اور عدل و انصاف کی تعریفیں کی جاتی ہیں تو غزل میں محبوب کے حسن و جمال، ناز و ادا اور جور و جفا کا بیان ہوتا ہے۔

سب سے پہلے حکیم سنائی نے غزل کو فروغ دیا ان کے کلام میں پختگی، برجستگی اور صفائی پائی جاتی ہے خیالات اور طرزِ ادا میں کہیں کہیں جدّت اور ندرت بھی عیاں ہے۔ کلام میں جوش اور سرمستی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے مثلاً ان شعروں میں ہے ؎

۱- چوں دو عالم زیر پایت نطع شد پائے بکوب
چوں دو کون اندر دو دستت جمع شد دستی بزن

بسکہ شنیدی صفت روم و چین
۲- خیز و بیا ملک سنائی ببین
سر بر آراد گلشن توحید تا در کوہ دین
۳- مکشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن

اس کے بعد اوحدی مراغی نے غزل کو جذبات و عواطف سے لبریز کیا، اسی کے ساتھ زبان میں نزاکت مٹھاس و روانی بھی پیدا کی۔ ان اشعار سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

بوئے آں دود کہ امسال بہ ہمسایہ رسید
تراشتی بود کہ در خانہ من یار گرفت
از بسکہ پر شدم ز صفاتِ کمالِ تو
نزدیک شد کہ پر شود از من جہاں ہمہ

اوحدی کے بعد خواجہ فریدالدین عطار رومی اور مراغی وغیرہ نے غزل کو پایہ بلندی تک پہنچایا لیکن چونکہ یہ لوگ عشقِ حقیقی کے دلدادہ تھے اس لئے ان کے کلام میں حقیقت کا پہلو غالب رہتا تھا جس کی بنا پر ان کی غزلیں زیادہ شہرت حاصل نہیں کر سکیں۔ اسی زمانہ میں تاتاری شورش و غارت گری کی وجہ سے شاعری کا زور کم ہو گیا اور تقریباً ۲۰۰ سال تک ایران میں کوئی نامور شاعر نہ ہوا

آخر کار شیخ سعدی ۵۸۹ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے وہ فطرتاً شاعر تھے زبان خداداد تھی۔ ان باتوں نے ملکر ان کی غزلوں میں یہ اثر پیدا کیا کہ تمام ایران میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔

سعدی شاعری کا پیغمبر اور غزل کا استاد مانا جاتا ہے۔ حافظ سا مشہور شاعر جو غزل میں معجزہ سرائی کرتا تھا اور جسکی غزلیں تمام دنیا میں مشہور رہیں سعدی کو استاد کہتا تھا۔ امیر خسرو بھی اسکے کمال کی داد دیتا ہے سعدی پہلا شخص ہے جس نے شاعری میں آزادی اختیار کی اور بخلاف دوسرے شعرا کے نامنا سب مبالغہ اور جھوٹ سے پرہیز کرتا تھا۔ وہ اپنے ممدوح کی درازی عمر کی دعا اسطرح کرتا ہے ؎

نہ گویمت کہ بدانچہ نوشتہ است عمر و ابد
پس اینچہ فائدہ گفتی کرتا بہ حشر بپائے

اس دور کے بعد شاعرانہ حیثیت سے سلمان اور خواجو نے غزل کو ترقی دی یہاںتک کہ خواجہ حافظ نے اسمیں چار چاند لگا دئے۔ حافظ کہتے ہیں ؎

استادِ غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما
دارد سخن حافظ طرزِ روش خواجو

سب سے بڑی چیز حافظ کے کلام میں حسنِ بیان خوبی اداشستگی اور لطافت ہے۔ اس کے کلام کا پڑھنے والا وہی لطف محسوس کرتا ہے جو کہ شاعر شعر کہتے وقت محسوس کرتا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ خود اپنے کلام کی مقبولیت سے واقف تھا جبھی اس نے یہ شعر کہا ؎

بہ شعرِ حافظِ شیراز می گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکانِ سمرقندی

یا پھر ایک اور جگہ اپنی مقبولیت کو اسطرح پیش کرتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

غزل کی ایک خاص زبان ہے جسمیں نزاکت لطافت اور لوچ ہوتا ہے۔ اس قسم کی زبان کے لئے خیالات بھی خاص ہوتے ہیں علمی یا فلسفیانہ مضامین اگر ادا کئے جائیں تو وہ رنگینی اور لطافت قائم نہیں رہ سکتی۔ مثلاً شیخ سعدی ایک غزل کا مطلع لکھتے ہیں ؎

اگر خدائے نباشد ز بندہ خوشنود
شفاعتِ ہمہ پیغمبران ندارد سود

ظاہر ہے کہ یہ مطلع غزل سے جوڑ نہیں کھاتا خواجہ حافظ کا خاص اعجاز ہے کہ وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین ادا کرتا ہے لیکن غزل کی لطافت میں قطعاً فرق نہیں آنے پاتا

اس کا قول ہے ؎

دردل ما غم دنیا غم معشوق نی شود
بادہ گر خام بود ، پختہ کند شیشۂ ما

خواجہ حافظ نے غزل صرف عشقیہ مضامین کیلئے مخصوص تھی اس کے سوا اور کوئی خیال غزل میں عموماً ادا نہیں کیا جاتا تھا چونکہ غزل کا ہر شعر علیحدہ ہوتا ہے اس لئے ایک وہی ایسی صنف ہے جسمیں ہر طرح کے مفرد اور بسیط خیالات ادا کئے جا سکتے ہیں خواجہ صاحب نے ایک طرف تو غزل کو یہ وسعت دی کہ اخلاق تصوف فلسفہ ، سیاست اور دوسرے ہر قسم کے مضامین ادا کئے اور دوسری طرف غزل کی خصوصیات یعنی لطافت اور شیرینی ہاتھ سے نہ جانے دی۔ ذیل کے اشعار اس کا منہ بولتا ثبوت ہے ؎

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند
سالہا دل طالب جام جم از ما می کرد
ساقی بیار بادہ و با مدعی بگو
آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد
انکار ما مکن کہ چنین خام جم ندرشت
اسطرح مجموعہ گل مرغ سحر داند و بس
کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

غرضیکہ اس قسم کے سینکڑوں معارف و حقائق اس انداز سے ادا کئے ہیں کہ غزلیت کے اسلوب میں فرق نہیں آنے پاتا۔ علاوہ ازیں ہر قسم کے قومی ملکی تمدنی اور معاشرتی مسائل حافظ نے ادا کئے ہیں لیکن غزل کی لطافت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی مثلاً اس شعر میں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

حافظ کے بعد ۱۴۱۴ A-D میں جامی پیدا ہوئے۔ جامی ایک اعلیٰ پایہ کے صوفی تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد عشق حقیقی پر مبنی تھی۔ جامی نے مثنوی کے ساتھ ساتھ غزل کو بھی ترقی دی ان کا ایک دیوان ہے جو غزلوں اور قصیدوں پر مبنی ہے یہ دیوان تین حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ فاتحۃ الاشباب۔
۲۔ واسطۃ العقد۔
۳۔ فاتحہ الحیات

جامی صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک انسان دوست اور دردمند انسان تھے۔ ان کی واقفیت مشرقی و مغربی علوم سے بے حد تھی ان کا قول ہے ؎

خوشتر زکتاب درجہاں یاری نیست
در غمکدہ زمانہ غمخواری نیست
ہر لحظہ ازو بگوشہ تنہائی
صد راحتی است ہرگز آزاری نیست

جامی بادشاہوں کے لئے صرف شاعر ہی کی نہیں حیثیت رکھتا تھا بلکہ انکا دوست اور روحانی رہنما تھا ؎

ہست دیوان شعر من اکثر
غزل عاشقان شیدائی
روح شاہان دو رہ است عاشق
نہ ز خوش خاطری و خود رائی

جامی کی غزلیں ترنم سوز و گداز صوفیانہ خیالات روانی و برجستگی کے لئے بہت مشہور ہیں، ہندوستان افغانستان، ترکی اور وسط ایشیا میں اس کی غزلیں گائی جاتی ہیں اور پسند کی جاتی ہے ذیل کے اشعار ان کی خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے ؎

آں کیست سواری کہ بلندی دل و دیں است
صرف سر برافراختہ در خانہ زیں است
آشوب جہاں است اگر اسپ سوار است
آتش جہاں است اگر بزم نشین است

گفتم کہ سخن رانی جامی زلب کیست
از سینۂ شکر بہ تحذیت کہ آرای سخن این است

مختصر یہ کہ جامی نے غزل کو نہایت وسعت دی اور اس میں کمال پیدا کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حکومت صفویہ کا آغاز ہوا اور کچھ ہی مدت کے بعد تمام ایران سے طوائف الملوکی مٹ کر ایک وسیع اور پرامن سلطنت قائم ہوگئی۔ اسی زمانے میں مغل خاندان ہندوستان میں فیاضیوں کے بادل برسا رہا تھا۔ اس جدید دور کے آدم بابا فغانی تصور کئے جاتے ہیں۔ فغانی کے کلام میں سادگی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ کسی بات کو ہیر پھیر سے نہیں کہتے ان کی یہ غزل بہت مشہور ہے ؎

گل می درد قبا بہ چمن داد خواہ کیست
گلشن بہ خون تپیدہ شہید نگاہ کیست

تشبیہات اور استعارات میں زیادہ جدت پیدا کی مثلاً اس بات کو کہہ دینا کا راز معلوم نہیں ہو سکتا حافظ اسطرح بیان کرتا ہے "کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معما را" فغانی اسکو اسطرح کہتا ہے ؎

آں کہ این نامہ سربستہ نوشت است نخست
مگرش تحت بہ سر رشتۂ مضمون زدہ است

سب سے بڑی خصوصیت فغانی کی اختصار کلام ہے یعنی ایک وسیع مضمون کو چند لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔ یہ وصف شعرائے متاخرین کا خاص جوہر ہے مثلاً وہ کہتا ہے ؎

ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد
این بے خودی گناہ دل زود مست ماست

فغانی کے سلسلے میں جن لوگوں نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے ان میں عرفی و نظیری شامل ہیں جو ایران سے ہندوستان چلے آئے تھے اور انہوں نے یہیں کا مذاق قبول کر لیا تھا جس نے ان کے کلام میں زیادہ رنگینی اور لطافت پیدا کر دی تھی فغانی کے دور سے جو خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی کا آغاز ہوا اس کو سب سے پہلے عرفی نے شروع کیا۔ ظہوری۔ جلال۔ اسیر۔ طالب آملی اور کلیم وغیرہ نے اس طرز کو فروغ دیا اور یہی طرز مقبول ہو کر دنیائے شاعری پر چھا گیا۔

عرفی نے غزل کو بے انتہا ترقی دی لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ جس چیز نے اسکو مشہور کیا وہ غزل نہیں بلکہ قصیدہ ہے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عرفی عام طور پر قصیدہ سے ہی جانا جاتا ہے۔ بہت کم لوگ اسے بحیثیت غزل گو جانتے ہیں۔ عرفی خود قصیدہ گوئی کو پسند نہیں کرتا تھا جیسا کہ اس نے خود کہا ہے ؎

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

غرض یہ کہ عرفی نے غزلیں بھی کہیں اور قصیدے بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غزل اپنی خوشی سے کہتا ہے اور قصیدہ دوسروں کی خوشی کے لئے۔ وہ یکتائی کا دعویٰ نہیں کرتا اور کہتا ہے ؎

مگو کہ نسبت گنہگار نہ ترزنہ عرفی
کہ این حسد بت گرا غایہ لاف یکتائی است

وہ اپنے دل کا حال بالکل واضح طور پر بیان کر دیتا ہے ؎

گماں مبر کہ چوں تو بگذری جہاں بگذشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

عرفی کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ اس کی غزل کی بنیاد اصلیت اور خلوص پر قائم ہے اسکے اشعار اس کے خالص خیالات ہیں اور سچے جذبات کی خالص شاعرانہ انداز سے ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے خیالات خواہ فلسفیانہ ہوں یا اخلاقی ایک ہی دماغ کی زرخیزی کا نتیجہ ہیں علاوہ ازیں چونکہ وہ

فطرتاً شاعر ہے اس کا تخیل بلند ہے اور احساسات
تیز ہیں وہ ہر چیز کو شاعرانہ نگاہ سے دیکھتا ہے
اور ہر بات کا شاعرانہ دل سے اثر لیتا ہے جیسا وہ
خود کہتا ہے ؎

در دلِ ما غم دنیا غم معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ ما

اسی دور کا دوسرا مشہور شاعر نظیری ہے
شعرائے متقدمین میں اس کا اونچا مقام ہے صائب
جیسا مشہور شاعر بھی نظیری کو بڑا شاعر مانتا ہے۔
اور اسکو عرفی پر ترجیح دیتا ہے ؎

صائب چہ خیال است شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری کہ رسانید سخن را

نظیری کی غزلوں کی خصوصیت ان کی سادہ
زبان، برجستگی اور شستگی ہے۔ بقول شبلی کے
نظیری کی غزلیں اسکے محاورات کے استعمال اور
[illegible] کے لیے بہت مشہور ہیں
جو کہ نہ صرف اس کی شاعری کو آسان بنا دیتی ہے
بلکہ نظیری کی زبان پر مہارت کو بھی ظاہر کرتی ہے
جیسے کہ اس شعر میں ؎

شب آخر گشتہ داد افسانہ از افسانہ می خیزد
سخت است حال اگر تا سحر گشتم

نظیری نے بھی مسلسل غزلیں لکھنے کی کوشش
کی ہے جسمیں اسے ایک معقول حد تک کامیابی بھی
ہوئی ہے۔ ایسی عشقیہ غزلیں اس کے
جذبات و عواطف کو ظاہر کرتی ہیں جو اس کی
سرشت میں ودیعت کر دیئے گئے تھے مثلاً یہ
شعر ؎

چشمش برابر ہائی رہ زد مژگان فاکش نگر
در سینہ دارم [illegible] پیراہن چاکش نگر
وادی کہ زلف انداختہ دیگر [illegible] سخن مشکین
دلی کہ مژگان ریختہ ترا من باکش نگر

از کوی معشوق آمدہ، شوریدگان در حلقہ و شہر
از صید آہوی [illegible] شہر ان نخچیر کشش نگر

نظیری ان شاعروں کی صف میں داخل ہے جو
کہ جالی [illegible] کئے جاتے ہیں۔
جا بجا موزوں استعارات و تشبیہات نے اس کی
غزلوں کی خوبصورتی کو بڑھا دیا ہے۔ ذیل کے
اشعار اس بات کو روز روشن کی طرح عیاں
کرتے ہیں ؎

بازم بکذ [illegible] نہ شمع و نہ آفتاب
[illegible]
ز فرق تا بقدم ہر کجا نظر می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است
ہمہ شب بر لب و رخسار و گیسو می زنم بوسہ
گل و ترین و سنبل را صبا در خرمن است امشب

غزل کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں عشق و
محبت کے کسی معاملے یا واردات کا مسلسل بیان نہیں
ہوتا ہر شعر الگ ہوتا ہے اور اس وجہ کوئی مخصوص خیال
یا واقعہ ادا کر دیا جاتا ہے جبکہ عربی اور یورپی
زبانوں میں غزل مسلسل ہوتی ہے جسمیں محبوب کا
مکمل سراپا وصل و ہجر کی داستان یا کوئی دلچسپ
واردات یا تفصیلی واقعات بیان کرتے ہیں
فارسی غزل میں اس قسم کے واقعات اور معاملات
کا نام و نشان نہیں ملتا۔
ایران میں عاشق اپنے آپکو نہایت ذلیل
سمجھتا ہے اپنے آپ کو معشوق کی گلی کا کتا
تصور کرتا ہے بلکہ ہر قسم کی ذلت و خواری کو محبت
[illegible] کہتا ہے ؎

[illegible] بکوئی [illegible] شکار رفتہ بودی
[illegible] بچہ کار رفتہ بودی
شنیدہ ام کہ سگان را قلادہ می بندی
چرا بگردن حافظ نمی نہی رسنے

بخلاف اس کے عرب کا عاشق طالب ہے
لیکن گدا و غلام نہیں۔ آسادہ جفائے ہے
لیکن۔ ذلیل و خوار نہیں۔

اگرچہ فارسی غزل میں سچے جذبات کم نظر
آتے ہیں تاہم ایک حصہ ایسا بھی موجود ہے
جس میں غزل کی اصل خوبیاں اعلیٰ درجے تک
پائی جاتی ہے۔ حضرات صوفیہ کا تمام کلام تر جوش
اور اثر سے لبریز ہے جو خیالات اور مضامین غزل
کے اصلی عناصر ہیں ان غزلوں میں نہایت پر
جوش طریقے سے ادا کئے گئے ہیں۔

عشق کا بڑا وصف یہ ہے کہ تمام رذیل اخلاق
شریفانہ اخلاق سے بدل جاتے ہیں بغض کینہ
حسد۔ خود پرستی و غرور فنا ہو جاتے ہیں طبیعت
میں رقت اور سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے اور
انسان ایک عام محبت اور کشش سے لبریز ہو جاتا ہے

اکبر بہ تا شر محبت نمی رسد
کفر آوردم دو رعشق تو ایمان کردم

غزل کا اصلی مایۂ خمیر عشق و محبت کا اظہار ہے
محبت کا جذبہ جب دل میں پیدا ہوتا ہے تو بے اختیار
زبان سے ادا ہوتا ہے عاشق خود جانتا ہے کہ اظہار
محبت نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ خلاف مصلحت
بھی لیکن دل اپنے قابو نہیں رہتا ہے

شوق نگذاشت کہ ہم پردل خویش
ورنہ این سوز نہ زانہ تو نہاں می بالیست

یہ تمام فطری باتیں اور لازمۂ محبت ہیں۔
اس لیے غزل میں سب سے پہلے
یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ مضامین کس حد تک پائے
جاتے ہیں اور ان میں حقیقت اور جوش اثر کہاں تک
ہے۔ فارسی غزل نے یہ تمام جذبات پورے
زور کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

تصوف نے بھی فارسی غزل گوئی کو بلند کیا ہے
جو اثر اور جذبہ حضرات صوفیہ کی شاعری میں پایا
جاتا ہے اور دوں کے کلام میں نہیں مل سکتا۔ حضرات
صوفیہ کا مطلوب عموماً شاہد حقیقی ہوتا ہے اس لئے
ان کا عشق ہوا و ہوس سے پاک اور نہایت قوی
اور مستقل ہوتا ہے مجازی حسن ناکامل اور سریع الزوال
ہے اس لئے عشق مجازی میں وہ زور اور جذبہ
و استقلال نہیں ہوتا جو عشق حقیقی میں پایا
جاتا ہے۔

غزل کی ہر دل عزیزی کے کئی سبب ہیں۔ ان
میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اس کا دار و مدار
خیالات و جذبات پر ہے اور ایک دل سے نکلی
ہوئی بات بہت سے دلوں کو ہلا دیتی ہے اشعار
غزل کے سریع التاثیر ہونے کا یہی سبب سے
بڑا راز ہے۔ اس کے علاوہ دلی کیفیتوں کو بیان
کرتے وقت زبان سے خود بخود سیدھے سادے
الفاظ نکلتے ہیں اور ان کی طبیعت میں بے ساختگی
پیدا ہو جاتی ہے یہ باتیں مل کر اس اثر کو دوبالا
کر دیتی ہے۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ
سکتے ہیں کہ غزل سب سے زیادہ مشکل صنف
بھی ہے اور سب سے زیادہ سہل بھی۔ سہل اس معنی
میں کہ کلام میں تسلسل قائم رکھنے کی دشواری نہیں
ہر ایک شعر بجائے خود مکمل ہے۔ دشوار اس لئے کہ
دو مصرعوں کے اندر تخیل کے باریک و طولانی جذبات
اور احساسات کی جیتی جاگتی تصویریں صفائی سے اتار
لینا بغیر تائید غیبی ممکن نہیں۔

اسی طرح میدان غزل سب سے زیادہ وسیع بھی
ہے اور سب سے زیادہ تنگ بھی تنگ اسی صورت
میں ہے کہ اس میں محض انہیں مضامین کی گنجائش ہے
جن میں تغزل ہو یا بالفاظ دیگر رنگ عشق کا
پرتو ہو۔ یعنی اشعار ایسے ہوں جو عاشق کی زبان

بقیہ صفحہ ۲۹ پر

# غنائی نثر

غنائی نثر نے شاعری، نثر اور ڈرامہ کی سرحد پر ترقی کی۔ شاعری سے اس کے رشتے کی جھلک نہ صرف اس کی ہیئت میں بلکہ آزادی اظہار اور زندگی کی ڈرامائیت کی عکاسی میں بھی ملتی ہے یہ داستانوی عکاسی کے رجحان کو مسترد نہیں کرتی ہے۔ جیسے بالآخر آج کل صاف طور سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ اسکی شعریت دراصل انسان کی باطنی دنیا اور آج کے انسان کی نفسیاتی زندگی کے سچے حقائق کے علم کی عکاسی ہے اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ غنائی نثر کی صنف اس زمانے کے ادب میں دو اہم رجحانات یعنی انسان دوستی اور تجزیہ سے گریز نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غنائی نثر کی خاص صنف قومی جمہوریاؤں کے نوجوان سوویت ادیبوں کی جانب سے سوویت ادب میں ادا کیئے گئے اہم پارٹ کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے میں مدد دیتی ہے۔

چند سال ہوئے اخباروں میں ایک نوجوان ادیب کی حیثیت سے چنگیز آئیتماتوف کے نام کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس سال وہ اپنا چالیسواں یوم پیدائش منا چکے، آئیتماتوف کی بہترین کتابیں اور ان کے اہم تخلیقی کارنامے ابھی آئیں گے۔ جیسا کہ خود مصنف کا خیال ہے۔ بہرکیف انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کو ایک نامور مصنف تسلیم کرنے کے لیے ہمیں ہر وجہ مہیا کرتا ہے۔

## ایک نیا انداز

انقلاب سے پہلے کرغیزیا جو آئیتماتوف کا وطن ہے، اپنا کوئی ادب نہیں رکھتا تھا آئیتماتوف کے ناولوں جمیلہ، ان کا کمیت، ادنتہ کی آنکھ اور سرخ رومال میں اپیا اور درخت جوڑ کی کامیابی ہمعصر ادبی میدان میں ایک ایسے ادب کی رونمائی کی اہمیت ظاہر کرتی ہے جو ابھی تک غیر معروف تھا یعنی ان لوگوں کا ادب جو اس سے پہلے طرف عوامی شاعری کا قدیم ورثہ رکھتے تھے۔ یعنی یہ ان لوگوں کا ادب تھا جن کی زندگی سے متعلق ہم عصر مشرق اور مغرب میں قریب قریب کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

آئیتماتوف کا ناول "خدا حافظ گلساری!" روسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ روسی زبان اور کرغیز زبان دونوں ہی مصنف کی مقامی زبانیں ہیں۔ اس ناول کی ترتیب میں قومی خوشبو اس کے پہلے ناولوں سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یہ ناول ایک گیت کی طرح لکھا گیا ہے۔ جس کا ہر باب ایک نیا مصرع ہے۔ اور جہاں بیان کا ترنم اسٹیپ کی سڑک پر دوڑتے ہوئے گھوڑے کی دلکی چال سے ملتا جلتا ہے۔

نامور مصنف نکولائی عطاروف اپنے نوجوان رفیق فاضل اسکندر کے بارے میں جو ابخازیا کے ادیب ہیں یہ کہتے ہیں کہ - ہر ذہین ادیب اپنی تمام ادبی دولت کے ساتھ یعنی جن کرداروں کی وہ عکاسی کرتا ہے۔ جو پیکر وہ پیش کرتا ہے۔ اور جن پلاٹوں کو وہ پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے اسی کرۂ ارض کے کسی نہ کسی مقام کا رہنے والا ہوتا ہے۔ بہترین حالتوں میں ادیبوں کی ذہانت کی یاد ان کے بچپن سے تعلق رکھتی ہے" عطاروف کا یہ یقین ہے کہ اسکندر جو ایک شاعر اور ادیب ہے اور جس نے معقول ترین طنزیہ ناول "کوزلاطور مجموعہ نجوم"۔ اور ظرافت سے بھرپور افسانوں کا ایک سلسلہ لکھا تھا۔ ایسے ہی ادیبوں میں سے ایک ادیب ہے اس کی ذہانت کی جڑیں اس کے بچپن میں بہت گہری چلی گئی ہیں جو ابخازیا کی فراخ دل جنوبی سرزمین میں گذرا تھا۔ تجربہ کار مصنف اسکندر کی کہانی" دادامیاں" کا تجزیہ کرتا ہے جس میں کہانی کا مصنف جو اس بات کو چھپاتا نہیں ہے۔ کہ وہ ایک عرصہ سے شہر کا باشندہ بن چکا ہے۔ لوگوں کو

وہ ان لوگوں کی کہانی جو اسے بہت عزیز ہیں اور جو اس کے بہت نزدیک ہیں۔ جذباتی انداز میں نہیں ایک ذہین مشاہد کی طرح سناتا ہے۔ بہرکیف اسکندر ہی تنہا اس غنائی نثر کا نمائندہ نہیں ہے۔ جو پرجوش مزاج کا کردار رکھتی ہے اور جو آج کی زندگی کے ایک خاص کلیہ کی طنزیہ عکاسی کی ایک کاوش ہے۔

## مزاحیہ نقطہ نظر

غنائی نثر کی صنف کے دائرہ میں کرداروں کے مطالعہ سے متعلق مزاحیہ نقطہ نظر کا اظہار نادر دمبازے بھی کرتے ہیں جو جارجیا کے نوجوان ادیب اور جارجیا کے طنزیہ رسالے کے مدیر ہیں۔ ان کی کہانی دادی اماں الیکو، الاریون اور میں ان کے بچپن کی کہانی ہے جو حیرت انگیز مزاح کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ لیکن مصنف جارجیا کے کسان کی غنائی عکاسی میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو محنتی ہے اور دنیا سے متعلق اپنے رعایت پسند رویے میں ذہین ہے جو ناانصافی کے خلاف اپنی جدوجہد میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا یعنی ایک ایسا انسان ہے جو اپنے احساس ظرافت کو کبھی گم نہیں ہونے دیتا یہ وہ کردار ہے جو واضح طور پر مصنف کو عزیز ہے۔

مالداویہ کے ادیب آیون دروتسے نے جو نثر لکھی ہے وہ قاری اور ادب کے نقاد سے ایک خاص موڈ اور ایک خاص یکسوئی کا تقاضہ کرتی ہے کہ وہ ان کی شعری اور پرجوش تخلیقات میں بیان کی گئی غیر معمولی باتوں پر یقین لانے کے لئے تیار رہے۔ آیون دروتسے ایک      ایسے ادیب ہیں جن کے بارے میں ان کے فنکارانہ احساس کے بغیر سوچا ہی نہیں جا سکتا۔ ان کے ناول ادیب کی جدت پسندی کی دنیا میں اس کی مزید پختگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ناول ان کی پہلی تخلیقات پر اکتفار رکھتا ہے۔ جنہوں نے دروتسے کے قارئین کے دلوں پر فتح پالی تھی۔ آگے کی طرف جست کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ماضی کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ ناول میں کرداروں کا ماضی ہے جو آیون دروتسے کے تخلیقی طرز عمل کی بڑی حد تک وضاحت کرتا ہے۔

---

## مشہور شاعر اور قومی کارکن

رسول حمزہ توف سوویت شاعر اور قومی کارکن ہیں۔ تمام لوگ انھیں      اور ان کے افسانۂ حیات کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کی کتاب "میرا داغستان"! ان کے خودنوشت سوانح عمری اور ان کی شاعرانہ صحافت کا امتزاج ہے۔ قاری کو کتاب پڑھنے سے پہلے کچھ شکوک ہو سکتے ہیں کہ کتاب آخر کار شعروں میں افسانۂ زندگی ہی تو ہے۔ قاری کو یہ شک بھی ہو سکتا ہے کہ غنائی نثر کی صنف میں لکھی گئی کتاب حمزہ توف کی شاعری میں کچھ اضافہ بھی کر سکتی ہے یا نہیں جس میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے اور دل کو متاثر کرنے والے خلوص سے کہا ہے۔ علاوہ ازیں حمزہ توف تذکرہ حیات لکھنے کے لئے ابھی بہت جوان سال ہیں۔ وہ اپنی تخلیقی زندگی کی بلندی پر ہیں لیکن "میرا داغستان"! ایک غیر معمولی کتاب ہے اور غیر معمولی نثر رکھتی ہے۔ شاعر پرانی یادوں میں نہیں کھو جاتا ہے۔ بلکہ مستقبل میں جھانک کر دیکھتا ہے۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا ہے۔ بلکہ آگے کی طرف چھلانگ لگانے کے لئے ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے۔ وہ کوئی کہانی بیان نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اپنے شاعرانہ کردار کا تجزیہ کرتا ہے۔

ہم میں سے ہر آدمی نوع انسانی کا حصہ ہے۔ ادیب اس کا کچھ زیادہ ہی حصہ ہوتا ہے۔ عصر زمانہ کا آہنگ اور درجہ حرارت اور انسانی زندگی کے وقار کے لیے عالمی ذمہ داری فنکار کے کردار کو ڈھالتے ہیں۔ ذہانت صرف خداداد عطیہ نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ لوگوں کی نمایاں شاعرانہ روح ہوتی ہے جس کے جھلک ایک تخلیق کار شخصیت کے تخلیقی کام میں ملتی ہے۔ جو ایک خاص ذریعہ اظہار سے جنم لیتا ہے۔"

یہ تصور حسن کا اظہار ایک خلاق سوویت ادیب نے کیا ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ کیوں اخلاقی اصول کا اتحاد فنکار کی آزادی کو کچلتا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اسے عظیم امکانات فراہم کرتا ہے۔ یعنی ادب میں انسانوں کی فروت

آگے صفحہ ۱۹ پر

# ........... رسوا کیا مجھے

پسندیدہ اشعار ——————— مرتبہ: ریحان الحق ایم اے بی کام.

●

جس جائے سراپا نہ نظر جائے ہے اس کے
آئے ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر کر

●

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل لے کے نام تیرا دیوانہ وار رویا

●

اتنی دہشت، اتنی وحشت ہے، اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرنا ہو، میں نہ شکاری دور کیوں اتنا بھاگو ہو

●

ہو گئی غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پہ نہیں

●

اظہار محبت پرا جس طرح وہ شرمائے
سب اگلی حیا میری آنکھوں میں اتر آئی

●

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احسان ہوتا

●

خفا نہ ہونا میری جرأت تخاطب پر
تمہیں خبر ہے میری زندگی کی آس ہو تم

●

شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آسکیں
وہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے

●

جو دل مانگا تو فرمایا کہ ٹھہرو یاد کرنے دو
ذرا سی چیز تھی ہم نے خدا جانے کہاں رکھ دی

●

میری امیدوں کا حاصل میری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

●

[illegible] نادان مجھے اتنا
یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

●

مجھ کو خبر نہیں مگر ایک سادہ لوح کو
برباد کر دیا تیرے دو دن کے پیار نے

●

ایسے ناداں تو نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو پند گرو راہ گذر تو دیکھو

●

اس نزاکت پہ سنے کیا وہ ہماری فریاد
غنچے چٹکے تو مجھے سر میں دھمک ہوتی ہے

●

اس ناز سے اس شان سے اس بے رخی سے
گذرو گے جو تم دنیا ہی سے جائیں گے گذر ہم

●

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں.

●

ہم اٹھ گئے محفل سے، ذکر آنے پہ مجنوں کا
سائے سے مرے نفرت اے رشک پری اتنی

●

جنازہ روک کر میرا وہ کس انداز سے بولے
گلی ہم نے کہی تھی تم تو دنیا چھوڑے جاتے ہو

●

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

# سسکتا ماضی

انیسہ بیگم دلی یونیورسٹی دلی

رات کی بڑھتی ہوئی سیاہی آہستہ آہستہ دن کے اجالے کو اپنے آنچل میں ڈھانپ رہی تھی۔ اس نے اپنے اوپر پڑے ہوئے کمبل کو ہٹایا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ پھر اپنے آپ ہی بڑبڑایا۔ میرے خدا میں یہ کیوں بھول جاتا ہوں کہ میں ایک مجرم ہوں۔ ایک قاتل ہوں۔ جسکے لئے تمام دروازے بند ہوچکے ہیں۔ پھر یہ دروازہ جس میں ہمیشہ قفل پڑا رہنا ہے یہ کیسے کھل سکتا ہے۔ اور پھر سوچتا اب تو مجھے زندگی کے باقی بیکار دن بھی یہیں گذارنے ہیں۔ اُف! یہ کیسے گذریں گے۔ میرے اللہ تو میری مدد کر۔ اور مجھ سے ماضی کی سسکتی یادیں چھین لے تاکہ زندگی کے باقی دن چین سے گذار سکوں"۔

پھر اس نے جیل کی سلاخوں پر اپنی گرفت کو مضبوط کرلیا۔ جیسے انھیں توڑ دینا چاہتا ہو اپنی ناکامی اور بے بسی پہ اس کی آنکھوں سے کتنے ہی موتی ڈھلک کر اسکے پھٹے ہوئے کپڑوں میں جذب ہوگئے۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اوپر کی طرف جھٹکا اور نیلگوں فلک کی بے کراں وسعتوں میں جھانکا جہاں اب ستارے جھلملانے لگے تھے۔ مدنظر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ اور چاندنی کی اس چادر نے دنیائے فانی پر پھیل کر کسی حد تک رات کو دن میں منتقل کردیا تھا۔ مگر اسکو تو قدرت کی بخشی ہوئی یہ بیش بہا دولتیں بیکار اور لغو معلوم ہوتی تھیں۔ آج اس کو ایک مجرم کی حیثیت سے رہتے ہوئے تقریبًا پندرہ سال ہوگئے تھے لیکن زندگی کے کسی لمحے نے بھی تو اسے سکون وچین کا سانس نہیں لینے دیا تھا کبھی وہ سوچتا جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔ اس نے جیسا جرم کیا اسے ویسی ہی سزا ملی۔ لیکن جب اسے یہ خیال آتا کہ کاش اس کا بھی ایک چھوٹا سا گھر ہوتا۔ ایک آنگن ہوتا شاذیہ ہوتی اور آنگن میں کھیلنے والے ننھے ننھے معصوم بچے ہوتے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑتا۔ اسے اپنے کیئے پر ندامت محسوس ہوتی۔ یہی سوچتے سوچتے اب تک اس کے سامنے پہلے

نورینہ کا معصوم چہرہ ابھرتا پھر ہنستی کھلکھلاتی شاذیہ کا اور پھر ننھے منے پپّو کا آہستہ آہستہ یہ تینوں چہرے اپنی جھلک دکھلا کر غائب ہوجاتے اور وہ پاگلوں کی طرح جیل کی چہار دیواری میں انھیں ڈھونڈتا اور پھر مایوس ہوکر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ لیکن یہ تینوں چہرے اسے ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے پر مجبور کردیتے اور وہ یادوں کے سمندر میں غرق ہوتا چلا جاتا۔

کم سن شاذی بی۔اے۔ رول کی طالبہ بنکر اس کے سامنے آئی تھی وہ سال آخر کا طالب علم تھا۔ شاذی اسے بہت اچھی لگی۔ قدرت کا حسین وجمیل شاہکار دبلی پتلی غزالی آنکھیں ستواں ناک گندمی رنگ اور لمبے گھنے سیاہ بال۔ کونسی ایسی خوبی تھی جو اسمیں نہیں تھی فرصت کے لمحات میں تراشا گیا حسین پیکر تھی۔ وہ جب چلتی تو ہواؤں میں لچک سی آجاتی ہنستی تو لگتا جیسے پھول جھڑ رہے ہوں کالج کا ہر لڑکا اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن وہ ان سب سے بے نیاز سہیل کی طرف کھنچی چلی آئی۔ اردگرد کا ہر فرد اسکی قسمت پہ رشک کرنے لگا اور پھر وہ بھی اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔ وہ اور شاذیہ ملتے رہتے وہ اسے پیار میں شاذی کہتا اور اکثر اسے چھیڑتا — "شاذی! کہیں بھول تو نہ جاؤ گی"؟

اور شاذی اس کے منھ پہ چھوٹا سا خوبصورت سا ہاتھ رکھ دیتی۔ پھر اچانک اپنی باہیں اس کی گردن میں ڈال کر جھول سی جاتی اور کہتی —

"شاید پیار کو بھی تم کھیل سمجھتے ہو۔ میں نے کتنی بار کہا سہیل کہ میں تمہاری ہوں صرف تمہاری۔ اور پھر باہوں کی گرفت ڈھیلی ہوجاتی۔ وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا اور شاذی شرم سے دوہری ہوجاتی اسے شاذی کی یہ معصوم ادائے بے حد پسند تھی۔ اور پھر سہیل بھی منہ بنا کر کہتا!" ہاں کوئی دوسرا تمہارے پاس آکر تو دیکھے۔ جان سے نہ ماردوں تو میرا نام سہیل نہیں"۔

سہیل کی اس بات پر شاذی فلک شگاف قہقہے لگاتی اور پھر وہ بھی اس کے قہقہوں میں شامل ہو جاتا۔ شاذی سے اس کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں وہ دونوں کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر ایک دوسرے سے ملتے رہتے وہ شوخ و چنچل لڑکی جب بھی اس سے ملی اسے مدہوش کر دیتی اور وہ دور خلاؤں میں گھورنے لگتا جیسے اسے صرف اس واحد صانع کی تلاش ہو جسنے اس پیکرِ ناز کو تراشا ہو۔ اور پھر دنیا میں صرف اس لئے بھیجا ہو کہ لوگ دیکھ دیکھ کر دادِ صناعی دیں۔ وہ اپنے کبھی خیالوں میں گم ہوتا کہ اچانک سر پر لڑکوں کا غول اسکی طرف بڑھتا وہ سب طرح طرح کے فقرے کستے اور ہنستے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ اور سہیل ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے بھاگتا۔ شوخ و چنچل شاذی اسی طرح بجلی کیسی تیزی کیساتھ سہیل کے پاس آتی اور جب کبھی وہ دور خلاؤں میں گم ہو جاتا تو اسے پریشان کرنے کے لئے۔ اس کے پاس سے چلی جاتی۔ شاید اسے بھی سہیل کی اس کمی کا احساس تھا۔

سالانہ امتحان نزدیک آ رہا تھا دونوں ہی جی جان سے امتحان کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ دن پلک جھپکتے گذر گئے۔ دونوں نے امتحان دیا اور کامیاب ہو گئے سہیل کی تھوڑی سی لاپرواہی کی وجہ سے سیکنڈ ڈویژن آئی شاذی بھی کامیاب ہو کر سالِ دوئم کی طالبہ بن گئی کیونکہ سہیل کے مالی حالات اچھے تھے اس لئے وہ شاذی کو جلدی سے جلدی اپنانا چاہتا تھا اور پھر شاذی کے سامنے اس نے ایک دن شادی کی پیشکش کر دی اور شاذی نے اپنی اکلوتی رضیہ آپی کے سامنے لیکن رضیہ نے جب سہیل کو دیکھا تو یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا۔

"شاذیہ جو میں نے خوابوں کا محل تعمیر کیا ہے تو اسے مسمار کرنا چاہتی ہے۔ پگلی! میں نے تیرے لئے ایک بڑا اچھا لڑکا ڈھونڈھا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے۔ میری یہی خواہش ہے کہ تیری شادی اسی سے کروں جانتی ہے میری تمام امیدیں آرزوئیں تجھ سے ہی وابستہ ہیں۔ اور پھر بیٹو تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس کا بڑا ہونا کسنے دیکھا ہے"

اور جب روتی ہوئی شاذی نے سہیل کے سامنے اپنی آپی کے یہ الفاظ دہرائے تو اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کانوں میں گرم گرم شیشہ انڈیل دیا ہو۔ اور شاذی کے ان جملوں نے تو اسے پاگل ہی کر دیا۔

"یہ ٹھیک ہے سہیل کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن میں آپی کی قربانیوں کو کیسے فراموش کر دوں انہوں نے میری اور پپو کی زندگی بنانے کے لئے اپنا گھر نہیں بسایا۔ مجھے پڑھا لکھا کر اتنا بڑا کیا۔ ان کی خواہشوں کے ساتھ میری خوشیاں بھی وابستہ ہیں" اور پھر اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا: "سہیل یہ میرے آخری الفاظ ہیں اچھی طرح سن لو۔ میں اپنی محبت کا گلا گھونٹ آئی ہوں مجھے بھول جاؤ سہیل مجھے بھول جاؤ"

اور پھر وہ چلا آیا! "بس بس لیکچر ختم بھی کرو گی یا بولے ہی جاؤ گی چلی جاؤ یہاں سے مکار، دغاباز، فریبی" شاذی چلی گئی لیکن جیسے اسے کوئی چڑا چڑا کر کہنے لگا۔

"سہیل اب تمہاری اپنی شاذی پرائی ہو جائے گی یہ وہی شاذی ہے جسکے لئے تم نے کہا تھا۔ شاذی! کوئی دوسرا تمہارے پاس آ کر تو دیکھے اسے جان سے نہ مار دوں تو میرا نام سہیل نہیں۔ اور اب کوئی دوسرا ہی تمہاری شاذی کے من مندر کا دیوتا بنے گا اور تم اسی طرح تماشہ دیکھتے رہو گے۔ بزدل کہیں کے بیٹا"

"نہیں ہرگز نہیں"

"تو پھر بدلہ لو" کسی نے پھر اکسایا۔

"ہاں ہاں ضرور لوں گا" لیکن کیسے؟

"دیکھو سہیل رضیہ ہی تمہارے اور شاذی کے بیچ دیوار بنکر کھڑی ہے۔ اسے ختم کر دو اور پھر شاذی ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو جائے گی۔ تم شاذی کو لے کر فرار ہو جانا لیکن کام جان جوکھوں کا ہے ذرا ہوشیار رہنا!!"

اور پھر سہیل پر خون سوار ہو گیا اور وہ اسی رات بمشکل تمام رضیہ کے کمرے میں پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ رضیہ کے قریب پہنچ کر اسنے آہستہ سے خنجر نکالا۔ اچانک کسی نے سرگوشی کی۔

"سہیل پاگل ہوئے ہو جو ایک معصوم اور بے گناہ

کو مارتے ہو۔ تم ایک مرد ہو عورت پہ وار کرنا ٹھیک نہیں اور پھر اس کی جان لے نا تمہاری ذلالت کی بھرپور دلیل ہے۔ یہ سوچ لو کہ تم ایک بے قصور اور با ایثار عورت کی جان لے رہے ہو۔ اگر تم شاذی کو اپنانا ہی چاہتے ہو تو رضیہ سے خود بات کیوں نہیں کر لیتے رضیہ تمہاری بات کو کبھی نہیں ٹھکرائے گی۔ آخر وہ بھی دل رکھتی ہے ابھی وقت ہے ہٹ جاؤ !!

اور پھر اچانک سہیل کے ہاتھوں میں ننگا خنجر لرزنے لگا۔ وہ گھبرا کر مڑتے ہی والا تھا کہ پھر پہلی آواز نے اس کے قدموں کو لوٹنے سے روک دیا۔

"سہیل بزدل واپس جا رہے ہو صرف اس بھروسہ پہ کہ رضیہ تمہاری بات مان لے گی۔ جب اس نے اپنی سگی بہن کی بات کو ٹھکرا دیا تو تمہاری بات کی اس کی نظروں میں کیا اہمیت ہوگی۔ تمہیں تو وہ دھتکار دے گی۔ اور پھر تم اپنا سا منہ لے کر بیٹھ رہو گے۔ ہرگز واپس مت جانا آگے بڑھو۔ اور اس دیوار کو گرا دو جو تمہارے اور شاذی کے بیچ کھڑی ہے۔ جب تم اس دیوار کو گرا دو گے تو شاذیہ تمہاری ہوگی صرف تمہاری"!

اور پھر سہیل کے اندر چھپا ہوا درندہ پورے جوش و ولولے کے ساتھ آگے بڑھا۔ پھر ایک دلدوز چیخ ابھری۔ جو فلک کج رفتار کی لا محدود بلندیوں کو پھلانگتی ہوئی کہیں دور جا کر ٹھہر گئی! اور بستر پر لیٹی ہوئی ایک معصوم زندگی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی!

رضیہ کی فلک شگاف چیخ سن کر شاذیہ اور پپو بھی جاگ گئے اور وہ لمحات تو سہیل کبھی نہیں بھول سکتا جب اس کی شاذی نے اسکے ہاتھ میں ننگا اور خون آلودہ خنجر دیکھ کر روتے ہوئے کہا تھا۔

"سہیل میں تمہیں اتنا ذلیل نہیں سمجھتی تھی۔ یہ ہی تمہاری محبت تھی۔ سہیل بتاؤ تمہیں کیا ملا میری زندگی کے آخری سہارے کو تم نے مجھ سے چھین لیا۔ لیکن یاد رکھو اس کے لیے تمہیں میں تو کیا کبھی قدرت بھی معاف نہیں کرے گی چلے جاؤ یہاں سے" ـــــ اور پھر وہ اپنی آپی کے بے جان لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔

ننھا پپو یہ دیکھ کر دروازہ کھول کر باہر کی طرف بھاگا اور پھر سہیل بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا جرم کرنے کے بعد اسے فوراً ہی اسے اپنے جرم کا احساس ہونے لگا اس کے گئے ہوئے حواس آہستہ آہستہ واپس آ گئے۔ اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔ اسنے خود ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا اسے سزائے عمر دیدی گئی۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے کچھ بھی نہیں کہا اور جب ہی سے وہ اس جیل کی چہار دیواری میں قید ہے۔ جیل میں آنے کے تیسرے دن اسے خبر ملی کہ شاذی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی اور اس کے اندر چھپا ہوا انسانی جذبہ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"تم قاتل ہو صرف ایک کے نہیں تم نے دو معصوم زندگیوں کو ختم کیا ہے رضیہ کو اور اسے بھی جسے تم پیار کرتے تھے۔ اور قدرت کا بہترین شاہکار تصور کرتے تھے ایسے انمول ہیرے کو تم نے خود اپنے پیروں تلے روند ڈالا۔ تم انسان نہیں درندے ہو۔ تم اس دنیا کے قابل نہیں۔ تمہاری یہی سزا ہے کہ تم جیل کی سلاخوں سے سر پٹک پٹک کر مر جاؤ۔"

اور پھر اس نے آنسوؤں کا خزانہ لٹا کر اللہ سے دعا کی "یا اللہ تو میری آہ و فغاں میں اثر پیدا کر دے اور مجھے ہمت دے کہ میں اپنے اس گناہ عظیم کی تلافی کر سکوں تاکہ شاذی کی پیاسی اور بھٹکی روح مطمئن ہو سکے ـــــ" اور پھر نہ جانے رات کو کس لمحے نیند کی دیوی نے اسکو اپنی وسیع اور پرسکون آنچل میں لپیٹ کر دنیا وما فیہا سے بے خبر کر دیا۔

●●

بقیہ صفحہ ۱۵

نہیں ہوتی۔ ادب فرسودہ اور پامال نہیں ہوتا یا اسے ماضی کو دوہرانا نہیں پڑتا اور ایک شہری کی حیثیت سے ایک ادیب کا رتبہ جو اس سے نئی باتوں کی دریافت کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس میں یہ جوش و خروش پیدا کرتا ہے۔ وہ نئی باتیں شد و مد سے تلاش کرے اور بڑی فراخدلی سے قارئین کو اپنے جذباتی تجربے میں حصہ دار بنا لے۔ ○○
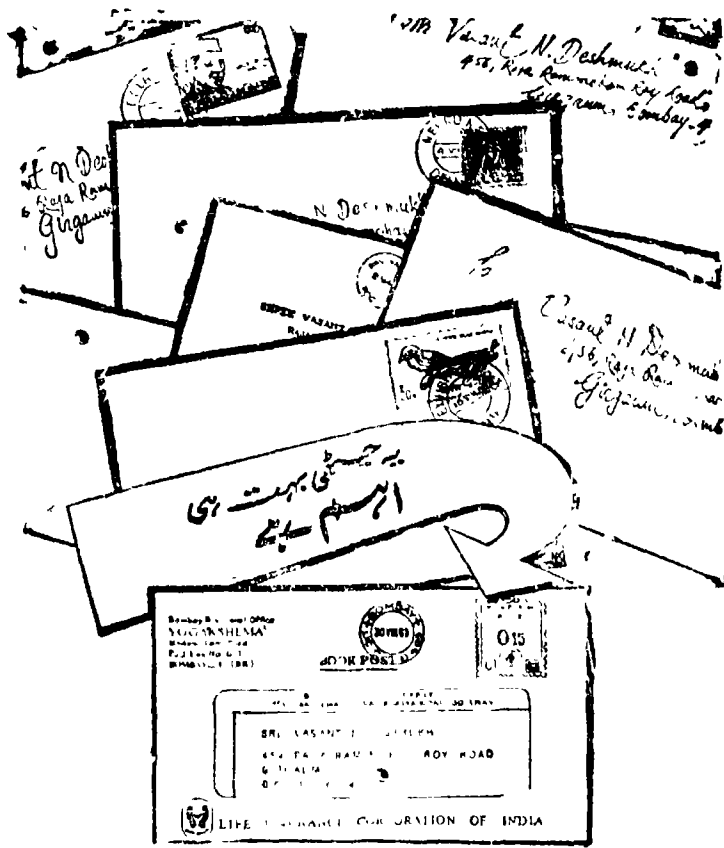
اعجاز شمسی

# غزل


سلمیٰ شہناز زرینی

طالبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی


ہنسنے کے نتیجے میں، پھر آنکھ جو بھر آئی

ہاں میں نے خطا کی تھی، ہاں میں نے سزا پائی

یہ شام کی خاموشی، یہ رونقِ تنہائی

تم کو نہ پسند آئے، ہم کو تو پسند آئی

پی لوں جو سرِ محفل، توہین ہے توبہ کی

ٹھکرا دوں اگر ساغر، ساقی کی ہے رسوائی

یہ ربطِ محبت بھی، کیا ربطِ محبت ہے

دِل اُن کا وہاں دھڑکا، آواز یہاں آئی

ان آنکھوں کی مستی جب بٹنے لگی محفل میں

چپکے سے میری توبہ، پیمانہ اٹھا لائی

شہناز نہ کچھ پوچھو، توبہ کی پشیمانی

جیسے ہی سبو توڑا، ویسے ہی گھٹا چھائی

# آخری سبق

مصنف ——— الفانسے
مترجم ——— شہناز بانو
کروڑی مل کالج دہلی

اس دن مجھے اسکول کے لئے بہت دیر ہوگئی تھی ——— میں دوڑ رہا تھا کہ مسٹر ہیمل مجھ کو نہ صرف دیر میں آنے کی وجہ سے ڈانٹیں گے۔ بلکہ گرامر یاد نہ ہونے پر سزا بھی دینگے کیونکہ مجھے گرامر کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

ان ہی خیالات میں گم جب میں ٹاؤن ہال کے پاس سے گذر رہا تھا۔ تو میں نے خبروں کے بورڈ کے پاس بہت سے لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ مگر میں مزید دیر ہونے کے ڈر سے تیز تیز قدم اٹھاتا رہا۔ کہ اتنے میں محلے کے لوہار نے مجھ سے چلا کر کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے بیٹا ——— آج اسکول میں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا ———" میں اس بات کو مذاق میں ٹال گیا۔

جب میں اسکول کے نزدیک پہنچا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ عام طور پر لڑکوں کے بلا بلا کر سبق یاد کرنے کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ لیکن آج خلاف معمول اسکول میں قبرستان کی سی خاموشی مسلط تھی۔ حیران و پریشان جب میں کلاس میں پہنچا تو دیکھا کہ لڑکے اپنے اپنے ڈیسکوں پہ بیٹھے ہیں۔ اور مسٹر ہیمل نظریں نیچی کئے زمین کی طرف تک رہے ہیں۔

میں کلاس میں داخل ہونے کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ لیکن دروازہ کھولنے کے بعد کچھ بھی نہ ہوا۔ جیسے ہی مسٹر ہیمل نے مجھے دیکھا۔ نرمی سے کہا۔

"آؤ، آؤ! فرانسیز میں سبق شروع کرنے ہی والا تھا"

میں جلدی سے جاکر اپنے ڈیسک پر بیٹھ گیا۔ لیکن آج مجھے سب باتیں عجیب عجیب سی لگ رہی تھیں۔ سب لوگ خاموش تھے۔ مسٹر ہیمل کو اس لباس میں دیکھ کر مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ جو وہ تقسیم انعامات کے وقت یا سالانہ معائنے کے وقت پہنتے تھے۔ لیکن جب میں نے گاؤں کے ان پڑھ اور بزرگ لوگوں کو پیچھے کے ڈیسکوں پر بیٹھے دیکھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

مسٹر ہیمل کرسی پر بیٹھ گئے اور ہم کو مخاطب کیا ——— لیکن آج خلاف معمول ان کی آواز میں نرمی تھی۔

"میرے بچو! یہ تمہارا آخری سبق ہے، جو آج میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ برلن سے حکم آیا ہے کہ سارے اسکولوں میں فرانسیسی زبان کی بجائے، جرمن پڑھائی جائے۔ کل سے تمہارے استاد آجائیں گے جو تمہیں جرمن پڑھائیں گے"

کس قدر تکلیف دہ تھے یہ الفاظ میرے لئے! اوہ، شاید یہی اعلان تھا جو خبروں کے بورڈ پر چسپاں تھا ——— میرا دل کچھ بھاری سا ہوگیا، یہ سن کر کہ آج میں آخری بار اپنی آخری زبان میں سبق پڑھوں گا۔ اور آج کے بعد پھر کبھی مسٹر ہیمل کو نہ دیکھ سکوں گا۔ حالانکہ مجھے خوش ہونا چاہئے تھا۔ کیوں کہ نہ میں نے کبھی فرنچ میں دلچسپی لی تھی اور نہ ہی مجھے مسٹر ہیمل اچھے لگتے تھے۔ لیکن آج نہ جانے کیوں مجھے ہر چیز عزیز اور پیاری لگنے لگی تھی۔ اپنی زبان بھی اور اپنے استاد بھی۔ اور اب میں سمجھا، کیوں مسٹر ہیمل نے آج سب سے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے۔ کیوں کہ آج اسکول میں ان کا آخری دن ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی اکٹھے ہوگئے ہیں۔ کیوں کہ ان کو بھی دکھ ہے۔ کیوں کہ وہ پھر کبھی

اُف یہ فضا اُداس اُداس، آہ یہ موجِ دودِ شام
یاد سی آکے رہ گئیں، دل کو کئی کہانیاں
فراقؔ

اس استاد سے نہ مل سکیں گے۔ جس نے اپنی زندگی کے
چالیس سال اسکول اور گاؤں کی خدمت میں گذارے تھے۔
میں ان ہی خیالات کے تانے بانے بُن رہا تھا کہ
مسٹر ہیمل نے میرا نام پکار کر پڑھنے کو کہا۔ لیکن میں
صحیح طرح پڑھ نہ پایا۔ کیونکہ مجھے سبق یاد ہی نہیں تھا ——
"میں آج تمہیں ڈانٹوں گا نہیں فرانسیز، لیکن ذرا
یہ سوچو، کہ کل جب وہ لوگ آئیں گے تو تم پہ ہنسیں گے۔
کہ تم اپنی زبان بھی نہیں جانتے"، مسٹر ہیمل نے کہا۔
"میرے بچو!" مسٹر ہیمل بولتے رہے۔ "ہماری
زبان جس میں شیرینی اور مٹھاس گھلی ہوئی ہے ——
ہمارا سرمایہ ہے۔ یاد رکھو! جب قوم غلامی کی بیڑیاں
پہنتی ہے تو اس کی زبان زنداں کی کنجی ہوتی ہے ——"
مسٹر ہیمل بولے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے ایک دن میں وہ سب کچھ پڑھا دینا چاہتے ہوں۔
ماحول پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ نہ کسی کے بولنے
کی آواز، نہ قہقہے، نہ لڑکوں کی بھاگ دوڑ، نہ استادوں
کی ڈانٹ ڈپٹ —— اگر کوئی آواز فضا میں ارتعاش
پیدا کر رہی تھی تو وہ ہمارے قلموں کی رگڑ تھی۔ جو کاپیوں
پر گھسنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ کلاس میں طاق
پر بیٹھے کبوتر بہت آہستگی سے غٹرغوں کرنے لگے ——
میں نے سوچا۔
"کیا وہ ان کبوتروں اور چڑیوں کا گانا بھی جرمن
میں سنا کریں گے۔ لیکن کیسے؟"
جب میں کبھی نظر اٹھا کر مسٹر ہیمل کی جانب
دیکھتا۔ تو ان کو ساکت نہ پاتا کسی نہ کسی چیز کو گھورتا ہوا
پاتا۔ شاید وہ کلاس کی ہر چیز کو ذہن نشیں کر لینا چاہتے
تھے۔ جن چیزوں سے چالیس سال تک ان کی وابستگی
رہی ہے۔ ان کو چھوڑتے ہوئے شاید ان کا دل
رو رہا تھا۔
یکایک چرچ کے گھڑیال نے بارہ کا گھنٹہ بجایا۔
مسٹر ہیمل اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ ان کا چہرہ
پیلا پڑ گیا تھا۔
"میرے دوستوں! اور بچو!" انھوں نے کہا۔ "میں....
...... میں ........" کوئی چیز ان کے حلق میں اٹک گئی۔ وہ
کچھ نہ کہہ سکے۔ اور پھر پلٹ کر بلیک بورڈ کے قریب پہنچ گئے۔
اور چاک کے ایک ٹکڑے سے اپنے جذبات کو قابو میں
رکھ کر صرف اتنا لکھ سکے۔

"فرانس زندہ باد —— !"

---

بقیہ افکارِ نو

شادی کر لینے کے بعد جب طلاق ہوتی ہے۔ تو اس کا ایک
بڑا سبب میاں بیوی میں آپسی Understanding
کا نہ ہونا بھی ہے۔

س:۔ ایک بیوی کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے یا نہیں؟
ج:۔ بیوی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے کیونکہ اس سے ازدواجی
زندگی، اخلاقی، معاشی اور سماجی طور پر خوش حال ہو جاتی
ہے۔ لیکن بیوی کے لئے تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ
سمجھدار ماں ہونا بھی ضروری ہے۔

س:۔ عشق کی کامیابی آپ کی نظر میں جسمانی اتصال ہے یا
ذہنی ارتباط؟
ج:۔ جس چیز کا نام عشق ہے اس کی کامیابی تجربہ میں ممکن ہے۔
پھر بھی ایسا ویسا نہیں۔ بلکہ ازل اور ابد جیسا۔ اور
اگر عشق موجودہ دور والا ہے۔ تو عشق کرنے والے کے
پاس تاج محل بنوانے کے لئے سرمایہ ہونا ضروری ہے

س:۔ کیا طلباء کو سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے؟
ج:۔ اگر سیاست میں حصہ لینے سے ملک و قوم کی خوش حالی
ممکن ہو تو اس میں جان کی بازی لگا کر بھی حصہ لینا چاہئے
اور اگر اس کا مقصد اشتعال و تباہی ہو تو پھر اس میں حصہ
لینا تو در اس کے متعلق سوچنا۔ سننا اور بات کرنا بھی گناہ
کے برابر ہے۔

سید محمد راشد۔ بی۔ اے۔ ۔ جامعی
دائرہ محلہ
پوسٹ آفس:۔ سہاگپور
ضلع:۔ ہوشنگ آباد (ایم۔ پی)

# افکارِ نو

تبدیلئ رجحانات کے پیشِ نظر نوجوانوں کے خیالات - اور ان کے رجحانات کی عکاسی اور ترجمانی کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے - زیرِ نظر شمارے میں سید راشد صاحب کے جوابات شامل ہیں۔ مندرجہ سوالات کے جوابات بھیجتے وقت اختصار کا دامن تھامے رکھیں۔

س :- ہندوستان میں رائج طریقۂ تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے کے لئے آپ کیا کیا چیزیں ضروری سمجھتے ہیں - اور کیوں ؟

ج :- موجودہ نظامِ تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیادی خامیاں ڈھونڈی جائیں - پھر ان کو دور کیا جائے - نظامِ تعلیم خود بخود ٹھیک ہو جائیگا میرے نزدیک تعلیم مکمل ہونے کے بعد بے روزگاری کا مسئلہ موجودہ نظامِ تعلیم کو ناقص بنانے کا ذمہ دار نہیں ہے - کیونکہ غیر تعلیم یافتہ حضرات بھی کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر ہی لیتے ہیں - اور پھر تعلیم حاصل کرنے کا مقصد یہ تھوڑے ہی ہوتا ہے کہ کرسی پر بیٹھا جائے - یا اس کو ذریعۂ معاش بنایا جائے - اور اگر ایسا ہے تو پھر جاہل رہنا زیادہ اچھا ہے - دراصل اس مسئلہ کو حل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے - اور وہ یہ کہ طلباء، اساتذہ اور طلباء کے والدین کو ان کے ابتدائی فرائض سے آگاہ کیا جائے - طلباء کو چاہئے کہ وہ تعلیم کو ذہنی نشو و نما کے لئے حاصل کریں ——— اساتذہ اپنی ذمہ داری صرف دو گھنٹے کے لکچر تک محدود نہ سمجھیں - بلکہ اس سے بڑی ذمہ داری وہ طلباء کے اخلاقی، سماجی و سیاسی کردار کو بلند کرنے کو سمجھیں - اور اسی طرح والدین اپنے بچوں کے نام اسکول کالجوں میں لکھانے کے بعد اپنے آپ کو الگ تھلگ محسوس نہ کریں - بلکہ ان کے تعلیمی و دوسری مسائل کو سمجھیں - اس کے علاوہ طلباء خود بھی اپنے موجودہ ذہنی انتشار کو دور کریں - جو کہ موجودہ فلسفۂ محبت اور سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں کھلونا بننے کی وجہ سے ہے - اور اس انتشار کو دور کر کے اپنے اندر ہمت، استقلال، اور یقینِ کامل پیدا کریں۔

س :- بے روزگاری کو ختم کرنے میں حکومت اور نوجوانوں کا کیا کردار ہونا چاہئے ؟

ج :- بے روزگاری بڑھنے کا بنیادی سبب بڑھتی ہوئی آبادی ہے - اور جیسے جیسے آبادی بڑھتی جائے گی یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہوتا جائے گا - اس لئے حکومت کو چاہئے کہ وہ آبادی کو کم کرنے کی فیملی پلاننگ تحریک کو اور تیز کر دے - اور طلباء کو ادبی تعلیم سے زیادہ میڈیکل اور ٹیکنیکل تعلیم کی طرف توجہ دے کر اپنی قوم و ملک کی اور نبی نوعِ انسان کی خدمت کرنی چاہئے - اسی سے بے روزگاری بھی ختم ہو گی - اور اپنا فرض بھی پورا ہو گا۔

س :- کیا شادی کرنے میں والدین کی مداخلت ضروری ہے ؟

ج :- والدین کی مرضی کا شامل ہونا اخلاقی وابستگی کی نشانی ہے - لیکن ایسا نہ ہو تو کم سے کم شادی کرنے والے لڑکے اور لڑکی میں Understanding کا ہونا بہت ضروری ہے - کیونکہ جذبات میں بہہ کر

آگے صفحہ ۲۳ پر

# ایک لمحہ، ایک سایہ

شمیم افروز
طالبہ دلی کالج دہلی

زندگی کی مصروف ترین گھڑیاں گذارنے کے بعد آج جب میں نے ایک سکریٹری کی اسامی کے لئے فارم بھرا، تو مجھے زیب یاد آگئی۔ زیب جو میری چچا زاد بہن بھی تھی۔ اور میری عزیز بہن بھی۔

زیب ایک غریب والدین کی اولاد تھی۔ ذکی چچا ایک معمولی کلرک ہی تو تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے زیب کو پڑھایا لکھایا۔ اور جب وہ اس قابل ہوگئی کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے تو خود چپکے سے آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئے۔

اب زیب تھی اور اس کی پریشانیاں۔ اُس نے مختلف جگہوں پر نوکری کے لئے درخواستیں دے رکھی تھیں۔ کئی جگہوں پر تو وہ انٹرویو بھی دے آئی تھی۔ مگر شاید ناکامی اس کی تقدیر بن چکی تھی۔ کیونکہ اُس کے پاس سیٹھوں کی جیب گرم کرنے کے لئے رشوتیں نہ تھیں۔ اونچے اور بڑے بڑے لوگوں کی سفارشوں سے محروم تھی۔

زیب پوری طرح ناامید ہو چکی تھی۔ کہ اندھیرے میں ایک کرن چمکی۔ اس کو ایک جگہ انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا۔ نواب راحیل کو ایک اچھی سکریٹری کی ضرورت تھی۔ اور اسی سلسلے میں زیب کو بھی بلوایا تھا۔

ہال میں جانے پر زیب کے پسینے ہی تو چھوٹ گئے۔ رنگ و بو کی پوری دنیا امڈی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ہر لڑکی پورے میک اپ میں اور اعلیٰ سے اعلیٰ لباس میں ملبوس تھی۔ صرف ایک زیب تھی، جو ایک سادہ سی سفید ساڑی میں بغیر کسی میک اپ کے گھبرائی گھبرائی کھڑی تھی۔ دوسری لڑکیوں نے اس کی طرف دیکھا۔ اور تمسخر آمیز انداز سے ہنس پڑیں۔

زیب نے سوچا کہ آنے والی ناکامی کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ یہیں سے واپس ہو جائے۔ مگر اس میں بھی تو اس کی توہین تھی۔ سادہ اور خوددار زیب اپنی توہین کسی طرح برداشت نہ کر سکتی تھی۔

وہ چونکی اس وقت، جب چپراسی نے اس کا نام پکارا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی آفس کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔

مگر یہ کیا؟ وہ چونک کر ایک دم رک گئی۔ نواب راحیل کے بارے میں اس کا خیال تھا۔ کہ کوئی بزرگ سی ہستی ہوں گے۔ مگر یہ خوب صورت اور پروقار شخصیت کے مالک کیا واقعی نواب راحیل ہو سکتے ہیں؟

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ان کی آواز پر چونک پڑی۔

"تشریف رکھئے"

اور وہ ہڑبڑا کر جلدی سے ایک کرسی پر ٹک گئی۔

نواب راحیل نے اس کی طرف دیکھا۔ اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اتنے سادہ سے کپڑوں میں اتنا دل پذیر حسن۔ وہ سحرزدہ سے تھے۔

ادھر زیب گھبرائی گھبرائی سی نگاہیں جھکائے، اپنی انگلیوں سے کھیلنے میں مصروف تھی۔

"آپ نوکری کیوں کرنا چاہتی ہیں؟"

نواب راحیل کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

زیب کی نگاہیں اٹھیں۔ اور پھر جھک گئیں۔

"کیونکہ مجھے ان چار افراد کا پیٹ پالنا ہے، جن کی ذمہ داری اب میرے کاندھوں پر ہے!"

اور پھر اس نے مختصر طور پر اپنی پوری کہانی ان کو سنا دی۔ نواب راحیل کافی متاثر ہوئے۔ اور تھوڑی بہت پوچھ گچھ کے بعد اسے جانے کی اجازت

ے دی۔

زیب اب بھی نا امید تھی۔ مگر وہاں سے آنے کے بعد اپنے ساتھ کچھ بے چینیاں سمیٹ لائی تھی۔

ایک دن جب وہ دیکھ رہی تھی۔ تو ایک دم اچھل پڑی اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ نواب راحیل نے اسے کل ڈیوٹی پر بلایا ہے۔

اب وہ نواب راحیل کی پرائیوٹ سکریٹری تھی۔ اپنے آفس میں بیٹھ کر ٹائپ کرتے ہوئے اُسے بڑا سکون ملتا۔ دو ڈھائی بجے سے پانچ بجے تک نواب صاحب کے کاروباری خطوط ٹائپ کیا کرتی۔ گھر آتی تو کھوئی کھوئی سی جانے کیا سوچا کرتی۔ اسے خود ہی معلوم نہیں تھا۔ کہ نواب راحیل اس کے حواسوں پر کیوں اتنی بری طرح سے چھا گئے تھے۔ آنکھیں بند کرتی۔ تو وہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ آ کھڑے ہوتے۔ اور اس کی گھبراہٹوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔ الٰہی خیر۔ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا۔ اور پھر اپنی بے وقوفی پر خود ہی ہنس پڑتی۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود اس نے آج تک نواب راحیل سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ان سے ڈرتی تھی۔

ایک دن، جب وہ دفتر آئی۔ تو اس کی میز پر ایک دعوتی کارڈ پڑا تھا۔ دیکھا تو نواب راحیل کی سالگرہ کا دعوت نامہ تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اتنی معمولی سی لڑکی۔ بھلا نواب راحیل نے اسے کیوں مدعو کیا؟

شام کو خطوط ٹائپ کرتے کرتے اسے وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ وہ چونکی تو اس وقت، جب اس کو اپنے [illegible] پر کسی گرم گرم سانسوں کا احساس ہوا۔ دیکھا تو نواب راحیل کھڑے اسے بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اسے [illegible] گھبرا اٹھتے ہوئے دیکھ کر بولے۔

"بس کیجئے مس زیب۔ اب تو بہت دیر ہو گئی۔ چلئے میں اپنی گاڑی میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

اور زیب سحر زدہ [illegible] کچھ کہے چپکے سے ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جیسے اسے کسی نے میسمرزم کر دیا ہو۔

"تم کل آرہی ہو نا؟"

اچانک نواب راحیل نے اس سے پوچھا۔ اور وہ اس لہجے پر چونک سی پڑی۔

"جی ۔۔۔!"

وہ صرف اسی قدر کہہ سکی۔

"ہوں کل ضرور آنا۔ یہ میری خواہش ہے۔"

اور انھوں نے گاڑی کناٹ پیلس کی طرف موڑ دی۔

"ارے! آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

وہ ایک دم گھبرا کر بول اٹھی۔

"کہیں نہیں۔ بس تھوڑی سی شاپنگ کرنی تھی۔"

وہ اسے لئے ہوئے ایک کپڑے کی دوکان پر گئے ۔۔۔ اور دوکان دار سے بہترین ساڑیاں لانے کا آرڈر دے دیا۔

ادھر زیب سوچ رہی تھی۔

"کل ان کی سالگرہ ہے۔ شاید اسی خوشی میں کسی کو پریزنٹ کر رہے ہوں گے۔ پتہ نہیں کون ہے وہ خوش نصیب۔"

"یہ ساڑی کیسی رہے گی؟"

وہ ان کی آواز پر چونک پڑی۔

وہ ایک نیلی ساڑی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

"مجھے نیلا رنگ بہت پسند ہے۔"

انھوں نے مسکرا کر زیب کی طرف دیکھا۔ اور زیب شرما گئی۔

"جی ہاں، بہت خوب صورت ہے۔"

ساڑی کا پیکٹ لئے وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور پیکٹ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولے۔

"لو، یہ کل باندھنا۔"

اور زیب حیران و ششدر ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"لیکن۔۔۔۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس اچھے بچوں کی طرح کہنا مان لو۔ کل تمہیں آنا ہے۔ اور اس ساڑی میں آنا ہے۔ اگر آگے کچھ کہا تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔"

گھر آچکا تھا۔ زیب کے لئے آگے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ اور وہ پیکٹ تھامے بغیر ان سے کچھ کہے اندر آگئی۔ بھلا وہ ان کو ناراض کس طرح کر سکتی تھی۔

رات اپنی پوری لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ اور زیب ساری رات جانے کیا سوچ سوچ کر اکیلے میں ہی سرخ ہوتی رہی۔ رہ رہ کر دو گہری گہری آنکھیں اس کے دماغ پر چھا جاتیں۔

"کل ضرور آنا۔ کل ضرور آنا" کے مسلسل تکرار سے وہ پر کھلائی جا رہی تھی۔ اس کو اپنے چاروں طرف سے بھی آوازیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"نہیں، نہیں، نہیں، مجھے یہ سب سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی حق نہیں ہے۔ میرے دو چھوٹے بھائی ہیں — ایک ماں ہے۔ بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانی ہے۔ اپنی ماں کو وہ تمام سکھ دینے ہیں۔ جن کی وہ ہمیشہ سے آرزو کرتی آئی ہیں۔ نہیں، نہیں میں کل نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں۔"

اور پھر وہ سکون سے سو گئی۔ جیسے اس نے کوئی اہم فیصلہ کر لیا ہو۔

صبح ہوئی۔ اس نے اٹھتے ہی اپنے آپ کو بے حد مصروف کر لیا۔ چار بجے۔ تو اس کی نگاہ خود بخود گھڑی کی طرف اٹھ گئی۔ دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

"کل ضرور آنا"

کسی نے کان میں سرگوشی کی۔

اس نے جلدی سے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اور اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ میرا بھائی بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا۔ فرض پکار اٹھا۔ محبت کو خاموش ہونا پڑا۔

اُدھر نواب راحیل کی نگاہیں گیٹ کا طواف کرنے میں مصروف تھیں۔ تین بجے۔ چار بجے۔ پھر پانچ بھی بج گئے۔ سب لوگ آگئے۔ مگر جس کو آنا تھا وہ ہی نہ آیا تھا۔ ان سے مزید صبر نہ ہو سکا۔ وہ بڑی تیزی سے باہر نکلے۔ اور گاڑی کو فل اسپیڈ سے چھوڑ دیا۔ رکی تو سامنے زیب کا دروازہ تھا۔ انھوں نے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ زیب کی والدہ نے کھولا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں راحیل ہوں۔ کیا مس زیب اندر ہیں؟"

"ہاں، ہاں۔ آئیے۔ اندر تشریف لائیے۔ وہ اندر ہی ہے۔"

بوڑھی ماں خوشی سے بے قابو ہوتی ہوئی بولی۔ وہ بھاگی بھاگی زیب کو بلا لائیں۔

زیب نے جب انھیں دیکھا۔ تو اپنے گرد بنائی تمام پابندیوں کو کمزور ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

راحیل زیب کی والدہ سے کہہ رہے تھے۔ آج میری سالگرہ ہے۔ مس زیب جب خود نہیں آئیں۔ تو مجبوراً انھیں لینے کے لئے مجھے آنا پڑا۔

جہاں دیدہ ماں سوچ میں پڑ گئی۔ مگر سوال گھر آئے مہمان کا تھا۔ انھوں نے زیب کو اجازت دے دی۔

زیب جب تیار ہو کر باہر نکلی تو اسی نیلی ساڑی میں ملبوس تھی۔ چند لمحوں تک تو راحیل کھو کر ہی رہ گئے۔ پھر ایکدم انھیں ہوش آگیا۔ کہ وہ اس وقت کہاں پر ہیں۔ کھڑے ہوئے اماں سے بولے۔

"آپ فکر نہ کیجئے گا۔ میں خود انھیں جلد ہی پہنچا دوں گا"

وہ اس وقت بہت خوش تھے۔ بہت ہی خوش۔ بڑے دھیمے سے بولے۔

"بہت بہت شکریہ"

"جی! کس بات کا؟"

زیب نے حیرت سے پوچھا۔

"اس ساڑی کو عزت بخشنے کا۔"

انھوں نے بڑی شرارت سے مسکرا کر کہا۔

اور زیب ایک دم سرخ ہو گئی۔ مانو، آسمان پہ دور کہیں شفق پھوٹ پڑی ہو۔

نواب راحیل نے جب زیب کو اپنی ماں سے ملوایا۔ تو وہ پہلی ہی نظر میں اس نازک سی لڑکی کو پسندیدگی کی دیکھنے لگیں۔ اور نواب راحیل اپنی ماں کے چہرے سے سب

کچھ پڑھ کر بالکل مطمئن ہو گئے۔
لیکن ایک دن تو زیب کے یہ تمام خواب بکھر گئے۔
دل کا آبگینہ چور چور ہو گیا۔ اور ہوا بھی اس طرح کہ زیب کو اس
کی کرچیں سمیٹنے کا بھی ہوش نہ رہا۔
آج راحیل آفس نہ آسکے تھے۔ فون پر انھوں نے
زیب کو بتایا۔ کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ نہ آسکیں گے۔
اس لئے زیب ایک گھنٹے کے لئے ان کے گھر آجائے۔
انھیں ایک ضروری خط ٹائپ کرانا ہے۔
لمحہ بہ لمحہ اس کا چہرہ سفید پڑتا گیا۔ ہاتھ لرزنے۔
ہونٹ پھڑپھڑائے۔ مگر اس نے سب کچھ برداشت
کر لیا۔
راحیل اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اور
چپکے چپکے مسکرا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ گھر تک آئی۔
لاکھ اس نے اپنے کو تسلی دی۔ کہ اسے ان سے کیا مطلب۔
اس کا اپنا ایک مقصد تھا۔ مگر وہ اس دل کو کیا کرتی۔ جو بے قابو
ہوا جا رہا تھا۔
اپنی اتنی مختصر سی زندگی میں اس نے کتنے بڑے
بڑے صدمے سہے تھے۔ مگر یہ صدمہ تو اس کی زندگی کا نچوڑ
ثابت ہوا۔ "کیا وہ یہ سب برداشت کر سکے گی؟" وہ اس سوال
کو سلجھا نہیں پا رہی تھی۔
دوسرے دن جب وہ آفس پہونچی۔ تو میز پر ایک
لفافہ پڑا تھا۔ کھول کر دیکھا، تو اس کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔ پہلے تو اس
کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔
"میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک کو دل کی گہرائیوں
سے چاہا ہے۔ اور وہ تم ہو۔ اب یہ تمہارے اوپر منحصر ہے،
چاہو تو مجھے زندگی بخش دو۔ اور چاہو تو موت کے غار میں دھکیل
دو۔"
رفتہ رفتہ وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ مارے شرم کے اس کا
برا حال ہوا جا رہا تھا۔ خط سے نگاہ اٹھائی۔ تو اور زیادہ
گلابی ہو گئی۔ سامنے ہی راحیل کھڑے مسکرا رہے تھے۔
اس نے بچ کر نکل جانا چاہا۔ مگر راحیل سامنے آ کھڑے ہو گئے۔

"جواب دینے سے پہلے ہی بھاگ جانے کا ارادہ ہے؟"
وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کرے۔ ایک طرف اس
کی محبت تھی۔ تو دوسری طرف اس کا فرض پکار پکار کے کہہ رہا
تھا۔
"تمہارے بعد تمہاری ماں کا۔ تمہارے بھائیوں کا
کیا ہوگا؟ یہ تمہارے امتحان کا وقت ہے۔ انکار کر دو۔
انکار کر دو۔"
اس نے گھبرا کر گردن اونچی کی۔ تو راحیل پر یقین نگاہوں
سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔
"نہیں، نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"
وہ یہ کہتی ہوئی راحیل کو حیران و پریشان چھوڑ کر بھاگ
آئی۔
ایک ہفتہ ہو گیا۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا بھی چھوڑ
دیا تھا۔ آیا کہیں راحیل سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔
ماں روز پوچھتی۔
"نوکری پر نہیں جانا؟"
اور وہ ماں کو روز ٹال دیتی۔ وہ یہ سب ایک خواب
کی طرح بھول جانا چاہتی تھی۔ مگر اس کا دل تھا۔ جو اس
کے انکار کے باوجود بھی خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ مگر
مگر لب پھر بھی مسکرایا کرتے تھے۔
ادھر راحیل تھے۔ ان کی پہلی ہی محبت نے ٹھوکر کھائی
تھی۔ پھر بھلا وہ کیسے سنبھلتے۔ پڑے۔ اور ایسے پڑے کہ
ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئے۔ اور بے ہوشی میں وہ
سب کچھ کہہ گئے۔ جو شاید ہوش انھیں کہنے نہ دیتا۔ ماں نے
سب کچھ سنا۔ اور سمجھا۔ اور بیٹے کی خوشیاں حاصل کرنے
دامن پھیلا کر زیب کے دروازے پہنچ گئیں۔
زیب کی والدہ نے سب کچھ سنا۔ اور اپنے سکون
کو بیٹی کی خوشیوں پر قربان کر دیا۔
انھوں نے ہاں کر دی
●●

# غزل

انیس الرحمٰن مرحوم دلی کالج دہلی

ہیں قیصر و جمشید ترے در کے سوالی
ہے شاہدِ رعنا تری ہر بات نرالی

اُف کیسی اُداسی ہے، ذرا کوئی بتائے
کیا بادِ صبا تو نے کوئی بات نکالی

اب کوئی نہیں ہے دلِ محزوں کا سہارا
سوزِ غمِ ہجراں نے بھی کیوں آنکھ چرا لی

یہ نیم نگاہی بھی ہے اِک حشرِ تمنا
تیری ہی نگاہوں نے میری جان نکالی

کہتا ہے زمانہ کہ مجھے عشق ہے تم سے
کیا خوب زمانے کی ہے یہ رسم نرالی

دیکھا جو تجھے ہوگئیں آنکھیں میری گریاں
اشکِ غمِ ہجراں نے نئی راہ بنا لی

کیا خوب سخن سنجی کا مرحوم ہے عالم
تو نے تو ہر اک بات میں ہے بات نکالی

# ہتیار اور انسان

عین. صاد.

جارج برنارڈ شا کے مشہور انگریزی ڈرامے ARMS AND THE MAN کی اردو تلخیص ——

پہلے ایکٹ کی تلخیص گذشتہ ماہ کی گئی تھی ـ باقی دو ایکٹ اس ماہ پیش کئے جا رہے ہیں

کئی مہینے گذر گئے ـ جنگ ختم ہوگئی ـ صلح نامے پر دستخط ہو گئے ـ اور فوجی اپنے اپنے گھروں کو واپس ہونے لگے ـ میجر پٹیکاف نے بھی گھر کا رُخ کیا ـ ادھر مکان کے باغیچے میں نکولا لوکا کو جو اس کی منگیتر بھی تھی، سرزنش کر رہا تھا ـ اور اسے سمجھا رہا تھا کہ سرکشی چھوڑ دینی چاہیئے ـ اور مالک کے ساتھ عزت و تکریم سے پیش آنا چاہیئے ـ اتنے میں میجر پٹیکاف نے نکولا کو آواز دی ـ دونوں نوکروں نے بھاگ کر اپنے مالک کا پُر جوش خیر مقدم کیا ـ اور نہایت مستعدی سے اُس کے لئے کافی تیار کرنے کے لئے اندر چلے گئے ـ خاوند کی واپسی کی خبر سُن کر کیتھرین بھی وہیں پہنچ گئی ـ دونوں میاں بیوی صلح کے متعلق باتیں کرنے لگے ـ میجر پٹیکاف ناشتہ بھی کرتا جاتا تھا ـ اور کیتھرین کی باتوں کا جواب بھی دیتا جاتا تھا ـ

دریں اثنا سرجئیس بھی اپنی محبوبہ اور منگیتر رینا سے ملنے کے لئے وہیں پہنچ گیا ـ کیتھرین نے نہایت تپاک اور جوش سے اپنے ہونے والے داماد کا استقبال کیا ـ اور اُسے فتح کے ہیرو کا خطاب دیا ـ لیکن سرجئیس بہت جلا ہوا معلوم ہوتا تھا ـ اُسے فوج میں ترقی نہیں ملی تھی ـ اس لئے اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا ـ اس خبر کو سُن کر پٹیکاف اور کیتھرین دونوں کو ہی بہت صدمہ ہوا ـ

کیتھرین اور پٹیکاف تو اٹھ کر اندر چلے گئے ـ اور سرجئیس اپنی محبوبہ رینا سے جو کچھ دیر پہلے وہاں آئی تھی، راز و نیاز کی باتیں کرنے لگا ـ دونوں نے باہر جانے کا پروگرام بنایا ـ رینا تو اپنا ہیٹ لینے اندر چلی گئی تھی ـ اور سرجئیس لوکا سے جو کافی کے برتن سمیٹ رہی تھی، چھیڑ چھاڑ کرنے لگا ـ وہ رینا سے اعلیٰ درجے کی رومانی گفتگو کر کے تنگ آ چکا تھا ـ اور اس نے سوچا کہ اگر لوکا سے کچھ عرصہ تفریح کر لی جائے تو کوئی ہرج کی بات نہیں ـ لیکن لوکا بھی ایک ہی کائیاں ذات شریف تھی ـ وہ زندگی میں اپنے مقام سے عاجز آ چکی تھی ـ اور ہر قیمت پر اونچا اڑنے اور "بلند تر شکار" کرنے کا اُدھار کھائے بیٹھی تھی ـ اُسے ایسا نادر موقع خدا دے اور وہ چوک جائے ـ چنانچہ اس نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے

کارلاکر ایسا بھرپور جوابی حملہ کیا کہ سرجئیس تلملا کر ہی رہ گیا۔ لوکا نے کمال بے نیازی
سے سرجئیس کو باتوں ہی باتوں میں یہ جتا دیا کہ اس کی عدم موجودگی میں ریناکسی
اور شخص سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔ سرجئیس نے لاکھ سر پٹکا۔ لیکن "یاں
اک خامشی ہے سب کے جواب میں" کے مصداق لوکا نے مزید کچھ بتانے سے
صاف انکار کر دیا۔
رینا اپنے محبوب سرجئیس کو اپنی خادمہ لوکا سے عشق بازی کرتے
دیکھ چکی تھی۔ اس نے واپس آتے ہی سوال کیا کہ "کیا تم لوکا سے چھیڑ چھاڑ کر
رہے تھے؟" اس پر سرجئیس صاف مکر گیا۔ اور وقتی طور پر بات آئی گئی ہو گئی۔
دونوں ابھی باہر نکلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ کیتھرین بھی وہیں پہنچ گئی۔ اس نے
سرجئیس کو تو اندر بھیج دیا۔ کیونکہ میجر پیٹکا کو اس سے کوئی ضروری کام تھا۔ اور وہ
خود رینا پر برسنے لگی۔ کہ اس نے اپنے باپ کا پرانا کوٹ اجنبی کو دے کر اسے
عجیب مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ پھر وہ اس بات سے بھی ڈر رہی تھی کہ کہیں
اجنبی کے رینا کے کمرے میں پناہ لینے کی بھنک سرجئیس تک نہ پہنچ جائے۔
اور وہ اپنی منگنی ہی نہ توڑ دے۔ رینا سرجئیس کی حرکتوں کو دیکھ کر پہلے ہی
بھری بیٹھی تھی۔ وہ اسے جی بھر کر کوسنے لگی۔ اسنے اپنی ماں سے یہ تک بھی
کہہ دیا کہ "اگر سرجئیس تک چاکولیٹ کریم سپاہی کا قصہ پہنچ جاتا ہے
تو میری بلا سے۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ غصہ سے پاؤں پٹختی وہاں
سے چلی گئی۔
اتنے میں لوکا نے کیتھرین کو اطلاع دی کہ "کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے"
یہ سنکر پہلے تو کیتھرین بہت حیران ہوئی۔ لیکن اس نے فوراً ہی لوکا سے کہا۔
"اس شخص کو یہاں باغیچہ میں بھیج دو"
جب وہ شخص وہاں پہنچا تو اسے دیکھ کر کیتھرین کے پاؤں تلے زمین کھسک
گئی۔ یہ وہی شخص تھا جو جنگ کے دنوں میں رینا کے کمرے میں پناہ لے چکا تھا۔
AA
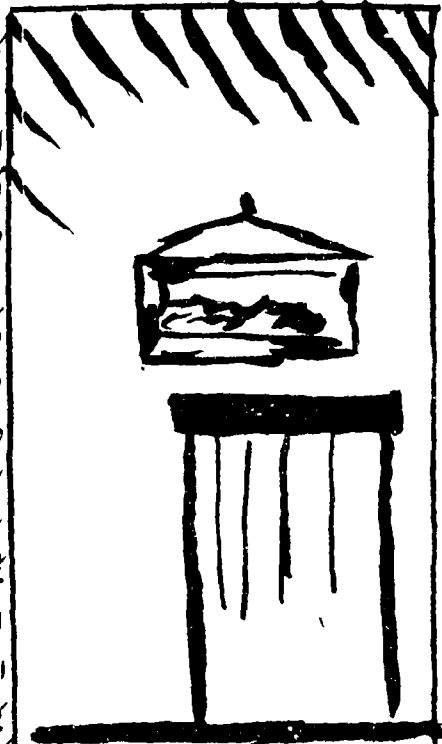
کیتھرین کسی قیمت پر نہیں چاہتی تھی کہ اس کے خاوند یا ہونے والے داماد کو اس اجنبی کی آمد کا علم ہو۔ چنانچہ اس نے اجنبی سے کہا کہ۔

"تم فوراً واپس چلے جاؤ۔ ورنہ میرا شوہر تمھیں دشمن سمجھ کر ہلاک کر دے گا"

"میں تو آپ کو کوٹ واپس کرنے آیا ہوں۔ جو آپ نے مجھے جاتے وقت مستعار دیا تھا"

کیتھرین نے لوکا کو آواز دی کہ وہ نکولا سے کہے کہ وہ اجنبی کا سامان باغیچے میں لے آئے۔ ابھی اجنبی کا سامان وہاں پہنچا ہی تھا کہ میجر پیٹکاف بھی ادھر آنکلا۔ اجنبی کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کیونکہ وہ اسے جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اس سے ہی ملنے آیا تھا۔ اس نووارد کا نام بلنت شلی تھا۔ سرجنیس بھی وہیں پہ آگیا۔ وہ بلنت شلی سے واقف تھا۔ اور وہ تینوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔

ابھی وہ باتوں میں مصروف تھے کہ رینا بھی ادھر آنکلی۔ بلنت شلی کو دیکھ کر اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"چاکولیٹ کریم سپاہی"

اس جملے کو سنکر دوسروں کو سخت تعجب ہوا۔ لیکن رینا نے حاضر دماغی سے کام لے کر فوراً ہی بات بنائی:۔

"میں نے پڈنگ کے لئے آج ایک چاکولیٹ کریم سپاہی بنایا تھا۔ لیکن نکولا کی نااہلی سے وہ خراب ہوگیا"

عین اسی وقت نکولا بھی بلنت شلی کا بیگ لے کر پہنچ گیا۔ اسی بیگ میں میجر پیٹکاف کا وہ پرانا کوٹ بھی تھا جو کیتھرین نے بھیس بدلنے کے لئے جاتے وقت بلنت شلی کو دیا تھا۔ لیکن نکولا کی یہ حرکت دیکھ کر پیٹکاف کو سخت غصہ آیا۔ اور وہ بری طرح اس کو ڈانٹ پلانے لگا۔ اس نے اس بات پر بھی

سخت جھاڑ پلائی کہ اس نے رینا کا چاکلیٹ کریم کا سپاہی خراب کر دیا تھا۔ نکولا بے حد سمجھدار ملازم تھا۔ فوراً معاملہ کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے "ناکردہ جرم" کی گڑگڑا کر معافی مانگی۔ اور بیگ لے کر وہاں سے چلا گیا۔ کیتھرین اور رینا نے سمجھا بجھا کر اُس کے غصّہ کو دور کر دیا۔ اور ٹپکاف، سرجئیس اور رینا کے اصرار پر بلنت شلی نے بھی وہیں پر ڈیرے جما دیئے۔ اس پر کیتھرین کو کوفت تو بہت ہوئی لیکن اس کی پیش نہ چلی۔ ناچار خاموش ہو رہی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد سب لوگ کتب خانہ میں اکٹھے ہو گئے۔

بلنت شلی اور سرجئیس تو بیٹھ کر اس فوجی مسئلہ کو سلجھانے لگے جو ٹپکاف کو درپیش تھا۔ کیتھرین اپنا کشیدہ کاری کا کام کرنے لگی۔ رینا اپنے خیالات کے اُدھیڑ بُن میں تھی۔ اور ٹپکاف اخبار پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی بیوی سے شکایت کرنے لگا کہ میں اپنا بڑا کوٹ الماری میں چھوڑ گیا تھا۔ اب وہاں نہیں ہے۔ کیتھرین دریں اثنا وہ کوٹ بلنت شلی کے بیگ سے نکال کر چپکے سے الماری میں رکھ آئی تھی۔ اس لئے اب وہ نہایت وثوق سے کہنے لگی کہ کوٹ تو وہیں پر ہے۔ ٹپکاف کو اصرار تھا کہ اس نے الماری کی اچھی طرح تلاشی لی ہے۔ اور کوٹ وہاں پر نہیں ملا۔ اس پہ دونوں میں ٹھن گئی۔ اور معاملہ شرط بدنے تک پہنچ گیا۔ نکولا کو کوٹ لانے کے لئے بھیجا گیا۔ اور کوٹ وہاں سے مل گیا۔ ٹپکاف شرط ہار گیا۔ اسے سخت تعجب ہو رہا تھا کہ ایسا ہو کیسے گیا۔ کچھ دیر آپس میں شغل ہوتا رہا۔ اتنے میں بلنت شلی نے وہ فوجی مسئلہ حل کر دیا۔ جو ٹپکاف کے لئے دردِ سر بن گیا تھا۔ چنانچہ پٹ کاف کو بہت خوشی ہوئی۔ اور وہ کیتھرین اور سرجئیس کو ساتھ لے کر احکام صادر کرنے باہر چلا گیا۔

اب رینا اور بلنت شلی اکیلے کمرے میں رہ گئے۔ رینا کا خیال تھا کہ اُس نے بلنت شلی کی جان بچانے میں جو اس کی مدد کی تھی۔ وہ اس کے لئے اس کا شکریہ ادا کرے گا۔ وہ اُسے جتانے لگی کہ میں نے تمہاری خاطر دو مرتبہ جھوٹ
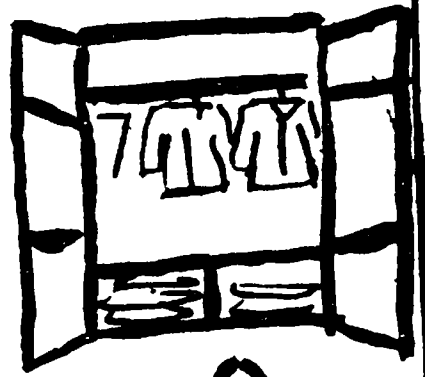
بولا۔ ایک بار فوجیوں کے سامنے۔ اور دوسری دفعہ اپنے باپ کے سامنے۔
لیکن بلنت شلی نے اس کی بلند و بالا گفتگو کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہ دی۔
پہلے تو رینا کو سخت غصہ آیا۔ پھر وہ مان گئی کہ بلنت شلی نے جو اس کے متعلق رائے قائم کی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ ہر کوئی اس سے دھوکا کھا جاتا تھا۔ لیکن یہ پہلا شخص تھا جس نے اُسے حقیقی رنگ میں پہچانا تھا۔ بلنت شلی نے جواب دیا۔
" تمہارے تمام تر جھوٹوں کے باوجود میں بھی تمہارا اتنا ہی مدّاح ہوں جتنا کہ دوسرے لوگ "
اب رینا نے اس سے سوال کیا۔
" کیا میری تصویر تمہیں مل گئی تھی؟ "
بلنت شلی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اب تو رینا کے حواس گم ہو گئے۔ کیونکہ اُس نے وہ تصویر کوٹ کی جیب میں رکھ دی تھی۔ جو بلنت شلی کو مستعار دی گئی تھی۔ اگر وہ تصویر غلط ہاتھوں پہنچ گئی، تو پھر اس کی شامت آجائے گی۔ کیونکہ اس نے اس تصویر کے پیچھے " اپنے چاکلیٹ سپاہی کے نام " لکھ دیا تھا۔
اتنے میں لوکا بلنت شلی کے بہت سے خطوط اور تار لے کر اندر داخل ہوئی۔ ان خطوط میں ایک تو اس کے باپ کے انتقال کا ذکر تھا۔ اور دوسرے میں اس جائیداد کی تفصیل تھی جو اسے ورثہ میں ملی تھی۔ بلنت شلی فوراً واپس جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اور اپنے نوکر کو ہدایت دینے کے لئے باہر نکل گیا۔ رینا کو اُس کی بے نیازی پر بڑا دکھ ہوا۔ اور لوکا نے اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے ایک فقرہ چست کر دیا۔ " کیا سنگ دل آدمی ہے کہ باپ کی موت پر بھی ایک آنسو تک نہیں بہایا " اس پر رینا گھبرا کر باہر نکل گئی۔
ابھی لوکا وہیں تھی کہ نکولا بھی وہیں آگیا۔ لوکا کے متعلق نکولا کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ دل سے وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ لوکا اس کے بجائے سرجیس سے شادی کر لے۔ کیونکہ اس طرح وہ اس کی بیوی بن کر اس
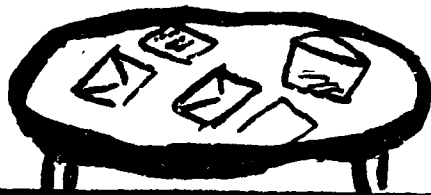
مال نہیں اڑا سکے گی۔ بلکہ وہ مالدار اسنے بیں بیاہ کرکے اس کے لئے بڑی اچھی گاہک ثابت ہوگی۔ اس نے لوکا کو بتا بھی دیا کہ اس سلسلہ میں مَیں تمہاری ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار رہوں۔

یہ دونوں ابھی باتوں میں معروف ہی تھے کہ خود سرجنیس بھی ادھر آ نکلا۔ سرجنیس کو دیکھ کر نکولا تو چپکے سے باہر نکل گیا۔ اور لوکا اپنی تمام ترنسوانی صلاحیتوں سے کام لے کر سرجنیس کو اپنے دام میں پھنسانے کی ترکیبیں کرنے لگی۔

اب اس نے سرجنیس کو صاف صاف لفظوں میں بتا دیا کہ بلنت شلی ہی اس کا رقیب ہے۔ اس پر سرجنیس کو بہت غصہ آیا اور وہ لوکا کے جال میں اس بری طرح پھنسا کہ اسے یہ دعاء کرتے ہی بنی کہ اب اگر میں تمہیں ہاتھ لگاؤں گا تو اپنی منگیتر کی حیثیت سے ہی لگاؤں گا۔

اتنے میں بلنت شلی بھی واپس پہنچ گیا۔ لوکا تو اسے دیکھ کر باہر کھسک گئی۔ اور سرجنیس بلنت شلی کو للکارنے لگا کہ "مجھ سے دو دو ہاتھ کر لو۔ کیونکہ تم نے میری عدم موجودگی میں میری محبوبہ کو مجھ سے ہتھیانے کی کوشش کی ہے۔"

بلنت شلی نہایت ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی تھا۔ پہلے تو اس نے سرجنیس کو طرح دینے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا تو وہ بھی آمادۂ پیکار ہو گیا۔ رینا نے جو کچھ دیر پہلے واپس آ گئی تھی، انھیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ باتوں باتوں میں یہ عقدہ کھلا کہ سارے فساد کی جڑ لوکا ہے۔ رینا سرجنیس سے مایوس ہو چکی تھی۔ اس نے اس پر الزام لگایا کہ "تم نے لوکا کو میری اور بلنت شلی کی مخبری کرنے کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ اور اب بھی لوکا یقیناً دروازے سے کان لگائے ہماری باتیں سن رہی ہوگی۔"

اس کا شبہ درست نکلا۔ سرجنیس نے رینا کو جھوٹا کرنے کے لئے باہر جھانکا۔ لیکن وہاں واقعی لوکا اوٹ میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ سرجنیس اسے گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ اور لوکا نے صاف لفظوں میں اس
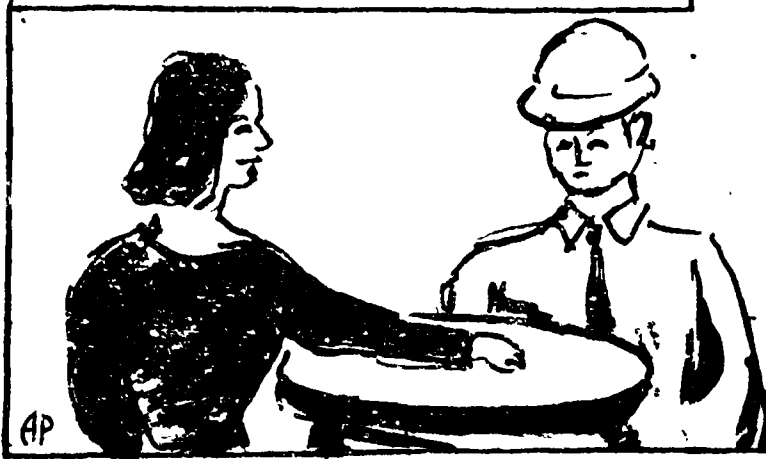
بات کا اقرار کر لیا کہ واقعی وہ سرجئیس سے محبت کرتی ہے۔

کچھ دیر بعد پٹکاف بھی وہیں آگیا۔ اُس نے آتے ہی رینا سے پوچھا کہ:

"تمہارا فوٹو میری جیب میں کیسے پہنچ گیا ہے؟" اور نکولا کو آواز دی کہ "میرا کوٹ ادھر لے آؤ۔" جب نکولا کوٹ لے آیا تو رینا اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور اپنے باپ کی جیب سے فوٹو چپکے سے کھسکا لیا۔ حالانکہ اس نے بہانہ یہ کیا تھا کہ وہ اُسے کوٹ پہنانے میں مدد دے رہی ہے۔ اُس نے نہایت ہوشیاری سے یہ فوٹو بلنت شلی کے حوالے کر دیا۔ جس نے سرجئیس کے سامنے ہی اُسے میز پر چھپا دیا۔

جب پٹکاف کوٹ پہن چکا۔ تو اس نے اپنے تمام جیبوں کی تلاشی لی لیکن فوٹو جیبوں میں ہوتا تو ملتا۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ لیکن اب اس نے بیوقوف بننے سے انکار کر دیا۔ اور صاف صاف لفظوں میں رینا سے سوال کیا کہ یہ "چاکولیٹ کریم سپاہی کون ہے؟ جسے تم نے فوٹو دیا تھا"

سرجئیس تو صاف انکار کر گیا۔ اور اب بلنت شلی نے نہایت جرأت کا اظہار کرتے ہوئے۔ اس بات کا اعتراف کر ہی لیا کہ "چاکولیٹ کریم سپاہی میں ہی ہوں۔"

پٹکاف بہت حیران ہوا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رینا دونوں میں سے کس کو ترجیح دیتی ہے۔ اور دونوں میں سے کس کی منگیتر ہے۔ اس کی بیٹی نے جواب دیا کہ "میں اب کسی کی بھی منگیتر نہیں ہوں۔" سرجئیس کی محبت کا مرکز اب لوکا ہے۔ پٹکاف کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اور اس نے انتہائی غصہ میں کہا:

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لوکا تو نکولا کی منگیتر ہے۔"

اب نکولا کی باری تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ لوکا مجھ سے بہت بلند اور ارفع ہے۔ میری اس سے حقیقتاً کوئی سگائی نہیں ہوئی ہے۔ اور جو ہوئی تھی

وہ تو محض دنیا کو دکھانے کے لئے تھی"۔

اب لوکا آگے بڑھی۔ اور اس نے سرجنیس پر الزام لگایا کہ "تم نے سب کے سامنے میری توہین کی ہے۔ اب اسکی تلافی کرو۔ سرجنیس تو پہلے اپنی جگہ پر اڑا رہا۔ لیکن بلنت شلی کے طنز کے سامنے وہ بے دم ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر لوکا کے ہاتھوں بوسہ دیا۔ لوکا کے لئے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ اس نے اعلانیہ کہدیا۔ "کہ اب جب کہ تم نے مجھ چھو لیا ہے، تو صاف صاف لفظوں میں اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو۔ سرجنیس نے بھی کھلے بندوں اسے اپنی منگیتر تسلیم کر لیا۔ یہ باتیں کیتھرین نے بھی سن لیں جو ادھر ہی آ رہی تھیں۔ اس کو سرجنیس کے رویہ پر بہت رنج ہوا۔ مگر لوکا نے اسے ٹوکا۔ اور کہا کہ "ریناؔ تو شروع سے ہی بلنت شلی کی طرف مائل تھی"۔

یہ سنکر بلنت شلی اپنی محسنہ کی صفائی پیش کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ "میری عمر تو چھتیس برس کی ہو چکی ہے۔ بھلا ایسے شخص سے شہزادوں اور رومانوں کے خواب دیکھنے والی اٹھارہ سالہ دوشیزہ کیسے محبت کر سکتی ہے"۔

اس پر رینا نے فوراً جواب دیا۔

"گدھے! میں اٹھارہ سال کی الہڑ دوشیزہ نہیں ہوں۔ بلکہ چوبیس برس کی جوان عورت ہوں"۔

بلنت شلی کے لئے یہ اشارہ کافی تھا۔ اس نے فوراً رینا کے باپ سے درخواست کی کہ "مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لو"۔

پیکاف اور کیتھرین پہلے تو گھبرائے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بلنت شلی محض ایک پیشہ ور سپاہی ہے۔ اور اس کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ ان کے ناز و نعم کی پلی ہوئی بیٹی کو اچھی طرح رکھ سکے گا۔ مگر جب بلنت شلی نے انھیں اپنی جائیداد کی تفصیل بتائی۔ تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انھوں نے فوراً اسے اپنی فرزندی میں لینا قبول کر لیا۔ سچی محبت سے عاری ہونے کے باعث لاتعداد انسانوں پر فتح پانے والا سرجنیس ایک کمزور و ناتواں دوشیزہ کا دل جیتنے میں ناکام ہو گیا۔

برنارڈ شا کا ڈرامہ "اسلحہ کے بل پر جیت" سے شروع ہوا تھا اور سچے انسانی جذبات کی کامرانی پر ختم ہوا۔ اس طرح اس سے یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ زیادہ طاقت کس میں ہے۔ اور آخری جیت کس کی ہے۔ "اسلحہ کی یا انسان کی"؟
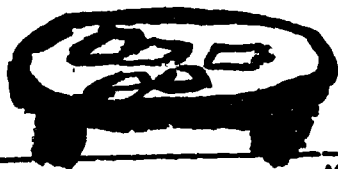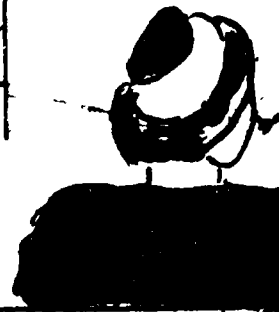
# خیالات کے جھروکے سے . . . . .

"قارئین شاہجہاں کے خطوط کے اقتباسات شائع کئے جاتے ہیں۔ ــــــ قارئین سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ شاہجہاں کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اپنی گراں قدر رائے اور مشورے سے نوازیں ــــــ"

مارچ ۸۰ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اب کے ٹائیٹل قدرے جاذب نظر ہے ــــ مضامین بھی اچھے ہیں۔ خاص طور پر ریحان الحق صاحب کا افسانہ " یہ خلش کہاں..... " بہت اچھا ہے ــــ دوسرے نصاب سے متعلق کتابوں کی تلخیص اور ترجمے کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ــ اس ماہ آپ نے انگریزی ڈرامے....... ARMS AND THE MAN کے پہلے ایکٹ کی تلخیص شائع کی ہے۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ اگلی مرتبہ باقی ماندہ دونوں ایکٹوں کی تلخیص ایک ہی بار دیدیں تاکہ وہ امتحان کے نقطہ نظر سے طلبہ کیلئے سودمند ثابت ہو سکے۔

محمد اسلم
دلّی کالج (شبینہ) دہلی۔

تازہ شمارہ ملا ــــ عرض ہے کہ اپنے مضامین کا معیار ذرا اور بلند کیجئے کیونکہ زیر نظر شمارے میں افسانہ "چارہ ساز" کا موضوع نہایت بچکانہ اور انداز تحریر بالکل بنیادی ہے ــــ شاہجہاں طالب علموں کے لئے ہے اس میں کوئی کلام نہیں ہے مگر طالب علم اچھے اور معیاری افسانے اور مضامین بھی تو لکھ سکتے ہیں ــــــ ادبی و معلوماتی مضامین کا حصہ بہت تھوڑا ہے اس طرف توجہ دیجئے۔

سلمان جاوید
الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد۔

مارچ ۸۰ء کا شمارہ پڑھا ــــ آپ نے اس میں ARMS AND THE MAN کے ایک ایکٹ کی تلخیص شائع کی ہے ــــ کیا ہی اچھا ہو اگر اپریل کے پرچے میں باقی دونوں ایکٹ کی تلخیص ایک ہی ساتھ دیدیں۔

محمد ہارون. کے. ایم. کالج ۔ سعید احمد دیال سنگھ کالج
سکندر۔ ہندو کالج ۔ وغیرہ ــــــ

کالج کے ریڈنگ روم میں "شاہجہاں" دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اردو کا ایسا پرچہ جسے ہر اعتبار سے طالب علموں کی سرپرستی حاصل ہو وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ —— خدا کرے شاہجہاں اردو کی اس کسمپرسی کے دور میں چشم بد سے دور رہے اور اردو زبان وادب کی ترویج و ترقی کے لئے بے حد مفید اور کار آمد ثابت ہو —— نیز اس زمانہ میں جب کہ نہ صرف عوام میں بلکہ طالب علموں میں زبان وادب کے ذوق وشوق، شعور و وقوف کا فقدان ہے اسے اچھا لکھنے والے ملیں۔

سید رحمان علی

راجستھان کالج ۔ جے پور۔

---

بقیہ صفحہ ۴۰ ——

دیال سنگھ کالج، ہندو کالج اور جامعہ ٹیچرز ٹریننگ کالج کے طلبا کی ٹیمیں تھیں۔

ابتدا میں محمد اقبال (سکریٹری بزم ادب) نے ٹرافی کا تعارف کروایا اور شہزاد اختر نے ایک شعر پڑھ کر بیت بازی کا افتتاح کیا۔

دلی یونیورسٹی سے مس ساجدہ، جامعہ ملیہ سے شانِ حیدر اور مس ثروت اور دلی کالج کی طرف سے محمد شاہد، مس ناہید تاج قریشی اور شاہد مجیب نے اساتذہ کے بہترین شعر دلکش ادائیگی اور صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر کے سامعین سے زبردست داد وتحسین حاصل کی۔ اس مقابلہ میں حصہ لینے والوں میں مس سلمیٰ مس فیروزہ ناظر، گلزار احمد راجہ اور اقبال قریشی بھی قابلِ ذکر ہیں۔

بیت بازی کے بعد مقابلہ میں حصہ لینے والوں سے ادبی سوالات پوچھے گئے۔ کئی طلبا نے صحیح جوابات دیئے۔ اس لئے قرعہ اندازی سے یہ انعام جمیل احمد (ہندو کالج) کو ملا۔

بیت بازی میں ٹرافی جامعہ ٹیچرس ٹریننگ کالج کو ملی۔ پہلا انعام مس ساجدہ (دلی یونیورسٹی)، دوسرا انعام شاہد احمد (دلی کالج) اور تیسرا انعام مس ناہید تاج قریشی (دلی کالج) کو ملا۔

ڈاکٹر قمر رئیس اور مولانا غلام سمنانی صاحب نے جج کے فرائض انجام دیئے۔

●●

بقیہ صفحہ ۱۲

سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ پست خیال یا مبتذل جذبات کی ترجمانی نہ کرتے ہوں۔ میدانِ غزل وسیع اس حالت میں ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات کی گنجائش ہے خواہ وہ فلسفیانہ ہوں چاہے اخلاقی، خواہ عشق و محبت کے ہوں چاہے بغض عداوت کے صرف عاشقانہ انداز سے انکو ادا کر دینا کافی ہے لیکن اگر یہ شرط نہیں تو اس شعر کو معنوی حیثیت سے غزل کے زمرے میں جگہ پانے کا حق نہیں ہو سکتا۔

●●

# میں بھی حاضر تھا وہاں

مرتبہ ریحان الحق ایم اے بی کام

"اس عنوان کے تحت مختلف تعلیمی اداروں کی ادبی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کی جاتی ہے ——— اردو، عربی اور فارسی سوسائٹیوں کے سکریٹری صاحبان سے درخواست ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ہونے والے فنکشن کی قبل از وقت اطلاع دیں یا مختصراً رپورٹ ارسال کریں ——— ادارہ ممنون ہوگا ———"

## ۲۰ر فروری ۱۹۷۰ء

### انجمن فارسی کے زیرِ اہتمام نعیم الدین کا مقالہ

۲۰ر فروری کو دلی کالج میں انجمن فارسی کے زیرِ اہتمام ایک ادبی نشست ہوئی۔

سیّد غلام سمنانی (لکچرار شعبۂ انگریزی) نے کرسیٔ صدارت کو رونق افروز فرمایا۔

نعیم الدین صدیقی (متعلم ایم۔ اے فائنل) نے اپنے پُر مغز مقالہ "فارسی غزل کا ارتقا" سے آج کی نشست کا افتتاح کیا۔ مقالہ بحیثیت مجموعی پسند کیا گیا۔ لیکن اس پر سامعین کی طرف سے اعتراض کیا گیا کہ مقالہ میں نظیری کے بعد کے شعرا کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مقالہ کے بعد مباحثہ میں حصّہ لینے والوں میں لیاقت مرزا، مس میمونہ اور عبدالمالک قابلِ ذکر ہیں۔

بعد ازاں ایک ایرانی طالب علم "خلیل ابراہیم" نے "دانش وآموز" کے عنوان سے فارسی میں ایک معلوماتی مقالہ پڑھا۔ اور محمد یونس صاحب جعفری (صدر انجمن) کے مقالوں پر تبصرے اور صاحبِ صدر کی صدارتی تقریر کے بعد چائے پر یہ نشست ختم ہوئی۔

## ۲۱ر فروری

دلی یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں عربی، فارسی اور اردو کے طلبا کو طلائی تمغہ جات اور

## متفرق انعامات

حسب سابق امسال بھی دلی یونیورسٹی نے عربی، فارسی اور اردو کے ہونہار طلبا کو ان کے امتحانات میں امتیازی حیثیت میں پاس ہونے والوں کو متفرق انعامات سے نوازا جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

| نام طالب علم | انعام | بحوالے |
| --- | --- | --- |
| ۱۔ آغا خورشید مجتبیٰ | سعدی گولڈ میڈل | بی۔ اے (آنرز) فارسی |
| ۲۔ محمد شفیع الرحمٰن | یونیورسٹی میڈل | ایم۔ اے عربی |
| ۳۔ انیس الرحمٰن | " " | بی۔ اے (آنرز) عربی |
| ۴۔ صلاح الدین خان | مرزا غالب پرائز | ایم۔ اے اردو |
| ۵۔ امیر محمد | " " " | بی۔ اے (آنرز) اردو |
| ۶۔ معروف الحسن صدیقی | " " " | بی۔ اے (پاس) اردو |

اس کے علاوہ صلاح الدین خان کو Composition Courses کے تمام طلبہ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر ایس را دھا کشن پرائز بھی دیا گیا۔ ادارہ شاہجہاں انعام یافتہ حضرات کو تہنیتِ قلبی پیش کرتا ہے۔

## ۲۸ر فروری

### عبدالمتین عثمانی انٹر کالج مقابلہ بیت بازی

دلی کالج ہال میں ایک دلچسپ مقابلہ بیت بازی منعقد ہوا۔ ایک طرف دلی کالج کے ۱۲ منتخب ادبی ذوق رکھنے والے طلبا تھے۔ اور دوسری طرف دلی یونیورسٹی،

# "فتحپوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول دہلی"

## ایک نظر میں

از- جناب زین العابدین صاحب ایم، کام، بی ایڈ پرنسپل اسکول ہذا

"فتحپوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول دہلی کے قدیم ترین اسکولوں میں سے ایک ہے - ۲۸ فروری ۱۹۸۰ء کو اسکول کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی پرنسپل صاحب کی رپورٹ مختصراً پیش کی جا رہی ہے - "

---

دنیا کی کوئی قوم یا ملت جہاں اپنے مختلف ورثوں پر فخر کر سکتی ہے، وہاں سب سے بیش قیمت ورثہ تعلیم اور اس سے متعلق درس گاہیں ہیں کیونکہ وہی اصل میں وہ گہوارے ہیں جہاں تہذیب پرورش پاتی ہے اور انسانی تمدن کو جلا دی جاتی ہے۔ چنانچہ دہلی کے عوام فتحپوری مسلم ہائر سکنڈری اسکول کے وجود اس کی خدمات پر بجا فخر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس ادارہ نے تاریخ کے نئے نئے موڑ دیکھتے ہوئے اور حوادثِ روزگار کا شکار ہوتے ہوئے بھی قومی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے میں جو اہم کردار ادا کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسکول کی بنیاد یں کس نیک نیتی سے رکھی گئی تھیں۔

ماضی کی محسن شخصیتوں میں خان بہادر حاجی حافظ محمد صدیق ملتانی فرزندان حاجی بخش مرحوم کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں جن کی مالی اعانت اور قربانیوں سے یہ ادارہ ۱۹۲۹ء میں صفحۂ وجود پر نفش تریا کی شکل میں ظہور پذیر ہوا اور وقف کمیٹی حاجی الہی بخش مرحوم اور منتظمہ کمیٹی مسجد فتحپوری کے زیر سایۂ عاطفت ۱۹۳۱ء میں ہائی اسکول کی شکل میں اختیار کر لی اور اب اس چشمۂ فیض سے ہزار ہا تشنگانِ علم سیراب ہو رہے ہیں۔

لیکن فلک کی فتنہ سامانی کو یہ لہلہاتی ہوئی کھیتی نہ بھائی اور اس کی فتنہ سامانی ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب اور جاں فرسا شورش کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ممکن تھا کہ یہ ادارہ اس سیل بلا کے تھپیڑوں کا متحمل نہ ہوتا لیکن ———

" دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست " کے مصداق اس ظلمت کدہ میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم و مغفور جیسی شخصیتیں روشنی کا مینار بن کر سامنے آئیں اور اس چراغِ سحری کو حیات نو دے کر قوم و ملت کے لئے مسیحا بن گئیں۔ سابق پرنسپل سید حمید حسین صاحب، م احمد صاحب سابق جوائنٹ سکریٹری و رکن مجلس منتظمہ اور نواب سلطان یار خاں ایڈوکیٹ کے بر وقت تعاون اور قربانی سے اس ادارے کی رگوں میں تازہ خون بھر تا رہا اسی قیامت خیز عالم میں آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو کے ان الفاظ نے اس ادارے کے ہمدردوں کی دستگیری کی کہ " میں خود ختم ہونا پسند کروں گا لیکن اقلیتی ادارے کا وجود قائم رہے گا " یہ اعلان افقِ یاس پر ایک روشنی کی قوسِ قزح ثابت ہوئی اور بادِ سموم کے جھلسے ہوئے اس گلشن میں پھر موسمِ بہار کا سکہ رواں ہونے لگا۔

۱۹۷۷ء کے بعد اس چراغ ملی کو سنی مجلسِ اوقاف اور مجلس منتظمہ اسکول ہذا کے دامنِ عاطفت میں جگہ ملی۔ اور ادارہ ایک روشن مستقبل نظر کے سامنے رکھ کر منزل کی طرف گامزن ہو گیا۔

سنی مجلسِ اوقاف کی سرپرستی اور کفالت قابلِ تعریف

ہے ۔ ادارہ اس احسانِ عظیم کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گا ۔ لیکن افسوس ! ۔

فلک را غیر ازیں خود نیست کارے
کہ یارے را جدا سازو زیارے

اوقاف نے چند ناگزیر حالات کے پیش نظر اس ادارے کو اپنی مالی اعانت سے محروم کر دیا اور ۶۹-۱۹۶۸ء میں اسکول کو مالی بحران کا شکار بنا کر دامن کش ہو گیا یہ حادثہ جانکاہ اسکول کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا لیکن اللہ کی تائید شاملِ حال تھی مجلس منتظمہ کی ۔ بروقت فرض شناسی اور ہمدردانِ ملت کے ایثار نے پھر اس ڈوبتی نیا کو پار لگایا حالات اسقدر ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ عمارت اور فرنیچر خستگی کا شکار ہو گئے تھے ۔ طلبہ کے لئے فرنیچر تو در کنار ٹاٹ اور دریاں بھی عنقا ہو گئی تھیں جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑ جانے سے خاک اڑنے لگی تھی پانی اور بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا ۔ ان ناسا عد حالات میں خادم کو بحیثیت پرنسپل اس قومی ادارے کی خدمت کا موقع ملا میں مجلسِ منتظمہ کے اراکین اور ہمدردانِ ملت کا کسطرح شکر بجا لاؤں جنہوں نے اپنی قربانیوں سے اس ادارے کی دامے درمے اور سخنے مدد کی ۔ اس سلسلہ میں بالخصوص جناب حاجی محمد فاروق صاحب آپ کلاتھ والوں کی ذاتِ اقدس قابلِ ستائش ہے جنہوں نے اپنی آسائش و آرام کو ترک کر کے اسکول کو انتہائی جد و جہد اور بے دریغ خدمت سے اس قابل بنا دیا کہ وہ حسب معمول کام کر سکے ۔

## انجمن والدین و اساتذہ

کسی ادارے اور طلبہ کی فلاح و بہبود کے لئے یہ انجمن نہایت نہایت ہی ضروری ہے اسی انجمن کے باعث اساتذہ اور والدین ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور بچوں کے مسائل کو اس طرح مشترکہ طور پر حل کیا جاتا ہے خدا کا شکر ہے کہ اب اس انجمن کی نشستیں ہر ماہ باقاعدہ ہوتی ہیں میں ان والدین اور سرپرست صاحبان کا شکر گزار ہوں جو اس سلسلہ میں تعاون فرماتے رہتے ہیں سال رواں میں اس انجمن کے صدر پرنسپل صاحب ۔ نائب صدر جناب محمد اسلام صاحب سکریٹری جناب انوار الدین صاحب استاذ اسکول ہذا ، جائنٹ سکریٹری جناب مولوی محمد فاروق صاحب واصفی اور جناب محبوب احمد صدیقی صاحب استاذ اسکول ہذا خازن ہیں ۔ یہ تمام صاحبان کوشاں ہیں کہ انجمن ہذا سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کیا جائے انجمن کی گذشتہ نشست میں یہ قرارداد منظور ہوئی ہے کہ اس کے چندے میں سے کچھ رقم غریب اور نادار طلبہ کے لئے نصابی کتابوں کی فراہمی پر صرف کی جائے اور کچھ رقم ان ملازمین پر بھی صرف کی جائے جن کے لئے محکمۂ تعلیم سے گرانٹ نہیں ملتی تاکہ اسطرح ادارے کی بہتر خدمت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے ۔ ہمیں امید ہے کہ والدین و سرپرست صاحبان اس کے فنڈ کی فراہمی میں ادارہ سے تعاون فرمائیں گے ۔

اسکول کے ان بیرونی حالات کا ذکر کرنے کے بعد اب یہ ضروری ہے کہ اندرونی حالات کا بھی جائزہ ناظرین کرام کے سامنے پیش کیا جائے ۔

یہ ادارہ ۱۹۵۹ء سے ہائر سکنڈری بنا ۔ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بلڈنگ کی گنجائش کے پیش نظر ۱۹۷۰ء سے مکمل کا نظام دو شفٹوں میں کر دیا گیا ۔ سیکنڈ شفٹ کے انچارج جناب محمد فریب خاں صاحب ایم ، اے ، بی ، ٹی ، جناب بشیر الحسن صاحب ایم ، اے ، بی ، ٹی ، اور جناب انوار الدین صاحب ایم ، اے بی ، ٹی ، ایڈ رہے ہیں ان حضرات نے انچارج شپ کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے ہیں اور اب یہ جملہ صاحبان فرسٹ شفٹ میں بی ، جی ، ٹی ۔ گریڈ میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اس وقت کے انچارج جناب پنڈت موہن لال شرما صاحب اپنے فرائض منصبی کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں ۔

●●

اس رپورٹ کی دوسری قسط مئی ۱۹۷۱ء کے شاہجہاں میں ملاحظہ فرمائیں۔

۔ ادارہ

مئی سنہ ۱۹۷۰ء

جلد ۴

شمارہ ۵

قیمت

فی پرچہ: پچیس پیسے

سالانہ: تین روپئے

شاہجہاں دہلی

طالب علموں کا — طالب علموں کے لئے — طالب علموں کے ذریعہ

مجلسِ ادارت

| | |
|---|---|
| محمد عتیق صدیقی | متعلم دلّی یونیورسٹی |
| نجمہ صدیقی | متعلم ،، ،، ،، |
| انیس الرحمٰن | متعلم دلّی کالج دہلی |
| محمد یوسف خان | متعلم دلّی یونیورسٹی دہلی |


# نوک و پلک

ارے! یہ کون ہیں ـــــ؟ داڑھی بڑھی ہوئی، سوجی ہوئی آنکھیں۔ پریشان بال۔ (جو ایک مدت سے کنگھے کے فراق کا شکوہ کر رہے ہیں۔) بے ترتیب لباس۔ ہاتھوں میں چند کتابیں۔ اور پاؤں میں پرانے چپل ڈالے ہوئے جا رہے ہیں ـــــ آپ یقیناً کہیں گے کہ ہو نہ ہو یہ یورپ کی بگڑی ہوئی نئی نسل (جس کو عرفِ عام میں ہپی کہتے ہیں) میں سے ہیں۔

لیکن یہ یورپ کے سرپھرے نوجوان نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوستان ہی کے نوجوان ہیں۔ ان کی یہ حالت امتحان کے قرب کے سبب ہے۔ یہ سال بھر عیش کرتے ہیں۔ کالج جاتے ہیں۔ لیکن کلاس سے ــ جیسے خدا واسطے کا بیر ہو۔ اور جب امتحان نزدیک آتا ہے تو کیا امپارٹنٹ ہے۔ "فلاں گیس پیپر میں کیا ہے"۔ اور کس کے نوٹس (NOTES) اچھے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ امتحان کا ایک ہوّا ان کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ اگر آپ طالب علم ہیں تو یقیناً آپ بھی اسی حال سے دوچار ہوں گے۔ اور امتحان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہوں گے۔ ہم آپکا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ اور اس تمنا کے ساتھ "کاش آپ شروع سال سے ہی تیاری کرتے"، اور اس خواہش کے ساتھ کہ "آئندہ آپ شروع ہی سے مصروفِ پڑھائی ہوں تاکہ امتحان کے زمانے میں لوگ آپ کو انسان ہی سمجھیں" ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ آپ کو کامیابی سے ہم آغوش کرے۔

ادارہ

زیرِ نظر شمارے میں شامل تمام افسانوں میں نام، مقام و واقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے جس کے لئے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں ہے۔


مشیرِ طباعت:۔ محمد شفیق صدیقی متعلم اینگلو عربک کالج دہلی

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر اور پروپرائٹر:۔ محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ:۔ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلّی ماران دہلی ۶

مقامِ اشاعت:۔ قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی نمبر ۶

## ادب ومعلومات



## تراجم



## طنز ومزاح



## افسانے



## منظومات



## تزئین

غضنفر زیدی ——— آرٹس انسٹی ٹیوٹ
اطہر پرویز ——— جامعہ نگر نئی دہلی

## مستقل عنوانات



## کتابت

محمد نور الحق ——— مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

**لکچرار ہیں** تو آپ سے مؤدبانہ درخواست ہے۔ کہ اپنے طلبہ سے مضامین لکھوا کر برائے اشاعت روانہ کرائیں۔ ہم ممنون ہوں گے۔

**طالب ہیں** تو کوئی مضمون (نصاب سے متعلق) ترجمہ (عربی، فارسی یا انگریزی سے کیا ہوا) یا افسانے اپنے لکچرار یا استاد سے تصحیح کرا کر ہمیں بھیج دیں۔ اپنے مسودے کے ساتھ نیچے چھپا کوپن ضرور منسلک کیجئے

**اردو، فارسی یا عربی کے سکریٹری ہیں** تو آپ سے گذارش ہے کہ اپنی سوسائٹی کی ماہانہ مختصراً رپورٹ (ادبی نشست، مشاعرہ، تحریری یا تقریری مقابلہ کا نتیجہ وغیرہ) اپنے لکچرار سے تصدیق کرا کے مہینے کے اختتام سے قبل ہم کو بھیج دیں۔ ہم اس کو شائع کریں گے۔

---

میں مضمون/افسانہ/غزل بعنوان ........................ بھیج رہا/رہی ہوں۔
اگر مناسب سمجھیں تو اس کو کسی قریبی اشاعت میں شامل کرکے ممنون فرمائیں۔ ورنہ واپس کرنے کی زحمت فرمائیں۔ واپسی کے لئے ٹکٹ ساتھ ہیں۔
نام ........................ کلاس و کالج/یونیورسٹی ........................
گھر کا پتہ ................................................

---

یہاں سے کاٹئے

از ۔ رحمٰن علی متعلم بی، اے، فائنل (راجستھان کالج جے پور)

# جدید اردو غزل کے عناصرِ اربعہ

## حسرت، فانی، اصغر اور جگر

اردو ادب کے تاریخی سفر میں جس صنفِ سخن کو سب سے زیادہ مقبولیت اور سب سے زیادہ انقلابات کا سامنا کرنا پڑا وہ غزل ہے۔ ایک دور تھا جب غزل گوئی کے بغیر کسی شاعر کے شعری کارناموں کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا جاتا تھا اور مکمل و خالص شاعر ہونے کی ضمانت غزل گوئی تھی۔ یہی وجہ ہے متقدمین میں ہمیں غزل دیگر اصنافِ سخن پر حاوی نظر آتی ہے۔ جب قصیدہ گہوارہ میں تھا مثنوی گھٹنوں کے بل چل رہی تھی اور مرثیہ کو انیس و دبیر کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی نظم کا عدم و وجود برابر تھا اس وقت صنفِ غزل ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کر چکی تھی۔

اردو غزل فارسی غزل کے زیرِ سایہ پرورش پاتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اس کا اپنا معیار بنتا چلا گیا اور شعراء اسے زلف و گیسو شانۂ تکرار سے سنوارتے رہے اور پھر متوسطین کے دور تک اس پر اتنا نکھار آ چکا تھا کہ وہ دوسری تمام اصنافِ سخن سے ممتاز تسلیم کر لی گئی یہ وہ دور تھا جب غزل اپنے قدیم روایتی حدود سے نکل کر حیات و کائنات کے سارے مسائل کو اپنے دامن میں سمیٹ کر حیات کی مختلف النوع رنگینیوں سے ہم آہنگ ہو گئی لیکن اس کے بعد اردو غزل ایک بار پھر انتہائی آزمائشی دور سے گذری یہ وہ دور تھا جب غزل کے دائرہ سے فلسفہ تصوف اور مسائلِ حیات کو خارج کر دیا گیا اور وہ ایک بار پھر محض روایتی غزل بن کر رہ گئی غزل۔ کہ اس رجحان نے نہ صرف عوام کو ہی متاثر کیا بلکہ بڑے بڑے متقی اور متقی قسم کے شعراء اپنے رنگ سے ہٹ کر اسی مقبولِ عام روش پر طبع آزمائی کرنے لگے تاکہ وہ عام مقبولیت حاصل کر سکیں یہ ایسا خطرناک رجحان تھا جس نے اردو غزل کی نہ صرف بنیادوں کو ہلا دیا بلکہ بلندی کے مینار سے پستی کے غار کی طرف پہنچا دیا اور صنفِ غزل زوال پذیر ہونے لگی اقلیمِ غزل گوئی میں داغ اور امیر اپنی غزل گوئی کا سکہ بڑی دھوم دھام سے چلا گئے لیکن اس کے بعد وہ رنگ جب دوسروں نے اختیار کیا تو یہیں سے غزل کا دورِ انحطاط شروع ہوتا ہے سنجیدہ لوگ اسی صنفِ سخن سے مایوس ہونے لگے اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ شاید یہ تھالی سلطنت کے بعد اردو غزل دم توڑ دے گی ادھر غدر کے بعد ملک کی سماجی سیاسی اور اقتصادی حالتیں جو زبردست تبدیلی آئی تھی اس سے ذہن و ادراک پراگندہ ہو چکے تھے زندگی کی پرانی اقدار پامال ہو رہی تھیں اور صالح ادب کی تخلیق کا اس زمانے میں تصور بھی ممکن نہیں تھا اردو غزل پر مولانا حالی مولانا محمد حسین آزاد اور ان کے معاصرین کی نئی تحریک نے بھی بے شمار تازیانے برسائے جدید اردو نیچرل شاعری کا نعرہ کچھ اس شدت سے بلند کیا گیا کہ غزل کی حیثیت کچھ حقیر نظر آنے لگی یہ دور اردو غزل کے لئے آزمائش کا دور تھا اردو غزل موت و زیست کے دوراہے پر کھڑی تھی اور کشمکش جاری تھی نیچرل اور جدید شاعری کا غلبہ کچھ اس حد تک بڑھ چکا تھا۔ کہ لوگ غزل گوئی سے دامن بچانا چاہتے تھے بلکہ دلوں میں غزل گوئی کے اٹھتے ہوئے طوفان کو محض اس لئے دبا دیا کرتے تھے کہ کچھ لوگ انہیں حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں ایسے پرآشوب دور میں غزل کہہ کر اردو غزل کو نئی زندگی دینا ایک جراَتِ رندانہ ہی کہی جا سکتی ہے۔

اردو غزل میں لطیف اشاروں اور کنایوں میں اظہارِ جذبات کا وہ موثر طریقہ موجود ہے جو دوسرے اصنافِ سخن کو بہت کم میسر ہے صنفِ غزل بڑی سخت جان واقع ہوئی ہے اس لئے

ص ۲۰

حالات کے تھپیڑے کھاتے رہنے کے باوجود بھی اب تک نہ صرف زندہ بلکہ اپنی عظمت بھی تسلیم کرا چکی ہے اس کی عظمت اس کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے جن شعراء نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ان میں مولانا حسرت موہانی، مولانا اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، اور جگر مرادآبادی کے نام بالخصوص قابلِ ذکر ہیں یہ حضرات اردو غزل کے ایوان میں ان ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر پورا محل قائم ہے اس لئے ہم ان چاروں حضرات کو جدید اردو غزل کے عناصرِ اربعہ بھی کہہ سکتے ہیں آیئے سب سے پہلے ہم مولانا حسرت موہانی کی شاعری کا مختصر سا جائزہ لیں۔

مولانا حسرت موہانی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اردو غزل کا ایسا زمانہ تھا جب لوگ اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اس کی دو وجوہات تھیں پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اردو شاعری میں دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول علیحدہ علیحدہ قائم ہو چکے تھے لکھنوی شاعری پر بالخصوص غزل پر لکھنؤ ماحول اور رئیسانہ شان و شوکت کا کافی اثر پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں ایسے مضامین کی بھرمار ہو گئی جو صرف عشقِ مجازی تک محدود تھے حسن و عشق کی واردات میں مبالغہ آرائی کا دخل اس حد تک ہوا کہ عشق میں خودداری کا کوسوں پتہ نہیں رہا اور وہ بیا نہ مندی اور خاکساری کی حد تک پہنچ گیا۔ حسرت نے عشق میں عاجزی اور انکساری کو شدت سے محسوس کیا انہیں عشق کا اس خاکساری میں احساسِ خودی مجروح ہوتا ہوا نظر آیا اور وہ غیر شعوری طور پر عشق خوداری کے حامی بن گئے۔ وہ اگر حسن کی تعریف کرتے بھی ہیں تو اس میں عشق کی خودداری پر آنچ نہیں آنے دیتے مولانا حسرت موہانی کے اس رنگ میں ان کی سیرت کا عکس پایا جاتا ہے وہ ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک سیاستداں بھی تھے اور انہوں نے حقائق کے اظہار میں کبھی مصلحتوں کو درمیان میں نہیں آنے دیا ان کے دل میں جو کچھ ہوتا تھا اسے زبان پر لانے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ یہی اصول ان کا شاعری میں بھی رہا وہ عام روش سے ہٹ کر جو کچھ کہتے ہیں اس میں نفسیاتی حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں مثال کے طور پر محبوب سے ملاقات غزل گو شعراء کے لئے ہمیشہ سکون و راحت کا باعث رہی ہے لیکن مولانا حسرت فرماتے ہیں ؎

بڑھ گئیں تم سے مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

اس شعر میں ایک ایسی نفسیاتی حقیقت کو اجاگر [کیا] ہے جس سے اردو شعراء دامن بچاتے آئے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی منشی امیر اللہ تسلیم کے شاگرد [تھے] اس طرح انہیں دہلی اسکول کی شاعرانہ روایات ورثے میں ملی[ں] مومن نے غزل میں جو بانکپن اور لطیف کنایات میں ا[پنے مد]عا کا طریقہ اپنایا تھا حسرت موہانی اس رنگ کے ا[مین] ثابت ہوئے۔ انہیں خود اس کا احساس تھا چنانچہ ایک جگہ ان[ہوں نے] اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

طرزِ مومن میں مرحبا حسرت
تری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

یہ حقیقت ہے کہ مولانا حسرت موہانی جدید اردو غز[ل] کی گرتی ہوئی اقدار کو سہارا نہ دیتے تو غزل ابتذال کی حد[و]ں کو چھو چکی ہوتی اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولانا حسر[ت] موہانی نے جو طرز اختیار کی وہ اس زمانے کے حالات سے بغ[اوت] تھی اور ان کی یہ باغیانہ روش ہی جدید اردو غزل [کے] لئے نہ صرف انقلاب آگیں بلکہ حیات آفریں ثابت ہو[ئی] مولانا حسرت موہانی کی طرزِ ادا میں شوخی اور لطافت کا ای[ک] حسین امتزاج ملتا ہے وہ غمِ دوراں اور غمِ جاناں دونو[ں] سے الگ رہتے ہیں وہ قلبِ حزیں کی واردات کو شعر کا جا[مہ] پہنا کر اس بے ساختگی سے پیش کرتے ہیں کہ بے اختیار دل سے واہ نکل جاتی ہے مثلاً ؎

شرم کر شرم اے جذبۂ تاثیرِ وفا
ترے ہاتھوں وہ پشیمانِ جفا ہوتے ہیں

مذکورہ بالا شعر میں حسرت موہانی نے گل ہائے احسا[س] کا جو خوبصورت گلدستہ پیش کیا ہے وہ نہ صرف حسین ہے بلکہ اس کا جذبہ بھی قابلِ قدر ہے وہ محبوب کے پشیمانِ جفا ہو[کر] پھر افسردہ ہوتے ہیں لیکن جذبۂ تاثیر وفا پر حرف نہیں آنے

دیتے ہیں صرف غیرت دلاتے ہیں اور یہی ان کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔

حسرت موہانی نے جدید اردو غزل کو وہ نیا انداز بخشا ہے جو ان سے پہلے صرف مومن ہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے لکھنؤ اسکول سے قطع تعلق کر کے دہلی اسکول سے وفا شعاری نہ کی بلکہ اپنے طرز میں خود ایک نئے اسکول کے بانی ثابت ہوئے۔ انہوں نے شاہراہ شعر و ادب پر جو نقش قدم چھوڑے وہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ان کے بعد کے بہت سے غزل گو شعراء نے ان راہوں پر گامزن ہو کر منزل مقصود کو پالیا۔

حسرت کی شاعری نے اردو غزل کو جدید رجحانات بخشے ان کو آگے بڑھانے کے لئے فانی بدایونی میدان عمل میں آئے۔ اردو غزل کی ارتقائی تاریخ میں غالب سے پہلے اور غالب کے بعد کی غزل میں جو نمایاں فرق پایا جاتا ہے وہ غالب ہی کا مرہون منت ہے۔ غالب نے اردو غزل کے محدود دائرہ کو جو وسعت بخشی تھی وہ رفتہ رفتہ پھر تنگ ہوتا جا رہا تھا اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اردو غزل ایسے دوراہے پر پہنچ گئی تھی جہاں ایک طرف ترقی پسند تحریک تھی اور دوسری طرف آزاد اور حالی کے نعرہ ہائے [illegible] کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی ایسے کشمکش کے دور میں فانی نے جدید اردو غزل میں ان قدیم روایات کو جدت [illegible] دیا جو غالب کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔

فانی بدایونی کے کلام کا اگر ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو ہمیں دو باتیں خاص طور سے محسوس ہوں گی پہلی بات یہ کہ انہوں نے تخیل میں بلندی کے ساتھ فلسفیانہ حقائق بھی اجاگر کئے ہیں اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فانی کو میر کا سوز اور غالب کا فلسفہ قدرت نے ایک ساتھ عطا فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غزل گو شعراء میں انفرادی حیثیت کے حامل ہو گئے۔

فانی کی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کی ایک طویل داستان ہے اس لئے ان کی شاعری میں ان کی شخصی زندگی کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کو ہر زاویہ سے دیکھتے ہیں لیکن وہ انہیں کبھی "ایک معمہ" اور کبھی "دیوانے کا خواب" نظر آتی ہے اور کبھی وہ زندگی کو مر مر کے جیئے جانے کا نام سمجھتے ہیں وہ جب اپنے محبوب سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کی کیفیت فدویانہ یا نیازمندانہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں مساویانہ شان ہوتی ہے۔ حالانکہ قدیم روایت یہ تھی کہ محبوب صرف ہنسنے کے لئے اور عاشق محض رونے کے لئے سمجھے جاتے تھے لیکن فانی نے جہاں خود آنسو بہائے ہیں وہاں اپنے محبوب کو بھی رونے پر مجبور کر دیا ہے۔

فانی نے جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر اور یاس و حسرت کا جہاں موازنہ کیا ہے وہاں ان کا فن اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے میر نے کہا تھا ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میر کے اس شعر میں سوز و گداز کی جو کیفیت ہے اس کا جواب نہیں لیکن کچھ ایسے ہی مفہوم کو فانی اپنے مخصوص ڈھنگ سے ادا کرتے ہیں تو اس میں بے پناہ شعریت کے ساتھ ساتھ ایک لطیف کسک اور ہلکی ہلکی خلش محسوس ہوتی ہے وہ کہتے ہیں ؎

آہستہ گذر صرصر غم وادی دل سے
برباد نہ کر خاک شہیدان تمنا

شعر میں صرصر غم سے جس نرمی سے خطاب کیا ہے۔ اس کا اندازہ خاک شہیدان تمنا سے ہوتا ہے۔

اس شعر میں سوز و گداز کے ساتھ تخیل کی ندرت اور طرز ادا کی [illegible] بھی دل کی گہرائیوں کو چھو لیتی ہے۔ فانی کے یہاں یاس و حرماں کا جو تصور ہے اس نے انہیں یاسیات کا امام بنا دیا ان کا یہ مخصوص رنگ اس دور میں بے پناہ مقبول ہوا اور بہت سے شعراء نے فانی کی تقلید کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

البتہ شاعری کا یہ رجحان اگر شدت اختیار کر جاتا تو خدا نہ جانے جدید اردو غزل کس مقام پر ہوتی قہقہہ تو دور کی

چیز ہے شاید تبسم زیرِ لب کو بھی ترس گئے، روتے اس موقع پر حضرت اصغر گونڈوی ایک نیا پیغام لے کر اِن نعروں شاعری میں وارد ہوئے اور انہوں نے دوری اور مجبوری کے احساسات کو غزل سے جدا کرنے کی بڑی مخلصانہ کوشش کی۔

اصغر کے رنگ کو ہم کسی قدیم شاعر کے رنگ سے مشابہت نہیں دے سکتے کیونکہ اس میں اس بلا کی انفرادیت ہے کہ وہ بجائے خود ایک اہم رنگ ہے۔ اصغر نے غزل کے ساز کو تصوف کا آہنگ بخشا یہاں وہ خواجہ میر درد سے قدرے نزدیک نظر آتے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحہ ان کے تصوف پر بھاری ان کے تخیل کی بلندی غالب آجاتی ہے۔ اصغر کی شاعری میں ایک خاص مقام کا ٹھہراؤ ہے وہ وصل و ہجر دونوں ہی کیفیات سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہ اشارات و کنایات سے زیادہ واضح الفاظ میں اپنی بات کہنا پسند کرتے ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں ؎

تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی مگر وہ ترا آستاں نہیں

اس شعر میں اصغر نے آستانۂ یار کی عظمت کا جس واضح الفاظ میں بیان کیا ہے وہ عشقِ حقیقی کا مظہر ہے لیکن مصرعۂ اولیٰ میں خانۂ کعبہ کی منزلت تسلیم کرکے پھر آستانۂ یار کا ذکر ان کی فنکارانہ چابکدستی کا ثبوت ہے۔ حضرتِ اصغر کی شاعری میں حسرت کی ولولہ انگیزی ہے اور فانی کی یاس خیزی و آلامِ ہجر میں بھی کیف و سرور کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان تخیلات میں محرومی کے بجائے ایک قسم کی سرخوشی محسوس ہوتی ہے فرماتے ہیں ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

اس شعر میں محرومی کے ہوتے ہوئے بھی جس کیف کا اظہار کیا ہے وہ لاجواب ہے کیونکہ دامنِ محبوب کا ہاتھ میں آنا عاشق کے ساری خدائی پر قابض ہونے سے کم نہیں ہوتا چنانچہ مجھے یہاں ایک اور شاعر کا شعر یاد آرہا ہے ؎

مرے ہاتھوں میں ان کا دامن ہے
میرے قبضے میں اب خدائی ہے

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ عاشق کے ہاتھ میں جب دامنِ محبوب ہوتا ہے اس وقت وہ ساری خدائی پر اپنا قبضہ سمجھتا ہے اب اندازہ لگایئے جب ایک بار دامن ہاتھ میں آنے پر عاشق کے احساسات اس درجہ بلند ہوتے ہیں تو سو بار دامن ہاتھ میں آنے کے بعد کیف و سرور کا کیا عالم ہوگا لیکن حضرتِ اصغر نے کیف و سرور کو انتہائی بلندیوں پر پہنچا دینے کے بعد مصرعۂ ثانی میں یہ کہہ کر کہ "جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے" ایسی انگیز کیفیت پیدا کر دی ہے کہ باوجود ضبط کے دل سے آہ نکلتی ہے گویا وہ کیف و سرور کا عالم محض "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" کی مثال بن کر رہ جاتا ہے۔

اصغر کے کلام میں سادگی کے ساتھ جو پرکاری ہے اور بات کہنے کا جو ڈھنگ ہے وہ بڑا دلکش ہے۔ انہیں اجتماعی زندگی کی افادیت سے پوری واقفیت تھی اور انہوں نے اس کا اظہار جابجا اپنے اشعار میں فرمایا ہے فرماتے ہیں ؎

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

اس شعر میں جہاں اجتماعی زندگی کی افادیت کا اعادہ کیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ زمان و مکان کی کوئی قید نہیں اگر انسان میں جرأتِ رندانہ ہے تو وہ جہاں بیٹھ کر پی لے وہی میخانہ بن جائے۔

اصغر کی خود اعتمادی ان کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے اور کہیں کہیں تو ان کی یہ خود اعتمادی تخیلات کی ان بلندیوں کو چھو لیتی ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا انہیں آستانۂ یار سے زیادہ اپنی سجدہ ریزیوں پر ناز ہے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

اصغر کا یہی انداز انہیں جدید اردو غزل میں ایک ممتاز مقام دلانے کا باعث ہے بلکہ ان کے اس انداز نے جدید اردو غزل کو وسعت خیال اور ندرت بخشی۔

اصغر کے بعد جدید اردو غزل پر جس شخصیت نے سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے وہ ہیں حضرت جگر مراد آبادی۔ جگر اصغر سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے لیکن ان کی یہ عقیدت ان کی شخصیت تک محدود تھی ان کی شاعری پر اس کا اثر نہیں ہوا حالانکہ جگر صاحب ارادی طور پر اصغر کی طرف بڑھے لیکن وہ غیرارادی طور پر حسرت موہانی سے جا ملے۔

جگر کی شاعری ہے جذباتی شاعری وہ رندی اور بیہوشی میں بھی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ جن پر ہوش والے بھی رشک کرتے رہ جائیں۔ اس کے بعد جب وہ عالم ہوش میں کچھ کہتے ہیں تو اس میں حادثاتِ زمانہ کی عکاسی ہوتی ہے وہ زندگی کے حقائق اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ زندگی سے نفرت کے بجائے اس پر پیار آنے لگتا ہے۔ وہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کے قائل ہیں لیکن دونوں میں امتیاز نہیں برتتے وہ دونوں کو ایک دوسرے کے متوازی رکھتے ہیں چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے ؎

اللہ رے بے بسی کہ غمِ روزگار بھی
بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے

غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا یہ توازن اس بات کا غماز ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے گہرے نفسیاتی معاملہ کا نچوڑ ہے۔ انہوں نے جدید اردو غزل کو ایک ایسا رنگِ تغزل عطا کیا ہے جس میں حسرت، مومن، غالب اور کچھ داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔

یوں تو ہر شاعر اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہوتا ہے لیکن ایک غزل گو شاعر جو حسن و عشق کے تانے بانے سے اشعار کا ہیولا تیار کرتا ہے وہ عام طور پر حادثاتِ زمانہ سے بے نیاز ہی رہتا ہے بلکہ اگر کوئی شدید واقعہ رنگِ تغزل کی راہ میں آ بھی جائے تو وہ اس سے نظر بچا کر نکل جانے ہی میں عافیت سمجھتا ہے غالباً جدید دور میں واقعاتِ عالم اور انقلاباتِ زمانہ سے جتنا تاثر جگر نے لیا ہے اتنا شاید کسی دوسرے غزل گو شاعر نے نہیں لیا وہ جب آنسو بہاتے ہیں تو ان کے آنسو آنسو نہیں ہوتے لہو کی بوندیں ہوتی ہیں اور جب وہ جراحتِ دل سے مجبور ہوتے ہیں تو پھر زمین و آسماں کو ہلا ڈالتے ہیں ان کے ساتھ ہی ان کی گلشن پرستی کا یہ عالم ہے کہ وہ کانٹوں سے بھی نباہ کرنا جزو ایمان سمجھتے ہیں لیکن تاراجیٔ گلشن پر اشک فشانی کے سوا ان کے پاس بھی کوئی چارہ کار نہیں۔

جگر کے یہاں جدید اور قدیم رنگ کی آمیزش کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے کس درجہ جگر کاوی کے ساتھ ان روایات کا تحفظ کیا ہے جو غزل اور صرف غزل کے لئے مخصوص ہیں۔ حسرت کو جتنا لطف خیالِ وصلِ یار سے آتا ہے جگر اس سے بھی زیادہ خیالِ ہجرِ یار میں محسوس کرتے ہیں ان کے شعور کی پختگی اور جذبات کا عالم ان کے تخیلات کو وہ رفعت بخشتا ہے جہاں شعر سے تکلف، تصنع، اور بناوٹ ختم ہو جاتی ہے۔

یہی جگر کی شاعری کا اہم پہلو ہے وہ خود اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

تکلف سے، تصنع سے بری ہے اپنی شاعری
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی

جگر نے جس خلوص سے اپنی شاعری اور اپنی زندگی کی عکاسی کی ہے وہ ناقابلِ تردید ہے تقسیم وطن کے بعد ملک میں جو انقلابات آئے جگر کے ذہن و ادراک نے انہیں شدت سے محسوس کیا اور انقلابات کی تباہ کاریوں کے تخیل سے وہ دامنِ شاعری نہ بچا سکے انہوں نے گل و بلبل و صیاد و نشیمن کی زبان میں بہت سی ایسی باتیں کہدی ہیں کہ جو تیر و نشتر سے کم نہیں ہیں وہ سازِ حیات کی شکستگی صرف محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ اس کا مداوا بھی تلاش کرتے ہیں وہ اپنے طور پر بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں اور غزل کے محدود دائرہ میں بہت کچھ کہہ گذرتے ہیں حالانکہ وہ رومانی شاعر ہیں ان کی طبیعت رومان پرور ہیں اس کے باوجود وہ سیاست کی گتھیوں کو ناخنِ تدبیر سے شعر و

شاعری کی زبان میں سلجھانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں لیکن زندگی کے پیغام سے غافل نہیں ہوتے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جدید اردو غزل کو آج ہم جس مقام پر دیکھ رہے ہیں اس کو یہ مقام دلانے والے حسرت، فانی، اصغر اور جگر ہیں۔ ان حضرات کے بعد فراق، فیض، جذبی اور مجاز نے اردو غزل کی ان روایات کو نبھایا لیکن حسرت، فانی، اصغر اور جگر کا جو مقام ہے وہ ان حضرات سے ممتاز اور بلند تر ہے۔ ان کی بیش بہا خدمات، جولانیٔ طبع اور ندرتِ تخیل کی بنا پر ہم انہیں جدید اردو غزل کے معمار سے تعبیر کر سکتے ہیں ایسے معمار جنہوں نے اس کی بنیادوں کو مستحکم بنانے کے لئے اپنے دل کا لہو نچوڑ کر گلستانِ سخن کو سینچا۔

●●

## بیان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات ماہنامہ شاہجہاں دہلی

### فارم نمبر ۴

(۱) مقام اشاعت ۔ قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی

(۲) وقفہ اشاعت ۔ ماہانہ

(۳) طابع
(۴) ناشر — محمد عتیق صدیقی
(۵) مدیر — قومیت ہندوستانی
(۶) مالک

پتہ ۱۴۸۸ قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی

میں محمد عتیق صدیقی اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم کے مطابق صداقت پر مبنی ہیں ۔

محمد عتیق صدیقی
ناشر

---

بقیہ امیر خسرو

میں اکثر عاشقانہ مضامین ہیں جن میں آرزوئے دیدار، ہجرانِ یار، نرگسِ بیمار، سوزشِ شمع دار، یار کرشمہ، ناز و نازِ کمند، انداز سیلِ اشک، خدنگِ نرگسِ مست، ابروئے چوگان اور کبکِ خوش خرام کے موضوعات ملیں گے اگر کہیں زہدا، خرقہ پوشان اور دیر در دنوشان سے مقابلہ کیا تو کہیں چشمِ زیبا اور اس کے احوال و اشکالِ فردار کی خوب داد دی امیر خسرو نے حکیم نظامی کی نقل میں پانچ مثنویاں بھی لکھی ہیں (۱) مطلع الانوار (۲) شیریں خسرو (۳) مجنوں لیلیٰ (۴) آئینہ سکندری (۵) ہشت بہشت ان کے علاوہ قران السعدین، نہ سپہر، مفتاح الفتوح اور خزائن الفتوح بھی انہیں کی کاوش کا نتیجہ ہے امیر خسرو کے اشعار کو از جمع کیا جا رہا ہے، اور آج کل خسرو اکیڈیمی اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے رہی ہے اس سلسلہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر مرزا صاحب بڑی جانفشانی سے کام لے رہے ہیں ان کی فارسی غزلیات سے لطف اندوزی کے لئے صرف دو تین اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا — تنم از بیدلی بیچارہ شد بیچارہ تر بادا
گر اے زاہد دعائے خیر میگوئی مرا این گو — کہ آن آوارہ کوئے بتان آوارہ تر بادا

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد — سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد
منم آہوئے رمیدہ ز خدنگِ غمزہ بیان — بہوسِ ہمیرم ار تو بشکار خواہی آمد

چہ بلاست اندو چشمت نظر نیاز کردن — مژہ را کشادہ دن در فتنہ باز کردن
صفِ عاشقانت اینجا وہلے نقیبِ زحمت
کہ بشہر بت پرستان نتوان نماز کردن

فی الجملہ امیر خسرو کو ہندوستان کا سب سے بڑا ایرانی اور ہندی کا شاعر کہا جا سکتا ہے ان کا امتیازی وصف کلام کی روانی اور چاشنی ہے نظم و سخن میں سرعتِ خیال اور جودتِ طبع کے حامل تھے خمسہ کے اشعار میں ایک اور کیف مخصوص لطافت ہے وہ بعض الفاظ اور تراکیب کے استعمال میں شاعرِ دریں سے دور ہو گئے ہیں اور ہندوستانی رنگ غالب ہے اور کیوں ہو ان کو ہندوستان اور ہندوستان کی ہر چیز سے والہانہ محبت تھی اگر اس محبت کا اندازہ کرنا ہو تو ان کی مثنوی نہ سپہر پڑھیے لیکن سرکار راز دلے آسمانِ صوفیاں کا یہ درخشاں ستارہ شاہانِ وقت، خواص و عام کا قبلہ اور طوطیٔ شکر مقال گلزارِ ادب میں چھپا کر ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں بمقام دہلی دیارِ آخرت میں جا پہونچا گو آج امیر خسرو ہمارے درمیان نہیں ہے لیکن یاد تازہ کرانے کے لئے اب بھی بستی نظام الدین موجود ہے جہاں ہر سال ہزاروں عاشقان سلطان الشعراء کی مرقد پر بیٹھ کر فاتحہ خوانی کا شرف حاصل کرتے ہیں ۔

●●

# DCM make the most sat-upon furnishings in India !
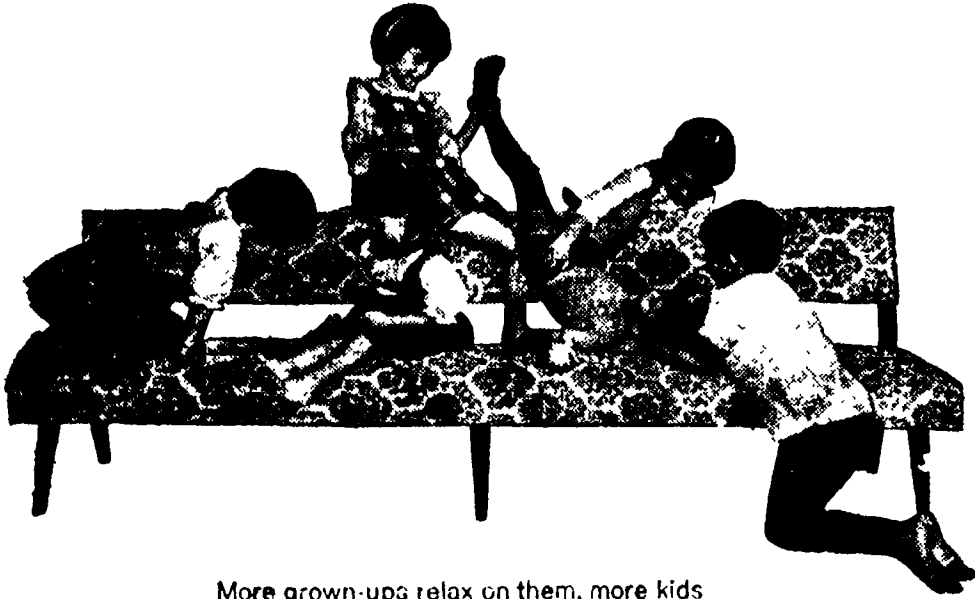
More grown-ups relax on them, more kids bounce on them, more cats curl up on them...in fact, more people insist on DCM Furnishings than any others. The reasons are not plain!

DCM Furnishings offer home-makers the most brilliant, buoyant range of Jacquard and Dobby patterned upholstery and printed and dyed curtaining materials at the most accommodating prices. You should see them today. You'll be sitting on them tomorrow!

DCM always have something special in store for you

# آنسو

فیروزہ ناظری ــــ طالبہ دہلی کالج دہلی

نرسنگ ہوم کے گھنٹے نے رات کے دو بجائے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے نرسنگ ہوم کا سکوت منقطع ہوگیا اور چند لمحوں بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ کبھی کبھی بیڈ سے کسی مریض کے کراہنے کی آواز رات کی ہولناکی میں اضافہ کردیتی تھی۔

بیڈ نمبر پانچ کی مریضہ آج بہت بے چین تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کو کسی طرح قرار نہیں تھا۔ رہ رہ کر وہ انجانے سے خوف سے کانپ جاتی۔

"یا خدا! کیا تو میرا امتحان لینا چاہتا ہے۔ میرے اللہ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں آنے والے کسی بھی حادثے کا سامنا کرسکوں۔"

اور جب اسے لیٹنا مشکل معلوم ہونے لگا تو بستر چھوڑ کر اُٹھ گئی۔ نرس نے جب اُسے اس طرح بے چین دیکھا تو وہ قریب آکر بولی۔

"کیوں عصمیٰ کیا بات ہے، تم ابھی تک سوئی نہیں؟"

عصمیٰ ایک دم گھبرا گئی۔ وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں سسٹر...... پانی...... چاہئے...... بڑی پیاس لگی ہے"

"تم بیڈ پر جاؤ میں ابھی پانی لے کر آتی ہوں"

نرس پانی لے کر عصمیٰ کے پاس آئی اور اسے پانی پلا کر بولی۔

عصمیٰ! تم اب سو جاؤ، صبح بہت سویرے تمھیں آپریشن کے لئے تیار ہونا ہے"

کچھ دیر کے لئے جو خیالات منتشر ہوئے تھے وہ پھر پریشان کرنے کے لئے اس پر مسلط ہونے لگے۔ وہ نرس کی طرف دردمند نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور کچھ آنسوؤں کے قطرے اُس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر بہہ نکلے۔

"کیا بات ہے عصمیٰ؟ تم اس قدر کیوں گھبرا رہی ہو؟ تم تو بڑی باہمت لڑکی ہو۔ آخر ہر روز ہزاروں آپریشن ہوتے ہیں۔ یہاں پھر ڈاکٹر کمال تو بہترین اسپیشلسٹ ہیں۔ انھوں نے ایک ہفتے میں جتنے بھی آپریشن کئے ہیں، سب کامیاب ہوئے ہیں۔ تم بھی خدا نے چاہا تو کامیابی کا منہ دیکھو گی۔!!...... اور"

عصمیٰ نے نرس کے منہ پر اپنے برف جیسے ہاتھ رکھ دیئے۔ اور ٹھنڈی دردبھری سانس بھر کر بولی۔

"نہیں، یہ میرے نصیب میں نہیں"

وہ اپنے ماضی کی حسین وادیوں میں کھو گئی۔

وہ ڈاکٹر کمال کو نرس سے زیادہ جانتی تھی۔ جب وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ عصمیٰ فرسٹ ایر میں تھی اور کمال پری میڈیکل میں۔ حالانکہ مضامین میں ذرا یکسانیت نہ تھی مگر نہ معلوم کون سی خوبی ایسی تھی کہ کمال اس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ جب اس کو عصمیٰ کہیں نظر آجاتی وہ اُسے مزید روکنے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھانے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ کمال کے وجود سے بے حد گھبراتی تھی۔ اپنی سہیلیوں میں حسین فقرے چست کرنے والی عصمیٰ کمال کے سامنے بھیگی بلی نظر آتی...... اور آہستہ آہستہ کمال نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اب وہ اس سے گھبراتی نہیں تھی۔ ........

آخر ایک دن کمال نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ مگر وہ مطمئن تھی۔ کیونکہ کمال نے اُسے بتا دیا تھا کہ "عصمیٰ تم گھبرانا نہیں میں بہت جلد اپنی تعلیم یہاں سے مکمل کرلوں گا۔ اور پھر کنیڈا جاؤں گا۔ مگر تب بھی تم میرے ساتھ ہوگی" ...........

اور عصمیٰ یہ بات سُن کر شرما گئی تھی۔

دن گذرتے رہے۔ وہ اکثر ملتے رہتے۔ اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتے۔ عصمیٰ نے بی۔ اے پاس کر لیا تھا وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر کچھ مجبوریوں کی وجہ سے نہ آگے نہ بڑھ سکی۔ ادھر کچھ عرصے سے کمال اسے کم ہی نظر آتا تھا۔ عصمیٰ یہ سوچ کر اپنے دل کو بہلا لیتی تھی کہ یہ کمال کے پڑھنے کے دن ہیں۔ وہ کیسے روز مجھ سے مل سکتے ہیں؟ .......

اور اب تو کئی ماہ گذر گئے۔ کمال سے اس کی ملاقات تک

نہ ہوئی تھی۔ ادھر گھر کے لوگ اس کی شادی کے لئے پریشان تھے۔ مگر عصمی کو اس ذکر سے بھی جیسے چڑ تھی۔ اور اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ فی الحال ہرگز شادی نہ کریگی۔ اور یہ بات کہتے ہوئے اس کا دل ایک انجانے سے خوف سے بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔

اس روز وہ اپنے حواس کھو بیٹھی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کمال کنیڈا چلے گئے۔ وہ کسی طرح یقین کرنے کو تیار نہ ہوتی تھی۔ مگر حقیقت کون بدل سکتا ہے۔ ........ یا اللہ !!.... کمال کو کیا ہوگیا ........ وہ اس سے کیا کہا کرتے تھے۔ یا وہ جاتے ہوئے بل کر بھی نہیں گئے۔ اس خبر نے اس کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا تھا۔ گھر کے سب لوگ اس کی حالت سے پریشان تھے۔ وہ ہر وقت بجھی بجھی رہتی۔ ہر بات پر کھلکھلا کر ہنسنے والی عصمی اب ہر بات پر رو دیا کرتی تھی۔ اس کی حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ اور کئی سال اسی طرح گذر گئے۔

ایک روز زیادہ حالت خراب ہونے پر اُسے نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا گیا۔ آپریشن سے ایک روز پہلے اُسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کمال اسی نرسنگ ہوم میں واپس آگئے ہیں۔........ اور شام اُسے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کمال ہی اُس کا آپریشن کریں گے۔ تبھی سے وہ بے چین تھی ....

صبح ہوئی اور اُس کو آپریشن کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ اور پھر اُسے بے ہوش کر دیا گیا ........ اُس کا آپریشن کامیاب ہوگیا تھا۔

مکمل چوبیس گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد اُس نے آنکھ کھولی ........ تو اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وہ ڈاکٹر کمال کو سامنے دیکھنے کی تاب نہ لاکر پھر بے ہوش ہو چکی تھی۔ کوئی دو گھنٹے بعد پھر اُس کو ہوش آیا۔ تو کمال کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا..... اُس نے اٹھنا چاہا۔ مگر وہ اُٹھ نہ سکی۔ لاچار ہو کر اُس نے منہ پھیر لیا۔ کمرے میں ڈاکٹر کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ ......

ڈاکٹر نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے التجا کی۔ کہ وہ اس کی طرف منہ کرے ........ نہ چاہتے ہوئے بھی عصمی نے ڈاکٹر کی طرف منہ کیا۔ اور خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

عصمی !..... پیاری عصمی ......! میں تمہارا گناہگار ہوں مجھے جو چاہے سزا دے لینا۔ مگر خدا کے لئے تم ٹھیک ہو جاؤ۔ میں تمہیں سب کچھ بتاؤنگا۔ مگر ابھی نہیں پہلے تم ٹھیک ہو جاؤ۔

تین روز بعد ڈاکٹر نے عصمی سے کہا۔

"عصمی مجھے بہت بڑی غلط فہمی ہوگئی تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کا نتیجہ زیادہ بھیانک شکل میں نکلنے سے پہلے سب بات کھل گئی"

میں جب میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا تو میری کلاس کی ایک لڑکی بُری طرح میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اس کی طرف میں کبھی دھیان نہ دیتا۔ میں نے اُسے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ اپنی شکست برداشت نہ کر سکی۔ اس کی ایک سہیلی نے جو شاید تمہارے ساتھ پڑھتی تھی، مجھے بتایا کہ تمہاری شادی کلکتہ میں ہوگئی۔ اور مجھے یقین آگیا۔ پھر میرے لئے یہاں ٹھہرنا موت کے برابر ہوگیا تھا۔ اور میں امتحانات پاس کرنے کے کچھ ہی روز بعد کنیڈا کے لئے روانہ ہوگیا۔ اور جب جہاز نے الوداعی سلام کا سگنل دیا تو مجھے تم سے کی ہوئی تمام باتیں یاد آگئیں۔ اور میں ضبط نہ کر سکا تھا۔ اور آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا ..........

ابھی پچھلے ہفتے ہی میں اس اسپتال میں آیا ہوں ..... آپریشن بیڈ پر تمہیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں کہ اچانک میری نظر تمہاری ریکارڈ فائل پر پڑی، وہاں مس عصمی لکھا دیکھ کر تو بس کچھ نہ پوچھو، مجھ پر کیا گذری اور تبھی سب بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے آپریشن کیا اور خدا کے فضل سے وہ کامیاب رہا۔ یقین کرو عصمی تمہاری بے ہوشی کے دوران میں نے تمہارے متعلق سب معلومات حاصل کر لیں۔ اور ساری رات خدا کے آگے سجدے میں گر کر تم کو اپنے معبود سے مانگ لیا ہے۔ اب بولو عصمی! تمہارا دل مجھ سے بدظن تو نہیں ..... تم نے

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

شاہجہاں دہلی

# ....رسوا کیا مجھے

## پسندیدہ اشعار

•

تجھے بھول جانا تو ہے غیر ممکن
مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

•

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

•

یہ ظالم ہی کیا کم ہے تم پاس نہیں میرے
کیا یہ بھی ستم ہوگا تم بھول بھی جاؤ گے

•

تعلیم سے بیگانہ ہو جس قوم کی لڑکی
دشوار بقا اس کی ہے آسان فنا ہے

•

بھول جاتا شاید سکوں ہو بھول جانے میں
کہ حاصل کچھ نہیں یاد کرنے یاد آنے میں

•

دل اے سیماب خالی آرزو سے ممکن تھا
نہ ہوتی آرزو تو آرزو کی آرزو ہوتی

•

فقیر شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیر شہر کے ارمان ابھی کہاں نکلے

•

دنیا میں کوئی جان سے پیارا نہیں ہوتا
کچھ لوگ مگر جان سے پیارے بھی ملے ہیں

•

میرے کلام سے بہتر ہے میری خاموشی
نہ جانے کتنے سوالوں کی آبرو رکھ لی

•

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے زندگی کی کس گلی میں شام ہو جائے

•

عمر کٹتی ہے جب خاموشی میں
تب کہیں ایک بات کہتا ہوں

•

بھلا بیٹھے ہو ہم کو آج لیکن یہ سمجھ لینا
بہت پچھتاؤ گے جس وقت ہم کل یاد آئیں گے

•

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تمہیں یاد کیا

•

اس ایک لمحہ پہ قربان ہزار بیداری
ترے خیال میں جو کچھ خیال گزرا ہے۔

مس عابدہ رشید
امینیہ مسلم گرلز ہائی اسکول دہلی

جب تجھے یاد کرلیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

آسماں کی فکر کیا آسماں خفا سہی
آپ یہ بتائیے آپ تو خفا نہیں؟

چُپ ہو گیا ہوں آپ کی صورت کو دیکھ کر
کرنی تھیں آپ سے مجھے کتنی شکایتیں

آؤ کچھ دیر غم کی کہانی کہہ لیں
پھر خدا جانے ملاقات کبھی ہو کہ نہ ہو

آئی جو تیری یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

مل لی ہے چاندنی نے تمہارے قدم کی خاک
پھولوں میں تک گیا ہے تمہارے بدن کا رنگ

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے۔

**راشدہ قریشی**
گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول
بلبلی خانہ دہلی۔

کسی کو کیا ہو شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹتے ہیں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

چوٹ لگی ہے دل پر جب آہ لبوں پر آتی ہے
یوں ہی چھن سے بول اٹھنا شیشے کا دستور نہیں

نہ جانے کب سے یوں ہی دل شکستہ بیٹھی ہوں
اداس چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لئے۔

دل کے شکستہ ساز سے نغمے ابل پڑے
پوچھا کسی نے حال تو آنسو نکل پڑے

نہ مجھ میں تاب گویائی نہ مجھ میں ضبط کا یارا
یہ کس نے شیشہ دل کو سرِ بے ہنر پہ دے مارا

**شاہدہ ادریس**
**دہلی**

---

## گزارش!
اشاعت کیلئے اشعار ارسال کرنے سے قبل اس بات کا یقین کر لیں کہ:
اشعار صحیح ہیں۔
**ادارہ**

---

# وہ کون تھا......؟

# بھوت یا انسان

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، جس کو اس کے غیر معمولی طور پر سنسنی خیز ہونے کے سبب اُس وقت کے اخباروں نے اپنے پہلے صفحے پر شائع کیا تھا۔ اس واقعے کے ظہور نے ۱۸۹۱ء میں پیرس میں لارڈ ڈفرن کی جان بچائی —— لارڈ ڈفرن ان دنوں وہاں برطانوی سفیر کے عہدے پر مامور تھے۔ اس سے قبل وہ ہندوستان میں وائسرائے، کینیڈا میں گورنر جنرل اور روم میں برطانیہ کے لئے سفارت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔


عتیق صدیقی

دلی یونیورسٹی دلی


—— لارڈ ڈفرن کو ان کے ایک پرانے دوست نے آئرلینڈ آنے کی دعوت دی، جس کو انھوں نے فوراً قبول کر لیا۔

وہ ایک چاندنی رات تھی۔ چاند اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آسمان کی زینت بنا ہوا تھا۔ اور زمین پر موجود ہر چیز چاندنی کا غسل لے رہی تھی۔ خاموشی اور سکوت کا دور دورہ تھا۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ لارڈ ڈفرن رات کے کھانے کے بعد اپنے دوست سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ نیند کی زیادتی کی وجہ سے انھوں نے اپنے دوست سے اجازت چاہی۔ اور اپنے کمرے میں سونے کے لئے آ گئے۔ ان کی آنکھیں نیند کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں۔ نیند کے غلبے کے باوجود انھوں نے کپڑے بدلے۔ اور بستر پر دراز ہو گئے۔ اور جلد ہی نیند نے اپنے آغوش میں سمیٹ لیا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد بغیر کسی وجہ کے ان کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کا ماحول عجب طور سے بدل چکا تھا۔ جیسے ایک دم کایا پلٹ ہو گئی ہو۔ لارڈ ڈفرن نے اپنے اردگرد شیطانی سایوں کو گھومتا ہوا محسوس کیا۔ چاند کی روشنی پُر اسرار انداز

میں کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور درختوں اور کھڑکیوں کے
پردوں کے سائے ایک ڈراؤنا اور خوفناک منظر پیدا کر رہے
تھے۔ اس ماحول سے گھبرا کر ڈفرن نے لیمپ روشن کیا۔ لیمپ
کی روشنی سے سایوں سے پیچھا چھوٹا۔ مگر کمرے میں ہیبت
بدستور باقی رہی۔ لارڈ ڈفرن نے جاننے کے لئے کہ حقیقت
ہے یا خواب اپنا ہاتھ لیمپ پر رکھ دیا۔ مگر گرمی کی تکلیف سے
فوراً ہٹا لیا۔ وہ مکمل طور پر ہوش میں تھے۔ اور وہ سب بھی
حقیقت تھا۔ مگر پھر بھی وہ ان سایوں کو پہچاننے سے قاصر تھے۔
"اوہ ٹھیک ہے" آئرلینڈ میں قدیم عمارتیں
اسی طرح بھوت یا ناپاک روحوں کا مسکن ہوتی ہیں۔ ہوسکتا ہے۔
یہاں بھی آج کی رات کوئی روح یا بھوت گھوم رہا ہو"
لارڈ ڈفرن بھوت پریت پر قطعاً یقین نہیں رکھتے تھے۔
کیونکہ وہ اس مکتبِ خیال کے حامل تھے کہ بھوت پریت پر یقین
ایک جھوٹا عقیدہ ہے۔ اور یہ انسان کی عملی زندگی میں کوئی وقعت
نہیں رکھتا۔

کمرے کی تمام کھڑکیاں کھلی تھیں۔ مختلف آوازیں ان
کی سماعت کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ "یہ آوازیں کاہے کی ہیں؟"
انھوں نے سوچا۔ "اتنی رات گئے کوئی پرندہ کیوں محوِ پرواز
ہے؟" "ارے ہاں یہاں تو جھینگر بھی ہیں" وہ بڑبڑائے۔
"یہ آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز کس کی ہے؟"........ یہ ہوا
کے چلنے کی آواز نہیں ہوسکتی —— یہ باہر درختوں کے پتوں
کی آواز بھی نہیں ہوسکتی...... تو —— تو —— پھر یہ
کس کی آواز ہے...... یہ کون نامراد روح ہے...... جو
مجھ کو پریشان کر رہی ہے......" وہ بڑبڑاتے ہوئے
پلنگ پر پھر دراز ہوگئے۔ مگر آواز برابر آرہی تھی۔ اب انھوں نے
آواز پر غور کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کسی انسان کے کراہنے
کی آواز ہے۔ "شاید کوئی آدمی زخمی ہے" یہ سوچ کر وہ فوراً
کھڑکی کے پاس گئے۔

وہ فرانسیسی طرز کی بنی ہوئی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔
جو صحن میں کھلتی تھیں۔ اور سامنے لان اونچے اونچے اور گھنے
درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آواز سامنے چاندنی
میں ڈوبے درختوں کے طویل اور گھنے سایوں کی تاریکی
سے آرہی ہے۔

لارڈ ڈفرن کھڑکی میں کھڑے اسی تاریکی میں اپنی
نگاہوں سے اُس آواز کا تعاقب کر رہے تھے۔ کہ سامنے
اچانک کچھ حرکت ہوئی —— کراہنے کی آواز جاری تھی۔
—— ایک انسانی سایہ تاریکی میں سے چاند کی روشنی
میں اُبھرا —— یہ ایک آدمی تھا جو اپنے کاندھوں پر
بوجھ لئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا —— بوجھ ایک صندوق
نما تھا۔ جس نے آدمی کے چہرے کو چھپا رکھا تھا —— اب وہ
آدمی مکمل طور پر روشنی میں آگیا تھا —— ڈفرن کو پہچانتے
دیر نہ لگی کہ وہ صندوق (تابوت) "کافن" (صندوق جس
میں عیسائی مردہ رکھ کر دفن کرتے ہیں) ہے۔

"کیا یہ آدمی کسی لاش کو لئے جا رہا ہے؟" ڈفرن نے
سوچا اور پھر فوراً اس آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"اے، سنو! یہ کیا لے جا رہے ہو؟"
آواز سن کر آدمی نے بوجھ کے نیچے سے اپنا سر نکالا اور
ڈفرن کی جانب دیکھا —— لارڈ ڈفرن اس کی جھرّیوں
اور زخموں کے نشانات سے بھرپور خوفناک اور مکروہ چہرہ
دیکھ کر ڈر اور خوف سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے ——
اُن کے دل و دماغ ماؤف ہوگئے —— وہ یہ نہ سمجھ سکے
کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ انسان یا بھوت....؟ کچھ لمحے
بعد انھوں نے اپنے اوپر قابو پایا۔ اور اس شخص سے پوچھا
"تم اس کو کہاں لئے جا رہے ہو؟"
اور پھر جیسے ہی وہ اس آدمی کو روکنے کے لئے اس کے
پاس پہنچے وہ ان کی نظروں سے غائب ہوگیا۔ ڈفرن نے
اس کے جانے کی طرف چلنے کا قصد کیا۔ مگر وہاں اوس
سے گیلی گھاس پر بھی اس کے قدموں کے نشان قطعاً نہیں
تھے —— وہاں صرف چمکتی چاندنی اور ... کا
شور تھا۔

خوف اور ڈر کی وجہ سے ڈفر...
مگر اس وقت انھوں نے اس

مناسب نہیں سمجھا۔ اور واپس کمرے میں آگئے۔ اور اس عجیب و غریب حادثہ کی تفصیل اپنی ڈائری میں درج کی۔

اگلے دن صبح ناشتہ کے بعد انھوں نے اپنے میزبان دوست سے پوچھ گچھ کی۔ اور یہ جان پائے کہ حال میں اس گاؤں میں کوئی موت واقع نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی کوئی تدفین عمل میں آئی ہے۔ اور یہ بھی کہ اس شکل کا آدمی اس گاؤں میں کوئی نہیں رہتا۔ جیسا کہ انھوں نے رات کو دیکھا تھا۔ ——— اس طرح ایک راز نے جنم لیا۔ اور اگر اس حادثہ کا انجام ظہور پذیر نہ ہوتا تو یقیناً یہ بھی ان لاکھوں حادثوں کی طرح ختم ہو جاتا جو کہ اب صرف ایک روایتی کہانی بن کر رہ گئے ہیں۔

چند سال بعد لارڈ ڈفرن پیرس میں سفیر مقرر ہوئے۔ ایک مرتبہ وہ گرینڈ ہوٹل میں ایک سفارتی استقبالیہ میں مدعو تھے۔ ہال مختلف ممالک کے نمائندوں اور سفیروں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ان کا پرائیویٹ سکریٹری ان کو ایک لفٹ کی جانب لے کر چلا۔ جہاں پہلے ہی بہت سے لوگ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اور ملتے ہوئے لفٹ تک پہنچے۔

لفٹ کا دروازہ کھولا گیا۔ ڈفرن داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ان کی نظر لفٹ چلانے والے پر پڑی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ان کا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ انھوں نے اپنے سکریٹری کو ہاتھ کے اشارے سے لفٹ میں داخل ہونے سے روک دیا ———

ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ جو ڈفرن خوف سے کانپنے لگے تھے؟ کیا وجہ تھی جو انھوں نے سکریٹری کو داخل ہونے سے روک دیا تھا ——— ؟ لفٹ چلانے والے کے چہرے پر ایسا کون سا جادو تھا جس نے ڈفرن کو بے خود کر دیا تھا ——— ؟ اس کے چہرے پر یقیناً جادو تھا جس نے ڈفرن کو بے خود کر دیا تھا۔ جو کہ انسان کو مار نے کے لئے کافی تھا۔ ڈفرن تو سخت جان واقع ہوئے تھے یا ان کی عمر لمبی تھی جو کہ صرف کانپ اٹھے مرے نہیں۔

کیوں کہ ڈفرن کے سامنے وہی خوفناک..... جھرّیوں والا اور زخم کے نشانوں سے بھرپور..... مکروہ چہرہ تھا۔ جو کہ کئی سال پیشتر انھوں نے آئرلینڈ میں اپنے دوست کے مکان میں دیکھا تھا۔ مگر اس پر کیسے یقین کیا جائے کہ یہ عجیب و غریب ناقابلِ فراموش جسم آئرلینڈ میں ایک مکان کے چاندنی میں نہائے صحن سے غائب ہو کر کئی سال کے بعد یوں اچانک گرینڈ ہوٹل پیرس کی ایک لفٹ میں نمودار ہو گا ——— ڈفرن کے ذہن سے یہ تمام خیالات اس سرعت کے ساتھ گھوم گئے جیسے ڈوبتے ہوئے آدمی کی آنکھوں کے سامنے سے اس کی زندگی کے تمام واقعات ——— ڈفرن نہایت حوصلہ ہمت اور استقلال کے آدمی تھے۔ انھوں نے وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے رواجی معذرت چاہی اور مزید انتظار نہ کرتے کو کہہ کر ہوٹل کے منیجر کے کمرے کی جانب چلے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ لوگ لفٹ میں داخل ہوئے اور لفٹ چڑھنا شروع ہو گئی۔ ان کا سکریٹری وہیں کھڑا رہا۔

منیجر کے کمرے میں پہنچنے کے بعد انھوں نے پوچھا۔

"لفٹ چلانے والا کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟"

اس سے قبل کہ منیجر جواب دے پاتا ایک زور کا دھماکہ ہوا اور انسانی چیخوں کی آواز نے سارے ہوٹل کو دہلا دیا۔ ڈفرن کا سکریٹری کانپتا، دوڑتا آیا۔ اور کپکپاتی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

"سر! وہی لفٹ جس میں آپ نے چڑھنے کو منع کیا تھا۔ جس کو وہی مکروہ چہرے والا آدمی چلا رہا تھا ——— جب پانچویں منزل پر پہنچی تو اس کا تار اچانک ٹوٹ گیا۔ اور فوراً زمین پر گر کر تباہ ہو گئی ——— اس میں سوار سب لوگ ختم ہو گئے۔"

اور اس طرح وہ پُراسرار شخصیت کا حامل کچھ اور لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر فنا ہو گیا ——— اور ہم اب تک نہ جان سکے اور نہ جان سکیں گے کہ وہ کون تھا.....؟ بھوت یا انسان۔

شاہجہان وہی

(انگریزی سے ترجمہ)

# حلیم بیگم برجانِ شوہر

قمر بن علیم
متعلم جامعہ ملیہ نئی دہلی

"اے! للّو کے ابّا! غضب خدا کا، دو دن عید میں گئے۔ اور تم کو کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ کیا تم پر انی قرض نہیں ——؟ میں کہتی ہوں آج ہر حالت بکرا آنا چاہیئے —— ہاں —— سمجھے ——"

بیگم کی گونجیلی آواز سے کانوں کے پردے دہلنے لگے۔ — للّو کی خواہش اور بیگم کا نادر شاہی حکم دن سر پہ مسلّط رہا۔ زندگی میں بکرا تو کیا، بلّی کا بچّہ کبھی نہیں خریدا تھا۔ عجیب ذہنی اُلجھن میں گرفتار ح طرح کے پروگرام بناتے بناتے آخر شام ں —— للّو کو نئے کپڑے پہنائے اور خود بھی ، بہانے اپنے آپ کو سنوارا۔ آنکھوں میں سُرمہ، ں میں عطر کے پھوئے۔ پان کی گلوری کو کلّے میں میاں للّو کو کندھے پر بٹھا، چلدیئے جامع مسجد کی طرف۔ عہدِ مغلیہ کا نادر نمونہ —— شاہجہاں کے فنِ تعمیر با جاگتا ثبوت —— دلی کی جامع مسجد اس وقت ں —— بس کچھ نہ پوچھئے —— شاہی دروازے لے کر مٹیا محل تک، ایک بے کراں ہجوم اور اس کی ہم آہنگ آواز جیسے کسی شریر بچّے نے اپنے ریڈیو وٹی ایسی جگہ لگا دی ہو جہاں بیک وقت چینی زبان خبریں، بڑے غلام خاں کے دادرے، اور رے کے گائے ہوئے بھجن بج رہے ہوں —— سی قسم کی بات یہاں پر تھی —— کہیں بکرا فروخت ے والوں کی آوازیں" دو ہی دانت ہے، دو ہی ت "، کہیں بکرا خریدنے والوں کی تکرار۔ اور پھر ان ، آوازوں پر سبقت لے جانے والی بکروں

اور بھیڑوں کی منمناہٹ ——

خیر صاحب! ہم نے خدا کا نام لیا، للّو کا ہاتھ تھاما اور شریک، شریک تو کیا بس گم ہو گئے اس ہجوم میں۔ آدمی پر آدمی گرا جاتا تھا اور یہ سب بے چارے بکروں پر۔ اُدھر ایک کا بکرا بھاگا تو دوسرے کے بکروں میں گم ہو گیا۔ اب وہ چلّاتا پھر رہا ہے — اِدھر اس کونے میں ایک پہلوان قسم کا آدمی زبردستی کم داموں پر بکرا لے جانے چاہ رہے ہیں —— بکرے کا گلا پہلوان کے ہاتھ میں اور دُم فروخت کرنے والے کی مٹھی میں اور میاں بکرے نہ زمین پر آسمان پر بس ہوا میں معلّق ہو کر رہ گئے ہیں —

اور صاحب اس خرید و فروخت کے سلسلے میں جن مراحل سے میاں بکرے کا گذر ہوتا ہے، وہ تو خدا کی ہی پناہ۔ ابھی سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ پھر وہی سلسلہ شروع۔ ایک صاحب نے دونوں ہاتھوں سے جبڑے کو چیر کر رکھ دیا۔ کہ دیکھیں کتنے دانت ہے۔ ایک نے سینے کو ہی کوٹنا شروع کر دیا۔ ایک صاحب زور زور سے پیٹھ پر ہاتھ مار رہے ہیں۔ کہ کہیں بیسن کا پانی تو نہیں پلا دیا — اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ ہر چند لمحات کے بعد یہ ظلم بکروں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اور یہ بے چارے گم سم اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں —

اب ہم پریشان کہ کیا یہ سب حرکتیں ہم کو بھی کرنی پڑیں گی۔ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ہجوم کو کچھ جوش سا آیا۔ اور وہ ایک سیلاب

ہی سا تھا جس نے ہم کو اِدھر سے اُدھر اُٹھا کر پھر وہیں پٹخ
دیا جہاں سے ہم اس ہجوم میں شامل ہوئے تھے ——
حیران اور پریشان چہرہ دھواں دھواں، کرتے کا دامن
تار تار، چپل نہ جانے کب پیروں کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔
اب کریں تو کیا۔ اتنی ہمّت نہیں کہ پھر اس ہجوم کا جوشش
برداشت کر سکیں —— دل کہتا کہ بھاگ چل اس ہنگامے
سے۔ مگر بیگم کی کرخت آواز کانوں میں گونجنے لگتی ——
عجیب کسمپرسی کا عالم تھا۔ شاید رحمت خداوندی ہی
کو جوش آیا۔ پیچھے سے آواز آئی۔ " دو دانت ہے، یہ
دو دانت " گھوم کر دیکھا کہ ایک شخص مجھ سے ذرا بڑے
بکرا نما ایک چیز لئے کھڑے تھے۔ جلدی سے اُن کے
پاس پہنچے۔ بکرے پر بغیر کسی تشدد کے مول تول کیا۔
رسی پکڑی، للّو کو کندھے پر بٹھا، چل دیئے گھر کی طرف ——
خوش تھے کہ چلو زیادہ بھاگ دوڑ نہ کرنا پڑی۔ اور میاں
للّو کی خواہش بھی پوری ہو گئی۔

للّو کی خواہش اور بیگم کی نادر شاہی حکم نے ہم
سے بکرا تو خرید وا دیا تھا۔ لیکن اس بکرے کو جامع مسجد
سے لانے اور قربانی تک جن مراحل سے گذرنا پڑا
خدا کسی دشمن کو بھی وہ دن نہ دکھائے ——
للّو کو کندھے پر بٹھائے، میاں بکرے کی رسّی پکڑے،
خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔ برابر سے ایک آواز
ہماری سماعت سے ٹکرائی "بھئی! ماشاء اللہ کیا
جانور ہے، دلدل ہے دلدل" اتنا سنتے ہی میاں بکرے
کو اپنی اہمیّت کا احساس ہوا تو اپنے اس قدرداں
کی آواز پر لبیک کہا اور بڑے سعادت مندانہ انداز
سے گردن جھکا کر بیچ سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ ہم انکو
گھسیٹ رہے ہیں اور وہ ہمیں۔ کبھی وہ آگے کبھی ہم۔
خوشامد کا سہارا جب کام نہ آیا تو مارنے کا سلسلہ
جاری کیا۔ تو پھر اسی قسم کی آوازوں نے خیر مقدم
کیا۔ ذرا معاملہ کچھ تشویش ناک ہوا تو گھبراہٹ لاحق
ہوئی۔ ہر قدم کے بعد یہی حرکت ہوتی۔ طرح طرح کی
آوازیں ذہن پر کچوکے لگاتیں۔ کسی کو میاں بکرے
کی جوانی پر رشک آتا، تو کوئی ان حضرت کے وجود
کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے۔ ایک صاحب
بولے کہ حضرت اس کو بھی کاندھے پر بٹھا لیجئے۔
اتنا سنتے ہی کیا حالت ہوئی۔ بس مت پوچھئے۔
کان کی لویں غم و غصّے سے سرخ، چہرے پر شرمندگی
کے آثار —— خیر صاحب، میں جو پشیمان تھا
تو تھا۔ لیکن بکرے کی پشیمانی مجھ سے نہ دیکھی جاتی
تھی۔ جب بھی کوئی آواز کانوں سے ٹکراتی تو میں بکرے
کی طرف دیکھتا اور میاں بکرے میری طرف۔ پھر
دونوں کے سر جھک جاتے۔ خدا خدا کرکے گھر
آیا۔ بیگم دوڑی، دوڑی آئیں۔ مگر بکرے کو دیکھ کر
یکلخت ٹھہر گئیں۔ وہ حیرت سے کبھی ہم کو اور کبھی بکرے
کو دیکھ رہی تھیں۔ ایکدم سوال ہوا کہ "یہ کیا اُٹھا
لائے ہیں آپ ——" صاحب اتنا سنتے ہی دل
کی دھڑکنیں رُکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اور اب جو
ہم نے غور سے میاں بکرے کی طرف دیکھا۔ تو
ان کے بکرے ہونے میں ہمیں بھی کچھ شک ہوا۔
اب ہم گم سم —— چند لمحات بعد بیگم کو کچھ مجھ
پر اور کچھ بکرے پر رحم آیا تو گھر میں جگہ دی۔

بقرعید میں دو دن باقی۔ بکرے کی آؤ بھگت کے
لئے طرح طرح کے سامان ہوئے۔ لیکن صاحب!
وہ بکرا کیا تھا۔ بس بکرا ہی تھا۔ اتنا نازک کہ جب
چلے تو گمان ہو کہ دیئے کی لو تھرتھرا رہی ہے ——
مزاج میں انکساری اور تکلف کا بہت زیادہ دخل،
اور حضرت ہماری تو خدا سے یہی دعا ہے کہ مہنگائی
کے اس دور میں اگر بکرے کا مزاج ایسا ہو جائے تو
پالنے میں دشواری نہ ہو۔

ان کی آؤ بھگت کے جو سامان کئے گئے
وہ سب بیکار گئے۔ کیوں کہ میاں بکرے نے
کبھی ان پر منہ بھی نہ مارا —— اب آپ سوال

ُریں گے کہ وہ کھاتے کیا تھے ؟ ـــ بس یہ نہ پوچھئے۔ پیسے کوئلے ان کی مرغوب غذا تھی۔ لیکن کبھی کبھی دوسری اشیاء پر بھی منہ مار لیا کرتے تھے ـــ مثلاً صابن کی ٹکیا، کاغذ، اور پُرانے خطوط خاص طور سے کھاتے تھے۔ ایک دن تو صاحب حیرت ہوگئی۔ اسپنج کے نئے چپل لائے تھے معلوم ہوا کہ ایک چپل غائب۔ گھر بھر میں تلاش کر مارا، نہ ملی۔ کیا ہوا ـــ ؟ کہاں گئی ـــ ؟ للّو کی زبانی معلوم ہوا کہ میاں بکرے کی نظرِ عنایت اس پر ہو چکی ہے۔ اب ان ہی حرکات سے ان کی جسمانی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

لیجئے جناب! بقر عید بھی آ گئی۔ اب ہم پر کیا گزری وہ بھی سُن لیجئے۔

نماز پڑھ کر مسجد سے جلد از جلد نکلے۔ اور گھر کی طرف گامزن ہو گئے ـــ قصائی کی تلاش شروع کی۔ اس گلی سے اُس گلی تک خاک چھان ڈالی۔ اور پھر بڑی منت سماجت کے ساتھ ایک قصائی کو پکڑا۔ انھوں نے چھُریاں ہمارے ہاتھ میں تھما دیں۔ اور تہمد کو باندھتے ہوئے کہنے لگے۔ آپ گھر چلئے میں ابھی آیا۔ اب ہم چھُریاں لئے ہوئے گھر کی طرف چل رہے ہیں۔ کہ یکایک ایک صاحب نے جو شاید کسی دوسری گلی سے تعلق رکھتے تھے۔ جھٹ سے ہمارا ہاتھ پکڑا، اور کھینچنے لگے۔ "شیخ صاحب پہلے ہمارے ہاں" اب وہ پہلے ہمارے ہاں کی گردان کرتے ہوئے ہم کو کھینچ رہے ہیں۔ اور ہم پریشان کہ یا اللہ یہ کون سے گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟ بعد مشکل انھیں سمجھایا۔ تو وہ قدرے شرمندہ ہوئے۔ اور ہماری جان میں جان آئی۔ گھر پہنچے۔ اپنے آپ کو تیار کیا۔ (جیسے کہ ہمی کو قربان ہونا ہو۔) آستین چڑھا کر کھڑے ہو گئے۔ شیخ صاحب نے آتے ہی بکرا لاؤ کا نعرہ لگایا۔ ہم نے اس مظلوم کی طرف اشارہ کر دیا۔ میاں قصاب نے پلٹ کر حضرت بکرے کی طرف دیکھا پھر ذرا غور سے دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے۔ اور وہ اب کبھی بکرے کی طرف دیکھتے۔ کبھی ہماری طرف اور کبھی چھریوں کی طرف۔ چند لمحات اس کی نظر کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ "جناب میں بکرے کاٹتا ہوں بکرے اور حضور اس کی بھی کیا ضرورت تھی۔ ایک چار پیسے کا مرغا کاٹ لیا ہوتا،" یہ کہتے ہی جو نو دو گیارہ ہوئے تو آج تک محلے میں بھی نظر نہ آئے۔

●●

---

بقیہ افسانہ آنسو

مجھے معاف کر دیا ہے۔ بولو عصمی، خدا کے لئے اپنے کمال کو معاف کر دو۔"

اور عصمی کی آنکھوں سے کچھ ستارے ٹوٹ کر ڈاکٹر کے ہاتھوں میں جذب ہو گئے۔ جیسے یہی آنسو اس کا جواب تھے۔ اور یہی اس کا شکرانہ ..........

●●

---

ـــ بقیہ ـــ بیں بھی حاضر تھا وہاں ـــ

## ڈاکٹر نذیر صاحب (صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا "برہانِ قاطع" پر بصیرت افروز مقالہ

۲۶ مارچ کو یونی ورسٹی کے کمرہ نمبر ۲۲ میں دلّی یونی ورسٹی اور دوسرے تعلیمی اداروں کے ممتاز اساتذہ اور سرکردہ ادیبوں کی محفل میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب (صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے "برہان قاطع" پر ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا۔ مقالہ کے بعد مباحثہ شروع ہوا۔ جس میں ڈاکٹر محمد حسن صاحب (شعبۂ اردو) اور نور الحسن صاحب انصاری (شعبۂ فارسی) نے خاص طور پر حصّہ لیا۔

آخر میں ڈاکٹر امیر حسن عابدی (صدر شعبۂ فارسی) نے صدارتی تقریر فرمائی۔ اور سب کا شکریہ ادا کیا۔

●●

# حقیقت کا زہر

ہمایوں قدیر
متعلم کے۔ جی۔ کے۔ کالج مرادآباد

"نہیں —— نہیں ——" میرا سارا وجود چیخ پڑا۔

کیا یہ ہو سکتا ہے ——؟ کیا یہ ممکن ہے —— ؟ یہ حقیقت ہے یا کوئی خواب ——؟

تم آج ایک بار پھر میرے سامنے ہو۔ لیکن کیا یہ تم ہی ہو ——؟

مگر ہاں —— تمہاری آنکھیں کچھ کہہ رہی ہیں۔ ان میں گزرے ہوئے کل کی پرچھائیاں صاف نظر آرہی ہیں۔ آنکھیں جو کبھی دھوکہ نہیں دیتیں۔ اور آج وہی آنکھیں جو کبھی میری متاعِ حیات تھیں، میرے سامنے ہیں۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔

وہ بھی ایک حقیقت تھی جب برگد کے اس گھنے پیڑ کے نیچے، جہاں ہم اور تم کبھی ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے اور آج یہ بھی ایک حقیقت ہے —— لیکن پہلے سے کتنی متضاد

گو کہ تمہاری آنکھوں میں وہی خواب دکھائی دے رہے ہیں۔ اور ان ہی خوابوں کے حسین سائے رقص کر رہے ہیں۔ لیکن —— لیکن۔ ——

اب سے دس سال پہلے —— جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ —— دھڑکتے ہوئے دلوں نے آپس میں کچھ کہا، کچھ سرگوشیاں کیں، اور ان سرگوشیوں کی دھمک نے روح کی بنیادوں تک ہلا دیں۔ اور پھر دو سائے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ جیسے ہمیشہ سے ایک ہی رہے ہوں۔ جیسے وہ پہلے کبھی جدا جدا نہ تھے۔ اور نہ بعد میں کبھی جدا ہوں گے۔

اچانک مجھے جانا پڑا تھا —— زندگی سے دور، موت کے قریب —— تم نے التجا کی، منت مانگی —— لیکن میں مجبور تھا —— جانے کے سوا کوئی چارہ اور نہ تھا۔

پہلے خط کا تم نے جواب دیا تھا۔ دبی زبان سے اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کیا تھا۔ آنے والے ہیبت ناک لمحات پر مبہم سی روشنی بھی ڈالی تھی۔ مگر اس وقت میں تمہاری ان باتوں سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا تھا

جنگ کے دوران میں نے تمہیں بہت سے خطوط لکھے۔ تم برابر جواب دیتی رہیں —— لیکن اچانک تمہارے خط آنے بند ہو گئے۔ میں پریشان ہو گیا —— تمہارے متعلق دوسروں سے استفسار کیا۔ لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا

دو سال کے بعد —— جب میں محاذ سے واپس لوٹا تو زندہ رہنے کے لئے بیساکھی کا سہارا لئے ہوئے تھا۔ مجھے امید تھی کہ بہت جلد ہی میں تمہیں منا لوں گا۔ اور پھر میرا سب سے بڑا سہارا مجھے مل جائے گا —— لیکن میرے لئے بیساکھیوں کا سہارا مستقل ہو گیا۔ میری ایک کٹی ہوئی ٹانگ ہوا میں جھولتی رہ گئی۔ اور میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔

وہ سہارا جس کی مجھے تلاش تھی ضرورت تھی۔ مجھ سے دور ہو گیا تھا۔ باوجود بہت کوشش کے میں تمہارا سراغ نہ لگا سکا ——

دن گذرنے لگے۔ زندگی کٹنے لگی۔ سلگتی ہوئی، سسکتی ہوئی، گھسٹتی ہوئی، تلملاتی ہوئی، بیزار سی تھکان سے چور۔

لوگ کہتے ہیں کہ جنگ سے لوٹنے پر مجھے شراب پینے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ میں ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہوں بات بے بات پر جھنجھلاتا ہوں۔ ہر کس و ناکس کو ذرا سی بات پر گالیاں دینے لگتا ہوں —— لیکن میں کہتا ہوں کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے زندگی میں شراب نہیں پی۔ میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی۔ میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی۔ میں کبھی کسی کو برا نہیں کہا۔ میں اتنا ہی شریف ہوں جتنا ایک باعزت انسان ہو سکتا ہے۔

دل کے زخم بھرے نہیں۔ ویران اور اندھیری راتو

میں ملبے اور بھیانک خوابوں کے سایوں میں، زندگی سلگتی رہی، دم توڑتی رہی —— اور میں جلتا رہا، کڑھتا رہا۔ صرف ایک یاد کو سینے سے لگائے ہوئے —— زندگی نام تھا صرف ایک یاد اور ایک آرزو کا۔

اس دوران میں نے وہ کہانیاں بھی سنیں جنھیں سنکر میرے کانوں نے باہر انڈیل دیا۔ ایسی کہانیوں کا سننا بھی سزا ہے۔

اکثر لوگ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے غم کو کچھ اور سمجھ کر میری دلجوئی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ ناداں سمجھتے ہیں کہ میں لنگڑا ہوں۔ اپاہج ہوں۔ خود سے کچھ نہیں کرسکتا۔ پڑے پڑے اپنے اپاہج پن کا ماتم کیا کرتا ہوں۔ لیکن اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان سب کے منہ پر کہوں۔ چیخ چیخ کر ساری انسانیت سے کہوں۔

"اے انسانیت! میں نے تیری بقا کے لئے زندگی جیسی اہم چیز کو داؤ پہ لگا دیا۔ لیکن بدلے میں تو نے مجھے کیا دیا —— ؟ ایک ایسا گہرا ناسور جس کا درد، جس کا جلن ہر وقت میں اپنی چھاتی میں محسوس کرتا ہوں۔ ہر وقت جس کے گندے بوجھ کے تلے میری روح پستی رہتی ہے۔ میرا سارا وجود کراہتا رہتا ہے۔ اور میں خاموشی سے یہ جلن برداشت کرتا رہتا ہوں۔ اس زہر کو اپنے سینے میں چھپائے رہتا ہوں۔ اگر میں نے اس زہر کو باہر اگل دیا تو ساری انسانیت کا دامن داغدار ہو جائے گا۔ اور انسانیت کا نام لیوا بھی کوئی اس دنیا میں باقی نہ بچے گا۔"

اکثر اندھیری راتوں میں وہ کہانیاں سانپ بن کر میرے احساسات کو ڈستیں، میں انھیں جتنا دماغ سے باہر نکالنا چاہتا۔ وہ اتنا ہی اپنا جال میرے دماغ کے گرد مضبوط کرلیتیں۔

یہ کشمکش جاری رہتی اور میں درد اور اذیت کے طوفان میں ایک حقیر سے تنکے کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتا رہتا۔ کبھی پُرشور موجیں مجھے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرتیں اور کبھی ہلکے تھپیڑے میرے وجود کو سنگلاخ ساحل پر دے مارتے۔

میں نے زندگی سے سمجھوتا کرنا چاہا تھا۔ مگر بدلے کی شرط اتنی کڑی تھی کہ میں برداشت نہ کرسکا۔

اور آخر ایک روز میں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ روز روز کی اذیّت سے گھبرا کر میں نے آخر کار درد و اذیت کے اتھاہ سمندر میں کود پڑنے کا تہیّہ کرلیا ——

—— زینے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی میرا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ خیالات نے ایک دم سے بغاوت کردی۔ اور میرا سارا وجود لرز کر رہ گیا۔ ہاتھوں نے بیساکھیاں تھامنے سے انکار کردیا۔ لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح وہ تیرہ سیڑھیاں پار کر ہی لیں۔ جھلسا دینے والے آگ کے تیرہ الاؤ

ایک کوٹھا انسانی سماج سے کتنی اونچائی اور کتنے فاصلے پر واقع ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ مجھے زندگی میں پہلی بار ہوا —— !

—— اور زمین کے اس جہنم میں تم میرے استقبال کے لئے اپنی تمام تر نسوانی صلاحیتوں کے ساتھ کھڑی ہو۔"

"نہیں —— نہیں یہ تم نہیں ہوسکتیں" میرا سارا وجود چیخ پڑا —— —— یہ حقیقت ہے یا خواب —" میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ ●●

درخواست:

اپنے مضامین و تخلیقات ارسال کرتے وقت
صفحہ نمبر ۵ پر چھپا کوپن ضرور منسلک کریں
اور
کاغذ کے ایک جانب لکھیں
اور
جواب طلب امور کے لئے
ڈاک ٹکٹ سائنہ
ارسال کریں۔

ادارہ

ہریانہ میں پنکھوں کا پہلا کارخانہ
आमर पंखे
AMAR FANS
امر پنکھے
جن کی خصوصیات
بجلی کا کم خرچ
نہایت خوبصورت
چلنے میں بے آواز
ڈبل بیئرنگ
ٹھنڈی پُر کیف ہوا
جلد ہی ڈیلر سے رجوع کریں
ایجنسی کیلئے لکھیں۔
TRADE MARK
A AEC C
INDIA
تیار کردہ:-
امر انجنیئرنگ کمپنی حصار روڈ۔ روہتک
فون:- 410 آفس 514 رہائش

اسلم جاوید دہلی

# امیر خسرو

دہلی سے چار میل جنوب مغرب میں ایک بستی نظام الدین کے نام سے واقع ہے پرانی بستی کچھ ویران سی ہے لیکن اب اس کے گرد و نواح میں کافی توسیع ہو گئی ہے۔ یہ پرانی بستی باوجود اپنی ویرانی اور بے سر و سامانی کے اہلِ دل اور صوفیانِ باصفا کی زیارت گاہ ہے اور کیوں نہ ہو یہاں ہندوستان کے مشائخ کبار رحمۃ اللہ کے سچے بندے بڑے بڑے عابد و زاہد پیوندِ زمیں ہیں۔ کون ایسا شخص ہے جس نے ایک نہ ایک بار نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی تربتوں میں شرکت نہ کی ہو اور وہاں کے مقدس مزارات پر جا کر فاتحہ کا شرف حاصل نہ کیا ہو آیئے اس طوطیِ ہند کی زندگی کے حالات پر اجمالاً نظر ڈالیں۔

امیر خسرو کے والد امیر یوسف الدین محمود بلوی کے والد ترکستان کے شہر کش کے رہنے والے تھے مغلوں کے ہنگامہ میں ایک بڑی مخلوق وہاں سے فرار ہو گئی چنانچہ جس کو جہاں موقع ملا سر چھپایا امیر خسرو کے والد ہندوستان کی طرف چل دیے اور ضلع ایٹہ پٹیالی میں آ کر رختِ سفر کھولا۔ امیر خسرو اسی شہر میں ۶۵۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے چونکہ آپ کے والد عالم اور فاضل تھے اس لئے امیر خسرو نے بھی علوم و فنون کی تحصیل شروع کر دی اور اپنی قومی زبان فارسی کے اشعار اور اشعار کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنے لگے۔

امیر خسرو دہلی رہے دہلی کے بادشاہوں کے یہاں آپ کی بڑی عزت تھی ان میں سے بعض سلاطین کی آپ نے اپنے اشعار میں مدح بھی کی ہے اور ان کا نام بھی لیا امیر خسرو صوفی بزرگ اور مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے حلقہ میں شامل ہو گئے خسرو نے آپ ہی سے روحانی تعلیم حاصل کی اور انہیں سے سلوک طریقت ریاضت اور درویشی کی باتیں سیکھیں امیر خسرو نے بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھیں ان کے والد جس وقت ہندوستان آئے دہلی میں غلام خاندان کی حکومت تھی اور سلطان التمش کا زمانہ تھا

امیر خسرو نے غیاث الدین بلبن سے محمد تغلق تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کے دربار میں معزز عہدوں پر فائز رہے لیکن حضرت نظام الدین کے حلقہ میں آنے کے بعد شاہی ملازمت سے طبیعت اچاٹ ہو گئی کئی مرتبہ درخواست کی کہ ان کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے۔ لیکن بادشاہِ وقت مصر تھا آخر کار اس کی مرضی کے خلاف دربار سے کنارہ کر لیا اور اب دوسری زندگی شروع کر دی۔

امیر خسرو پر کہاں تک قلم اٹھایا جائے ان کی کس کس چیز کی تعریف کی جائے اگر ایک طرف شاہی اعزاز سے مشرف تھے تو دوسری طرف طبیعت میں استغنا اور بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ تو ایسے شخص تھے کہ صوفیوں میں صوفی اور عوام میں پیارے اور چہیتے خسرو اگر آج فارسی کے شعر کہہ رہے ہیں تو کل ہندوستانی زبان میں پہیلیاں دو سخنے اور مکرنی کہہ رہے ہیں آج دربار میں ہیں تو اگلے دن محفل سماع جم رہی ہے آج کسی اور کے دربار میں گئے ہیں تو کل لوگ ان کے دربار میں آ رہے ہیں نسلاً ترک ہے تو روح ہندی ہے باپ دادا کی زبان فارسی ہے لیکن عوام کے دل عوام کی زبان سے موہ لیتے ہیں۔

امیر خسرو صرف خواص میں ہی نہیں بلکہ عوام میں بھی ہر دل عزیز تھے ان کے لطیفے اور ظرافت ان کی پہیلیاں ان کے راگ ان کی مکرنیاں ان کے دو سخنے آج تک زبان زد خاص و عام ہیں قارئین کی دلچسپی کے لئے ہر ایک کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ پڑھنے والوں کی زبان چٹخارے نہ لے اور چھوٹے اور بڑے اپنے اپنے گھروں اپنی اپنی محفلوں اور نشستوں میں ان کو سامانِ تفریح نہ بنا لیں اب یہ کام آپ کا ہے کہ بتائیں کہ یہ چیزیں کیا کیا ہیں۔

(۱)

ترور سے اک تریا اتری اس نے بہت رجھایا باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا۔

آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام بنولی

(۲)

فارسی بولی آئینہ
ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے
منہ دیکھو جو اسے بتائے

(۳)

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے
دیکھ سفیدی سوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندروں کا باشا۔ باشے کا وہ کھلعیا
سنگ ملے تو سر پر رکھیں واہ کو را ورا جیا
سی سی کر کے نام بتایک میں بیٹھا ایک
الٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی یہ کہی تو سن لے میرے لال
عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

دلی کیا بلکہ ہندوستان کے سارے شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہاروں میں گھر گرداتی ہیں پیڑوں میں جھولا ڈالتی ہیں مل مل کر جھولتی ہے اور گیت گاکر جی خوش کرتی ہے۔ ایسے موقعوں کے لئے بھی امیر خسرو نے گیت لکھے ہیں خاص طور پر برہا راگ بھی ہیں کا ہے بنانے والوں نے ہزاروں گیت بنائے اور گانے والوں نے اسے آج ہوئے کل بھول گئے چھ سو برس گذرے یہ آج تک ہیں اور ہر برسات میں ویسا ہی لطف دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جو پیا آون کہہ گئے ابھوں نہ آئے سوامی ہو
اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ

بڑی بڑی عورتوں کے لئے گانے تو ویسے گیت تھے لیکن چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پیا یا سوامی کا کہاں ذکر کر سکتی ہیں ان کے لئے اس طرح کا گانا مناسب نہ تھا لیکن دل میں امنگ تو وہ بھی تھی چنانچہ امیر خسرو نے ان کے لئے یہ گیت دے دیا۔

اماں میری بابا کو بھیجو جی کہ — ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بڈھا ری کہ — ساون آیا

ہلال ماہنامہ دہلی

اماں میرے بھائی کو بھیجو جی کہ — ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری کہ — ساون آیا
اماں میرے ماموں کو بھیجو ری کہ — ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ — ساون آیا

اب آئیے دو تین مکرنیاں بھی پڑھیے
اور دل ہی دل میں بوجھیئے۔

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن نا سکھی دیا

---

سرب سلونا سب گن نیکا
وا بن سب جگ لاگے پھیکا
واکے سر پر ہووے کون
اے سکھی ساجن نا سکھی لون

---

وہ آوے تب شادی ہووے
اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول
اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

---

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھی۔ امیر خسرو کو پیاس لگی اور کنوئیں پر جا کر پانی مانگا، چاروں کہنے لگیں کہ ہمارے لئے کوئی بات کہہ دو تب پانی پلائیں گے چاروں نے بالترتیب کھیر، چرخہ، کتا اور ڈھول کے الفاظ بتائے اب سنیے امیر خسرو کیا کہتے ہیں۔

کھیر پکائی جتن سے اور چرخہ دیا جلائے
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجائے
(پانی پلا۔)

چلتے چلتے ایک ڈھکوسلا بھی سنتے جائیے۔

بھادوں کی پکی پہیلی۔ جو چوپڑی کپاس
بی بہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا

لیجئے اب اپنے کانوں میں کچھ دو سخنوں کا بھی رس ڈال لیجئے۔

| | |
|---|---|
| شت کوں نہ کھایا | ڈوم کیوں نہ گایا |
| بہ کیوں نہ پہنا | سنبوسہ کیوں نہ کھایا |
| رکیوں نہ چکھا | وزیر کیوں نہ رکھا |
| وداگر را چہ می باید | بوچے کو کیا چاہیئے |
| شنہ را چہ می باید | ملاپ کو کیا چاہیئے |
| کار کچہ می باید کرد | قوت مغز کو کیا چاہیئے |

موسیقی میں ان کی طبیعت ایک ایسا ساز تھی جو کسی مضراب کی محتاج نہ
تھی امیر خسرو نے دہرپت کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد
کئے ان میں سے اکثر گیت آج تک ہندوستان کے مرد اور عورت کی زبان
میں بہار راگ اور بسنت راگ نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے
بین کو مختصر کرکے ستار بھی انہی کی ایجاد ہے موسیقی کے ذوق کے متعلق
کے چند لطیفے زبان زد خاص و عام ہیں طوالت کی وجہ سے ان کو
یہاں نقل نہیں کیا جا رہا تاہم ایک ہلکا سا اشارہ کافی ہوگا ایک مرتبہ سلطان
کے یہاں ایک مہمان آیا تھا نا کھا کر آدھی رات بیٹھا رہا اور اٹھنے کا نام
لیتا تھا جب آدھی رات کی نوبت بجی تو سلطان جی نے خسرو سے پوچھا
خسرو یہ کیا بجا بلا تکلف فرمایا۔

.. نان کہ خوردی خانہ برو....
نہ کہ بدست تو کردم خانہ برد...

اسی طرح دھینے کی دھنکی میں سے جو آواز نکلتی ہے اس کو
سطرح ادا کیا ہے۔

.. در پئے جاناں جاں ہم رفت
جاں ہم رفت جاں ہم رفت ...
.... رف رف رف رفتن وہ "

امیر خسرو صوفی ہونے کے علاوہ فارسی عربی اور ہندی کے
بہت بڑے شاعر تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ ہندو اور مسلمانوں
کو ایک ایسی محبت کے رشتہ میں جکڑ دیا جائے کہ وہ رشتہ کبھی نہ ٹوٹے
ان کی یہ خواہش ان کے ان اشعار سے صاف ظاہر ہے۔

چو من طوطئ ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم
ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم عرب



کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند
آری آری می کنم با خلق ما را کار نیست

الغرض امیر خسرو ہندو مسلم اتحاد کے ایک بہت بڑے حامی تھے اور اس
غرض کے لئے انہوں نے ایک مشترک زبان بنا رکھی جسے عرف عام میں کھڑی
بولی کہتے ہیں جیسا کہ آپ نے ابھی دیکھا کہ انہوں نے فارسی اور برج بھاشا کو
نون مرچ کی طرح ملا دیا ہے انہوں نے ایک ایسی غزل بھی ایجاد کی جس میں فارسی
میں اور خیالات ہندی اسی طرح ان کی ایک غزل ملاحظہ فرمایئے جو اس
اعتبار سے "آدھا تیتر آدھا بٹیر" ہے۔

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اسی طرح ایک محبوبہ کا نقشہ کھینچا ہے جو بال کھولے ہوئے پلنگ
پر سو رہی ہے اور اس کی سیاہ زلفوں نے اس کے چہرے کو چھپا رکھا ہے

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چوں دیس

امیر خسرو کا فارسی کلام کا باقاعدہ ایک دیوان موجود ہے یہ پانچ
حصوں میں ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر رجیہ قصائد ہیں۔ (۱)
تحفۃ الصغر (۲) وسط الحیوۃ (۳) غرۃ الکمال (۴) بقیہ نقیہ (۵)
نہایۃ الکمال، یہ دیوان ادبی خوبیوں کے علاوہ تاریخی اہمیت کا بھی حامل
ہے کیونکہ ہر حصہ میں شاہانِ وقت کی تعریف کی گئی اور اسی طرح ان کے
درباری اور ملکی حالات کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے قصائد میں حضرت
نظام الدین اولیاء سے کر بلبن اعظم کے بیٹے اور اپنے سرپرست
نصرت الدین سلطان محمد اور سلطان معز الدین کیقباد۔ جلال الدین
فیروز شاہ اس کے جانشین مثلاً رکن الدین اور علاء الدین وغیرہ
علاء الدین محمد شاہ سلطان غیاث الدین تغلق تک کی تعریف کی
گئی ہے اور اسطرح یہ قصائد ایک طویل عرصہ کی تاریخی معلومات
کا معتبر ذریعہ ہیں۔

لیکن ان کی غزلیں قصائد سے کہیں بہتر ہیں ان کی غزلوں
آگے صفحہ ۵۲ پر

# طلبہ وقت سے پہلے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے؟

دو طلبہ امتحان کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے، ان میں سے ایک حد سے زیادہ مایوس تھا۔ اور دوسرا بڑے اطمینان سے سمجھا رہا تھا۔ کہ ابھی کافی وقت ہے۔ اساتذہ کے لکھائے ہوئے نوٹس کا مطالعہ ہی امتحان میں کامیابی کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر اس کے لئے انضباطِ اوقات کا پابند ہونا ضروری ہے۔ تدریسی اوقات کے علاوہ دو ٹائم ٹیبل بنائے جائیں۔ ان میں سے ایک رات کے لئے اور دوسرا صبح کے لئے ہونا چاہئے رات کے وقت ایسے مضامین کا مطالعہ ٹائم ٹیبل میں شامل

## ایک اہم سوال

کیا جائے جو کم خشک ہیں۔ خشک مضامین کے لئے صبح کا وقت مقرر کیا جائے۔

پہلا طالب علم اپنے ساتھی کی نصیحت غور سے سنتا رہا۔ اور بعد میں کہنے لگا۔ کہ میں نے تو کلاسوں میں باقاعدگی سے حاضری ہی نہیں دی۔ اور نہ ہی نوٹس لکھے ہیں۔ ایسا گر بتا کہ تین مہینے میں پورے سال کی پڑھائی مکمل ہو جائے۔ اور امتحان میں کامیاب بھی ہو جاؤں۔ ورنہ میری زندگی خراب ہو جائے گی۔ والدین دوبارہ داخلہ نہیں لے کر دیں گے۔ اور فیل ہونے پہ جو سبکی ہوگی وہ الگ.........

خدا کے واسطے میری مدد کرو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ سالا سال پڑھوں گا۔

امتحانات کے وقت ایسی باتیں اکثر سنائی دیتی ہیں۔ جب ان کے پسِ منظر کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے۔ کہ شہری طلبہ کی ۹۸ اور دیہاتی طلبا کی ۶۰ فی صد تعداد سیکنڈری اور ہائی سکنڈری مدارج میں تدریسی اوقات کے بعد کتابوں کے نزدیک تک نہیں جاتی ...... شہروں میں ۳۰ اور دیہات میں دس فی صد طلبہ اساتذہ کے نوٹس سے استفادہ نہیں کرتے۔ اور یہی طلبہ امتحانات کے قریب آنے پر روزانہ سولہ سولہ اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے پڑھتے ہیں۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے امتحانات میں فیل ہونے والوں کی مجموعی تعداد ۷۰ فی صد تک پہنچ جاتی ہے۔

تعلیمی سال کے دوران باقاعدگی سے درس وتدریس کی طرف توجہ دینے والے طلبہ کی ۹۸ فی صد تعداد خلاصوں، گائڈوں، ماڈل ٹیسٹ پیپروں اور دیگر امدادی کتابو انحصار کرتی ہے۔ باقی دو فی صد ان سے کبھی بے نیا رہتے ہیں۔ اور جب امتحانات میں صرف ایک مہینہ رہ جاتا ہے تو گیس پیپروں کی طرف لپکتے ہیں۔ اور الا بلا رٹ کر کمرۂ امتحان میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور پرچہ وضو کرنے پہلے آیتہ الکرسی اور درود شریف کا ورد کرتے ہوئے سنا دیتے ہیں۔ حالانکہ انھیں یہ علم ہوتا ہے کہ اللہ ان مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

جب ان امور کی طرف اساتذہ کی توجہ مبذول کر گئی تو انھوں نے بڑے بے لاگ انداز میں تبصرہ کر ہوئے کہا کہ والدین بچوں کے تدریسی مشاغل سے مسلسل غفلت برت رہے ہیں۔ طلبہ کی تقریباً ۳۰ فی صد تعداد جماعتوں میں حاضر ہونے سے گریز کرتی ہے۔ وہ ہفتہ صرف دو دن حاضر ہوتے ہیں۔ پیریڈ چھوڑنے والوا

تناسب ۴۰ فی صد ہے - یہ طلبہ کل پیریڈوں میں سے روزانہ ایک سے لے کر چار چار پیریڈوں میں غیر حاضر رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اساتذہ کا خوف قطعی نہیں ہوتا۔ اور جب والدین سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے تو وہ اپنی مصروفیات کا رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اساتذہ اپنی عزت وناموس کا خیال رکھتے ہوئے سختی کرنے سے پرہیز کرتے ہیں — نرمی کی جائے تو طلبہ کو راس نہیں آتی۔

اساتذہ نے بتایا کہ تدریس کے اوقات کے بعد والدین کی اکثریت اپنے بچوں کی تدریسی زندگی سے غافل رہتی ہے۔ غضب تو یہ ہے کہ جس گھرانے میں زیادہ پڑھے لکھے افراد ہوتے ہیں۔ اسی گھرانے کا طالب علم پڑھائی کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ اور نہ ہی بڑے بڑے ڈگریوں والے چھوٹی جماعت کے طالب علم کی رہنمائی پر آمادہ ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان گھرانوں کے طلبہ ٹیوٹروں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ اور جب ٹیوٹر دو گھنٹے پڑھانے کے بعد دوسرے گھر ٹیوشن پڑھانے جاتے ہیں تو طلبہ پھر کتابوں کا منہ نہیں دیکھتے۔

اس ضمن میں اساتذہ نے والدین کے ذمے ایک اور کام سپرد کیا ہے۔ کہ پڑھے لکھے والدین اپنے بچوں کے لئے تعلیمی سال کے آغاز سے ہی رات اور دن کے اوقات کے لئے ٹائم ٹیبل مقرر کریں۔ اور کڑی نگرانی رکھیں کہ ان کے بچے مقررہ تدریسی اوقات میں کیا کرتے ہیں...... ان پڑھ والدین یہ معمول بنائیں کہ ان کے بچے رات اور دن کے وقت کتابوں میں مصروف رہتے ہیں یا نہیں۔

والدین کو کون بتائے کہ ذرہ بھر احساس ذمہ داری سے تعلیمی دنیا کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ اور قوم سالانہ ۲۳ کروڑ روپئے کے نقصان سے بچ سکتی ہے۔ یہ مسئلہ والدین کی توجہ کا مستحق ہے۔

دستیاب ہے

۱۴۲ انچ سائز سیلنگ پنکھے
اورینٹ پنکھوں کی صف
میں ایک اور شاندار
اضافہ ہیں۔ اورینٹ
کی روایات کے
مطابق یہ پنکھے ڈیزائن
میں لاجواب اور کارکردگی
میں لاثانی ہے۔
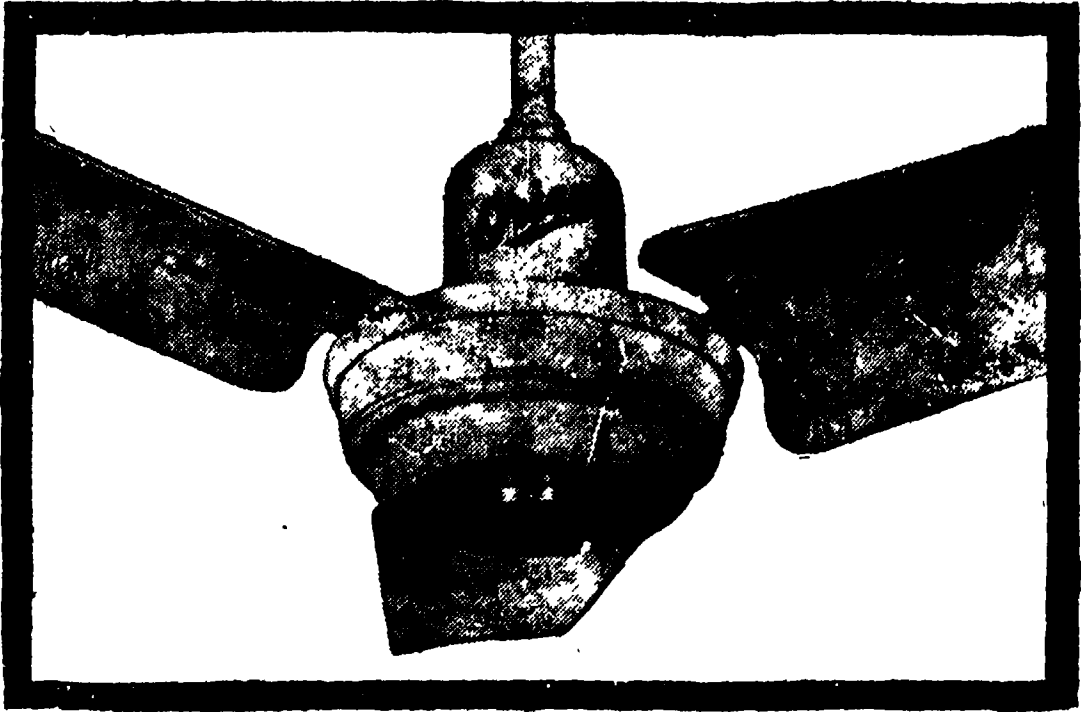
اورینٹ

اورینٹ جنرل انڈسٹریز لمیٹڈ
کلکتہ ۲۳

# افکارِ نو

تبدیلیٔ رجحانات کے پیشِ نظر لوگ یہ جاننے کے لئے بے چین ہیں کہ آج کا جوان ذہن زندگی کے مختلف پیرایوں کو کس زاویئے سے دیکھتا ہے۔ اس لئے ان افکار اور رجحانات کی ترجمانی کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر شمارہ میں چودھری عبداللطیف خان (متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے خیالات شامل ہیں، آپ اپنے افکار بھیجئے وقت اختصار سے کام لیں

ادارہ

س ۱۔ ہندوستان میں رائج طریقۂ تعلیم کو بہتر اور مفید بنانے میں آپ کیا کیا چیزیں ضروری سمجھتے ہیں۔ اور کیوں؟

ج ۱۔ ہندوستان میں مروجہ تعلیمی ڈھانچہ خدا جانے کون سے اصول اور مقاصد کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے، ہندوستان کے تعلیمی ڈھانچہ میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ تعلیم علاقائی زبانوں میں دی جاتی ہے۔ جب کہ ذریعۂ تعلیم صرف ایک زبان ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تامل ناڈو اور اترپردیش کا طالب علم ایک دوسرے سے ملے تو وہ اپنے دلی جذبات ایک دوسرے تک نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ایک نے ہندی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کی اور دوسرے نے ملیالم زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کی۔ ایسی صورت میں ایک تعلیم یافتہ دوسرے تعلیم یافتہ کے لئے بالکل جاہل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تعلیمی زبان مشترک ہونی چاہئے۔ ثانوی درجہ تک تعلیم فری اور لازمی قرار دی جائے۔

س ۲۔ بے روزگاری کو ختم کرنے میں حکومت اور نوجوانوں کا کیا کردار ہونا چاہئے؟

ج ۔ بے روزگاری کے تنہا ذمہ دار نوجوان ہیں۔ حکومت کو کسی صورت میں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ آج کا تعلیم یافتہ نوجوان صرف ڈگری تک تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ قابلیت نام کی چیز سے تو وہ بالکل نابلد ہوتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے جذبۂ ایثاری اور خلوص کے ساتھ قابلیت پیدا کریں۔ قابل ہونے کی صورت میں وہ نوکری کی تلاش میں نہیں ہوں گے۔ نوکری ان کی تلاش میں ہوگی۔ دوسرے، تعلیم یافتہ طبقہ کو نوکری سے زیادہ تجارت کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اور اس میں حکومت کو مالی امداد دینی چاہئے۔

س ۔ کیا شادی کرنے میں والدین کی مداخلت ضروری ہے؟

ج ۔ شادی کرنے میں والدین کا مشورہ ضروری ہے۔ لیکن مداخلت بالکل بے جا ہے۔ اور والدین کو بھی چاہئے کہ وہ نوجوان طبقہ (لڑکے لڑکی) کے جذبات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس مداخلت سے دست بردار ہو جائیں۔ اور شادی کے لئے انتخاب میں لڑکے لڑکی کو بالکل آزاد چھوڑ دیں۔

س ۔ کیا ایک بیوی کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے؟

ج ۔ تعلیم کے ساتھ ہی تہذیب یافتہ ہونا بھی ضروری ہے۔ تعلیم یافتہ ہونا یوں بھی ضروری ہے کہ خاندان کے اخراجات صرف ایک کاندھے پر نہ پڑیں۔ بلکہ وہ بھی اس میں برابر کی شریک ہو۔

س ۔ عشق کی کامیابی ذہنی ارتباط ہے یا جسمانی اتصال؟

ج ۔ عشق کم از کم اس لڑکے کو معلوم نہیں ہونا چاہئے جو کسی تعلیمی ادارہ سے بحیثیت طالب علم وابستہ ہو۔ اور ایک پڑھنے والے لڑکے کے لئے یہ تمام چیزیں عجیب سی ہیں۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد پوری زندگی پڑی ہے۔ چاہے عشق کیجئے۔ چاہئے.... اور رو لیجے بھی ——

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

چودھری عبداللطیف خاں

۱۳۶۔ ایم۔ بی ہاؤس، سلیمان ہال۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نعیمہ صدیقی دہلی

# "دلّی سے متعلق ضرب الامثال"

- دلّی دور ہے (منزلِ مقصود دور ہے)
- دلّی کی کمائی، دلّی ہی میں گنوائی (سب کچھ خرچ کر دیا، ایک پیسہ پاس نہ رکھا۔)
- دلّی کی کمائی بھنگ کے بھاڑے میں گنوائی (دولت مفت میں گنوائی، ساری عمر کی محنت رائیگاں گئی)
- دلّی کا روڑا (بہت ہوشیار)
- تھوڑا کھانا دلّی میں رہنا۔
- بے زر کا مرد بلّی گھر میں رہے کہ دلّی۔
- آس پاس برسے دلّی پڑی ترسے
- دلّی دکھانا۔ (بچوں کو بطور کھیل کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر سر سے اونچا کرتے ہوئے)
- دلّی کا کوتوال (بہت دبدبے والا)
- دلّی سے میں آؤں، خبر کہے میرا بھائی (جب کوئی شخص پرانی خبر سنائے)
- کون جائے ذوقؔ یہ دلّی کی گلیاں چھوڑ کر۔
- ہنوز دلّی دور است
- دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار اور بستی نہیں یہ دلّی ہے۔
- بارہ برس دلّی میں رہے اور بھاڑ ہی جھونکا (اچھی جگہ رہنے کے باوجود قابل نہ ہوئے۔)
- دلّی سے ہینگ آئی تب بڑے پکے (بڑی مشکل سے کام ہونے کے بعد کہتے ہیں۔)
- دلّی کے بانکے جن کی جوتی میں سو سو ٹانکے (دلّی کے بانکے کیسے ہی غریب کیوں نہ ہوں، رکھ رکھاؤ سے کام لیتے ہیں)
- دلّی دیکھی نہیں بن گئے شاہجہاں آبادی۔
- دلّی کی بیٹی متھرا کی گائے کرم پھوٹے تو باہر جائے (غیر قوم میں شادی کرنا)
- دلّی کے دل والے منہ چکنا پیٹ خالی (دلّی کے رہنے والے گو بہت بن سنور کر رہتے ہیں، مگر بھوکے مرتے ہیں۔)

قارئین کے خطوط کے اقتباسات شائع کئے جاتے ہیں ـــ شاہجہاں کے پڑھنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ اس کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے اپنی گراں قدر رائے/مشورے سے نوازیں ـــ

---

اپریل کا شمارہ دیکھا ـــ افسانہ "ایک لمحہ ایک سایہ" بہت خوب لکھا ہے ـــ کیا آپ اسکی ضخامت میں اضافہ نہیں کر سکتے ـــ؟ پورا رسالہ پڑھنے کے بعد تشنگی اور بڑھ جاتی ہے ـــ "ان کے نام" اس مرتبہ نہ دیکھ کر بہت کوفت ہوئی یہ بھی تو ایک کالم ہے جس میں "دوسروں" کے حالات معلوم ہوتے ہیں.

ویدپرکاش
گورنمنٹ کالج سہارنپور.

---

شاہجہاں کا برابر مطالعہ کر رہا ہوں ـــ اپریل سنہء کے شمارے میں ایک فکری مقالہ پڑھا۔ معلوم ہوتا ہے کسی مبتدی نے لکھا ہو ـــ جملے بے ربط ہیں اور بہت سی جگہ فاضل مقالہ نگار تسلسل قائم نہیں رکھ سکے ـــ ایسے مہمل مضامین چھاپنے سے قبل ضروری ہے کہ آپ "تصحیح" کر لیا کریں ـــ افسانہ "سکتا مانی" بہت اچھا ہے ترجمہ "آخری سبق" بھی نہایت موثر ہے.

عابد حسین قریشی
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

---

خدا کا شکر ہے کہ یہ رسالہ ان تمام فحش ولغو باتوں سے پاک ہے جو دیگر جرائد میں پائی جاتی ہیں اور جن سے ذہن پراگندہ اور آمادہ فحشیات ہوتا ہے ـــ اور جس سے نئی نسل خصوصاً طلبہ کا ذہن عشق و محبت کی مہیب وادیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے ـــ شاہجہاں وقت کی اہم ضرورت اور طلبہ کیلئے ایک نعمت ہے.

ساجدہ رشید
اینیگرز اسکول دھلی

**·SANFORIZED·**
REGD TD MK

سلیکس ہوں یا ٹرّوزر یا بیل باٹم ۔ ڈرین پائپ ہوں یا ڈینمس یا حرم پینٹ یا پھر وہی پُرانی طرز کی سادی پتلون ۔ گھر میں کوئی بھی پینٹ پہنے، کوئی بھی خریدے ۔ ہر پینٹ پر 'سینفورائزڈ' کی چھاپ ضرور دیکھ لینی چاہیئے ۔

شہرۂ آفاق ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ' آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی قابلِ اعتماد گارنٹی ہے ۔ اِس چھاپ والے لباس خواہ وہ سوتی ہوں یا سوت ملے کپڑوں سے بنے ہوں، متعدد بار دھلنے کے باوجود بھی اپنی اصلی فٹنگ کو برقرار رکھیں گے

سینفورائزڈ چھاپ کے مالکان کلوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ایس۔اے میں قائم شدہ) نے شائع کیا۔ صرف اسی سوتی یا سوت ملے کپڑے کے سلسلے میں اس چھاپ کا استعمال کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو نہ سکڑنے کی کڑی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

# میں بھی حاضر تھا وہاں

مرتبہ: ریحان الحق۔ ایم۔ اے۔ بی کام

اس عنوان کے تحت مختلف تعلیمی اداروں کی اردو، فارسی اور عربی سوسائٹیوں کے زیر اہتمام ہوئے پروگراموں کی ایک جھلک پیش کیجاتی ہے ـــــ اگر آپ کسی سوسائٹی کے سکریٹری ہیں تو اپنے یہاں ہونے والے پروگرام کی قبل از وقت اطلاع دیں یا مختصراً رپورٹ ارسال کردیں ـــــ ہم ممنون ہوں گے۔

## پوسٹ گریجوٹ انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر اختر اورینوی اور بیگم شکیلہ اختر کی آمد

شعبہ اردو پوسٹ گریجوٹ ایوننگ کالج دہلی یونی ورسٹی دہلی میں پروفیسر اختر اورینوی، بیگم شکیلہ اختر کی آمد پر ۲۹ فروری کی شام کو پروفیسر اختر اورینوی اور بیگم شکیلہ اختر کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔

جناب مغیث الدین فریدی استاد شعبۂ اردو نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا تعارف کرایا اور پروفیسر اختر اورینوی سے گزارش کی وہ اپنے کلام سے جلسہ کا آغاز کریں۔

اختر صاحب نے غالب کی زمین میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

میں کہی ہوئی اپنی تازہ اور کامیاب غزل سے جلسہ کا آغاز کیا۔ اس کے بعد بیگم شکیلہ اختر نے اپنے افسانے "آخری سہارا" بہار کے خونی فساد" کے ایک سچے واقعے کو نہایت پرتاثیر اور دردناک انداز میں پیش کیا۔

پروفیسر اختر اورینوی نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ علم النفس کی تحقیقات نے ہمیں ایک نئی روشنی دی ہے۔ جس میں ادب کی قدریں متعین کی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اب ادب برائے ادب اور افادی ادب کا بُعد ختم ہوچکا ہے۔ جمالیاتی قدروں کو ادب کی بنیاد قرار دیتے ہوئے آپ نے اپنی افادیت اور دوسری قدروں کو ثانوی قدر بتایا اور ادب کے تہذیبی رشتوں پر بھی نئی روشنی ڈالی۔

آخر میں صدر جلسہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی نے پروفیسر اختر اورینوی اور بیگم شکیلہ اختر کی ادبی خدمات کو سراہا۔

---

## بزم ادب کروڑی مل کالج کے زیر اہتمام جدید اردو شاعری پر سیمنار

۷ مارچ کو کروڑی مل کالج کی بزم ادب کی جانب سے ایک دل چسپ محفلِ مذاکرہ منعقد کی گئی ـــــ عنوان تھا اردو شاعری۔

جب راقم کروڑی مل کالج پہنچا تو سیمنار روم میں مہمان جمع ہوچکے تھے۔ شروع میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب (صدر شعبۂ اردو) نے "اردو شاعری میں نئے موڑ" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا۔ جس میں انھوں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ جدید اردو شاعری اور اس کے جدید رجحانات پر بحث کرتے ہوئے جدید شعرا کے افکار و خیالات اور

ان کی شاعری کے رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ مقالہ کے بعد اساتذہ، طلباء اور اہلِ ذوق مہمانوں نے مباحثہ میں حصّہ لیا۔

مقالہ اور اس پر مباحثہ کے بعد جدید اردو شعراء کا ایک نمائندہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں سلام مچھلی شہری، رفعت سروش، زبیر رضوی، عمیق حنفی، بلراج کومل، کمار پاشی، راج نارائن رازؔ، اسلم پرویز، مخمور سعیدی، اور قمر رئیس صاحب نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

آخر میں پروفیسر سروپ سنگھ (پرو وائس چانسلر) کے خطبۂ صدارت پر یہ محفل ختم ہوئی۔

---

## دلّی کالج دہلی میں حضرت آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کی تشریف آوری

۹ ، مارچ کا دن دلّی والوں کے لئے انتہائی مبارک اور بزمِ ادب دلّی کالج دہلی کے لئے ایک تاریخی اور یادگار دن کا۔ اس دن دلّی کالج میں ادیب و نقاد بزرگ جناب آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کا ورود مسعود ہوا تھا۔

جناب شیو پرشاد جاوید وششٹ (صدر شعبہ اردو) نے ابتدا میں جناب رحمت الٰہی (ریسرچ اسکالر دلی یونی ورسٹی) سے آغا صاحب پر ایک تعارفی خاکہ پڑھنے کی درخواست کی۔ اس خاکہ میں ان کے حالات زندگی اور بعض دلچسپ واقعات بڑی خوب صورتی سے پیش کئے گئے تھے۔

اس کے بعد جاوید صاحب کی درخواست پر آغا صاحب نے اپنے دلکش اور مسحور کن اندازِ بیان کے ساتھ اپنے بچپن کے حالات، اُس وقت کے طریقۂ تعلیم، بول چال، رہن سہن، طور طریق، اپنے اساتذہ کے تذکرے، طلباء کی فرمانبرداری (اور ان کی معصوم شرارتیں) ہندو مسلم اتفاق اور اتحاد، غرض ہر ہر پہلو پر خوب خوب روشنی ڈالی۔ اور سامعین نے بھی اپنا حق خوب ادا کیا۔ ایسے ہمہ تن گوش ہو کر سُنا کہ گویا کوئی روحانی پیشوا اپنے چیلوں کو نصیحتیں کر رہا ہو۔ اور وہ ان کو اپنے افکار میں موتیوں کی طرح مضبوط کر تے جا رہے ہوں۔ راقم الحروف کے خیال میں پچھلے برسوں میں دلّی کالج میں لوگوں کی اتنی حسین شام نہ گذری ہوگی۔ اور بہتوں کے لئے تو آغا صاحب کی زیارت ہی باعثِ فخر اور وجہِ افتخار ہوگی۔ وہ آئندہ نسلوں کے سامنے فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کی آنکھیں دیکھی ہیں۔

بہر حال تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد آغا صاحب کی دلچسپ و دلپذیر تقریر ختم ہوئی۔ حالانکہ سامعین میں احساس تشنگی اب بھی باقی تھا۔

اس کے بعد مرزا محمود بیگ صاحب (سابق پرنسپل دلّی کالج) نے بھی اپنے مخصوص اندازِ بیان کے ساتھ اپنے اور آغا صاحب کے بچپن کی دلی کا موازنہ بڑے خوب صورت انداز میں کیا اور اس طرح اس حسین شام کو اور حسین بنا دیا۔

## ٹیچرس ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مقابلۂ بیت بازی

۱۰ ، مارچ کو ''اوکھلا'' اور اس کے نواح میں زبردست ژالہ باری ہو رہی تھی۔ لیکن ٹھیک اسی وقت ٹیچرس ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہال میں ایک زبردست انٹر کالج بیت بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

شانِ حیدر (سکریٹری بزم ادب) نے ایک شعر پڑھ کر بیت بازی کا آغاز کیا۔ اس مقابلہ میں ٹیچرس کالج۔ جامعہ کالج لیڈی سری رام کالج ہندو کالج اور دلّی کالج کی ٹیموں نے مقابلہ میں حصّہ لیا ـــــ

تقریباً ایک گھنٹہ بعد جب انور صدیقی صاحب اور چودھری معروف صاحب (جو جج کے فرائض انجام دے رہے تھے) مقابلہ میں حصہ لینے والوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے چلے گئے تو اس دوران میں عطیہ روحی صاحبہ اور جمیل صاحب نے ایک ایک غزل ترنم سے مرحمت فرمائی۔

جلد ہی جج صاحبان واپس تشریف لے آئے۔ اور انہوں نے مندرجہ ذیل فیصلہ سنایا۔

کپ برائے بہترین ٹیم = دلی کالج
اوّل = ناہید تاج قریشی دلی کالج
دوم = شاہد احمد دلی کالج
سوم = عطیہ روحی جامعہ ملیہ اسلامیہ

---

## جامعہ کالج میں مقابلہ غزل سرائی---

۱۱ مارچ شام تین بجے جامعہ کالج نئی دہلی میں غزل سرائی کا انٹر کالج مقابلہ ہوا۔ مقابلے میں دلی کالج۔ دلی یونی ورسٹی۔ ہندو کالج۔ لیڈی شری رام کالج۔ ٹیچرز کالج اور جامعہ کالج کی ٹیموں نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض پروفیسر محمد مجیب صاحب نے انجام دیئے۔

ٹرافی جس کا نام جگر ٹرافی رکھا گیا ہے، دلی یونی ورسٹی کی ٹیم نے حاصل کی --- دیگر انعامات درج ذیل ہیں۔ آخر میں بزم ادب کے سکریٹری محمد اکرم فرشوری نے مہمانوں کا "استقبال" اور شکریہ ادا کیا۔

پہلا انعام --- مس وینا کپور --- لیڈی شری رام کالج
دوسرا انعام --- مس انیسہ بیگم --- دلی یونیورسٹی
تیسرا انعام --- سہیل احمد --- جامعہ کالج نئی دہلی

### خصوصی انعامات

روپ کمل جیٹلی --- ہندو کالج
مسٹر بھنڈاری --- جامعہ کالج

---

## نظام لکچرز کے تحت پروفیسر محمد مجیب صاحب کا حضرت نظام الدین اولیاؒ کے اخوتِ انسانی سے متعلق نظریات کو خراجِ تحسین

شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی پچھلے چار سال سے نظام اردو لکچرز کا اہتمام کرتا ہے۔ امسال یہ لکچر ۱۶ اور ۱۷ مارچ کو ٹیگور ہال دلی یونی ورسٹی میں منعقد ہوئے مشہور مورخ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے پہلے دن حضرت نظام الدین اولیاء کے حالاتِ زندگی اور دوسرے دن ان کی تعلیمات پر خطبات پڑھے۔

پہلے دن جناب کے۔ این۔ راج صاحب (وائس چانسلر) نے صدارت فرمائی۔ دوسرے دن پروفیسر سروپ سنگھ (پرو وائس چانسلر) نے صدارت کی۔ اور آخر میں صدارتی تقریر بھی کی۔ بعد ازاں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

ان لکچرز کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہوئی کہ امسال دعوت ناموں اور تعارفی پمفلٹ سے اردو غائب تھی۔ اردو دوست حلقوں کی طرف سے اس پر شدید حیرت کا اظہار کیا گیا۔ کہ پچھلے برسوں کے برخلاف اس مرتبہ غالباً اس کی دانستہ کوشش کی گئی۔ کہ ہم جیسے عامیوں کو یہ معلوم نہ ہونے پائے یہ لکچرز اردو میں ہیں یا انگریزی میں۔

باقی صفحہ نمبر ۲۳ پر ملاحظہ فرمایئے

---

صفحہ ۴۲ کا بقیہ

(۱) محمد نجیب خاں متعلم یازدہم اے، صدر (۲) سید انیس الحسن متعلم یازدہم اے نائب صدر (۳) ریاض احمد متعلم یازدہم اے سکریٹری۔ (۴) معراج الدین یازدہم اے جوائنٹ سکریٹری ---

(آخری قسط اگلے شمارے میں دیکھئے)

دوسری قسط

# فتحپوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول دہلی

## ایک نظر میں

جناب زین العابدین صاحب ایم، کامل، بی، ایڈ پرنسپل اسکول ھذا

(گذشتہ سے پیوستہ)

فتحپوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول دہلی کے قدیم ترین اسکولوں
میں سے ایک ہے۔ ۲۸ فروری سنہ ء کو اسکول کے سالانہ جلسہ
میں پڑھی گئی پرنسپل صاحب کی رپورٹ مختصراً پیش کی جارہی ہے۔

طلبہ ملک و قوم کے معمار ہی نہیں بلکہ مستقبل کے
شہری بھی ہیں وہی قومی ترقی کی بنیاد ہیں۔

## طلبہ

الحمدللہ اس اسکول کو اپنے طلبہ کے تعلم وضبط اور صلاحیتوں
پر فخر ہے وہ بھی اپنی فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر میدان میں
گوئے سبقت لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اچھے طالب علم ہیں وہاں
وہ دیگر سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ اس وقت طلبہ کی
مجموعی تعداد ۱۵۰۷ ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی تنگی کی وجہ
سے بہت سے طلبہ کو داخلہ سے مایوس ہونا پڑتا ہے لیکن
ہمیں قوی امید ہے کہ عنقریب اسکول میں نئے کمروں کے اضافے
کے بعد یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اسوقت چھٹی سے گیارھویں
جماعت تک بیس سیکشن ہیں۔

## تعلیم

اس مادی دور میں آرٹس کی تعلیم کے ساتھ
ساتھ کامرس اور سائنسی تعلیمات بھی
نہایت ضروری ہیں اب راکٹ، لونا، اپالو، اور ایٹمی ایجادات
کا دور ہے۔ اور انسان تسخیر ماہ کر چکا ہے اس لئے اسکول
کے ارباب اختیار کی نظر تعلیم کے ہر پہلو پر رہی ہے۔ بایں وجہ
چار سال قبل اسکول میں انجینئرنگ گروپ کی سائنس کا اجرا
کردیا گیا تھا۔ اب اسکول کی تعلیمی سرگرمیاں شعبہ وار ملاحظ
ہوں۔

## شعبۂ آرٹس

اس شعبہ کے تحت انگریزی، اردو،
فارسی، عربی، ریاضی، ہندی، سنسکرت،
اقتصادیات، تاریخ اور ڈرائنگ جیسے اہم مضامین کی تعلیم
اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی ہے۔ اس شعبہ میں نہایت قابل،
تربیت یافتہ اور تجربہ کار اساتذہ تعلیم کے جملہ فرائض
انجام دے رہے ہیں علم و تمدن اور تاریخ کے طلبہ
کو گذشتہ مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے، نیز علم و تمدن کے
طلبہ کو پارلیمنٹ کی کارروائی دکھائی جاتی ہے اسکول میں ایک
عربک سوسائٹی بھی ہے جس کے روح رواں عربی کے
استاذ جناب محمد نبی صاحب ہیں ان کی سربراہی میں عربک
سوسائٹی نے عربی کے کمرے کی تعمیر، فرنیچر کی فراہمی اور عربی
لائبریری کے قیام میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے اس سوسائٹی
کی کوششیں دوسرے مضامین کے لئے بھی مشعل راہ بن
سکتی ہیں محمد نبی صاحب بذات خود ایک ایسے سرگرم اور
مستقل مزاج کارکن ہیں جن پر یہ ادارہ اور بالخصوص
عربی کا شعبہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے گذشتہ دو سالوں میں

[illegible]

سکول کی تعمیری جد و جہد میں نبی صاحب موصوف کی دن
ت کی کاوشیں قابل صد ستائش ہیں ۔

## شعبۂ کامرس

تعلیم کا ایک نہایت مفید شعبہ ہے مغربی اقوام کی بالادستی محض تجارت
ہی کرشمہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجارت
ترغیب دی ہے۔ یہ امر باعثِ خوشی ہے کہ یہاں کامرس
تعلیم کا نہایت معقول انتظام ہے اور اس شعبہ کے اوسطاً
نا بچ ہمیشہ ۹۰ فیصدی رہتے ہیں کامرس کے طلبہ اسکول
لے تعمیری کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ پچھلے
ن سالوں سے اسکول میں کامرس سوسائٹی جناب ڈاکٹر
سد محبوب صاحب صدیقی کی نگرانی میں بحسن وخوبی کام
ر رہی ہے۔ یہی سوسائٹی اسکول میں ایک بچوں کی دوکان
لا رہی ہے ۔ اس کے منافع کا ایک حصہ غریب اور نادار
بہ کی امداد پر اور ایک حصہ اسکول کی فلاح و بہبود پر
رف کیا جاتا ہے اور ایک حصہ شیئر ہولڈرس میں تقسیم کیا جا
ہے اسطرح طلبہ کو تجارت کی عملاً تربیت دی جاتی ہے۔
س شعبہ میں بک کیپنگ اینڈ اکاؤنٹس اور طریقۂ تجارت
سواشیات کے علاوہ عربی، فارسی، ریاضی، اردو،
نگریزی، اور ہندی کی تعلیم بھی دیجاتی ہے ۔

## شعبۂ سائنس

اس شعبہ میں ہمارے یہاں انجینیرنگ گروپ کے مضامین
ہنی علم فزکس، کیمسٹری، ریاضی اور میکنیکل ڈرائنگ
تعلیم دی جاتی ہے کیمسٹری اور فزکس کے تجربات کے
لئے علیحدہ علیحدہ تجربہ گاہیں موجود ہیں اور سائنس کے
اساتذہ حتی المقدور اس کوشش میں مصروف ہیں کہ
سائنس معیار کو بہتر بنایا جائے ۔ اور سال گذشتہ کے
مقابلہ میں اس سال بہتر نتیجہ پیش کیا جائے ۔ اس کے
لئے ہمیں انتھک کوشش کرتی ہے کیونکہ ہمیں ابھی
ل سائنس کے مناسب سامان اور تجرباتی آلات کی
ن کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے میں اس سلسلہ میں پرامید
ہوں کہ ہمدردان ملت اس شعبہ کی پریشانی کی طرف

بھی اپنی توجہ مبذول فرما کر ہم کو اس بات کا موقع دیں
گے کہ اس شعبہ سے ہم طلبہ اور قوم کی خاطر خواہ خدمت
کر سکیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ سال گذشتہ
سے اس شعبہ میں ایک سائنس کلب کا قیام عمل میں
آگیا ہے اور طلبہ اساتذہ کی صلاحیتوں سے فائدہ
اٹھا کر سائنس کے مضامین میں دلچسپی لینے لگے ہیں ۔

## اخلاقی اور دینی تعلیم

طلبہ کی ہمہ گیر تربیت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ان
کے لئے اخلاقی اور دینی تعلیم بھی ضروری ہے ایک متوازن
زندگی ہی انسانیت کا نچوڑ ہے اس لئے اسکول شروع
ہونے سے پہلے روزانہ پندرہ منٹ اخلاقیات اور
دینیات کا درس دیا جاتا ہے اس لئے ہم اپنے رفیق کار
جناب حکیم مختار احمد فلک کاکوروی کے شکر گذار
ہیں جو اپنے شیریں و نطق و بیان سے طلبہ کو روزانہ
مستفیض فرماتے ہیں ۔ سکنڈ شفٹ میں نمازوں کے
اوقات کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے سال گذشتہ
موسم گرما کی تعطیلات میں جمعیۃ بلڈنگ میں دینیات
کی تعطیلات کا بندوبست کرایا گیا آئندہ کے لئے ہمارا
پروگرام یہ ہے کہ ہر جماعت کے لئے دینی نصاب
کی تشکیل دی جائے اور سال کے آخر میں باقاعدہ
امتحان لیا جائے ۔

## فزیکل ایجوکیشن، کیمپ اور اسپورٹس

صحت مند دماغ کے لئے صحت مند
جسم کی ضرورت ہے لہٰذا اسکول میں فزیکل ایجوکیشن لازمی
ہے۔ ہفتہ میں ہر جماعت کے لئے تین پیریڈس پی، ٹی
کے لئے مہیا کئے گئے ہیں۔ اس کام کے لئے دو تجربہ کار پی
ای ٹیچر کی خدمات اسکول کو حاصل ہے ۔ اسکول میں سینیر
اور جونیر فٹ بال اور کرکٹ کی ٹیموں کو تربیت دی جاتی
ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اسکول کا اپنا کوئی گراؤنڈ نہیں ہے۔

... اس سال محمد عاقل ہفتم، ہم اور شریف الدین
ہم جماعت ششم و سرور بیگ 18 X دہلی اسٹیٹ اور دہلی اسکولس
کی نمائندگی کی۔

پچھلے دو سال سے نیشنل یعنی شیسی ڈرا بیور کی اسکیم پر بھی
شروع کر دیا گیا ہے اس اسکیم کے تحت طلبہ مختلف مقابلوں
میں شرکت کرتے رہتے ہیں اور ہونہار طلبہ محکمہ کی طرف سے
سرٹیفکٹس دیے جاتے ہیں۔

اس سال اسکول کی جونیئر فٹ بال ٹیم زونل ٹورنامنٹ
کے فائنل تک پہنچ گئی اور سینئر ٹیم سیمی فائنل تک پہونچ
گئی۔ زونل فٹبال ٹیم میں محمد فاروق 8 A X ، نیم ظفر 9 A
شریف الدین C 7 نے بہت اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔

## این، سی، سی

طلبہ کو تعلیم کے ساتھ فوجی تربیت
بھی دی جاتی ہے تاکہ طلبہ بحیثیت
ایک فوجی کے ہنگامی حالات
میں ملک کے اندرونی نظم و نسق کو بخوبی سنبھال سکیں۔ اس
وجہ سے ہمارے اسکول میں N. C. C کے دو ڈویژن
سینئر اور جونیئر کیڈٹس پر مشتمل ہیں جس میں طلبہ اپنے دیرینہ جذبہ
کا شاندار مظاہرہ کرتے ہیں یہ کام جناب آر ظفر دلسیلی صاحب
کی زیر نگرانی بحسن و خوبی چل رہا ہے اس سال ہمارے کیڈٹس
نے ہماچل اسٹیٹ ہماچل پردیش میں منعقدہ N. C. C
کیمپ میں شرکت کی اور فوجی تربیت پائی۔ اس کے علاوہ این۔
سی۔ سی کمانڈر سلیم الدین درجہ دہم اے کی خدمات باعث
فخر ہیں۔

## اسکاؤٹنگ

اسکاؤٹنگ ایک عالم گیر نیم فوجی
اور سماجی تنظیم ہے ہمارا اسکول
اس تحریک میں تنظیم اعتبار کا اک کردار رکھتا ہے خوش قسمتی سے ہمارا
اسکول سٹی ڈسٹرکٹ کے سالانہ ٹریننگ کیمپوں میں ہمیشہ
امتیازی شان حاصل کرتا جا رہا ہے اسکول کا ایک طالب علم
اخلاق پریسیڈنٹ اسکاوٹ بن چکا ہے۔ ہمارے
اسکاؤٹس نے الہ آباد اور کلیانی (مغربی بنگال) کی جمبوریوں
میں شرکت کرتے ہیں۔ سال گذشتہ کی موسم گرما کی تعطیلات میں
ہمارے اسکول کے پانچ طلبہ محمد نجیب حامد یازدہم، عمار
یازدہم عبیاء العابدین ہفتم، انعام الرحمن نہم اور محمد اقبال
ہفتم نے جناب محمد نبی صاحب کی سربراہی میں مدھیہ پردیش
میں پچمڑی کے مقام پر منعقدہ کیمپ میں شرکت کی۔ یہ
کیمپ مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے قومی یکجہتی کو فروغ
دینے کے سلسلے میں منعقد کیا گیا تھا اس کیمپ میں موسیقی
ڈرامہ تقریر اور مصوری میں امتیازی درجہ حاصل کرنے پر
شریک طلبہ کو سرٹیفیکیٹس بھی دیے گئے۔ جناب محمد نبی
صاحب کو چارٹس اینڈ پینٹنگ میں اول انعام ملا جس کے
لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں

علاوہ ازیں اسکاؤٹس مختلف مواقع پر سوشل سروس
انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہر سال جمعۃ الوداع کے موقع پر
جامع مسجد کیمپ میں وہ حتی المقدور عوام کی خدمات کا شرف
حاصل کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اسکول کو چند نہایت تجربہ
کار اور تربیت یافتہ اسکاوٹ ماسٹرس کی خدمات حاصل
ہیں۔

## اسکول پارلیمنٹ

آزاد ہندوستان میں
جمہوری قدروں کے نشو و
نما کے لئے یہ ضروری ہے
کہ طلبہ کو جمہوریت کے لوازم کی تربیت دی جائے انہیں
اپنے ووٹ کی قدر فرض شناسی نیز حقوق شناسی کا سبق
دیا جائے تاکہ مستقبل کے یہ شہری صحیح جمہوری تربیت حاصل
کرکے اپنے ملک کی جمہوریت کو کامیاب بنا سکیں اس مقصد کے
حصول کے لئے اسکول میں پارلیمنٹ کا قیام کیا گیا ہے۔ اسکول
پارلیمنٹ مدت دراز سے جناب منیر الحسن صاحب منیر جھنجھانوی
کی زیر نگرانی شایان شان کام انجام دے رہی ہے۔

پارلیمنٹ کے اس سال کے عہدیداران کے نام حسب
ذیل ہیں:۔

باقی صفحہ نمبر ۳۹

... امر شاہجہاں دہلی

# دلی شاہجہاں

طالب علموں کا ، طالب علموں کے لئے ، طالب علموں کے ذریعے

اکتوبر ــــــ ۱۹۷۰ء

جلد ـــ ۴ ـــ شمارہ ـــ ۱۰

فی پرچہ ــــــ پچیس پیسے

سالانہ ــــــ تین روپئے




شاہجہاں میں شامل افسانوں میں نام ، مقام و واقعات قطعی فرضی ہیں ۔ کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے ۔ جس کے لئے ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں ۔

شاہجہاں آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل ( A.I.S.N.E.C ) نئی دہلی کا ممبر ہے ۔

## ہمارے مقاصد

طالب علموں ــــــ
ــــــ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا
ــــــ کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا
ــــــ کو ملک و ملت کی بامقصد خدمت کے لئے تیار کرنا
ــــــ میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا
ــــــ کی آواز کو عوام تک پہنچانا
ــــــ کو اخلاق ، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا ــــــ اور
ــــــ سماجی اصلاح کے لئے جد و جہد کرنا

ادارہ

شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین ، افسانے اور غزلیں و نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے ۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول و کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں ۔

ادارہ




طابع ، ناشر و مالک محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

مقام اشاعت :- قاسم جان اسٹریٹ بلی ماران دہلی نمبر ۶

# جرعات

## ادب



## ترجمہ



## افسانے



## غزلیں



## مزاح



## مستقل عنوانات

# لمحۂ فکر

اداریہ

**آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی**
**اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی**

ہم پچھلے دو ماہ سے شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کی بدعنوانیوں اور ایم۔اے اردو کے طلباء کی جائز شکایات پر لکھ رہے ہیں۔ ...ں بہت سے حضرات نے یہ روش ترک کرنے کے لئے کہا۔ مختلف باتوں سے خوف زدہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن ہم ا... ان ...بدعوں کو صاف صاف بتا دینا چاہتے ہیں کہ حق بات کہنے میں ہم ذرا بھی خوف نہ محسوس کرتے ہیں نہ کریں گے۔ شاہ جہاں طلباء کا ...رسالہ ہے۔ جس کے لئے وہ خود لکھتے ہیں، خود کتابت کرتے ہیں، خود ایڈٹ کرتے ہیں اور خود چھپواتے ہیں۔ کسی بھی مقام پر طالب ...ں کے ساتھ زیادتی ہوگی ہمارا قلم چلے گا اور ضرور چلے گا۔

جیسا کہ ہم پچھلے شماروں میں لکھ چکے ہیں کہ اردو ایم۔اے کا امتحان دیگر مضامین کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ نتائج نکلنا شروع ...ئیے۔ اور آہستہ آہستہ تمام مضامین کے رزلٹ آؤٹ ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان مضامین کا بھی پہلے اعلان ہوا جو ایم۔اے۔ اردو کا امتحان ...ہو جانے کے بعد تک جاری رہے تھے۔ حکام دہلی یونیورسٹی سے طلباء نے جب دریافت کرنا چاہا تو کوئی معقول جواب نہ ... اس ...ے اردو طلباء میں بے چینی بڑھتی رہی۔ آخر کار انھوں نے صدر شعبہ اردو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب سے رابطہ قائم کرنا ...ا۔ معلوم ہوا کہ دہلی تشریف نہیں رکھتے۔ اس طرح طلباء نتیجہ جاننے کے لئے سرداں دواں بھٹکتے پھرتے رہے۔ بالآخر نتیجہ ...۔ نتیجہ اتنا لیٹ نکلا کہ طلباء کو ذہنی طور پر، تعلیمی سطح پر اور مالی طور پر زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر صدر شعبہ اردو چاہتے تو ...م۔اے اردو کا نتیجہ بھی دیگر مضامین کی طرح وقت پر نکل سکتا تھا۔ لیکن نتیجہ لیٹ کیوں کیا گیا۔ یہ ایک معمہ ہے۔

۱۱ر جولائی ۱۹۷۰ء کا دن شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی اور اس شعبہ سے متعلق ایم۔اے اردو کے لئے طلباء کے لئے منحوس ...ین دن تھا۔ اس روز نتیجہ نکلا اور اس نتیجہ سے حامیانِ اردو کو سخت مایوسی ہوئی۔ ایم۔اے (اردو) سالِ آخر میں ۴۶ طلباء ...نے شرکت کی۔ ان ۴۶ طلباء میں سے صرف ۴ طلباء نے فرسٹ ڈویژن (مارجن پر) ۲۸ طلبا نے سیکنڈ ڈویژن اور ۱۳ طلباء

نے تھرڈ ڈویژن حاصل کی۔ نتیجہ اس قدر "گندہ" کیوں نکلا۔ یہ ایک معمہ ہے۔ اور اس معمہ کا میل اور بیان کئے گئے معمہ سے ملانا غلط نہ ہوگا۔ اس قدر گندہ نتیجہ نکلنے پر ہر طرف حیرانی اور مایوسی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

شاہجہاں کے نمائندہ نے ایم۔ اے اردو کے ان طلبا سے رابطہ قائم کیا جنہوں نے اس امتحان میں شرکت کی تھی اور پھر ان سے نتیجہ پر تبصرہ کرنے کو کہا تو معلوم ہوا کہ ہر طالب علم نتیجہ کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ طلبار کا کہنا تھا کہ ہمارے اساتذہ نے ہمیں دل و جان سے محنت کرائی تھی۔ ہم نے خود بھی محنت کی لیکن اس نتیجہ نے تو ہمارے دل و دماغ خراب کر دیئے ہیں۔

جب اردو کے اساتذہ سے رابطہ قائم کیا گیا تو نتیجہ کے سلسلہ میں انھیں بھی حیران و پریشان پایا۔ اساتذہ کا کہنا تھا کہ طلبار نے حقیقت میں بے انتہائی محنت کی تھی۔ اور ایم۔ اے کا نتیجہ اس قدر خراب نکلنے پر طلبار کی مشاورتی کمیٹی نے ایک پوسٹر بھی نکالا تھا جو یونیورسٹی کیمپس میں دیکھا گیا۔ (اس پوسٹر کا مضمون اس شمارے میں دیا جا رہا ہے)

پروفیسر ڈاکٹر راج (وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی) چونکہ اپنی انصاف پسندانہ رائے کے لئے طلبا اور یونیورسٹی حکام میں بہت مقبول ہیں اسی لئے ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر راج صاحب طلبار کی شکایات پر ہمدردانہ غور فرما کر ان کی بے چینی کو دور فرمائیں گے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہم ایک بار پھر صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کو [illegible] تے ہیں کہ وہ بھی شاہجہاں کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار فرما کر طلبہ کو مطمئن کریں۔

مدیر

شعبہ اردو دلی یونیورسٹی سے متعلق جو پوسٹر ام. اے. کے رزلٹ کے بعد یونیورسٹی کیمپس میں دیکھا گیا اسکی نقل بجنسہ کی جارہی ہے ——

---

شعبہ اردو دلی یونیورسٹی کے سنہ ء کے نتائج کے پیش نظر

# صدر شعبہ کو برطرف کیا جائے

## وائس چانسلر سے طلباء کی اپیل

شعبہ اردو ، دلی یونیورسٹی کے سنہ ء کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے ۔ جو نہ صرف اردو کے طلباء بلکہ اردو کلاسیز میں آئندہ داخلہ لینے والوں کیلئے بھی انتہائی مایوس کن اور لمحۂ فکر بن گیا ہے۔ یہ نتائج اس بات کے غماز ہیں کہ شعبہ کے صدر خواجہ احمد فاروقی صاحب اپنی آمرانہ کارروائیوں کی وجہ سے شعبہ میں موثر چار ریڈرز اور آٹھ لکچرارز کے باوجود دس سال کے طویل عرصے میں صرف تیس (۳۰) طلباء میں بھی کوئی صلاحیت پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں ۔ اس طرح جہاں نوجوان طلباء کے قیمتی دو (۲) سال ضائع ہوتے ہیں وہاں یونیورسٹی کے مالی بجٹ کا ایک بڑا حصہ صرف ایک شخص کی انا پر بے کار صرف ہوتا ہے ۔ تعجب ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران کی نظر شعبہ اردو کے صدر کے گذشتہ سالوں سے رچے جانے والے اس کھیل کی طرف نہیں گئی شعبہ کے صدر نہایت اطمنان و سکون کے ساتھ امتحان کے نتائج اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ مستحق طلباء کے حقوق کو پامال کرتے ہیں اور طلباء و اساتذہ پر بے تاج بادشاہی فرماتے ہوئے ہیں ۔

اس لئے یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب سے ہماری مؤدبانہ درخواست ہے کہ شعبۂ اردو کے نتائج اور دیگر معاملات پر تحقیقی نظر فرمائی جائے اور جس طرح شعبہ ہندی کے لئے اصلاحی تدابیر اختیار کی گئی ہیں اسی طرح شعبہ اردو کے مسلسل کئی سال سے چلے آنے والے صدر کو تبدیل کرکے طلباء کے لئے معیاری تعلیم اور مستحق طلباء کے حقوق کی حفاظت کا بندوبست فرمایا جائے ——— امسال اردو کلاسیز میں داخلہ لینے کا ارادہ رکھنے والے طلباء کی بڑی تعداد اردو کلاسیز کے نتائج اور صدر شعبہ کی عادات سے خائف ہے۔ اسلئے یونیورسٹی کے تمام طلباء سے اپیل کیجاتی ہے کہ اپنے ساتھیوں کی امداد کیلئے آواز اٹھائیں اور شعبہ اردو کے صدر کو بدلنے میں وائس چانسلر صاحب سے تعاون کریں ۔——

مشاورتی کمیٹی طلباء اردو ، دلی یونیورسٹی ، دہلی۔

اداکنوبر ۱

شاہجہان دہلی

# دورِ عباسی میں عربی شاعری کے نئے رجحانات

ظفر علی خاں
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عباسی حکومت سیاسی، سماجی اعتبار سے اموی دور سے بہت مختلف تھی۔ اموی دور میں عرب قوم بدویانہ اور سادہ زندگی گزارتی تھی۔ لباس، کھانا، پینا ہر چیز میں سادگی تھی۔ لیکن عباسی دور میں عربوں پر پوری طور سے ایرانی رنگ چڑھ گیا تھا۔ انھوں نے بہترین قسم کے محل بنائے۔ اعلیٰ قسم کے سجے آراستہ گئے۔ موٹے کپڑوں کی جگہ ریشمی اور اعلیٰ قسم کے کپڑے استعمال میں آگئے۔ البتہ سرکاری اور عوام کی زبان عربی ہی رہی۔ یہ بھی وہ دور ہے جس میں دوسری قوموں اور تہذیبوں سے مختلف علوم وفنون کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

عباسی دور یا عباسی حکومت کی مدت پانچ سو سال سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ دور ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ میں ہلاکو کی تباہی پر ختم ہوتا ہے۔

اس دور میں دوسرے فنکاروں کی طرح شاعروں نے بھی شہری زندگی اور شہری اخلاق و عادات اپنالی تھیں۔ جب کہ اس سے پہلے دور میں شعراء کی زیادہ تعداد بدوی تھی۔ ان کے سامنے صحرا ہوتا یا دھول اڑاتی ہوئی ہوائیں۔ اور دشمنوں کا خوف۔ ان کا ساتھی انکا گھوڑا تھا یا ان کی بہادری۔ لیکن عباسی دور میں شعراء محلوں میں رہتے۔ جہاں بہترین حوضیں اور پارک ہوتے۔ اور اعلیٰ قسم کے قالین اور پردے استعمال کئے جاتے۔ یونانی اور فارسی علوم کی اشاعت سے اسلام کی بندشیں ڈھیلی پڑگئی تھیں۔ شعراء جو چاہتے تھے وہ کرتے۔ اور جو جی میں آتا کہتے۔ شرم و حیا ختم ہوگئی تھی۔ شراب اور گانے بجانے کی محفلیں عام ہوگئی تھیں۔ شعراء، خلفاء اور امراء کے ہم نشین ہونے کی وجہ سے ان سب چیزوں میں آگے تھے۔

ظاہر ہے اس زندگی اور اذہان کی تبدیلی کا شاعری پر براہ راست اثر پڑا اور عباسی دور کی شاعری، اموی دور کی شاعری سے بہت بدل گئی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اموی خلفاء و امراء عرب اور عربوں کو دوسری قوموں اور ان کی تہذیب پر ترجیح دیتے تھے۔ زیادہ تر شعراء بدوی تھے اور بصرہ، کوفہ، حجاز و نجد سے متعلق تھے۔ اس کے برخلاف عباسی خلفاء اور حکومت غیر عرب کو ترجیح دیتے۔ اور عربوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے منصور کو یہ مشورہ بھی دیا کہ خانہ کعبہ کے قائم مقام ایک عبادت خانہ عراق میں بنا لیا جائے تاکہ ان اطراف کے لوگ یہیں حج کر لیا کریں۔ اور انکو حجاز نہ جانا پڑے۔ منصور نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔

چونکہ شعراء کسی قسم کی سیاسی و سماجی اور اخلاقی و ادبی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے، اس لئے عباسی شاعری میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ لفظی اعتبار سے بھی، معانی و مطالب اور اسلوب کے اعتبار سے بھی۔ دوسرے الفاظ میں شعر کے تینوں اجزاءِ ترکیبی میں تبدیلی آئی۔ میرا مطلب ہے خیالِ شعری، جس کو معنیٰ کہتے ہیں۔ دوسرے وہ قالب جس میں وہ معنیٰ ڈھالے جائیں۔ یعنی کلام موزوں، مقفیٰ یا نظم، تیسرے الفاظ۔

اگرچہ صدر اسلام اور بنی امیہ کے دور کی شاعری جاہلی شاعری سے اسلوب و معانی میں کہیں اچھی تھی لیکن امویوں کے اس اعتقاد نے کہ جاہلی شعراء اور ان کا کلام اصل ہے، ان سے اچھا کلام کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ان کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ جاہلی شعراء کی پیروی کریں۔ لیکن عباسی دور میں ناقدین نے ان کی کمزوریوں کو ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ ادبا میں سب سے پہلے ابن قتیبہ نے اپنی کتاب الشعر والشعراء میں تنقید کی ہے۔ جب کہ شعراء نے عباسی دور کے شروع ہی میں ان قیودات اور حدود کو پھلانگنا شروع کر دیا تھا۔ جو جاہلی شعراء اور اموی شعراء نے لگا رکھی تھیں۔ جیسا کہ مطیع ابن ایاس کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

لاحسن من بید یحاربھا القطا
ومن جبلی طی و صفکما سلعا
تلاحظ عینی عاشقین کلاھما
له مقلة فی وجه صاحبه ترعی

ابو نواس کے ان اشعار سے بھی قدما کے طریقہ سے انحراف کرنا ثابت ہوتا ہے۔

لا تبك ليلى ولا تطرب الى هند
واشرب على الورد من حمراء كالورد
صفة الطول بلاغة القدم
فاجعل صفاتك لابنة الكرم

ابو نواس کے بعد والے شعراء ابو العتاھیۃ وغیرہ نے اس کی تقلید کی۔ اس طرح مندرجہ ذیل خصوصیات اس دور کی شاعری میں ظاہر ہو گئیں۔

۱۔ اس دور میں شعراء نے غریب الفاظ، مبہم تراکیب اور مغلق عبارتوں سے اپنے کلام کو پاک کیا۔ اب ان کے کلام کو سمجھنے کے لئے پرانی لغات یا اسالیب کے دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ مثلاً ابن الوردی اپنے طویل قصیدے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کو اپنا کلام سنا رہا ہے۔ وہ غریب الفاظ اور غیر واضح تراکیب سے نفرت کرتا ہے۔ تقریباً یہی خصوصیت آپ کو ابو نواس، صریع الغوانی مسلم بن الولید، ابن المعتز، ابو العتاھیہ، بحتری اور بشار کے یہاں ملے گی۔ نمونہ کے لئے عباس بن الاحنف کے یہ اشعار درج ذیل ہیں۔

لاجزی الله دمع عینی خیرا
وجزی الله کل خیر لسا
نم دمعی فلیس یکتم شیئا
ورأیت اللسان ذا اکتما
کنت مثل الکتاب اخفاہ طی
فاستدلوا علیه بالعنوا

۲۔ اس دور میں کثیر مشاہدات اور نئے تمدن کی طرف لانے چیزوں کی وجہ سے شاعری میں عجمی الفاظ کی کثرت ہوگئی۔ مثلاً ابو کے اس شعر میں طرجہار فارسی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

وعلفنا عنی المدامة فیه
فرأینا النھا فی الطرجهـ

اسی طرح ابن معتز کے اس شعر میں دوشاب کا استعمال

لا تخلط الدوشاب فی قدح
بصفاء الماء طیب الـ

۳۔ اس دور کا اسلوب بیان نہایت خوب صورت اور واضح ہے۔ اور شعراء نے دمن، اطلال اور بکا الدیار کو چھو محلات، ان کے آرام و آسائش، دوستوں کے ساتھ اٹھنا شراب کی تعریف، باغات کی منظر کشی کو اپنا لیا۔ اب مدحیہ قص میں اطلال وغیرہ کی جگہ نئی چیزوں کا تذکرہ آنے لگا۔ مثلاً ابو ہادی کے لئے مدحیہ قصیدہ کہتا ہے۔ تو شروع میں محلات، شراب ساقی وغیرہ سب کی تعریف کرتا ہے۔

اس دور میں مختلف تہذیبوں کے ملنے اور مختلف عناصر کے ا نے جس طرح الفاظ اور اسلوب پر اثر ڈالا اسی طرح شعر کے معانی مفہوم پر بھی اثر انداز ہوا۔ کیونکہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی تبا سے وہاں کے لوگوں کی فکر و شعور اور خیالات پر بھرپور اثر ہونا چنانچہ عباسی دور کی شاعری پر بھی کافی اثر ہوا جس کو ذیل بیان کر ہے۔

۱۔ قصیدے کے اجزاء میں باہم ارتباط اور فکر میں ترتیب تسلسل ہوتا ہے۔ بشار بن برد کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یزهدنی فی حب عبدة معشر
قلوبهم فیها مخالفة

شاہ

قلت دعوا قلبی وما اختار وارتفی
فبالقلب لا بالعین یبصر ذو الحب
اتبعوا العینان فی موضع الهوی
ولا تسمع الاذنان الامن القلب

ان اشعار میں شاعر اپنی محبوبہ عبدہ سے اپنی محبت کے استحکام
اظہار کرتا ہے۔ لیکن ناصحین سے معذرت کرکے کہتا ہے کہ یہ دل کی
یں ہیں۔ ان کو آنکھوں سے مت دیکھو کیونکہ محبت آنکھ یا کان سے
بھنے کی چیز نہیں ہے۔

اس طرح اس دور کی شاعری میں فکر میں تسلسل اور خیال میں
انی پائی جاتی ہے۔ مقدمات سے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ ان خصوصیات
سب سے آگے ابن الرومی ہے۔ اس کے تمام قصائد اس کی بہترین
لیں بن سکتی ہیں۔

۲۔ خوشحال اور مالداری نے بھی شعراء کو کچھ معنیٰ دیئے۔ مثلاً
ند بن مامون کا یہ شعر۔

م ترا ن الفقر یرجی له الغنی
وان الغنی یخشی علیه الفقر

اس شعر میں زندگی کی کشمکش کی طرف اشارہ ہے جو ایک نادار
امیر بن جانے پر ابھارتی ہے۔ اور ایک دولت مند کو ہر وقت یہ فکر
رہتی ہے کہ اس کی دولت نہ چھن جائے۔ ظاہر ہے یہ خیال محدود
دی زندگی میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ تمام افکار و خیالات بھی اسی زمرہ
آجاتے ہیں۔ جن کو بعد میں زہد اور تصوف کی شاعری کا نام دیا گیا۔
صیل آگے آرہی ہے۔

۲۔ فنون کے پڑھنے سے معانی میں اضافہ ہوا۔ اور ہر شاعر کے
م میں اس کا میلان طبع ظاہر ہونے لگا یہاں تک کہ اشعار پڑھ کر
ں کا علم ہو جاتا ہے کہ شاعر کس مکتب فکر سے متعلق ہے۔ فقیہ ہے
وی یا فلسفی وغیرہ۔ مثلاً اخفش معدن بن مغیلان سے سواری
ب کرنے کے لئے یہ شعر لکھ کر بھیجتا ہے۔

دت الرکوب الی حاجة
فمر لی بفاعلة من دبیب

تو اس نے جواب میں لکھا۔

دبنا یا اخا عامر دکوبا علی فاعل من غریب

۵ آنتو بر نی

اس طرح کے لفظی کھیل عباسی دور کے دوسرے حصہ میں
ظرافت اور خوش طبعی کے لئے عام ہو گئے تھے۔

نئے فنون و علوم کی وجہ سے بعض علمی الفاظ نے بھی شاعری
میں جگہ پائی۔ جیسے تناہی، تولید، معاد وغیرہ۔

۴۔ شاعروں نے منطقی اور فلسفی خیالات کو استعمال کیا۔
لہٰذا ان کا کلام گہرے فکر اونچے فلسفہ اور منطق کا مجموعہ بن گیا۔
جو معانی، ترتیب اور تسلسل کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

بشار کہتا ہے۔

اذا كنت فی کل الامور معاتبا
صدیقك لم تلق الذی لا تعاتبه
فعش واحدًا وصل اخاك فانه
مقارف ذنب مرة ومجانبه
اذا انت لم تشرب مرارًا علی القذی
ظمئت وای الناس تصفو مشاربه
ومن ذا الذی ترضی سجایاه كلها
كفی المرء نبلا ان تعد معایبه

اسی طرح ابو العتاہیہ کا زہد فی الدین، یہ کلام بھی فلسفیانہ انداز
میں ہے۔

۵۔ خیال میں انوکھاپن اور تصویر کشی میں حسن و جمال بھی اس دور
کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کے شعراء نے
عیش و آرام کی ایسی زندگی گذاری جو صدر اسلام اور جاہلی دور کو میسر
نہ تھی۔ ان میں ذوق حسن اور تہذیب کی روشنی آئی تھی۔ جس نے ان کو
بلیغ تشبیہات اور بدیع مجازات و کنایات عطا کئے۔ ابونواس کے ان
اشعار کو ملاحظہ فرمایئے۔ ان میں کتنی خوبصورت تشبیہات استعمال
کی ہیں۔

كأنّ فی مثل ما تهواه قد خلقت
فی رونق الحسن لا طول و قصر
الورد من حمر من خجل
والغصن من خدها یزهو به الثمر
البدر طلعتها والمسك نكهتها
والغصن قامتها ما مثلها بشر

اسی طرح ابن معتز شراب کے لئے بہت خوب صورت تشبیہات استعمال کرتا ہے۔

وامطر الکأس ماء من اناملہ
فانبت الدر فی الارض من الذھب
وسبح القوم لما ان رأوا عجبا
نورًا من الماء فی نار من العنب

## ۶۔ مدح میں مبالغہ

تقریبًا ہر زمانہ میں مدحیہ قصائد کہے گئے ہیں۔ زمانہ جاہلیہ میں کسی کی مدح کی جاتی تو واقع اور حقیقت سے قریب ہوتی اور مبالغہ سے دور۔ لیکن جیسے جیسے عرب قوم حضارہ کی طرف آتی گئی مبالغہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ خصوصًا جب عرب فارسیوں سے خلط ملط ہوتے مبالغہ میں اتنا غلو ہوگیا کہ ناممکن صفات کو ممدوح سے منسوب کرنے لگے۔ اس لئے کہ فارسی شعراء مدح ہی میں نہیں بلکہ تصویرکشی اور حقائق کو بیان کرنے میں مبالغہ کے بہت شوقین تھے۔ عربوں نے بھی ان کی پیروی کی اور وہی مضامین نظم کرنے لگے۔ دیکھئے زہیر بن ابی سلمی کے اس شعر میں کس قدر سادگی اور سچائی پائی جاتی ہے۔

تراہ اذا ماجئتہ متھللا
کانك تعطیہ الذی انت سائلہ

لیکن عباسی شاعر منصور النمری رشید کی مدح میں کہتا ہے۔

خلیفۃ اللہ ان الجواد اودیۃ
احلك اللہ منھا حیث تجتمع
اذا رفعت امرًا فاللہ رافعہ
ومن وضعت من الاقوام متضع
من لم یکن بامین الیہ معتصما
فلیس بالصلوات الخمس ینتفع
ان اخلف القطر لم تخلف مخایلہ
او ضاق امر ذکرناہ فیتسع

ان اشعار میں شاعر مبالغہ کے حدود کو بھی پار کر گیا ہے۔ لیکن شعر و ادب کی دنیا میں مقبول ہونے اسی لئے ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ اشعار اس کے بہترین اور سب سے چھوٹے اشعار ہیں۔

اسی طرح ابی دلف کی مدح میں عکوک کے یہ اشعار ہیں۔

انت الذی تنزل الایام منزلھا
وتنقل الدھر من حال الی حال
وما مددت مدی طرف الی احد
الا قضیت بارزاق و اجال

## الموضوعات والاغراض

شاعری کے اغراض و مقاصد ہر زمانہ میں اجتماعی زندگی اور سیاسی حالات کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں۔ جیساکہ اس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے آپسی تعلقات بدلنے اور تہذیب و علوم کے منتقل ہونے سے بھی شاعری میں نئے موضوعات آتے ہیں۔ اسی لئے شعراء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ حالات کے بدلتے ہوئے رخ کو سمجھیں اور اپنے زمانہ کے خیالات ورجحانات کو سمجھ کر کچھ کہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ پرانے اغراض و مقاصد کو یکسر چھوڑ دیا جائے۔ ہاں ان میں کمی زیادتی ممکن ہے۔ مثلاً مدح میں عباسی شعراء نے یہاں تک مبالغہ کیا کہ ناممکنات اور کفر والحاد تک پہنچ گئے۔ اسی طرح وصف میں ہر اس چیز کو شامل کرلیا جس کو وہ کرسکتے تھے۔ محل، باغ، لہو ولعب کی مجالس اور شراب وکباب کی خوب خوب تعریف کی۔ بعض معانی قدیمہ کو یکسر چھوڑ دیا اور ان سے نفرت کا اظہار کیا گیا۔ مثلاً وقوف بالدیار، بکاء الاطفال وغیرہ۔

کچھ نئے موضوعات بھی اس زمانہ میں شاعروں کو ملے۔ مثلاً غزل بالمذکر، معنیین کی ہجو، فحش گوئی، مختلف کھانوں کی توصیف، حکایات، قصے، اور مختلف علوم کے قواعد کو نظم۔ ان تمام میدانوں میں ابونواس کو امام مانا جاتا ہے۔ جس کے قصائد شراب، ساقی، اور جام سے شروع ہوتے ہیں۔ اور اس کا خیال ہے۔

لاتبك لیلی ولاتطرب الی ھند
واشرب علی الورد من حمراء کالورد

اس نے ہمیشہ پرانی روش پر چلنے والوں کی مذاق اڑائی۔

چنانچہ ان ہی خیالات پر رشید نے اس کو قید کر دیا تو مجبوراً اس نے معافی مانگی، لہٰذا اس کو آزاد کر دیا گیا۔

## ا۔ الغزل بالمذکر

عربی ادب میں شاعری کی یہ قسم پہلے نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عباسی دور سے پہلے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے اوامر و نواہی کا احترام تھا۔ اور اتنی خود سری ہنسی تھی۔ جب کہ عباسی دور میں لوگوں کے اخلاق و عادات میں گراوٹ آگئی۔ دین اور اس کے احکام کا احترام جاتا رہا۔ عیاشی، شراب نوشی اور دوسرے لہو و لعب عام ہو گئے۔

استاد محمود مصطفیٰ کا کہنا ہے کہ تمام بری عادتیں ایرانیوں کے عربوں کے ساتھ اختلاط کا نتیجہ تھیں۔ غزل بالمذکر میں سب سے پہلے "حماد عجرد" اور "والبہ ابن الحباب" کا نام آتا ہے۔ ان کے بعد ابو نواس اور حسین بن الضحاک سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد شعراء میں یہ صنف سخن عام ہو گئی۔ یہاں تک عام ہوئی کہ صفات چاہے مؤنث ہی ہوں لیکن ضمائر مذکر ہی لانے لگے۔ بغداد میں کوئی شاعر ایسا نہیں تھا جو کسی نہ کسی لڑکے سے عشق ذکر تا ہو۔ اور اس کے لئے غزلیہ اشعار نہ کہتا ہو۔ ابو نواس کے دیوان میں غزل بالمذکر کے نام سے ایک الگ باب ہے۔ جس میں ایک ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اس بری عادت کے عام ہونے میں بشہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ کیونکہ بعض چاپلوس قسم کے علمانے نبیذ تمر کو حلال کر دیا تھا۔ حالاں کہ اگر اس کو زیادہ دیر تک رکھدیا جائے تو وہ مسکر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے اس فتوے سے عوام نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اور شراب عام ہو گئی۔

اگرچہ اس صنف سخن میں ابو نواس پہلا شخص نہیں۔ لیکن اس نے وہ مہارت حاصل کی کہ اپنے پیش روؤں سے سبقت لے گیا۔ دو شعر بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

ملاحظہ ہو۔

جاء ماء الشباب فی خدیکا
وتلالا البھاء فی عارضیک

ودمی طرفک الکحل بالسحر
ولؤادی فصار رھناً لدیک

۲۔ شاعری کو عرب اور عربوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ یہ صرف اس لئے ہوا کہ خلفاء نے ایرانیوں کو حد سے زیادہ اعزاز دے دیا تھا۔ اور بڑے بڑے مناصب عطا کر دیئے تھے۔

بشار کہتا ہے۔

نبئت قوماً بھم جنة
یقولون من ذا وکنت العلم
الا ایھا السائلی جاھداً
لیعرفنی انا انف الکرم
نمت فی الکرام بنی عامر
فروعی واصلی قریش العجم

۳۔ واعظوں کا بڑی تعداد میں ہونا بھی اس دور کی خصوصیت ہے۔ زہد نے دوسرے فنوں کی طرح ایک فن کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ جس کا سربراہ ابو العتاہیہ کو مانا گیا ہے۔ انھوں نے زہد پر ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رغیف خبز یابس ٭ تاکله فی زاویة
وکوز ماء بلارد ٭ تشربه من صافیة
وغرفة ضیقة ٭ نفسك فیھا خالیة
تدرس فیه دفتراً ٭ مستنداً بساریة

۴۔ شاعری کو ادب سکھانے کا ذریعہ بتایا گیا۔ اور نصیحت آمیز قصہ، کہانیاں نظم کی گئیں۔ مثلاً ابان بن عبد الحمید اللاحقی نے کلیلہ و دمنہ نظم کی۔

۵۔ شاعری کو ہنسی مذاق کے لئے استعمال کیا گیا۔ اس میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا اور جھوٹے قصے گھڑے جاتے۔ جیسے ابو نواس کے یہ اشعار۔

لقد کنا رینا ٭ عن سعید عن قتادة
عن سعید بن مسیب ٭ ان سعید بن عبادة
قال من مات محبا ٭ فله اجر شھادة

۶۔ مختلف علوم کو نظم کیا گیا۔ اس میدان میں سب سے پہلے ابان بن عبد الحمید اللاحقی نے قدم رکھا۔ اس کے بعد دوسرے

لوگوں اس کی اتباع کی۔ عصر عباسی کے ختم ہوتے ہوتے علماء شاعری کے ذریعہ مسائل اور قواعد کو محفوظ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ حدیث الاربعاء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں مشہور کتابوں کو نظم کرنے کی بہ نسبت منظوم کتابیں زیادہ لکھی گئیں۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ کے مسائل میں ایک طویل قصیدہ لکھا گیا۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

قال ابو یوسف المعترض

فرمضان صومه اذا عرض

والصوم فی کفارة الایمان

من حنث ماجری علی اللسان

ومعه الحج وفی رمضان

الصوم لا یدفع بالانکار

۷۔ جاہلی دور میں کسی کی ہجو کرنا ہوتی ہو تو اس کو بزدلی، بخل اور مروت جیسے صفات سے متصف کیا جاتا۔ اسلام نے آکر ہر چیز کی حدود بیان کر دیں تو کسی نے ان کو توڑنے کی ہمت نہیں کی۔ لیکن عصر عباسی آیا تو ہر طرح کی حدود و قیود توڑ دی گئیں۔ ہر طرح کے جھوٹ اور افتراپردازیاں کی گئیں۔ انتہائی گھٹیا قسم کے بازاری الفاظ اور فحش گوئی سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ اس قسم کے شاعراں طبقہ کو الشعراء المجان کہا گیا۔ جن کا امام ابونواس تھا۔ بعض اوقات مذاق اڑانے کے لئے بھی ہجو کی جاتی تھی۔

۸۔ وصف الریاض والازہار۔

اگرچہ دور جاہلی میں یہ صنف سخن موجود تھی اور ان شعراء کے کلام میں اس کی مثال بھی مل جاتی تھی جنہوں نے عراق و شام وعدن کے باغات دیکھے تھے۔ لیکن عباسی دور میں اس صنف میں بہت وسعت ہوئی۔ اور کثرت سے شعراء نے باغات، پھولوں کی توصیف کی۔ ان میں سب سے آگے ابونواس اور ابوتمام شمار ہوتے ہیں۔

عصر عبّاسی کے تیسرے دور میں جو ۳۳۴ھ سے شروع ہوکر ۶۵۶ھ پر ختم ہوتا ہے، کچھ اور نئی چیزیں عربی شاعری میں آئی۔

۱۔ فلسفہ و منطق کے عربی میں منتقل ہونے کی وجہ سے شعراء کی نظر صنعت اور حقیقت کے قریب آگئی۔ اور انھوں نے شاعری میں ایک نیا مذہب اور نیا راستہ اپنایا۔ جس کے امام متنبی اور ابوالعلاء المعری مانے جاتے ہیں۔ اگر متقدمین کے طریقوں پر عباسی دور کے اول ہی سے تنقید ہونے لگی تھی لیکن کچھ قیود ایسی تھیں جن پر اس دور کے شعراء مسلسل عمل پیرا تھے۔ متنبی اور معری آئے اور انھوں نے شاعری کو ان سے آزاد کیا۔ انھوں نے اپنے ملکہ راسخہ اور طبیعت کے اقتضاء سے شاعری کی فلسفہ وجود اور حکمۃ فی الخلق پر بہت کچھ لکھا۔ خصوصاً معریٰ نے، ان لوگوں نے شعر کے حقیقی مفہوم کو اپنایا۔

۲۔ اس دور میں شعر کی مزید کچھ اصناف ظہور میں آئیں۔ جس طرح ابتدائی عباسی دور میں خمریات اور غزل بالمذکر کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے اس آخری دور میں اخوانیات شکوی الدہر، زہدیات ملاعبات (کھیل کود) سلطانیات وغیرہ کا اضافہ ہوا۔ ان میں سے بعض پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن اس دور میں وہ مستقل شاعری کی ایک قسم بن گئیں۔

## ۳۔ طول القصائد

عباسی دور کے اس حصہ میں سیکڑوں اشعار پر مشتمل قصائد لکھے گئے۔ جیسے ابن عبد ربہ اور واسانی کے قصائد۔ اس کے باوجود عرب اس دور میں بھی شاہنامہ جیسی طویل نظمیں نہیں کہہ سکے۔ بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ابی الرجا احمد بن محمد الربیع المتوفی ۳۳۵ھ کا قصیدہ جس میں اخبار العالم، قصص الانبیاء نظم کئے گئے ہیں۔ اور منظوم کلیلہ و دمنہ ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے۔

## ۴۔ زیادۃ البحر و اوزانہ

اس دور میں بعض نئی بحریں وجود میں آئیں جن میں سب سے زیادہ "اہم الموحشات" ہے۔ اس میں ایک شعر مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہ بحر اندلسی شعراء کی تخلیق ہے۔ اس میں سب سے پہلے مقدم بن معافر الفریری نے تیسری صدی کے آ میں طبع آزمائی کی۔ پھر ابن عبد ربہ صاحب عقد الفرید نے اس کی تقلید کی۔

---

# امتحان کی تیاری کیسے کریں

ترجمہ: اے ظفر بی اے آنرز لکھنؤ یونیورسٹی

دو طالب علموں کو کسی اہم امتحان میں بیٹھنا تھا دونوں کی صلاحیت یکساں تھی اور دونوں ہی بڑے محنتی تھے، لیکن جب وہ مشکل دن سر پر آگیا، تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ٹام براؤن نے امتحان ہال میں نہایت احتیاط سے پرچے کو بار بار پڑھنے، سوالات کے چننے اور اختصار کے ساتھ ان کا جواب سوچنے میں چند منٹ لگانے کے بعد اپنا قلم سنبھالا اور مسلسل روانی کے ساتھ لکھتا چلا گیا۔ دوسری طرف جیک رابن سن پرچہ پر پہلی نظر ڈالتے ہی حواس باختہ معلوم ہو رہا تھا، غصہ میں اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں اور سوالات پر بار بار اس کی نظر جاتی، یہ سارے موضوعات اس کے مطالعہ سے گزر چکے تھے۔ مگر عین وقت پر کسی وجہ سے اُن معلومات کو جنہیں اس کے دماغ کے کسی گوشہ میں ہونا تھا سطح ذہن پر نہ لا سکا نہ ان میں ترتیب قائم کر سکا۔ علاوہ ازیں بھی معلومات کی مدد سے جس انداز میں کام لینے کی ہدایت کی گئی تھی وہ اس کے وہم و خیال میں بھی نہ تھی۔ چنانچہ وہ ناکام، بے چین اور الجھن میں مبتلا ہو کر اپنے جواب کا ایک حصہ لکھتا، پھر اسے قلم زد کرکے از سر نو شروع کرتا۔ اس اثنا میں اس کے چہرے کا رنگ کافی حد تک مایوس کن ہو چکا تھا۔ گھنٹی عین اس وقت بجی جب ٹام براؤن اپنے جوابات پر نظر ثانی کر چکا تھا اور جیک رابن سن ہول دلی اور وحشت و گھبراہٹ کے عالم میں قلم گھسیٹ رہا تھا۔

نتیجے کا اندازہ آپ کو بہ سہولت ہو سکتا ہے ٹام بہترین امیدواروں میں تھا جبکہ جیک بیچارے کو نئے سرے سے محنت کرنی پڑی۔ ہمارے بہت سے بھائیوں کو جیک کی طرح تلخ تجربے ہوتے ہوں گے اور مستقبل میں وہ ان سے بچنا چاہتے ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہم ان سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ جواب ہے تیاری کے صحیح طریقوں کا استعمال کرکے۔ پچھلے بابوں میں ذکر کی گئی بہت سی ہدایتوں سے یہاں بھی مدد ملے گی لیکن تدریجی تکرار و اعادہ کے ساتھ چند ایسے اشاروں کی جو خاص طور سے امتحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتب کئے گئے ہیں ایک فہرست بنا لینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ امتحان سے متعلق ہر ممکن بات کا پتہ لگائیے

اگر اسکول یا کالج کے درجے میں ہونے والا امتحان (CLASS EXAMNNTION) ہو تب تو ضرورت کی ساری معلومات آپ کو فراہم کی ہی جائیں گی اور اگر کوئی خارجی امتحان ہو تو اس کے متعلق درج ذیل معلومات کا پتہ چلانا ہوگا۔

(الف) موضوع کی صحیح وسعت اور مجوزہ کتابیں،

اگر نصاب (کا کوئی کتابچہ) شائع ہوا ہو تو نہایت ہوشیاری سے اس کا مطالعہ کیجئے اور یہاں اس بات کا پوری طرح اطمینان کر لیجئے کہ آیا یہ اسی سال کے لئے منظور شدہ نصاب ہے۔ جس میں امتحان کے لئے آپ کو بیٹھنا ہے۔

(ب) سوالات کے پرچوں اور ان کے مجموعوں کی عام شکلیں،

ہو سکے تو کچھ پرانے پرچوں کی نقلیں بھی فراہم کیجئے تاکہ تیاری میں ان سے رہنمائی مل سکے۔

(ج) امتحان ہونے کی صحیح تاریخ، جگہ اور حسب ضرورت ساتھ لے جانے کے لئے ضروری اسباب۔

اگر آپ کے کچھ دوست احباب امتحان دے چکے ہوں تو امتحان سے متعلق جو نشیب

فرازوہ بتا سکتے ہوں سب ان سے اکٹھا لیجئے، سال گزشتہ کے نتائج پر اگر کوئی تنقید شائع ہوئی ہو تو اس کا بھی مطالعہ کیجئے۔ کبھی کبھی اساتذہ اور طلبہ کو ان کی قابل گرفت غلطیوں اور کمزوریوں سے باخبر کرنے کے لئے ممتحن کی رپورٹ بھی شائع کی جاتی ہے، انہیں غلطیوں کے مکرر سرزد ہونے کی توقع ہوتی ہے اس لئے ان سے بچنے کی خاص طور پر تیاری کرنی چاہیئے۔

۲- اپنے مطالعہ کا ایک خاکہ بنایئے۔

تیاری کے لئے آپ کے پاس جتنے ہفتے ہوں ان کی تعداد شمار کر لیجئے، پھر ہر ہفتہ میں کام کی ایک واضح مقدار معین کر کے اسے تقسیم کر دیجئے اس سے اس خیال کو تحریک ملے گی کہ ہر شنبہ تک موضوع کے ایک معین حصہ پر حاوی ہو جانا ہے اگر ہفتہ بھر کے اندر اس کی انجام دہی میں کوتاہی ہو جائے تو دوسرے ہفتے کے دوران تلافی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر آپ اس قسم کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے رہے تو امتحان کے سلسلے میں یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ آپ موضوع پر پوری طرح حاوی ہو چکے ہیں خاکہ بنانے میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ نظر ثانی کے لئے ہفتہ بہ ہفتہ اور میعاد کے خاتمہ دونوں پر کچھ وقت نکالیے۔

موضوع کے تنوع کا خیال رکھیئے بہتر تو یہ ہے کہ روزانہ ہر موضوع کے لئے کچھ وقت نکالئے۔ آرام کے وقفوں کے سلسلے میں جن باتوں کی باب اول میں ہدایت کی گئی ہے۔ ان پر چلنا کبھی نہ بھولئے۔ ہر ہفتہ کے لئے ایک، دو مخصوص، منزل کی تعیین، طریق کار میں تنوع، آرام کے وقفوں کی مناسب تقسیم اور روزانہ کچھ (معین) تفریحی اوقات کی بدولت آپ کو اپنی ترقی پر حیرت ہوگی اور امتحان کی غرض سے ہونے والا مطالعہ توقع سے زیادہ دلچسپ اور مفید معلوم ہوگا۔

۳- معلومات سے کام لینے اور ان کو سطح ذہن پر لانے کی مشق کیجئے۔ یہ نہایت اہم اصول ہے بہت سے طلبہ اس کی انجام دہی سے قاصر رہ جاتے ہیں امتحان میں مطلوب سوالات کے پرچے کا مطالعہ کرنا یا انہیں اپنی معلومات میں لانا نہیں ہوتا بلکہ معلومات کو سطح ذہن پر لا کر مختلف شکلوں میں ان کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ بھی ایک فن ہے، اس لئے آپ کو اس کی مشق کرنی چاہیئے (مضامین کو صرف) اپنی معلومات میں لانے کی مشق کر کے آپ انہیں سطح ذہن پر نہیں لا سکتے۔ پھر اس کی کیا تدبیر ہو؟

(ا) امتحان کے پرانے پرچے حل کر حل کرنے کی مشق کیجئے۔ کوشش اس بات کی کیجئے کہ کتاب سے استصواب کئے بغیر معین وقت کے اندر ہی اسے انجام دیدیں۔ بعد ازیں اپنی کتابوں یا نوٹس کی مدد سے اور بوقت اشتباہ اساتذہ یا دوستوں سے استصواب کر کے اپنے جوابوں کی تصحیح کر لیجئے۔

(ب) اس سوال کو قلم بند کر لیجئے جو آپ سے حل نہ ہو سکا ہو، اس کے ذریعہ آپ کے کمزور پہلو ابھر کر سامنے آجائیں گے۔

(ج) خود ساختہ سوالات کا اس طرح جواب دیجئے جیسے آپ امتحان دینے کی پوزیشن میں ہوں۔ ایسے سوالات بنایئے جو یہ مطالبہ کریں کہ آپ اپنی معلومات کو سطح ذہن پر لائیں۔ بلکہ ان سے کام لینے کا بھی مطالبہ کریں۔

(د) مطالعہ کی ایسی شکلوں پر عمل کیجئے جن میں تخلیق و ترتیب کی قسم کی چیز آتی ہو۔ جیسے خلاصہ، تجزیہ، مضمون یا رپورٹ، انشاء، تحریر برجستہ، جدول، یا کوئی بھی مرتب فہرست، معلومات پر نظر ثانی کی بہترین شکل یہ ہے کہ ان سے کام لیا جائے۔

(ہ) ممکن ہو تو ایک یا چند دوستوں کے ساتھ مل کر کام کیجئے۔ ہر ایک کے سامنے جداگانہ سوالات رکھئے۔ ان کے جوابات پر تنقید کیجئے۔ جن باتوں میں شک ہو ان پر بحث کیجئے۔ جن باتوں میں شک ہو ان پر بحث کیجئے۔ ہر دو جواب کے بیچ موازنہ کیجئے۔ اس طرح سے آپ کا مطالعہ کھیل و تفریح کی چیز بن جائے گا۔

مشق کرنے کا سب سے اچھا اور عام ایک اصول یہ ہے کہ جتنا وقت آپ معلومات کے حصول میں لگاتے ہیں اتنا ہی اپنی معلومات کو سطح ذہن پر لانے اور ان سے کام لینے میں لگایئے۔

۴- کسی خاص قسم کے امتحان کی تیاری کیجئے۔

اب تک امتحان کی عام نوعیتوں پر جن میں مضمون کی شکل کے سوالات (ESSAY TIDE QUESTIONS) ہوتے ہیں غور کرتے رہے ہیں جب کہ تاریخ جغرافیہ یا اقتصادیات وغیرہ کے مضامین میں آپ کو سابقہ پڑ سکتا ہے۔ ریاضی سے متعلق مضامین کے امتحانات یقیناً اس سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں سوالات، مسائل اور مساوات کا حل مطلوب ہوتا ہے۔ زبانی ہو یا عملی، ہر امتحان خود اپنی نوعیت کی مہارت چاہتا ہے۔ ان سبھوں پر یکساں اصول لاگو ہوتے ہیں۔ جن باتوں کی انجام دہی امتحان میں مطلوب ہوگی ان کو انجام دینے کی مشق کیجئے۔

## افسر امروہوی

تری مخمور نگاہی الہیٰ توبہ
ترے انداز الہیٰ توبہ
ہائے وہ شب وہ گھنیری زلفیں
جن کے سائے میں مجھے نیند آئی
اور جب خواب سے بیدار ہوا
پھر وہی سلسلۂ تنہائی

تو کہ ہے نور مری آنکھوں کا
میں کہ نظروں میں تری کچھ نہ رہا
دفعتاً مجھ کو زلیخائے جمال
تری ساکت نظری یاد آئی
دیکھنا گردن کج سے ترا
کیسے بھولے گا دل شیدائی

وکہ زیبائش صد رنگ محل
ں کہ مسکن مرا آغوش اجل
وہ ترے لب کہ گلِ تر جیسے
کتنی شیریں تھی تری گویائی
گوش احساس میں تری آواز
جیسے بجتی ہو کہیں شہنائی

تو کہ پابندۂ رسم و رواج
میں کہ خانہ بدوش و تاراج
ترے چہرے پہ تقدس کی پھوار
اُف وہ اشکوں کے ترے گرمائی
سوز افکار مسیحا کے طفیل
شدت درد سکوں افزائی

وکہ ایک ساز مگر بے آواز
ں کہ وحشت اثر و رقص انداز
ترے رخسار نفوس قدرت کا
جن سے پھولوں کی نظر شرمائی
ہاں مگر چشم تمنا نے مری
جذب کر لی تھی وہ سب رعنائی

تو کہ حسّاس نہیں جانِ حیا
میں کہ احساس کی بستی کا خدا
سرو قد چشم و لب اللہ اللہ
جامعیت کشش دل آرائی
دست قدرت کی بنائی تصویر
دیدنی ہے اگر ہو بینائی

---

# غلط فہمی

ماسٹر محمد مزمل خاں ۔ ایم ۔ اے

جب میری نظر نیلے رنگ کی ساڑی میں ملبوس لڑکی پر پڑی تو مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں اس وقت کار ڈرائیو کر رہا ہوں ۔ اور چوراہے پر نصب سرخ لائٹ رکنے کا اشارہ کر رہی ہے ۔ صفدر میرے پاس بیٹھا تھا ۔ میری یہ حرکت دیکھ کر بولا ۔ کیا دیوانے ہو گئے ہو؟

" ہاں میں دیوانہ ہو گیا ہوں ۔ پاگل ہو گیا ہوں ۔ اس نیلی ساڑی نے مجھ سے میرے ہوش و حواس چھین لئے ہیں ۔ اور میں تم سے کیا خود سے بھی بے نیاز ہو گیا ہوں ۔"

میرے دل نے جواب دیا ۔ مگر زبان اس کے ادا کرنے سے قاصر رہی

" دیکھو ۔۔۔ گاڑی روکو ورنہ ایکسیڈنٹ ہو جائے گا ۔"

صفدر مجھ کو خاموش دیکھ کر بولا ۔ اور میں صرف " اوہ !" کہہ کر بریک لگایا ۔ اور ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رک گئی ۔

" کیا بات ہے مرزا ۔ طبیعت تو ٹھیک ہے ؟" صفدر نے میری بدحواسی کو بھانپتے ہوئے استفسار کیا ۔

" ہاں بالکل ٹھیک ہوں یار ۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ سامنے جو لڑکی جا رہی ہے ، وہ ہو نہ ہو شکیلہ ہے ۔"

" شکیلہ ۔۔ !" وہ اس طرح چونکا جیسے کسی بچھو نے اس کے ڈنک مار دیا ہو ۔ " ہاں ! شکیلہ ۔ شکیلہ ۔ وہی شکیلہ جو کالج میں ہمارے ساتھ پڑھتی تھی ۔ اور تمہاری بھابی ۔ اور میری ....... ہونے والی تھی ۔۔۔" میرا جواب سن کر صفدر خاموش ہو گیا ۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ میرا دماغ پھر گیا ہے ۔ مجھے ہر لڑکی شکیلہ نظر آتی ہے ۔

شکیلہ ، جو میری زندگی تھی ۔ اور اب موت نما زندگی کا باعث ہے ۔ صفدر بے چارہ سیدھا سادہ بزنس مین ۔ وہ کیا جانے کہ یہ سب کیا ہوتا ہے ۔ اسے تو بس پیسے کے لین دین اور اس کے استعمال کے فکرات ہی گھیرے رہتے ہیں ۔ کالج میں ہم تینوں ساتھ کلاس فیلو تھے ۔ ایم ۔ اے کے بعد میں لکچرار مقرر ہو گیا ۔ صفدر اپنے کاروبار سے منسلک ہو گیا ۔ اور شکیلہ اپنے ان تمام عہد و پیمان جو اس نے میرے ساتھ کالج ، کینٹین ، کیفے ، کالج لان اور ٹیرس میں کئے تھے کے ساتھ ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گئی ۔

پچھلے دو سال سے اس کا کوئی پتہ نہیں ۔ میں آج بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں ۔ اس کے لئے اپنے والدین ، بھائی بہنوں کے ارمانوں کا خون کر چکا ہوں ۔ انھوں نے کتنے پیار و محبت کے ساتھ مجھ سے مختلف رشتے قبول کرنے

کو کہا۔ مگر میں نے نہ صرف ان رشتوں سے انکار کر دیا بلکہ اپنی منگنی ختم کرا کے اپنے بزرگوں اور اعزا کی ناراضگی مول لے لی۔

"کیا سوچنے لگے۔ دیکھو، ہری لائٹ ہو گئی۔" صفدر نے مجھ کو ٹھوکا دیا۔ اور پھر میں کار ڈرائیو کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لڑکی جا چکی تھی۔ اور میں کبھی یہ سوچ کر کہ شاید میرا وہم ہو خاموش ہو گیا۔

گاڑی کناٹ پلیس کے دائرے میں گھوم کر مدراس کیفے کے سامنے رُک گئی۔ ہم دونوں گاڑی سے اُترے۔ ابھی میں اچھی طرح لاک لگا بھی نہ سکا تھا۔ کہ میرے کان مانوس قہقہے کی آواز سے بھر گئے۔ آواز جو شکیلہ کی ہنسی سے مشابہ تھی، مجھے ایک بار پھر شک ہوا۔ کہ شکیلہ یہیں کہیں ہے۔ مگر یہ سوچ کر میں نے صفدر سے اس کا ذکر نہیں کیا کہ کہیں سچ مچ وہ اس کو میرے دماغ کا فتور سمجھ کر مذاق نہ اُڑائے۔ اسی خیال کے تحت میں نے خاموش رہنا مناسب تصور کیا۔

"یار، تم نے شکیلہ کی آواز سُنی ---؟" صفدر نے پوچھا۔

"ہاں، لگی تو ایسی ہی ہے۔" میں نے دامن بچاتے ہوئے جواب دیا۔ دوسرے ہی لمحے جب ہم کیفے داخل ہونے کے لئے مڑے تو سامنے شکیلہ ایک نوجوان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا سر چکرا گیا۔ اگر صفدر ساتھ نہ ہوتا تو یقیناً میں گر گیا ہوتا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور شکیلہ کی طرف چلا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ نوجوان کوئی اور نہیں۔ میرا پرانا دوست اور کلاس فیلو جاوید ہے۔ جو ہائر سکنڈری کرنے کے بعد علی گڑھ چلا گیا تھا۔

"ارے، مرزا تم ---!" جاوید شکیلہ کو چھوڑ کر مجھ سے چمٹ گیا۔ یہ دیکھ کر شکیلہ کا چہرہ جلدی جلدی اپنے رنگ بدلنے لگا۔ اور وہ خاموش ساکت وجامد مبہوت سی کھڑی رہی۔ جاوید سے گلے مل کر بچپن اور تعلیم کا ابتدائی زمانہ جو جاوید کے ساتھ گزارا تھا۔ میرے ذہن میں چلتی ہوئی فلم کی مانند جلدی جلدی گھومنے لگا۔

"اور سناؤ۔ کیا کر رہے ہو؟" میں نے فرطِ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کچھ نہیں۔ خدا خدا کر کے بی اے کر لیا ہے۔ اب والدین کی شادی کے لئے بضد ہیں۔ سو اسی تیاری میں مصروف ہوں۔" جاوید نے بے باکی سے جواب دیا۔

"شادی مبارک ہو۔"

جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شادی کی ایڈوانس مبارک بادی کا شکریہ۔"

میں نے شکیلہ سے کہا۔ "جاوید صاحب سے تو میری اتنی گہری دوستی نہ تھی۔ لیکن تم سے تو"

شکیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جاوید نے فوراً سوال کیا۔ "آپ انہیں جانتے ہیں؟"

"جاوید صاحب یہی نہیں بلکہ یہ بھی مجھے خوب جانتی ہیں۔" شکیلہ کے چہرے کی رنگت اُڑی اڑی سی تھی۔ اس سے اس کے چہرے کی معصومیت اور نکھر گئی تھی۔ لیکن کسی کو کیا معلوم کہ اس معصوم چہرے کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح باتیں کرتے کرتے کیفے میں پہنچ گئے۔

بیٹھتے ہوئے جاوید نے شکیلہ سے کہا۔ "تم نے کبھی صفدر اور مرزا کا ذکر مجھ سے نہیں کیا ---؟"

"مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ غائبانہ تعارف بھی اسی لئے ضروری نہیں سمجھا۔" شکیلہ نے جواب دیا۔

بیٹھنے کے بعد جاوید کو اچانک خیال آیا کہ Regal کے قریب Hand Loom Shop سے جو اس نے کپڑا خریدا تھا، اس میں سے پلنگ کی چادروں کا بنڈل وہیں

گیا۔ چنانچہ اس نے صفدر سے کہا کہ ذرا چلیں۔ وہاں سے اس بنڈل کو لے آئیں۔ صفدر اور جاوید کھڑے ہوئے تو شکیلہ بھی ذرا حرکت میں آئیں۔ جاوید نے کہا "تم یہیں بیٹھو ہم ابھی پانچ منٹ میں آتے ہیں"۔ صفدر اور جاوید دونوں فوراً چلے گئے۔ اب صرف شکیلہ اور میں ماضی کی موہوم یادوں میں گم ہوئے بیٹھے تھے۔

شکیلہ کی آنکھوں میں اچانک آنسو اُمڈ آئے۔ وہ رونے لگی۔ اور بولی۔ "مرزا میری غلطی معاف کردو۔ میں غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ مجھے میرے عزیزوں اور گھر والوں نے تمہارے خلاف اکسایا۔ اور ایسی لغو باتیں کہیں جس کی وجہ سے میرے گھر والے اور میں تم سے بدظن ہوگئی تھی۔" وہ جذبات میں بہہ نکلی۔ "مرزا۔! ان تمام باتوں کو بھول جاؤ تمہیں میری محبت کا واسطہ۔ وہ تمام عہد و پیمان جو میں نے تم سے کئے تھے وہ جاوید کے سامنے مت دہرانا۔"

"محبت کا واسطہ۔! کون سی محبت کا، سچی یا جھوٹی؟" میں نے نہایت تند لہجے میں جواب دیا۔ "تم نے میری زندگی برباد کردی۔ میں نے تمہارے ایک اشارے پر نشاط سے اپنی منگنی ختم کرلی۔ جو کہ میری ماموں زاد بہن تھی۔ پانچ سال منگنی رُکی رہی۔ میرے ماموں ایم۔ اے کرنے تک میرا انتظار کرتے رہے۔ اور انھوں نے اچھے اچھے رشتے نکال دیئے۔ اور یہی کہتے تھے کہ نشاط کی منگنی مرزا سے ہوئی ہے۔ میں شادی بھی اُسی سے کراؤں گا۔ لیکن بے وفا لڑکی تم میری زندگی میں ایک بلا کی طرح آئیں اور مجھ کو تباہ کرکے اپنی راہ ہولیں۔ کیا تم یہ بھول گئی تھیں کہ میں نے تمہاری، صرف تمہاری وجہ سے نشاط سے منگنی ختم کی تھی۔ اور آج تک میرے تمام خاندان کے افراد مجھے حقیر نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مجھ سے میرے والدین تک نے تعلقات ختم کردیئے ہیں۔ یہ سب کس کی وجہ سے ہوا؟ صرف تمہاری وجہ سے۔ اور پھر بھی تم میری نہ بن سکیں۔ آخر میں نے تمہارے ساتھ ایسا کون سا جرم کیا تھا جس کی سزا تم نے مجھے یہ دی ہے؟ میں نے تم سے ہمیشہ پاک محبت کی تھی۔ کسی قسم کا کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔ اور نہ اٹھانے کی کوشش کی۔ شاید اس کا ہی یہ نتیجہ ہے۔ اگر میں کوئی حرکت کر بیٹھتا تو شاید تم میری ہو جاتیں۔ لیکن کبھی میں نے دل میں ایسا خیال تک نہ لایا تھا۔ جس کا انعام تم نے یہ دیا۔"

اس کے بعد میں نے شکیلہ کو چار سال پرانا فوٹو جو ہم نے Grand Studio میں کھنچوایا تھا دکھاتے ہوئے کہا۔ "شکیلہ دیکھو! اگر میں چاہتا تو تمہارے خطوط اور فوٹو دنیا کے سامنے لاکر تمہاری زندگی تباہ کردیتا۔ تم کو رسوا کر دیتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن آج کی ملاقات کے بعد آج میں جذبۂ انتقام سے مجبور ہوکر کہیں میں کچھ کر نہ بیٹھوں اس لئے یہ فوٹو تمہارے سامنے پھاڑ رہا ہوں ——— ——— یہ تمہارے ظرف اور ذہنیت کی بات ہے کہ تم نے میرے جذبے، انتظار اور قربانی کا کوئی خیال نہ کیا۔ اور دنیا والوں کی باتوں میں آکر تم نے مجھ کو اپنی زندگی سے "حرف غلط کی مانند" مٹا دیا۔"

میں جذبات میں آکر جو دل میں آرہا تھا۔ کہہ رہا تھا ——— "کیا تم وہ تمام وعدے بھول گئیں جو پولو گراؤنڈ میں گھنٹوں گھنٹوں بیٹھ کر کرتی تھیں؟ کیا تم نے وہ ملاقاتیں بالکل فراموش کردیں جب کہ تم میرے ساتھ مہرولی، اوکھلا اور فلموں میں جایا کرتی تھیں؟

تم نے تو اس پاک محبت کے مضبوط رشتے کو ایک کچے دھاگے کی مانند لوگوں کے بہکانے میں آکر توڑ دیا۔ اس کی سب سے بڑی قصوروار تم ہو ——— صرف تم۔

شکیلہ کی آنکھوں سے ساون بھادوں بہہ نکلی - وہ
رمی ہوئی آواز میں بولی - "مرزا ! بس کرو —— میں
بیرے میں تھی - مجھے اپنی غلطی تسلیم ہے - میری غلطی معاف
دو —— مجھے معاف کردو مرزا —— مجھے معاف کردو"
"شکیلہ میں یہ کسی طرح نہیں دیکھ سکتا کہ تم کسی دوسرے
راحت کا سامان بنو - تم تو مجھے اس مکار جبار کا حال
ؤ کر آج کل کہاں ہے ؟ اُس نے اِس تباہی میں سب
، زیادہ حصہ لیا ہے - میں تو انتقام اس مردود سے لونگا
احساب جب تک بے باق نہ کروں گا مجھے سکون نہیں
، گا -"

میں یہی کہہ پایا تھا کہ صفدر اور جاوید سامنے سے
تے دکھائی دیئے - شکیلہ نے جلدی سے اپنے آنسو صاف
ے - جاوید بہت تیز تھا - اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی
یا تھا - شکیلہ کو مایوس دیکھ کر بولا - "کیوں ، کیا ہوا ،
کھوں میں نمی کیسی ؟"
"کچھ نہیں - کچھ بھی تو نہیں - کچھ آنکھ میں گر گیا ہے
ں کی وجہ سے پانی اُمڈ گیا -"
صفدر بیرے کو بلا کر کافی اور ڈوسے کا آرڈر دے
تھا -

میں نے کہا - "شکیلہ ہمیشہ آملیٹ کو ترجیح دیتی ہیں -
سہ انھیں اچھا نہیں لگتا - ڈوسہ کبھی نہیں کھاتیں -
سنو - ! ان کے لئے کولڈ کافی منگانا - کولڈ کافی کی
ت شوقین ہیں" شکیلہ نیچی نگاہیں کئے ہوئے مسکرا رہی

یہ سن کر جاوید کے کان کھڑے ہوئے - اور سمجھ گیا
دال میں کالا ہے - سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا - اور
ریٹ سلگا کر کچھ سوچنے لگا - اور پھر بولا کہ مجھے یہ معلوم
ہوتا کہ مرزا تمہارے اور شکیلہ کے تعلقات اتنے قریبی ہیں -
تو میں ضرور کچھ کرتا - خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے -"
"جاوید —— ! تم نے میری بہاریں لوٹ لیں -
اس باغباں کے باغ کے پھول توڑ لئے - اور پھر زخموں پر
نمک پاشی کر رہے ہو -" میں نے تند لہجے میں کہا -
جاوید نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا - "مرزا میں
کچھ نہیں سمجھا کہ آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو - ارے بھئی ، میری
منگنی تو رفعت سے ہوئی ہے - کیا تم نہیں جانتے کہ رفعت
میری خالہ زاد بہن ہے -"
میں نے صفدر کو دیکھا - اور صفدر اور شکیلہ نے
جاوید کو - اب جاوید اپنے سوال کا جواب چاہتا تھا -
صفدر نے کہا - "جاوید صاحب تو پھر شکیلہ صاحبہ
سے آپ کا کیا ..........؟"
"ارے بھئی یہ تو میری چھوٹی بہن ہے - جس کی منگنی
انور کے ساتھ طے ہونے جا رہی ہے -"
"انور —— !" میں نے تعجب سے پوچھا -
"ارے ہاں ، انور - جو ہمارے ساتھ دسویں میں
پڑھتا تھا - اب فوج میں کرنل ہے -
لیکن اب مجھے کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں - میں
سب کچھ سمجھ گیا - کہ شکیلہ کے اور تمہارے کیسے تعلقات
ہیں - کاش —— ! یہ بات مجھے پہلے ہی پتہ چل جاتی - کوئی
بات نہیں - اب بھی وہی ہوگا مرزا جو تم چاہوگے - کوئی
فکر کی ضرورت نہیں -"
شکیلہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا - اور اس کے چہرے
پر شفق پھوٹ پڑی - اور میں حیرت و استعجاب کا
مجسمہ بنا جاوید کو گھور رہا تھا -

●●

# DCM starts a revolution

Can't believe your eyes? Look again! There's been a fashion explosion at DCM – a brave new world of colour, a bold new dimension in design. DCM's super-charged collection of prints on wash 'n' wear poplins and superia Trinca rubia is going like a bomb—better load [illegible] if you want to bring [illegible] defences [illegible]

DCM always have something special in store for you

# قابل اعتراض سامان

مترجم:- عبداللطیف
دہلی کالج دہلی

"یہ کہانی "A BOOK OF SHORT STORIES" میں سے لی گئی ہے جس کا عنوان "The questionable cargo" ہے جس کو "Julius Day" نے تصنیف کیا ہے مذکورہ کہانی دہلی کے بی اے کورس سے متعلق ہے۔

ہوائی اڈے پر پائلٹ روم میں بیٹھے ہوئے پائلٹ
ی نے ایک عجیب بوجھ ڈھونے کی کہانی سنائی۔ وہ
ے کار تھا اور کسی نوکری کا متلاشی تھا ایک اخبار کے پرسنل
لم میں اس نے ایک اشتہار دیکھا کہ ایک معتبر اور تجربہ
ر پائلٹ کی ہوا اڑان کے لئے بہت اچھی تنخواہ پر فوری ضرورت
ہے۔ اس اخبار کے باکس نمبر کے پتہ پر بغیر کسی امید کے اس
نے درخواست بھیجدی لیکن اسے تعجب ہوا کہ اسی رات ایک
ٹل میں ملنے کے لئے جولیس ڈے نامی ایک شخص کا خط موصول
ا ان سے ملاقات کرنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے فرانس کے
نوب میں ایک جہاز خریدا ہے اور وہ اسے انگلینڈ لے جانا
ہتے ہیں وہ دونوں ٹرین اور اسٹیمر سے فرانس جائیں گے
ر وہاں سے ہوائی جہاز سے لوٹیں گے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا
یسا کام کرنے کے لئے اسے تمام اخراجات کے علاوہ ایک پونڈ
ے گا۔

ٹامی کو یہ نوکری پسند آئی اور اس نے فوراً ہی اس کو
قبول کرلیا۔ اس وقت کچھ تنگ دستی کی حالت تھی اس لئے اس
نے اس کو منظور کی۔ جولیس ڈے نے اس کو اگلی صبح ہی کو چلنے
کو کہا۔ ٹامی کو کچھ تعجب ہوا لیکن وہ ایک سوٹ کیس میں اپنے
کپڑے رکھ کر وقت پر اسٹیشن پہونچ گیا پلیٹ فارم پر
جولیس ڈے کو آتے دیکھ کر اسے کچھ تعجب تو ہوا کیوں کہ ابھی
تک اس مسئلہ کی سچائی پر اس کا یقین جم نہیں سکا تھا۔

جب دونوں ٹرین میں بیٹھ گئے تو ڈے نے ٹامی
کو پچاس پونڈ دئے اور باقی پچاس پونڈ انگلینڈ میں بخیریت
پہنچنے پر دینے کے لئے کہا۔

فرانس کا سفر بالکل سیدھا رہا جولیس ڈے نے ساری
دنیا کا سفر کیا تھا بڑی عجیب و غریب اور دلچسپ کہانیاں
تمام راستے سناتے رہے ان کی عمر تقریباً ۶۰ سال کی تھی
فرانس کو پار کرنے میں سفر بڑا معمولی رہا۔ پیرس میں انہیں تین
گھنٹہ رکنا پڑا۔ جہاں جولیس ڈے نے ٹامی کو کھانا بھی
کھلایا رات کو انہوں نے مرسیلز Marseilles جانے

والی گاڑی پکڑی اور صبح وہاں پہونچ گئے وہیں اس کا جہاز بھی
تھا وہ لوگ جلدی مرسیلز کے ہوائی اڈے مرگنین
Marignane پہونچے۔ وہ جہاز بالکل ٹھیک اور سفر کے
لئے تیار دکھائی دیا۔

ٹنکی میں پٹرول بھرا ہوا تھا۔ انگلینڈ تک جہاز کو اڑانے
میں کوئی دشواری معلوم نہیں ہوتی تھی۔ پھر بھی ٹامی کو ایک مشکل
کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے جولیس ڈے سے پوچھا کہ جہاز کو
کہاں اتارنا ہے۔ لیمپن ( Lympne ) میں یا
کرائیڈن ( Croydon ) میں۔ انہوں نے کہا کہ جہاز ان
جگہوں پر نہیں اتارا جائے گا۔ انہوں نے انگلینڈ کا ایک نقشہ
نکالا۔ اسٹون مس ٹائن ( Stonemastine ) کے پاس
ایک میدان میں اشارہ کیا۔ ٹامی نے کہا کہ جہاز وہاں نہیں اتر
سکتا۔ کسٹم کی کارروائی کے لئے پہلے ہوائی اڈے پر جہاز
اتارنا پڑے گا۔ جولیس ڈے نے بتایا کہ ایسا کرنے میں ہوائی
اڈے کے اصول کے تحت انہیں بہت سارے کاغذات
پر دستخط کرنے پڑیں گے اور ایسا کرنا انہیں پسند نہیں۔ ٹامی نے
جواب دیا کہ غیر قانونی طریقے سے جہاز اڑانے میں اس کا لائسنس
چھن جائے گا۔ شاید جیل کی سزا بھی ہو گی صرف سو پونڈ
کے بدلے وہ یہ سب کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ جولیس ڈے
نے جب اسے ایک بیوپاری کی طرح جتایا تو ٹامی نے جواب
دیا کہ وہ جہاز ڈے کو خود انگلینڈ لے جانا پڑے گا۔

کچھ دیر دونوں میں بحث و تکرار چلتی رہی آخر میں جولیس
ڈے اس بات پر رضامند ہو گئے کہ ایسکس ( Essex )
میں ایبرج ( Abridge ) کے ہوائی اڈے پر وہ جہاز اتار
دے جو اس کے گھر کے قریب بھی ہے ٹامی بھی مان گیا
لیکن جب دونوں فضا میں تھے تو ڈے نے اپنے گھر کے
پاس والے میدان میں جہاز اتارنے کے لئے دو سو پونڈ دینا
چاہا پہلی بار ٹامی کو شک ہوا کہ ذرا سی بات کے لئے کوئی
بھی اس طرح دولت برباد کرنا پسند نہیں کرے گا۔
پہلے تو میں نے اترنے کا خیال آیا لیکن جولیس ڈے کے اچھے برتاؤ
کو دیکھ کر ... اس نے ... اتر سکا دوسرا پونڈ لینا

اس نے نامنظور کر دیا اس نے جہاز کو انگلینڈ کے کسٹم والے
ہوائی اڈے پر اتارنے کا ارادہ کر لیا۔

ٹامی کو اپنے اوپر پورا بھروسہ تھا جب کینٹ آیا تو وہ
بوڑھا ڈے کیبن ( Cabin ) میں کسی کام کے لئے گیا تھا
لوٹ آیا اور ٹامی سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے ٹامی نے جواب
دیا کہ تقریباً دس منٹ میں وہ ایبرج ہوائی اڈے پر اتر جائے
گا لیکن جب اس نے جولیس ڈے کی جانب دیکھا تو اس کے
ہاتھ میں پستول دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس کی پیٹھ پر ہوائی چھتری
بھی لگی ہوئی تھی جو وہ سوٹ کیس سے نکال لایا تھا اس کے چہرہ
سے دوستی کا نقطہ یہ رفع ہو گیا تھا غصہ میں ٹامی کی جانب دیکھ رہا تھا
اس نے ٹامی سے کہا جو کچھ اس سے کہا گیا ہے وہی کرے یعنی
جہاز کو میدان میں اتار لے اگر وہ ایبرج کی جانب مڑا تو
اس کو گولی مار دی جائے گی اور وہ ہوائی چھتری سے محفوظ
زمین پر پہونچ جائے گا۔ ٹامی نا امید ہو گیا وہ قانون نہیں
توڑنا چاہتا تھا لیکن مرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

معمولی اصول توڑنے کے لئے مرنا عقلمندی نہیں تھی اس
نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ اسمگلنگ کا معاملہ ہے اور وہ اترنے
کے بعد کارروائی کرے گا۔

جہاز اتارتے پر ٹامی کچھ نہ کر سکا وہ جہاز سے باہر نکلا
ڈے کی پستول اسے اب بھی نشانہ بنائے ہوئی تھی۔
دو حبشی مکان سے نکلے اور ٹامی کو گھیر لیا اس نے
لڑنا چاہا لیکن دو مضبوط اور طاقتور حبشیوں کے سامنے
وہ بے بس ہو گیا وہ گھر میں لے جایا گیا اور ایک کمرے میں
بند کر کے باہر سے قفل کر دیا گیا۔

ٹامی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک
ہو گا وہ وہاں قیدی کی طرح زندگی بھر رکھا جائے گا یا ڈے
کی آسانی کے لئے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔
بنا کسی کے کچھ جانے اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

مستقبل بڑا تاریک تھا ایک گھنٹہ کے بعد ڈے اندر
آیا ساتھ میں ایک حبشی کھانے سے بھری تھال لایا وہ اب
پہلے کی طرح نہ تھا بلکہ ہنس رہا تھا ٹامی سے ادھر ادھر کی

انہوں نے منظور کیا کہ ٹامی کے ساتھ ان کا سلوک
شرمندگانہ تھا۔

اگر ٹامی سنتا تو وہ وجہ بتانے جل رہے تھے۔ ٹامی نے
کھانا کھانا شروع کیا اور کہا کہ اسے اب ٹھیک طرح معلوم
ہو گیا ہے کہ یہ کوکین یا سکرین کا کیس ہے۔

ڈے نے ایک لمحہ اسے دیکھا اور بڑے زور سے
ٹھٹھا مارا۔ ٹامی نے ان کی بات سمجھی کیوں کہ وہ پیکنگ کیس
بہت بھاری تھا۔ اور اس میں دو وائن نہیں ہو سکتی تھیں۔
جولیس ڈے نے اسے پچاس پونڈ دیئے وہ ٹامی کو انعام
دینا چاہتے تھے لیکن اس شخص نے ایسا نہیں کیا کہ کہیں
ٹامی اسے گھونس نہ سمجھ لے وہ اپنی کہانی بتانے لگے۔

وہ کافی دلچسپ کہانی تھی۔ ڈے نے بتایا کہ پچھلے
دس سالوں سے وہ افریقہ کے جنگلوں میں تھے انہیں سونے
کی تلاش تھی۔ کھیتی بھی کرتے رہے اور شکار بھی کھیلتے رہے
کافی مدت تک بھی علاقوں سے دور رہے ایک سال پہلے وہ
کینیا میں کافی کے باغ چلا رہے تھے۔ وہ ایک بڑی سنسان
جگہ تھی۔ چیتے بھرے ہوئے تھے انہیں شیر سے کبھی ڈر
نہیں لگا کیوں کہ وہ بغیر ستائے حملہ نہیں کرتے تھے لیکن چیتوں
سے ہمیشہ خوف زدہ رہتے۔ ان چیتوں نے کئی خادموں کو مار
ڈالا اور حالات بہت خطرناک مزدوروں کی بہت قلت تھی جو مزدور
ان کے پاس تھے انہوں نے بغیر ہتھیار بند چوکیدار کے آنے
جانے سے انکار کر دیا۔ کام میں بڑی مشکل پڑی پھر ڈے نے
اپنے کتے کی مدد سے بڑی بے رحمی سے ان کا شکار کرنا شروع
کر دیا۔ چیتوں سے مقابلہ کرنے والے کتے بھی آسانی سے
نہیں ملتے تھے ان کے پاس ایک خطرناک کتا تھا۔ لیکن وہ
بھی اب بوڑھا ہو چلا تھا اس کو ساتھ لیکر شکار کھیلنا اب
خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پھر انگلینڈ میں ایک کتے پالنے
والی کمپنی سے انہوں نے ایک اچھی سی کتیا بھیجنے کیلئے لکھا
چیتوں سے لڑنے والے کئی کتے پلنے کا ان کا خیال
تھا۔ نئی کتیا جوڈی (Judy) انسانوں سے تو بہت
اچھا برتاؤ کرتی تھی لیکن چیتوں سے خوب لڑتی تھی اور

ایک بار چیتے سے زخمی ہو جانے کے بعد تو وہ اور بھی زیادہ خطرناک
ہو گئی تھی۔ جوڈی نے کچھ دنوں میں چار خوبصورت پلے جنم دیئے
چیتوں کے شکار کیلئے پانچ کتوں کے سہارے سے ڈے
کھل اٹھے جس سے جولیس ڈے کے افریقی دو سال کے ہو گئے
تب ایک واقعہ گزرا۔ وقت گزرا اور وہ پلے زندگی کا خاتمہ کر دیا
ایک شام کو وہ اپنے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے
تھے کہ ایک چیتا ان پر جھپٹ پڑا۔ لاپرواہی سے ان کا رائفل
اندر ہی رہ گیا تھا ان کا پرانا کتا انہیں کے پاس بیٹھا تھا۔
وہ جلد ہی بھڑ گیا وہ چیتا جولیس ڈے پر آ گرا اور دونوں برآمدے
میں لڑھک گئے۔ چیتا ان کے اوپر تھا اس کو ہٹانے کا انہیں
کوئی موقع نہ ملا۔ چیتے کے منہ میں اپنا ہاتھ دیکر انہوں نے
جوڈی کو پکارا۔ چیتا ان کی جان لے ہی رہا تھا کہ جوڈی اپنے
چاروں پلوں کے ساتھ آ پہنچی۔ جوڈی نے چیتے کی گردن پکڑ لی
اور ڈے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ چیتا
بہت بڑا تھا اور اگر جلد ہی انہوں نے کچھ نہ کیا تو نہ تو کتا بچے
بچے گا اور نہ چیتا ہی۔ وہ کافی زخمی ہو چکے تھے پھر بھی کمرے میں
داخل ہوئے وہاں سے رائفل نکالا اور چیتے کو مار دیا اس
کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔

اب ان کا دھیان لوٹا تو اپنے آپ کو خون میں لت پت
پایا۔ ان کے سارے نوکر بھاگ گئے تھے۔ ایک تو پیڑ پر
چڑھا ہوا تھا جب اس نے ڈے کو اٹھتے ہوئے دیکھا
تو اوروں کو بلایا۔ جوڈی مر چکی تھی بل ڈاگ بھی مر رہا تھا۔
وہ چاروں پلے بھی بری طرح زخمی ہو چکے تھے لیکن سب
اچھے ہو گئے دو مہینے بعد جب ڈے نے اسپتال چھوڑا
تو انہیں ڈاکٹروں نے انگلینڈ لوٹ جانے کی صلاح دی۔ وہ
اپنے کتوں کو بھی لے جانا چاہتے تھے مرسیلز تک تو وہ
انہیں ساتھ لے گئے وہاں انہیں معلوم ہوا کہ انگلینڈ لائے
جانے والے کتوں کو چھ مہینے تک بیماری سے بچنے کے
لئے اکیلا رہنا پڑتا ہے۔

---

# اُردُو

-یاسمین نظامی

برائے نام سی دستور میں جگہ دے کر
مری زبان تجھے اہلِ وطن نہیں سمجھے
ترے حسین تکلّم کی دل رُبائی نے
مزاجِ گنگ و جمن کو محبّتیں دی ہیں
ترے جمالِ منوّر کی رُونمائی نے
حسین تاج محل کی حقیقتیں دی ہیں
وہ پاک و چین کے حملے تو یاد ہیں سب کو
صدائے دردِ وطن بن کے کون گونجا تھا؟
وہ دشمنوں کے قدم کس نے ڈگمگائے تھے؟
مزاجِ برق و شرر بن کے کون چمکا تھا؟
مری زبان ترے انمول کارناموں کا
کبھی تو اہلِ وطن کو خیال آئے گا

یوسف قریشی
دلی کالج دہلی

"زیر نظر افسانہ دلّی کالج دہلی کے انٹر کالج مختصر کہانی مقابلہ میں پہلے انعام کا حقدار قرار پایا گیا ــــ"

گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مستقل انگارے برسا رہی تھیں۔ غصہ کی شدت سے اس کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ بار بار وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ گاڑی سے کود کر کلکتہ کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔ یہ انقلاب جو اس کی زندگی میں آیا تھا اس کے لئے وہ قطعی تیار نہ تھا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں وہ بار بار اپنی سیٹ پر سے اٹھتا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتا پھر واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتا۔ اس کے دل و دماغ پر "خون" سوار تھا۔ انتقام کی آگ نے اس کے سارے جسم کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ چاروں طرف سے اسے انتقام۔ انتقام کی ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس سے اپنی اس بربادی کا انتقام جلد سے جلد لیکر اپنے آپ کو سکون دینا چاہتا تھا جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی میں ہزاروں مصیبتیں جھیلیں اپنے ماں باپ اور سارے رشتہ داروں سے بگاڑی جس کی خوشی کے لئے محنت مزدوری سے بھی عار نہ کیا اور اس کی ہر قربانی کا بدلہ اس نے یہ دیا ــــ

اس کے جسم میں بجائے خون کے "لفظ خون" دوڑ رہا تھا اس کے ہواس قابو میں نہ تھے۔ انتقام کے اس ذہنی انتشار کی وجہ سے نہ جانے وہ کتنے مسافروں سے بلا وجہ اڑ پڑا تھا

رتن کمار کو آج ہی صبح تار ملا تھا کہ "کلکتہ میں اس کی منگیتر لالی نے ایک رئیس آدمی سے شادی کر لی" تار کو پڑھ کر اس پر بجلی ہی تو گر گئی۔ لالی جس کے لئے اس نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔

رتن کمار کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے خوابوں کے محل کو جو ابھی زیر تعمیر ہی تھا ڈھا دیا ہو۔ رتن کمار بمبئی صرف اس لئے آیا تھا کہ کچھ پیسہ کما کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے۔ اور کچھ آرام سے لالی کو اپنی شریک حیات بنا سکے۔ وہ اس دنیا میں صرف ایک ہی مقصد کے لئے زندہ تھا اور وہ مقصد تھا لالی۔ لالی اس کی زندگی تھی اس کی دنیا تھی۔ اس کی منزل تھی۔ دنیا کی ہر چیز میں اسے لالی ہی لالی نظر آتی تھی۔

"مگر لالی نے ایسی ذلیل حرکت کی" رتن کمار دل ہی دل
میں بڑبڑایا۔ لالی نے دنیائے محبت پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔
ایسا کرکے اس نے تاج محل پر تھوکا ہے اس جرم میں
اسے جو سزا بھی ملے وہ کم نہ ہوگی۔
رتن کمار کو اس کی محبت میں پورا یقین تھا وہ ایک سال
کی اجازت لیکر اپنے شہر سے بمبئی آیا تھا ___ مگر یہ کیا؟ چھ مہینے
بعد ہی اسے اطلاع مل رہی ہے کہ لالی نے شادی کرلی۔
تار ملتے ہی اس نے اپنے مالک سے کچھ روپے ادھار
لئے چور بازار سے ایک پستول خریدا اور اپنے شہر کی طرف روانہ
ہوگیا۔
خدا خدا کر کے گاڑی اسٹیشن پر پہنچی رتن کمار نے اپنا پستول
چیک کیا اور سیدھا لالی کے گھر کی طرف چل پڑا۔
لالی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ شہر کے ایک چھوٹے
سے کمرہ میں رہا کرتی تھی۔ اور قریب ہی ایک اسکول میں ٹیچر
تھی رتن کمار کی ملاقات اس سے اسی اسکول میں ہوئی تھی۔
جب وہ کسی کام سے اسکول آیا تھا پہلی ہی ملاقات میں دونوں کی
اجنبیت برسوں کی شناسائی میں بدل گئی تھی رتن کمار کو پھر
لالی نے اپنی ماں سے بھی ملوایا تھا اس کی ماں پر بھی رتن کمار کا ایسا
اثر پڑا کہ اسے رتن کمار میں اپنے داماد کی صورت نظر آنے لگی۔
تصویر کے دونوں ہی رخ روشن تھے۔ لالی کو بھی رتن کمار سے اتنی
ہی محبت تھی جتنی رتن کمار کو لالی سے ___ اس نے بھی تصور
کے تاج محل میں بیٹھ کر گھنٹوں رتن کمار سے باتیں کیں تھیں وہ
اسی انتظار میں ایک ایک دن کاٹ رہی تھی کہ کب ایک سال
ختم ہو۔ اور اس کا رتن کمار بمبئی سے واپس آئے اور اسے
اپنی رانی بنا کر لیجائے۔ دلہن بننے کے تصور سے وہ اکثر
مسکرانے لگتی۔
مگر آج صبح جب وہ سو کر اٹھی تب ہی سے اس کا دل
کچھ گھبرا رہا تھا اپنی ماں سے اس نے اس کیفیت کا اظہار
کیا تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "یوں ہی کبھی کبھی ایسا ہوجاتا
ہے" اسی گھبراہٹ [illegible] اسکول [illegible] گئی تھی۔
جب کسی طرح [illegible] نے [illegible] کے

سہاگ کا سرخ جوڑا نکالا جو اسے بہت ہی پیارا تھا اور
اکثر نکال کر وہ اسے دیکھا کرتی تھی اس کا بہت دل چاہتا
تھا کہ وہ اسے پہن لے مگر ہر بار ماں نے اسے منع کر دیا تھا
مگر آج اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ لالی نے چوری سے
وہ جوڑا نکالا اور پہن لیا اور پھر خود بخود اس کے ہاتھ زیورات
کے ڈبے کی طرف چلے گئے جس میں اس کی ماں کی زندگی بھر
کی پونجی پنہاں تھی۔ ایک ایک کرکے اس نے سب زیور پہن
ڈالے اور یونہی گھونگھٹ نکال کر آئینہ کے سامنے جا
کھڑی ہوئی۔ جیسے ہی اس کی نظر آئینہ پر پڑی اس نے
اس کے اندر رتن کمار کا چہرہ دیکھا مگر اس وقت اس کی
صورت میں اسے اپنی موت کا فرشتہ نظر آیا ابھی پلٹ کر
اس نے دیکھنا ہی چاہا تھا کہ فضا میں تین دھماکے
ہوئے اور رتن کمار کی گولیوں نے لالی کا جسم چھلنی کر دیا۔
ایک آہ بھر کے وہ زمین پر جا گری۔
"کمینت، ذلیل، بے وفا دیکھا تو نے فریب کا
نتیجہ" وہ وحشی درندے کی طرح چلایا تو نے شادی کی ہے
نا ایک رئیس سے؟
"شادی کیسی شادی؟ میں تو آپ کا انتظار کر رہی
ہوں" لالی نے موت کی سسکیاں لیتے ہوئے یہ الفاظ ادا
کئے۔ "تو پھر یہ سہاگ کا جوڑا؟" رتن کمار نے حیرت
سے سوال کیا۔ "یہ ماں کا جوڑا تو میں نے یوں ہی پہن لیا تھا
کیا اس کی سزا اتنی بڑی ہوا کرتی ہے؟ میرے مالک میرے
سرتاج مجھے معاف کر دیجئے۔ میں شرمندہ ہوں۔
م۔۔ما۔۔۔۔۔۔۔۔ ماف ک۔۔۔۔ک۔۔کر دیا نا؟"
اتنا کہہ کر لالی کی روح نے جسم کی قید سے رہائی پائی۔
رتن کمار پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا وہ ایک بت
کی طرح بے جان کھڑا رہ گیا مگر اب بھی اس کے ذہن
پر "خون ہی سوار تھا مگر لالی کا نہیں بلکہ اس کا جس نے
اسے جھوٹا تار دیکر فریب دیا تھا۔

●●

ستارہ جہاں دہلی

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

تھے۔ زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں سے آنکھیں
چار کرتے ہوئے فانی ڈرتے تھے وہ
اپنی پسند اور خواہش کے مطابق زندگی
اور ماحول میں تبدیلی نہیں لا سکے تھے۔
اس لئے وہ زندگی سے متنفر اور موت کے
آرزومند تھے۔

فانی نے جس انداز میں موت کا ذکر کیا ہے
وہ ان کی بے پناہ خواہش مرگ، موت سے
محبت اور اس کی دلربائی کو ظاہر کر دیتا ہے
موت ہی فانی کا محبوب ہے، ہجر کے مارے
نامراد عاشق کی طرح وہ اپنی موت کا
انتظار کرتے رہے ؎

آج روزِ وصال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

موت کی امید اور آسرے میں زندگی
کے دن کاٹ دیتے ہیں۔ درد و غم، رنج و
الم کا علاج موت کو سمجھتے ہیں یاس و حرماں ان
کی طبیعت و مزاج میں داخل ہے۔ اسی یاس
کے ذریعہ وہ موت سے باخبر ہوتے ہیں ؎

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانی ناامید کو موت کا آسرا دیا

فانی کی زندگی جس انداز سے گزری،
یاس و ناامیدی اور ناآسودہ زندگی کے جس
المناک دور سے وہ گذر رہے تھے اس نے
انہیں زندگی میں ہی موت کی آغوش میں
ڈال دیا ؎

یا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
اس ناکام کے دل سے تو پوچھے زندگی کیا ہے

---

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یا رب
موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیے تھا

عالم کے ہر ذرے میں وہ اپنے محبوب کو
جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ کائنات کی حرکت انہیں
محبوب کی آمد کا پتہ دیتی ہے اور وہ بے خود
ہو جاتے ہیں۔ بہار کی آمد آمد ہے مگر فانی نہ
گریباں چاک کر کے دیوانے بنتے ہیں اور
نہ قیس کی طرح زنجیر کی جھنکار سنتے ہیں بلکہ
بہار کی خوش منظر فضا میں بوئے کفن پاتے
ہیں اور موت کا پیغام سنتے ہیں ؎

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کچھ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے

ان کی ساری عمر ہجر و فراق میں کٹی۔ موت
آئی، گویا محبوب سے وصال ہوا، ہجر کی کلفتوں
اور زندگی کی محرومیوں کا خاتمہ ہوا، موت
کی آغوش گویا محبوب کی آغوش ہے۔ کتنی
مبارک کتنی کیف انگیز ؎

اجل کو مژدۂ فرصت کہ آج فانی زار
امید وصل سے بیٹھا ہے لو لگائے ہوئے

موت کا انتظار ساری عمر رہا۔ یہ انتظار رہا
والہانہ اور نشاط انگیز تھا ؎

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

فانی کے خیال میں زندگی ایک اندوہناک
اور کربناک مریضانہ تسلسل ہے جس کا انجام
موت کے ذریعہ ہی ممکن ہے ؎

لو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا
تیرے بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

---

آئی ہے۔ تیرے بیمار کے نہ پردوں
جان گیا ہم سے نکلی کوئی ارمان نکلا

فانی نے اپنی شاعری اور کلام کے ذریعہ
ہمیں زندگی کے مثبت پہلوؤں سے روشناس
نہیں کرایا ان کے کلام میں نشاط زندگی کا کوئی
پیغام نہیں ملتا۔ ان کے یہاں ہر طرف ایک
اداسی، سوگواری ناآسودگی، محرومی اور
غم انگیزی کی فضا ملتی ہے ان کی شاعری
ہماری روح کو بالیدگی اور حرارت نہیں بخشتی
بلکہ تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ فانی کی
اس غم پسندی، مرگ پرستی اور فراری ذہن
کی وجہ سے مجنوں گورکھپوری نے ان کی شاعری کو
"موت کی انجیل" کہا ہے۔

فانی سے پہلے اردو شاعری میں موت، غم،
حرماں اور بے ثباتی عالم پر شعرا کے اشعار ملتے
ہیں مگر یہ عنوانات فانی کے یہاں آکر حقیقی اور
عالمگیر بن گئے۔ میر و غالب کے یہاں بھی غم و
اندوہ اور انسان کی نارسائی اور ناآسودگی
موجود ہے مگر ان کے یہاں غم کا حقیقی عرفان
بھی پایا جاتا ہے جو زندگی کو گوارا اور حلاوت
بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار
دیئے جاتے ہیں جن سے فانی کی مرگ پرستی
اور موت سے بے پناہ محبت کا اندازہ
لگایا جا سکتا ہے ؎

سکون قلب میسر ہے موت ہی سے سہی
غرض کہ خاتمۂ رنج اضطراب ہوا

جان فانی ترے کرم پہ نثار
تو نے بخشی حیات مرگ نواز

آکر پلٹ نہ خالی اے مرگ جان لے جا
فانی کے سر یہ تیرا احسان رہ نہ جائے

جناب راقم کانپوری

وائے قیمت عظمتِ ہندوستاں خطرے ہے
یہ وطن یہ خطۂ جنت نشاں خطرے میں ہے
آشیاں کا تذکرہ کیا گلستاں خطرے میں ہے
دوستو! گہوارۂ امن و اماں خطرے میں ہے

فتنہ سامانی میں ہے سرگرم ہر فرقہ پرست
تم کو عزمِ نوجواں سے ان کو دینی ہے شکست

کیا قیامت ہے کہ خود پر بھی نہیں ہے اعتماد
کب تلک روشن رہے گا شعلۂ بغض و عناد
آج بھی ارضِ وطن پر ہو رہا ہے کیوں فساد
بھیمڑی اور چائباسہ کیا نہیں ہے تم کو یاد

آؤ ہم سب مل کے اس طوفاں کے رُخ کو موڑ دیں
ظلم کے جو ہاتھ اُٹھیں ہم بڑھ کے اُس کو توڑ دیں

نذرِ بربادی ہزاروں دَم زدن میں ہو چکے
کیسے کیسے پھول افسردہ چمن میں ہو چکے
جذب کتنے خون تارِ پیرہن میں ہو چکے
آہ کیسے کیسے ہنگامے، وطن میں ہو چکے

تم کو دیتا ہے صدائیں مرنے والوں کا لہو
اَب تمہارے ہاتھ میں ہے اس وطن کی آبرو

ہوش میں اب بھی نہ آؤ گے تو پھر پچھتاؤ گے
درسِ عبرت تم زمانے کے لئے بَن جاؤ گے
تم نہیں سیلابِ بربادی پہ قابو پاؤ گے
پست ہمت صفحۂ تاریخ میں کہلاؤ گے

حوصلوں سے راہِ مستقبل کو تابندہ کرو
دورِ ماضی سے سبق لو، فکر آئندہ کرو

ظالموں کے واسطے تیغِ قضا بَن کر اُٹھو
قوم کے دشمن پہ اِک برق بلا بَن کر گرو
امنِ عالم کے لئے اِک قافلہ بَن کر چلو
اس طرح تم اندرا کے ہمنوا بَن کر رہو

لازمی ہے جنگ اب فرقہ پرستی کے خلاف
تم حریفِ فتنہ سامانی ہو کہہ دو صاف صاف

# جہاں قوم کا مستقبل پلتا ہے

اس عنوان کے تحت ہر ماہ دلی کے کسی اسکول کا دورہ کر کے اس کے حالات پیش کئے جائیں گے۔ اس کے اساتذہ و طلبہ کی شکایات و تکالیف کی طرف متعلقہ حکام سے توجہ کی درخواست بھی کی جائے گی۔

اس ماہ گلی فرحت اللہ بیگ کوچہ پنڈت دہلی کے اسکول کا ذکر پیش کیا جا رہا ہے۔

ادارہ

از:- قریشی ایم-اے

آپ نے دہلی میں بہت سے اسکول دیکھے ہوں گے۔ ایسے اسکول بھی دیکھے ہوں گے جو صرف خیموں میں لگتے ہیں۔ اور ایسے بھی جن کے پاس بڑی بڑی بلڈنگیں ہیں۔ لیکن میں آپ کو ایک ایسے اسکول کی جھلک دکھانا چاہتا ہوں جس کو آپ مکمل طور پر اسکول کہہ سکتے ہیں۔ یہ اسکول گلی فرحت اللہ بیگ میں واقع ہے۔ اور اسکول کا نام ہے ایم سی اسکول کوچہ پنڈت۔

اس اسکول کی دونوں شفٹوں میں سات سو طلبا ر تعلیم پاتے ہیں۔ طلبا ر کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اسکول کی عمارت بہت ہی چھوٹی ہے۔ لیکن اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب شریعت اللہ صاحب اور اسکول کے اسٹاف کے عمدہ انتظام کی وجہ سے اس کمی کو بڑی حد تک محسوس نہیں کیا جاتا۔ اسکول میں پڑھائی کا عمدہ انتظام ہے۔ بورڈ کا نتیجہ ہر سال شاندار رہتا ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ہی اسکول نے کھیلوں میں بھی اپنا نام روشن کر رکھا ہے۔ تھرو بال کی ٹیم بہت شاندار رہتی ہے۔ اپنے پورے زون میں اس سال بھی دوسرے نمبر پر ہے۔ اور سنٹر میں بھی سیمی فائنل تک بہت شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دو کھلاڑیوں کے چوٹ لگ جانے کی وجہ سے ٹیم آگے نہ چل سکی۔ اسکول نے کھیلوں میں پندرہ انعامات حاصل کئے ہیں۔ کھیلوں میں گیمس کے انچارج جناب ماسٹر ظہیر احمد صاحب اور جناب مرغوب عالم صاحب بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اور بچوں کے ساتھ بڑی محنت کرتے ہیں۔

اس سال اسکول میں ایک چھوٹے سے سائنس روم کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔ بچوں کو چھوٹے چھوٹے تجربے کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے بچے سائنس میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے

۔ جناب اظہر حسن صاحب بچوں سے تجربے کرا کر بھی دیکھتے ہیں۔

اسکول میں بچوں کی پڑھائی اور تفریح کے لئے ٹیلی ویژن ہے۔ دن میں ٹیلی ویژن کی مدد سے بچوں کو سبق پڑھایا جاتا ہے۔ اور ہفتہ میں دو بار رات کے وقت بچوں کو ڈرامے، فلم اسی طرح کے دوسرے پروگرام بھی دکھائے جاتے ہیں۔

اسکول کا ڈسپلن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ خاص طور ہیڈ ماسٹر شریعت اللہ صاحب ہر وقت بچوں کی اور استادوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔

اسکول میں ایک کلنک بھی ہے جہاں زخمی بچوں کے مرہم پٹی باندھی جاتی ہے۔ اس کا انتظام ریڈ کراس سوسائٹی کرتی ہے جس کے انچارج ماسٹر مسیح الزماں ہیں جو نہایت محنت اور تندہی سے اپنے فرائض کو انجام دیتے ہیں۔

المختصر یہ اسکول صحیح معنوں میں صحت مند تعلیمی درسگاہوں میں سے ہے۔ جہاں پر اچھے شہریوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

# طبیب اور مریض

مریض:- ڈاکٹر صاحب! آپ مجھ سے فیس نہ لیجئے۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ جس طرح آپ مرے کام آئے ہیں، میں بھی ایک دن آپ کے کام آؤں گا۔ اور آپ کا کام مفت کر دوں گا۔

ڈاکٹر:- اچھا۔ تم کام کیا کرتے ہو؟

مریض:- جی۔ میں قبریں کھودتا ہوں۔

---

مریض:- ڈاکٹر صاحب! میں ایک بڑی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوں۔

ڈاکٹر:- کیا بیماری ہے آپ کو؟

مریض:- کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب —— جب میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

---

مریض:- ڈاکٹر صاحب! کھانسی تو بند ہو گئی ہے البتہ سانس رُک رُک کر آتی ہے۔

ڈاکٹر:- گھبراؤ نہیں۔ وہ بھی بند ہو جائے گی۔

---

مریض:- ڈاکٹر صاحب مجھے کھانسی ہے۔

ڈاکٹر:- گھر جا کر خوب ٹھنڈے پانی سے نہاؤ۔ دہی، برف اور آئس کریم کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرو

مریض:- کیا اس سے میری کھانسی ختم ہو جائے گی؟

ڈاکٹر:- یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر یہ سب کچھ کرنے سے تمہیں نمونیا ہو جائے گا۔ اور اس کا علاج مجھ کو آتا ہے۔

---

مریض:- ڈاکٹر صاحب! میں بہت گھبرا رہا ہوں کیوں کہ یہ میرا پہلا آپریشن ہے۔

ڈاکٹر:- بھائی! میں بھی بہت گھبرا رہا ہوں۔ کیوں کہ میرا بھی یہ پہلا آپریشن ہے۔

# فانی اور موت

جناب اشتیاق احمد لاری

فانی کا تعلق عہد جدید کے اُن شاعروں سے ہے جنھوں نے غزل کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا اور اس کی مٹتی ہوئی آبرو کو بچایا۔ آزاد، حالی اور شبلی کی کوششوں سے اردو ادب کا عصرِ اصلاح شروع ہو چکا تھا اور جدید شاعری کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ فانی نے اس قدیم صنف میں اپنا نیا راگ چھیڑ دیا اور بہت جلد ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔

ادیب یا شاعر اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اپنے زمانہ، ماحول اور گرد و پیش کے دھارے سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ اثر پذیری شاعر اور ادیب کے لئے بڑی ناگزیر ہوتی ہے۔ وہ کسی طرح بھی ماحول کے اثرات و میلانات سے دامن نہیں بچا سکتا۔ فانی بھی اپنے عہد کی تخلیق ہیں اور اپنے زمانے اور ماحول سے خاص طور پر متاثر بھی ہیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر انھوں نے اپنے عہد کے میلانات کو قبول کیا ہے۔ ان کے کلام سے بڑی حد تک اس دعوی کی تصدیق ہوتی ہے۔

فانی جس زمانے کی تخلیق ہیں وہ نہایت پُر آشوب اور کش مکش کا زمانہ ہے، برطانوی اقتدار ختم ہو رہا تھا۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے والی تھیں۔ آزادی اور حریت کے نعرے پورے ملک میں بلند ہونے لگے تھے لیکن یہ سیاسی کشیدگی سماجی اور اقتصادی بدحالی کا سبب بن رہی تھی۔ فانی ایک خوشحال گھرانے کے فرد تھے، مگر اپنے لاابالی پن اور افتاد مزاجی کے سبب بہت جلد زندگی کی سب سے زیادہ تلخ و سنگین حقیقت، معاشی مشکلات سے دوچار ہو گئے۔ عشرت عسرت میں بدل گئی، اس نئی صورت حال کا مقابلہ انھوں نے کیا، زندگی کی تلخی کو بہر نوع برداشت کیا۔ اسے آبِ حیات سمجھ کر پیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فانی کے دل و دماغ پر ہمیشہ غم کے بادل منڈلاتے رہے۔ یاس، حرماں، رنج و الم نے ان کے دل و دماغ پر تسلط قائم کر لیا۔ زندگی اور اس کی حقیقتیں تلخ معلوم ہونے لگیں، اور موت ایک خوبصورت علاجِ غم نظر آنے لگی۔ ایسا علاج جو فانی کو زندگی کی تمام الجھنو[ں] اور مصائب و آلام سے نجات دے سکتا تھی۔

اے اجل اے جانِ فانی تو نے یہ کیا کر دیا
مار ڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا

فانی فطرت کی طرف سے غم پسند اور الم [پر]ور طبیعت لے کر آئے تھے۔ ماحول کی ناسازگار[ی] اور زمانے کی تلخیوں نے انہیں زندگی سے فر[ار] اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ زندگی کی تلخیو[ں] سے گھبرا کر موت کے دامن میں پناہ ڈھونڈ[نے] لگے۔ وہ زندگی اور دنیا سے کبھی سمجھوتہ نہ کر سک[ے]۔ زندگی اور اس عالم کو سمجھنے کے لئے تا حیات کوشاں رہے۔ مگر اس کے اسرار و رموز سے وہ کبھی آگاہ نہ ہو سکے۔ غالب کی طرح انھو[ں] نے فطرتِ انسانی اور حیات و ممات کی پیچید[گیاں] سلجھانے کی کوششیں کیں مگر ذہن و دم[اغ کی] جس بیداری سے غالب نے کائنات کا مط[العہ] کیا تھا فانی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی وجہ ہے کہ غالب نے زندگی کو اس کی الجھنو[ں] اور مصائب و آلام کو گوارا بنا لیا تھا۔ او[ر] وہ اس دنیا میں جینے پر تیار ہو گئے، حالانک[ہ] زندگی کی جن سنگین حقیقتوں کو جھیل رہے [تھے] غالب ان سے بھی زیادہ سنگین حقیقتوں سے دوچار ہو چکے تھے۔ فانی زندگی سے فرا[ر]

طالب علموں کیلئے – طالب علموں کے ذریعے

سنہ ۱۹۷۰ء

۴ —— شمارہ —— ۱۱

—— پچیس پیسے

—— تین روپئے

## مجلس ادارت



شاہجہاں میں شامل افسانوں میں نام، مقام و واقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں۔

**شاہجہاں آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (A.I.S.N.E.C) نئی دہلی کا ممبر ہے۔**

# ہمارے مقاصد

## طالب علموں ——

—— میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا
—— کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا
—— کو ملک و ملت کی با مقصد خدمت کے لئے تیار کرنا
—— میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا
—— کی آواز کو عوام تک پہنچانا
—— کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا —— اور
—— سماجی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا۔

ادارہ

**شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے اور غزلیں و نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول و کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں۔**
**ادارہ**



طابع، ناشر و مالک —— محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ —— اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

مقام اشاعت: قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی نمبر ۶

# چراغ



خطاط : محمد نورالحق نیپالی
عبدالمجید آزاد بجنوری

سرورق:
CONFUSED FUTURE
غیر یقینی مستقبل

تزئین: صدیقی

# لمحۂ فکر

اداریہ

ہم گزشتہ چند ماہ سے دلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ان بدعنوانیوں کو منظر عام پر لا رہے ہیں تو وہ صدر شعبہ اردو یا کسی بھی لکچرار یا ریڈر سے کسی قسم کی رنجش یا دشمنی کے سبب نہیں ہے بلکہ اپنے ساتھیوں کے کیریر کے "ناجائز" خون،، اور ان کے ساتھ ہوئی زیادتیوں نے ہمارے قلم کی بے باکی و بے لاگی کو چیلنج کیا جسکو اس نے قبول کر کے اپنے ساتھیوں اور ہر حلقے میں شرف قبولیت حاصل کیا۔ ہماری یہ بے باکی صرف شعبہ اردو دلی یونیورسٹی تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کے کسی بھی کالج / یونیورسٹی میں طلبار کے ساتھ ناجائز زیادتیوں اور بے انصافیوں کے لئے وقف ہے۔ ہم نہ کسی کو کسی منصب سے ہٹانا چاہتے ہیں اور نہ کسی کو لگانے کے خواہش مند ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں طلبہ کے ساتھ انصاف ہو۔ ان کی کیریر کو کسی گروپ بندی یا ذاتی مفادات یا رنجش کے تحت تباہ نہ کیا جائے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ امسال دلی یونیورسٹی کے اردو ایم۔ اے۔ کا رزلٹ نہ صرف "تاخیر سے آیا بلکہ اتنا گندہ اور مایوس کن تھا جس کی یونیورسٹی کی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ نتیجہ کے طور پر ہر ایک نے موجودہ رزلٹ کو شک کی نگاہ سے دیکھا۔ اور چونکہ اس مرتبہ کچھ ایسے ہونہار طلبہ جو ہمیشہ سے فرسٹ رہے ہیں اور اس بار بھی (بقول کچھ اساتذہ) ان سے اچھی توقعات وابستہ تھیں سیکنڈ ڈویژن سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس لئے اس بات نے لوگوں کے عام خیال (رزلٹ مشکوک ہے) کو تقویت پہنچائی۔ یونیورسٹی کیمپس میں پوسٹر بھی دیکھے گئے۔ چند ذمہ دار اساتذہ کو بھی اسی مرکز خیال کا حامل پایا گیا۔

کچھ طلبہ نے کاپیاں دوبارہ جانچنے کے لئے درخواستیں دیں۔ لیکن جواب میں یونیورسٹی کا چھپا ہوا خط اور جو نتیجہ نکلا ہے درست مانا۔ ایک طالب علم نے کنٹرولر امتحانات دلی یونیورسٹی کا وہ خط دکھایا جس میں اس کو مطلع کیا گیا تھا کہ آپ کے دو نمبر پرچہ (E) V میں گنتی میں رہ گئے ہیں۔ آپ مارکس شیٹ بھیج دیں تاکہ نمبر بڑھا دیئے جائیں۔ اس طالب علم نے کنٹرولر صاحب کو مطلع کیا کہ حضرت آپ میرے (E) V پرچے میں دو نمبر بڑھانے کی بات تحریر کر رہے ہیں جبکہ میں نے اس پرچے کا امتحان ہی

نہیں دیا ۔ میں نے تو (C) V پرچے کا امتحان دیا تھا۔ جواب آنا تھے۔ جو پرچہ ہم نے (E) V لکھا تھا درحقیقت وہ (C) V ہی ہے ـــــ ایک خط جو کہ ذمہ دار افسران کے ہاتھ سے نکل کر آتا ہے اس میں بھی ایسی فحش غلطی ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ یونیورسٹی میں نتیجہ بناتے وقت پوری توجہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ بہت ممکن ہے کہ باقی ماندہ طلبہ کی کاپیاں بھی اسی غفلت کا شکار رہوئی ہوں۔

اب یہ معلوم ہوا ہے کہ ان ،،مظلوم،، طلبہ (ایم۔ اے۔ فائنل اور سالِ اول کا امتحان دینے والے) نے موجودہ رزلٹ پر اپنی بے چینی اور بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے وائس چانسلر ڈاکٹر کے۔ این۔ راج کو الگ الگ میمورنڈم پیش کئے ہیں۔ اپنے ان میمورنڈم میں انھوں نے جو الزامات عائد کئے ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو وہ اس قدر سنگین اور گھناؤنے ہیں کہ ان کو سنکر درندگی بھی خون کے آنسو روئے۔ کسی کا مستقبل برباد کر دینے کا جرم کسی کو قتل کر دینے کے جرم سے زیادہ خطرناک اور نہایت عبرتناک سزا کا مستحق ہے۔ انھوں نے اپنے میمورنڈم میں کہا ہے کہ ان کی مارکس شیٹ میں دیئے گئے نمبر وہ نمبر نہیں ہیں جو ان پرچوں کے ممتحن نے انہیں دیئے ہیں۔ بلکہ ممتحن حضرات کے دیئے گئے نمبروں کو یونیورسٹی میں غیر قانونی طور پر وضع کیا گیا ہے جس سے اکثر طالب علموں کا تعلیمی کردار تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔

طالب علموں نے اس پورے فراڈ کی ذمہ داری شعبہ اردو کے صدر ہونے کے ناطے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی صاحب پر عائد کی ہے اس سلسلے میں ان لوگوں نے بارہا وائس چانسلر صاحب سے ملنے کی کوشش کی۔ مگر ہر بار ان کے پی۔ اے۔ صاحبان راستے میں دیوار بن جاتے ہیں۔ اور یہ کہہ کر کہ آپ کی شکایات پر غور ہو رہا ہے۔ ٹال دیتے ہیں۔ ڈیڑھ ماہ کا طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ اس دوران نہ تو وائس چانسلر صاحب نے طلبہ کو طلب کیا۔ اور نہ ہی کوئی خاطر خواہ جواب دیا۔ جس کی وجہ سے طلبہ میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ بے چینی (خدانہ کرے) کوئی غلط رخ اختیار کرے یا کوئی سیاسی پارٹی اپنے مفاد کی خاطر بیچ میں کود پڑے۔ ضروری ہے کہ طلبہ کو مطمئن کر دیا جائے۔ اور ان کے عائد کردہ الزامات کی تصدیق کے لئے آزادانہ انکوائری کرائی جائے۔ اور طلبہ کو ان کے اصلی نمبروں سے (اگر صحیح ہے تو) جو ان کے ممتحن حضرات نے دیئے ہیں، سے نوازا جائے۔ اس سے جہاں طلبہ کا کردار تباہ ہونے سے بچ جائے گا وہاں یونیورسٹی کا وقار بلند ہوگا۔ اور مفاد پرست عناصر کو سر اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔

---

## ڈاکٹر راج مستعفی

دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر کے۔ این۔ راج کے اچانک استعفیٰ نے تعلیمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی میں ایسے عناصر کی کثرت ہے جو مسائل کو حل کرنے کی بجائے نئے نئے مسائل پیدا کرتے ہیں یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلے وائس چانسلر ہیں جو نوجوان، نڈر اور اصلاح پسند ہیں ـــــ طلبہ و اساتذہ کی بیشتر انجمنوں نے ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی ہے اور کہا ہے کہ ان عناصر کو منظر عام پر لائیے تاکہ ہم بھی آپکے ساتھ ملکر انکا مقابلہ کریں ـــــ کہا نہیں جا سکتا کہ وہ استعفیٰ واپس لیں گے یا نہیں ـــــ اگر انھوں نے استعفیٰ واپس نہیں لیا تو یونیورسٹی کی تاریخ کا اہم اور سنہری باب ختم ہو جائیگا اور یہ رستا ہوا ناسور یونیورسٹی کو تباہ کر دے گا۔

وہ توڑ ہی نہیں سکتا تھا ـــــ اسے ہمیں یونیورسٹی کے کاموں سے باہر رکھنے کا کوشش کر رہا تھا ـــــ
بشکریہ ہندوستان ٹائمز

# مصر یتیم ہو گیا!



۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کی صبح خبروں سے کالے اخبارات بڑے موٹے کالے لفظوں میں اعلان کر رہے تھے کہ موت کے بے رحم اور ظالم ہاتھوں نے نہ صرف مصر سے اس کے عظیم رہنما، سرپرست اور رہبر کو چھین کر اس کو یتیم کر دیا ہے بلکہ ہم کو بھی ہمارے ایک مخلص دوست سے محروم کر دیا ہے۔ صدر ناصر کا اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

ناصر کی موت سے نہ صرف مصر میں تہلکہ مچ گیا۔ بلکہ پوری عالمِ انسانیت دُکھ و غم سے چیخ پڑی۔ مصر میں لوگ سڑکوں پہ روتے ہوئے دیوانہ وار نکل آئے۔ قاہرہ میں لوگ اپنے محبوب رہنما کے آخری دیدار کرنے کے لئے جوق در جوق آنے شروع ہو گئے۔ بیرونی ممالک کے اکثر نمائندے سرزمین مصر پہ قدم رکھتے ہی آنسوؤں میں نہا گئے۔ ان کی بیوہ نے کہا۔ "ناصر میرے لئے نہ صدر تھے اور نہ رہنما وہ میرے شوہر تھے میں انھیں کے ساتھ دفن ہونا چاہتی ہوں" ان کے قریبی دوست محمد حسنین ہیکل کے کانوں میں ان کے آخری الفاظ گونج گئے۔ "میں گہری نیند سونا چاہتا ہوں"۔ پوری دنیا میں تعزیتی جلسے ہوئے اور ہر ایک نے جس طرح بھی ممکن تھا اپنے غم کا اظہار کیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء کو انکی تدفین عمل میں لائی گئی۔ جنازے کے ساتھ پچاس لاکھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ مصر کی پچھلی ایک ہزار سال کی تاریخ میں اتنے بڑے اجتماع کی کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ صدر ناصر دنیا کے واحد صدر ہیں جن کی موت نے تمام دنیا کو اس قدر متاثر کیا۔ مصر کے کئی طلبہ نے اس سانحہ کو برداشت کرنے کی اپنے اندر ہمت نہ پا کر موت کو گلے لگا لیا۔ مجمع میں ہر تیسرے منٹ بعد ایک آدمی بیہوش ہوتا تھا۔ اس طرح ہسٹریا دورے کی کثرت بھی تا حال کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ جلوسِ جنازہ کی کمنٹری کرتے ہوئے دو اناؤنسر بھی اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور رو دیئے۔

آج صدر ناصر ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ آج ان کا جسم ہمارے سامنے نہیں ہے۔ مگر ان کے افکار، ان کی تعلیم اور ان کے خیالات تا قیامت ہمارے ساتھ رہیں گے۔ انھوں نے جس کردار، اخلاق، جدوجہد اور عزم کا اپنی زندگی میں مظاہرہ کیا وہ نہ صرف مصر اور عرب دنیا کے نوجوان طبقہ کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔ بلکہ ہمارے لئے بھی معاون بنیں گے۔ ہم اپنی طرف سے اور اپنے [illegible] رسالے کی طرف سے اظہارِ عقیدت کرتے ہیں اور [illegible] دعا کرتے ہیں کہ وہ عرب دنیا کو عموماً اور مصر کو خصوصاً کرنل ناصر جیسا ہی نڈر، بے باک، بہادر اور [illegible] عطا کرے۔ [illegible]

ادارہ

# صدر جمال عبد الناصر

## اصول اور کردار کے آئینے میں

جمال عبد الناصر، شمالی مصر کے آسیوط گورنری کے معمولی سے گاؤں انبی مور میں ۱۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو ایک متوسط درجہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی وجہ سے ان کے والد ماجد کو کئی جگہ کا آب و دانہ کھانا پڑا۔ اس لئے جمال عبد الناصر کو متعدد مرتبہ اسکول بدلنے پڑے۔ پندرہ برس کے ہوتے تو ان کے اندر غیر معمولی سیاسی آگہی بیدار ہو گئی۔ مصر کے حالات کا ان کے دل و دماغ پر گہرا ردّ عمل ہونے لگا اور غیر ملکی سامراج کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ ان کے خیالات پر حاوی ہونے لگا اور ان کے مستقبل کی نوک پلک سنوارنے لگا اور وہ سامراج اور شاہی محلوں کی ملی بھگت سے ہو رہی سازشوں اور عوام کی تحریک آزادی کچلنے والے اقدامات کے خلاف مظاہروں میں شریک ہونے لگے۔

النہضۃ المصریہ اسکول میں جواں سال جمال عبد الناصر کی یہ سرگرمیاں برابر جاری رہیں جو اسکندریہ میں شروع ہو گئی تھیں۔ تحریک مزاحمت کے متعلق جو کمیٹی بنائی گئی جمال اس کے سربراہ بنے اور انھوں نے سامراج کے خلاف پُرزور مظاہرہ میں حصہ لیکر آزادی اور سامراج کے خاتمہ کا مطالبہ کیا۔ ان دونوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے۔ "ان دنوں، میں نے النہضہ اسکول میں کتنے ہی مظاہروں میں شرکت کی اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا لیکن ہمارا شور و غل بے کار گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ہماری صدا میں وہ اثر نہیں کہ پہاڑ ہل جائیں چٹانیں پاش پاش ہو جائیں۔"

۱۹۳۶ء میں جمال عبد الناصر النہضہ اسکول سے ہائر سکنڈری اسکول پاس کرنے کے بعد قاہرہ یونیورسٹی میں شعبہ وکالت میں داخل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے پانچ مہینے گذارے ہوں گے جب ملٹری اکیڈمی نے چند طلبا منتخب کرنے کا اشتہار دیا۔ جمال عبد الناصر نے درخواست دی اور منتخب ہو گئے۔ اکیڈمی میں لڑکوں کی کل تعداد ۹۰ تھی۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے برطانیہ اور مصر میں معاہدہ ہو جانے کی بدولت یہ تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ملٹری اکیڈمی سے گریجویٹ بن جانے کے بعد آپ پیدل فوج —— انفنٹری —— میں بھرتی ہو گئے۔ اور آسیوط میں منکاباد تعینات کر دیئے گئے، جہاں ان کی ملاقات انور السعادت اور ذکریہ محی الدین سے ہوئی۔ یہاں ملازمت کرتے ہوئے سیکنڈ لفٹیننٹ جمال عبد الناصر کے دل

ں بغاوت اور انقلاب بر پا ، کے خیالات پنپنے لگے۔ فوج میں پھیلی
ئی بے حسی اور کورپشن دیکھ کر ان کا دل کڑھتا تھا۔ لیکن یہ بے بس
ے اور اصلاح و انسداد کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ فوجی ملازمت
ے سلسلے میں انھیں پہلے سوڈان جانا پڑا۔ پھر قاہرہ میں اور بعد ازاں
ہیں مغربی صحرا میں العلمین میں تعینات کر دیا گیا۔ اس وقت وہاں
ب واقعہ رُونما ہوا جس نے ، انقلاب کے خیالات نے اب ٹھوس شکل
ورت اختیار کرنے کا عزم کر لیا۔

۴ فروری ۱۹۴۲ء کو برطانوی مقبوضہ فوج نے اپنے ٹینکوں
عابدین محل کو گھیر لینے کے لئے بھیجا تاکہ شاہ فاروق کو مجبور کر دیا
ئے کہ وہ مصطفےٰ النحاس پاشا کو وزیر اعظم مقرر کرے اور انہیں
ریزوں سے تعاون کرنے والی حکومت بنانے کی آزادی دیدے
ں واقعہ کا جمال عبدالناصر پر گہرا اثر ہوا اور انھوں نے اپنے
ست کو لکھا۔ اب پانی سر سے اونچا گزرتا جا رہا ہے۔ ان حالات
ں جب ہم نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے اُسے خاموشی
ے برداشت کر لیا ہے ہمیں کیا کرنا چاہئے ؟ میرا یقین ہے کہ
امراج نے ہمیں مرعوب اور خوف زدہ کرنے کے لئے یہ چال چلی
ہے۔ لیکن ایک دفعہ سامراجیوں کو یہ علم ہو جائے کہ بعض مصری
اخون بہا دیں گے اور ان کا رستہ روک لیں گے اور طاقت
مقابلہ طاقت سے کریں گے تو بھاگ کھڑے ہوں گے۔

اس عرصہ میں جمال عبدالناصر اپنے رفقاء میں سے ہم خیال
رہم نظریہ دوستوں کو منتخب کر رہے تھے جو مصر کی صورت حالات
متعلق ان کی طرح دل برداشتہ ہوں اور خطرہ مول لے کر
لات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہوں۔ ان دنوں کے
دائی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے جمال عبدالناصر نے کہا: "اس
ت چند مخلص دوستوں کا مختصر سا گروہ تھا جو اپنے خیالات کا مشترکہ
ں کی صورت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دنوں میں نے مشہور
رخوں اور دانش وروں، مثلاً لاسکی، نہرو اور ایے جون ڈ، لکھی
ہوئی کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا اور میرے دل میں آہستہ آہستہ
مگر یقینی طور پر سوشلسٹ خیالات پنپنے شروع ہو گئے۔"

۱۹۴۸ء میں جو حالات ہوئے انھوں نے جمال عبدالناصر
کے تیار کئے ہوئے خاکہ کو عملی جامہ پہنانے کے عمل کو تیز تر کر دیا۔
جب ۱۴ مئی کو برطانیہ نے فلسطین پر انتداب میڈیٹ
( Mandate ) ختم کر دی اور بن گورین نے قیام اسرائیل
کا اعلان کر دیا۔ اگلے دن حکومتِ مصر نے اعلانِ جنگ کر دیا۔
اور مصری فوجوں نے کوچ کر دیا۔ ۱۶ مئی کو وہ جنگ لڑنے کے
لئے فلسطین روانہ ہو گئے۔ فلوجہ کی جنگ میں جمال عبدالناصر زخمی
ہو گئے۔ جب ایک گولی ان کے دل کے چند انچ اوپر آ کر لگی۔
انھیں غزہ ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ لیکن یہ ہسپتال سے بھاگ کر
پھر سے اپنی فوجوں سے آن ملے اور میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

مسٹر میتھیو رینا ٹو فی ( Mathieu Renato
Bertoud ) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب میں لکھا ہے :۔
مصر پر برطانیہ اقتدار اور مسئلہ فلسطین نے جواں سال جمال
عبدالناصر کے دل و دماغ پر گہرا اثر پیدا کیا۔ فوجی ملازمت کے
دوران میں انھوں نے عہدِ فاروق میں مصر کی زبوں حالی اور
کورپشن دیکھی تھی۔ اور محسوس کیا تھا کہ اس کورپشن کی وجہ سے
فلسطین میں مصری فوجوں کو شکست دیکھنی پڑی۔ جمال عبدالناصر
اس نتیجہ پر پہنچے کہ ملک کو کورپشن سے بچانے کے لئے ضروری ہے
کہ فوج ملک کا نظم و نسق چلانے کی ذمہ داری سنبھال لے۔"

جمال عبدالناصر نے آزاد فوجی افسروں کی تحریک اور
اس کی سرگرمیوں کو منظم کرنے کا کام جاری رکھا۔ اس ادارے
کی طرف سے پہلا پمفلٹ نومبر ۱۹۴۹ء کو جاری کیا گیا۔ جو جمال عبدالناصر
کی تنظیمی صلاحیتوں کا روشن اور واضح ثبوت تھا۔ اس تنظیم نے
فوج اور فوج کے باہر کے لوگوں پر ملکی زبوں حالی سے آگاہ کرتے
ہوئے انقلاب کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے پانچ خاص

کمیٹیاں بنائیں۔ (۱) اقتصادی امورات کی کمیٹی (۲) حملہ کرنے والی فوجی کمیٹی (۳) پروپیگنڈہ کی کمیٹی۔ (۴) سلامتی (سکورٹی) کمیٹی (۵) دہشت پرور قوتوں کی کمیٹی۔

شاہ فاروق کو فوج کے ان آزاد افسروں کی اس تنظیم کا علم تھا۔ اور اس نے اس کی بیخ کنی کی کوشش کی۔ فوجی افسروں کی کلب کا انتخاب اس تنظیم کی حمایت اور رسوخ کا امتحان تھا۔ شاہ فاروق نے ایک اعلان کے ذریعے کلب کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کو توڑ دیا اور آزاد فوجی افسروں کو کسی ذمہ دار عہدہ پر منتخب ہونے کی ممانعت کر دی۔ لیکن ادھر حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ اور ملک کورپشن کی انتہا ہو چکی تھی۔ شاہی حکومت کی طرف سے عوام کے حقوق کو پامال کر کے ملک کو تباہی اور بربادی کے دہانہ پر پہنچا دیا تھا۔ اور ملک کا سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام تیزی کے ساتھ بگڑتا جا رہا تھا۔

۲۲ جولائی ۱۹۵۲ء کو جب شاہ فاروق شاہی محل میں ایک زبردست استقبالیہ دے رہا تھا۔ جمال عبدالناصر فوجی افسروں کی کارروائی شروع کرنے کا وقت مقرر کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کام کے لئے ۲۳ جولائی کو رات ایک بجے کا وقت مقرر کیا۔ تاکہ ملک میں انقلاب برپا کیا جا سکے۔ اس انقلاب کے متعلق چارٹر میں اعلان کیا گیا۔ مصر میں عوام عوام کی جدوجہد کی تاریخ میں نئے روشن باب کا آغاز ہوا۔ ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو جب انھوں نے شاندار انقلاب کی ابتدا کی۔ مصر کے عوام نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ماضی کے گھناؤنے حالات اور زبوں حالی طرف پشت کر لی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالا جو ان کی تعمیر میں اور مثبت کوششوں کو جکڑے ہوئے تھیں۔ عوام نے صدیوں سے چلی بے انصافی، ظلم و ستم اور جابرانہ استبداد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور تمام منفی عناصر کو جو ان کی زندگی میں تاریکی اور تباہی لانے کے ذمہ دار تھے، خیرباد کہتے ہوئے زندگی کی تعمیر نو کا کام شروع کر دیا۔"

انقلاب کے اس پہلو کے متعلق ایم۔ آر لسٹونی نے لکھا ہے:۔ "عبدالناصر کے انقلاب کی قوت ان کی اس آگہی پر دارومدار رکھتی ہے جو انھیں ملکی حالات کے متعلق تھی اور ان کے اس اعتماد اور بھروسہ پر منحصر تھی کہ عوام دشمن بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے سامراج کے ساتھ مل کر ملک میں جو کورپشن پیدا کی تھی ملک و قوم اس کی بیخ کنی کر دے گی۔ یہ امتحان ان کے دل میں فلسطین کے عربوں کے خلاف صیہونی سازش کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اور پکڑ گئی پختگی پکڑ گئی تھی۔ ۲۳ جولائی کے انقلاب کی وجہ سے مصر کی تباہی اور بربادی کی ذمہ دار حکومت کا خاتمہ ہوا جو ناصر سے پہلے کوئی بھی سیاست داں ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔"

درحقیقت انقلاب نے ایک تاریک دور کا خاتمہ کیا تھا۔ وہاں اس نے ایک نئی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ روشن اور تابناک درخشندہ مستقبل کے لئے کی تعمیر کے لئے اس جدوجہد کا جس کے متعلق ارجنٹائین کے مصنف راؤل جیسین (Raoul Jessen) نے اپنی کتاب "قومی انقلاب کا ہیرو ناصر" میں لکھا ہے:۔

"دنیا کا کوئی بھی انقلاب کسی ایک فرد واحد کی سرگرمیوں اور کوششوں کا اس قدر مرہونِ منت نہیں، جس قدر جمال عبدالناصر کا انقلاب ہے۔"

جمال عبدالناصر کو ملکی محاذ پر برطانوی سامراج کی قابض فوجوں کے خلاف جدوجہد کرنا پڑا، وہاں سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ طبقوں کی طرف مصری عوام پر ہو رہے جبر و استبداد کا بھی خاتمہ کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں غضبناک، خارجی قوتوں اور دباؤ اور انقلاب کے خلاف پے در پے کتنی ہی سازشوں کے

خلاف جدوجہد کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں اوّلین زرعی خاکہ
اصلاحات کا خاکہ تیار کرتے ہوئے ملک میں پرانی سیاسی
جماعتوں کو توڑنے اور جاگیردارانہ غلبہ اور اقتدار کو ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے ختم کرتے ہوئے ان متعدد شدید ترین کوششوں
کی مزاحمت کرنی پڑی، جو مغربی سامراج نے مصر کو اپنے
اثر و اقتدار کے حلقہ کے اندر رکھنے کے لئے کیں۔"

جمال عبدالناصر نے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء میں ملک میں
رہی سہی برطانوی قابض فوجوں کے انخلا اور واپسی کی کامیابی
حاصل کی ۱۹۵۴ء میں سامراجی فوجوں کا انخلا اس معاہدہ کی
رُو سے عمل میں لایا گیا جو حکومت برطانیہ سے ہوا تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء
کو برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مصر کے انقلاب کو کچل
ڈالنے اور مصر کو پھر سے اپنے حلقۂ اقتدار میں لانے کے لئے جو
سہ طاقتی جارحیت کی تھی، اس کو کچل ڈالنے کی بدولت صدر
ناصر سامراجی قوتوں کی پسپائی اور انخلا حاصل کرنے میں کامیاب
ہوئے۔ اور انھوں نے نہر سوئز کمپنی کو ملکی اور قومی انتظام میں لینے
کا جو اعلان کیا تھا، اس میں شاندار کامیابی حاصل کی۔

مصر کی جدید تاریخ میں ناصر کا اس ممتاز اور پرشکوہ انقلاب
کا ذکر کرتے ہوئے مشہور برطانوی نامہ نگار اور ایڈیٹر مینسفلڈ نے
لکھا ہے کہ جمال عبدالناصر کی کامیابی اور ہر دلعزیزی کی وجہ
یہ تھی کہ انھوں نے اس ملک کو نئی زندگی دی - نیا مستقبل دیا۔
جس ملک کو کورپشن اور بدانتظامی نے کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔
ان دونوں تاریک قوتوں نے مصر کے عوام کا انکے شاندار ماضی
سے سب رشتے ناطے توڑ رکھے تھے۔ لیکن جمال عبدالناصر کی قیادت
میں مصر نے نہ صرف غریبی اور جہالت کی بیڑیوں کو چُن چُن کر کاٹ
دیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی ملک کو پس ماندگی کی پستیوں
اور تاریکیوں سے باہر نکال دیا اور مصر کے عوام کو پھر سے قومی
عزت و آبرو سے روشناس کرایا - اور اس کا بین الاقوامی
وقار بحال کر دکھایا - جمال عبدالناصر کی قیادت انقلاب کی
بدولت نہ صرف انقلاب کے چھ اصولوں میں سے اوّلین اصول کی
تکمیل میں سامراجی اثر و اقتدار کا خاتمہ ہوا اور ملک کو کامل
سیاسی آزادی ملی، بلکہ اس کے ساتھ ہی انھوں نے فوجی
گٹھ جوڑوں، فوجی بلاکوں اور حلقۂ اقتدار کے اقتدار کے
خلاف جدوجہد کی اور عرب قوم پرستی کا نعرہ لگا کر عربوں
کو درخشندہ مستقبل کی رُو پہلی صبح سے روشناس کیا۔

جمال عبدالناصر نے جہاں تک ملک کی سیاسی آزادی
کو مستحکم اور مضبوط بنایا وہاں انھوں نے ملک غیر ملکی اجارہ
داریوں کے غلبہ و اقتدار سے بھی آزادی دلائی اور ملک کی اقتصادی
دولت اور اس کے ذرائع کو اپنی اقتصادی ترقی و تعمیر کی طرف
مبذول کیا - نہر سوئز کمپنی کی نیشنلائزیشن اس ضمن میں اوّلین
ضرب کاری تھی - اس کے بعد انہوں نے ملک کے خلاف سہ
طاقتی حملہ اور جارحیت کو ناکام اور نامراد بنانے کے بعد ان
تمام غیر ملکی کمپنیوں کو ملکی انتظام میں لے لیا جو ملک کی اقتصادیات
پر تسلّط جمائے ہوئے تھیں۔ اس کے بعد مصر نے جمال عبدالناصر
کی قیادت میں ترقیاتی سرگرمیانی اور ترقیاتی پراجیکٹوں کی
تعمیر شروع کی - ہائی ڈیم پراجیکٹ ان ملکی کوششوں میں ممتاز
ترین درجہ رکھتی ہے۔

عصر جدید میں مصر کے نئے شہرت کردار کی نشان دہی
کرتے ہوئے جمال جمال عبدالناصر نے بہت سی بین الاقوامی
کانفرنسوں میں شرکت کی اور متعدد ممالک کا دورہ کیا - جس
ملک میں بھی وہ گئے اور جس بین الاقوامی کانفرنس میں انھوں
نے شرکت کی - انھوں نے امپریلزم اور سامراج کے خلاف
مصر کی نئی خارجہ پالیسی کا پرچم بلند کیا اور غیر ملکی استبداد
کے خلاف دوسرے تمام ملکوں کی قومی تحریکوں کی حمایت
و امداد کا اعلان کیا اور عالمی امن کی قوتوں کو مضبوط اور

مستحکم بنانے میں نمایاں پارٹ ادا کیا۔ ۱۹۵۵ء میں بنڈونگ کانفرنس میں جمال عبدالناصر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے شانہ بشانہ کانفرنس کے روحِ رواں تھے۔ ایک دفعہ مرحوم جواہر لال نہرو نے کہا تھا۔ "بنڈونگ کانفرنس کی کامیابی کا دار و مدار بہت حد تک مصر کے صدر جمال عبدالناصر پر ہے۔ اس کانفرنس کی کامیابی ان کی ذاتی فتح تھی۔" بنڈونگ کانفرنس کے متعلق اپنی کتاب "مصر" میں برطانوی مصنف ٹام لٹل نے لکھا تھا۔ "اس بات میں کوئی شک و شبہہ نہیں کہ اس کانفرنس کے بعد جہاں صدر جمال عبدالناصر نئی ذاتی عظمت سے ہمکنار ہوئے، وہاں ان کے دل میں مصر کی اہمیت و توقیر کا نیا احساسِ اعتماد پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایشیا کے سرکردہ سیاست دانوں کے ہم دوش پایا۔"

۱۹۵۶ء میں بدونی دیوکوسلافیہ کے مقام پر صدر ناصر نے وزیر اعظم نہرو اور صدر ٹیٹو کے ساتھ بنڈونگ اصولوں کے متعلق پہلی کانفرنس میں شرکت کی۔ اور غیر جانب داری کی پالیسی کو تعبیرِ نو اور تلاشِ امن کے متعلق نیا موڑ دیا اور نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ ۱۹۶۰ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں صدر ناصر نے شرکت کی اور امپریلزم کے خلاف آزادی کی تمام لڑائیوں کی صدق دلانہ حمایت کا اعلان کیا اور کہا کہ امنِ عالم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سامراج کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہاں صدر ناصر نے نہ صرف غیر جانب دار ممالک کے لیڈروں کے ساتھ ملاقاتیں کیں بلکہ انھیں دوسرے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سربراہوں سے بھی ملنے کا موقع ملا۔

۱۹۶۱ء میں بلگریڈ میں غیر جانب دار ممالک کی جو پہلی کانفرنس منعقد ہوئی، صدر ناصر نے اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور برلن اور کانگو جیسے مسائل پر جو عالمی امن کے لئے زبردست خطرہ پیدا کر رہے ہیں مذاکرات میں اہم پارٹ ادا کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے الجیریا اور کیوبا کے آتش فشاں معاملات پر بھی، جن کی وجہ سے روس اور امریکہ میں کھلی ٹکر ناگزیر نظر آتی تھی، غیر جانب دار کانفرنس کے مذاکرات میں سرگرم حصہ لیا۔

مئی ۱۹۶۳ء میں صدر ناصر ادیس ابابا گئے تاکہ تمام افریقی ممالک کی کانفرنس کی افتتاحی اور بنیادی رسم میں شرکت کر سکیں۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو صدر ناصر نے قاہرہ میں فلسطین کے سوال پر عرب سربراہوں کی پہلی کانفرنس بلائی تاکہ عرب ممالک مل کر فلسطین کے بارے میں کوئی مشترکہ، ٹھوس کارروائی کر سکیں۔ یہ کانفرنس جنوری ۱۹۶۴ء کو منعقد ہوئی۔ اس کے بعد عرب سربراہوں کی دوسری کانفرنسیں اسکندریہ اور کاسا بلانکا میں منعقد ہوئیں۔ ان اجتماعوں میں صدر ناصر کی دور اندیشانہ پالیسی، مدلل دلائل اور تعمیری زاویۂ نگاہ نے عرب ماحول اور عرب مطلع کو صاف و شفاف بنانے میں گراں قدر پارٹ ادا کیا۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں غیر جانب دار ممالک کی دوسری چوٹی کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی جس میں پچاس ممالک نے شرکت کی۔ کانفرنس کے آغاز پر صدر ناصر نے جو افتتاحی تقریر کی اس میں انھوں نے امن و جنگ کے متعلق غیر جانبدارانہ ممالک کے تعمیری کردار پر جو روشنی ڈالی، وہ بلاشبہہ تواریخی اہمیت رکھنے والی تقریر تھی۔ اس میں انھوں نے اس بات کا زبردست مطالبہ کیا کہ ترقی یافتہ ممالک ترقی کر رہی قوموں کی بڑھ چڑھ کر امداد کریں اور بھوک، افلاس، ماندگی اور اقتصادی زبوں حالی کے خلاف جنگ میں شرکت کریں۔ ان کی اس تقریر نے غیر جانبدار کانفرنس کے دائرہ کار کو نئی وسعتیں دیں۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر

قابل ذکر ہے کہ صدر ناصر کے اس نظریہ کی تائید بعد ازاں اقوام متحدہ کی ترقی و تجارت کے متعلق بین الاقوامی کانفرنسوں نے بھی کی۔ اس معاملہ کو اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء کو نئی دہلی میں ہندوستان، متحدہ عرب جمہوریہ اور یوگوسلاویہ کی سہ طاقتی چوٹی کانفرنس میں بھی بہت اہمیت دی گئی۔

اس وقت جب صدر ناصر بین الاقوامی محاذ پر شاندار کامیابیاں حاصل کر رہے تھے، ملک کے اندر انقلابی حکومت رجعت پسندانہ عناصر کی بغاوت اور سازش کے خلاف جنگ کو کامیابی سے لڑ رہی تھی۔ درحقیقت صدر ناصر کا انقلاب یک طرفہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ تین طرفہ انقلاب تھا—— سیاسی آزادی کا حصول اور اقتصادی آزادی کا ملنا، محض معاشرتی انقلاب کا دوسرا نام تھا۔ جولائی سنہ ۱۹۶۱ء میں حکومت نے متعدد سوشلسٹ قوانین نافذ کئے۔ جن کی غرض و غایت یہ تھی کہ تعمیر و ترقی کے سب ذرائع عوام کے ہاتھوں میں سونپ دیئے جائیں۔ ایک نیا زرعی قانون بھی نافذ کیا گیا جس کی رو سے کاشت کار کو زیادہ سے زیادہ پچاس فیڈان زمین رکھنے کا حق دیا گیا۔ یہی نہیں محنت کشوں اور مزدوروں کے حقوق واگذار کئے گئے۔ اور انھیں ملک کے نظم و نسق میں بھی حصہ لینے کی آزادی دیدی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی انھیں کارخانوں اور فیکٹریوں کے منافع میں بھی حصہ دار بنا دیا گیا۔

صدر ناصر کی داخلی پالیسی کی بنیاد ہمیشہ یہ اصول رہا ہے کہ ملک کی مضبوط اور مستحکم، اقتصادی بنیادوں کی بدولت ہی ملک کی پوزیشن اور اس کا مرتبہ بلند و بالا ہو سکتا ہے اور ملک تبھی دوسرے شعبوں میں بڑھ چڑھ کر مفید پارٹ ادا کر سکتا ہے۔ ملک میں آٹھ سو کے قریب نئے کارخانے قائم کئے گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہائی ڈیم کی تعمیر کا کام خواب پورا ہو گیا۔ اور ہائی ڈیم بن کر تیار ہو گیا۔ اور مصری عوام کے آہنی ارادہ کی ترجمانی اور عکاسی کر رہا ہے۔ درحقیقت ہائی ڈیم کی بدولت ملک کو تاریخ کے تاریک ترین دور میں روشنی کی تویہ دکھائی دی۔ کیوں کہ اس وقت جب مصری عوام سامراجی اور صہیونی سازش کے خلاف جنگ، لڑ رہے تھے، ۵ جون سنہ ۱۹۶۷ء کو عرب ممالک کے خلاف اسرائیل کے حملے کے اثرات دور کئے جا رہے تھے کہ ہائی ڈیم سے بجلی قاہرہ پہنچنی شروع ہو گئی۔ اور ملک کے عوام کو نیا حوصلہ اور نیا ولولہ اور جوش ملا۔

انقلاب مصر کی تاریخ صدر ناصر کے اس ارادہ اور اور اس مقصد کی منہ بولتی تصویر ہے کہ وہ ملک میں مضبوط جمہوریت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور ملک سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور بین الاقوامی اعتبار سے نیا وقار دینا چاہتے تھے۔ اور اُسے نئی عظمتوں سے مالا مال کر دینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان میں جب کہیں کوئی غلطی یا خامی رہ گئی، صدر ناصر نے اس کی اصلاح کرنے کی صدق دلانہ کوشش کی۔ تاکہ عوام کو صحیح معنوں میں شریکِ حکومت بنایا جائے۔ اس غرض کے لئے سنہ ۱۹۶۲ء میں نیشنل چارٹر—— قومی منشور جاری کیا گیا۔ تاکہ ملکی اور قومی سرگرمیوں کی رہنمائی کر سکے۔ ملک کے کسانوں اور محنت کشوں کی جو جنرل نیشنل کانگریس منعقد ہوئی اس میں نیشنل چارٹر پر مہر تصدیق ثبت کی گئی۔ عوام کی سیاسی سرگرمیوں کو منظم کرنے کی غرض سے عرب سوشلسٹ یونین کی صورت [illegible] مقبول عام سیاسی جماعت اور تنظیم کی د[illegible] عرب سوشلسٹ یونین کی شاخیں ملک کے طول د[illegible] کی گئیں۔ قومی منشور کے مطابق، پہلی نیشنل اسمبلی کے لئے انتخابات کرائے گئے۔ جنا میں نیشنل چارٹر کے مطابق پارلیمنٹ (قومی اسمبلی) اور مقامی کونسلوں میں محنت

کسانوں اور کاشت کاروں کو نصف نامزدگی دی گئی۔ جنوری ۱۹۶۵ء
ملک کے عہدۂ صدارت کے لئے جو رائے شماری اور استصواب
رائے کرایا گیا اور لوگوں نے اتفاق رائے سے جمال عبدالناصر
کو صدر منتخب کیا۔ تاکہ وہ ان کے مقاصد کو پورا کرسکیں جن کے
حصول کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقفِ قوم کردی تھی۔
دیکھا جائے تو سامراج اور صیہونی طاقت نے ہمیشہ صدر
ناصر پر عوام کے اس قدر زبردست اعتماد کو منتشر کرنے کے لئے
متعدد بار حملے کئے۔ متعدد بار ارتکاب جارحیت کیا۔ اور
نت نئی سازشوں کو جنم دیا۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کا سب سے
بڑا مقصد صدر ناصر کی ہر دل عزیز حکومت کا تختہ الٹ
دینا اور مغربی طاقتوں کی بے پناہ فوجی، اقتصادی اور
مالی امداد کے بل بوتے پر عربوں کی کمر ہمت توڑ دینا تھا۔
لیکن دشمن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ درست ہے
کہ عربوں کو اس جنگ میں زبردست نقصان اٹھانے پڑے۔
اس لئے صدر ناصر نے اعلان کیا کہ انھوں نے صدارت سے
مستعفی ہو جانے اور صدارتی فرائض سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ
کر لیا ہے۔ لیکن عوام کے سب طبقوں نے ایک زبان
ہو کر مطالبہ کیا اور اجتماعی مظاہرہ کر کے صدر ناصر کو مجبور کردیا
کہ وہ استعفیٰ واپس لے لیں۔ اور ان کی قیادت کرتے رہیں۔
۹ اور ۱۰ جون کو عوام نے صدر ناصر کے حق میں جو مظاہرے کئے۔
انھوں نے جنگ جون کو مصری عوام کی اخلاقی فتح میں تبدیل کر
دیا۔ کیوں کہ عوام نے شکست تسلیم کرنے کی بجائے صدر
ناصر کی قیادت میں جنگِ مزاحمت جاری رکھنے کا تہیہ کرلیا
تھا۔

۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۰ء تک صدر ناصر نے اپنے ملک اور
اپنے عوام کے لئے بیش بہا اور گراں قدر خدمات انجام دیں۔
اور متحدہ عرب جمہوریہ، سوڈان اور لیبیا نے باہم مل کر
۱۹۶۷ء کی جارحیت کے اثرات کو ختم کرنے اور عرب
علاقوں کو آزاد کرانے اور فلسطینی عوام کے حقوق کی
بحالی کے لئے سہ طاقتی عمل کا آغاز کیا۔ اور سب جانتے
ہیں کہ انھوں نے اپنی موت سے پہلے جارڈن کی خانہ جنگی
کو ختم کرانے کے لئے شاہ حسین اور فلسطینی تحریک مزاحمت
کے لیڈر یاسر عرفات میں سمجھوتہ کرا کے ایک تاریخی اور
ناممکن عمل تعمیری کام انجام دیا جس کا ذکر عرب تاریخ میں
سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔
صدر ناصر دو لڑکیوں اور تین لڑکوں کے باپ تھے۔
اور اب نانا بن گئے تھے۔ لیکن ان کی مکمل زندگی ملک و قوم کے
وسیع ترین مفاد اور درخشندہ ترین مستقبل کے لئے وقف تھی۔
اور وہ آخری دم تک عرب مفاد اور عرب مستقبل کے
لئے ہی سرگرم رہے۔

# سوال

یوسف قریشی - دلی کالج - دہلی

مجھ کو دیکھنے والو
تم نے میری ہستی کو
غور سے نہیں دیکھا
میں تو ایک سوال ہوں

---

زندگی سے میں نالاں
مجھ سے زندگی عاجز
رات دن بھٹکتا ہوں
جانے کیا تلاش ہے
راستے میں لوگوں سے
پوچھتا پھرا ہوں میں
کیا انھوں نے خواب میں
زندگی کو دیکھا ہے؟

---

یہ تو زندگی نہیں!
راستے ویران ہیں
ہر نگر اداس ہے
روح کیوں تڑپتی ہے

---

رات دن یہ ہی الجھن
دل کو ڈستی رہتی ہے
کیا کروں کدھر جاؤں
کس کو دل کا دکھ دکھاؤں

---

مندروں کے سائے میں
خون کے نشان ہیں
مسجدوں کے دروازے
چائے کی دوکان ہیں

---

مسجدیں یہاں بکیں
مندروں کا سودا ہو
گرجائیں نیلام ہوں

---

پیٹ کی خاطر کوئی
زر سے پیار کرتا ہے
اپنے ہی سراپے کا
کاروبار کرتا ہے
کیا یہ ہی ہے زندگی؟

---

لیڈروں کے بھیس میں
ہر طرف لٹیرے ہیں
ظلم و جبر کے بادل
قوم ہی کو گھیرے ہیں
قوم کے جو رہبر ہیں
تہذیب جن کے دم سے ہے
حق جن کا نعرہ ہے
چور ہیں یہ سب کے سب

---

ہم تو بے زبان ہیں
کیوں کہ ہم انساں ہیں
بول کچھ سکتے نہیں
لب کو سینا پڑتا ہے
آنسوؤں کے سائے میں
مسکرانا پڑتا ہے
میرے ان سوالوں کا
کاش دے کوئی جواب

---

# یادِ ماضی

انیس الرحمٰن
متعلم دلی کالج — دہلی

آہ یہ یادوں کا ہولناک سایہ میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا؟ بادلی سی چنگاری بار بار میرے خرمنِ محبت میں شعلہ بن کر کیوں چمک اٹھتی ہے؟ اتنی سبک رفتاری سے یہ کیوں میری ساکت اور منجمد حیات میں داخل ہو کر ہلچل مچا دیتی ہے؟ یہ یادوں کا کارواں کیوں میری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے؟ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں لیکن میری دردناک آہ حلق میں ہی پھنس کر رہ جاتی ہے، میری ہر فریاد صدا بہ صحرا بن جاتی ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

لیکن ماضی ہی تو میرا عزیز ترین سرمایہ حیات ہے میں نے گلشنِ ماضی کو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے خون سے سینچا تھا۔ اگر میں اس سے دامن چھڑا بھی لوں۔ تو میرے پاس کیا رہ جائیگا؟ انسان کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کا ماضی ہوتا ہے اس ماضی سے اس کی حسین یادیں وابستہ ہوتی ہیں، اس کا بچپنا اس کے پاکیزہ جذبات ماضی ہی سے تو وابستہ ہوتے ہیں تمہیں یاد ہوگا ہو سکتا ہے تم بھول گئے ہو۔ لیکن "مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا۔"

— وہ دن جب تم پہلی مرتبہ کالج میں آئے اور تمام لڑکیوں کے ہوش اڑا دیتے تھے، ہر لڑکی اپنے آپ کو تمہارے تیرِ نظر کا گھائل سے سمجھتی تھی، سب ہی کی ایک تمنا اور ایک آرزو تھی وہ یہ کہ ایک مرتبہ تم سے بات کرنے کا موقعہ مل جائے یا کسی پر تمہاری نظرِ التفات پڑ جائے، تمہیں ذرا سا بھی احساس نہ تھا کہ کتنے دل تمہارے لئے بیتاب ہیں، کتنی بانہیں تمہارے لئے بے چین ہیں کتنی امیدوں کے حسین اور نازک محل صرف تمہاری ذات پر بنائے گئے۔ میں نے کبھی کبھی یہ محسوس کیا کہ تم میری طرف مائل ہو رہے ہو۔ لیکن ہمیشہ اس خوش فہمی کو حرفِ غلط کی طرح دل سے نکال دیا — وقت اپنے محور پر گھومتا رہا۔ کائنات مصروفِ طواف رہی۔

— ایک ایسا وقت آیا جب تم میرے بارے میں

سے سوچنے لگے "عقل" سے نہیں، تم نے اسی "تاثر کے نتیجہ میں مجھے ایک مبہم سا خط ہی لکھ ڈالا۔ جسے محبت نامہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے سوچا کہ شاید یہ ایک وقتی سا جذبہ ہو، تم نے بارہا شکایت آمیز نظروں سے نظریں ملانے کی کوشش کی میری ہمت جواب دے گئی۔ ——

پھر نہ جانے ذہن کے کون سے گوشے سے محبت ابھری اور . . . . . . . . فروری ۱۹۶۷ء کی وہ حسین رات جبکہ میں نے تمہاری بانہوں میں آ کر اقرار محبت کر لیا تھا کتنی دلکش تھی وہ رات جبکہ معلوم ہوتا تھا یہ چاند اور ستارے ہمیں رشک آلود نظروں سے دیکھ رہے ہیں، ان کی روشنی اور جگمگاہٹ ہماری محبت کی تابندگی کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔ کاش وہ رات اتنی لمبی ہوتی کہ اس کے بعد کوئی رات نہ آتی اگردش کائنات اپنی مصروفیت بھول جاتی۔ کاش وہ لمحات گزرتے ہی نہیں اور وقت کی رفتار تھم جاتی لیکن ایسا کبھی ہوا بھی ہے —— تم ہوسٹل چلے گئے اور میں اپنے دل و دماغ کو خوشگوار یادوں سے معطر کئے ہوئے گھر پہنچ گئی اور نہ جانے کتنی شوخ اور چنچل آرزوؤں کی چادر تان کر نیند کی وادی میں تم سے ملنے پہنچ گئی —— اس رات خواب بھی کتنے حسین تھے۔ میں اور تم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز افق کے اس پار چلے جا رہے تھے۔ جہاں نیلگوں خوبصورت آسمان اور دھرتی کا سنگم ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام خوشیاں خدا نے میرے ہی دامن میں ڈال دی ہیں۔

میری خوشی کی انتہا نہیں ہوتی جب میں سوچتی کہ جمال میرا دوست ہے۔ میرا عزیز ہے، میرا محبوب ہے۔ میرا سب کچھ ہے —— زندگی میں پہلی مرتبہ اگر کسی کو اتنے قریب سے دیکھا ہے تو وہ تم ہو . . . . . اور یہی وجہ تھی کہ تمہیں جس دن نہ دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ آج کوئی بہت قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ یہ دھرتی یہ آسمان سب اداس اداس نظر آتے، ایک نہ معلوم سی کسک رہ رہ کر میرے دل میں انگڑائیاں لیتی رہتی، اور جب میں تمہیں دیکھ لیتی اور باتیں کر لیتی تو محسوس ہوتا ہے کہ دنیا جہان کی خوشیاں میرے قدموں پر سجدہ ریز ہیں۔ —— لیکن ہماری محبت لوگوں کو ایک آنکھ نہ بھائی اور دونوں کی پاکیزہ محبت کو بدنامی کی صلیب پر چڑھا دیا گیا۔

چاروں طرف سے لعنت و ملامت کے تیر برسائے جانے لگے طنزیہ فقروں سے ہماری تواضع کی گئی، اور ہم اپنی محبت میں مگن دنیا کی باتوں سے بے پرواہ اپنی ڈگر پر رواں دواں بڑھتے چلے گئے۔ اس راہ پر جو بظاہر جاذب نظر ہے لیکن اس میں خلا بھی ہے اور نشیب و فراز بھی، پھر بھی ہم عزم اور حوصلہ کے کارواں میں تابناک مستقبل کا توشہ لیکر اور پاکیزگی کو رہبر بنا کر منزل پانے کی دھن میں بڑھتے چلے گئے —— وقت کی ایک زوردار تھپیڑ نے مجھے میرے ساحل سے دور کر دیا۔ میں تم سے سینکڑوں میل دور تھی، کربناک جدائی کے طویل ترین دن رات مجھے تنہائی میں سانپ بنکر ڈستے رہتے ہیں طرح طرح کے خیالات نے میرے اردگرد ایک جالا سا بنا لیا تھا۔ اس سے فرار ناممکن تھا —— کبھی تمہیں فرصت ہوتی تو تم آ کر میرے تڑپتے دل کو تسکین دیتے، تجدید محبت کرتے ہوئے میری تشنگی کو ختم کرتے —— میں صرف تمہارے اسی معمول پر اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کرتی رہتی ہی، جب بھی تم دور سے آ کر مجھے اپنی بانہوں میں سموتے تو مجھے یقین سا ہو جاتا کہ تم کہیں بھی رہو، میری یاد اپنے دل سے محو نہ کر سکو گے، جب میں تمہاری بانہوں میں آ جاتی تو ایسا لگتا کہ اب اس دنیا میں میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس لمحہ، میں ارض و سماں اور چاند تاروں کی حد بندیوں سے نکل کر اس وادی میں پہنچ جاتی جہاں صرف محبت کرنے والوں کا راج ہوتا ہے۔ یہاں پر سوائے محبت کے کوئی قانون نافذ نہیں ہوتا۔ —— حالات نے ایک اور کروٹ بدلی، تم اب تک مجھے برابر تسکین دیتے رہتے لیکن تمہاری اس اطلاع نے تو جیسے میری پربہار زندگی میں آگ لگا دی اور میں اپنے آپ کو اس ظالم سماج کے پنجہ میں تنہا سمجھنے لگی، تمہاری زندگی کو آئینہ موڑ دیا گیا اور تمہارے قدموں کو ازدواجی زندگی کی طلائی بیڑیوں سے آراستہ کر دیا گیا۔ تم نے کہا کہ "تم بھی مجھے بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کر دو"

کم از کم مجھے میری حسین یادیں تو مت چھینیے۔

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

تم سے بس اتنی سی التجا ہے کہ خدا را میرے ماضی کو یوں ہی رہنے دو۔ اگر تم مجھے کچھ دے نہیں سکتے تو میرے اس واحد سرمایۂ حیات پر کیوں انگشت زنی کرتے ہو —— تم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ:-

ڈیر شاذی۔

امید ہے تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو گی

۔ اس دنیا میں انسان کی آمد کے ساتھ اس کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے وہ ابتدا سے انتہا تک اس دنیا کو نئے روپ اور نئے زاویہ سے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر ہر روز غم اور مصیبت سے ہم آغوش ہوتا ہے تو وہ غم کی وجہ سے مر نہیں جاتا۔ تڑپ تڑپ کر جان نہیں دیتا سسک سسک کر دم نہیں توڑتا۔ وہ آنسوؤں کے سمندر میں غوطہ زن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس امید پر سو جاتا ہے کہ تجسم سحر اپنی تابندگی میں اس کے لئے مسرت بخش پیغام لائیگا اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کو ایک امید پر قائم رکھتا ہے۔ اس کے جتنے آلام و مصائب اور مسرت ہوتی ہیں زندگی میں اس طرح رس بس جاتی ہیں کہ وہ کبھی اپنی بدقسمتی اور کم نصیبی پر افسوس نہیں کرتا۔

جمال —— جو کبھی تمہارا اعتماد تھا۔

یہ باتیں میں نے بھی بہت سنی ہیں۔ یہ صرف باتیں ہیں حقائق سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ "صبح کا تارا انسان کے لئے ایک نیا پیغام لاتا ہے" لیکن یہ کہاں تک حقائق پر مبنی ہے، کہاں تک اس میں صداقت ہے، اس کا احساس کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر نیا دن انسان کے لئے آلام و مصائب کا حامل ہوتا ہے، اس لئے ایک نئی تکلیف اور نئی پریشانی پیدا کرتا ہے اور یہ آلام و مصائب تکالیف و پریشانی سب سے اس طرح گھیر لیتے ہیں کہ اگر کوئی خوشی بھی اس سے ہمکنار ہونا چاہے تو نہیں ہو سکتی ——

# غزل

**قاسم نورؔ**

وہ تغافل سے کام لیتے ہیں
بے دلی سے سلام لیتے ہیں

ہم ترستے ہیں قطرے قطرے کو
لوگ بھر بھر کے جام لیتے ہیں

ہیں وہی میر کاروانِ حیات
وہ جو گرتوں کو تھام لیتے ہیں

میکشی بے سبب نہیں اپنی
غم سے ہم انتقام لیتے ہیں

نورؔ ہوتے ہیں جو بڑے انسان
انکساری سے کام لیتے ہیں

میں نے بھی زندگی میں کوئی آرزو کی تھی، وہ آرزو "پیار" کی تھی اور پاک پیار کی۔

"پیار" جو تقاضائے فطرت ہے "لیکن جب پیار نہ ملا۔ تو ایسی چیز کی آرزو کے تصور سے ہی روح کانپ جاتی ہے۔ بقول شاعر ؎

کچھ اتنے دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

بہ ہزار حسرت و یاس

تمہاری —— تباہ کون؟

# غزل

کالج میں یہ لڑکی نے کیا کیا مرے آگے
اک لڑکے کے توڑے کئی اعضا مرے آگے

بیوی سے لڑائی کے سبب گھر میں ہمیشہ
منظر ہے وہی "لوک سبھا" کا مرے آگے

چلمن سے جھلکتا ہے تبسّم ترا، لیکن
منہ کھولے کھڑا ہے ترا کتا مرے آگے

بیگم تو سینما میں مرے بازو ہیں لیکن
سالی مرے پیچھے ہے تو سالا مرے آگے

مسٹر سے منسٹر جو ہوا میں، تو یہ دیکھا
ہر شخص ہوا جاتا ہے چمچہ مرے آگے

در گھر میں رقیب آیا ہے لیکن میں کیا کروں
چپل ہے، نہ سینڈل ہے، نہ جوتا مرے آگے

دو بیویاں ہیں، سالے ہیں، بہنوئی ہیں گھر میں
دن رات ہے "U.N.O" کا نقشہ مرے آگے

اسٹیٹ میں اک "سینا" بنا رکھی ہے جب سے
چلتا نہیں C.M.[1] کا بھی بھیجا مرے آگے

میں خود ہی اہنسا کا پرستار ہوں اے دوست
کیا کرلے گا ورنہ ترا باوا مرے آگے

بس ایک جھلک دیکھ کے چکرا کے گرا میں
یعنی تمھاری خالہ کا رکشہ مرے آگے

کل تک جو نواسوں کو لئے پھرتا تھا یارو
اب آیا ہے باندھے ہوئے سہرا مرے آگے

اک "پی۔اے" ہے اور ایک ہے سکریٹری راہیؔ
بھانجا مرے پیچھے ہے، بھتیجا مرے آگے

راہی قریشی

[1] چیف منسٹر

# چاند پھر نکلے گا

شاذ تمکنت

چاند پھر نکلے گا، پھر تیرے خد و خال کا رنگ
یاد آئے گا، مجھے نیند نہیں آئے گی

دل بہت روئے گا، آنسو نہیں پونچھے گا کوئی
جاں پہ بن جائے گی، دیوار و در و بام مجھے
بھینچ لیں گے مری تنہائی نہ دیکھے گا کوئی
آنکھیں 'دھوم اجالے کے پر اسرار کھنڈر'
راہ تکتی چلی جائیں گی نہ لوٹے گا کوئی

رات بھر پھر مرے ارماں کا سیہ تاب چراغ
جھلملائے گا مجھے نیند نہیں آئے گی

ہر مہینہ یوں ہی یہ درد کی فصل آئے گی
چاند آ آ کے کرے گا مرے زخموں کا حساب
مطمئن ہو کے شب ماہ پلٹ جائے گی
کہ ابھی تک مری آنکھوں سے لہو بہتا ہے
کہ ابھی اور تمنا مجھے تڑپائے گی

چاند پھر دائرہ سے زاویہ ناخن تک
گھٹتا جائے گا مجھے نیند نہیں آئے گی

# آرائشِ جمال

رحمٰن حمیدی

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حُسن خدا کی دین ہے یہ خیال بھی اپنی جگہ ایک حد تک درست ہے۔ اور صحیح بھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حُسن کو خارجی اسباب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دراصل یہ نظریہ ان اُلجھے ہوئے دماغوں کی کاوش ہے جنھوں نے حُسن کے متعلق غلط اندازِ فکر کو اپنایا اور غلط زاویہ نگاہ سے سوچنے سمجھنے کی کوشش کی۔ اور اس کا ایک خاص معیار اور وزن متعین کرنے کی لاحاصل فکر میں بے پایاں کوشش صرف کی۔ حالانکہ جس طرح حُسن کسی خاص قوم یا ملک کے ساتھ وابستہ نہیں اسی طرح وہ کسی خاص رنگ تک بھی محدود نہیں ہے اس کے علاوہ مختلف طبقات میں حُسن کا میزان بھی مختلف ہے۔ ایک ہی آب و ہوا، ایک ہی ملک، اور ایک ہی قوم کے مختلف افراد کا نظریہ حُسن بھی مختلف ہے۔ ہر ایک کی پسند جداگانہ اور ہر ایک کا نقطۂ انتخاب الگ الگ ہے اور یہ اختلاف اس قدر عام ہے کہ حُسن کا معیار متعین کرنا ناممکن ہے بلکہ اس معاملے میں ہر منزل پر لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید کا خیال رکھنا چاہئے۔

مذکورہ اختلافات کے باوجود چند چیزیں ایسی ہیں جن کی بنیاد پر حُسن کا معیار قائم کیا جا سکتا ہے جہاں تک حُسن و خوبصورتی کا تعلق ہے عورت کے وجود میں مکمل نسائیت اور انتہائی کشش کا ہونا لازمی ہے جو مرد [illegible] کا ایک ایسا جاذبِ نظر [illegible] جو [illegible] کو حاصل ہو حُسن کہلانے کا مستحق ہے جسمانی [illegible] سے تعلق رکھنے والی خوبیوں اور اعضا کی حسین موزونیت کے علاوہ حقیقی حسن کے لئے نیک سیرت، شرم و حیا، خوش مزاجی، وضع قطع میں سادگی، سچائی، خوفِ خدا، غرض شناسی، بزرگوں کی عزت، خدمت کا شوق اور جسمانی صفائی نیز پاکیزگی وغیرہ اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ واقعی ایک حسین و جمیل لڑکی کا دل نور سے معمور ہوتا ہے، اس میں سحر انگیزی، متانت، حیا آلود سادگی، مخلصانہ ہمدردی کی بڑی لگن ہوتی ہے جو اسے ہر منزل پر کامیاب و کامران کرتی ہے اس لئے حقیقی حُسن دل سے پیدا ہوتا ہے مجھے احساس ہے کہ آپ کو میری یہ باتیں نہایت معمولی اور بے وزن معلوم ہوں گی لیکن یہ ساری باتیں عینی مشاہدہ اور حقائق پر مبنی ہیں۔

خود آرائی، ناز و نزاکت کے اظہار اور ڈینگیں مارنے، خود کو حسین و جمیل ثابت کرنے کی کوشش سے حُسن ظاہر نہیں ہوتا جیسا کہ غلطی سے دورِ جدید کی تعلیم یافتہ اور فلم زدہ لڑکیوں نے سمجھا ہے یہ چیزیں آج کل کلب یا پارٹی کی زندگی میں ضروری سمجھ لی گئی ہیں۔ ہمیشہ اس لئے کی جاتی ہیں کہ اہم جسمانی عیوب کو چھپایا جا سکے یہ میرا مشاہدہ ہے میں نے ایک انگریزی اسکول کے پرنسپل کی بیوی کو دیکھا جو برابر میک اپ میں دوسروں کے سامنے آیا کرتی تھیں۔ اتفاق سے ایک بار میں ایسے موقع پر گیا جب وہ میک اپ میں نہیں تھیں انھوں نے مجھ سے چہرے کو چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے آپ کو چھپا نہ سکیں۔ اس وقت ان کے چہرے سے جو [illegible] پارٹی میں بہت سے میک اپ [illegible] نقائص کو چھپانے کے لئے میک اپ کا سہارا لیتی ہیں یا جدید فیشن سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو فلمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں فیشن کے جدید آرائشِ جمال کے سامان کاسمیٹک، اسنو، لپ اسٹک، نیل پالش

کی مقبولیت صنف نازک میں بہت زیادہ ہے حالانکہ تجربہ سے ثابت ہوچکا ہے ان میں سے اکثر نقصان دہ اور مضر ہیں۔ فلم اسٹار بھی اس طرح کی چیزوں کے استعمال سے حتی الامکان گریز کرتی ہیں۔ مشہور فلم اسٹار ممتاز سے ریڈیو سیلون کے جناب امین سیانی نے ان کی خوبصورتی کا راز پوچھا تو مذکورہ اداکارہ نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ آرائش و زیبائش سے مطلق پرہیز کرتی ہیں۔

آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنی نگاہیں حسن، صرف پیشانی سے ترشے ہوئے بال، لپ اسٹک کی گہری تہہ، غازے کی مالش اور نیم عریاں چست لباس کو سمجھتی ہیں۔ وہ یہ نہیں غور کرتیں کہ اس قسم کے میک اپ سے وہ خود بھی حسین معلوم ہوتی ہیں یا نہیں؟ بعض لڑکیاں اس قسم کی نقل سے نہایت بدصورت اور بعض تو نہایت بھدی معلوم ہوتی ہیں۔ آج کل خوش رنگ بلاؤز نصف سینہ پر اور ہلکے رنگ کی ساری زیر شکم باندھنے کا رواج بہت عام ہوتا جارہا ہے۔ ان میں خودنمائی تو ہوتی ہے لیکن حسن کا عنصر غائب ہوجاتا ہے اور فحش تہذیب کا نمونہ دوسروں کے سامنے آجاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تہذیب کے اثرات معاشرے کو بھی نقصان پہونچاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ایک لڑکی حیا کے زیور سے آراستہ ہو، اس کی شخصیت دل نشیں ہو، اور اعضا میں موزونیت ہو تو اسے بے حد خوش نما چہرے کی بھی چنداں حاجت نہیں ہوتی۔ میک اپ تو دور کی بات ہے۔

میرے خیال میں حسین بننے کے لئے چند خصوصیات ضروری ہیں اور یہ خصوصیات اسی وقت عمل پذیر ہوسکتی ہیں جب بچپن ہی سے ان پر عمل کرایا جائے۔ اگر ان خصوصیات کے ساتھ ظاہری خوبصورتی بھی ہو تو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان میں عمدہ صحت سب سے زیادہ ضروری ہے جو موجودہ زمانہ کے فیشن سے دور رہنے سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ چمک دار اور خوش نما بال جن میں کسی قسم کا کریم روغن اور جنگلی پھول نہ ہو جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آتا ہے اس کے علاوہ نرم اور انسانی لوچ دار آواز، سیدھی اور بچی تلی چال۔ دل آویز شخصیت، کشادہ چہرہ، جائز تجسس، بہتر چال چلن، خود اعتمادی۔ فطری حرکات و سکنات اور سب سے زیادہ فرض شناسی کا جذبہ اور ہر کام میں ایمانداری عورت کو حسین و جمیل بناتی ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس کلچر کی تجدید ہو جس کے نمونے درویدی سیتا اور ساوتری میں نظر آتے ہیں یا جھانسی کی رانی، میرا، کستوربا سروجنی جیسی عورتیں ہمارے معاشرے میں پیدا ہوں تو معاشرے سے ہالی ووڈ کی فلموں اور دیگر فلمی عناصر کو ترک کرنا ضروری ہے عورت کا صحیح مقام اور اس کی صحیح نمائندگی کے لئے دور جدید کی فلموں میں ترمیم و تنسیخ لازم ہے ورنہ معاشرے میں ایسی تہذیب سرایت کر جائے گی جس میں عورتیں بجائے گھر کی دیوی کے بازار حسن کی فروخت ہونے والی گڑیا بن کر رہ جائیں گی۔

ہندوستان کی وہ تہذیب جس کی بدولت زمانۂ قدیم میں ہندوستان کی قدر و منزلت ملی تھی۔ آج اس کی دیواریں گرتی رہی ہیں اور اس قسم کے اثرات تیزی سے ذہن نشین ہوتے جارہے ہیں جس کی روشنی میں زمانۂ قدیم کی تہذیب کو دقیانوسی اور آرتھوڈکس سمجھا جاتا ہے۔ یہ رجحان آگے چل کر صنف نازک کے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہوگا اور عورتوں کو ناساعد حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر عورتیں چاہیں تو اس قسم کے خیالات کی ترویج و اشاعت [illegible] کو روک سکتی ہیں۔ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرکے سدِ باب کرسکتی ہیں۔ اور صالح خیالات کی وسعت سے اپنی زندگی میں تنوع اور اپنی شخصیت کو زیادہ موثر اور [illegible] بنا سکتی ہیں۔ خارجی آرائش جمال سے کوئی عورت سماج میں قدر و منزلت یا عام لوگوں کی نگاہ میں وقعت نہیں حاصل کرسکتی اور نہ اس کی بدولت وہ کامیاب و کامران زندگی بسر کرسکتی ہے۔ بلکہ اس کی بدولت حاصل شدہ وقار بھی خطرے میں آجائے گا۔ اور عورت جو ملک و ملت کی [illegible] ہے غلط نقطۂ نگاہ سے دیکھی جانے لگے گی۔

(زیلور پٹنہ)

آنکھ سے دور کبھی جنت کی بہاروں کی طرح
دست انساں سے کبھی محفوظ ستاروں کی طرح

... نے نہایت نرمی سے جواب دیا۔

" تم کو شرم نہیں آتی مجھ سے برقعہ اتارنے کو کہتے ہو ۔۔۔ میں مسلمان ہوں ۔ میں برقعہ کیسے اتار سکتی ہوں ۔ ... بے پردہ کیسے ہو سکتی ہوں ۔ " اس نے برہم ہو کر جواب دیا۔

" تم مسلمان ہو برقعہ نہیں اتار سکتیں مگر نقاب الٹ سکتی ہو ۔۔۔ تم مسلمان ہو بے پردہ نہیں ہو سکتیں لیکن تنگ برقعہ پہن کر جسم کی نمائش کر سکتی ہو ۔۔ " میرے دل نے جواب دیا مگر زبان نے خاموش ہو گئی میں مصلحت بھی کیوں کہ اب وہ لڑکی لائن میں کھڑے دوسرے لوگوں سے مخاطب تھی۔

" دیکھو یہ مجھکو چھیڑ رہا ہے ۔ کہہ رہا ہے کہ برقعہ اتار دو "

... اس کی یہ فریاد سن کر تمام حضرات اپنی ... رہا ... تنا تے چہرے لئے میری طرف ... تم کو شرم نہیں آتی شریف بہو بیٹیوں کو چھیڑتے ہوئے ... اچھی تھوڑی دیر

پہلے لڑکی کو بد نظر ... رہے تھے مجھ پر گرجے۔

" دیکھئے صاحب کیا زمانہ آگیا ہے ۔ ایک ہمارا وقت تھا کہ ہر لڑکی کو اپنی بہن سمجھتے تھے اور ایک آج کا وقت ہے کہ لڑکا ہر لڑکی کو اپنی بیوی سمجھتا ہے ... قیامت نزدیک ہے ۔ ۔ ۔ ۔

... مرید صاحب نے کہا اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہنے لگے بس صاحب اس قوم کا تو اللہ ہی مالک ہے میں تو اکثر اپنے پیر صاحب کا نام لے کر کے دربار میں اس کی بھلائی کے لئے دعا مانگتا رہتا ہوں " ابھی شاید کوئی اور صاحب اظہار نفرت کرتے کہ اچانک چپراسی کی آواز گونجی " یہ کیا ہنگامہ ہے چپ چاپ لائن میں کھڑے رہو ... اگر صاحب کہہ رہے ہیں ورنہ میں چلا جاؤں گا " آواز ... سن کر سب چپ چاپ پھر لائن میں لگ گئے اور میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔

●●

# رازہائے حیات

عبداللطیف ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

● تلخ بات قلب انسانی پر گرم گرم راکھ کے برابر ہے۔

● کچھ لوگ دوسروں کے عیب کو عیب اور اپنے عیب کو فیشن سمجھ کر فراموش کر دیتے ہیں۔

● اگر تم نے حال پر کڑی نظر نہ رکھی تو تمہارا مستقبل تاریک بن کر رہ جائے گا۔

● ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے

● بدلہ لینے میں وہ مزہ نہیں جو معاف کر دینے میں ہے۔

● اصول ایک پنجرہ ہے ۔ جسے انسان اپنے [illegible] کو قید کے لئے خوب صورت الفاظ سے بناتا ہے۔

● خدا کی کائنات میں سب سے زیادہ قابل [illegible] عورت ہے۔

● ماضی کے زخموں کو حال کی سوئی [illegible] کر مستقبل کی طرف دوڑو ۔ مستقبل تمہارا انتظار کرتا ہے۔ مبادا تمہارے انتظار میں دنیا کئی سال پیچھے رہ جائے اور تم [illegible] مستقبل تباہ کر بیٹھو۔

● ہماری زندگی اپنے تجربوں کی قرض دار ہے۔

● انسان ، انسان ہو کر جانوروں کی [illegible] کرتا ہے۔ مگر جانور ، جانور ہو کر بھی کبھی انسان کی نقل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

● کوّا ، اُلّو کی بولی کبھی نہیں بول سکتا ۔ اسی طرح اُلّو ، کوّے کی بولی نہیں بول سکتا ۔ مگر ایک چاپلوس انسان اپنا مطلب حل کرنے کے لئے وہ ساری بولیاں بول لیتا ہے جو اسے نہیں آتیں۔

● انسان جس قدر حسین اور پُرکشش خواب دیکھتا ہے اتنی ہی بھیانک تعبیر سے واسطہ پڑتا ہے۔

● جو زیادہ [illegible] جانتے ہیں ، وہ جانتے نہیں اور جو جانتے ہیں وہ بولتے نہیں۔

● [illegible] اور وقت کسی کا انتظار نہیں کرتے۔

---

## دوستی

— دوستی اور اس میں رنگ وفا
امید کرتے ہو کس زمانے کی شاد

— کتنا بڑا ثبوت میری سادگی کا ہے
احباب سے خلوص کا خواہاں رہا ہوں میں شاد

— دوستوں سے اسقدر صدمے اٹھائیں ہیں جان پر
کہ اب دل سے دشمنوں کی شکایت کا گلہ جاتا رہا آتش

— دوست یا سر پرہیں خود فریبیوں کے نام
کہ آج آپ کے سوا کوئی آپ کا نہیں — تاجور

مرسلہ : مس سعیدہ شاد دہلی۔

# عوام میں پھیلے ہوئے بعض مغالطے

حامد اللہ افسر

جدید سائنس نے عوام میں پھیلے ہوئے بعض مغالطوں کو باقاعدہ غلط ثابت کیا ہے۔ سائنس کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ بعض چیزیں، جن کو حقائق سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

امریکہ اور مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں اور لیبوریٹریوں میں سربر آوردہ ماہرین نفسیات، معالج اور محقق سائنسداں ان شہادتوں کی جانچ پڑتال کر رہے ہیں، جو بعض ان باتوں کی حمایت کرتی ہیں، جن کو ہم درست اور صحیح سمجھے ہوئے ہیں، تاکہ گیہوں سے بھوسی سے اور حقیقت افسانہ سے الگ ہو جائے۔ پرانے تصورات سے خاک دھول ہٹانے اور اپنی واقفیت کو تازہ کرنے کے لئے ہم ذیل میں چند ایسی باتیں پیش کرتے ہیں، جن کو ہم صحیح مانتے چلے آ رہے ہیں، اگرچہ سائنس کے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔

۱۔ جب سو رہے ہوں اس وقت ہم مطالعہ نہیں کر سکتے اور نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

سائنس نے یہ بات معلوم کی ہے کہ طالب علموں کو اس وقت بہت سے موضوعات کی تعلیم دی جا سکتی ہے، جب وہ غافل سو رہے ہوں۔ جو چیزیں بغیر کسی کوشش کے اور بغیر محنت کئے اس وقت حاصل کی جا سکتی ہیں، جب ہم سکون و اطمینان سے سو رہے ہوں ان میں مختلف زبانیں، علم ریاضی، کیمیاوی فارمولے اور تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ طالب علم مقررہ وقت پر ریکارڈ بجانے والا ایک آلہ اپنے بستر کے پاس رکھ لیتا ہے۔ اس آلہ کو سیریپوگراف کہتے ہیں۔ جب طالب علم کو سوتے ہوئے کافی دیر ہو جاتی ہے تو سیریپوگراف کسی خاص موضوع کا ریکارڈ بجاتا ہے۔ اگلے دن حافظہ کو تر و تازہ کرنے کا ایک طریقہ استعمال کرنے کے بعد طالب علم کو حرف بہ حرف یاد نکلتا ہے۔

امریکہ میں نارتھ کیرولینا یونیورسٹی نے اس اصول تعلیم کو ۱۱۰ [illegible] کے ایک منتخب گروپ پر دو سال تک آزمایا۔ ان طالب [illegible] ایک خاص لیبوریٹری میں "خوابی درس" دیئے گئے۔ نتائج نہایت ہی امید افزا نکلے۔ گو تعلیم کا یہ طریقہ ابھی امتحانی دور ہی میں ہے، پھر بھی جن ماہرین تعلیم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے معمولی طرز تعلیم کے ساتھ یہ ایک بہت مفید الحاقی طریقہ بن سکتا ہے۔

۲۔ صنف نازک "بہت آسانی سے الجھن میں پڑ جاتی ہے اور بہ نسبت مردوں کے بہت جلد شرما جاتی ہے۔"

جانچ پر [illegible] واضح ہوا کہ مرد زیادہ آسانی سے جھینپ جاتے ہیں اور [illegible] پریشان ہو جاتے ہیں۔ تحقیقات کرنے والے کہتے ہیں کہ کسی کو جھینپانے اور شرمندہ کرنے کا سب سے آسان طریقہ کسی کی تضحیک کرنا یا مذاق اڑانا ہے۔ جب چند منتخب مردوں کی تضحیک کی گئی تو [illegible] فی صد بہت جھینپے اور غصہ میں بھر گئے، لیکن جب عورتوں کے ساتھ بعینہ وہی برتاؤ کیا گیا تو صرف ۲۰ فی صدی کے چہرے سرخ ہوئے اور معمولی سی پریشانی ہوئی۔

اس سلسلہ میں ایک اور طریقہ سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جو لوگ اس مسئلہ کی تحقیق کر رہے تھے، انہوں نے مردوں اور عورتوں کے ایک ملے جلے مجمع [illegible] کہانیاں سنائیں۔ ان مجمع

ان میں قوت برداشت بہت ہوتی ہے اور وہ متحمل اور بردبار ہوتی ہیں
اس کے علاوہ ماہرین طب دماغی اس امر پر متفق ہیں کہ ذہنی اور جذباتی حیثیت سے وہ مردوں سے بہت زیادہ متوازن ہوتی ہیں اور اعصابی کھنچاؤ اور تناؤ مردوں سے کہیں زیادہ برداشت کر لیتی ہیں۔ اعصابی خلل، خودکشی اور دماغی اور جذباتی پریشانیوں میں مرد جس قدر زیادہ مبتلا ہوتے ہیں عورتیں اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوتیں۔

۹۔ مونڈنے کے بعد بال جلد نکلتے ہیں اور موٹے پڑ جاتے ہیں۔

یہ ایک اور غلط فہمی ہے، جسے عام طور پر لوگ صحیح تسلیم کرتے ہیں واشنگٹن اسکول آف میڈیسن میں اور چند دوسرے سائنسی اداروں میں اس سے متعلق جو امتحانات کئے گئے، ان سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ بال مونڈنے سے ان کی بالیدگی یا ان کی ساخت اور بناوٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۱۰۔ تم اپنی آنکھیں کھول کر نہیں سو سکتے

اسٹینفورڈ یونیورسٹی کی نفسیاتی لیبارٹری میں پروفیسر والٹر مائلز نے اس سوال کو سائنٹفک تحقیق کا موضوع بنایا تھا انسانوں کے ایک گروپ پر تجربات کے بعد انھوں نے اس بات کو حتمی طور پر تسلیم کر لیا کہ انسان بغیر آنکھیں بند کئے سو سکتا ہے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے اور صرف اسی وقت ممکن ہے جب کوئی شخص بہت ہی تھک گیا ہو۔
اسٹینفورڈ کی تحقیقات سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو گئی کہ آنکھیں کھلی رکھ کر سویا جا سکتا ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا کہ نیند کو بھگانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں خوب زور سے بھینچ کر تناؤ پیدا کر لو۔

۱۱۔ دیہات کے لوگ بڑے بڑے شہروں کے باشندوں کی بہ نسبت زیادہ پرسکون اور صحیح الحواس ہوتے ہیں۔

اوہیو اسٹیٹ یونیورسٹی نے دیہاتی علاقوں کا خاص طور پر اسی مسئلہ کی تحقیقات کیلئے جائزہ لیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ دیہات کے لوگ بھی اسی طرح مایوسی کا شکار اور خلل اعصاب کے مریض ہوتے ہیں جس طرح وہ لوگ ہیں جو بڑے شہروں کی دھکا پیل اور ... دوڑ دھوپ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔
دوجی ... تعداد ... معلوم ہوتا ہے کہ شہری لڑکوں کی بہ نسبت دیہاتی لڑکے زیادہ تر اسلئے ... کہ ان کا دماغی توازن ٹھیک نہیں تھا۔

صفحہ نمبر ۳۰ کا بقیہ از جہاں قوم کا مستقبل پلتا ہے۔

کے پیش نظر ہیڈ مسٹریس صاحبہ دفتر میں زیادہ تر وقت جوڑ توڑ میں گزارتی تھیں نتیجے کے طور پر طالبات کی پڑھائی کی طرف مناسب توجہ نہیں دی جا سکی۔ جس کی وجہ سے رزلٹ پر بہت برا اثر پڑا۔
اب نئی ہیڈ مسٹریس صاحبہ محترمہ شہزادہ بیگم صاحبہ کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ کس طرح اسکول کے حالات کو سدھارتی ہیں اور اس کو ترقی کی طرف بڑھاتی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم اسکول کی دیگر معلمات سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ کے ساتھ تعاون کریں اور اسکول کی ترقی اور طالبات کی پڑھائی کی جانب توجہ دیں۔ فضول گروپ بندیوں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔
اسی کے ساتھ ساتھ ہم ایجوکیشن آفیسر مسٹر راؤ صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اسکول کی عمارت کی طرف خصوصی توجہ دیں، اس اسکول کی تمام طالبات مسلمان ہیں جو پردہ کرتی ہیں۔ لیکن یہاں پردہ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ٹین کی چادروں میں سوراخ ہیں جن سے بچے جھانکتے ہیں۔ اسکول میں جو ٹینٹ لگے ہوئے ہیں وہ بھی پرانے اور پھٹے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے طالبات کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برسات میں تو ... ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اور بجلی کا بھی کوئی انتظام نہیں ہے۔ علاقے کے میونسپل کونسلر صاحب سے بھی ہماری گذارش ہے کہ وہ اسکول کی بلڈنگ کے معاملے میں کئے اپنے وعدے کو پورا کریں۔ اور جلد سے جلد اسکول کی بلڈنگ کا انتظام کریں تاکہ طالبات کو اس عذاب سے نجات ملے۔

# جہاں قوم کا مستقبل پلتا ہے

• قریشی ایم۔ اے

اس عنوان کے تحت ہر ماہ دلی کے کسی ایک اسکول کے حالات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کے اساتذہ وطلبہ کی شکایات وتکالیف کی طرف متعلقہ حکام سے توجہ کی درخواست کی جاتی ہے ـــــ پچھلے ماہ آپ ایم۔ سی۔ بوائز اسکول کوچہ پنڈت کا تعارف پیش کیا گیا تھا۔ اس ماہ آپ ایم سی۔ گرلز اسکول لال کنواں دہلی سے متعارف ہو رہے ہیں۔

ادارہ

ایم سی گرلز اسکول لال کنواں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، لال کنواں پر واقع ہے۔ لیکن آج کل میونسپل کارپوریشن کی مہربانی اور اعلیٰ انتظام کے سبب یہ اسکول کھلے میدان میں لگ رہا ہے، جہاں طالبات برسات کے موسم میں بارش کے پانی سے غسل کر سکتی ہیں ـــــ گرمی کے موسم میں اپنے پسینہ سے نہا سکتی ہیں۔ اور سردی میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے محظوظ ہو سکتی ہیں ـــــ ۱۰ / مئی ۱۹۶۹ء تک اسکول ہمدرد دوا خانہ کی گلی (کشورہ دینا بیگم) میں تھا۔ لیکن چھٹیوں کے بعد پڑھائی کے جذبے سے سرشار جب طالبات اسکول پہنچیں تو وہاں عمارت کی جگہ مٹی کا ایک ڈھیر پایا۔ معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ اسکول کی نئی عمارت بن رہی ہے۔ اس لئے عارضی طور پر طالبات کو تین جگہ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اکثر کو کوچہ پنڈت کے کھلے میدان میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ کو گلی بوخاں بلیماران میں اور کچھ کو چاندنی چوک کے اسکول میں۔ اور یہ عارضی انتظام آج تک عارضی چل رہا ہے۔

جہاں تک اسکول کے انتظام کا تعلق ہے تو کچھ طالبات اور کچھ معلمات سے گفتگو کرنے کے بعد پتہ چلا کہ یکم اگست ۱۹۷۰ء تک اسکول کی ہیڈ مسٹریس مس شمیم تھیں جنہوں نے اسکول کو تعلیمی مرکز کی بجائے سیاست کا اکھاڑا بنایا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے اسی اسکول میں ان کی بھاوج محترمہ سکندر جہاں بھی ہیں جو ان کا دایاں بازو تھیں۔ اپنے سیاسی ذوق

باقی صفحہ ۲۹ پر

# خیالات کے جھروکے سے

## قارئین

اگست کے شمارے میں میرے مرسلہ مزاحیہ فقروں پر عاقل صاحب نے لکھا ہے کہ فقروں کے کہنے والوں کے نام نہیں دئے اسکی وجہ میری اختراع پسندی ہے تو عرض ہے کہ میں نے تو سب فقروں کے نیچے ان کے کہنے والوں کے نام لکھ دئے تھے شاید وہ کاتب صاحب کی نذر ہو گئے ہونگے۔ عاقل صاحب نے مزید لکھا ہے کہ "ان شخصیتوں کا مشہور ہونا تو درکنار موجود ہونا بھی مشکل ہے" ـــــ یہ پڑھ کر آن کے مطالعے کی کمی پر رونا آتا ہے وہ کون ذی شعور آدمی ہے جس نے سکندر اعظم، ارسطو، ہنری وارڈ بیچر اور نکولس بٹلر جیسے مشہور مفکرں اور شخصیتوں کا نام نہ سنا ہو۔ ـــــ

ـــــ شاہدہ ادریس دہلی

گزشتہ دو ماہ سے آپ شعبہ اردو دلی یونیورسٹی کے امسال ایم۔اے۔ کے نتیجہ پر طلباء کی بے چینی کا ذکر کر رہے ہیں اور اسکی ذمہ داری صدر شعبہ پر ڈالی جارہی ہے ـــ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ نتیجہ خراب ہونے کے ذمہ دار صدر یا دیگر اساتذہ کیوں ـ؟ لڑکوں نے جتنی محنت کی ہوگی انکو اتنا ہی بدلہ مل گیا ہوگا ـــــ ایک استاد بھلا کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اسکا شاگرد اچھے نمبروں سے کامیاب نہ ہو ـ ایک شاگرد کی حیثیت اپنے استاد کے نزدیک حقیقی اولاد سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ـــــ لہذا میں سمجھتا ہوں کہ طلباء کا اپنے استادوں کو مورد الزام ٹھرانا نہ صرف غلط اور بے ہودگی ہے بلکہ انکا یہ الزام سرکشی، احسان فراموشی اور نافرمانی پر محمول ہے۔

ـــــ اکرم جاوید الہ آباد

ـــــ ہم بھی اسی مرکز خیال کے حامل تھے کہ طلباء اپنی کمزوریوں کو اس الزام کے پیچھے چھپانا چاہتے ہیں مگر چند طلباء و اساتذہ سے ملاقات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ نتیجے میں ضرور کچھ گڑبڑ ہے ـــ طلباء نے جو میمورنڈم اس سلسلے میں وائس چانسلر صاحب کو دیا ہے اس میں بھی نمبر تبدیل کئے جانے پر شک کا اظہار کیا ہے (مزید تفصیل کیلئے اس ماہ کا اداریہ ملاحظہ فرمائیں)

ادارہ

---

. . . . . . صدر شعبہ اردو جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب اور شعبہ میں ہونے والی دھاندلیوں کے خلاف آواز اٹھا کر آپ اردو طلباء پر احسان عظیم کر رہے ہیں۔

محمد شاہد، انیس احمد، محمد اخلاق، ساجدہ بیگم ـ دلی یونیورسٹی

ـــــ ہم اگر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی کی بدعنوانیوں پر قلم اٹھا رہے ہیں تو اسلئے نہیں کہ (خدا نخواستہ) ہماری فاروقی صاحب سے کسی قسم کی کوئی رنجش یا دشمنی ہے بلکہ ہمارا قلم اٹھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس سے ہمارے بہت سے ساتھیوں کا مفاد وابستہ ہے اور طالب علم ہونے کے ناطے یہ ہمارا فرض ہے۔

ادارہ

---

اکتوبر کے شمارے میں آپ نے جو "جہاں نو — مستقبل بلیتا ہے" کے تحت اسکولوں کا تعارف دینا شروع کیا وہ ایک قابل تحسین قدم ہے۔ اس سے جہاں عام لوگوں کو اسکول سے متعرف ہونے ہونے کا موقعہ ملے گا وہاں اسکول کے انتظامیہ اور اساتذہ کو اپنی شکایات حکام بالا کو پہنچانے میں سہولت رہے گی ——

محمد یعقوب دہلی

---

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا — ٹائٹل کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں —— دوسرے اس ماہ مضامین بھی کچھ ہلکے ہی ہیں علاوہ ظفر علیجاں کے مقالے "دور عباسی میں عربی شاعری کے نئے رجحانات" افسانوں میں یوسف قریشی کا افسانہ "فریب" غنیمت ہے ورنہ دو افسانے غلط ... ہو رہے — مجھے تعجب ہے کہ آپ ایسے کمزور مضامین ... چھاپ دیتے ہیں۔

صبیحہ مرزا لکھنؤ

---

..... شاہجہاں نے اردو طلبہ کی حمایت میں قلم اٹھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ رسالہ نہ صرف طلبہ کے ادبی ذوق کی تسکین کرتا ہے بلکہ وقتِ ضرورت پر طلباء کے مفاد کی خاطر آواز اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتا —— ہم اسکے لئے مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے ......

محمد عزیز، انور علی، سرور احمد اور ...

---

ہماری مودبانہ درخواست ہے کہ آپ شاہجہاں کے سرورق کا موجودہ ٹرینڈ بدلیئے — بہتر ہے اگر آپ اسکو بالکل سادہ رکھیں ——

اسلم جاوید، رضی ...

—— اس سلسلے میں ہم کو قارئین کے بے انتہا خط موصول ہوئے ہیں یہی وجہ ہے اس ماہ سرورق تبدیل کر دیا گیا ہے — ہم اپنے کرم فرماؤں سے اس سلسلے میں ان کی رائے کے منتظر ہیں۔

ادارہ۔

---

اردو ادب کے جدیدیوں کا ایک رسالہ "شب خون" الہ آباد سے شائع ہوتا ہے جو اپنی خرافات اور مافوق العقل باتوں کے ساتھ اردو ادب پر یقیناً شب خون (رات کا حملہ) ہے —— کیا شاہجہاں کا ایک ادبی پرچہ ہونے کے ناطے اردو ادب کی عزت و آبرو بچانا فرض نہیں ہے —— ؟

عبدالحمید لکھنؤ

---

جگہ کی کمی کے سبب ہم بہت سے ساتھیوں کے خطوط چھاپنے سے معذور ہیں۔

ادارہ

# میں بھی حاضر تھا وہاں

مرتبہ :۔ ریحان الحق ایم۔اے۔بی۔کام

امسال یونیورسٹی اور کالج یونینوں کے انتخابات میں غیر معمولی
تاخیر ہونے کے سبب عربی، فارسی اور اردو کی انجمنوں کی تشکیل بھی بہت
دیر میں ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں تادم تحریر کسی بھی کالج میں کسی بھی انجمن
کی طرف سے کوئی بھی فنکشن منعقد نہیں ہو سکا۔ اس وجہ سے مجبوراً اس کالم
میں مختلف انجمنوں کے عہدیداران کے ناموں پر ہی اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔

## دہلی کالج

### ۱۔ بزم ادب

صدر :۔ شیو پرشاد صاحب جاوید وششٹ
(صدر شعبہ اردو)
سکریٹری :۔ اطہر پرویز
جوائنٹ سکریٹری: قمر عباس
آرگنائزر:۔ پروین اختر

### انجمن فارسی

صدر:۔ سید محمد یونس صاحب جعفری (لکچرار شعبہ فارسی)
سکریٹری:۔ صلاح الدین احمد
جوائنٹ سکریٹری برائے پاس کورس:۔ میمونہ خاتون
〃 〃 〃 آنرز :۔ نسیمہ خاتون

### ۳۔ لجنۃ الادب

صدر:۔ مولانا عبداللطیف صاحب اعترازی
(صدر شعبہ عربی)
سکریٹری :۔ اخلاق قاسمی
جوائنٹ سکریٹری :۔ عبداللہ اسلم

---

بزم ادب دلی یونیورسٹی دہلی

---

نگراں : صدیق الرحمٰن صاحب قدوائی (لکچرار)
صدر : قدسیہ افضال ایم۔لٹ۔ پریویس
سیکریٹری : محمد فاضل ایم۔اے۔ پریویس
ممبران (E.C) : ابرار احمد۔ایم۔اے۔فائنل
راحت بیگم 〃 پریویس
ناہید تاج قریشی 〃

# یو۔جی۔سی۔ کے اسکالر شپ

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۷۱-۱۹۷۰ء کے دوران فارسی اور عربی میں اور پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم کے لئے مندرجہ ذیل طلبہ کا انتخاب کیا ہے۔

## عربی

### پوسٹ گریجویٹ

۱۔ سید قیصر محمود۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔ ایم۔ اے۔ دواورکر۔ بمبئی یونیورسٹی۔
۳۔ این۔ پی۔ محمود۔ فاروق کالج نیروک (کیرالہ)
۴۔ پی۔ کے۔ تھنگل۔ فاروق کالج نیروک (کیرالہ)
۵۔ کے۔ کے۔ محمد کٹی۔ فاروق کالج نیروک (کیرالہ)
۶۔ کے۔ عبدالقادر۔ فاروق کالج نیروک (کیرالہ)
۷۔ آئی۔ سوئنڈ پا۔ نیو کالج مدراس
۸۔ مس صدیقہ سلطان عثمانی۔ آرٹس وکامرس کالج حیدرآباد۔

### آنرز

۱۔ ابوالکلام قاسمی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
۲۔ کے۔ بی۔ زماں۔ " " "
۳۔ طارق مختار۔ " " "
۴۔ محمد شمس الضحیٰ۔ پٹنہ کالج۔ پٹنہ
۵۔ رضوان الحق۔ دہلی کالج۔ دہلی
۶۔ آر۔ آئی۔ فیضان۔ " "

## فارسی

### پوسٹ گریجویٹ

۱۔ سید حسین محمود۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔ نیر حسیب۔ " " "
۳۔ این۔ اے۔ صدیقی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی

### آنرز

۱۔ مس خورشید بیگم۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۔ ایم۔ ایم۔ کوسالہ۔ بڑودہ یونیورسٹی
۳۔ مس چندر ریکھا عابدہ بانو۔ گجرات کالج احمد آباد
۴۔ منصوری تسلیم بانو۔ گجرات کالج احمد آباد
۵۔ محمد قمرالدین۔ ٹی۔ این۔ بی۔ کالج۔ بھاگلپور۔
۶۔ مس تاجور اسلم۔ مگدھ مہیلا کالج پٹنہ۔

## یو۔جی۔سی۔ اسکالرشپ برائے ریسرچ

دلی یونیورسٹی کے مندرجہ طلبہ نے ریسرچ کے لئے دو دو سال کے اسکالرشپ حاصل کئے ہیں

۱۔ ریحان الحق شعبۂ عربی
۲۔ مس ثریا بیگم۔ شعبۂ اردو
۳۔ مس نرگس جہاں۔ شعبۂ فارسی

ادارہ ریحان الحق صاحب کو قلبی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ ریحان الحق صاحب شاہ جہاں کے صرف خصوصی نمائندہ ہیں، بلکہ وہ ادارے کے ایک سرگرم ممبر بھی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ادارہ دعاگو ہے کہ تینوں ساتھیوں کے مقالے وقت پر جمع ہو جائیں۔ آمین

# شاہجہان

# ہمارے مقاصد

طالب علموں کا۔ طالب علموں کیلئے۔ طالب علموں کے ذریعے

فروری ........ ۱۹۷۱ء

جلد ۵ ........ شمارہ ۲

قیمت فی پرچہ ۲۵ پیسے
" سالانہ تین روپے

## طالب علموں

........ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا۔
........ کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا
........ کو ملک و ملت کی با مقصد خدمت کے لئے تیار کرنا۔
........ میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا
........ کی آواز کو عوام تک پہنچانا۔
........ کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا۔
........ سماجی اصلاح کے لئے جد و جہد کرنا۔

ادارہ



شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے، غزلیں اور نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں۔

ادارہ

شاہجہاں میں شامل افسانوں میں نام، مقام واقعات فرضی ہیں۔ کسی سے کوئی مطابقت محض اتفاق ہے۔ جسکے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں۔



شاہجہاں آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (AISNEC) نئی دہلی کا ممبر ہے۔

طابع، ناشر و مالک ........ محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ ........ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

مقام اشاعت:۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ بلیماران۔ دہلی نمبر ۶

سر ورق: یوں مسکرائے جان سی۔۔۔۔

تزئین: صدیقی

## پڑھنے والوں سے۔۔۔

فروری ۷۱ کا شمارہ ۱۵ر جنوری ۷۱ء کو پوسٹ کیا جارہا ہے اور اب آئندہ ہر ماہ شاہجہاں ۱۵ر پندرہ تاریخ کو پوسٹ کیا جائے گا ۔۔۔ لہٰذا اگر آپ کو بیس تاریخ تک رسالہ نہ ملے تو فوراً مطلع کردیجئے ۔۔۔۔ دوسرے سالانہ چندہ یا تو براہ راست ہم کو ارسال فرمائیں اور یا صرف ان کو دیں جو آپ سے بلا کسی اس کی چھپی ہوئی رسید دیں ۔۔۔

ادارہ

**ادارہ**

اردو ہندوستان کی ایک مظلوم زبان ہے جو اپنے ہی وطن اور اپنے ہی گھر میں غیر بنادی گئی ہے اور مشکوک نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ ایک وہ تھا جب غیر اردو داں طبقہ بھی اپنے بچوں کو اردو پڑھنے اور سیکھنے کی ترغیب دیتا تھا۔ سڑک پر چلتا ہوا شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سامنے سے آنے والا اردو سے ناواقف ہوگا۔ اور اردو شعراء و ادباء باعث عزت سمجھے جاتے تھے اسکے برعکس اسی ہندوستان میں اسی چاردیواری میں کل کی محبوب اردو آج معتوب بنی ہوئی ہے۔ آج اردو داں طبقہ بھی اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلانے سے گریز کرتا ہے۔ بازار میں اردو والا عجیب عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اردو ادیب و شاعر کے دامن حقارت و نفرت کے کانٹوں سے تار تار ہیں۔

اردو کی اس زبوں حالی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اردو کے چند نام نہاد بہی خواہ کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے حکومت سے اردو کا حق مانگتے ہیں۔ اسکی ترویج و ترقی کے نام پر پیسہ حاصل کرتے ہیں۔ گزشتہ پندرہ بیس سال سے یہ ہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ اردو روز بروز اسکولوں سے کالجوں سے غرض گھروں سے نکلتی جارہی ہے فنا ہوتی جارہی ہے اور یہ بہی خواہ یہ ہمدرد حق مانگنے کیلئے اسی طرح جھولی پھیلائے کھڑے ہیں اب ان کی جھولی اتنی بوسیدہ اور کمزور ہو چلی ہے کہ اگر اسکو اسکی مطلوبہ چیز سے بھر بھی دیا جائے تو یہ اس کا وزن برداشت نہیں کرسکے گی۔

تمام حقائق کے پیش نظر ہم یہ بات بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اردو کو موجودہ حالت پر پہنچانے، تاراج کرنے اور اسکا حق چھیننے کے ذمہ دار ارباب سیاست نہیں ہیں بلکہ خود اردو کے محافظ اور ہمدرد اسکا باعث ہیں ــــ یوں تو ہندوستان میں اردو کے تحفظ اور ترویج کے لئے بہت سی انجمنیں اور دستے موجود ہیں مگر ان میں منظم اور بارسوخ انجمن صرف انجمن ترقی اردو ہے کیونکہ اسکی شاخیں مختلف شہروں میں بھی قائم ہیں۔ جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے اسکا مقصد صرف اردو کو ترقی دینا ہے۔ ایک اردو داں ہونے کے ناطے اگر آپ اس بات کا تجزیہ کریں کہ اس نے اردو کی ترقی کیلئے کیا کیا اقدام کیے اور ان میں کہاں تک کامیابی ہوئی تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مختلف اوقات میں لاکھوں یا ہزاروں دستخط پر مشتمل مختلف میمورنڈم اردو کو اسکا حق دلانے کیلئے کبھی صدر کو پیش کئے اور کبھی وزیر اعظم یا دوسرے وزراء کو ــ اسکے علاوہ کبھی کبھی ادبی نشستیں منعقد کریں اور ان میں مخصوص ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرلیا۔ بس ــــ یہ ہی یا اسی طرح کی ہی اسکی کارگذاری ہوگی ہمارے خیال میں کوئی ذی ہوش انسان یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اس سے اردو کو ترقی ہورہی ہے۔ جہاں تک میمورنڈم پیش کرنے کا تعلق ہے اسکے لئے آج بھی "ہنوز روز اول است" والا معاملہ ہے اور ادبی نشستوں کے انعقاد کو اردو کی ترقی تصور کرنا بے وقوفی کی حد تک غلط ہے ــــــ اردو کو اسکا حق دلانے کے ہم بھی حامی ہیں مگر گھر میں بیٹھ کر یا میمورنڈم پیش کرکے نہیں۔ ہم کسی چیز کو حاصل کرنے کیلئے دستِ سوال دراز کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ ہم اس مرکز خیال کے حامل ہیں کہ خود کو اتنا مضبوط کرلیا جائے کہ مانگنے سے پہلے ہی ہم کو مطلوبہ چیز مل جائے۔ ہمارے ملک میں جمہوریت ہے ہر ایک کو بہت سی آزادیوں کے ساتھ زبان پھیلانے کی بھی آزادی حاصل ہے۔ اردو کے ذمہ داروں نے جتنا وقت حق لینے کیلئے میمورنڈم پر میمورنڈم دینے میں صرف کیا اگر یہی وقت وہ۔

صحیح معنوں میں اردو کی ترقی و ترویج میں لگاتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ حکومت اسکے لئے تیار نہ ہوتی ۔ اگر وہ اس دوران غیر اردو طبقے کو اردو سکھانے کے انتظامات کرتے تو آج ان کے ساتھ دوسرے طبقوں کی آوازیں بھی اٹھ رہی ہوتیں۔ مگر آج ان آواز کے ساتھ اردو طبقہ بھی پورا نہیں ہے کیونکہ سب اردو کو غیر ضروری اور بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ چکے ہیں اور اب حالت ہے کہ اگر اردو کو اسکا حق دیدیا بھی جائے تو اس سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اسی لئے حکومت اس مسئلے کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی۔ اسلئے ہمارا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اردو کے قاتل ارباب سیاست یا اسکے دشمن نہیں ہیں بلکہ خود اسی کے محافظوں اور ہمدردوں کی آستینوں میں اسکا خون لگا ہوا ہے۔

اب بھی وقت نہیں گزرا ہے اور ابھی بھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اگر مختلف محلوں اور شہروں میں اردو پڑھانے کے مراکز قائم کئے جائیں تو اس سے اردو کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔ چند سال قبل دلی کالج (ایوننگ) دہلی میں اردو کی بزم ادب نے اردو سیکھنے کے خواہشمند طالب علموں کے لئے اردو کی کلاسز کا اہتمام کیا تھا بعد میں ایسے طالب علموں کی تعداد اتنی بڑھی کہ تین سیکشن کرنا پڑے تھے۔ اگر اب بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس طرح کی کلاسز لگائی جائیں تو اس سے جہاں اردو پھیلے گی وہاں دوسرے طبقوں میں بھی اردو کیلئے ہمدردی پیدا ہوگی۔

ایک بار پھر ہم اردو کے محافظ دستوں اور اسکی انجمنوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ موجودہ روش کو چھوڑ کر اپنے کمرے سے باہر نکلیں، اور بغیر کسی سیاسی اور ذاتی فائدے کے اردو سکھانے کے مراکز کھولیں اور صدقِ دل سے اردو کی ترقی کے لئے کام کریں۔

---

## فری ٹیوشن کلاسز

جیسا کہ قارئین کو علم ہی ہے کہ ہم نے پرنسپل فتحپوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول محترم الحاج زین العابدین اور کچھ معزز اساتذہ اور بہت سے ساتھیوں کے تعاون سے پچھلے ماہ ہائر سیکنڈری کے طلباء کے لئے فری ٹیوشن کلاسز کا اہتمام کیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ کلاسز نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔ اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ۱۱ر جنوری سے آٹھویں کلاس کے طلبہ کے لئے بھی کلاسز شروع کر دی گئی ہیں۔ زیادہ رش ہونے کی وجہ سے طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو داخلہ نہ دینے کے باوجود دو سیکشن کرنا پڑے۔ اسکے علاوہ ہم جلد ہی دہلی میں تعلیم بالغان کا مرکز بھی قائم کرنے والے ہیں۔

ہمیں یہ لکھتے ہوئے نہایت دکھ ہے کہ کچھ لوگ ہمارے اس قدم کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور کچھ ٹیوٹرز بھی ہم کو اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ جبکہ اس سے ہمارا مقصد نہ کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا ہے اور نہ ہی کسی سے دشمنی مول لینا ہے۔ ہم صدقِ دل سے خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ہم بامقصد تنقید کا خیر مقدم کریں گے اور جارح تنقید کا جواب دینا فرض سمجھیں گے۔

---

## دلی یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

آٹھ جنوری ۱۹۸۸ء کا دن دلی یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک سنہرا دن ہے کیونکہ اس دن یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسکا اپنا طالب علم وائس چانسلر بنا۔ ڈاکٹر سروپ سنگھ جو سابق وائس چانسلر تھے۔ این. راج کے زمانے میں پرو وائس چانسلر تھے یکم اکتوبر ۱۹۸۷ء ڈاکٹر راج کے استعفیٰ دینے کے بعد سے اسی عہدے کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ——— ڈاکٹر سنگھ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لکچرار ہوئے۔ پھر کروڑی مل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اسکے بعد پروفیسر اور انگلش ڈیپارٹمنٹ کے صدر ہوئے بعد ازاں پرا کٹر اور پھر پرو وائس چانسلر اور اب وائس چانسلر بن گئے۔ ان کے مقابلے میں کوئی نہیں تھا جو یونیورسٹی کی کارکردگی کے ہر پہلو سے اتنا واقف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انکے تقرر کو ہر جگہ اچھی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔

# فنِ ناول نگاری

ادب

محمد ارشاد ایم اے۔ ایم لٹ
دلی یونیورسٹی

قدرت نے انسان میں یہ وصف پیدا کیا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں میں دلچسپی لیتا ہے وہ آپس میں ملتا جلتا رہتا سہتا ہے۔ ایک دوسرے مسائل سے دلچسپی لیتا ہے۔ سوسائٹی میں اس میل جول کی وجہ سے نئے نئے زندگی کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ سب ان مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں اور اسے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں انسان کی یہ دلچسپی ہر دور اور ہر مقام پر پائی جاتی ہے ادب کی بنیاد بھی اسی دلچسپی پر قائم ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اظہار خیال کا ذریعہ وہ رزمیہ بزمیہ نظموں کو، مثنوی کو، قصیدہ کو، رباعی کو، غزل کو، ڈرامہ کو، افسانہ کو، ناول کو بناتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر صنفِ ادب میں انسان کا ذکر ہوتا ہے۔

ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے انگریزی ادب کا اثر ہمارے اردو ادب پر پڑا۔ تو ہمارے ادب میں بھی ناول وجود آیا۔ اور یہ اس تیزی سے آیا کہ ادب میں اس نے ایک، ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ اور یہ دیکھتے دیکھتے تمام ادب پر چھا گیا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ناول سے پہلے ہمارے ادب میں قصے کہانیوں کا وجود نہ تھا یہ کہنا غلط ہوگا۔ بلکہ ناول سے پہلے اردو ادب میں الف لیلیٰ، طلسم ہوشربا، بوستان خیال، باغ بہار فسانۂ عجائب، نوطرز مرصع جیسی کتابوں کا وجود تھا۔ ان داستانوں میں حسن، عشق کے چرچے بھی ملتے ہیں۔ تخیل کی بلند پروازی بھی ہے۔ حق و ناحق کا تصادم بھی ہے۔ کردار نگاری بھی ہے اور انداز بیان کی خوبصورتی بھی ہے۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ان میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ وہ فرضی ہیں۔ اور حقیقت سے دور ہیں۔ ان کو پڑھ کر قاری کا وقت گذر جاتا ہے۔ وہ اس کے طلسم میں خود کو فراموش ضرور کر دیتا ہے۔ لیکن پاتا کچھ نہیں۔ اس کے مقابلے میں ناول حقیقت اور فطرت انسانی سے قریب ہوتا ہے۔ وہ انسانی مسائل کو پیش کرتا ہے وہ اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے۔

ناول کی ابتداء کے بارے میں رچرڈ کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ " کہانیاں ساری دنیا کو پیاری ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ قصہ گوئی کا آغاز اس وقت سے ہوا ہو جس وقت سے انسان نے کھڑا ہونا سیکھا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ناول نگاری کی ابتداء قصہ گوئی سے ہوئی ہو۔ اور قصہ گوئی انسانی گروہ میں شروع سے رائج رہی۔ ابتدائی دور میں بھی جب انسان تھکا ہارا واپس اپنے غار میں آتا ہوگا۔ تو وہ دن بھر کی داستان اپنے ساتھیوں کو سناتا ہوگا۔ اس جدید دور میں بھی جب ہم تھکے ہارے گھر جاتے ہیں تو اس محفل میں جو واقعات ہمیں،

پیش آتے ہیں ہم اس کا ذکر اپنے ساتھیوں سے کرتے ہیں یہیں سے کہانی کی ابتدا شروع ہوتی ہے۔ جس نے آگے چل کر ناول کا روپ اختیار کیا۔

ناول ادب کی ایک اہم شاخ ہے جو ہماری زندگی کے مختلف مسائل کو سلجھانے میں مدد دیتا ہے۔ سوال ابھرتا ہے کہ یہ کام ڈرامہ سے بھی تو لیا جا سکتا ہے لیکن ڈراما خالص ادبی چیز نہیں ہے اس کے لئے اسٹیج کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈراما اس لئے لکھا جاتا ہے کہ اسے اسٹیج پر دیکھا جائے اس کے برعکس ناول پڑھنے کیلئے لکھا جاتا ہے ناول کیلئے اسٹیج ضروری نہیں ہے۔ شاید اسی لئے میرین کرافورڈ نے ناول کو "پاکٹ سٹیڈ" کہا ہے۔ چونکہ ناول میں پلاٹ، کردار، لباس، مناظر اور دوسری ڈراما کی ضروری چیزیں موجود ہوتی ہیں۔

اردو ادب میں ناول انگریزی سے اثر لے آیا کیوں کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ سحری اپنی تمام توانائی کھو کر ٹمٹما رہا تھا۔ انگریزوں کا اثر و رسوخ ہر سمت بڑھ رہا تھا ہر ادب اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے۔ اور فاتح کی ہر چیز قبول کر لیتی ہے۔ ہمارے ادیب نے بھی انگریزی ادب کا اثر قبول کیا۔ اس طرح اردو ادب میں ناول نگاری کی ابتدا ہوئی۔

یورپ میں ناول کو اٹھارویں صدی میں ادبیات میں جگہ ملی۔ انیسویں صدی میں یہ صف اول میں آگئی۔ یورپ میں بھی ناول نشاۃ ثانیہ کی یادگار ہے۔ اس دور میں مشینوں کی ایجاد صنعت و حرفت کی ترقی کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں طوفان آگیا تھا۔ یورپ کا جاگیرداری نظام دم توڑ رہا تھا زندگی کی حقیقی قدریں ابھر رہی تھیں ایک نیا سماج جنم لے رہا تھا۔ صنعت و حرفت کی وجہ سے لوگوں کی مصروفیت بڑھ گئی ان کے پاس طویل داستان سننے کے لئے وقت نہ رہا۔ لیکن ذوق جمال کی تسکین ضروری تھی۔ اب اس [illegible] بھی بدل گیا اب ان کا نقطہ نظر سائنٹیفک [illegible] اب وہ حقیقت سے آشنا ہوگیا تھا۔ اب وہ زندگی کے ہر پہلو

جن جھوٹ، عشق و محبت کی فرضی داستانوں، طلسم کے حسین خیالوں سے نہیں بہل سکتے تھے۔ اب اسے حقیقت کے کھلونوں کی ضرورت تھی۔ اس دور میں ناولوں کا وجود ہوا۔ داستانوں کا دور ختم ہوا۔ ناول زندگی کی تصویر بھی ہوتی ہے اور تفسیر بھی۔ اس کے علاوہ یہ زندگی کی تنقید بھی ہوتی ہے۔ ناول نگار پہلے خود زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔ پھر دوسروں کو زندگی کا مطالعہ کراتا ہے۔ انگریزی میں رچرڈسن۔ اور فیلڈنگ ناول کے موجد کہے جاتے ہیں۔

اردو میں ناول نویسی کا بانی عام طور پر سرشار کو بتایا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں حقیقت میں نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ اس لئے کہ ان کی تصانیف "بنات النعش" ۱۸۷۲ء میں مرآۃ العروس ۱۸۶۹ء میں اور توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء میں۔ سرشار کے ناول فسانہ آزاد سے بہت قبل شائع ہو چکی تھی

ایک ناول کو ہم اس وقت تک ناول نہیں کہہ سکتے جب تک کہ اس میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری، اسلوب اور فلسفہ حیات نہ ہو۔

# موضوع

پہلی چیز جو ناول میں دیکھی جاتی ہے وہ اس کا موضوع ہوتا ہے۔ جس کو واکنز اس طرح بیان کرتا ہے۔ "ناول کے موضوع کی وسعت خود ذات انسانی سے کسی طرح کم نہیں۔ ناول نگار عورتوں مردوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ انکے تعلق انکے افعال انکے خیالات اغلاط اور خامکاریوں کی، انکی عظمت کی اور ان کی فرومائگی سے بے شمار حسین اشکال ان کی متلون مزاجی خوف عادات۔ جوش اور جذبات جو قلب انسانی میں تموج برپا کر دیتے ہیں۔ یہ سب ناول کے موضوع ہیں مختصر یہ کہ اس کا موضوع خود ذات انسانی ہے۔"

اس کے علاوہ دنیا کی ہر چیز ناول کا موضوع ہو سکتی ہے۔ تاریخی، سماجی، معاشرتی، مذہبی، واقعات بھی ناول کا موضوع ہو سکتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناول

معاشرتی ہیں۔ شرر نے اپنے ناول کے موضوعات اسلامی تاریخی
واقعات کو بنایا۔ یہ بات ناول نگار پر منحصر ہوتی ہے۔
یہ اسکی طبیعت کا میلان ہوتا ہے۔

مشہور ناول نگار۔ ڈکنیس، تھیکری، جارج ایلیٹ
وغیرہ کے اگرچہ موضوعات مختلف ہیں۔ لیکن سب نے زندگی
کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے اور ان
سب مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی جذبات
کی عکاسی کی ہے۔ سماجی گتھیوں کو سلجھایا ہے اور زندگی
کی اخلاقی قدروں کو بلند کیا ہے۔

نذیر احمد، شرر اور پریم چند کے ناول اصلاحی ہیں۔
موجودہ دور کے ناول نگار۔ بیدی، کرشن چندر، علی عباس
حسینی اور سجاد ظہیر بھی اس مقصد کو نظر انداز نہیں کرتے۔

## پلاٹ

موضوع کے بعد سب سے زیادہ اہمیت پلاٹ کی
ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ناول کا وجود ناممکن ہے۔ فورسٹر
پلاٹ کی تعریف اس طرح کرتا ہے "وہ واقعات جو اشخاص
قصہ کو پیش آئیں اور وہ افعال جو ان سے سرزد ہوں مجموعی
حیثیت سے پلاٹ کہلاتے ہیں"۔ پروفیسر ایلین پلاٹ کی تعریف
اس طرح کرتے ہیں" پلاٹ نام ہے ان واقعات کا جو اشخاص
قصہ کو پیش آئیں"۔ لیکن ایلین کے خیال کے مطابق اس میں
جاذبیت، دلچسپی کے علاوہ واقعات میں لگاؤ اور تعلق ہونا
ضروری ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ناول وقت گذارنے کے
لئے تھکن دور کرنے کے لئے ذوق جمال کی تسکین کیلئے
پڑھا جاتا ہے۔ اسے پڑھنے کا غالباً اور کوئی مقصد نہیں ہوتا
اگر اس میں جاذبیت دلچسپی اور واقعات میں تعلق اور لگاؤ
نہ ہوگا تو پھر اسے کون پڑھے گا۔

عام طور پر پلاٹ کو دو اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔
۱۔ منظم پلاٹ ۲۔ غیر منظم پلاٹ

منظم پلاٹ میں کہانی کے ترکیبی اجزاء ایک دوسرے
سے گتھے ہوئے ہوتے ہیں ان میں کہیں جوڑ نہیں ہوتا۔
اردو میں نذیر، شرر، پریم چند کے ناولوں کے پلاٹ منظم
ہیں۔ مگر سب سے زیادہ منظم پلاٹ رسوا کے ناول "امراؤ جان
ادا" کا ہے۔

غیر منظم پلاٹ وہ ہوتا ہے جس میں کہانی کے اجزاء
مختلف واقعات پر مبنی ہوتے ہیں ان کا آپس میں منطقی ربط
کم ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں "رابن کروسو" اور اردو میں
سرشار کا "فسانہ آزاد" غیر منطقی پلاٹ کی بہترین مثالیں ہیں

اس کے علاوہ پلاٹ سادہ اور مرکب پلاٹ میں بھی
تقسیم کیا جاتا ہے۔ سادہ میں ایک کہانی ہوتی ہے اس میں پیچیدگی
نہیں ہوتی۔ مرکب میں کئی کہانیاں ہوتی ہیں یہ پیچیدہ ہوتا ہے
جیسے سرشار کا فسانہ آزاد

اچھے پلاٹ منظم ہی ہوتے ہیں پلاٹ میں چستی اور
تناسب کا ہونا ضروری ہے اس کے علاوہ پلاٹ کو تصنع
اور بناوٹ سے بھی پاک ہونا چاہیئے۔ یعنی پلاٹ میں واقعات
کا بڑھنا اور پھیلنا فطری ہونا چاہیئے۔ واقعات کو فطری
ہونا چاہیئے نہ زندگی سے دور۔

## کردار نگاری

واقعات انسان کو پیش آتے ہیں۔ انسان اپنی زندگی
میں مختلف واقعات سے دوچار ہوتا ہے۔ اور خاص حالت
میں خاص حالت میں خاص عمل اس سے سرزد ہوتا ہے

اچھے ناول نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ کرداروں کو اس
خوبی سے پیش کرتا ہے۔ کہ وہ ہمیں سچ مچ کے معلوم ہونے
لگتے ہیں۔ اور ہمارے ذہن پر اپنے کردار اور افعال کی
وجہ سے چھا جاتے ہیں۔

کردار نگاری کے دو طریقے ہیں
۱۔ تجرباتی ۲۔ ڈرامائی

تجرباتی میں ناول نگار خود کرداروں کے چال چلن پر
روشنی ڈالتا ہے ——— ڈرامائی میں کردار خود اپنا چال
چلن قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں

کردار نگاری میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے

کہ کردار وہی کام انجام دیں جو کہ ناول میں ان کو انجام دینے
ہوں۔ خلاف عقل اور بے ضرورت کا ناول میں گزران گھٹیا ہیں
اس کے علاوہ ناول کے ماحول وقت اور موقع کا بھی خیال
رکھنا ضروری ہے۔

## مکالمہ

کردار واقعات کے دوران میں جو گفتگو کرتے ہیں۔
اس کو مکالمہ کہا جاتا ہے۔ ناول کی کامیابی اور ناکامی کا
دارومدار بڑی حد تک مکالمہ پر ہوتا ہے۔ یہی وہ
ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم ناول کے قصے اور کرداروں
کے کردار سے روشناس ہوتے ہیں ان کے متعلق رائے
قائم کرتے ہیں۔ ان سے نفرت یا محبت کرتے ہیں۔

مکالموں کو دلچسپ، موزوں، مناسب اور برمحل
ہونا چاہیئے۔ الفاظ جچے تلے ہونے چاہیئے۔ جملے چھوٹے
ہوں طویل نہ ہوں۔

اس کے علاوہ مکالموں کو ناول کے اصل قصہ سے
ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ غیر ضروری نہ ہو۔ مکالموں کو
منظری اور ڈرامائی ہونا چاہیئے۔ مکالموں میں وقت، مقام
اور کیفیت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ یہی کرداروں
کے احساسات۔ جذبات اور خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں۔
اچھے مکالموں کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے۔ کہ اس کے ذریعہ سے
کہانی کو آگے بڑھایا جائے۔ اسی کے ساتھ مکالموں کی
زبان آسان ہو۔ ان میں برجستگی ہو ان کے کردار کا آئینہ
ہو تصنع سے پاک ہو۔

## منظر نگاری

پلاٹ، مکالمہ، کردار نگاری کے ساتھ ساتھ
ناول نگار کو منظر نگاری ([illegible]) کا بھی خیال رکھنا
پڑتا ہے یہ کمی ناول کی خوبیوں کو کم کر دیتی ہے۔ ادب
کے نقاد کسی ناول پڑھتے وقت اس کی منظر نگاری پر
ضرور نظر ڈالتے ہیں کہ ناول میں مکاں اور زماں کا خیال
رکھا گیا ہے کہ نہیں۔ منظر نگاری میں مقام۔ وقت۔ منا
فطرت کی عکاسی کردار کی عادات خصائل۔ اس دور
طرز سے رہائش جس دور میں کہ ناول لکھا گیا ہے ما
وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ ایک اچھا ناول نگار ان باتوا
خیال رکھتا ہے۔ وہ جس دور کے واقعات کو موض
بنا کر ناول لکھتا ہے۔ وہ ناول میں اس دور طرز معاشر
لباس، نشست و برخاست وغیرہ کو بھی پیش کرتا ہے۔ نا
احمد نے اپنے ناولوں میں کامیابی سے منظر نگاری کی۔
ان کے ناول ان کے دور کے ترجمان ہیں۔ اور اس د
کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ سرشار بھی کامیاب منظر
ہیں انھوں نے بھی فسانہ آزاد میں لکھنوی تہذیب کو بڑ
چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ سب سے داد تحسین د
کی ہے۔ لیکن شرر اس سلسلے میں ناکام رہے ہیں۔ انھ
نے اپنے تاریخی ناولوں میں واقعات تو اسلامی تاریخ
لئے ہیں اور منظر نگاری ہندوستانی معاشرت کی کی ہے۔

## فلسفہ حیات

مشہور انگریز شاعر اور نقاد آرنلڈ کا قول ہے
" شاعری تنقیدِ حیات کا نام ہے کہ یہ قول ناول نگاری
لئے بھی اتنا ہی درست ہے جتنا کہ شاعری کیلئے۔ آرنلڈ
نے ناولوں کو جانچنے کے لئے تین باتیں بتائی ہیں۔ اس
میں سے ایک تنقید حیات بھی ہے۔ [illegible]
([illegible])

انسانی زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ اس میں
تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے حالات انسان کو کبھی خراب
بنا دیتے ہیں۔ اور کبھی اچھا۔ کبھی انسان کا دامن خوشیوں
سے بھر جاتا ہے وہ عیش و نشاط کی محفلیں گرم کرتا ہے
کبھی وہ غموں کے سنگین بوجھ کے نیچے دب جاتا ہے۔ کیو
کہ ناول نگار خود بھی انسان ہوتا ہے اس کی زندگی میں بھی
ایسے دور آتے ہیں ناول نگار کے حساس دل پر اس کا اثر
ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے دکھ اور سکھ کا مطالعہ کرتا

آگے صفحہ ۱۳ پر

# فرقہ وارانہ یک جہتی

مضمون

نسرین تاج قریشی
گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول چشمہ بلڈنگ دہلی

فرقہ وارانہ یکجہتی آج ہندوستان کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کو قائم کرنے کے لئے ہندوستانی عوام عموماً اور طلبہ کو خصوصاً کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے موصول ہونے والی صحت مند تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

(ادارہ)

انگریزوں کی سب سے بڑ پالیسی کیا تھی؟ اگر ہم میں سے کسی سے بھی یہ سوال کیا جائے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ فرقہ وارانہ فساد، اس کے برعکس اگر پوچھا جائے کہ ہندوستانیوں کے آزاد ہونے کا کیا راز ہے تو اسس کا جواب یقیناً یہی ہوگا "فرقہ وارانہ یکجہتی" جب ہمارے ملک کے لیڈروں اور عوام نے یہ عہد کیا تھا کہ ہمیں صرف ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے ملک کو اپنے مادر وطن کو غلامی کے زنجیروں سے آزاد کرانا ہے تو وہ اپنے اسس ارادے میں کامیاب ہو گئے۔

دیکھنے میں تو بظاہر "یک جہتی" اور "فساد" دو معمولی الفاظ ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کی بہت اہمیت ہے۔ کیونکہ جب انھیں عمل میں لایا جاتا ہے تو دوزخ اور جنّت کے نمونے ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں۔

ہندوستان آج گاندھی جی کا وہ درس بھول گئے جس کی تبلیغ میں انھوں نے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اہ آج ان کی وہ تعلیم صرف کتابوں میں ہی بند ہے۔ جو کچھ لوگ گاندھی جی کا پیغام دوسرے لوگوں تک پہنچانا بھی چاہتے ہیں ان کی آواز نقارہ خانے میں طوطی کی صدا ہو کر رہ گئی ہے۔ سر سیّد احمد خاں کا وہ پیغام جو انھوں نے ہندوستانیوں کو دیا تھا۔ "ہندو، مسلمان ہندوستان نامی دلہن کی دو آنکھیں ہیں اگر ان میں سے ایک بھی خراب ہوگئی تو دُلہن کافی اور بدصورت لگنے لگی۔ ہمارا فرض ہے کہ اسس کی حفاظت کریں۔" آج بھی کتابوں کی زینت ہے۔ لیکن ان فساد پرست لوگوں کی آنکھوں پر چربی چھا گئی ہے۔ انہیں سوائے لوٹ کھسوٹ کرنے کے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

ملک کی ترقی کی راہوں میں رکاوٹ ڈالنے والے یہی لوگ ہیں جنھیں فسادات کرنے اور لوگوں کو لڑنے لڑوانے کے سوا دنیا میں کوئی اور کام نہیں ہے۔ یہ لوگ آستین کے سانپ کی طرح ہندوستان میں پل پل کر اس کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آج زبان کے نام پر فساد ہے تو کل مذہب کے نام پر آج بمبئی میں تو کل احمد آباد میں غرض کہ تمام ملک میں یہ وبا پھیلی ہوئی ہے۔ یہ انھیں فسادات کا نتیجہ ہی تو ہے کہ ہزاروں لوگ آن کی آن میں بے گھر بار ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ جن کی کبھی بڑی بڑی ملیں اور کارخانے تھے دو دو کوڑی

فتاج ہو چکے ہیں۔ جنھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا
اقہ کسے کہتے ہیں۔ بھوک سے بلک رہے ہیں۔
لوگوں کی زندگی کبھی بڑے عیش و آرام میں گذرتی تھی
د کی ایک ہی لہر نے ان کا تمام عیش و آرام چھین لیا۔
ں نے اپنی آنکھوں سے اپنی دکانوں، مکانوں،
مانوں اور ملوں میں آگ کے شعلوں کو بھڑکتے
ا اور کچھ نہ کرسکے صرف حسرت سے دیکھتے رہ گئے
ہ وہ بے بس تھے۔ لاچار تھے مجبور تھے اور ایسے
ی تھے جن کی فریاد کو کوئی بھی تو سننے والا موجود
ا۔

ہندوستان کی فرقہ وارانہ طاقتوں میں اضافہ
ڈتا جا رہا ہے۔ فرقہ پرست لوگ ہی ہیں جو بغیر کسی
ے کے کمزور اور ضعیف لوگوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ
تے ہیں۔ اُن کے بڑھاپے کے سہاروں کو بے دردی
ردی سے قتل کر ڈالتے ہیں۔ معصوم نوشگفتہ
لوں کو بے رحمی کے ساتھ پیروں سے کچل ڈالتے
۔ پاک دامن عورتوں اور لڑکیوں کی عصمت کو
ں میں ملاتے ہیں انھیں کوئی عار نہیں۔ غرض
رح سے لوگوں کو برباد کرنے پر تل جاتے ہیں میرے
ں میں یہ صرف ان کی بربادی نہیں بلکہ پورے ہندوستان
بربادی ہے۔ اور اس رو سے ہمیں ان ہندوستان
ندا اددں کو ختم کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے
ہم اپنا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے قابل
ں ہوں گے۔ صرف دوسرے ملکوں سے ادھار
لے کر اور ان کے رحم و کرم پر ہی ترقی کے خواب
ے جائیں گے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہندوستان اس
ت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک یہاں پر فرقہ وارانہ
ہتی قائم نہیں ہو جاتی۔ اور یہ ملک فرقہ وارانہ
دوں اور ان کے شروع کرنے والوں سے پاک
ں ہوتا۔ اگر ہندوستان میں ان کا وجود رہے گا
تو ایک نہ ایک دن ہم اپنے ہی فسادوں کی آگ میں
جل کر ختم ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں گے، فنا ہو جائیں گے
یہاں کی وہ تاریخ جو کبھی سنہرے حرفوں سے لکھی گئی تھی
بے گناہوں کے خون کے "لال حرفوں" سے لکھی جائے گی
اور ہندوستان جو تاریخ میں اب بھی سونے کی چڑیا،
کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بدنام ہو کر رہ جائے گا
جس کے سکھ اور امن کے لئے بڑی بڑی ہستیوں نے
اپنی جانوں کو قربان کر دیا وہ ہندوستان اپنے ہی معمولی
اور حقیر لوگوں کے ہاتھوں برباد ہو جائے گا۔ جب تک
یہاں کے شہری باہمی اتفاق سے اس کے لئے کچھ نہیں
کریں گے جب تک ہر صوبے کا باشندہ یہ عہد نہیں
کرے گا کہ اُسے صرف ہندوستانی بن کر ہندوستان
کی خدمت کرنی ہے۔ جب تک ہر مذہب کے لوگ یہ نہیں
سمجھیں گے کہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں بعد میں ہندو مسلم
یا سکھ وغیرہ تو اسوقت تک ہمارے ملک کیلئے ترقی کے
راستے تقریباً بند ہیں۔ اگر ہندوستان کے شہری یہ چاہتے
ہیں کہ دنیا میں ہندوستان کا نام روشن ہو تو انھیں اپنے
دلوں سے مذہب، زبان اور قوم کے بھید بھاؤ کو مٹانا پڑے
گا

دوسرے ملکوں کے ساتھ ترقی کی راہ میں قدم سے قدم
ملا کر چلنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم آپس میں باہمی میل جول
اتحاد اور اتفاق پیدا کریں۔ اسکے لئے ہمیں ان لوگوں کے سامنے
سینہ سپر ہونا پڑیگا جو فسادات کے بیج بوتے ہیں اور اپنی
شر پسند ذہنیت کی تبلیغ کرتے ہیں اور لوگوں کے مذہبی
جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ملک کو ایسی ذہنیت سے پاک کرنا
پڑے گا۔ ہماری حکومت کو چاہئیے کہ ایسے لوگوں کو سزائے موت
دیدے

فرقہ وارانہ یکجہتی ترقی کے دروازے کی کنجی ہے اور ہندوستان
جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کیلئے یہ انتہائی ضروری ہے ——————
اس ہندوستان کی حفاظت کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے
جسکو مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت نہرو جیسے

شاہجہاں دہلی

دنیاؤں نے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیا تھا ـــ جس کے لئے شہید بھگت سنگھ، اشفاق اللہ اور سبھاش چندر بوس نے اپنی اپنی جانیں قربان کر دیں تھیں ـــ ہمیں ملک میں فرقہ وارانہ یکجہتی کو قائم رکھنا چاہئیے کیونکہ یہ ہی ہماری کامیابی اور بقا کا ذریعہ ہے مہاتما گاندھی کی تعلیم کو محض کتابوں ہی میں بند نہیں رکھنا چاہئیے بلکہ اسکو اپنے دلوں پر نقش کر کے اس پر عمل پیرا ہونا چاہئیے

ہندوستان کے ہر فرقے، ہر مذہب، ہر زبان اور ہر صوبے کے رہنے والوں کو چاہئیے کہ باہمی اتفاق کے ساتھ مل جل کر رہیں اور ملک کو ترقی کے راستے پر گامزن کریں ـــ منزل تک پہنچنے کا واحد یہ ہی راستہ ہے۔

---

بقیہ فنِ ناول نگاری از صفحہ نمبر ۱۰

پھر انسانی زندگی کے کسی واقع کو موضوع بنا کر اپنا ناول لکھتا ہے۔ اور اپنا فلسفہ حیات کردار نگاری یا قصہ کے ذریعہ سے یا مکالموں کے ذریعے سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح ناول نگار مفکر بھی ہوتا ہے اور معلم بھی۔ پہلے وہ خود زندگی کے متعلق فکر کرتا ہے اور اسے ناولوں میں سموتا ہے۔

نذیر نے اپنے ناولوں میں معاشرتی اور مذہبی اصلاح پر زور دیا۔ شرر نے اسلامی روح کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ جدید اچھے ناول نگار بھی سماجی، معاشرتی اصلاح پر زور دے رہے ہیں، سرمایہ داری کنبہ پروری طبقاتی کشمکش کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔

# اسلوب یا انداز بیان

آرنلڈ نے ایک جگہ کہا ہے کہ تین باتیں یعنی منظر نگاری فلسفہ حیات اور افرادِ قصہ اس کا برتاؤ ایک ناول کو جانچنے کے لئے کافی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ ہی ایک اور چیز بھی ہے۔ وہ ہے ناول نگار کا اسلوب بیان یا انداز بیان یا طرزِ نگارش۔ بعض حضرات تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تمام عناصر ترکیبی میں یہی وہ عنصر ہے جو ایک ناول کی کامیابی اور ناکامی کا سبب بنتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک اچھے پلاٹ کی تعمیر و تشکیل بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ مگر جب تک اس کو خوبصورتی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے۔ وہ چیز مقبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔

اب تک اردو کے اندر دو اسلوب بیان مشہور ہیں ایک تو میر امن کا سیدھا سادہ عام فہم انداز بیان ہے۔ جو بناوٹ اور تصنع سے پاک ہے۔ دوسرا مرزا رجب علی بیگ سرور کا۔ رنگین، بناوٹی، مقفی۔ اور مسجع عبارت سے بھرا ہوا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اب حقیقت کا دور دورہ ہے ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ناول نگار کا اسلوب بیان شگفتہ، دلکش اور انوکھا ہو اور دلچسپ واقعات کو اچھے اور دلچسپ انداز میں بیان کیا جائے۔ اگر انداز بیان روکھا اور بے اثر ہوگا تو ناول مقبولیت حاصل نہ کر سکے گا ـــ پریم چند کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انداز بیان بے حد دلچسپ، انوکھا اور دل کو موہ لینے والا ہے۔ وہ قاری کو مرعوب کرنے کے لئے ثقیل اور پرشکوہ الفاظ کا استعمال نہیں کرتے اور نہ بے جا اور فضول عبارت آرائی سے پڑھنے والے کا وقت برباد کرتے ہیں۔ فرانسیسی ناول نگاری میں ڈوما اس فن کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اردو میں رتن ناتھ سرشار اپنے طرز نگارش کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگ قصہ سے زیادہ عبارت میں دلچسپی لیتے ہیں۔

نذیر احمد کا انداز بیان بھی کافی خوبصورت ہے۔ انھیں زبان اور محاوروں پر قوت حاصل ہے ظرافت کی شوخی اور چاشنی بھی ہے لیکن کبھی کبھی وہ صوفیانہ پن سے کام لیتے ہیں اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ استعمال کرنے سے نہیں چوکتے

یوں تو شرر کا انداز بیان بھی شگفتہ اور دلکش ہے لیکن اسمیں ادبی کیف نہیں ہوتا۔ آپ صفحے پر صفحے پڑھتے چلے جائیے کوئی بھی جملہ یا ترکیب ایسی نہ ملے گی جو یاد کرنے کے قابل ہو ـــ غرض ناول کے انداز بیان کا انوکھا اور نادر ہونا ضروری ہے۔ اسلوب بیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تحریر میں ایک لفظ بھی بے ربط یا بے مطلب نہ ہونا چاہئیے اور ہر لفظ کی اپنی جگہ اہمیت ہونا چاہئیے۔

# کچھ مردم شماری کے بارے میں

۲۔۲۔۸

۱۰ فروری ۱۹۸۱ء کو ہندوستان میں مردم شماری کا کام شروع ہو جائے گا۔ مردم شماری کے ساتھ ساتھ دوسری معلومات بھی حاصل کی جائیں گی مثلاً ذرائع آمدنی مادری زبان اور مذہب کیا ہے؟ تعلیم کتنی حاصل کی ہے وغیرہ اس سے پورے ملک کی آبادی معلوم ہو جائے گی اور اسکا بھی علم ہو جائے گا کہ کونسی زبان کتنے لوگوں کی مادری زبان ہے۔ نیز یہ کہ لوگ مادری زبان کے علاوہ کون کونسی زبانیں جانتے ہیں۔ اسطرح ہر زبان کے جاننے والوں کی کل تعداد معلوم ہو جائیگی اگر کسی علاقے میں اردو جاننے والوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو اس جگہ اردو داں طبقہ کو خصوصی مراعات مل سکتی ہیں۔ اسی طرح دیگر اطلاعات کی بناء پر آئندہ کے منصوبوں کی بنیاد ہوگی۔ اسلئے ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ مردم شماری میں صحیح اندراجات کروائے ہیں سرکاری کارندوں کی مدد کریں۔

مردم شماری سے متعلق کام خوش اسلوبی سے انجام دینے کیلئے ضروری ہے کہ ہر حلقہ میں کچھ لوگ ملکر کمیٹی بنالیں اور مردم شماری سیاسی طریق کار سے خود واقفیت حاصل کرکے دوسروں کو بتائیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ:

- مردم شماری میں ہر فرد اور خانہ شماری میں ہر گھر شمار کر لیا جائے
- مردم شماری کی سلپ میں ہر اطلاع صحیح درج کی جائے۔
- ہر خاندان کا سربراہ انفرادی سلپ کا جائزہ لے کر ہی اسکی پشت پر دستخط کرے اور اندراجات صحیح نہ ہونے کی صورت میں دستخط نہ کرے
- اگر کوئی اطلاع خلاف واقع درج کر لی جائے تو اسکو ٹھیک کرائیں اور اگر اسمیں رکاوٹ پڑے تو افسران بالا کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں۔ ناکامی کی صورت میں قانونی چارہ جوئی تک کی جا سکتی ہے۔

اپنی

مادری

زبان

اردو

ہی

لکھوائیے

**خانہ شماری** —— خانہ شماری کا پہلا دور ۱۹۸۰ء کے اوائل میں ختم ہو چکا ہے اور اسمیں مندرجہ ذیل کام انجام پا چکے ہیں۔

— ہر مکان میں رہنے والے تمام انسانوں کا شمار۔

— ہر مکان کے صدر دروازے پر نمبر سازی۔

— ہر حلقے کے مکانوں کا ایک نقشہ۔

حلقوں کے یہ نقشے نہایت اہم ہیں کیونکہ ان ہی نقشوں کی بناء پر مردم شماری کی جائے گی۔ جو گھر یا محلے خانہ شماری سے رہ گئے ہیں وہ مردم شماری کے وقت بھی چھوٹ سکتے ہیں اسلئے عوام کا فرض ہے کہ وہ ہر گھر یا رہائش گاہ کو شمار کرادیں تاکہ مردم شماری میں آسانی کے ساتھ پوری آبادی کا شمار کر لیا جائے۔

اگر کسی گھر سے پتہ چلے کہ وہاں کوئی نہیں آیا تو آس پاس کے گھروں سے دریافت کیجئے۔ یقین ہو جانے پر کہ ایک گھر یا کچھ گھر یا پورا علاقہ خانہ شماری سے رہ گیا ہے تو اسکی شکایت مقامی مردم شماری دفتر کو بھیجئے اور افسران متعلقہ سے رابطہ قائم کیجئے سرکاری افسران خانہ شماری کے نقشہ سے تصدیق کریں گے۔

اگر آپکے شکایت کردہ گھر یا علاقے شمار ہو چکے ہیں تو آپ کو ان کا نمبر بتادیا جائے گا ورنہ ان کی خانہ شماری کرائی جائے گی۔

ہو سکتا ہے کہ کسی مقام پر یہ کام اتنا آسانی سے نہ ہو سکے اسی صورت میں مردم شماری کے بڑے افسروں سے ملیے اور اپنی شکایت سے آگاہ کیجئے۔ اور اسوقت چین سے نہ بیٹھئے جب تک کہ آپکے بتلائے ہوئے گھروں کو شمار نہ کر لیا جائے اور آپ کو انکے نمبر معلوم نہ ہو جائیں۔

اپنی مادری زبان اردو ہی لکھوائیے کیونکہ آپ اردو ہی بولتے ہیں۔

شاہ جہاد۔

# سپنا

افسانہ

ظفر علی خان ایم اے (فائنل)
(علیگڑھ مسلم یونیورسٹی)

انور جیسے تیسے چھٹیاں گذار کر یونیورسٹی جانا چاہتا تھا۔ گرمی کا ایک ایک دن اس کیلئے پہاڑ سے کم نہ تھا۔ خدا خدا کر کے جولائی کا مہینہ آیا تو اس نے گاؤں کے خاموش اور ساکت ماحول کو خدا حافظ کہا۔ ہوسٹل میں لڑکوں سے دعا سلام کے بعد سب سے پہلا تذکرہ جو اس کے کانوں میں پڑا وہ ایک صاحبہ کا تھا جو فرسٹ ایر میں آئی تھیں۔ اور عصمت کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ کو ایجوکیشن میں اس قسم کے تذکرے عموماً ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ہوسٹل میں بحثوں کا موضوع زیادہ تر کوئی لڑکی ہی ہوتی ہے کسی کی تعریف کی جاتی ہے تو کسی کی برائی، کسی کو فرشتوں کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا ہے، تو کسی کو طوائف تک کا خطاب دینے سے گریز نہیں کیا جاتا۔

انور ان تمام بحثوں سے الگ ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا لیکن عصمت کی کچھ اس طرح تصویر کشی کی گئی کہ وہ دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں کو چشم آہو، بالوں کو زلف بنگال، اور چہرے کو گلاب کے پھول سے تعبیر کیا گیا۔ ایک صاحب ذرا سنجیدہ قسم کے تھے۔ فرمانے لگے "کبھی یوں تو بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں۔ بہت سی ہمارے کالج میں بھی ہیں جن کے حسن کے چرچے ہیں۔ لیکن اس جیسا معصوم حسن تو کبھی نہیں دیکھا، اس کی چال ڈھال غرض ہر ادا سے متانت، بردباری اور شرافت ٹپکتی ہے۔ سنا ہے بہت اچھی ڈبیٹر (DEBATOR) اور مقرر بھی ہے۔

اگلے روز ہی انور کسی کام سے شہر جا رہا تھا، بس بری طرح مسافروں سے بھری ہوئی تھی بمشکل تمام اسے کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ دو چار اسٹوپج کے بعد جب ذرا بھیڑ کم ہوئی تو اس نے مسافروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، شاید وہ غیر شعوری طور پر عصمت کو تلاش کر رہا ہو۔ یوں تو بس میں اس کو کئی لڑکیاں نظر آئیں۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر برابر والی سیٹ پر پڑی وہ چونک کر رہ گیا۔ سچ مچ وہ تھی بھی اتنی ہی حسین جیسے گلاب کی کلی نے انسانی روپ اختیار کر لیا ہو، نگاہوں میں فروشانہ انداز، ابرو کی چڑھی ہوئی کمانیں، گھنی پلکیں جوانی کے بار سے بوجھل، چہرے پر لطیف فضائی اور ائیت گردن میں خم، یاقوتی لب، کانوں میں جھولتے ہوئے طلائی ادیزے، سینے پر بے تحاشہ ابھار اور تمام جسم کو ایک طرح کی کسمساتی ہوئی نمکین لذت کی لطیف چادر چھپائے ہوئے تھی۔

ابھی اس نے اپنے اوپر قابو بھی نہیں پایا تھا کہ لڑکی کے برابر والی سیٹ خالی ہوئی اور وہ غیر ارادی طور پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ ایک آواز نے اس کو چونکا دیا "اگر آپ برا نہ مانیں تو میری سیٹ پر آ جائیے" وہ میری سسٹر ہیں میں وہاں بیٹھ جاؤں گا"

"بہت بہتر" کہتا ہوا انور اسے جگہ چلا گیا۔

"آپ شاید اسی کالج میں پڑھتے ہیں"؟

"جی ہاں، مجھے انور کہتے ہیں" میں بی۔ اے فائنل

کا اسٹوڈنٹ ہوں، کیا آپ نے بھی یہیں ایڈمیشن لیا ہے؟"
انور نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔
"جی میں تو علیگڑھ میں زیر تعلیم ہوں یہ میری سسٹر
ہیں، فرسٹ ایر میں آئی ہیں۔ ایڈمیشن کا مرحلہ کتنا مشکل
ہوتا ہے، یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے، اسی لئے ان کی کچھ
مدد کیلئے آگیا تھا، ہو سکتا ہے چند روز اور آنا پڑے ابھی
یہ نئی نئی تو ہیں۔ تنہا آنے سے گھبراتی ہیں۔ اوہ.....
میں نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں، مجھے ساجد پرویز کہتے ہیں"
یہ انور کی ساجد سے پہلی ملاقات تھی اس کے بعد دو چار
ملاقاتوں میں وہ خاصے بے تکلف ہو گئے۔ کچھ ہی روز بعد ساجد
کی یونیورسٹی کھل گئی۔ اور وہ چلا گیا۔ انور نے کئی مرتبہ چاہا کہ
عصمت سے اسکا پتہ پوچھے لیکن وہ نہ پوچھ سکا صرف اسلئے
کہ وہ اس کا کہیں غلط مطلب نہ نکال لے، پھر نہ جانے کیوں
اس کو یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ عصمت کو اپنے حسن
اور قابلیت پر غرور ہے، ہو سکتا ہے یہ اس کا واہمہ ہی ہو
وہ اپنے دل میں سوچتا" اگر وہ ایک اچھی مقرر اور ڈبیٹر
(DEBATOR) ہے تو میں نے بھی بہت سے مقابلوں میں
فرسٹ پرائز حاصل کئے ہیں۔ اگر وہ فرسٹ کلاس اسٹوڈنٹ
ہے تو میں بھی اپنی کلاس میں ہمیشہ ٹوپ کرتا ہوں پھر میں اس
سے بات کرنے میں پہل کیوں کروں، اگر یہ مان بھی لیا جائے
کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں یا محبت بھی کرنے لگا ہوں تو کیا
یہ صحیح نہیں" عشق اول در دل معشوق پیدا می شود" لہذا
اس کے دل میں بھی تڑپ ہونی چاہیئے۔ اگر وہی پہل کرے
تو کیا حرج ہے۔ آج تک تو لڑکیوں نے مجھ سے بات کرنے
میں فخر محسوس کیا ہے۔ اور میں ان صاحبہ کے نخرے برداشت
کروں، نا بابا...... یہ مجھ سے نہ ہوگا" یہ شاید اس
کے دل میں چھپی ہوئی محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ ہر وقت..
عصمت ہی کے بارے میں سوچا کرتا رہتا۔ اسے یقین تھا کہ
ایک نہ ایک روز وہ اس سے بات کرے گی اور اس کی
محبت رنگ لا کر رہے گی۔
آج کافی دنوں کے بعد کالج کے لڑکے اور لڑکیاں ہال میں
جمع تھے، اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے ایک (DEBATE) کا
اہتمام کیا گیا تھا۔ عنوان تھا "مخلوط تعلیم ہماری سوسائٹی کے
لئے نقصان دہ ہے" انور FAVER میں تھا اور عصمت AGAINST
میں۔ تقریریں شروع ہوئیں، تھوڑی ہی دیر بعد عصمت کا
نمبر آگیا۔ اگرچہ وہ صورت سے سیدھی سادی اور کم گو معلوم
ہوتی تھی۔ لیکن مائیک پر آتے ہی گویا اس کی شخصیت میں
انقلاب آگیا۔ بس یہ سمجھو ایک کم گو اور شرمیلی لڑکی نے
پورے ہال کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ
آج ہر ایک سے اپنے خیالات منوا کر رہے گی، بعض
لوگوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ اول یہی رہے گی لیکن انور
کی تقریر زیادہ سلجھی ہوئی تھی اس کے دلائل میں جان تھی
اور طرز بھی نہایت پختہ اس لئے اسی کو فرسٹ پرائز کا حقدار
سمجھا گیا اور عصمت دوسرے نمبر پر رہی۔
آج زندگی میں پہلی مرتبہ انور کو اپنے فرسٹ آنے پر
افسوس تھا۔ صرف اس لئے کہ اس کی وجہ سے عصمت
دوسرے نمبر پر رہ گئی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا ہوگا۔ اس کو
وہ کیسے یقین دلائے "عصمت تمہارے اول نہ آنے پر تم
سے زیادہ مجھ کو افسوس ہے اگر میرے بس میں ہوتا تو
میں یقیناً اس فیصلے کو منظور نہ کرتا" لیکن عصمت نے کچھ بھی
کہنے کا موقع تو نہ دیا۔ نہ جانے وہ کس دروازے سے نکلی
اور بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی انور اس کے پاس جانا ہی چاہتا
تھا کہ بس آئی اور اس کو لے اڑی اور وہ دیکھتا کا دیکھتا
رہ گیا انور کو اس پر اور بھی افسوس تھا کہ اتنی سب
لڑکیوں نے مبارکباد دی لیکن عصمت جو اس کی رگ
رگ میں سما چکی تھی جس کے خیال میں وہ ہر وقت کھویا
رہتا تھا ایک دفعہ بھی مبارکباد دینے نہ آئی۔ کہ جو آتا
اس کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع مل جاتا۔ کبھی وہ
ارادہ کرتا کہ وہ خود ہی بات کرے گا لیکن اگر وہ برا مان
گئی تو کیا ہوگا یا اس کی بات کا ٹھیک سے جواب نہ دیا تو
اس کی خودداری کو شدید ضرب لگے گی، اکثر رات گئے تک
وہ یہی سوچا کرتا۔ آسمان سے ستارے ٹوٹتے اور پھر

اس کی پلکیں نیند کے مارے بوجھل ہو کر سو جاتیں لیکن اس کا جذبہ عبودیت خوابوں کے دھندلکے میں مارا مارا پھرتا جہاں اس کے من مندر کی دیوی عصمت سر پر تاج لگائے حکمرانی کرتی، وہ دوڑتا، اس کی جبین نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپتے، وہ چاہتا کہ عصمت کے قدموں پر سر رکھ کر اشکوں کے موتی بکھیر دے مگر وہ اس کو منہ چڑا کر فضا رلبسیط میں پرواز کر جاتی اور ستاروں کی جھلمل کرنوں پر جھولا جھولنے لگتی، وہ بھی سپنوں کے پروں پر اڑتا ہوا اس تک پہنچ جاتا مگر وہ وہاں سے ہنستی اور کھلکھلاتی ہوئی بھاگ جاتی اور تمام آسمان میں کہکشاں اس کیلئے راستہ بنا دیتی۔ جب انور کی آنکھ کھلتی تو دھوپ کافی چڑھ جاتی، سورج کافی بلند ہو جاتا۔

ایک فنکار جب اپنے دل کی بات براہ راست نہ کہہ سکے تو وہ فن کا سہارا لیتا ہے، مصوّر اپنی تصویر اور شاعر اپنے اشعار سے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچاتا ہے انور نے بھی اپنے فن کا سہارا لیا۔ وہ ایک اچھا افسانہ نگار تھا۔ اس نے اپنے سچے عشق اور پاک محبت اور عصمت کی بے التفاتی و خود بینی کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور اپنا پورا فن صرف کر کے ایک افسانہ تیار کر دیا جس کا عنوان "سپنا" تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اگرچہ وہ اپنی کہانی کو حقیقت کا روپ نہ دے سکا لیکن الفاظ کا روپ دے کر زندہ جاوید ضرور کر دے گا ہو سکتا ہے کہ عصمت بھی اس افسانے کو پڑھ لے اور اس کے جذبات سے واقف ہو جائے۔ یہی سوچ کر اس کو کچھ سکون ہوتا۔

انور کو علی گڈھ آئے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے ساجد سے اس کا تعارف تو پہلے سے ہی تھا یہاں آکر وہ معمولی سی جان پہچان دوستی میں بدل گئی، حسنِ اشتیاق کہئے کہ انور ساجد کا ہوسٹل فیلو بھی ہو گیا، دونوں کا کھانا، ناشتہ، تفریح، فلم سب ساتھ ہوتی اس لئے اس کو جونیئر ہونے کا بالکل احساس نہ ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عصمت اور اس کی یادیں ماضی کے دھندلکوں میں جاتی رہیں۔ وہ خود بھی کوشش کرتا کہ اس کے متعلق کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آنے پائے اب اس کو یہ خیال بھی رہنے لگا تھا کہ عصمت ساجد کی بہن ہے اگر اس کو میرے خیالات کا علم ہو جائے تو وہ کیا سوچے گا

ایک روز جیسے ہی وہ کلاس آیا ڈاک پر نظر پڑی۔ لفافہ دیکھا کسی پروین صاحبہ نے بھیجا تھا۔ جلدی سے چاک کیا۔ لکھا تھا۔

"انور صاحب۔ سلام مسنون۔ آپ کا افسانہ سپنا پڑھا، بے حد پسند آیا۔ اس کے بعد میں نے آپ کے تمام شائع شدہ افسانے پڑھ ڈالے، خدا کی قسم آپ بہت اچھا لکھتے ہیں، مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے اگر آپ اصلاح دیدیا کریں تو ممنون ہوں گی۔ امید ہے کہ آپ میری درخواست رد نہ کریں گے۔

جواب کی منتظر

پروین

ظاہر ہے انور اس کی درخواست کو کیسے رد کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد باقاعدہ اصلاح کا کام اور خط و کتابت شروع ہو گئی۔ شروع میں کچھ تکلف تھا خط کا ہر جملہ بڑی احتیاط سے لکھا جاتا لیکن چار پانچ ماہ ہی میں اس کی جگہ بے تکلفی نے لے لی۔ پروین کے الفاظ سے محبت کی بو آنے لگی۔ خطوط میں ایک مٹھاس اور ایک کشش تھی۔ جو انور کو اس کے قریب لے جا رہی تھی۔ ہر خط دوسرے خط کی انتظار کی شدت کو اور زیادہ کرتا، پروین کے افسانوں اور ان کے کرداروں میں بھی انور کو اپنا اور پروین کا تذکرہ کسی نہ کسی روپ میں ضرور ملتا۔ پروین کی فرمائش پر اس نے اپنی کئی تازہ تصویریں بھی بھیجدیں تھیں لیکن تعجب یہ تھا کہ پروین سے جب بھی تصویر کی فرمائش کی گئی وہ کسی نہ کسی طرح ٹال

جاتی۔ اور اسی طرح پورا سال گذر گیا، چھٹیاں ہوئیں، نیا سال شروع ہوا، لیکن انور کی فرمائش اپنی جگہ باقی تھی۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور دل نا امید، لہٰذا اس نے صاف صاف لکھ دیا

"پروین صاحبہ اگر آپ نے اس خط کے جواب میں تصویر نہ بھیجی تو میں پھر کبھی فرمائش نہ کروں گا۔ ہو سکتا ہے خط لکھنا بھی بند کر دوں"

چند روز بعد ہی اس کا جواب بھی آگیا۔

"میرے بھولے بھالے انور۔ میں نے کتنی مرتبہ لکھا ہے کہ میں بدصورت نہیں ہوں، جب تم مجھے دیکھو گے تو ضرور پسند کرو گے خیر اگر ضد ہی کرتے ہو تو گذارش ہے کہ اس ہی مہینے سالنامہ شائع ہو رہا ہے، اس میں میرا ایک افسانہ ہے اور تصویر بھی۔ افسانہ تو خیر دیکھا ہوا ہوگا۔ تصویر خوب غور سے دیکھ لیجئے گا۔ میں جناب کی رائے کی منتظر رہوں گی۔ خدا کرے پسند آ جائے۔

تمھاری پروین

ابھی انور پورا خط پڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ساجد نے پیچھے سے آکر لفافہ اچک لیا۔ "اچھا تو یوں چوری چوری خط و کتابت ہوتی ہے۔ ہم بھی تو سوچتے تھے کہ اس کی اتنی ڈاک کہاں سے آنے لگی۔ جلدی بتاؤ یہ کس کا خط ہے نہیں تو میں پڑھنا شروع کرتا ہوں۔"

انور نے بہت چاہا کہ کسی طرح اس کو معلوم نہ ہو، وہ بغیر پڑھے واپس کر دے لیکن اس کی ایک نہ سنی گئی۔ اور ساجد میاں نے باآواز بلند پڑھنا شروع کیا، آخیر میں "تمھاری پروین" کو خوب زور دے کر پڑھا گیا" ہوں فی الحال میری اتنی گذارش ہے کہ ان پروین صاحبہ کے متعلق صحیح صحیح بتا دو۔ اگر ذرا بھی دروغ گوئی سے کام لیا تو تم جانتے ہو میں سینئر ہوں INTRODUCTION/ شروع ہو جائے گا۔"

انور واقعی اس وقت بالکل جونیئر معلوم ہو رہا تھا اس نے شروع میں ہی ساجد کو پوری داستان بتانے کا کئی مرتبہ ارادہ کیا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہ بتا سکا۔ اس کو شرمندگی اس پر تھی کہ وہ پہلے ہی بتا دیتا تو آج چور کا بچہ کو بنتا۔ بہرحال اس وقت تو صحیح صحیح بتانے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

"پروین صاحبہ میرے مداحین میں سے ایک ہیں اسی سلسلہ میں ہماری خط و کتابت شروع ہوئی تھی۔ میں نے اب تک ان کو دیکھا بھی نہیں"۔

ساجد نے کسی قدر معاملے کی تہ میں جاتے ہوئے کہا "میرے دوست بغیر دیکھے بغیر ملاقات کئے محبت میں گرفتار ہو گئے۔ مان اگر وہ بدصورت ہوئی تو کیا تمھاری محبت برقرار رہے گی۔ کیا تم اس سے شادی کرنا پسند کرو گے۔؟ میرے خیال تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔"

"آپ کا خیال غلط ہے میں ایسا ضرور کر سکتا ہوں خوبصورتی ہی تو دنیا میں سب کچھ نہیں ہوتی، میں شادی ایسی لڑکی سے کرنا چاہتا ہوں جو میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے جو اپنے نیک اور سچے مشوروں سے میرے بگڑے کاموں کو سنوار سکے جس کے اندر عقل ہو اور میرے مشکلات کو حل کرنے کی طاقت، جہاں تک میں نے اس کے خطوط اور افسانوں سے اندازہ لگایا ہے اس میں یہ سب صفات موجود ہیں اس کے ہر ہر لفظ سے دانائی، بردباری اور متانت ٹپکتی ہے۔ اب اگر وہ خوبصورت نہ ہو تو اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا" جذباتی انداز میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن ساجد مسکراتے ہوئے بیچ میں ہی بول پڑا۔ "اچھا مان لیا، جناب عشق میں مجنوں کے باپ اور فلاسفی میں افلاطون کے استاد ہیں اب یہ بتاؤ مٹھائی کب کھلا رہے ہو۔"

●●

شاہجہاں دہلی

# انجام

**(افسانہ)**

از خالد ندیم ہلدوانی

یونہی تنہائی میں ہم دل کو سزا دیتے ہیں
نام لکھتے ہیں ترا لکھ کے مٹا دیتے ہیں

ناظم آباد کراچی

اچھے انیس خوش رہو آباد رہو!
تم سوچ رہے ہو گے انیس میرا خط شکایتوں سے بھرا ہو گا۔ نہیں مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، کوئی گلہ نہیں، تم خوش رہو سلامت رہو! میں ہمیشہ تمہارے لیئے دعا کرتی رہوں گی۔ اچھا کیا انیس تم نے میرے پیار کو ٹھکرا دیا۔ کتنے ارمانوں سے تمکو اپنایا تھا۔ کتنے خواب سجائے تھے۔ لیکن تم نے میرے پیار کو کھیل سمجھا میں جب بھی تمہارے پاس آئی مجھ کو بیوقوف بنایا، میں تھی بھی اسی لائق۔ میں بے وقوف نہ ہوتی تو کیوں اپنی ایسی حالت بناتی۔ تمہارے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ اپنے ارمان، اپنی قسمت سب کچھ تم کو سونپ دیا۔ یہاں تک کہ میں نے تمہارے لیئے دولت کو بھی ٹھکرا دیا۔ انیس تم کو اپنی عزت کا بڑا خیال ہے۔ لیکن میں نے تمہاری خاطر کتنی بے عزتی سہی ...... کاش تم سوچ سکتے، لیکن نہیں تم کیوں سوچو گے یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے اسمیں تمہارا قصور نہیں میری ہی خطا ہے میں نے تم کو چاہا، اپنایا، لیکن کتنا یقین تھا کتنا اعتماد تھا مجھ کو تم پر، میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا انیس ایسا ہو گا۔ لوگوں کو اپنے پیار پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ میں کسی سے کیا کہوں گی، کوئی مجھ سے پوچھے گا کیا جواب دونگی تم مرد ہو بھول سکتے ہو کسی کے پیار کو! لیکن میں! میں تمکو کسطرح بھلا پاؤنگی۔ تم میری نس نس میں سما چکے ہو میں تم کو نہیں بھلا سکتی۔ تمکو بھلانا میرے بس کی بات نہیں۔
تم نے تو پیار کرنے سے پہلے ہی پیار کا انجام سوچ لیا۔ یہ اور کہ پیار کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ جانے والی ہر چیز بُری لگتی ہے۔ تم نے جو کیا

”اچھا کیا۔ کاش کہ تم مجھے نہ ملے ہوتے آہ کتنی ”مسرور تھی وہ زندگی، جانتے ہو انیس تم مجھ کو کیوں اچھے لگے تھے انیس! میں تمہاری کس بات پر دل دے بیٹھی! صرف تمہاری ملنساری اور مسکراہٹ پر! تم اجنبی لوگوں سے بھی کسطرح گھل مل کر باتیں کر رہے تھے، میری ہی بات پر وہ تمہاری پیاری ہنسی، آہ انیس! میں تمہاری ہنسی کو زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھول سکتی، چاندنی رات میں تمہارے چہرہ پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ! اس رات معلوم ہے میں نے کیا سوچا تھا ۔سوچا تھا ساری زندگی تم کو یونہی دیکھتی رہوں اور تمکو سے ذرا پہ ساری رات تمہارے خیالوں میں ڈوبی رہی، تم کو بھلانا بھی چاہا تم نے خوابوں میں آکر ستانا شروع کر دیا اور یوں تمہاری محبت کا پودا میرے دل میں جڑ پکڑتا گیا جو آج ایک تناور درخت بن گیا ہے میں دن رات سوچتی رہی کہ تم کو کسطرح حاصل کروں اور آخر ایک دن ہمت کر کے تمہارے پاس پہنچ گئی۔
تم نے میرے پیار کا اچھا صلہ دیا۔ میری محبت کا مذاق اڑایا قصور میرا تھا مجھ کو اسکی سزا ملنی تھی مل گئی۔ کاش وہ رات میری زندگی میں کبھی نہ آئی ہوتی۔ ؎

تم کو دنیا کے غم و درد سے فرصت نہ سہی
سب سے الفت سہی اور مجھ سے محبت نہ سہی
میں تمہاری ہوں یہی میرے لیے کیا کم ہے
تم میرے ہو کے رہو یہ مری قسمت نہ سہی

انیس تم کو معلوم ہے آجکل شب و روز کسطرح گزرتے ہیں؟ تمکو نہیں معلوم!“

میں تم کو بتاتی ہوں، دن رات تمہاری یاد میں آہیں بھرتی ہوں سسکیاں لیتی ہوتی ہوں، تمہارے درد تمہارے پیار کو سینہ سے لگائے رہتی ہوں اس کے علاوہ کچھ نہیں میری سسکیاں تم تک نہیں پہنچ سکیں" اب میں تم کو کبھی اگر پریشان نہیں کرونگی یاد ہے انیس! تم مجھ کو دور جانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ تم مجھ سے کتنی دور جاؤ گے! تم میرے دل سے نہیں جا سکتے،

انیس میں زندگی کے آخری سانس تک میں بھی تمہارا ہی نام لونگی۔ میرا دم گھٹ رہا ہے، انیس اب مجھ سے یہاں نہیں رہا جاتا۔ میں چلی جاؤں گی، کہیں بھی چلی جاؤں گی، تم تو مجھ کو زہر دینے کے لیے بھی نہیں آسکتے کاش کہ تم اپنے ہاتھوں سے زہر دیدیتے۔ تمہاری گود میں دم ٹوٹ جاتا۔ کتنی حسین موت ہوتی، یونہی گھٹ گھٹ کر مرنے کی تو تم کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اگر خبر ہو جائے تو جنازہ میں کاندھا دینے تو آجاتا۔ بولو! آجاؤ گے نا!!
تم مجھ سے دور جانے کے لئے کہہ رہے تھے میں ہی تم سے دور جا رہی ہوں، یہ دنیا چھوڑ دوں گی اور آئندہ کبھی نہ لوٹنے کیلئے۔ تم کو تو اب میرے سایہ سے بھی ڈر لگنے لگا ہوگا۔ تم خوش رہو آرام سے رہنا اب میں تم کو پریشان کرنے کبھی نہیں آؤں گی، ... تم سلامت ہو تو ہم چین بھی پا ہی لینگے۔
کسی صورت سے دل کی لگی بجھا ہی لینگے

پیار کا جام ملے یا نہ ملے
ہم تو آنسو ہی پیے جائیں گے

تم ہمیں پیار کرو یا نہ کرو
ہم تمہیں پیار کیے جائینگے

انیس تم کو بھولنے کے لئے دور جا رہی ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ اگر تم کو بھول سکی تو کیا ہوگا یہ زندگی کسطرح گزرے گی اگر تم کو بھلانے میں کامیاب ہو گئی تو یہاں ضرور واپس آؤنگی تم سے دوبارہ محبت کرنے نہیں تمہاری خدمت کرنے کے لئے، تمہاری زندگی کی سب سے بڑی آرزو کی تکمیل کے لیے۔ بس اگر کسی لڑکی سے شادی کرکے ساری دولت تم پر لٹا دونگی اور تمہاری زندگی کی اس سب سے بڑی تمنا (دولت) کو پورا کروا دونگی، کیونکہ انیس تم کو مجھ سے محبت نہیں پیسے سے محبت ہے

تم کو پیسہ چاہیے صرف پیسہ! کاش میری دولت تمہارے کسی کام آسکی تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ میرا انتظار کرنا اگر زندگی بچ گئی تو میں تم سے زندگی میں ایک مرتبہ ضرور ملونگی۔

انیس نہ معلوم وہ کون خوش نصیب ہوگا جس سے تم پیار کرو گے؟... کاش کہ ہماری بھی ایسی قسمت ہوتی۔ بدنصیبوں کو کون پیار کرتا ہے۔ ہم زندگی بھر تمہارے پیار کو ترسینگے زندگی میں تمہارا پیار ہی نہ ملا تو اور کچھ پانے کی تمنا بھی کیسے کریں۔ اچھا انیس تمہارا بہت سا وقت لے لیا۔ اب اور زیادہ پریشان نہیں کرونگی۔ میری وجہ سے تم کو جو پریشانیاں اٹھانا پڑیں ان کے لئے معافی چاہتی ہوں

خدا حافظ، الوداع، الوداع
روح کی گہرائیوں سے" تمہاری طلعت

---

۸/۶ ڈی فرنیڈ کالونی نئی دہلی

پیاری طلعت! سلام محبت!
تمہارا خط ملا۔ سوچ رہا ہوں کہ تم کو کسطرح خط لکھنا شروع کروں ... میں تم سے کسقدر شرمندہ ہوں۔ طلعت! میری شرمندگی احاطہ تحریر میں نہیں آسکتی! طلعت میں تمہارا گناہ گار ہوں، تمہارا قصوروار ہوں، اسکے باوجود تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم آج کہیں مت جاؤ، ! میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ میں نے ابھی ابھی ویزا لے لیا ہے اور ساتی اپریل کو طلعت کی خدمت میں ہونگا اور تم سے میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گا۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر د

تمہارا اور صرف تمہارا
انیس

ناظم آباد کراچی

انیس بھائی! آپ کا خط باجی کے نام مل گیا لیکن افسوس کہ بہت دیر سے پہنچا اب آپکا آنا بیکار ہے

آگے صفحہ ۲۸۰ پر

شاہ جہاں

انیس الرحمن متعلم دلی کالج دہلی

فاصلے دل کے بڑھاتے ہو یہ کیا کرتے ہو
شمع یادوں کی جلاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

آرزو دل کی چھپاتے ہو یہ کیا کرتے ہو
نام لکھ لکھ کے مٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

ہم نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے
سوتے خوابوں کو جگاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

مدتیں ہو گئیں اجڑے ہوئے اس گلشن کو
دلِ ویراں کو بساتے ہو یہ کیا کرتے ہو

ساقیا رسم نہیں خوب یہ میخانے کی
جز میرے سب کو پلاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

تم کو جب ترکِ تعلق ہی گوارا ہے تو کیوں
خواب میں آ کے ستاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

غیر سے ربط بڑھانا ہے بڑھاؤ لیکن
آگ کیوں دل میں لگاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

جب اندھیرا ہی اندھیرا ہے ہر اک سمت انیس
جوت کیوں دل کی جلاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

---

نشیلی رات کا جادو کسی کے خواب میں تھا
گلاب کا سا وہ بدن کتنے پیچ و تاب میں تھا

تمام رات سفر کر کے ہم جہاں پہنچے
اک آنسوؤں کا نگر سرمئی گلاب میں تھا

چمک کے گر گئے، پلکوں پہ تیرتے تارے
یہ سانحہ مری ہر بات کے جواب میں تھا

کسی کے سبز بدن پر دکھائی دیتا ہے
جو کوہسار سمندر کے نیلے آب میں تھا

تھرکتی رات کی باہوں میں سو گئے تارے
ہر ایک چاند کسی بھیگے آفتاب میں تھا

میں اپنے آپ کو خود ہی سمیٹتا لیکن
عجیب حسن بکھرتی ہوئی کتاب میں تھا

# کچھ آبرو کے بارے میں

اطہر ندیم نقوی ایم۔ اے
دلی یونیورسٹی

ادب

گذشتہ سے پیوستہ

عام طور پر آبرو کی شاعری پر ایہام گوئی کا الزام لگایا گیا ہے اور یہ بات صحیح ہے لیکن پوری طرح نہیں۔ ہمارے نقاد انھیں ایہام گو کہہ کر ان کی دوسری خصوصیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ ایہام گو شاعر زیادہ سے زیادہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو ذو معنی ہوں۔ ایک معنی قریب اور ایک معنی بعید۔ عام طور سے شاعر کی مراد بعید معنی ہی سے ہوتی ہے۔ ذہین قاری ایہام پر مبنی کسی شعر کو پڑھ کر پہلے قریبی مفہوم لیتا ہے۔ لیکن فوراً ہی ایک اور مفہوم جو دور کا ہے اس کے ذہن میں آتا ہے جس سے اسے زیادہ مسرت ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ہر کام سلیقہ چاہتا ہے بے سلیقگی ہر اچھے کام کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایہام گوئی دوسری شعری صنعتوں کی طرح ایک صنعت ہے۔ معتدل اور مناسب حدوں میں رہتے ہو ایہام پر مبنی بہت اچھے شعر کہے جا سکتے ہیں اور کہے گئے ہیں۔ ایہام گوئی کا ناپسندیدہ اور ناگوار رنگ دلی کے شعراء متقدمین میں اثر کر گیا ان پر ایہام گوئی کے سلسلے میں جو اثرات مرتب ہوئے ان کی تفصیل یہ ہے کہ یہ شعراء عام طور پر فارسی کی اس شاعری سے متاثر تھے جو مغلوں کے آخری عہد میں وجود میں آئی اور جس میں لفظی کاریگری، شعبدہ بازی پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ ایہام گوئی ان فارسی شعراء کا عام مذاق تھا۔ اس کے علاوہ برج بھاشا کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ برج بھاشا میں کی گئی ہندی شاعری کا اس وقت تک ایہام گوئی اس وقت تک ایک بہت بڑا وصف تھا تیسری وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ محمد شاہ کے عہد میں مجلسی زندگی پر بہت زور دیا گیا اور اردو شاعری عام طور پر فارسی غزل اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ہم تلفظ لیکن مختلف المعانی الفاظ استعمال کرنے کی دلدادہ ہوئے لہٰذا اس طرح ایہام گوئی کے لئے میدان تیار ہوا۔ میر، قائم، یقین، اور دوسرے شعراء نے اپنی شاعری اور تذکروں میں ایہام گوئی کی سخت مذمت کی ہے اور اس کو لفظوں کا گورکھ دھندہ قرار دیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ لفظوں کے اس گورکھ دھندے سے شعر کا اصل وصف اور کیفیت مجروح ہوتی ہے شاعر کی توجہ زندگی کے تجربات کے اظہار سے کہیں زیادہ الفاظ پر مرکوز ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ مصنوعی اور بناوٹی اشعار کی صورت میں نکلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بغیر صرف محاورے، روزمرہ اور ذو معنی الفاظ کے استعمال کا کمال بن کر رہ جائے گا تو شعری کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ الفاظ یقیناً شاعری کے لئے بہت اہم ہیں لیکن یہ خیالات اور تاثرات، جذبات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ ہیئت اور معنویت دونوں میں اگر تناسب پیدا ہو تو اچھی شاعری وجود میں آئے گی۔ ورنہ نہیں۔ شاعری نہ محض خیال ہے اور نہ محض زبان بلکہ جیتی جاگتی تجربات کا اظہار نہایت نفیس اور بہترین الفاظ میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیوان

آگے صفحہ ۴۸ پر

# یہ دلی ہے پیارے

مزاحیہ

محمد عتیق صدیقی ایم۔اے

## بیوی کی تلاش

"شمیم صاحب! ہم اپنے ایک دوست کے دروازے پر کال بیل نہ ہونے کے سبب نعرہ زن ہوئے۔ اونچا مکان ہونے کی وجہ سے ہماری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ لہٰذا ہم نے دوسری آواز کے لئے خود کو تیار کیا۔ اور پھر پوری طاقت سے آواز دینے لگے۔ ابھی ہم صرف شمیم ہی کہہ پائے تھے کہ ایک بزرگوار ادھر سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ہم نے فوراً آواز کا گلا گھونٹ دیا۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے۔؟" بزرگوار ہم تک پہنچنے کے بعد پھٹ پڑے۔ ہم سراپا استعجاب بنے ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ آخر یہ کس سے مخاطب ہیں۔ کیونکہ ہم نے تو کوئی بدمعاشی کیا شرارت بھی نہیں کی تھی۔ قرب و جوار میں کسی کو نہ پاکر ہمیں ان کے صحیح العقل ہونے پر شک ہوگیا۔

"میں تجھ سے ہی کہہ رہا ہوں کمبخت۔ شرم نہیں آتی تجھ کو؟" وہ ہم کو گھورتا دیکھ کر پھر گرجے۔

"حضرت آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کوئی بدمعاشی نہیں کی۔" چھٹکارا پانے کے لئے ہم نے عاجزی کو اپنایا۔ اور دل ہی دل میں انکے جلد اچھا ہونے کی دعا کے ساتھ ساتھ شمیم کو ہزاروں بددعائیں دیں کہ اگر وہ گھر پر ہوتا تو یہ مصیبت ہی کیوں آتی۔

"کسی کی بہو بیٹی کے نام اس طرح سڑک پر کھڑے ہوکر پکارنا بدمعاشی نہیں تو کیا ثواب کا کام ہے۔" بزرگوار نے غصہ کی وجہ تسمیہ بتائی۔ اس سے ہم کو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کوئی دیر نہ لگی کہ شمیم نے یہ مکان چھوڑ دیا ہے اور یہ صاحب اس مکان میں نئے کرایہ دار ہیں اور شمیم ان کی بیٹی یا بہو کا نام ہے۔

"معاف کیجئے گا مجھکو معلوم نہ تھا۔ میں تو اپنے دوست کے پاس آیا تھا۔ جو کچھ دن پہلے تک اسی مکان میں رہتے تھے۔" ہم معافی مانگ کر اور انکا جواب سنے بغیر ہی واپس ہو لئے۔

"یہ شمیم بھی کتنا گدھا ہے۔ کمبخت کافی دن سے نہ تو ملا اور نہ ہی یہ بتایا کہ اب اس نے یہ مکان چھوڑ دیا ہے۔ معلوم نہیں اب کہاں ہوگا۔ کس طرح ملے گا کہاں ملے گا۔ ہم ان ہی خیالات میں گم جا رہے تھے کہ ہماری نظر سامنے ایک کرایہ پر سامان دینے والی دوکان پر پڑی۔ ہمارے ایک بہت ہی عزیز دوست جنہیں ہم پیار میں ماسٹر جی کہتے تھے دکان میں بیٹھے برتنوں کی گنتی کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ یہ تو ناممکن ہے کہ انھوں نے یہاں نوکری کر لی ہو۔ تو پھر یہ گنتی۔؟" "بہت ممکن ہے کہ سوشل سروس کر رہے ہوں۔" دل نے اظہار خیال کیا۔ مگر دماغ نے ماننے سے انکار کر دیا ــــــ خیر اسی دوران ہم دوکان تک پہنچ گئے۔ سلام کیا تو وہ اس طرح چونکے جیسے وہ یہ برتن کرائے پر نہیں بلکہ چرا کر لے جا رہے ہوں۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ محلہ میں ایک تقریب ہے اس سلسلے میں وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔ ہم نے ان کے فرض کی انجام دہی میں حائل ہونا مناسب نہ سمجھا اور اپنی راہ ہو لئے۔

اتوار کا دن تھا اس لئے ادھر ادھر گپ شپ میں کافی وقت برباد کرنے کے بعد جب ہم نے گھر کی طرف کوچ کیا تو راستے میں شمیم سے ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے کہ ہم یاد شدہ گالیوں کا ورد کرکے اس پر دم کرتے۔ وہ کہنے لگا۔ "یار پچھلے ہفتے بالکل اچانک اور افراتفری میں

میری شادی ہوئی ہے مجھے اسکا بہت افسوس ہے کہ میں اپنے دوستوں کو مطلع نہ کرسکا۔" اس نے معذرت چاہتے ہوئے ہمارے چہرے کا جائزہ لیا اور اس پر غصے کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر خوشامدانہ لہجہ میں بولا ۔۔ خیر اس کا ازالہ میں عنقریب پارٹی دے کر کرنے والا ہوں۔" چونکہ ہمارا غصہ شادی میں نہ بلانے کی وجہ سے نہیں تھا اس لئے اس ۔۔ ذ تحریش کے بعد بھی اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

" یار اب غصہ تھوک دو اور چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ ورنہ دیر ہو جائیگی۔" غصہ کو برقرار دیکھ کر اس نے کہا۔ اس کے جواب میں ہم نے اسکو بتایا کہ ہمارا غصہ شادی کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اسکے مکان چھوڑنے کی اطلاع نہ دینے کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ اگر وہ پہلے بتا دیتا تو آج ہماری بے عزتی تو نہ ہوتی۔ پھر ہم نے اسکو پورا قصہ سنایا۔

ہمارا جواب سنکر وہ بجائے شرمندہ ہونے کے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اور پھر اپنی ہنسی پر بریک لگا کر بولا ۔" یار میں نے مکان چھوڑا نہیں ہے۔ اور اب بھی اسی مکان میں رہتا ہوں۔ اور وہ بزرگوار جن سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی میرے خسر ہیں۔ اور دوسری حقیقت جو بے عزتی کا باعث بنی وہ یہ ہے کہ ان کی دختر تمہاری بھابی اور میری بیگم کا نام بھی شمیم ہے۔ جس وقت تم مجھے آواز دے رہے ہو گے وہ یہ سمجھے ہونگے کہ تم ان کی بیٹی کو پکار رہے ہو گے۔"

صحیح صورت حال سمجھنے کے بعد ہم نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں تم کہاں چلنے کو کہہ رہے تھے ۔؟"

" کیا تمہیں نہیں معلوم ۔؟" اس نے متعجب ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

" نہیں نہیں۔ یار کیوں پہیلیاں بجھا رہے ہو۔ صاف صاف بتاؤ نا۔"

" بھئی اپنے ماسٹر جی کی، آج منگنی ہو رہی ہے ۔"

" سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مجھے تو وہ آج ہی ملا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا وہ مجھ سے چھپاتا ۔؟" ہمیں بالکل یقین نہیں آیا ۔

" لیکن اس نے مجھ سے تو کہا ہے۔ اور شمیم تو دوپہر سے وہیں ہیں۔ اگر اب بھی یقین نہیں ہے تو چل کر دیکھ لو ۔"

" ٹھیک ہے بھائی تم جاؤ۔ ہماری طرف سے بھی مبارکباد دے دینا۔ وہ تو ہم کو اب دو تین دن بعد ہی ملینگے۔ اچانک ہونے کی وجہ سے مطلع نہ کرنے کی معذرت چاہتے ہوئے ۔" اور شمیم تعجب اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے چلا گیا۔

ہم سوچنے لگے کہ ہمارے دوست بھی عجیب ہیں۔ کم بختوں کی شادیاں ہوتی ہیں تو بالکل وقت پر مطلع کرتے ہیں۔ اور یا بعد میں معذرت کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ان کی دلہنوں کے گھر بھاری ہوتے ہیں تو تولید سے دو مہینے پہلے سے ہی رٹ لگانی شروع کر دیتے ہیں "میاں تیار ہو جاؤ بھتیجا آ رہا ہے ۔" ہم ان کی ان حرکات پر صرف جھنجھلا کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم ان سے بدلہ لینے کی حالت میں نہیں ہیں۔ ہم ابھی کنوارے ہیں۔ لیکن آج شمیم اور ماسٹر جی کی حرکات نے ہماری خودداری حمیت اور جذبہ انتقام کو بیک وقت للکارا تھا۔

لہٰذا ہم نے طے کیا کہ ہم بھی ان سے گن گن کر بدلہ لینے کے لئے چار شادیاں کرینگے خواہ اسکا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ ایک شادی والدین کی مرضی سے ایک اپنی مرضی سے اور اگلی دو پہلی دو کی مرضی سے۔

بہت غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ والدین کی مرضی والی میں تو ابھی بہت دیر ہے اس لئے پہلے اپنی مرضی والی کر لی جائے اب مسئلہ تھا کہ کس سے کی جائے۔ کیونکہ ہم تو عشق و شق کے قائل نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری کوئی محبوبہ بھی نہیں ہے کہ انہیں کو پکڑ کر لے آئیں۔ سوچا یونیورسٹی تو جاتے ہی ہیں وہیں سے کسی کو پکڑ لینگے۔ بس دل کو اطمینان دلا کر ہم صبح کا انتظار کرنے لگے ۔

یوں تو ہم یونیورسٹی روز ہی جاتے تھے لیکن اس دن ہمارا مقصد حصول تعلیم کے علاوہ تلاش محبوبہ بھی تھا اس لئے نہایت اہتمام کے ساتھ گھر سے نکلے۔ بس اسٹاپ پر پہنچے حسب معمول بہت بھیڑ تھی۔ اور حسب معمول ہی طالبات کی اکثریت تھی۔ یوں تو ہم روزانہ ہی زرق برق لباسوں میں ملبوس ان لڑکیوں کی طرف دیکھتے تھے مگر صرف اپنی آنکھوں کی غذا کے طور پر۔ لیکن آج چونکہ ہمیں اپنے دل کے لئے بھی غذا مطلوب تھی اس لئے آج کا دیکھنا قدرے مختلف تھا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ سامنے چوڑی دار اور ڈھیلے کرتے میں ملبوس محترمہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں نئی طرز سے لگے کاجل کو دکھانا چاہتی ہیں۔ بس ہم نے بھی انکا دل نہ توڑنے اور اپنے مقصد کے حصول کے پیش نظر

ڈھکلی باندھ دی۔ محترمہ نے بھی باوجود کافی آگے ہونے کے ٹکٹکی کو برقرار رکھنے میں پورا پورا تعاون دیا۔ کمبخت بس آگئی اور سب لوگ لائن سے اس میں چڑھنے لگے۔ محترمہ چونکہ ہم سے کافی آگے کھڑی تھیں اس لئے وہ پہلے چڑھ گئیں۔ بس میں داخل ہوتے ہوئے بھی انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ اسی بس میں آجاؤ۔ ہماری تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ منزل پر اتنی جلدی پہنچ جائینگے یہ تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ہماری یہ خوشی خوش فہمی ثابت ہوئی۔ جب ہم سے آگے صرف دو تین مسافر رہ گئے تو کنڈکٹر نے وسل دی بس چل دی اور ہم

سہ کارواں گذر گیا غبار دیکھتے رہے ــــ کے مصداق بس گذر گئی دھواں دیکھتے رہے۔

اس جانکاہ حادثے سے ہمارا دماغ بالکل اپ سٹ (upset) ہو گیا اور ہم کسی دوسری لڑکی کی طرف دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ بس دعا کرتے رہے کہ جلدی سے دوسری بس آجائے تو یونیورسٹی پہنچ کر محترمہ کو پکڑ لیا جائے اور ملاقات کی جائے۔ قسمت مہربان تھی دوسری بس آئی اور اب ہم جلدی سے بس میں کود کر کھڑکی والی سیٹ پر جھپک لئے۔ تاکہ باہر کا نظارہ بھی کر سکیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ محترمہ کہیں نظر ہی آجائیں۔ بس چلی اور کول تار کی سیاہ سڑکوں پر دوڑتی ہوئی تیزی کے ساتھ یونیورسٹی کی جانب بڑھتی رہی۔ اور ہماری نگاہیں کھڑکی سے باہر محترمہ کو ڈھونڈتی رہیں۔ یونیورسٹی کا اسٹاپ آگیا۔ اور ہم دل میں امید کی کرن لئے نیچے اتر آئے۔ کمرہ امتحان کے ان دجی لیڈر کی طرح چھکتے ہو کر اپنی گردن کو چاروں طرف گھماتے ہوئے کلاس روم کی طرف چلنے لگے۔

" آداب عرض ہے ـــ،، سلمہ نے ٹوکا۔

" آداب عرض کہہ کر ہم جلدی سے پا بہ رکاب ہو گئے۔

" سنیئے ـــ" حسب توقع اور خلاف توقع انھوں نے ہمیں روکنے کے لئے لگام کھینچی۔ اور ہم رک کر ان کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے گھورنے لگے ـــ " میں نے ایک افسانہ لکھا ہے اگر آپ اسکو دیکھ لیں تو ممنون ہونگی ـــ " انھوں نے عاجزی کے رنگ میں اظہار مدعا کر دیا۔

" ٹھیک ہے دید۔ بنا۔ دیکھ لونگا ـــ" کہکر ہم دوڑنے کی حد تک تیز چلنے لگے۔ ہم نے سوچا کہ بھئی اس لڑکی پر بھی اچھا رنگ جما ہوا ہے۔ سمجھتی ہے کہ ہم اسکی طرح طالب علم نہیں بلکہ ایک بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ بس ہمارے دو تین افسانے کیا پڑھ لئے کہ ہو گئیں گرویدہ۔ اب اسکو کون بتائے کہ وہ افسانے ہمارے اپنے نہیں ہیں بلکہ پرانے رسائل کا عطیہ ہیں۔ اور چونکہ ہم بھی اپنی ساکھ کو بگاڑنا نہیں چاہتے اس لئے خاموشی سے اوٹ پٹانگ تصحیح کر کے واپس کر دیتے ہیں ـــ

یوں تو یونیورسٹی میں ہر دوسری اور تیسری طالب علم لڑکی تھی۔ مگر ہماری نگاہیں ابھی تک ان ہی محترمہ کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ خیال یہ تھا کہ اب اگر بالکل نئی تلاش کی جائے تو بہت وقت صرف ہوگا۔ چونکہ ان سے کافی سے زیادہ بات بن چکی ہے اس لئے وقت کی بچت ہونے کا امکان موجود ہے۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ سامنے نگاہ پڑی اور محترمہ قہقہہ مارتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم کو لگا ہماری امید بر آئی۔ وقت کی بچت کے خیال سے ہم فوراً ہی بالوں کو درست کرتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔ قدرے قریب ہونے پر یہ راز ہم پر تنگ اور مختصر لباس میں ملبوس لڑکی کے جسم کی طرح عیاں ہو گیا کہ محترمہ اکیلی ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ہمراہ ایک صاحب بھی ہیں۔ ہماری امید دل پر اوس پڑ گئی۔ اور مایوس ہو کر ہم غیر ارادی طور پر کینٹین کی طرف چل دیئے۔ وہاں سلمہ کو اکیلے بیٹھا دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ان ہی کو راضی کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی دل ایکبار پھر مسرور ہوا۔ اور ہم ان کی طرف بڑھنے لگے ـــ

اپنی طرف ہم کو آتا دیکھ کر سلمہ احتراماً کھڑی ہو گئیں۔ ان کے اس احترام نے ہمیں ایک لمحہ یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا ان کے اس احترام کو بالائے طاق رکھ کر دست شادی دراز کرنا مناسب ہے مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال نے کہ اگر بیوی احترام کرنے والی مل جائے تو کیا برائی ہے" ہماری پریشانی دور کر دی۔ ہم چونکہ ڈائرکیٹ اپروچ (Direct Approach) کے قائل ہیں لہٰذا ہم نے فوراً کہہ دیا کہ سلمہ ہم آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں ـــ" سلمہ نے ہماری اس بے باکی اور بے شرمی کے حملے کو احترام کی ڈھال پر روک لیا اور نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے گویا ہوئیں ـــ " عتیق صاحب مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میرے والدین میری منگنی کر چکے ہیں ـــ " ان کی یہ صاف گوئی ہمارے لئے تنکا سا جواب ثابت ہوئی۔ اور ہم اپنی شکست کو دل اچھا کوئی

بات نہیں۔" کے پردے میں چھپا کر وہاں سے فوراً چلدیئے۔ اس حادثے نے ہمارا دماغ بالکل ہی بے کار کر دیا تھا۔ اور ہم کسی بھی کام کے نہیں رہ گئے تھے۔ لہٰذا فوراً ہی ہم نے گھر چل کر غم غلط کرنے کا فیصلہ کیا اور بس اسٹاپ کی طرف اپنا رخ موڑ دیا۔

اسٹاپ پر منتظرین طلبہ و طالبات کا کثیر مجمع ہمارے لئے کوئی باعث استعجاب نہیں تھا۔ کیونکہ دلی یونیورسٹی کا ہر طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ واپسی کے وقت بس میں داخلے کے لئے کتنی جد و جہد اور طاقت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم اُن خداداد صلاحیتوں حامل ہیں جو بہت کم طلبہ کو حاصل ہوتی ہیں۔ یعنی رش کتنا ہی کیوں نہ ہو ہم بس کے رکتے ہی دوسرے لمحے اندر ہوتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے لئے کتابیں رکھ رکھ کر جگہ گھیر لیتے ہیں۔ اور اگر کوئی ساتھی ساتھ نہیں ہوتے ہیں تو ہم اپنی برابر والی جگہ کسی صنف نازک کو پیش کر دیتے ہیں البتہ گھیر تے ضرور ہیں۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد ہی بس آ گئی اور فوراً ہی اس میں داخلہ کے لئے دھکا مکی شروع ہو گئی۔ کوئی طاقت کو استعمال کرتا اور کوئی عقل کو اور بے چاری لڑکیاں خود کو یعنی وہ خود کو لڑکوں کے ریلے میں جھونک دیتیں۔ اور یہ ریلا آہستہ آہستہ ان کو اندر پہنچا دیتا۔ ہم حسب عادت بہت جلدی داخل ہو گئے اور برابر والی سیٹ پر کتابیں رکھ دیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے بس بھر گئی اور کنڈکٹر نے چلنے کی وسل دیدی اور بس چل پڑی۔ ہم نے سیٹ دینے کے لئے آگے پیچھے نظریں دوڑائیں اور برابر کھڑی ہوئی محترمہ کو پیش کش کر دی۔ محترمہ تھینک یو کہتے ہوئے براجمان ہو گئیں۔ ہم نے ان کے سراپے کا جائزہ لیا اور ان کے ہاتھ میں ایک تازہ اردو ماہنامہ پرچہ دیکھ کر چونک گئے۔ اس پرچہ میں ہمارا ایک افسانہ فوٹو کے ساتھ چھپا تھا ایک بار پھر ہمارے دل کو امید کی کرن نظر آئی اور مایوسی کے بادل چھٹ گئے۔ سوچا اب تو ناز بے مناسب رہے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد محترمہ نے رسالے کی ورق گردانی شروع کی۔ اور جب ہمارے فوٹو اور افسانے والے صفحے پر اپنی... نگاہیں گاڑ دیں تو ہمیں اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہا کہ یہ ہماری مداح ہیں۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خیال آیا کہ ان سے کہدیں کہ محترمہ یہ افسانہ اور یہ فوٹو ہمارا ہی ہے! اور جب ان کو یہ معلوم ہوگا کہ انکا پسندیدہ افسانہ نگار ان کے بازو میں ہی بیٹھا ہوا ہے تو یہ بھی بہت مسرور ہونگی۔ اور بہت ممکن ہے کہ گھر چلنے کی دعوت بھی دیں کیونکہ شکل سے خاندانی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہ سوچ کر کہ بس میں تعارف اچھی طرح نہ ہو پائے گا۔ ہم اپنے خیال کی تکمیل سے باز رہے اور یہ فیصلہ کر لیا کہ جب یہ بس سے اتریں گی اس وقت ہی کچھ کرینگے۔

بس ایک بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ مال روڈ علی پور روڈ آئی پی کالج کشمیری گیٹ ہوتے ہوئے لال قلعہ کے اسٹاپ پر آکر کھڑی ہو گئی۔ ہماری منزل تو یہی تھی۔ ہم نے محترمہ کی طرف دیکھا اور ادھر اترنے کے کوئی آثار نہ دیکھ کر ہم بھی خاموشی سے بیٹھے رہے۔ کیونکہ ہمیں تو محترمہ سے بات کرنی تھی اور وہ بھی بس کے باہر اس لئے آج ہماری منزل وہی تھی جو محترمہ کی منزل تھی۔ بس پھر سڑک پر دوڑنے لگی۔ اور محترمہ نے پھر رسالہ کے ان ہی صفحات پر نظریں جما دیں وہ رسالے کو کچھ اس طرح تھامے ہوئے تھیں کہ انکی انگلیاں تصویر میں ہمارے گال پر رکھی ہوئی تھیں اور ہمیں بیچ بیچ اپنے گال پر ان انگلیوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔

جب بس دریا گنج کے اسٹاپ سے بھی گذرنے لگی اور محترمہ بدستور سیٹ سے چپکی بیٹھی رہیں تو ہمیں فکر لاحق ہوئی کہ آخر ان کو جانا کہاں ہے۔ سوچا کہ چھوڑو میاں اس چکر کو اور اگلے اسٹاپ پر اتر جاؤ۔ مگر پھر اچانک دوستوں سے انتقام لینے کی خاطر شادی کا خیال آیا تو ہمارے جذبے میں نئی جان سی پڑ گئی اور ہم مستعد ہو کر جمے رہے۔ بس غیر مانوس راستوں سے ہوتی اپنی منزل کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اور ہم دل ہی دل میں محترمہ کی منزل جلد آنے کی دعاء کر رہے تھے۔ بالآخر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگاتار چلنے چلتے ایک جگہ رکی اور سب مسافر اترنے شروع ہو گئے۔ محترمہ بھی اترنے کیلئے کھڑی ہو گئیں۔ رسالہ اب انھوں نے اپنی کتابوں کے بیچ میں دبا لیا تھا۔ مسافر آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے تھے۔ ہم بھی محترمہ کے پیچھے پیچھے نیچے اتر آئے۔

نیچے آنے کے بعد محترمہ ایک طرف برق رفتاری کے ساتھ

ان کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لئے "جی! سنیئے ——" مگر وہ چونکیں اور نہ متوجہ ہوئیں۔ ابا ڈٹ کرمتوجہ ہوئیں اور استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

آپ اس رسالہ میں جو افسانہ راستے میں پڑھ رہی تھیں وہ میرا ہی ہے" ہم نے رسالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے مزید کہا۔ "اس میں میرا فوٹو بھی ہے۔" ہماری اس بات کا انھوں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ہمکو اس طرح گھورنے لگیں جیسے ایک گونگا اور بہرہ شخص اپنے مخاطب کو اس وقت گھورتا ہے جب اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ پھر اچانک کچھ سمجھ کر مسکراتی ہوئی بولیں۔ "اوہ! معاف کیجئے گا میں یہ رسالہ پڑھ نہیں رہی تھی بلکہ دیکھ رہی تھی کیونکہ مجھے اردو نہیں آتی ——"

"اگر اردو نہیں آتی تو یہ اردو کا رسالہ ——؟" شاید وہ ہماری نگاہوں کی زبان سمجھ گئیں فوراً بولیں ——

"ہمارے پڑوس میں ایک اردو داں رہتی ہیں انھوں نے کہا تھا تم شہر جانی ہو رسالہ لیتی آنا۔ سو میں لے آئی ——" محترمہ اپنی بات مکمل کر کے چلی گئیں اور ہم وہیں ساکت و جامد کھڑے کھڑے ان کو اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ اگلے موڑ سے مڑ کر نظروں سے غائب نہ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد ہم نے اپنے جسم کو حرکت دی تو معلوم ہوا کہ ہم جیسے ہی نہیں سخت جان بھی ہیں جب ہی تو تین چار جانکاہ حادثوں کے بعد بھی صحیح و سالم کھڑے ہیں۔

---

بقیہ افسانہ انجام از صفحہ ۳۰

باجی ہم سب کو چھوڑ کر بہت دور چلی گئی ہیں کبھی واپس نہ آنے کے لیئے۔

انیس بھائی تم میری باجی کے قاتل ہو، ان کا خون تمہاری گردن پر ہے وہ آخری سانس میں بھی کس طرح تمکو یاد کرتی رہیں، اس کا حال کچھ خدا جانتا ہے۔ باجی نے تمکو مرتے وقت معاف کر دیا۔ لیکن قدرت تمکو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تمنے وہ گناہ کیا ہے جسکا کفارہ تمہاری سات پشتیں بھی نہیں ادا کر سکتیں تمنے مری معصوم باجی کو بے موت مار ڈالا۔ میں تمہارے خط کا جواب کبھی نہیں دیتی صرف یہ سوچ کر لکھدیا ہے کہ آخر تم میری بہن کے محبوب تھے

تمہاری چھوٹی بہن روشن



آبرو کا سرسری مطالعہ بھی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بہترین تجربات بہترین الفاظ میں اکثر و بیشتر نہیں ہیں۔ لیکن آبرو کے پورے دیوان کے متعلق صرف یہ حکم لگا دینا یقیناً ان کے ساتھ بے انصافی ہے۔

دراصل ایہام گوئی نے ہمیں لفظیات کا ایک نیا ادراک دیا ہے اور اس خدمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایہام گوئی نے ایک تاریخی خدمت یہ بھی کی ہے کہ تاریخی اور معاشرتی اصلاحیں، تلمیحات، سماجی حوالے، لباس، میلے ٹھیلے، نشست و برخاست کے طریقے، عام گفتگو کے انداز، محاورے، عام روائیتیں اپنے متعلقات اور مناسبات کے ساتھ واضح طور پر استعمال کی ہیں۔ آبرو کے یہاں ایسے کثیر اشعار ہیں جو ایہام گوئی کے باوجود اپنے اندر شعری کیفیت اور بے ساختگی رکھتے ہیں۔ ایسے اشعار میں عملی زندگی کی تمام سچائیاں ملتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں تفکر، گہرائی اور بلندی کا فقدان ہے۔ حالی کی یہ رائے بالعموم قدما کے متعلق اور بالخصوص آبرو کے متعلق صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان شاعروں کی شاعری اگرچہ نیچرل معلوم ہوتی ہے (بہ تقاضائے فطرت و طبیعت) لیکن نامقبول ہے۔ لیکن ان کے لہجے کے بھولپن اور سادگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آبرو کے ایسے شعر ناسخ اور لکھنؤ کے دور کی شاعری کی طرح سپاٹ، بے کیف اور بے نمک نہیں ہیں ان کے بلکہ ایسے شعروں میں تلازمہ خیال کی مختلف منازل کا ارتقا ملتا ہے۔

اس تجزیہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آبرو ایک مخصوص طرز ادا کا بیان نہیں بلکہ ایک مخصوص شخصیت، ایک دور اور ایک مزاج کا نام ہے۔ یہ تسلیم کہ اس میں عظمت نہیں ہے لیکن اس کا اپنا ایک نشہ اور اپنا مزہ ہے۔ بالیدگی نہیں ہے۔ چاشنی ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو

طور کیا پوچھتے ہو کافر کا — شوخ ہے بانکا ہے سپاہی

---

نازک پنے پہ اپنے کرتے ہو تم غروری
موسی کمر یہ اتنے فرعون ہو رہے ہیں
پھرتے تھے دشت دشت دیوانے کدھر گئے
وہ عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

شاہ جہاں دہلی

# ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر ایک نظر

شمس الاسلام۔ ایم۔ اے۔ سیاسیات (سال اول)

شاہجہاں سیاسی جریدہ نہیں ہے لیکن طلبہ کی سیاسی سوجھ بوجھ کے لئے یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے ــــ اگر قارئین اس سلسلے کو پسند کریں گے تو آئندہ بھی اسی طرح کے مضامین شائع کئے جاتے رہیں گے۔

کسی بھلے آدمی نے کہا ہے کہ سیاست میں دوست اور ...ل نہیں ہوتے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر ...بات بالکل صادق ہے۔ ویسے تو ہندوستانی سیاست کبھی ...مستحکم نہ تھی لیکن ۱۹۶۷ء کے الیکشن کے بعد حالات بد سے ...بدتر ہوتے چلے گئے۔ لوگ عام طور پر کانگریس کے ۲۰ سالہ ...دورِ حکومت سے مایوس ہوچکے تھے۔ اور اینٹی کانگریس ...جذبے کے تحت انھوں نے کانگریس پر دوسری علاقائی ...پارٹیوں کو ترجیح دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے سے زیادہ صوبے ...کانگریس کے ہاتھ سے نکل گئے اور وہاں پر اپوزیشن جماعتوں ...کی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ جن صوبوں میں کسی بھی ایک پارٹی کی اکثریت ...نہیں تھی وہاں متحدہ محاذ بن گئے۔ مثلاً مغربی بنگال، بہار، مدھیہ پردیش ...کیرالہ، ہریانہ، پنجاب اور اڑیسہ وغیرہ۔

حالانکہ آدھی سے زیادہ ریاستیں کانگریس کے ہاتھ سے نکل ...چکی تھیں لیکن مرکز میں اسکی اکثریت برقرار رہی۔ اسکی سب ...سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے مقابلے میں کوئی کل ہندپیمانے ...کی پارٹی نہیں تھی۔ اسکا مقابلہ کرنے والی جماعتوں میں زیادہ تر ...علاقائی پارٹیاں تھیں جیسے کہ ڈی۔ ایم۔ کے۔ تامل ناڈو میں۔ بنگلہ ...کانگریس بنگال میں۔ جن سنگھ شمالی ہند میں وغیرہ وغیرہ۔ ...ان جماعتوں نے صوبائی اسمبلیوں کیلئے تو کانگریس کا مقابلہ ...کیا اور اسکو شکست دینے میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئیں۔ لیکن ...پارلیمنٹ کیلئے ان جماعتوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی اور نتیجہ یہ

ہوا کہ کانگریس مرکز میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

اس طرح ۱۹۶۷ء کے عام انتخاب کے بعد ہندوستانی سیاست بہت ہی نازک دور میں داخل ہوگئی۔ ایک طرف تو کانگریسی مرکزی حکومت اور اپوزیشن ریاستی حکومتوں میں اختیارات کی تقسیم پر کھینچا تانی شروع ہوگئی دوسری طرف متحدہ محازوں میں اندرونی خلفشار بڑھتا چلا گیا۔ یہ متحدہ محاز جن پارٹیوں نے ملکر بنائے تھے وہ کسی ایک پروگرام یا ایک آئیڈیالوجی کی ماننے والی نہیں تھیں۔ ایک ہی متحدہ محاز میں بنیادی اختلاف رکھنے والی پارٹیاں شامل تھیں ان کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ تھا کانگریس کی طاقت کو ختم کرنا۔ وہ یہ کرنے میں تو کامیاب ہوگئیں لیکن یہ جذبہ مستحکم ثابت نہیں ہوا۔ آئے دن مختلف صوبوں میں حکومتیں بدلی جانے لگیں۔ ہریانہ، مدھیہ پردیش اور بہار کی ریاستیں اس میدان میں سب سے آگے رہیں۔

ابھی یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ سیاست نے ایک نئی کروٹ لی۔ بنگلور میں کانگریس کی قسمت کا فیصلہ اسطرح ہوا کہ یہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک کی قیادت وزیراعظم بیگم اندرا گاندھی کے حصے میں آئی اور دوسرا حصہ سنڈیکیٹ کہلایا۔ یہ تقسیم اسوقت پوری ہوگئی جب سنڈیکیٹ نے اندرا گاندھی کی حکومت کو اپنی حمایت دینے سے انکار کردیا۔ کل تک جو ساری کی ساری لیڈرشپ سوشلزم اور سیکولرزم کی حامی سمجھی جاتی تھی اب ان میں سے کچھ سوشلزم اور سیکولرزم کے علمبردار کہلائے جانے لگے اور باقی سوشلزم کے دشمن۔ ایک لڑائی جو شخصی بنیاد پر شروع ہوئی وہ اصولی جنگ

بن گئی۔

کانگریس میں انقلاب کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ اب صحیح عملی سیاست شروع ہوگئی ہے۔ ایک طرف اندرا کانگریس، ایس۔ ایس۔ پی۔، پی۔ ایس۔ پی۔، کمیونسٹ اور ڈی۔ ایم۔ کے۔ اور دوسری طرف سنڈیکیٹ، جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی میں مقابلہ شروع ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی سیاست دو صحیح حصوں میں منقسم ہوگئی ہے۔ مگر بہت جلد یہ بھرم ٹوٹ گیا اور موجودہ حالات میں یہ فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ کونسی پارٹی ترقی پسند ہے اور کونسی قدامت پسند۔ حال ہی کے کیرالا کے وسط المدتی چناؤ سے یہ ظاہر ہوگیا کہ کمیونسٹ پارٹی (مارکسٹ) نے ترقی پسند گروپ کو چھوڑ کر دوسرے گروپ کے ساتھ الیکشن میں تعاون کیا۔ یو۔ پی۔ کا بھارتی کرانتی دل صبح کو اندرا گاندھی کانگریس کے ساتھ ہوتا ہے اور شام کو جن سنگھ اور سنڈیکیٹ کے ساتھ ملکر حکومت بناتا ہے یہی حال اکالیوں کا پنجاب میں ہے کل تک یہ جن سنگھ کے ساتھ تھے اور آج اندرا کانگریس کے ساتھ ملکر سوشلزم کے گن گا رہے ہیں۔ شیو سینا جس کو کانگریس نے مہاراشٹر میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا آج وہ اسی کی دشمن ہے اور جن سنگھ کے ساتھ ہے۔ سنڈیکیٹ نے حال ہی میں ایک اور دھماکہ کیا جبکہ اس نے جن سنگھ اور ایس ایس پی کے ساتھ ملکر ایک عظیم اتحاد کی بنیاد ڈالی تاکہ وہ آنے والے وسط المدتی چناؤ میں کانگریس کا مقابلہ کرسکیں۔ اس عظیم اتحاد کا سب سے عظیم پہلو یہ ہے کہ سوتنتر پارٹی جو اب تک سنڈیکیٹ اور جن سنگھ کی معتبر ساتھیوں میں سے تھی اس نے اسمیں شامل ہونے سے منع کردیا ہے جبکہ ایس۔ ایس۔ پی۔ جو ابھی تک اندرا گورنمنٹ کے ساتھ تھی اور خود کو سوشلزم کا علمبردار کہتی تھی آج رجعت پسندوں کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑی ہے۔

ان حالات میں پارلیمنٹ کا انتخاب مارچ میں ہونے جارہا ہے۔ نتیجہ کیا ہوگا اسکے متعلق کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے کہ نئی پارلیمنٹ میں کسی بھی پارٹی کو مطلق اکثریت حاصل نہیں ہوگی۔ جو بھی گروپ حکومت بنانا چاہے گا اسکے لئے ضروری ہوگا کہ وہ کئی اور پارٹیوں کو ملاکر حکومت بنائے اور اس طرح مرکز میں کولیشن گورنمنٹ کی بنیاد پڑ جائے گی۔ سیاسی جماعتوں کے اصولوں میں ایک بار پھر ترمیم کیجائے گی نئے نئے دوست بنیں گے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا کیوں نہ رہے آخر ہندوستانی سیاستدانوں کو یہ قول کہ سیاست میں اصول اور دوست نہیں ہوتے بہت پسند ہے۔

اگر آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس مسئلے پر غور کریں کہ غیر مستحکم اور غیر اصولی ہندوستانی سیاست کن باتوں کی دین ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گوکھلے نے جو بات ۶۰ سال قبل کہی تھی بالکل صحیح ثابت ہورہی ہے۔ گوکھلے نے کہا تھا کہ آزادی کوئی مذاق نہیں ہے۔ اسکے ساتھ جمہوریت ملے گی اور کامیاب جمہوریت کیلئے ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض اچھی طرح سمجھتا ہو۔ ڈسپلن سے رہنا جانتا ہو۔ یہ شعور حاصل کئے بغیر آزادی کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اسوقت کسی نے گوکھلے کے ان معنی خیز خیالات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اسوقت ہر لیڈر کی یہی خواہش تھی کہ آزادی ملجائے۔ آزادی کیسے ملے، کن حالات میں ملے اسکا کسی کو بھی خیال نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کو آزادی ملی جہاں لوگ اپنے فرض اور دوسروں کے حقوق کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پورا معاشرہ سماجی برائیوں سے بھرا پڑا تھا۔ فرقہ واریت چھوت چھات اور جاہلیت کا دور دورہ تھا۔ دور اندیش لوگ آزادی ملنے کے فوراً بعد ہی سمجھ گئے تھے کہ آزادی غلط لوگوں کو مل گئی ہے۔ آزادی کے فوراً بعد فساد اور پھر علاقہ پرستی و لسانی تعصب نے وہ گل کھلائے کہ شیطان بھی پناہ مانگنے لگا۔

اس سب کی ذمہ داری ہماری تحریک آزادی کی قیادت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر اس وقت عوام کے درمیان تعمیری کام پر بھی اتنا ہی زور دیا جاتا جتنا کہ آزادی کیلئے تو شاید ہمیں موجودہ صورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑتا ــ اب بھی حالات قابو میں آسکتے ہیں بشرطیکہ موجودہ قائدین اس پہلو کو ذہن میں رکھ کر کام کریں ــ اگر اب بھی اس کو نظر انداز کردیا گیا تو شاید سارے ہندوستان میں وہی ہو جو اب ملک کے کچھ حصوں میں دیکھنے میں آرہا ہے۔

●●

ڈاکٹر محمد یونس صاحب جعفری
لکچرار دلی کالج دہلی۔


## تعطیلات تابستان را چگونه گذراندید؟

سال تحصیلی بسرعت بپایان رسید۔ بہار، آن نوعروس سال با تمام فر و شکوه خود جلوه گری آغاز کرد۔ طبیعت جوان شد، گلهای زیبا با طراوت از خاک تیره سر بدر آوردند؛ درختان جامۂ سبز برتن آراستند؛ بلبلان درمیان بستر گلها مستانه بنغمه سرائی پرداختند۔

آری، طبیعت جوانی از سر گرفت، ولی قلب من و سایر دوستانم مملو از اضطراب و دلهره و نگرانی گردید۔ چون بدبختانه هر سال امتحانات ما در فصل دل انگیز بهار آغاز می گردد۔

بهر حال، پس از چند هفته دست و پنجه نرم کردن با دیو مهیب امتحانات آنرا شکست دادم و موفق و سربلند سال تحصیلی را بپایان رساندم۔ اولیاء دبیرستان جشن پرشکوه و در عین حال ساده ای برپا کردند و کارنامه های قبولی ما را در برابر چشمان خوشحال پدر و مادرمان بما دادند۔

هنگامیکه بخانه رسیدم؛ پدر و مادرم صمیمانه بمن تبریک گفتند و برادر و خواهرانم مرا با گرمی بوسیدند، بعد پدرم هدیه نفیسی را که بمناسبت موفقیت من خریده بود بمن داد؛ مادر و برادر و خواهرانم برایم هلهله برکشیدند۔ وقتیکه هدیه را از دست پدرم گرفتم، دیدم چشمان مهربانش پر از اشک شده بود۔ پدرم با محبت هر چه تمامتر مرا بوسید و گفت! فرزند عزیزم، بمناسبت این موفقیت عالی تو ما ترا از تو دعوت کرده که تعطیلات تابستانی را در املاک وسیع او بگذرانی۔

مادرم لوازم ضروری مسافرت و در جامه دانی گذاشت و همان روز بلیط ترن نیز برای من خریده شد۔

ساعت سه صبح روز دیگر همگی از خواب برخاستیم۔ هنوز خورشید طلوع نکرده بود، هوا تا اندازه ای تاریک بود. با عجله زیادی صبحانه ام را صرف کردم و لباس پوشیدم۔ وقتیکه تمام کارهایم رو براه شد، ساعت پنج شده بود۔ روی مادرم را بوسیدم و پس از خدا حافظی، با پدر و برادر و خواهرانم سوار تاکسی شده و براه آهن رفتیم۔

چند دقیقه قبل از ساعت شش، من با عزیزانم خداحافظی کرده و سوار ترن شدم۔ درست سر ساعت شش ترن سوت جگر خراشی از سینه برکشید که محوطه ایستگاه راه آهن را بلرزه درآورد و بعد جثه عظیم و سنگینش را حرکت داد۔ ابتدا خیلی آهسته براه افتاد و بتدریج سرعت گرفت۔ وقتیکه ترن از محوطه ایستگاه خارج شد، هنوز میتوانستم حرکت ملایم دستمال های پدر و برادر و خواهرانم را ببینم۔

ترن سوت زنان تهران را پشت سر گذاشت و با پیچ و خم دوراه های پرپیچ و تاب، بسوی شمال براه افتاد۔

تا ساعت دو چیزی جز دشت های بیکران و تخت و کوه های سر بفلک کشیده و شکلات رنگ و تنگ درخت های خشکی که

چون پنجه های استخوانی مردگان آسمان را تهدید میکردند از پنجره ترن بچشم می خورد. کم کم منظره عوض شد بتدریج بمزارع سرسبز و خرم و جنگلهای انبوه شمال نزدیک گردیدیم. مه رقیق، مثل یک پرده حریر، درختان جنگلی و مزارع سرسبز برنج را در برگرفته بود. باران ریزی میبارید و صورت گلها و گیاهان زیبا و با طراوت را شستشو میداد. بلبلان در میان شاخسار درختان نغمه سرائی میکردند. فضا مملو از رایحه گلهای وحشی بود.

ترن سوت کشیده و در ایستگاه توقف کرد. عمو جانم با افراد خانواده اش و دسته جمعی باستقبال من آمده بودند. پس از سلام و احوال پرسی همگی سوار اتومبیل شده و مجدداً براه افتادیم. اتومبیل در طول جاده ای پیش میرفت که یکطرفش کوه ها و تپه هائی مستور از جنگل بود و طرف دیگرش کشتزارهای برنج. جاده با پیچ و خم های فراوانش بمار شباهت داشت. اتومبیل چندین ساعت متوالی غرش کنان پیش میرفت. کم کم شب فرا رسید و حجاب تیره ای عالم را فرا گرفت.

بهر حال، دو سه ساعت از شب گذشته بود که بمقصد[1] عموم رسیدیم. پس از صرف شام چون خیلی خسته بودم، زود خوابم برد. صبح وقتیکه از خواب بلند شدم، آفتاب طلوع کرده و قسمتی از اطاق مرا هم فرا گرفته بود. صدای امواج دریا از دور بگوش میرسید.

با ذوق و شوق برخاسته و لباس پوشیدم و پس از خوردن ناشتائی با پسر عموهایم بطرف دریا رفتیم. هنگامیکه خود را بوسط امواج کوچک و بزرگ دریا انداختم، مثل اینکه تمام خستگی ها و ناراحتی های ناشی از امتحان یک مرتبه وجود مرا ترک گفت. قلبم مملو از شادی گردید. دلم میخواست از فرط مسرت بلند داد بکشم و فریاد بکشم.

تا ظهر در دریا شنا کردیم و بعد بخانه بازگشتیم. ساعت سه بعد از ظهر مجدداً بسوی دریا رفتیم و خویشتن را بدست امواج آب دریا سپردیم. گاهگاهی روی شنها و ماسه های داغ ساحلی دراز میکشیدیم و امواج دریا، هم چون زبان های کوچک و بزرگ، بر بدن های ما لیسه میزد.

از آن پس برنامه روزانه ما عبارت از شنا و گردش و تفریح و اندکی هم مطالعه بود. سه ماه تعطیلی من بسرعت برق سپری گردید. دریغ و درد که ساعت خوشی و فراغت خیلی زود بپایان میرسند و جای خود را به لباس غم ها و گرفتاری های گوناگون زندگی میدهند!

تازه دلهرهٔ امتحانات را فراموش کرده و خستگی و تشنگی زندگی را از تن بدر کرده بودم که بادهای پائیزی وزیدن آغاز کرد و بمن اطلاع داد که دیگر باید با خوشی ها وداع گفته و دوباره خود را برای درس و بحث آماده کنم.

با روحی تازه و جسمی سالم و شاداب بطهران بازگشته و خویشتن را برای از سر گرفتن دروس حاضر ساختم. و بدین ترتیب تعطیلی تابستان من بپایان رسید.

●●

---

۱- بکار بردن حرف (د) پس از اسم مفعول برخلاف دستور زبان فارسی است. اما اگر در همین کتاب بخش بهترین آثار نویسندگان گذشته و معاصر ایرانی مراجعه کنید خواهید دید که اکثر آنان این قاعده را زیر پا گذاشته اند.

---

## فارسی کے طلباء سے ......

فارسی مضامین کا یہ سلسلہ فارسی پڑھنے والے بہت سے ساتھیوں کی تجویز پر اور ان کے امتحان کے نقطہ نظر سے مفید سمجھتے ہوئے شروع کیا جارہا ہے —
اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ایک کتاب بھی عنقریب ہی شائع کردی جائے گی.

ادارہ

شاہجہاں دہلی

# خبرنامہ

رپورٹ

مرتبہ ریحان الحق بی۔ایم۔اے۔ بی کام

**نوٹ:۔** تعلیمی درسگاہوں میں ہونے والے ادبی تقریبات کی مختصراً رپورٹ پیش کی جاتی ہے۔ سیکریٹری حضرات سے درخواست ہے کہ وہ فنکشن کی مختصراً رپورٹ ارسال کریں۔ رپورٹ کے ساتھ یا تو کسی استاد کا تصدیقی خط ہونا چاہیئے۔ یا رپورٹ سوسائٹی کے لیٹر ہیڈ پر ہونی چاہیئے۔

---

## دلی یونیورسٹی کے ہونہار طلبا کو مختلف وظائف

مندرجہ ذیل طلبا کو جو کہ دلی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں مختلف وظائف سے نوازا گیا ہے۔

نعیم الدین دلی یونیورسٹی ریسرچ اسکالرشپ۔ برائے فارسی۔
مولینا رضا احمد صدیقی یو جی سی ریسرچ برائے عربی۔
مس ناہید تاج قریشی۔ ہمدرد اسکالرشپ برائے پوسٹ گریجویٹ
مس قدسیہ افضال " " " ایم۔لٹ

ادارہ شاہجہاں ان لوگوں کو قلبی مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ جن مقاصد کے لئے یہ وظائف دیئے گئے ہیں ان میں طلبا کو کامیابی حاصل ہو

## انجمن فارسی دلی یونیورسٹی میں شمیم صاحب کی افغانستان سے آمد۔

شمیم قریشی صاحب جو کہ دلی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد سے افغانستان میں ہندوستانی سفارتخانہ میں ترجمان کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں وہ آجکل رخصت پر ہندوستان تشریف لائے ہوئے ہیں۔ انکے اعزاز میں دلی یونیورسٹی کی انجمن فارسی نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ جس میں شمیم صاحب نے افغانستان کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ حاضرین نے تقریر بہت دلچسپی کے ساتھ سنی۔ اور مختلف سوالات بھی کئے۔ جنکے جوابات شمیم صاحب نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ دیئے۔ جلسہ کی صدارت جناب امیر حسن صاحب عابدی صدر شعبہ فارسی دہلی نے فرمائی۔

## دلی کالج میں انجمن فارسی کے زیر اہتمام حافظ شیرازی پر سیمنار۔

یکم جنوری ۱۹۷۱ء کو دلی کالج میں انجمن فارسی کے زیر اہتمام ایک اہم ادبی سیمنار ہوا۔ جس میں نعیم الدین صاحب ریسرچ اسکالر نے حافظ شیرازی پر ایک بصیرت افروز مقالہ پڑھا۔ مقالہ کے بعد طلباء نے اس موضوع پر مباحثہ میں حصہ لیا اور مختلف سوالات کئے جنکے جوابات فاضل مقالہ نگار نے بہت خوش اسلوبی سے دیئے۔ آخیر میں جناب محمد یونس صاحب جعفری صدر انجمن نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں مقالہ کے مبہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ اور جلسہ پر یہ دلچسپ محفل اختتام پذیر ہوئی۔

## ...ادب جامعہ کالج نئی دلی کی سال رواں کی ...ی تقریب۔

بزم ادب جامعہ کالج کی سال رواں کی پہلی تقریب ۸ اردسمبر ۱۹۸۰ء ...ع کے ہال میں منعقد ہوئی۔ اس بزم کے مہمان خصوصی جناب ...و پرشاد صاحب جاوید وششٹ صدر شعبہ اردو دلی کالج دلی تھے۔ ...ب دستور تقریب کی صدارت خود بزم کی صدر محترمہ ...ہدہ حسینی (بی۔ اے فائنل) نے کی۔ سب سے پہلے سابق ...کریٹری اکرم فرشوری نے تقریر کی۔ اور اس کے بعد نئے ...یکریٹری حسین اختر مراد۔کرمانی نے بزم ادب میں شرکت ...نے والے حضرات کا خیر مقدم کیا۔ اور پرنسپل کالج جناب ...باد الحسن صاحب فاروقی اور قنبیر زیدی کا شکریہ ادا کیا ...ن کی سرپرستی اور تعاون سے ہی بزم ادب پروان چڑھ رہی ...ہے۔ اس کے بعد جناب محمد ذاکر صاحب لکچرار شعبہ اردو جامعہ ...لج نے مختصر مگر جامع تقریر کی۔ جس میں موصوف نے پروفیسر ...وید وششٹ صاحب کے ادبی کاموں کا ذکر کیا۔

اس بزم میں بیرونی شعراء کے علاوہ کالج کے جن طلباء ...جو تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں اپنی اپنی نظموں اور غزلوں ...ے محفل کو مسرور کیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔

جناب ساحل صدیقی، قمر فضیل، نعیم صدیقی ان کے علاوہ ...مول علی اور ماجد نے دلکش ترنم کے ساتھ جناب نشور واحدی ...رجناب شکیل بدایونی مرحوم کی غزلیں پیش کیں۔ سیکریٹری نے ...نظمیں سنائیں۔

ان طلباء کے بعد جناب اجمل اجملی صاحب اور جناب ...بمنی پیری صاحب نے اپنے بلند افکار سے بزم کو محظوظ ...رمایا۔ آخر میں مہمان خصوصی جناب پروفیسر جاوید وششٹ ...صاحب سے گذارش کی گئی کہ پہلے وہ اس بزم کے بارے میں ...پنے تاثرات کا اظہار کریں۔ پھر اپنے کلام بلاغت نظام سے ...سامعین کو سرفراز فرمائیں۔

جاوید صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے طلباء اور ...طالبات کو خطاب کرتے ہوئے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ "اردو زبان مٹنے والی زبان نہیں ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے خواص و عوام کی زبان کہتے ہیں۔"

تقریر کے بعد موصوف نے اپنی ایک نظم "للکار" سنائی۔ اس کے بعد دو غزلیں میر تقی میر کے رنگ میں سنائیں جنہیں سامعین نے بے حد پسند کیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے؎

رات کے مبہم سناٹے میں یادوں کی پرچھائیں میں
رو دے ہے رُت شبنم شبنم پیاسے نین بھگوئے ٹک

شعر و سخن کے شہ پاروں میں رنگ ابھی کچھ بھرنا ہے
اے فن کار تو اپنی پلکیں خون دل میں ڈبوئے ٹک

جاوید صاحب کی دونوں فکر انگیز غزلوں کو سامعین نے بے حد پسند کیا۔ آخیر میں بزم ادب کی صدر شاہدہ حسینی نے مہمان خصوصی جناب جاوید صاحب اساتذہ کرام اور طلباء و طالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اور پر تکلف چائے کے ساتھ یہ تقریب بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

مرسلہ مراد کرمانی (سیکریٹری بزم ادب)

## اپنے فنکار سے ملیئے کروڑی مل کالج میں۔

دلی کے کروڑی مل کالج میں ہر سال بزم ادب کسی شاعر کو بلاتی ہے اور طلبہ کو اس شاعر کے بارے میں مزید جاننے کا موقعہ فراہم کرتی ہے۔ یہ طرز یقینی طور پر ایک مفید اور کار آمد ہے۔ پچھلے سالوں میں جناب فرقت کاکوروی، شمیم کرہانی اور شہاب جعفری کو بلایا جا چکا ہے۔ حسب سابق امسال بھی دو مشہور شعراء جناب رفعت سروش اور جناب مخمور سعیدی کو بلایا گیا تھا۔ یہ تقریب ۱۱ رجنوری ۸۱ء کو تیجا کالج میں منعقد ہوئی ـــــ فنکشن کے آغاز میں ڈاکٹر کامل قریشی (لکچرار) نے بزم ادب کی غرض و غایت بتانے کے بعد جناب شبیہ احمد (صدر بزم ادب) سے مہمانان خصوصی کا خیر مقدم کرنے کو کہا۔ شبیہ احمد صاحب نے ہر دو شعراء کے بارے میں مختصراً حاضرین کو بتایا۔ پھر حاضرین اور شعراء کے درمیان دلچسپ سوال و جواب کے بعد یہ تقریب بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوگئی۔ ـــــ

مرسلہ، محمد ہارون کروڑی مل کالج دہلی۔

# شاہجہان

طالبعلموں کا۔ طالبعلموں کیلئے۔ طالبعلموں کے ذریعے

مارچ ۱۹۷۱ء

جلد ۵ ......... شمارہ ۳

قیمت ......... پچیس پیسے

سالانہ ......... تین روپے




شاہجہاں میں شامل افسانوں میں نام، مقام اور واقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مطابقت اجزائے مجلس بالکل اتفاقیہ ہے اس مطابقت کا ادارہ یا افراد ادارہ یا مصنف و مؤلف قطعی ذمہ دار نہیں

شاہجہان
آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل
AISNE.C
نئی دہلی کا ممبر ہے

## ہمارے مقاصد

طالب علموں
......... میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا
......... کو تخریب سے بچانا۔ تعمیر میں لگانا
......... کو ملک و ملت کی بامقصد خدمت کیلئے تیار کرنا
......... میں باہمی میل جول اور اتحاد کیلئے کوشش کرنا
......... کی آواز کو عوام تک پہنچانا
......... کو اخلاق تہذیب اور اپنی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا
......... اور
......... سماجی اصلاح کیلئے جدوجہد کرنا۔

......ادارہ......

شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے، نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے! اپنے نام کیساتھ اسکول و کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں

ادارہ




طابع۔ ناشر و مالک ......... محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ ......... علمی پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

مقام اشاعت:۔ قاسم جان اسٹریٹ بلیماران۔ دہلی نمبر ۶

## فہرست



---

شاہ جہاں علی

ہر چند شاہجہاں سیاسی جریدہ نہیں ہے مگر چونکہ اس بار الیکشن میں ہمارے بہت سے ساتھی اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال پہلی بار کریں گے اور موجودہ انتخاب درمیانی مدت میں ہونے کے باعث زبردست اہمیت کا حامل ہے اسلئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی صحیح راہنمائی کی جائے تاکہ مرکز میں جمہوری، سیکولر اور پائیدار حکومت قائم ہو سکے ———— ادارہ

ہندوستان میں اس وقت دو قوتیں ایک سرمایادارانہ اور فسطائی اور دوسری سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت کی علمبردار ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے نبرد آزما ہیں۔ ملک کے کچھ حصے میں سینڈیکیٹ کانگریس، ایس۔ پی۔ سوتنتر اور جن سنگھ نے متحد ہو کر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا ہے (ورکچھ سیٹوں پر یہ آپس میں ایک دوسرے کے مدِمقابل کھڑے ہیں) ان کے اس مرتبہ مورچے میں جن سنگھ کو ہی اہمیت حاصل ہے اور وہی اس نام نہاد اتحاد کی سربراہ ہے۔ اور اب یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ جن سنگھ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (R.S.S.) کا سیاسی بازو ہے اور جو جمہوریت پر کوئی یقین نہیں رکھتی اس طرح اس اتحاد سے ملک کا جو نقشہ سامنے ہو گا اس کو سمجھ لینا زیادہ دشوار نہیں

اگر انتہا پسند خواہ وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے ہوں برسرِ اقتدار آگئے تو ان کا نشانہ تہذیبی اور سماجی میراث، شریفانہ قدریں اور جمہوری نظام ہوں گے۔ اور اگر ایک مرتبہ بھی غیر جمہوری مزاج رکھنے والی قوت نے حکومت پر قبضہ کر لیا تو وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے پاؤں اتنے مضبوط جمالے گی کہ بعد میں اس کو آسانی سے نہیں ہٹایا جا سکے گا۔

یہ حقیقت ہے کہ آج کل ہمارا ملک بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ ہم کو ہی کرنا ہے کہ کیا ملک کو تباہی و بربادی کی نذر کر دیں —؟ کیا ان قوتوں کو برسرِ اقتدار آنے دیں جو جمہوریت کو پامال کر کے فسطائیت کو پھیلانا چاہتی ہیں —؟

ہر ذی ہوش ہندوستانی اسکا جواب یہ ہی دے گا کہ اس وقت ملک کو بچانے نیز خود کو ایک متوازن اور معتدل قوت کی حیثیت سے ابھارنے کے لئے سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت پسند قوتوں کا ساتھ دیں اور اپنا وزن اس پلڑے میں نہ رکھیں جس سے فسطائی قوت اور جمہوریت دشمن عناصر کو فائدہ پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

## یاد رکھیے:

اگر آپ نے آج طبقے، نسل اور مذہب کے نام پر سستے اور جذباتی نعروں کی رَو میں بہہ کر کوئی غلط فیصلہ کر دیا تو آنے والی نسلیں آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔

## جامعہ کالج بند

چند دنوں سے جامعہ کالج نئی دہلی کے کچھ طلبہ نے جو بظاہر خود کو طلبہ کا لیڈر سمجھتے ہیں اپنی بے تکی مانگیں پوری کرانے کے لئے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ ان کے مطالبات کی ایک لمبی فہرست ہے جسمیں نمایاں طور سے "یونیورسٹی یونین" کا مطالبہ ہے۔ مطالبات منوانے میں ان نام نہاد لیڈروں کی شدت اور ہنگامہ آرائی سے تنگ آکر شیخ الجامعہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تین ادارے جامعہ کالج۔ اسکول آف سوشل ورک اور انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ کو تا حکم ثانی بند کردیا ہے

اس تعطل کا اثر سب سے زیادہ فائنل کے طلبہ پر ہوگا۔ کالج بند ہوجانے کی صورت میں لازمًا امتحانات دیر سے ہونگے جو رزلٹ میں تاخیر کا سبب بنیں گے جس کی وجہ سے آگے داخلہ میں پریشانی یقینی ہیں۔

دوسری مانگوں سے قطع نظر یونیورسٹی یونین کے سلسلے میں ہم ان ساتھیوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کیا، یونین کے قیام سے ان کا معیار تعلیم اونچا ہوجائے گا۔ یا وہ اس کے حصول سے چاند فتح کرلیں گے ——— ہم جو کچھ ان کے اس عمل سے سمجھ سکے ہیں تو بس اتنا کہ یونین بن جائے، الیکشن ہوں، اور یہ تعلیمی انجمن جو دنیا بھر میں اپنی انفرادیت کے باعث عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اپنا وقار اپنی انفرادیت کھو بیٹھے اور یہاں کے اساتذہ بھی دوسرے اداروں کی طرح طلبہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائیں اور پڑھانے سے زیادہ جوڑ توڑ میں وقت لگائیں۔ اور طلبہ خود پڑھنے کی صعوبت سے بچ جائیں اور جامعہ کا تعلیمی معیار گر جائے۔

ہم اس وقت جہاں ان طلبہ کے اس فعل کو مذموم نظر سے دیکھتے ہوئے ان سے بے وقت کی راگنی کو نہ بجانے کا مشورہ دیتے وہاں جامعہ کے ذمہ داروں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ شرپسند طلبہ کے خلاف جلد اور سخت اقدامات اٹھائیں تاکہ جامعہ کی تاریخی انفرادیت برقرار رہے۔

## طلبہ کالج علی گڑھ بند

ایک اطلاع کے مطابق طبیہ کالج میں کچھ طلبہ نے کافی کشیدگی پھیلا رکھی ہے جسکی وجہ سے کالج کو غیر معینہ مدت کے لئے بند کردیا گیا ہے ——— ان لوگوں کا سب سے بڑا مطالبہ ہے کہ " پرنسپل کو فورًا الگ کیا جائے۔

ہم ان طلبہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ اگر ان کو پرنسپل صاحب سے کچھ شکایات ہیں یا (ان کی نظر میں) پرنسپل صاحب نے ان پر کوئی زیادتی کی ہے تو اسکا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ "پرنسپل ہٹاؤ" مطالبہ کردیا جائے بلکہ عقلمندی کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اپنے مطالبات اور شکایات پرنسپل صاحب کے سامنے رکھی جائیں اگر وہ اس پر توجہ نہ کریں تو اخلاقی دباؤ ڈال کر پرامن طریقے سے اپنی جائز شکایات اور مشکلات کو رفع کرانے کی کوشش کی جائے۔

ہم ان طلبہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ فرض کیجئے آپ کو موجودہ پرنسپل سے چھٹکارا مل بھی جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ آپ کو نئے پرنسپل سے اس قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوگی کہ آپ کو پھر پرنسپل ہٹاؤ مطالبہ کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

اس صورت میں ہمارا ان طلبہ کو مشورہ ہے کہ، وہ اپنے مطالبات پرامن اور انسانیت کے طریقے سے منوائیں ——— اور غلط اور نامناسب حرکات کرکے نہ صرف اپنا نقصان مت کیجیے بلکہ اس ادارے کے بانی سر سید احمد خاں کی روح کو تکلیف نہ پہنچائیے۔

●●

# ذوق کا رنگِ تغزل

ایس رحمان علی متعلم یونیورسٹی آف راجستھان۔ جے پور۔

غالب اور مومن کے ہمعصر ذوق دلی اسکول کے مشہور
شاعر ہیں۔ دلبستانِ دلی کی تاسیس میں ان کا اہم تعاون ہے
صلاح زبان کے سلسلے میں ان کی مساعی جمیلہ بڑی زبردست
ہے۔ انھیں اردو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اور وہ
زبان کے دھنی تھے۔ ذوق صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک
فنکار اور ایک صناع بھی تھے۔ انھوں نے روزمرہ کی زبان اور
محاورات کا استعمال بڑی ستھرائی اور سلیقہ مندی سے کیا
ہے۔ مغلیہ سلطنت کے آخری چشم و چراغ اور اردو کے
لاثانی شاعر بہادر شاہ ظفر اور زبان اردو کی ایک عظیم
شخصیت پروفیسر محمد حسین آزاد ان کے ہونہار شاگرد تھے۔

ذوق اس زمانے کے شاعر ہیں جب دلی میں شعر و
شاعری کا چرچہ غیر معمولی تھا۔ شاعروں کا بازار گرم اور
غزل کہنے کا رواج عام تھا۔ ذوق بھی ان مشاعروں میں
شرکت کرتے تھے اور اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں خوب
داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ ذوق چونکہ اپنی فطرت اور
طبیعت کے اعتبار سے نہایت سنجیدہ، متقی، خلیق اور
منسار انسان تھے۔ اس لئے ان کی شاعری بھی ان صفات
سے خالی نہیں ہے۔

ذوق کے کلام میں صرف اخلاقی مضامین ہی نہیں بلکہ
ان کا کلام فلسفہ، تصوف، حسن و عشق، شراب و ساقی
اور رند و واعظ کے تذکروں سے بھی خالی نہیں ہے۔ ان کے
اشعار میں مشاہدۂ عالم اور ذاتی تجربات کا بھی مذکور ہے۔
مضامین بلند پائے کے ہیں۔ لیکن انداز بیان میں روانی و رنگینی،
دل کشی و سحر آفرینی، تڑپ اور جوش و خروش کی کمی ہے۔ مگر
اس کے اسباب یہ نہیں ہیں کہ وہ زبان پر حاوی نہیں تھے،
ان میں خداداد شاعرانہ صلاحیتیں نہ تھیں یا ان میں آمد کی کمی تھی۔
اور وہ قصداً ہی شعر کہتے تھے۔ ذوق کے بارے میں ایسا کہنا
تو ان کو کم سمجھنے، ان کے کلام کا مطالعہ نہ کرنے یا ان کے مقابلے
میں کسی کی بے جا طرفداری کرنے کا ثبوت ہے۔ ہماری نظر میں
اس کی دو اہم وجوہ ہیں:-

پہلی وجہ یہ ہے کہ ذوق اصلاح سخن کے کام میں اسقدر
مصروف رہتے تھے کہ انھیں کچھ کہنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔
بہادر شاہ ظفر نہ صرف اپنے شعروں پر اصلاح ہی لیا کرتے تھے
بلکہ ذوق سے فرمائشی غزلیں بھی کہلواتے تھے۔ اور بقول
انوار الحسن صدیقی ”کہ بادشاہ کی استادی نے ذوق کے لئے
شاعری جیسی لطیف اور نازک چیز کو ایک بیگار بنا دیا تھا۔“
اس طرح ذوق نے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں اور عمدہ ترین
اوقات کا کریم ([illegible]) فرمائشی غزل کہنے اور مشورۂ
شعر و سخن دینے میں صرف کیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قصیدہ جو اردو شاعری کی دشوار
ترین اور مشکل ترین صنف ہے ذوق اس پر طبع آزمائی کرتے
تھے۔ سودا کے بعد ذوق ہی اردو کے ایک وہ شاعر ہیں جنہیں

ید ے اور غزلیات دونوں میں یکساں مقبولیت حاصل
ی۔ ذوق کی قصیدہ گوئی سے خوش ہو کر اکبر شاہ نے......
انی ہند" کا خطاب عطا کیا تھا۔ قصیدہ گوئی ذوق پر ختم
ی ہے اور وہ اس کے بادشاہ مانے جاتے ہیں۔
قصیدہ گوئی میں شاعر کی خارجی کاوشوں کو بڑا دخل ہوتا
۔ حقیقی جوش و جذبات کی کمی ہوتی ہے۔ شاعر نئی نئی بندشوں
ید ترکیبوں اور عجیب و غریب صنعتوں کی اختراع و ایجاد میں
شاعرانہ ادراک اپنا پورا زور اور ملکہ صرف کر دیتا ہے۔ شاعر
یہ تلاش و تجسس اور کوشش و کاوش واقعی قابل ستائش اور
ق تحسین ہے۔ لیکن اس میں عوام اور سماج کے کثیر التعداد
ہ کے لئے کوئی خاص انٹرسٹ (INTEREST) نہیں ہوتا
ں لئے قصائد کی وقعت ایک شاعرانہ مشق سے زیادہ نہیں ہوتی
ید ے کی غیر مانوس زبان، لفظی شان و شوکت اور مبالغہ
ائی شعر کی افادیت کو کم کر دیتی ہے۔ اور اشعار بے اثر ہو کر
دیف قافیہ کے سوا کچھ نہیں رہ جاتے۔ قصیدے کی ان....
صوصیات نے اور ذوق کی طبع آزمائی نے خود ذوق کے رنگ
زل کو بہت متاثر کیا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود اگر ہم دیوان
ق کا طائرانہ جائزہ لیں تو ہمیں ایسے بیش بہا اشعار جا بجا بہت
ی تعداد میں مل جائیں گے جو درد و اثر، شاعرانہ صداقت اور
ساختگی سے خالی نہیں ہیں اور جن میں طرز بیان کی حسن و خوبی،
فاظ کی سادگی اور عام فہمی، روانی و سلاست، خیالات کی
مت وحدت، تجربات کی وسعت اور مشاہدۂ کائنات کی
ق موجود ہے۔
ذوق حالانکہ متقی اور خدا ترس انسان تھے لیکن انھوں
اعری کی روایات کو انھوں نے پوری طرح برقرار رکھا ہے
ر ذوق کی غزلوں میں خمریات نہایت شوخ اور دلفریب انداز
جلوہ گر ہے ؎

اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

دختر رز نے وہ انداز دکھائے سر بزم
رات یاروں کے تو یاں غسل وضو ٹوٹ گئے

ساقیا بادہ کشی میں کٹی ساری برسات
جھوٹ پیمان میرے سب اب کی بر صفت ٹوٹ گئے۔

شور قلقل یہ کیوں ہے دختر رز
کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے۔

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی
باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں۔

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا۔

نہ اٹھیں شور قیامت سے بھی وہ مست ہیں ہم
کہیے جب تک کہ نہ تم قم لیبد مینا ہم کو۔

ذوق ہے ایک رند شاہد باز
اس کو کیا دخل ہے پارسائی میں۔

مشرقی محبوب بڑا کج ادا اور بیداد گر ہوتا ہے۔ اور اس کے برعکس عاشق بے حد وفادار اور اپنے محبوب کے تئیں نہایت صادق ہوتا ہے۔ محبوب کی سخت مزاجی اور مسلسل بے اعتنائی کو عاشق بسر و چشم سہتا ہے۔ اور اگر وہ قتل بھی کرنا چاہے تو عاشق نہایت مؤدبانہ انداز سے اس کی تیغ تیز کے سامنے سر تسلیم خم ہو کر بخوشی شہید ہونا قبول کرتا ہے۔ عاشق شہادت کے اس درجہ کا بے حد متمنی ہوتا ہے۔ دیکھئے ذوق نے ایک شعر میں کس خوبی انداز سے بار بار اس درجۂ شہادت کو حاصل کرنے کے لئے عاشق کی حسرت و آرزو کی ترجمانی کی ہے ؎

مکتب عشق میں ہو کاش تناسخ ہی سہی
کہ اٹھائیں ترے سر بار شہادت کے مزے۔

اگر اتفاقاً یا قصداً محبوب سے یہ غلطی سرزد ہو گئی کہ اس نے کسی غیر کو مار دیا تو اس کے قتل پر رشک کر کے ذوق نے اس مضمون کو کس حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

محبوب کی پیہم بے نیازی اور بے توجہی عاشق کا دل توڑ دیتی ہے اور پھر اس کے علاوہ بے بس عاشق کے پاس چارہ بھی کیا رہ جاتا ہے کہ وہ شکوہ شکایت کرے اور یاس و حسرت میں

کھلتا رہے۔ اس کی ترجمانی ذوق نے ان اشعار میں کی ہے ؎

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا۔
کیا جانے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں رات کو تنہا نہیں آتا۔
آتا ہے تو آ جا کہ کوئی دم کی ہے رخصت
پھر دیکھئے آتا بھی تو ہم یا نہیں آتا۔
تم بھول کر بھی نہیں یاد کرتے ہو کبھی
ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے۔
مشکل ہے میرے عہد محبت کا ٹوٹنا
اے دغا یہ تیری خدا کی قسم نہیں۔
لکھئے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا۔
آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا۔
جانِ شیریں بھی گئی اور نہ ملی شیریں بھی
پوچھ فرہاد سے اس تلخیٔ حسرت کے مزے۔

آخیر کے دو شعروں میں مجنوں کی لاچاری کمزوری اور بےبسی کا بیان دیکھنے کے قابل ہے۔ اور فرہاد کی تلخیٔ حسرت تڑپا دینے والی ہے۔ اسی طرح عاشق کے عہد محبت کی استواری اور معشوق کے عہد و پیماں کی ناپائیداری کا بیان بالکل جدید ہے۔

یہ زندگی کس قدر مختصر اور ناپائیدار ہے۔ دنیا فانی ہے۔ کائنات کی ہر چیز ختم ہونے والی ہے۔ اور اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی۔ لیکن پھر بھی حیات سے رغبت اور ممات سے نفرت آدمی کی فطرت ہے۔ ذوق انہیں فلسفے اور تصوف کے مضامین کو عام فہم اور سیدھے سادھے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے۔
ایک دم عمر طبیعی ہے یہاں مثل حباب
شکر امروز ہے نے کچھ غم فردا ہم کو
یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے۔
کیا بگولے کی طرح خاک کا پتلا اے ذوق
اڑتا پھرتا ہے بھری جب سے ہوا ہے اس میں۔
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے۔
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے۔

اسی طرح پیری و شباب، ہجر و وصل، کشتی و ناخدا، قفس و گلزار اور صیاد و شکار وغیرہ کے مضمون، جذبات کی تڑپ جوش و خروش کی بے ساختگی، زبان و بیان کی حلاوت و ملاحت اور ترنم کی سحر خیزی و کیف آفرینی کے ساتھ جلوہ فگن ہیں ؎

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں۔
ایکدم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امیدِ وصل میں گوارا ہو گیا۔
احسان ناخدا کا اٹھائے میری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں۔
یاد آیا جو اسیرانِ قفس کو گلزار
مضطر ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے۔
لو گرفتارِ قفس گر یونہی تڑپے صیاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے۔
نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔
لگ گئی آنکھ جو سودے میں تیری زلفوں کے
شب سیاہی نے کئی بار دبایا مجھکو۔
جاتی رہی زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے
افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا۔
ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح ہمیں رونا نہیں آتا۔

دیکھ اس چشم مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے۔

آدمی جب ایام کی گردشوں سے گھبرا جاتا ہے اور اسے کسی پہلو چین نہیں ملتا تو وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ "مجھے موت دیدے" یہ تمنا اس لئے کرتا ہے کہ اس کے خیال میں ... کی زندگی یہاں کی زندگی سے بہتر ہوگی۔ اس "مثالی عالم" (UTOPIA) کے تصور نے آدمی کو تسلی و تشفی کے کچھ لمحات بخشے ہیں۔ لیکن ذوق بڑے دور اندیش ہیں ان کو اس (UTOPIA) میں حاصل ہونے والے سکون و اطمینان پر شک ہے۔ وہ بلا تردد کہتے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہمیں چین نہ ملا اور ہمارا جی نہ لگا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ سوال شاعر کو پریشان کئے دیتا ہے۔ اور ذوق بڑی یاس و حسرت کے ساتھ شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔

شاعر کیسا ہی متقی اور پارسا ہو وہ بنت العنب کی تعریف اور واعظ و ناصح کی ہجو کرتا ہی ہے۔ یہ باتیں اردو شاعری میں روایات کا مقام حاصل کر چکی ہیں۔ اور اس کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بے حد لازمی ہے۔ غالب نے بھی اس سلسلے میں بے ساختہ کہا ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔

ذوق نے بھی باوجود خدا ترس ہونے کے واعظ کی شخصیت پر سخت طنز کیا ہے

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے شہوت پرست ہے۔

الاماں والحفیظ! ذوق کی شخصیت اور زاہد پر ایسا وار! جذبات کی ایک تیز رو ہے۔

ذوق جو مدرسے کے بگڑے ہوئے ہیں ملا
ان کو مے خانے میں لے آؤ سنور جائیں گے۔

یہاں ذوق نے نہایت شائستگی اور قادر الکلامی سے کام لیا ہے۔
ذوق کے اس مختصر کلام پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہم انوار الحسن صدیقی صاحب کے اس جملے کی تائید بجا طور پر کر سکتے ہیں کہ

ذوق ہماری شاعری کے لئے وہ کچھ کر گئے جو سب سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ روزمرہ کا استعمال اور محاورات کی برجستہ SETTING ذوق کی اپنی انفرادی شان ہے۔ ان کا اسلوب بیان سو فیصدی اردو ہے۔ بول چال کی عام فہم زبان میں گہرے، پاکیزہ اور بلند خیالات کو بیان کرنا انہیں کا فن ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ شاعر ہونے کے ساتھ بڑے فنکار اور صناع بھی ہیں۔ یہی خصوصیات ذوق کو اپنے ہمعصروں میں منفرد کرتی ہیں۔ اردو زبان کے سلسلے میں ذوق کے کارنامے تاریخ زبان اردو میں حروف زریں سے تحریر کئے جائیں گے۔

* * * * *

## لطائف

شاہدہ ادریس دہلی۔

- ایک فرم کے مالک نے اپنے دفتر کے تمام کمروں کی دیواروں پر تختی آویزاں کر دی جس پر لکھا تھا۔ "جو کچھ کرنا ہے ابھی کر لو۔" ایک ہفتے بعد اس کے دوست نے پوچھا کہ ملازمین پر اس کا کیا اثر ہوا؟ فرم کے مالک نے جواب دیا! منشی جی تیس ہزار روپے لے کر بھاگ گیا۔ تین کلرکوں نے اپنی تنخواہیں فوری بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ اور ایک چپراسی نے تو حد ہی کر دی۔ اس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے ساز باز کی اور سیف کے راز اگل دیئے۔
- خبریں پڑھتے پڑھتے نیوز ریڈر کو محسوس ہوا کہ وہ خبر کو غلط پڑھ گیا ہے۔ ایسے موقعوں پر نیوز ریڈرز معذرت طلب کرتے ہیں اور خبر دوبارہ پڑھ دیتے ہیں۔ لیکن اس دن خبر کو غلط پڑھنے کے بعد نیوز ریڈر نے جو فقرہ پڑھا وہ تھا "معاف کیجئے میں اس خبر کو پھر سے غلط پڑھتا ہوں۔"
- ریڈیو پر اقبال بانو کی آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا۔

" دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔"

گانا ختم ہوا تو اناؤنسر نے ایک نعرہ نشر کیا۔ "سڑکوں پر گندگی مت پھیلائیے۔"

شاہ جہاں دہلی

# ولی کی دکنی شاعری کی خصوصیات

مرزا اطہر بیگ بی۔ اے۔ آنرز۔ اینگلو عربک (؟) ذاکر حسین دلی کالج۔ دہلی۔

ولی نے تمام مروجہ اصناف سخن میں اپنا کمال شاعری دکھایا۔ بحیثیت شاعر ولی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے دور کے تمام ادبی فکری معیاروں کو اپنی شاعری میں سمویا بلکہ بیان کی لذت اور زبان کی تعمیر کا اعجاز دکھایا۔ اور اسی میں ولی کی کرامات کا راز پنہاں ہے۔ تصوف اس زمانے کی فکری اور اخلاقی بلندی کا معیار تھا۔ وحدت الوجود کا عقیدہ جذبہ اور سلوک اور معرفت کے لئے واحد بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ ولی کے بعد تیرھویں صدی ہجری تک میر و سودا کے آخری عہد تک یہی نظریہ مذہب نے بھی اسکو صرف اپنی زندگی میں برتا بلکہ اپنی شاعری میں بھی اس خوبی سے اظہار کیا کہ ان سے پہلے کسی نے اردو میں اتنی کامیابی سے نہیں برتا تھا۔ چونکہ وحدت الوجود کے نظریہ کے مطابق صرف ذات باری کا ہی وجود حقیقی سمجھا جاتا ہے۔ اور ماسوائے اللہ کا وجود محض ذہنی اور اعتباری ہے۔ اس لئے دنیا کی بے ثباتی زندگی کی بے اعتباری وغیرہ کے مضامین ولی کے یہاں بھی بہت خوبی سے ملتے ہیں۔

اس تصوف میں چونکہ قرب الہٰی کا درجہ عشق ہے اس لئے عشق ہی ہر جگہ ہر ایک رگ و پے میں ملتا ہے۔ ولی کا دل اور دماغ دونوں وسیع تھے اس لئے جہاں انھوں نے دنیا کے کاروبار پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے وہاں عشق کے معاملات میں بڑے سوز و گداز سے کام لیا ہے۔ اور اپنے فن کو بڑی خوبی اور کامیابی سے نبھایا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی ولی کی مدح سرائی کئے بغیر نہ رہ سکے۔

تصوف بھی عجیب طریقۂ نظر ہے۔ ایک طرف تو اس میں تخیل ادراک دل اور دماغ سب کو روحان انگیز تسلی ہوتی تھی۔ ہر حقیقت میں حسن ہی نظر آتا تھا۔ دوسری طرف اس کے ساتھ ہی فن جمالیات یا مذاق و معیار کی بھی تربیت ہوتی تھی۔ بصارت اور بصیرت دونوں موج کوثر و تسنیم میں ڈوبے رہتے تھے۔ اس لئے جہاں مضامین بھی دلگدازی کے ہوتے تھے وہاں فن شاعری بھی ترقی کرتا تھا۔ ظاہر و باطن معنی و لفظ میں جب ایک سلیقہ آجاتا ہے تو وہی ادب کلاسیکل ہو جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ولی کے یہاں کلاسیکل ادب کی پوری شان ملتی ہے۔ پختگی اور اقدار انکلامی ان کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تصوف میں کیونکہ نظر اندر کی طرف رہتی ہے اس لئے ہمیشہ جزو میں کل قطرے میں دریا دل کے آئینہ میں دنیا کا تماشہ دیکھا جاتا ہے۔ اور اسی لئے ایسی شاعری شاعری ہمیشہ داخلی ہوا کرتی ہے۔ اگر کبھی انکی نظر خارجی کو دیکھتی بھی ہے تو وہاں بھی انھیں حسن ہی نظر آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ غزل کا اپنا اصل میدان ہے۔ احساسات اور واردات کی دنیا انکی اپنی دنیا ہے۔

لیکن کیونکہ موضوع اور طریقہ اظہار کے باب میں ولی کو کوئی خاص اجتہاد نہیں کرنا پڑا۔ اساتذہ کا کلام ان کے پیش نظر تھا سخن آفرینی کا کام معیار فکر و نظر کا پورا مذاق ان کے طرز کے تمام اسرار انھیں بآسانی ستعار مل گئے۔ ولی ان کے

نتے میں کامیابی اس لئے ہوئی کہ وہ خود صوفی اور صاحب دل
،۔ البتہ انھوں نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ تشبیہ و استعارہ
تلمیحات میں اردو زبان میں ہندی عنصر کو نہیں بھولے ہیں۔ کبھی کبھی
عشوق کی رعایت سے الفاظ بھی مونث برت جاتے ہیں۔ صنائع
ئع کا استعمال اس زمانے کے مذاق کے مطابق بہت ہے۔ لیکن
ئع بدائع کے لئے شاعری نہیں کرتے۔ اور کوشش یہی کرتے ہیں کہ
کا استعمال آمد کے سلسلے میں معلوم ہو۔ صاحب کیف بھی اس
بعض غزلوں میں مضمون مسلسل مل جاتا ہے۔ طبیعت میں ترنم
ر چھوٹی بحر کی غزلیں بڑی لطیف اور بامزہ ہیں اور پڑھنی
ب لکھی گئی ہیں حسب ذیل کے اشعار سے واضح ہو جائیگی ؎

عشق میں لازم ہے اول ذات کو خالی کرے
ہو فنا فی السمد دایم یاد یزدانی کرے

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ل بہتر ہے عشق بازی کا۔ کیا حقیقی و کیا مجازی کا

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کو لگاتے جا

سلونے سانورے پیتم ترے موتی کی جھلکاں سے
کیا مقدھ بکوں خراب آہستہ آہستہ

کی شخصیت اور اس کے کلام کی اہمیت اس طرح اور بڑھ
، ہے کہ انھوں نے اردو شعر و ادب پر اسقدر زیادہ اثرات
ئے ہیں کہ ان کی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے۔ چنانچہ ولی کا کلام
زبان و خیالات کا وہ آخری نقطۂ ارتقا تھا جسے تاریخ
سے طے کر رہی تھی۔ دکن میں حالانکہ غزل گوئی پہلے سے موجود
۔ وجہی۔ غواصی۔ نصرتی۔ شوقی۔ ہاشمی اور سلطان قلی۔۔۔
، شاہ وغیرہ کی غزلیں بہت دستیاب ہوئی ہیں۔ لیکن ان کی
دکنی اور ہندی زیادہ ہے لیکن اردو کم ہے۔ اس لئے وہ دن میں
نت نہیں آسکتی جس نے ولی کو مقبول بنا یا۔ ولی کے کلیات
ہے اشعار کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ آج کل کی مروجہ زبان
ن میں ایک دو لفظوں کی تبدیلی سے موجودہ زبان بن سکتی
، لحاظ سے ولی کا اثر دکن کی شاعری پر مسلم ہے ۔

شمالی ہند میں ولی سے پہلے بھی دکن کے شعراء کی غزلیں یہاں
آیا کرتی تھیں۔ لیکن زبان کی نا مانوسیت کے باعث کبھی مقبول عام
نہ ہو سکیں۔ ولی صاحب دہلی جب پہلی بار تشریف لائے تو یہاں وہی
فارسی گوئی کا چرچا تھا۔ بیدل۔ آرزو۔ فراق۔ ندیم۔ درد اور
فطرت وغیرہ فارسی ہی میں غزلیں کہتے تھے۔ اور شعر و سخن کی محفلیں
گرم کرتے تھے۔ ارباب طرب اور اہل نشاط شاہانہ مجلسوں
اور درویشوں کی محفلوں میں حافظ۔ خسرو۔ اور دیگر شعرائے فارسی
خصوصاً شعرائے متاخرین کے کلام سے کام لیتے تھے۔ لیکن زبان
بن چکی تھی البتہ اس میں اظہار کی صلاحیت کا کامیاب مظاہرہ ابھی
تک نہ ہو سکا تھا۔ کسی سے جعفر زٹلی یا اٹل بلگرامی محض ظرافت کی
خاطر فارسی اور ہندی کا بے تکا پیوند لگا لیا کرتے تھے۔ بعض جگہ
شمالی ہند میں یہ پیوند کاری سنجیدگی سے بھی کی جاتی تھی۔ لیکن اس میں
افعال و حروف ربط فارسی کے لائے جاتے تھے اس لئے اسکا
چلن عام نہ ہو سکا اور نہ اس قسم کی شاعری عوام میں مقبول
ہو سکی۔ میر تقی میر تو اس قسم کی ریختہ کو قبیح کہتے ہیں۔ ولی نے
جب اپنی غزلیں اس زبان میں سنائیں جو عوام سے لیکر خواص
تک میں آسانی سے سمجھی اور بولی جاتی تھی اور پھر اس زبان میں
قادر الکلامی اور پختگی کی وہی شان دکھائی جو فارسی شعرا کے
یہاں ملتی تھی جس کے خواص گرویدہ تھے۔ وہی تصوف کی لطیف
موشگافی وہی عشق کی دل گدازی اور پھر اس کے ساتھ صنائع
بدائع کا اصلی فنکارانہ معیار جو متاخرین شعرا فارسی کے ہاں پایا
جاتا تھا تو اس نے شمالی ہند کے شعر و ادب اور موسیقی کی دنیا
میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ دلی کی گلیوں میں ہندی گیتوں
کے بجائے شیریں نغمے گونجنے لگے۔ عوام کے مذاق کی وجہ سے ترنم
میں ایک نئے فیشن نے جگہ پائی۔ عوام سے گذر کر خواص میں یہ
اثر پیدا ہوا کہ اردو میں غزل گوئی فوراً شروع ہو گئی۔ دیوان
بننے لگے اور اردو شعر و شاعری کا عام رواج ہو گیا۔

شمالی ہند میں عموماً اور دلی میں خصوصاً اردو غزل گوئی
کا رواج ولی ہی کی بدولت شروع ہوا۔ یہ ولی ہی کی کرامت
تھی کہ غزل گو شعرا کا ایک طبقہ دہلی میں پیدا ہوا تھا۔
آبرو۔ مضمون۔ شاکر ناجی اور یکرنگ وغیرہ اس طبقے کے

شاہ جہاں دہلی

خاص شاعروں میں سے ہیں رہیں۔ لیکن ان لوگوں نے ایک غلطی یہ کی کہ اپنی شاعری کی بنیاد ایہام پر رکھی ان کا خیال تھا کہ عام طور سے صنائع بدائع اور خاصکر ایہام گوئی کا التزام ہی مستند اور پختہ شاعری کی دلیل ہے۔ ہندی کے دوہوں کی بدولت ایہام گوئی کا اس قدر اثر اور فیشن ہوگیا تھا کہ ہندوستانی فارسی شعراء کے کلام میں بھی یہ صنعت کثرت سے استعمال ہونے لگی اس لئے ولی کی شاعری کی قادرالکلامی کا راز بہت کچھ اس قسم کی صلاحیت میں مضمر سمجھا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ ولی کے یہاں دوسرے صنائع کے ساتھ یہ صنعت بہت کافی استعمال میں لائی گئی ہے مثلاً ؎

مذہب عشق میں تیری صورت
دیکھنا ہمکو فرض عین ہوا۔

ہے نقش کناری کا تیرے جامے کے اوپر
دامن کو تیرے ہاتھ لگا کون سکے گا۔

لیکن ان لوگوں کا ولی کی عظمت اور قادرالکلامی کا راز اسی میں مضمر سمجھ لینا یقیناً غلطی تھی۔ ولی کے کلام کی شہرت کا باعث بھی اسی قسم کے صنائع بدائع کے استعمال کو سمجھا۔ لیکن ولی کے ان شعری و ادبی اثرات کے علاوہ ولی کی اپنی ایک خاص روش بھی تھی اور یہ وہی دلبستان تھا جسکا اس عہد کا تمدن آئینہ دار تھا تصوف نے ممکن ہے سوسائٹی میں امرد کا ایک طبقہ پیدا کر دیا ہو لیکن شعر و ادب میں اس نے پاک بینی کو قائم رکھا۔ ولی کے کلام میں ہندی کی گھلاوٹ اور رس بھی ہے اور فارسی کی شیرینی بھی اور قادرالکلامی بھی۔ لیکن پاک نظری کی بھی خاص روش تھی۔ یہ بہت عرصے تک قائم رہی۔ جب تک دلی برباد نہیں ہوئی دلی کا تمدن برقرار رہا۔ خان آرزو۔ میر۔ سودا۔ درد۔ قائم اور اثر تک یعنی پوری بارہویں صدی ہجری تک ولی کی یہ کوشش برقرار رہی۔ لیکن جب دلی تباہ ہوگئی اور شعر و شاعری کا مرکز لکھنؤ میں منتقل ہوگیا تو یہیں سے وہ دور بھی ختم ہوگیا جسے دلی کا دلبستان کہہ سکتے ہیں۔ انشا اور جرأت کا زمانہ وہ پہلا دور تھا جس نے اس طہارت کو توڑا اور اپنے جذبات کی رو میں بے وضو ہوگئے۔ لیکن ولی کا اثر محض تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اس کے کلام میں دو ستر بھی ہیں جو ہاد بود زبان کی خرابیت کے ہمیشہ دلوں پر کھٹکتے رہیں گے۔

آخیر میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ولی نہ صرف شاعر تھا اسکے دیوان میں جا بجا ایسے مقامات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اہل علم میں سے تھا۔ عربی نظم و نثر کے شاہکار ہی اس کے مطالعے میں نہ رہتے تھے علوم پر بھی اس کی نظر تھی۔ کلام کے اتار چڑھاؤ کو وہ خوب جانتا تھا۔ یہ بھی سمجھتا تھا کہ لفظوں کے ہیر پھیر سے شعر میں کیونکر جان پڑ جاتی ہے۔ یہ بات اصل نہیں ہوئی جب تک کہ شاعر صحیح و فصیح کو نہ پہچانے اور شعر کے فن کو نہ جانے۔ ولی کے کلام سے ہم شعر اور زبان دونوں کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اگر اس زمانے کی زبان سے واقف ہونے کی پوری کوشش کریں۔

* —— * —— * —— * —— *

## انشاءِ فارسی

صفحہ ۳۱ سے آگے.

اَمری کہ بظاہر خالمانہ جلوہ می کند برای ما یکدنیا نفع منظور شدہ است و علاج زندگی مادر اینست کہ پندہای آنان را آویزۂ گوش سازیم و با جان و دل بکار بندیم۔
کسانی در زندگی سعادتمند میشوند و بہ آرزوہای طلائی خود میرسند کہ پند بزرگتران خود را بشنوند و طبق گفتۂ آنان عمل کنند و قتیکہ آنہا عمر جوانی خویش را در پای ما گذاشتہ و در راہ پرورش ما از ہیچگونہ جد و جہدی فرد گذاری نکردہ اند آیا ناجوانمردی نیست کہ تمایلات آنا نرا نادیدہ گرفتہ و طبق دلخواہشان رفتار نکنیم؟
درخت را میکارند تا در سایہ اش بنشینند یا از میوہ اش استفادہ کنند و حیوانات را پرورش میدہند تا از پشم و پوست و شیر و گوشت آنہا استفادہ نمایند یا برآنہا بار بنہند آیا ما انسان ہا از درختہا و حیوانات کمتریم؟ آیا ما نبایہ در روزگار پیری پدر و مادر خود، عصای دست آنہا بشویم؟

یوسف قریشی ۔ دتی کالج دہلی۔

چھوڑ دیں ساری باتیں میں نے
توڑ دیے سب رشتے ناطے
اب تو بس ایک تنہائی میں
یاد تجھے میں کر لیتا ہوں
جب بھی آنکھیں بند کر لیتا ہوں
سامنے تو آجاتی ہے
بھولی بسری یادیں اکثر
میرے بند کمرے میں آکر
مجھ کو خوب ستاتی ہیں
صبح سویرے باغ میں اکثر
میں نے تجھ کو دیکھا ہے
تو تتلی بن کے پھرتی ہے
میں ترے پیچھے پھرتا ہوں
شام کو جب سورج چھپتا ہے
تو جانے کہاں کھو جاتی ہے
رات کا جب آنچل ڈھلتا ہے
میں خواب ترے دیکھا کرتا ہوں
میں تجھ کو بھول چکا ہوں ۔!
پھر یاد تری کیوں آتی ہے ؟

جعفر عسکری
الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

بس وہی اس برس بھی ہوا
ابر آئے برس کر چلے بھی گئے
خشک دریاؤں میں۔
بوڑھا سیلاب آکر گذر بھی گیا
یوں ہوا
جیسے فوج ستمگر کسی خوشنما شہر کو
کرکے تاراج واپس ہوئی
بس اسی طرح سے اس برس بھی ہوا۔

# ہم نے افسانہ لکھا

شیخ عرفان تبسم

مزاحیہ

ایک دن دوپہر کے کھانے کے بعد جب ہم قیلولہ کے لئے لیٹے تو ہمارے ذہن میں ایک خیال ابھرا کیوں نہ ہم بھی افسانہ نگاری شروع کردیں کیونکہ نوکری کی طرف سے تو ہم بالکل ہی مایوس ہو چکے تھے اور مستقبل قریب میں نوکری کی کوئی امید نہ تھی۔ ہم نے سوچا کہ افسانہ نگاری تو بغیر پھٹکری کے چوکھا رنگ دے سکتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا کاروبار شروع کرنے کے لئے کم از کم ہزار بارہ سو روپے چاہییں اور نوکری کے لئے دفتروں کی خاک چھاننا پڑتی ہے وقت صرف کرنا پڑتا ہے چپڑاسیوں اور کلرکوں کے بدلتے تیور دیکھنے پڑتے ہیں اور اس کے برعکس افسانہ نگاری میں نہ کوئی محنت ہے اور نہ کوئی پریشانی اسی وجہ سے ہر پانچواں اردو داں شخص افسانہ نگار یا شاعر ملے گا۔

ہمارے اکثر دوست بھی شاعر اور ادیب ہیں (یہ بات دیگر ہے کہ انکی کوئی تخلیق ہماری نظر سے تاہنوز نہیں گزری) اس کے علاوہ جب بھی کبھی انھوں نے نئے لوگوں کو متعارف کرایا ہے یہ ہی کہا ہے کہ "یہ بہت اچھے شاعر یا ادیب ہیں۔"

آج جب ہم ایک نئے ادیب سے ملے تو ہمارے ذہن میں دوپہر والا خیال عود کر آیا اور ہم سوچنے لگے کہ جس کو دیکھو افسانہ نگار جس سے ملو شاعر پھر ہم ہی کیوں اس سعادت سے محروم رہیں اور کیوں نہ ہم بھی افسانہ نگاری کو اپنا لیں۔

نز... ملنے پر ہم قلم اور سادے کاغذوں کا دستہ لے کر بیٹھ گئے۔ آدھ گھنٹے تک تو قلم ہاتھ میں پکڑے اسطرح بیٹھے رہے جیسے ہم کسی فوٹوگرافر کی دکان پر پہنچ گئے ہوں اور وہ کیمرے سے آنکھ لگائے ہمارے خاص موشن کا انتظار کر رہا ہو۔ آدھ گھنٹے تک ساکت وجامد بیٹھ کر دماغ پر زور دینے کے باوجود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھیں تو کیا لکھیں۔ تھوڑی دیر کیلئے قلم وہ ایک طرف کو رکھ ہم صحن میں ٹہلنے لگے اور افسانے کا خاکہ ذہن میں ترتیب دیتے رہے۔ سوچتے سوچتے ہمیں اپنے ایک افسانہ نگار دوست کی ایک بات یاد آگئی انھوں نے ایک تھا "یار افسانہ لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہر اتوار کو جو کباڑی بازار لگتا ہے وہاں سے لاؤ اور ان کے افسانے یا تو جوں کے توں اپنے نام سے دے اور یا اُنکے پلاٹ چرا لو۔ آجکل کے تمام افسانہ نگار یہ تو کرتے ہیں ——" ہم نے سوچا بات تو کچھ جچتی سی معلوم ہوتی ہے مگر دوسرے ہی لمحہ یہ خیال آیا کہ اگر کسی افسانہ نگار کو یہ معلوم ہوگیا کہ میرا افسانہ یا پلاٹ چرایا ہوا ہے تو ناحق پریشان ہونا پڑے گا۔ وہ تو ٹھیک ہے کہ آج کل سب ہی ادیب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں لیکن ہم کیوں اس کشتی میں سوار ہوں جسکے ڈوب جانے کا خطرہ ہو۔ ہم نے ... کرلیا کہ افسانہ لکھیں گے تو خود اپنا ورنہ نہیں لکھیں گے

ہمارے ذہن میں ایک نیا خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آیا کہ ہمارے محلہ میں جو لڑکی چار کے ساتھ بھاگا تھا اس کے بارے میں ہو بہو وہی کہانی لکھ دیں تو بہت شاندار افسانہ بن جائے گا۔ رہا کسی اعتراض کا سوال تو ایڈیٹر حضرات ...

صفحے پر لکھ دیتے ہیں" اس شمارے میں شامل تمام افسانوں میں نام، مقامات اور کردار قطعی فرضی ہیں۔۔۔ وغیرہ وغیرہ — تو اس طرح کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور بہت ممکن ہے کہ افسانہ اچھا ہونے پر کوئی انعام بھی مل جائے پھر اس پیسے سے اپنا کوئی پرائیویٹ کام کریں گے اور افسانہ نگاری کو محض شوق کے طور پر ہی استعمال کریں گے۔

اسی ادھیڑ بن میں شام ہو گئی ہم نے سوچا ایک کپ چائے پی لیں پھر افسانہ لکھیں گے۔ حاکمانہ انداز سے بہن کو چائے بنانے کا آرڈر دے کر ہم بازار چلے گئے۔ سوچا تھا آ کر چائے پی لیں گے گھر آئے تو چائے کا دور دور پتہ نہ تھا ہماری بات سنی ان سنی کر دی گئی تھی ہماری بات گھر میں صرف اسی وقت چل سکتی تھی جب ہم کچھ کما کر اماں جی کو دیتے۔ ہمیں غصہ تو بہت آیا مگر چائے کی بجائے اسی کو پی کر افسانہ لکھنے بیٹھ گئے۔ کچھ دوست ملنے کیلئے آئے لیکن ہم نے کہلوا دیا کہ "وہ" یعنی ہم بذات خود گھر میں حاضر نہیں ہیں اور خود افسانہ لکھنے میں محو ہو گئے۔ ابھی لکھنا بھی شروع نہ کیا تھا کہ خیال آیا کہ پہلے افسانے کا کوئی عنوان تو تجویز کر لیں۔ اچھے ادیب پہلے افسانے کا خوبصورت سا عنوان منتخب کرتے ہیں پھر افسانے کا خاکہ بنا کر لکھنا شروع کرتے ہیں۔ ویسے افسانہ مختصر ہی لکھنا چاہیئے کیونکہ رسالوں کے مدیر حضرات لمبا افسانہ چھاپنے سے احتراز برتتے ہیں اور چھوٹے افسانے کو فوراً چھاپ دیتے ہیں۔

اب سوال یہ تھا کہ افسانے کی ابتداء کیسے اور کہاں سے ہو۔ منظر کشی سے افسانہ لکھنا کوئی آرٹ نہیں ہے ویسے آجکل ہر کس موسم اور ہوا کے متعلق ایک آدھ پیراگراف لکھ کر فضول طویل کر دیتا ہے۔ افسانے کی تمہید کسی فقرے یا کسی مکالمے سے ہونی چاہیئے۔ سگریٹ اور اس کا دھواں افسانے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ اگر ہم نے افسانے میں سگریٹ کا حوالہ دیا تو ہو سکتا ہے کہ بھائی جان کو ہم پر شک ہو جائے اور وہ سچ مچ سمجھنے لگیں کہ ہم سگریٹ پیتے ہیں۔ ہم افسانے میں اپنے دوست کا ذکر بھی تو کر سکتے ہیں ارے ہاں یہ ٹھیک ہے ہم اپنے افسانے میں اپنے دوست اور اسکی محبوبہ کا ہی حوالہ دیں گے اور وہ رسالے میں اپنا نام دیکھ کر خوش ہو جائے گا پھر ہماری عزت بھی کرے گا۔

پہلے تو وہ اگر ہوٹل میں چائے یا ناشتے کا منتظر ہوتا تھا اور ہم کو آتے دیکھ لیتا تھا تو ہنستے ہوئے ہوٹل سے باہر آ جاتا اور کہتا "یار اخبار دیکھنے ہوٹل میں بیٹھ گیا تھا یہ ہوٹل اس قابل ہی نہیں کہ اسمیں چائے پی جائے۔ یہ کہتے ہوئے وہ ہمارے ساتھ دس قدم تک چلتا تھا مگر اب تو وہ ہم کو بھی اپنے ساتھ ناشتہ کرائے گا۔

اچانک ہم کو خیال آیا کہ ہم افسانہ لکھنے تو بیٹھ گئے لیکن ہمیں افسانے کا مقصد تو معلوم نہیں ہے — اگر اس سلسلے میں کسی افسانہ نگار سے رابطہ قائم کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ کسی شاعر یا ادیب سے انٹرویو لیتے وقت اکثر یہی سب سے پہلے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کی نظر میں افسانے یا شاعری کا مقصد کیا ہے —؟۔

اگر ہم کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوگا تو ہم جواب کیسے دیں گے۔ لہٰذا رات کا کھانا کھا کر (کیونکہ بغیر کھانا کھائے افسانے کا تصور بھی ذہن میں نہیں آ سکتا) ہم اس ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے جہاں پر روزانہ رات کو شاعر اور افسانہ نگار آ کر بیٹھتے ہیں۔ ہم نے اپنے پرانے واقف کار افسانہ نگار سے پوچھا "تمہارے خیال میں افسانے کا کیا مطلب ہے —؟

ادیب کامل نے ہمارے سراپے کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا اور پھر کہا۔ "میاں آج یہ بے مقصد سوال کہاں سے اٹھا لائے۔"

ہم نے جواب دیا بے مقصد کہاں آپ کا تو کام ہی افسانہ لکھنا ہے —

افسانہ نگار نے قدرے مسکرا کر کہا "میرے نزدیک تو افسانے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ خالی پھرنے سے افسانہ لکھنا بہتر ہے —"

پیشتر اسکے کہ وہ آج کل کے ادبی ماحول پر تبصرہ انداز ہوتے ہم وہاں سے آ گئے۔ کیونکہ ہوٹل میں وہی لوگ آ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں جو بے کار ہوتے ہیں لیکن ہم تو مصروف تھے کیونکہ ہم کو افسانہ لکھنا تھا۔

تے رہے لیکن صبح جب اٹھے تو سب کے سب غائب تھے صرف سر میں تھوڑا تھوڑا درد باقی رہ گیا تھا۔ رات ہی کو ہمارے دماغ میں ایک خیال اور آیا کہ اگر ہم لائبریری کا پاس بنوا لیں تو بہت اچھا رہے۔ اس سے ایسا ہوگا ادبی کتابیں اور بڑے بڑے مصنفوں کے ناول پڑھ کر معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے جس سے ہمارے افسانوں میں جان پڑ سکتی ہے۔

صبح اٹھ کر ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے دو تین دوستوں کو ساتھ لیا اور لائبریری کو گئے۔ سارا دن لائبریری میں کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ شام کے وقت جب لائبریری سے موٹی موٹی کتابیں لے کر گھر آئے تو امی جان بولیں:

"آج واحد صاحب آئے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ اختر کو میرے پاس بھیج دینا ایک جگہ نکلی ہے ڈھائی سو سے اسٹارٹنگ ہے اور کام بھی زیادہ محنت کا نہیں ہے۔

ہم نے امی جان کو صاف جواب دیتے ہوئے کہا "لعنت بھیجو نوکری پر، اب تو ہم ایک ایسا کام شروع کر رہے ہیں جس سے روپیہ بھی ملے گا اور شہرت بھی ہوگی۔"

امی جان بہت خوش ہوئیں اور ہم کو ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔ اور شام کو انھوں نے یہ بات بھائی صاحب کے گوش گزار بھی کر دی۔ دو ہی دن میں ہماری صورت بگڑ گئی تھی۔ روز کے روز موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ نہ کھانا کھانے کی فکر نہ پینے کی فکر۔ ہماری خیریت معلوم کرنے ہمارے تمام دوست آتے کیونکہ ہم نے سب سے ملنا جلنا بھی بند کر دیا تھا اور اگر اتفاقاً کبھی ملاقات ہو جاتی تو وہ کہتے "بھئی کون سے ڈاکٹر کا علاج کرا رہے ہو"۔ کوئی کہتا کسی اچھے ڈاکٹر سے صلاح لو وغیرہ وغیرہ۔ ان کے جواب میں ہم صرف "ہوں" "ہاں" کرتے اور کسی کو بھی یہ نہ بتاتے کہ ہم نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔

کسی طرح ہمارے بھائی صاحب کو اس بات کا علم ہو گیا کہ ہم افسانہ نگاری شروع کر رہے ہیں۔ شروع میں تو خاموش رہے آخر کو جب رہا نہ گیا تو یوں گویا ہوئے،

چھوڑو ...

نے کئے ہوں۔ افسانے کبھی تمہارے باپ دادا نے بھی لکھے ہیں جو تم لکھنے چلے ہو۔ ابھی کون سی تمہاری زندگی قابل رشک ہے جو افسانہ نگار بن کے خود کو جانور کا روپ دیتے ہو ——

خاموشی سے تمام تقریر سننے کے بعد ہم ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنے لگے —— اس بات کی طرف تو ہم نے بھی توجہ دی تھی کہ جب سے ہم نے افسانہ نگاری کا قصد کیا تھا تو اس وقت سے خود کو وزیر اعظم سے بھی زیادہ مصروف پایا تھا۔ امی جان گوشت وراشن کیلئے پیچھے رہتیں لیکن ہم کتابوں پر اپسے جھکے رہتے جیسے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رہے ہوں۔ چار چار دن بغیر شیو کے گزر جاتے اگر قمیص کسی جگہ سے اپنی ہستی کھو چکی ہے تو وہ اسی حالت میں رہتی۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا اور نہ کسی دوست سے ملنا بس ہم تھے اور کتابیں تھیں۔ پانچویں روز جب ہم نے اپنی جون بدلی۔ نہائے شیو کیا اور آئینے میں اپنا چہرہ مبارک دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ ابھی تو افسانہ نگاری کی ابتداء تھی اس کی انتہا کیا ہوگی۔

پانچ ہی دن میں ہم برسوں کے بیمار معلوم ہوتے تھے۔ اور صحت بنانے کا شوق ہمیں بچپن سے ہی رہا ہے اس کے لئے ہم نے بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ روزانہ گرمی سردی غرض بارہ مہینے صبح تڑکے باغ میں جاکر ورزش کرنا۔ اور یہاں افسانہ نگاری ہماری صحت تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی جو ہماری برداشت سے باہر تھا۔

ہم نے کتابوں کو ایک طرف ڈال دیا اور پھر جرمانہ واجب ہو جانے کے خدشے سے ان کو لائبریری میں واپس کر آئے۔ ——

اور کارڈ پھاڑ کر پھینک دیا اور افسانہ نگاری کا خیال دل سے نکال دیا —— اور نوکری کی تلاش میں پہلے تو واحد صاحب سے ملے وہ نیک جگہ اور گئے اور آئندہ بھی نوکری کی جستجو کے لئے تیار ہونے کو ڈنڈ پیلنے لگے۔

●●

# دل جلے گا تو اجالا ہوگا

## اخلاقی

ریحانہ خانم متعلمہ ایس. ایس. سی.
اقبال یونین ہائی اسکول گودھرہ (گجرات).

انسان کی زندگی غموں کا مجموعہ ہے۔ انسان کو سب سے بڑی نعمت جو قدرت کی طرف سے عطا کی گئی ہے وہ غم کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ آدم کے روزِ اول سے ہم مشاہدہ کرتے چلے آئے ہیں کہ جن لوگوں نے دکھوں اور غموں کو برتا ہے مشکلیوں سے دوچار ہوئے ہیں وہی اپنے آپ کو اس قابل بنا سکے ہیں کہ دوسروں کو سکھ شانتی دے سکیں۔ جو لوگ ہمیشہ سکھ چین سے رہے ہیں کو سکھ نہیں دے سکے۔

ان کی زندگی میں اعتبار اور مقصدیت غموں کو برتنے سے پیدا ہوتی ہے۔ حصولِ مقصد کے لئے جب تک انسان میں شدتِ احساس ب بائی گن اور قوتِ برداشت اور رنج و غم نہ ہوں تب تک اُسے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ اگر انسان کو کسی قابل بننا ہو تو اسے ہزار جتن کرنا پڑتے ہیں۔ جانفشانی اور رنج و الم کی بھٹیوں سے گذرنا پڑتا ہے جب کہیں جاکر وہ کسی قابل بنتا ہے۔ اس دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنکے چاروں طرف مایوسی کی گھنگھور گھٹا ہیں چھائی ہوئی ہیں امید کی کرن کبھی انھوں نے نہیں دیکھی اور نہ ہی خوشیوں نے کبھی ان کی دہلیز پر دستک دی لیکن یہ حقیقت ہے کہ صرف یہ ہی لوگ فلسفۂ حیات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ واقعی سوز و غم ہونے سے زندگی میں نکھار آتا ہے۔ جس کی زندگی میں غم نہیں وہ انسان جانوروں مختلف نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں ایثار و قربانی کی جو شانیں ہم مختلف ہستیوں میں دیکھتے ہیں وہ تمام درد و غم کی جلوہ گری

انسان کو ہر حال میں حق و صداقت کی دولت سوزِ جگر سے ملتی ہے۔ انسان کے جسم میں سب سے زیادہ احساس کرنے والا کوئی حصہ ہے تو وہ دل ہی ہے جس کی مثال خود ایک ریڈیو اسٹیشن کے نشریات Receiver (ریسیور) کرنے کا کام ہے۔ دل ہی ہم کو زمینی دنیا اور آسمانی دنیا سے باخبر رکھتا ہے احساسات سے رشتہ جوڑتا ہے ——— یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ میں سے نکل کر دوسروں کے درد و غم کو اسطرح تلاش کرتا ہے جیسے کوئی اپنی کھوئی دولت، زندگی کا کوئی واحد سہارا یا دنیوی زندگی کے اس طوفانی سمندر میں ساحل کو تلاش کرتا ہو۔

انسان کا بلند اور ارفع مقام صرف اسی ایک جستجو اور کوشش سے حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے سوا اوروں کے دکھ درد کو اپنا ہی غم سمجھے۔ دوسرے کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں اٹھائے دوسروں کی دلجوئی کرے ان کے دکھ درد کا حصہ دار بنے۔ اگر انسانوں کا آپس کا اعتماد، ہمدردی اور محبت و مروت اٹھ جائے تو انسان کیلئے ان گنت آفتوں اور مصیبتوں کا دہانہ کھل جائے اور ممکن ہے رفتہ رفتہ انسان درندہ صفت بن جائے اور انسانیت کا سرِعام قتل کرے۔

اگر دنیا کے ۲۵ فیصد لوگ بھی اپنے باطن اور اپنے خیالات میں اخلاقی روشنی پیدا کریں تو انسانوں کے آپسی جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ ظالموں کے ظلم کو روکا جاسکتا ہے اور کل کے ایٹم بم کے خطرے سے انسانیت محفوظ رہ سکتی ہے۔ دل کو جلاتا اور اس میں روشنی پیدا کرنا آج کے دور میں خود زندہ رہنے کیلئے اتنا ضروری ہے جتنا کہ سائنس بننا ———

# ہندوستان کا معاشی نظام ایک جائزہ.

شمس الاسلام متعلم ایم اے. سیاسیات (پریولیس)
دلی یونیورسٹی

ہندوستانیوں کی غربت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے. وہ سر زمین جو کسی زمانے میں سونے کی چڑیا کہلاتی تھی آج بھوک، خشک سالی، قحط، غریبی اور بیماری کی آماجگاہ ہے. آج کے ہندوستان میں ۷۶٪ فیصد لوگ نچلا بکلا کی حد سے بھی بچھڑی ہوئی (Below subsistence level) زندگی گزارنے کیلئے مجبور ہیں. ۲۶٪ فیصد لوگوں کی ماہانہ آمدنی اٹھارہ روپے فی مہینہ ہے. اور ہندوستانیوں کی فی کس آمدنی تقریباً ۱.۳۵ روپے پڑتی ہے. ۱۱ کروڑ لوگوں کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں ہے. ۶ کروڑ لوگوں کے پاس کل زمین کا صرف ایک فیصد حصہ ہے. تقریباً آدھا ہندوستان رات کو بھوکا سوتا ہے. یہ حد درجہ غربت کن وجوہات کا نتیجہ ہے —؟ ایک سیدھا سا جواب ہے "بڑھتی ہوئی آبادی". کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ سب کو زندہ رکھنے کی سہولیات دینا ناممکن ہو گیا ہے. لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کو ہندوستان کے افلاس کا بنیادی سبب بتا کر پیش کرنے والے اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں. سماجی، تہذیبی اور معاشی پسماندگی اور بدحالی دراصل غلط معاشی نظام اور لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے ہے نہ کہ اسکے برعکس —

اگر آبادی کا تیزی سے بڑھنا ہی غریبی اور سماجی و تہذیبی بدحالی کا سبب ہوتا تو یورپ کے بہت سارے ملک ہندوستان سے زیادہ غریب ہوتے. جب ہم ۱۸۶۰ء سے ۱۹۱۰ء تک کی مختلف ملکوں میں بڑھتی ہوئی آبادی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ فی صد اضافہ اس طرح ہوا.

| | | | |
|---|---|---|---|
| ہندوستان | ۱۸.۰۸٪ | انگلینڈ | ۵۸٪ |
| جرمنی | ۵۹٪ | بیلجیم | ۴۷.۹٪ |
| ہالینڈ | ۶۲٪ | روس | ۷۳٪ |

پورے یورپ کا فیصد اضافہ ۴۵.۴٪

جتنا اضافہ آبادی اور ملکوں میں ہوا ہندوستان میں ایک تہائی بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہوا لیکن ہندوستان زیادہ غریب ہوتا چلا گیا اور سارا یورپ زیادہ امیر. اس سے ظاہر ہے کہ آبادی کا بڑھنا غریبی کا باعث نہیں ہے.

اسکے علاوہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی دریافتیں ہوتی رہی ہیں. مثلاً کسی زمانے میں سمندر کو غذائی نقطۂ نظر سے ایک بے کار چیز سمجھا جاتا تھا لیکن آج اس میں پھیلے ہوئے پودوں سے پروٹین بنائے جاتے ہیں. نائیلون کی ایجاد نے ہم کو اس قابل بنا دیا ہے کہ کتنا بھی کپڑا تیار کر سکتے ہیں. وہ مرغی جو دن میں دو انڈے دیتی تھی آج مشینوں کے ذریعے کئی گنا زیادہ دیتی ہے. آبادی کے ساتھ ساتھ ذرائع بھی بڑھتے رہتے ہیں. کسی زمانے میں لوگ یک منزلہ گھروں میں رہتے. اب سو سو منزلہ عمارتیں بنائی جا رہی ہیں.

اگر ہندوستان میں سب مصیبتوں کا سبب "زاید از ضرورت آبادی" نہیں تو پھر کیا ہے. اس کا جواب بھی بہت آسان ہے. ہمارے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم بیماری کی اصل جگہ کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں بلکہ ہمیشہ اس چکر میں

ہیں کہ کسی طرح گھوڑے کے آگے گاڑی جوت دی جائے۔ سب خرابیوں کا سبب یہ نہیں کہ ھندوستانی اولاد زیادہ پیدا کرتے ہیں بلکہ یہ اس وجہ سے ہیں کہ ہمارا معاشی اور سیاسی ڈھانچہ صرف چند لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور عام لوگ اس سے کسی قسم کا استفادہ کرنے سے محروم رہتے ہیں مایم ایل۔ ڈارلنگ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ھندوستان میں سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ اسکی مٹی ذرخیز ہے اور اسکے باشندے مفلس۔" ہندوستانی غریب ہیں لیکن ھندوستان غریب نہیں ہے۔ یہ قدرتی خزانوں، معدنی ذخیروں و وسائل سے بھرپور ہے ان کا استعمال یقیناً کیا جاتا ہے لیکن وہ ھندوستان کی ۷۵ اجارہ دار خاندانوں کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ ان ۷۵ اجارہ دار خاندانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پورے ملک کی ۶۰ فیصد دولت کے مالک ہیں۔ اگر ۵۵ کروڑ میں سے ۷۵ خاندانوں کے پاس ساٹھ فیصدی دولت ہے تو غریبی مفلسی اور بھوک کا ہونا لازمی ہے۔ ہندوستان میں جگہ کی قلت نہیں ہے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایک کروڑ چالیس لاکھ لوگوں کے قبضہ میں سارے ملک کی ۴۷ فیصد زمین ہے۔ ہم ناانصافی پر مبنی معاشی سسٹم کو تو صحیح نہیں کرنا چاہتے بلکہ لوگوں کی توجہ اصل مسئلہ سے ہٹانے کیلئے ضرورت سے زیادہ آبادی کا واویلہ مچاتے رہتے ہیں۔ اگر ہم صرف یہی کرتے رہے اور سمجھتے رہے کہ اصلاح ہو جائے گی تو یہ اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہوگا اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جو لوگ بڑھتی ہوئی آبادی کو ہندوستان کی غربت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں ان کی یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسا کہ "پروکرسٹس" کا پلنگ تھا (پروکرسٹس ایک ڈاکو تھا جو راہگیروں کو قید کرکے ایک پلنگ سے باندھ دیتا تھا جو آدمی پلنگ سے چھوٹے ہوتے تھے انہیں کھینچ کر لمبا کر دیا جاتا تھا اور جو پلنگ سے بڑے ہوتے تھے انکے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں چھوٹا کر دیا جاتا تھا) جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ سامراج کے زیر سایہ پیداوار کی موجودہ تقسیم ناقص ہے اور فطری طور سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی (حالانکہ وہ اس [illegible] سے اصل نظام تقسیم کو بہتر بنا کر سب کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں) تو وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں (نظام تقسیم کو بہتر بنانے کے بجائے) کہ موجودہ آبادی کو کم کر دیا جائے۔ وہ کہتے ہیں اسکا آدمی کے پاؤں کاٹ دو کیونکہ یہ پلنگ سے بہت لمبا ہے۔ انکو اس بات کا خیال نہیں رہتا کہ جو فالتو سامان اسکے پاس پڑا ہوا ہے اسکو پلنگ میں ملا کر اسے بڑا کر دیں۔

ہندوستان کے مسائل اسوقت تک حل نہیں ہوں گے جب تک کہ ہم مرض کی تشخیص اور اس کا صحیح علاج نہیں کریں گے۔ صحیح تشخیص یہ ہے کہ ہمارا معاشی نظام فرسودہ ہے یہ عام سماجی بھلائی کے بجائے کچھ مخصوص لوگوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ ہندوستان میں سب کچھ ہے لیکن اسکو ایک چھوٹے سے حلقہ نے اپنے حق محدود کر رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہندوستانی معیشت کو ان سے اور انکی اجارہ داری سے نجات دلاکر اس کی از سر نو تعمیر کریں۔ اور ایک ایسے نظام کے لئے کوشاں ہوں جہاں ہندوستان کے مالک ۵۵ کروڑ لوگ ہوں نہ کہ ۷۵ خاندان اور ایک کروڑ چالیس لاکھ لوگ جو ملک کی آدھی زمین کے مالک ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم خاندانی منصوبہ بندی کے مخالف ہیں۔ ایک خوشحال سماج کے لئے ضروری ہے کہ وہاں پر ہر کام ترتیب کے ساتھ ہو اور ہر کام قدرت کی مرضی پر ہی نہیں چھوڑ دیا جائے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا صرف خاندانی منصوبہ بندی ہی سارے مسائل حل کر سکتی ہے۔ یا اسکے ساتھ کچھ اور بھی کیا جانا ضروری ہے ــــ خاندانی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ اپنے معاشی نظام پر بھی نظرثانی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ملکی وسائل کا فائدہ ہر ہندوستانی کو پہنچ سکے۔

●●

# فلمی شعرا

نجم الحسن انجم ادیب

حضرت فراق گورکھپوری کا اب سے چار پانچ سال پہلے
ے ایک ماہنامے میں ایک خط شائع ہوا تھا۔ جس میں فراق صاحب
عاشقانہ فلم " ایک دل سو افسانے " میں راجکپور محبت کا آغاز
ے ایک شعر سے کرتا ہے۔ اور فلم کا نام بھی ان ہی کے ایک مصرعہ سے
بت رکھتا ہے۔ فلم والے لاکھوں کروڑوں روپے کما لیتے ہیں۔
فیں کچھ نہیں دیتے۔ ... حضرات فراق کی اس بات سے
ں ہوں۔ غالب، ذوق، مصحفی اور بھی بہت سے شعرا کے اشعار
الے اپنے مکالموں میں استعمال کر چکے ہیں۔
فلم مرزا غالب اور دوسری بہت سی فلموں میں غالب کی
ں استعمال ہوئیں۔ ڈاکٹر اقبال، مجاز، بہادر شاہ ظفر کی غزلیں
موں کی زینت کا اجزا ثابت ہوئیں۔ اگر کوئی فلمی شاعر ایک
لکھتا ہے تو اسے سینکڑوں روپے پروڈیوسر دے دیتا ہے۔
انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ہی ایک ایسی انجمن ہے جس
اردو کا معاوضہ انجمن ترقی اردو ہند علیگڑھ کو بھیج دیا جائے تاکہ
سے متعلق کوئی ٹھوس کام ہو سکے یا اس رقم سے " اردو گھر " کی
جلد از جلد مکمل ہو سکے۔ اب سے سال دو سال پہلے کسی صاحب نے
ترقی اردو ہند علیگڑھ کے ہفت روزہ " ہماری زبان "
ڑھ میں ایک مراسلہ شائع کرایا تھا۔ ایک ایسی اردو کی
ینکسی بنائی جائے۔ اور ... ادیب و شاعروں کی
قات کو اپنے قبضے میں لے۔ اگر کوئی فلم ساز و موسیقار
بی شاعر و ادیب کی تخلیق کی اچھی قیمت ادا کر کے اس کو
فلموں میں استعمال کرے اور اس رقم کو کیبنی اپنے کاموں میں
استعمال کرے۔ یہ بات بھی کوئی بری نہیں۔

ذیل میں ان فلمی شاعروں سے متعلق لکھ رہا ہوں جو
مشہور شعرا کے شعروں اور مصرعوں کو خفیف تبدیلی کے ساتھ اپنے
گیتوں میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس کار خیر میں جناب اقبال حسین،
حسرت جے پوری صاحب پیش پیش ہیں۔

غالب کا ایک شعر ہے ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

حسرت صاحب فلم سسرال میں یوں لکھتے ہیں ؎

عشق نے ہم کو نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔

مومن کا ایک شعر ہے ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

تو فلم " لو ان ٹوکیو " میں حسرت صاحب یوں لکھتے ہیں ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

مجاز کا ایک شعر ہے ؎

کھلتے رہیں عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

تو فلم ... میں حسرت صاحب لکھتے ہیں ؎

کھلتے رہیں ہونٹوں کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

ناسخ کا ایک شعر ہے ؎
تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لئے پھرتے ہیں

تو فلم "ضدی" کے ایک گیت میں مندرجہ بالا شعر کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے ناسخ کے اس مصرعہ کو ؎
تجھے بھول جانا تو ہے غیر ممکن۔

تو فلم "اپریل فول" میں حسرت صاحب لکھتے ہیں ؎
تجھے بھول جاؤں یہ ممکن نہیں ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش کا ایک شعر ہے ؎
اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی مالک نے مجھے بھی تو محبت دی ہے۔

تو فلم "دیوانہ" میں حسرت صاحب یوں لکھتے ہیں ؎
اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی مالک نے مجھے بھی تو محبت دی ہے۔

جگر مراد آبادی کا ایک شعر ہے ؎
نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیگا
جہاں جائیگا ہمیں پائیے گا۔

تو حسرت صاحب فلم "آرزو" میں یوں لکھتے ہیں ؎
اجی ہم سے چھپ کر کہاں جائیے گا
جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا۔

سکندر علی وجد کا ایک شعر ہے ؎
جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے۔

تو فلم "ایک مندر" میں جوں کا توں لکھ دیا ہے۔
حسرت صاحب مشہور شعرا کے شعر ہی نہیں بلکہ اپنے ہمعصر فلمی شعرا کے مصرے بھی اڑا لیتے ہیں۔

کیفی اعظمی نے فلم "لالہ رخ" میں لکھا تھا ؎
تجھے دیکھا تجھے چاہا تجھے پوجا میں نے
بس اتنی خطا ہے میری اور خطا کیا ہے۔

تو فلم "چھوٹی سی ملاقات" میں لکھتے ہیں ؎
تجھے دیکھا تجھے چاہا تجھے پوجا میں نے
بس اتنی خطا ہے مری اور خطا کیا ہے

شکیل احمد شکیل بدایونی صاحب سے بھی اس قسم کی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ آرزو لکھنوی کا ایک شعر ہے ؎
نہ سوچا نہ سمجھا نہ دیکھا نہ بھالا

تو شکیل صاحب فلم "مغل اعظم" میں لکھتے ہیں ؎
نہ سوچا نہ سمجھا نہ دیکھا نہ بھالا
تیری آرزو نے ہمیں مار ڈالا۔

قابل اجمیری کا ایک شعر ہے ؎
اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھ
زندگی کتنی خوبصورت ہے۔

تو شکیل صاحب فلم "بن بادل برسات" میں لکھتے ہیں ؎
زندگی کتنی خوبصورت ہے
آئیے آپ کی ضرورت ہے۔

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے ؎
ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم۔

تو فلم "میرے محبوب" میں شکیل صاحب لکھتے ہیں ؎
پاس رہتے ہوئے بھی تجھ سے بہت دور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

مجروح سلطان پوری ریاض خیرآبادی کے اس شعر ؎
آپ آئے تو خیال دل ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔

کو فلم "آرتی" میں یوں لکھتے ہیں ؎
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا
کہ مرے دل پہ پڑا تھا کبھی غم کا سایا۔

داغ دہلوی کا ایک شعر ہے ؎
ہم نے ان کے سامنے اول تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا۔

# دور جدید میں کنبہ

۔اصیلہ حسی۔

انتظار احمد ایم۔اے (دلی یونیورسٹی)

جدید دور کی اصطلاح سے ہماری مراد نہ صرف آجکل کے زمانے سے ہے جس میں ہم آپ سانس لے رہے ہیں بلکہ ایک خاص زاویہ نظر اور فکری رجحان سے ہے۔ یہ زاویہ نظر اور فکری رجحان سماج میں ہونے والی بنیادی تبدیلیوں سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلیاں پیداوار کے ذرائع بدلنے سے وجود میں آتی ہیں۔ انسان کی قدیم ترین یا قبل تاریخ سماج کو دور وحشت کا سماج کہا گیا۔ کئی ہزار سال کے بعد انسان نے اپنے حالات کو بدلنے کے لئے اور اپنی زندگی کو خوشگوار تر بنانے کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رکھی تو انسانی سماج جاگیرداری دور میں داخل ہوا۔ پہلے زمانہ میں پیداوار کے ذرائع پتھر کے ہتھیار یا شکار کا سامان تھے۔ جاگیرداری دور میں انسان نہ صرف مل جل کر گاؤں اور قصبوں میں تمدنی زندگی گذارنے لگا بلکہ اس نے پیداوار کا ایک انقلابی ذریعہ یعنی کھیتی باڑی ایجاد کرلیا۔ یہ دور اپنی طوالت کے لحاظ سے انسانی سماج کا سب سے طویل دور تھا۔ تیسرا دور سرمایہ داری کا دور ہے جس کی بنیاد مشین پر ہے۔ اسی دور کو سائنس کا دور کہا جاتا ہے۔ اگر ہم بغور دیکھیں تو انسان کی ذہنی زندگی ان تینوں دور میں ایک دوسرے سے مختلف شعور رکھتی ہے۔ تیسرے دور نے جو شعور ہمیں دیا وہ سائنس کے ذریعہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بدلنے کا شعور ہے۔ یہ شعور نہ دور وحشت میں پیدا ہو سکتا تھا اور نہ جاگیرداری دور میں!

خاندان یا کنبہ اتنا ہی قدیم ادارہ ہے جتنا کہ خود انسان کا تمدن کنبہ کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو یہ انسانی تمدن کی تاریخ بن جاتی ہے۔ دور وحشت میں کنبہ کی نوعیت کیا رہی ہوگی اس کا ہم قیاس ہی کر سکتے ہیں۔ جاگیرداری نظام نے کنبہ کی جو نوعیت تشکیل کی وہ آج بھی ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا ملک سرمایہ داری اور اس سے پیدا ہونے والی صنعت کاری سائنس کی ترقی اور ٹیکنولاجی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے لیکن اس کی شروعات اس نے ابھی کی ہے۔ بدلے ہوئے ذرائع کا جو اثر ہمیں شہروں میں نظر آتا ہے وہ گاؤں میں نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے وسیع و عریض ملک کی آبادی (جو دنیا کے ممالک کی دوسری بڑی آبادی ہے) ۸۰ فیصدی دیہات میں رہتی ہے جب تک آبادی کا یہ بڑا حصہ نئے ذرائع پیداوار کی کوکھ سے پھوٹنے والے نئے شعور کا حامل نہیں ہوتا ہم پورے ملک کی زندگی کو جدید نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کنبہ کی جو نوعیت ہزاروں سال سے ہمارے ملک میں چلی آرہی ہے وہ گاؤں میں بڑی حد تک جوں کی توں ہے جبکہ کنبہ کا یہ روایتی ادارہ شہروں میں ایک زبردست تبدیلی سے گذر رہا ہے۔

اسے تبدیلی کہیئے یا نئی حقیقتوں کا ایک زبردست چیلنج۔ آبادی کی کثرت اور پیداوار کی کمی نے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہمارے سوچنے والے ذہنوں کے سامنے پیش کر دیا کہ یا تو

کنبہ کے تصور اور نوعیت میں بنیادی طور پر اور بے حد جلد تبدیلی کی جائے یا آبادی کی کثرت سے اور روز بروز پیدا ہونے والی پیداوار کی کمی سے غریبی اور پسماندگی سے شکار بننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

ابھی ہمارے سامنے کی بات ہے کنبہ کی حیثیت ہمارے سماج میں ریڑھ کی ہڈی جیسی تھی۔ اس کی اہمیت اور بڑائی سے کون انکار کر سکتا تھا۔ کنبہ کے تمام افراد مل جل کر رہتے تھے ایک دوسرے کے درد میں شریک ہوتے تھے۔ کنبہ کا بزرگ قبیلے کے سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ کمانے والا ایک یا دو ہی ہوتے تھے اور ان کی کمائی پر انحصار کرنے والے بیسیوں بلکہ پچاسوں۔ لیکن گذشتہ چوتھائی صدی میں آبادی کی کثرت ہوش ربا حد تک بڑھنے اور اس کی نسبت پیداوار حیرت انگیز حد تک کم ہونے نے سماج کے بیدار لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اس چیلنج کو بہادری سے قبول کریں۔ اس کی تدبیریں سوچیں۔ چنانچہ حکومت، ملک کے دانشور اور منتظم لوگ بیس سال سے مختلف تدبیریں اختیار کر چکے ہیں۔ ایک تدبیر یہ ہے کہ نئے آلات اور نئے ذرائع پیداوار اور سائنس کے جدید تر انکشافات سے ملک کی پیداوار میں اس قدر اضافہ کیا جائے کہ پوری آبادی اکتفا کر سکے۔

دوسری جانب بھی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے سامنے کچھ قدرتی اور کچھ تاریخی مجبوریاں بھی ہیں۔ جن کے باعث ہمیں کچھ اور تدابیر اختیار کرنی ہونگی۔ ان میں ایک بہت ہی آسان قابل عمل، نتیجہ خیز اور بے ضرر چیز ہے "خاندانی منصوبہ بندی"۔ اس منصوبہ بندی پر اب تک جس قدر عمل کیا گیا اور اس کے جو بھی نتائج نکلے وہ ہرگز بھی مایوس کن نہیں ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے عوام اس کی اہمیت سے آشنا ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بڑھتی ہوئی آبادی اور کم ہوتی ہوئی پیداوار کے چیلنج کا تسلی بخش حل ڈھونڈ ہی نکالیں۔ اسے ایک مثال سے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایک کارخانہ کے مزدور کے یا ایک دفتر کے بابو کے اگر بیس سال میں دس بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کی آمدنی ہرگز اس رفتار سے نہیں بڑھتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے کنبہ کا طرز زندگی گر جاتا ہے۔ غیر تسلی بخش کھانا، پینا، رہنا، لباس، تعلیم غرضکہ اس کنبہ کی پوری سماجی حیثیت اس سے متاثر ہوتی ہے۔ آگے بڑھ کر دیکھئے تو یہ سوال صرف ایک کنبہ کا نہیں رہتا بلکہ پورے ملک اور قوم کا بن جاتا ہے۔ فرد ہی سے جماعت کا تصور قائم ہے۔ جیسے افراد ہونگے ویسی ہی جماعت ہوگی۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدید دور میں کنبہ ایک بہت ہی نازک دور سے گذر رہا ہے۔ اگر ہمیں اس کو باقی رکھنا ہے تو اس کی نوعیت تبدیل کرنی ہوگی۔ اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلیاں کرنی ہونگی۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

---

فلمی شعراء — صفحہ ۲۲ سے آگے

فلم "ممتا" میں مجروح صاحب لکھتے ہیں ؎

ہم نے تو ان کے سامنے اول تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا۔

ریاض خیر آبادی کے اس شعر کو ؎

آپ آئے تو خیال دل ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔

تو فلم "گمراہ" میں یوں لکھتے ہیں ؎

آپ آئے تو خیال دل ناشاد آیا
کتنے بھولے ہوئے زخموں کا پتہ یاد آیا۔

فیض احمد فیض کا ایک شعر ہے ؎

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ دو اپنے دیوانے کا نام۔

تو جاوید انور صاحب فلم "شبنم" میں یوں لکھتے ہیں ؎

میں نے رکھا ہے محبت اپنے افسانے کا نام
تم بھی کچھ اچھا سا رکھ دو اپنے دیوانے کا نام۔

تجربہ کار، گیت کار اور نامور شعرا کو ایسی حرکت زیب نہیں دیتی۔

# خواہشِ لذتِ آرزو

معراج الدین صدیقی متعلم جامعہ کالج نئی دہلی۔

"کہاں سے تشریف آرہی ہے۔؟" پسینہ میں شرابور جب میں گھر پہنچا تو راحیلہ دوڑتی ہوئی نزدیک آئی اور اس بے چینی سے پوچھا جیسے گرمی مجھے نہیں بلکہ اسے لگ رہی ہے۔ اتنا کہتے ہی ہی پنکھا اٹھا کر جھلنے لگی۔ میرے منع کرنے کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پسینہ خشک ہوتے ہی شربت بنانے چلدی۔ اور پلک جھپکتے ہی شربت کا بھرا گلاس میرے سامنے موجود تھا۔ شربت کا حلق سے اترنا تھا کہ طبیعت سرشار ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ میں صرف چار دن کے لئے یہاں آیا ہوں۔ راحیلہ میرے ہر کام میں اس طرح دلچسپی لیتی ہے جیسے کہ اس کا اپنا کام ہو۔ آخر کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کھانا لئے چلی آئی۔ میں نے کہا "کس کے لئے۔؟" بولی "آپ کے لئے۔"

"ارے! کھانا تو میں نے ایک دوست کے گھر کھالیا تھا۔" راحیلہ نے فوراً جواب دیا کہ "میں نے تو ابھی تک آپ کے انتظار میں کھانا نہیں کھایا۔"

میری طبیعت اور پریشان ہوئی کہ یہ لڑکی آخر اتنی ہمدردی سے کیوں پیش آتی ہے کہ میری خاطر کھانا بھی نہیں کھایا جبکہ گھر میں سب نے کھالیا ہے۔

"اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ دہلی کب جارہے ہیں۔؟"

"کیا کہا۔؟" میں ایک دم چونکا۔

"میں پوچھ رہی ہوں کہ آپ دہلی کب تشریف لیجا رہے ہیں۔؟"

"میرا رہنا آپکی طبع نازک پہ گراں گذر رہا ہے تو میں کل چلا جاؤنگا۔" اتنا کہتے ہی راحیلہ کے چہرے پہ نہ جانے کیوں اداسی چھا گئی۔

"کیا ہوا راحیلہ! خاموش کیوں ہوگئیں۔؟"

"کچھ نہیں۔ آپ نے غلط سمجھا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تو میں مستقل یہیں رہوں گا۔"

"ارے یہاں آپ ہم جیسے غریب لوگوں میں کیوں رہینگے" اس کی یہ باتیں میرے دل میں تیرِ نیم کش کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ کیونکہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

آخر کار میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ "تم اتنی اداس کیوں رہتی ہو۔؟"

"آپ اپنے دل سے پوچھیں تو بہتر ہوگا۔" مجھے مکمل یقین ہو چلا تھا کہ یہ لڑکی موت کی کھائی میں گر چکی ہے۔

میں نے کہا اچھا راحیلہ اب یہ بتاؤ کہ دہلی کب آرہی ہو

"بھابی کے ساتھ آؤنگی۔"

"اچھا تو پھر وہیں باتیں ہونگی۔"

کل صبح کی ٹرین سے جانے کا پروگرام تھا لیکن ایکدم کالج کھل جانے کا خیال آتے ہی پروگرام بدل دیا۔ اور اسی وقت بس کے ذریعہ دہلی روانہ ہوگیا۔ دہلی آنے کے بعد نہ جانے کیوں کسی کام میں میری طبیعت نہیں لگ رہی تھی۔

ماہ بعد خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ کل شام کی ٹرین سے راحیلہ
ہی ہے۔ دل کو اس قدر خوشی محسوس ہوئی کہ جیسے جنت
ئی ہو۔

دن بھر انتظارِ شام میں گذرا۔ اسٹیشن پہنچنے پر معلوم ہوا
ی آچکی ہے۔ دوڑ کر گاڑی تک پہنچے۔ ایک ایک کمپارٹمنٹ
ن مارا۔ لیکن راحیلہ کا کہیں پتہ نہیں۔ حسرت و یاس سے یہ
ر پڑھتے ہوئے نکلے ؎

کون جانے میرے احساس پہ کیا گذری ہے۔
گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ بہار آگئی۔ تو پھر کیا تھا جان میں جان
۔ سوچا کہ چلو مل آئیں۔ لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ خود ملنے
ے۔ اسی سوچ میں مستغرق کتاب کے اوراق سے کھیل رہا تھا
ی کے سلام کی آواز کانوں میں گونجی۔ گردن جو اٹھائی تو قیامت
ِ سوار تھی۔ سلام کا جواب ندارد۔ خاموش نگاہوں سے اسے
ھنے لگا۔

سلام کا جواب تک بھی نہ دیا۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے کہ کچھ
ہا نہیں۔" راحیلہ بولی۔ مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ زبان
ہی نہ رہی تھی لیکن "کچھ خبر بھی نہیں" اور "کیا حالت بنا رکھی ہے"
ان کو جنبش ہوئی ؎

میری تصویر میرے پاس آ کر مجھ سے کہتی ہے
یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی، آئینہ دیکھو

بہ نہ جانے کیوں مجھے تمہارا شدت سے انتظار تھا۔ اور میں
چ رہا تھا کہ جب تم آؤ گی تو تم سے شکوہ شکایت کروں گا۔ لیکن
نے کیوں اب زبان سے کچھ نکلتا ہی نہیں جو میں تم سے کہوں
سے راحیلہ تم اب تک کھڑی ہو بیٹھی بھی نہیں کب تک کھڑی
ں۔؟"

آپ نے کہا ہی کب ہے جو میں بیٹھتی۔ اچھا یہ بتائیے کہ گھر کے
لوگ کہاں گئے ہوئے ہیں۔؟"
یہ سب تو خالہ کے یہاں کسی تقریب میں گئے ہیں۔"
تو پھر آپ کیوں نہیں گئے۔؟"
میں اس کو کیا بتاتا کہ میں کیوں نہیں گیا، مجھے انتظار تھا کسی کا
دیکھ لیا فرصت ہے کہیں آنے جانے کی۔ چائے کا

پانی کھول چکا تھا، چائے خود راحیلہ نے تیار کر کے ایک کپ
خود پیا اور ایک مجھے دیا۔ آج نہ جانے کیوں چائے میں عجیب
لذت محسوس ہو رہی تھی۔

ہاں تو میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ آپ جب سے دہلی آئے ہیں نہ جانے
کیوں میری طبیعت گھر پہ بالکل نہ لگی۔ ایک عجیب سی چبھن محسوس ہوتی
رہی۔ اور ہر وقت آپ کی یاد نے جتنا پریشان کیا ہے کچھ کہہ نہیں سکتی۔
ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ موجود تھی۔ لیکن آپ کو سوں دور
مجھے بھولے بیٹھے تھے۔ جبکہ آپ کے بغیر میرا زندہ رہنا بھی ناممکن ہے۔"

"راحیلہ! اگر تم نے ایسا سوچا تو بالکل غلط سوچا۔" میں نے
کہا سنو! "محبت برائے محبت ہونی چاہیئے۔ اور تم یہ اچھی طرح
جانتی ہو کہ میں ابھی زیرِ تعلیم ہوں مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے جسکے
لئے چھ سال کا عرصہ درکار ہے۔ اس لئے میں تم سے کوئی عہد و پیماں
نہیں کرنا چاہتا کہ بعد میں وہ باعثِ پریشانی بنیں۔ آپ یہ بھی نہ سمجھیں
کہ مجھے آپ سے الفت نہیں ہے۔ بلکہ میں آپ کی محبت کا احترام کرتا
ہوں اور تا زندگی کرتا رہوں گا۔ جھوٹا وعدہ قطعاً نہ کر سکوں گا۔"
راحیلہ کی اشکبار آنکھیں میری طرف تکتیں جنکی تاب میں نہ لا سکا۔
اور میرا دل کچھ پسیجا کہ میں اپنے الفاظ واپس لے لوں یا معافی مانگ
اور اس کے دل کو بہلانے کے لئے وہ الفاظ کہہ دوں جنکی وہ منتظر ہے۔
لیکن ضمیر نے گوارہ نہ کیا کہ اسکو غلط فہمی میں مبتلا کروں۔
راحیلہ نے بڑی آہستگی سے کہا مجھے تو آپ سے ان الفاظ کی
پہلے ہی امید تھی۔"

"راحیلہ تم بہت سادہ بہت بھولی بہت سیدھی ہو۔"
"آپ کو میرا ساتھ ہی نہ دینا تھا۔ اور آپ کیوں کسی کے دل کو
تسکین پہنچانے لگے۔ اچھا میں چلتی ہوں خدا حافظ۔" یہ کہتی ہوئی
راحیلہ تیزی کے ساتھ زینہ سے اتر گئی۔
راحیلہ کو ملے ہوئے پانچ چھ ماہ کا عرصہ گذر گیا تھا۔ لیکن
دل بے قرار کو چین نصیب نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس نے کسی کے دل
کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ لیکن ایک طرف دل کو سکون بھی تھا کہ میں نے
کسی کو دھوکے میں نہیں رکھا۔ پھر بھی آج میرا دل اس بچے کی طرح
رو رہا تھا جسے گھنٹوں سے ماں کا دودھ نہ ملا ہو۔
راحیلہ کی شادی کا کارڈ مجھ تک بھی پہنچا۔ ایک دن کے
بقیہ صفحہ ۲۸ پر
شاہ جہاں ملی

# پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
# کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

خاکہ

اظہر ندیم نقوی ایم۔ اے دہلی

اللہ سلامت رکھے کندن لال بھی عجیب خوبیوں کے آدمی ہیں۔ کندن لال کا صحیح سالِ پیدائش کیا ہے خود انھیں بھی معلوم نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق وہ اپنی پیدائش ۱۹۳۶ء کے آس پاس بتلاتے ہیں۔ ان کی پیدائش ضلع ڈیرہ غازی خان کی تحصیل سنگھڑ کے ایک گاؤں کوٹ میرانی کے ایک متوسط الحال گھرانے میں ہوئی۔ کندن لال ابھی دس گیارہ سال ہی کے تھے کہ ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ اور اس بٹوارے نے کندن لال کو دہلی لا پھینکا۔

کندن لال شکل و صورت کے اعتبار سے قبول صورت ہیں بالفاظ دیگر ناک نقشے کے مالک ہیں۔ سرو قد، کھلتا رنگ، کتابی چہرہ، فراخ پیشانی، چمکدار آنکھیں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے لب، ٹھوڑی سے استقلال ٹپکتا رہتا ہے، کاٹھی مضبوط ہے بے کون ہے جو اس قد و قامت اور تیکھے نقوش پر نہ مر مٹے۔

کندن لال شیو کرنے کے بڑے چور ہیں۔ وحشیوں کی طرح شیو بڑھا رہتا ہے۔ سر کے بال بے ترتیب ان میں کبھی تیل نہ ڈالتے اور نہ انھیں بناتے۔ یہ ان گنی چنی چیزوں میں سے ہیں جنھیں اپنے سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی زندگی قلندرانہ اور رحم کشتی مجذوبانہ ہے۔ سیاتی بڑی موثر اور دلکش کرتے ہیں۔ ان کے انداز گفتگو سے ان کی شرافت نفسی جھلکتی ہے۔

کندن لال سے ہماری ملاقات تین سال پہلے ہوئی جب انھوں نے اور ہم نے یونیورسٹی میں ایم۔ اے میں داخلہ لیا۔

اس دو سال کے عرصہ میں کندن لال نے ہمیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ داخلہ سے قبل اردو کا مناسب ماحول نہ ملنے کی وجہ سے کندن لال گفتگو میں اکثر مذاق کا موضوع بنتے۔ بے تکلف احباب ان پر پھبتیاں کستے۔ مگر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتے اور کبھی الٹ کر کوئی سخت جواب نہ دیتے۔ اس سے یہ ہوتا کہ معترض خود شرمندہ ہو جاتا۔ ان کے نزدیک دوستی کی بڑی اہمیت ہے وہ دوستوں پر جان دیتے ہیں اور انھیں زیر بار منت کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اپنی اس کمزوری کی بدولت اکثر نقصان اور تکلیف اٹھاتے ہیں اور بے مہری احباب کے شکوہ سنج رہتے ہیں۔ مگر وسیع القلبی نے چشم پوشی اور درگزر کو ان کا شعار بنا دیا ہے۔ انھیں دوستی کا حق ادا کرنے میں ایک خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ وہ کسی کا دل دکھانا نہیں جانتے۔ اگر ہم انھیں خلوص و ایثار کا امام بالا کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ہر شئے کی تعریف تو کر سکتے ہیں مگر خامی کی طرف ان کی نظر مشکل ہی سے جاتی ہے۔

سنتے ہیں کہ کندن لال کو قمار بازی کی بری عادت تھی۔ نہ معلوم کس طرح یہ عادت جاتی رہی لیکن قمار بازی کی جگہ شراب نوشی نے لے لی۔ شراب نوشی کے عادی تو نہیں ہیں لیکن کبھی کبھی پی لیتے ہیں۔ اور جب پیتے ہیں تو یونہی بوتل سے منہ لگا کر غٹاغٹ چڑھا جاتے ہیں۔

کندن لال کو سوائے پڑھنے لکھنے کے اور کسی بات کا شوق نہیں ہے۔ ملازمت کی دماغ سوز مصروفیت کے باوجود استاذ فن

ضرور نکال لیتے ہیں تاکہ اپنا مطالعہ بھی جاری رکھیں۔ وہ بڑے
آدمیوں سے ملنا جلنا عار سمجھتے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے بڑے پن کے
وہ کبھی قائل نہیں رہے۔ اور کسی سے مرعوب ہونا تو وہ جانتے ہی نہیں۔
مذہب سے کندن لال کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ وہ بس ہندو اس لئے
ہیں کہ ایک ہندو کے ہاں پیدا ہوئے۔ بقول خود ان کے وہ آج تک
مندر میں پوجا کے لئے نہیں گئے۔ پوجا میں کیا کیا سامگری ہوتی ہے
انھیں معلوم نہیں۔

کندن لال کو میں نے کبھی کسی سے بدزبانی کرتے نہیں دیکھا
وہ تو کسی سے مذاق تک نہیں کرتے۔ ان کا رکھ رکھاؤ ایسا ہے کہ
کیا مجال جو وہ کسی سے ناشائستہ بات کریں۔ ادب آداب ہمیشہ
ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ کبھی اپنے
عیبوں کو نہیں چھپاتے اور نہ کبھی اپنی خوبیوں کو سراہتے ہیں۔ ریا
کاری ان میں نام کو نہیں۔ ان کے لئے خلوت اور جلوت دونوں
ایک ہیں۔ ہر انسان کچھ اخلاقی قدروں کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن
ان کے نزدیک مروجہ اخلاق کی کوئی حیثیت نہیں۔ بلکہ وہ انھیں برا
سمجھتے ہیں اور ان کی تحقیر کرتے ہیں یا شاید انھوں نے ظاہر کو
تج دیا ہے۔ اور ان کا باطن ہی ظاہر بن گیا ہے۔

گلاب کا پھول سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ گلاب کا پھول کندن
لال کی کمزوری ہے۔ بے اجازت توڑ لینے یا اس کے چرا لینے میں بھی
وہ کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ جاڑوں میں جب آپ انھیں سوٹ
پہنے دیکھیں گے تو دل کے اوپر لال گلاب لگا ہوا آپ کو ضرور
دکھائی دیگا۔ اور اگر کوٹ نہ ہو اور گلاب مل جائے تو اپنی
انگلیوں میں دبائے رہینگے۔

کندن لال کی خوش اخلاقی بعض صورتوں میں اس حد
تک پہنچ جاتی ہے کہ لوگ انھیں شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں
خصوصاً خواتین کے باب میں۔ ہم نے بھی چند بار ان کے
التفات فراواں کو دیکھا ہے۔ اور اس پر انھیں ٹوکا بھی ہے۔
مگر کندن لال نے گھبرا کر نہایت سادگی سے جواب دیا کہ
"نہیں یہ بات تو نہیں ہے" مگر بدنیتوں اور بدطینتوں کا
کیا کیجئے۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا جاسکتا ہے کہنے کی زبان نہیں
پکڑی جاتی۔ جو لوگ کندن لال کی عادت سے واقف نہیں ہیں
سمجھتے ہیں کہ عورت کندن لال کی کمزوری ہے۔ اور واقعی
جب کسی خاتون سے سابقہ پڑتا ہے تو اس سے اس قدر گھل
مل کر باتیں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ریتے خلقی ہو گئے ہیں۔
لیکن دراصل یہ ان کا اخلاق ہوتا ہے ان کا جذبۂ احترام ہوتا ہے
اور تو اور متعارف ہونے والی خاتون کو بھی مغالطہ ہو جاتا ہے
کندن لال کا تذکرہ حسینوں کی زلف سیاہ کی طرح دراز ہوتا
جارہا ہے۔

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

بڑی محبوب اور رچی ہوئی شخصیت ہے کندن لال کی۔
جب صورت اور سیرت دونوں میں جمال و خلوص ہو تو انھیں
کیسے بھلایا جاسکتا ہے؟

---

خواہش لذت آرزو — صفحہ ۲۶ سے آگے

سفر کے بعد میں راحیلہ کے گھر پر موجود تھا۔ گھر میں ہنگامۂ
شادی بپا تھا۔ اگلے دن صبح کو بارات آئی ۔ دن خاطر
مدارات میں گذر گیا ۔ رخصتی کا وقت آگیا ۔ راحیلہ دلہن بنی
آنگن میں کھڑی تھی۔ ماں، باپ، بھائی، بہن اسے گلے لگا کر
اشکبار آنکھوں سے رخصت کر رہے تھے ۔ ایک طرف کھڑا
میں بھی یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ لیکن کون جانے میری آنکھوں میں
نمی کیسی ہے اور کون جانے میرے احساس پہ کیا گذری ہے۔
یہ مصرعہ میں اس طرح گنگنا رہا تھا جیسے اس سے کہہ رہا ہوں
؎ شہر دل میں غم دوراں کو نہ آنے دینا۔

آج مجھے دلی خوشی ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ میری تمنا
بہاروں کے گرداب میں پھنس رہی ہے۔ خدا اسے ہمیشہ اسی
میں رکھے۔"

میں یہ کہتا ہوا اسٹیشن کی طرف مڑا ؎
میں ہوں اور میری سلگتی ہوئی تنہائی ہے
خواہش لذت آرزو کو نیند آئی ہے

# آج کا نوجوان اور مشینی دور

مسرور ترمذی۔ بی۔ اے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی

آج کی دنیا گو بہت تیزی سے ترقی کے راستوں پر گامزن ہے۔ شہر کی زندگی ایک مشین کی چلتی پھرتی تصویر ہے جو کہ اپنے وقت سے پہلے رکنا ہی نہیں جانتی۔ اگر خدانخواستہ کسی وقت بہت تھوڑے سے عرصے کے لئے اس مشین کو رکنا بھی پڑتا ہے تو صرف تیل لینے کے لئے یا صفائی کے لئے۔ میرا مطلب آج کے مشینی دور سے ہے جس میں لوگ زیادہ سے زیادہ محنت اور مشقت کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ لوگوں کی فہرست میں جوان بھی ہیں بوڑھے بھی بچے بھی ہیں۔ خواہ وہ صنف نازک سے تعلق رکھتے ہوں یا صنف ثقیل سے۔

لیکن افسوس ہوتا ہے اگر آج کے اس دور میں بھی ان نوجوانوں کی صورتیں سامنے آجاتی ہیں جو کہ گھر میں بیٹھ کر فاقہ کر سکتے ہیں اپنی جوان بہنوں کو جو کہ اپنی جوانی کی عمر میں صرف مفلسی کا شکار ہونے ہوئے خاموشی سے دیکھتی رہتی ہیں۔ ان کی قوت گویائی بھی سلب ہو جاتی ہیں ان کی مثال کے لئے اگر بے زبان جانوروں کی تمثیل پیش کی جائے تو شاید غلط نہ ہو، جو بیکس و مجبور جانور اپنی زبان بے زبانی سے مالک کو اپنی تکلیفوں کو سمجھانا تو چاہتے ہیں لیکن یا تو مالک ان کی زبان کو سمجھ ہی نہیں پاتا یا سمجھتے ہوئے بھی مصلحتاً خاموش رہ جاتا ہے وہ جانوروں کا مالک یا بہ لفظ دیگر ہمارے وہ نوجوان جن کا اشارہ میں اوپر کر چکا ہوں۔ اپنی ناؤں کی یا بیوہ ماؤں کی سسکتی آوازیں سن سکتے ہیں، اپنے باپ کو جو کہ زمانے کی ساری صعوبتیں ساری پریشانیاں اٹھا چکنے کے بعد اب زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑا ہوا دیکھ سکتے ہیں لیکن باہر نکل محنت یا مزدوری کر کے ان کی دشواریوں کو دور نہیں کر سکتے ہا بلکہ اگر کوئی ہمدرد ان سے کچھ کہتا بھی ہے تو وہ بڑے اطمینان سے چار بہانے تراش کر اس کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا ہیں۔ عموماً ان کا ایک بہت گھسا پٹا بہانہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح چلنے لگتا ہے۔

" کیا کروں جناب آج کل مسئلہ روزگار اتنا دشوار طلب ہو گیا ہے کہ اگر آپ کے پاس کوئی بہت زوردار سفارش یا ذا نہ ہو تو آپ کو کوئی نوکری مل ہی نہیں سکتی۔ نوکری تو صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو کہ کسی بڑے صاحب کا بھتیجا یا بیٹا ہو یا سکریٹری کا رشتہ دار ہو یا کسی اور فرم کے منیجر یا ڈائریکٹر جان پہچان کا ہو۔ یا تو پھر اس کے پاس اتنا پیسہ ہو کہ وہ روز کے دفاتر میں کلرکوں کو چاندی کے جوتے مار سکے۔ لہٰذا میں تو عانی ان دونوں نعمتوں سے محروم ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے کیا کروں؟ اس میں میری کیا غلطی ہے۔ برادر محترم نے یہ با ٹیپ ریکارڈر کی طرح سنا تو دیں لیکن اس بات پر انھوں نے دانستہ میں ذرا بھی غور نہیں کیا کہ جس شخص کو جناب نے کافی بخش جواب دیا ہے ان سے ہی ابھی گذشتہ رات کافی بار میں ملاقات ہو چکی ہے جبکہ جناب دن بھر خوبصورت کلبوں ساتھ خوبصورت عمارتوں کو دیکھ دیکھ کر تھک کے پھر رہے تھے اور مخاطب نے ان کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا تھا کہ

ی گھر سے ایک انٹرویو لیٹر لیکر نکلتے تھے۔ اور انٹرویو
گہ تھا کس آفس میں تھا، اس آفس کے لئے کونسا راستہ
تی بس جاتی ہے؟ ان سب معلومات کو معلوم کرنے کی
کو تو ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ وہاں مطلب تو دوسرا یعنی
ات یار کا شرف حاصل کرنا اور گھر والوں کو مطمئن کرنا کہ کیا
دن بھر میں ایک ایک آفس، ایک ایک دوکان میں گیا لیکن
کو پتہ نہیں میرا چہرہ ہی دیکھ کر پتہ چل جاتا تھا کہ میں بے
کار ہوں۔ اور وہ لوگ چاہے دوکان کے سیلزمین صاحبان
یا آفس کلرک صاحبان، وہ اتنے زور سے گھور کر اور اتنی
آواز سے "کہئے" کہتے تھے کہ اپنی تو بس روح ہی فنا
ی تھی لیکن اس بے بسی میں گھبرایا نہیں تھا بلکہ اسی انداز میں
کرنے کی کوشش تو کرتا تھا لیکن کیا کروں میں مجبور ہو جاتا
وقت جب کوئی کلرک میرا مطلب سمجھ کر مجھے بڑے صاحب
سامنے کھڑا کر دیتا تھا یا کوئی سیلزمین مجھے سیٹھ کے سامنے کھڑا
اتھا تو بس پھر مت پوچھئے ایک دم سے میرا حلق سوکھ جاتا تھا
نا کچھ چاہتا تھا لیکن زبان کمبخت کچھ اور ہی بکتی تھی۔ اور
کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سیٹھ صاحب یا بڑے صاحب خوب
ار کر بہت ہی گرجدار آوازیں فرما دیتے تھے کہ بھئی یہاں تو
ال کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ اور اس کے بعد وہ دوسری
منہ پھیر لیتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ بس اب آپ تشریف
ئیے ورنہ کیا فائدہ مجھے اپنے چند خاص چپراسیوں کو آواز
پڑ جائیگا۔ بس جناب بندہ کو وہاں سے فوراً ہی "پیچھے
ر پیچھے دیکھے ہوئے سیدھے باہر بھاگ جانا پڑتا تھا۔

اب اگر کوئی مرد مقابل تجربہ کار اور دنیا کا ٹھوکر خوردہ
وہ فوراً اس منچلے نوجوان کو دوسری رائے پیش کردیگا کہ بھئی
تم کوئی چھوٹا موٹا روزگار ہی کیوں نہیں کر لیتے۔ اب اگر روزگار کا
ے ہی اس خوبصورت نوجوان نے فوراً ہی سرمایہ کا اعتراض
کر دیا تو اس شخص کی بات تو کٹ ہی جائیگی لیکن خدانخواستہ
ہیں اس نے کہا کہ بھئی آجکل کتنے پڑھے لکھے لڑکے جو کہ تمہاری
دو نایاب نعمتوں سے محروم ہیں لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح
محنت کرکے اپنا گذر بسر کر ہی رہے ہیں۔ کوئی اخبار بیچ کرکے
اپنا اور اپنے متعلقین کا گذر بسر کر رہا ہے تو کوئی پھل بیچ کر اور
یہاں تک کہ کچھ نوجوان تو ایسے بھی ہیں جو کہ رات دن رکشہ تک
چلا رہے ہیں، مزدوری کر رہے ہیں کیونکہ ان نوجوانوں کے
اندر ایک خوددار دل موجود ہے۔ وہ اپنی بہنوں کے سفید ہاتھ
نہیں دیکھ سکتے، وہ اپنی ماں کو خاموشی میں سسکتا نہیں دیکھ سکتے۔
وہ اپنے باپ کو چارپائی کو ٹیک کر اٹھتے اور نہ سنبھلنے پر بیماری کی
حالت میں گرتا نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اپنے گھر والوں کی خاطر
اپنی جان دے سکتے ہیں، اپنا خون پسینہ ایک کر سکتے ہیں۔
رکشہ چلا کر اپنا کلیجہ سکھا سکتے ہیں۔ منڈیوں میں رات رات بھر
سبزی و پھل بیچ کر سردی کھا سکتے ہیں۔ نمونیہ میں مبتلا ہو سکتے
ہیں لیکن تھک کر گھر واپس آنے پر اپنی نوجوان بہنوں کے ہاتھ
مہندی سے لال دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی ماں اور اپنے باپ کو
خوش خوش چھوٹے بچوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتے ہیں
ان نوجوانوں کو اپنے نام کی شہرت کی خواہش نہیں۔ اپنے کو
صاحب اور بابو کہلوانے کی خواہش نہیں ان کو صرف اپنے
خاندان والوں کی کم سے کم ضروریات زندگی پوری کرنے کی
خواہش ضرور ہے۔

اس جواب پر ہمارے وہ نوجوان جو کہ آج بہت
خوبصورت ہوتے ہوئے بھی آج کی تہذیب کے لئے آج
کے ترقیاتی دور کے لئے آج کے سماج کے لئے ایک بدنما
داغ ہیں جو کہ نہ مٹنے والے ہیں۔ جن کے داغ بجائے مٹنے کے
اور پختہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اگر ان کی یہ روش کچھ دن
اور برقرار رہ گئی تو وہ دن دور نہیں کہ یہ داغ بڑھتے
بڑھتے ایک بہت بڑا اور پختہ داغ بن جائینگے۔ کوئی جواب
نہیں دے سکیں گے۔

*—*—*—*

# انشاءِ فارسی

منتخب ڈاکٹر محمد یونس جعفری لکچرار دتی کالج دہلی

## وظیفہ ما نسبت بپدر و مادر

روزهای عمر با تبدیل بهفته و هفته تبدیل بماه و ماه تبدیل بسال میگردد. سالها با سرعت برق پشت سر یکدیگر میگذرند و ما از دوران خوش کودکی وارد مراحل شور انگیز و پر شر و شور جوانی و شباب میگردیم. از کودکستان بدبستان و از دبستان بدبیرستان و دانشگاه پا میگذاریم و روزی بخود میائیم و میبینیم برای خود باصطلاح کسی شده ایم و دیگران بچشم احترام بما مینگرند.

آیا تاکنون حتی برای یک لحظهٔ کوتاه بآن اشخاص مقدسی که در تمام این مراحل یار و پشتیبان ما بوده اند، بیچگونه کمک مادی و معنوی در مورد ما خودداری نکرده اند اندیشیده ایم و آیا میدانیم که این موجودات عزیز و فداکار چه بسا اوقات از ضروری ترین مایحتاج زندگی خود صرفنظر کرده و بخود فشار آورده اند تا بما بد نگذرد.

آیا میدانیم هنگامیکه ما در خواب خوش بوده ایم، ایشان بالای سر ما نشسته و مراقبت کرده اند که از گرما و سرما یا از شر حشرات گزنده در امان باشیم؟

آیا هیچ فکر کرده ایم زمانیکه ما سرماخوردگی مختصر یا تب خفیفی داشته ایم، شب تا صبح با کمال اضطراب بالای سر ما نشسته و برای سلامت ما با خدای بزرگ راز و نیاز کرده و هزاران مرتبه از او خواسته اند که سلامت ما را بما بازگرداند و در عوض تندرستی آنان را باز ستاند!

آیا اصلاً از خاطرمان گذشته وقتیکه ما مشغول تفریح هستیم و با دوستان خود گل میگوئیم و گل میشنویم، پدر مان با تمام نیرو و لیش با زندگی قهار پنجه در افکنده و در تحت شرائط مشکل توان فرسائی برای آسایش ما میکوشد و جان میکند؟

آیا میدانیم شست و شوی لباس و تهیهٔ غذا و خوراکهای گوناگونی که سفره های ما را رنگین میکند، با چه زحمت و مرارتی توسط مادر عزیز مان انجام میگیرد؟

و بالاخره آیا اطلاع داریم که وجود ما از هستی آنان است و آنها برای بزرگ کردن و تربیت ما عمر عزیز خود را تباه کرده و چه بسیاری از خواسته های ایشان را زیر پا گذاشته اند؟

آری میدانیم، خیلی خوب هم اطلاع داریم که این دو وجود گرامی و بزرگ چقدر بگردن ما حق دارند و اگر تمام عمر هم کمر بخدمتشان ببندیم حتی قادر نخواهیم بود یکی از هزاران رنجی را که در راه ما برده اند جبران کنیم، اما آنان بقدری بزرگوارند که از ما چنین انتظاری ندارند.

باغبانها با این امید گلها را میکارند و آنها را در مقابل باد و باران و سایر عوامل طبیعت حفظ میکنند که در فصل بهار از زیبائی آنها لذت ببرند.

پدران و مادران بمنزلهٔ باغبانها هستند و ما بمنزلهٔ گلها. انتظاری که آنان از ما دارند آنست که خواسته های ایشان را محترم بشماریم و در برابر اوامر آنان سرکشی و تمرد نکنیم درست که وقت کنیم می بینیم در همان خواسته ها و اوامر

[illegible]

# خبرنامہ

مرتبہ: ریحان الحق ایم. اے. بی.کام.

(تعلیمی درس گاہوں میں ہونے والی ادبی تقریبات کی مختصراً رپورٹ پیش کی جاتی ہے)

۹ر جنوری

## سید سلیمان اشرف صاحب کی قاہرہ سے مراجعت پر لجنۃ الادب کی طرف سے استقبالیہ

سید سلیمان اشرف صاحب لکچرار دلی کالج (شعبہ عربی) جو کافی عرصے سے ریسرچ کیلئے قاہرہ گئے ہوئے تھے اس سال کے شروع میں ہندوستان واپس تشریف لے آئے ہیں اُن کی آمد پر لجنۃ الادب دلی کالج دہلی نے ایک پُرشکوہ ادبی نشست منعقد کی. سب سے پہلے رضوان الحق متعلم بی.اے. نے ایک بسیط مقالہ ابن خلدون پر پڑھا اس کے بعد حافظ ضمیرالدین (متعلم بی. اے فائنل) نے اشرف صاحب کا استقبال کیا۔ آخر میں اشرف صاحب نے اپنی مختصر اور جامع عربی تقریر میں شکریہ ادا کیا اور مصر اور مصریوں کے حالات اپنے مخصوص انداز میں بتائے: آخر میں عبدالخالق صاحب نقوی لکچرار عربی اسکول آف فارن لینگویجز نے عربی میں مختصر تقریر کی اور پھر کام و دہن کی آزمائش کے سلسلہ پر یہ مجلس اختتام پذیر ہوئی

۳۰ر جنوری کو اردو رسم خط پر ایک اہم ادبی سیمینار ہوا پہلے روز صدر شعبہ اردو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے چند کلمات کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی کا افتتاحیہ خطبہ ریڈر شعبہ اردو ڈاکٹر محمد حسن نے پڑھ کر سنایا پروفیسر صدیقی اچانک طبیعت خراب ہونے کے باعث نہ آسکے تھے. اس خطبہ کے بعد کئی مقالات پڑھے گئے جن میں پروفیسر آل احمد سرور، جناب عتیق احمد صدیقی، رشید حسن خاں اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے مقالات قابل ذکر ہیں.

دوسرے دن مشہور ترقی پسند شاعر جناب علی سردار جعفری صاحب کے خطبہ صدارت کے بعد ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے قابل ذکر مقالے پڑھے اور بعد میں حاضرین کے اشکالات کے تسلی بخش جوابات بھی دئے۔

---

۲۹ - ۳۰ جنوری

## دلی یونیورسٹی میں اردو رسم خط پر منعقدہ سیمینار

دلی یونیورسٹی نے شعبہ اردو کے زیر اہتمام ۲۹ اور

---

یکم فروری

## انجمن فارسی دلی کالج کے زیر اہتمام شمیم صاحب کی تقریر آج کا افغانستان

شمیم قریشی صاحب جو کہ دلی کالج (دلی یونیورسٹی) سے

# مسخ شدہ شخصیت

(کہانی)

—— ہمایوں قدیر، کے جی کے کالج مراد آباد

وہ مجھے مسٹر اور مسز چاؤلہ کی بڑی لڑکی رجنی کی شادی کی خوشی میں دی گئی دعوت میں ملی تھی۔ سرخ جمپر اور سفید پاجامے میں ملبوس اسکے بے پناہ حسن کو دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا اور میرے ذہن میں شکیل بدایونی کی ایک رومانی غزل گونج گئی۔ اور میں اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر کسی نہ کسی طرح اسکے نزدیک پہنچ ہی گیا۔

"ھلو —— !" میں نے اسکی طرف ایک جال پھینکا۔

اس نے نخوت سے بھرپور نگاہوں سے ایک بار میرے سراپا کا جائزہ لیا اور پھر نہایت خوش اخلاقی سے گویا ہوئی

"ہلو ——"۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی ان دو متضاد رویوں پر۔ اسکی پُر نخوت نگاہوں کا انداز دیکھ کر تو میں یہ ہی سمجھا تھا کہ وہ بجائے جواب دینے کے میری طرف سے رخ پھیر لے گی۔ ہمت کر کے میں نے کہا "آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں —— ؟"

"کیوں —— ؟" لہجہ بڑا درشت تھا۔ میں اپنی غلطی پر دل ہی دل میں پشیمان ہو گیا۔ لیکن اچانک دوسرے ہی لمحے اس نے انداز بدل کر بڑی ادا سے کہا —" پہلے آپ خود اپنا نام کیوں نہیں بتاتے ——" میری تو گویا خواہش بر آئی۔

"خاکسار کو پال کہتے ہیں۔ اروند پال ——" میں نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

لمحہ بھر کیلئے اسکے چہرے سے بیزاری اور غصہ کے جذبات کا اظہار ہوا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے بڑے تپاک سے میرا آگے بڑھا ہوا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھ میں لے لیا۔

"مجھے تو آپ کہیں سے بھی خاکسار نظر نہیں آتے۔"

میں حیران رہ گیا۔ اس کی ہر ادا ایک دوسری سے متضاد تھی۔ میں سوچنے لگا عجیب لڑکی ہے دور سے دیکھنے پر خوبصورت سنگ مگر فولاد لگا —— چھونے پر ریشم کا تھان۔

میں نے جرأت کر کے پوچھا کہ

"آپ کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں۔"

"سچ —— ؟" اسکی آنکھوں میں مسرت ناچنے لگی۔

"یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں ——"

"آپ شاعر ہیں —— ؟"

"جی ہاں! شاعر ہی ہوں۔"

"کوئی رومانی شعر سنائیے۔"

"ایک شرط ہے ——"

"کیا —— ؟"

"شعر سنانے سے پہلے میں سرشار ہونا چاہتا ہوں۔"

"پھر —— ؟"

"آپ میرا ساتھ دے سکیں گی —— ؟"

"اوہ ... شیور ——۔"

میں اسکو بار کی طرف لے گیا

"کیا پئیں گی آپ —— ؟"

"جو آپ چاہیں۔"

"شیری۔ دو پیگ ——" میں نے بار مین سے کہا۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا ——" میں نے دو تین چسکیاں لے کر کہا۔

"کیا کیجئے گا پوچھ کر —"
"پھر بھی —"
"موری چنٹری —— آپکو پسند آیا — ؟"
"بے حد —"
"مجھے تو بالکل پسند نہیں ہے —"
"لیکن کیوں —؟"
"بس یوں ہی —"
"آپ کہاں رہتی ہیں — ؟" میں نے موضوع تبدیل کرنا چاہا

"آپ کی آنکھوں میں —" میں اسکے جواب پر چونک گیا۔ شاید یہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے میں نے غور سے اسکے چہرے کی طرف دیکھا مگر اسکی آنکھوں میں معصومیت کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا میں حیرت زدہ رہ گیا —— اچانک اس نے میری ٹائی کو اپنی مخروطی انگلیوں سے مس کیا اور بولی —
"آپ کی ٹائی بڑی خوبصورت ہے —"
"آپ کی آنکھوں سے کم ——"
اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور پھر گویا ہوئی —
"میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔"
میں اسکے اس عجیب رویے پر بوکھلا گیا اور نفسیاتی طور پر میرا ذہن چند لمحات کیلئے ماؤف سا ہو گیا۔
سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے قطعاً عاری ہو کر میں نے اپنا بایاں ہاتھ اسکی کمر میں ڈال دیا اور اسکو اپنے نزدیک کر لیا۔ لیکن میری اس حرکت پر اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔
چند لمحوں کے بعد جب میں حواس باختہ ہوا تو مجھے اپنے اس فعل کی سنگینی کا اندازہ ہوا اور میں نے شرمندہ ہو کر اپنا ہاتھ اسکی کمر سے ہٹا لیا۔ لیکن اس نے میری ان حرکات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا جیسے اسکے لئے یہ سب ایک معمولی بات تھی۔
میں اپنے حیرت زدہ ذہن کو سنبھال کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک ساٹھ سالہ بوڑھا ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گیا اور پھر اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔
"مسٹر یہ کیا بدتمیزی ہے —" میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا — بوڑھے نے کاٹ کھانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا اور انتہائی غضبناک آواز میں
"ہوش میں رہیئے — یہ میری بیوی ہے —" یہ کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس سے گھسیٹ کر لے گیا۔
"اب میری سمجھ میں اسکی مسخ شدہ شخصیت کی سا[ری] نفسیاتی تفصیل خود بخود آگئی اور میں دیر تک اپنی جگہ گم [سم] کھڑا اپنے معاشرے کی اس لعنت پر غور کرتا رہا۔

●●

---

## خبرنامے

صفحہ ۳۲ سے آگے

ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد سے افغانستان کے ہندوستانی [سفارت] خانے میں ترجمان کے فرائض انجام دے رہے ہیں [پچھلے] دنوں ہندوستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ انجمن [کی] گزارش پر آپ یکم فروری کو دلی کالج تشریف لائے [اور] افغانستان کے موجودہ حالات پر روشنی ڈالی۔
نشست کے آغاز میں سیکریٹری انجمن کی گزارش پر ڈاکٹر محمد یونس جعفری نے شمیم صاحب کا اپنے مخصوص و شگفتہ انداز میں شمیم صاحب کا تعارف کرایا اور ان سے گفتگو کے آغاز کی درخواست کی۔
شمیم صاحب نے افغانستان اور وہاں کے رہنے والوں کے بارے میں نہایت تفصیلی گفتگو کا آغاز وہاں کی جغرافیائی حالت اور موسموں سے کیا اور ادب و مراسم کے بعد سیاست پر ختم کیا۔ بعد ازاں لوگوں نے کچھ تحقیقی سوالات کئے جن کے نہایت خوش اسلوبی سے جواب دیا گیا۔ اسکے بعد چائے پر اس بصیرت افروز گفتگو کا اختتام ہوا۔

مرسلہ: صلاح الدین احمد
(سیکریٹری)

## ہمارے مقاصد

طالب علموں........
........ میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنا
........ کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا
........ کو ملک وملت کی بامقصد خدمت کیلئے تیار کرنا
........ میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا
........ کی آواز کو عوام تک پہنچانا
........ کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں
........ سے روشناس کرانا...... اور
........ سماجی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا۔
ادارہ

شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے اور غزلیں و نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول و کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں

ادارہ



طابع و ناشر و مالک ...... محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ ........ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

# شاہجہاں

طالب علموں کا۔ طالب علموں کیلئے طالب علموں کے ذریعے

مئی ........ ۱۹۷۱ء
جلد ۵ ........ شمارہ ۵

قیمت فی پرچہ ........ پچیس پیسے
سالانہ ........ تین روپئے





شاہجہاں آل انڈیا اسمال اردو نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (AISNEC) نئی دہلی کا ممبر ہے۔

مقام اشاعت:۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ بلیماران۔ دہلی نمبر ۶

جرعات
فہرست

ادارہ

# طلبا پڑھنا چاہتے ہیں

شعبہ اردو دلی یونیورسٹی سے متعلق اپریل ۱۹۷۱ء میں اردو ایم۔اے کا امتحان دینے والے کچھ طلباء کی طرف سے ایک مقدمہ پہلے ہی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس میں طلبہ نے الزام لگایا ہے کہ ممتحن کے دیے ہوئے ان کے نمبروں کو سازشاً کم کیا گیا ہے جسکے ذمہ دار صدر شعبہ وائس چانسلر اور کنٹرولر آف اگزامینیشن ہیں۔ اس مقدمے سے شعبہ کی جو بدنامی ہوئی ہے اور تعلیمی حلقوں اور سنجیدہ طبقے پر جو اثر پڑا ہے اسکا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ شخص اپنے شناسا کو (اگر وہ اس کی بھلائی چاہتا ہے) اردو ایم۔اے میں داخلے کا نہ صرف مشورہ نہیں دیتا بلکہ اس کو اس میں داخلے سے باز رہنے کی نصیحت کرتا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اردو ایم اے۔ میں اکثر وہی طلبہ (معذرت کے ساتھ) داخلہ لیتے ہیں جو کسی اور مضمون میں داخلے کے اہل نہیں ہوتے یا وہ طلبہ جن کا مستقبل ہی اُردو سے وابستہ ہوتا ہے۔ مگر ایسے طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

اس صورت میں ایک تو طلبہ کا پہلے ہی تعلیمی معیار پست ہوتا ہے دوسرے اساتذہ کی آپسی گروپ بندی اسکو تباہ کر دیتی ہے۔ اور اس گروپ بندی میں طلبہ کا آزادانہ استعمال تباہی میں آخری کیل ٹھونک دیتا ہے اور طلبہ "بے چارے طلبہ" ناخداؤں کے ہاتھوں اپنے مستقبل کے بیڑے کی غرقابی پر صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر پاتے۔ اسی گروپ بندی میں طلبہ کے استعمال کا ایک واقعہ پچھلے دنوں سننے میں آیا ہے اس واقعہ پر تبصرہ نہ کرتے ہوئے سب ہی استادوں سے مؤدبانہ درخواست کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ آپسی گروپ بندی کو ختم کر کے ذاتی مفاد سے نظر پھیر کر صرف طلبہ کا مفاد دیکھیں اور رزلٹ کو بہتر بنانے پر توجہ دیں۔ کیونکہ طلبہ پڑھنا چاہتے ہیں سیاست کی تربیت لینا یا کسی کے آلہ کار بننا نہیں چاہتے۔ اس سے جہاں شعبہ کا رزلٹ بہتر ہوسکے گا وہاں ڈیپارٹمنٹ میں صرف کوانٹٹی ہی نہیں بلکہ کوالٹی بھی ہوگی۔ ••

---

شاہجہاں آپ کی آواز ہے
اسکو مؤثر بنانے کے لئے
عام کیجیے ـــــــــ ادارہ

# داخلے کے لئے دِلّی میں ایڈوائزری کمیٹی

دہلی میں عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ کالج میں داخلے کے وقت طلبہ موزوں مضامین کا انتخاب نہیں کر پاتے۔ جس کی وجہ سے بعد میں ان کو پریشانی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کالج میں داخلے کے لئے جو پریشانیاں ہوئی ہیں اس کے پیش نظر دلی کے مختلف کالجوں سے متعلق چند معزز اساتذہ اور طلبہ ایک "ایڈوائزری کمیٹی" تشکیل دے رہے ہیں جس کا کام امسال دلی میں ہائر سیکنڈری پاس کرنے والے طلبہ و طالبات کو مناسب مضامین چننے میں مدد دینا نیز داخلے کے لئے ہر ممکن تعاون دینا ہوگا۔

اس سلسلے میں ہم ان ساتھیوں سے (جو خود کو اس کام کے لئے موزوں سمجھتے ہیں) درخواست کرتے ہیں وہ مذکورہ کمیٹی میں شامل ہونے کے لئے درج ذیل اساتذہ و ساتھیوں سے ملیں۔ یا براہ راست ہم سے رابطہ قائم کریں۔

دلی کالج

ڈاکٹر محمد یونس صاحب جعفری۔ شعبہ فارسی۔
جناب شبیہہ الحسن صاحب شعبہ عربی
" ضمیر حسن صاحب شعبہ اُردو
" شمس الاسلام صاحب ایم۔ اے (پیریولیس)
" مرزا لیاقت بی اے (آنرز) (فائنل)
جناب انیس الرحمٰن بی۔ اے آنرز (سیکنڈ ایر) دلی کالج (ایوننگ)

جناب عظمت اللہ خاں صاحب شعبہ اُردو
خالصہ کالج

جناب شہاب جعفری صاحب شعبہ اُردو
کروڑی مل کالج

جناب ڈاکٹر کابل قریشی شعبہ اردو
جناب محمد باردن ایم۔ اے (فائنل)
" قمر الحسن خان بی۔ اے (فرسٹ ایر)
جامعہ کالج

جناب معراج الدین۔ بی۔ اے سیکنڈ ایر
" منصور عالم " "
" انور سعید " "
" آفتاب احمد " فرسٹ ایر
" محمد شفیق صدیقی " "
دلی یونیورسٹی

" ریحان الحق۔ ایم۔ اے۔ ریسرچ اسکالر۔

# دہلویت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
شعبہ اردو دلّی یونیورسٹی۔

دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ رہی ہے۔ اس
ؔ جہ سے یہاں ہمیشہ سیاسی انقلاب آتے رہے ہیں کتنی
ار اسے بیرونی حملہ آوروں نے لوٹا اور برباد کیا۔
لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے انگریزی
کومت کے قیام تک دہلی جن حادثات سے دوچار ہوئی
ن کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کے غدر کی بربادی کوئی حقیقت
ہیں رکھتی۔ احمد شاہ ابدالی کے بے شمار حملے، نادر شاہ
درانی کی لوٹ مار اور قتل عام۔ دہلی کا قحط، بادشاہان
دہلی کی بے سروسامانی۔ یہ سب اس زمانے کی
داستان ہے۔ اس زمانے کے مورخین نے لکھا ہے کہ یہ
وہ زمانہ تھا جب بیگمات اور شہزادوں تک کو دو دو
وقت فاقوں سے گذارنے پڑتے تھے۔ صنعت گر کاریگر
درفنکار کسی قدر باقی نہ رہے۔ دہلی جو خوشیوں کا
ہوارہ تھی، نیچے اور ذلیل لوگ شرفا اور امراء پر غالب
آ گئے۔ اور انھوں نے بادشاہوں کو اندھا کیا، ان کی
آنکھیں نکلوا کر بازاروں میں جلوس نکالے۔ رعایا کو
تہ تیغ کیا۔ غرض اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے
تقریباً سو سال تک دہلی ایک ہنگامے سے دوچار رہی
خود میر لکھتے ہیں کہ کئی بار میرے جھونپڑے کو فوجیوں نے
روند ڈالا۔ شریفوں کو منہ چھپانے کی جگہ نہ ملی۔ ہر
سرف لوٹ مار بربادی اور تباہی کا دور دورہ تھا۔

مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما کر گل ہونے والا تھا اور
موجوں کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔

اس قسم کے سیاسی حالات میں یہ بات ناممکن تھی
کہ شاعری میں درد اور سوز وگداز نہ آتا۔ شاعر
جو خود اس فضا میں سانس لے رہا تھا ان تمام حوادث
سے گذر رہا تھا کس طرح اپنے خیالات اور ادب کی
پرورش ان تمام اثرات سے الگ کر سکتا تھا۔ لہٰذا
فطری طور پر غم کی لطیف چاشنی، درد کی مٹھاس
کسک اور سوز وگداز کی لہر تمام دہلوی شعراء کے
یہاں پائی جاتی ہے۔ مگر شاعری اس زمانے کے حالات
اور سیاسی سماجی معاشی زوال کی دردناک داستان
ہے۔ سوداؔ کے قصائد میں جھوٹی تعریف اور فرضی
خوبیوں کی بھرمار ہے۔ جو اس وقت کے بادشاہوں
میں نام کو بھی نہ تھیں۔ دردؔ کی غزل میں تصوف اور
دنیا کی بے ثباتی کا عنصر غالب ہے۔ یہ بھی انھیں
سیاسی حالات کا اثر تھا۔ ایک شاعر اگر سکون اور
اطمینان بھی تلاش کرتا تو صرف دل کی گہرائیوں میں
اور خانقاہی ماحول میں ہی اسے کسی حد تک سکون
مل سکتا تھا۔ ورنہ تمام عالم افراتفری میں گھرا ہوا
تھا۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں خوشی و شادمانی کے
حصے کاٹے جائیں تو یقیناً بے وقت کی راگنی ہوتے انھیں

حالات کا نتیجہ تھا۔ دہلی اصول اور دہلی کے رنگ سخن پر سوز و گداز، درد و غم اور تصوف اس طرح وابستہ ہو گئے کہ کوئی شاعر ان سے الگ نہ رہ سکا اور عوام بھی چونکہ انھیں چیزوں میں اپنی زندگی کا عکس دیکھتے اور انھیں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ غرض غم کی پذیرائی اور تصوف کی چاشنی دہلی کی غزل سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئیں۔ اس لئے دہلی کے رنگ سخن کا مطلب ہے سنجیدگی، درد و غم سوز و گداز تصوف اور انسانی اقدار کا تصور۔

دہلویت ایک خاص افتاد ذہنی یا مزاج شعری کا نام ہے۔ جس کا ظہور مخصوص تمدنی و تہذیبی اثرات کی وجہ سے ہوا۔ دہلی کا شاعر غم روزگار کا ستایا ہوا اور غم عشق کا مارا ہوا ہے۔ اس لئے اس کے کلام میں دونوں کی کسک اور کھٹک آ گئی ہے سیاسی حالات نے اسے بنایا۔ تصوف کی میراث نے اس میں روحانیت پیدا کی۔ اور اس کے ساتھ ایک اخلاقی نصب العین اور تصور عطا کیا۔ اس نے اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھولیں۔ اس کے سطحی پہلو نے امرد پرستی کو عام کیا۔ مگر اچھے شعرا نے اس میں ادر ڈوب کر عشق حقیقی کی منازل طے کیں تصوف کا منبع دل یا روح ہے عسرت یا دنیا سے بے تعلقی اس فلسفے کے اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ عشرت کا تعلق ظاہری اور ذہنی ہے۔ اس لئے ایک جگہ گہرے روحانی یا دلی جذبات کی کارفرمائی لازمی ہے، دوسری جگہ حواس کی رنگینیاں اور ذہن کی جولانیاں۔ ایک جگہ ظاہری دنیا بگڑی ہے تو اندرونی دنیا بنانے کے سامان ہیں دوسری جگہ تن کی دنیا کے بیچ میں دنیا کا خیال نہیں آتا۔ اس لئے ایک جگہ ہنسی ہے قہقہے ہیں اور دل لگی ہے تو دوسری جگہ نالہ و فریاد اور غم و اندوہ ہے۔ ایک جگہ قلب کی وارداتیں ہیں تو دوسری جگہ دماغ کی موشگافیاں، ایک جگہ دل کا تجزیہ ہے تو دوسری جگہ دماغ کا رسم۔ ایک جگہ شادی کے لئے دل کا گداز ہونا ضروری ہے تو دوسری جگہ صرف طبیعت کا موزوں ہونا۔ ایک جگہ درد ہے تو دوسری جگہ فن۔ مختصر یہ کہ ایک جگہ آہ ہے تو دوسری جگہ واہ۔ دہلی کا تمدن زندگی کا المیہ رخ پیش کرتا ہے۔ تو لکھنؤ کا طربیہ۔

بظاہر دونوں کیفیتیں زندگی کی تصویر اور تفسیر مکمل کرتی نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کی بنیاد مصنوعی یا فرضی حقائق پر نہیں ہیں۔ تصوف نے جہاں اسلام کو یہ فائدہ پہنچایا کہ اس نے سیاسی پستی کے زمانے میں منتشر شیرازۂ عقائد کو برقرار رکھا، وہاں اس نے یہ سخت نقصان پہنچایا کہ عقائد کی بنیاد ان نیم حقیقی مفروضات پر رکھی جو اسلامی نہیں تھے۔ دہلی کا تمدن بھی اس صوفیانہ تمدن کا پرتو تھا۔ مصنوعی حقائق پر تمدن کی بنیاد رکھنے کے باعث تمدن میں بھی وہ تصنع آ گیا تھا جو اس عہد کے رفتار کردار گفتار غرض کہ قومی اور اخلاقی زندگی ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ اس تصنع کو لوگ حقیقت سمجھتے رہے بتوں کو پوجتے رہے لیکن خدا مان کر۔

پرستش کی یاں تک سبھوں کی نظر میں خدا کر چلے

یہی تصنع اپنے طربیہ رنگ میں ہمیں لکھنؤ میں نظر آتی ہے۔ دہلی کے المیہ جذبات کی طرح لکھنؤ کی سرمستی اور خوشیاں بھی محض رسمی ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہاں کے بھی جذبات حرکات سکنات سب میں تصنع اور تکلف رچ گیا تھا۔ اور بقول شخصے زندگی سرے سے آداب مجلس ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی تمام بھڑک میں ایک سناٹا تھا۔ یہاں کا ماتم بھی ایک جذباتی تعیش رکھتا تھا۔ فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:—

"لکھنؤ بھر کی شاعری میں جو محبت کی چوٹیں اور جلن مثنوی زہر عشق میں ہے اور کہیں نہیں۔ اس

مثنوی کے وصیت نامے کو خلوص اور سوز و گداز کی یادگار بنایا جائے گا۔ لیکن اس وصیت نامے کے لب و لہجہ پر غور کریں تو خلوص اور سچے پن کا عجب میں نظر آئے گا۔ عاشق صاحب کا زہد کھا کے مسکراتے ہوئے اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے پھر بھی اٹھتا اس وقت کی جھوٹی اور بناوٹی زندگی کی چغلی کھا رہا ہے۔ اور اس وقت کی نام نہاد نشاطیہ شاعری میں نہ کہیں بذلہ سنجی ہے نہ حقیقی تر بد مزہ کر دینے والی سستی اور اوچھی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔
..... غرض اسلامی تمدن کے زوال کا ایک رخ دہلی پیش کرتا ہے دوسرا لکھنؤ۔ لکھنؤ کا عشق دیِ طرب ایک بجھے ہوئے چراغ کی آخری بھڑک تھی
عشق کی ماہیت پر اگر غور کیا جائے تو یہ ایک فطری جبلت ہے جس کی تسکین بہر حال لازمی ہے۔ خواہ رندی اور بوالہوسی میں اپنا جلوہ دکھائے منزہ ہو کر عشق الٰہی کی طرف راغب ہو جائے۔ اور پھر تمام زمین و آسمان میں عشق ہی عشق دکھائی دے۔ یا پھر عشق مجازی کی صورت اختیار کرے یا ذلیل امرد پرستی میں تباہ ہو جائے۔ دہلی میں بالعموم معشوق کوئی مطہر ہے لکھنؤ میں بالعموم کوئی طوائف۔ اس لئے دہلی کے شاعر کو ہجر نصیبی کے باعث عشق کی تکلیف سے زیادہ سابقہ ہے۔ لکھنؤ میں وصل نصیبی کے باعث آنکھ حسن کی رنگینی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ اس لئے دہلی میں داخلیت اور اس کی وجہ سے شعریت شاعر کے کلام میں نظر آئے گی۔ لکھنؤ میں حسن کی رنگینی اور خارجی لوازمات حسن کے بیان میں شاعر رنگین بیانی اور زبان کی تشکیل و ترصیع میں زیادہ مصروف رہے۔ عشق کی اس تفریق کے متعلق عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں ......

"حقیقت یہ ہے کہ جرأت و انشا سے پہلے غزل گوئی کے دو مختلف رنگ قائم ہو چکے تھے۔ ایک خواجہ میر درد میر اثر اور راسخ کا رنگ تھا جس میں عشق حقیقی کے پاک جذبات نہایت مناسب الفاظ میں ادا کئے جاتے تھے۔ اس لئے اس رنگ کو تصوف معرفت سے گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرا رنگ میر تقی میر کا تھا۔ جس میں عشق حقیقی کے ساتھ عشق مجازی کے پاک جذبات بھی شامل ہو گئے تھے۔ اور سودا قائم میر حسن اور بیان وغیرہ کا بھی قریب قریب یہی انداز ہے۔ قدما کے تیسرے دور میں مصحفی نے بھی یہی روش اختیار کی اور تغزل کا بہترین نمونہ قائم کر دیا تھا لیکن جرأت اور انشا نے اس حد سے آگے قدم بڑھایا اور شاعری میں رندی و ہوس ناکی کے جذبات کا عنصر غالب کر دیا اور یہیں سے اس معاملہ بندی کی بنیاد قائم ہوئی جس پر متاخرین شعرائے لکھنؤ نے بلند عمارتیں کھڑی کر دیں۔ لیکن با ایں ہمہ اب تک میر کے تغزل کا اثر قائم تھا۔ اس لئے جرأت کے کلام میں میر کے تغزل کا ایک حصہ شامل ہے۔

دہلی میں عشق کا سلک وہاں کے تمدن میں سرایت کئے ہوئے تھا۔ اس لئے داخلیت وہاں کی شاعری کا جزو اعظم ہے۔ جوں جوں عاشق پیشگی وہاں سے رخصت ہوتی ہے دیوانہ عشق کے بجائے فرزانہ عشق رواج پانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ متوسلین کے دور تک یہ تمام رواج پایا جاتا ہے۔ انفرادی اختیارات شاعروں میں نظر آنے لگتے ہیں معشوق کا نظریہ بھی چونکہ مختلف تھا اس لئے ہجر نصیبی

۔۔۔ ادوں میں خصوصیت کے ساتھ اساس کلام ہے لیکن
۔۔۔ دور میں یا تو معاملات کی طرف توجہ زیادہ
ہو جاتی ہے یا پھر لکھنؤ کی طرح لفظی صناعی کی طرف
۔۔۔ ہیں دہلی کے برخلاف دولت اور عیش وعشرت
۔۔۔ نی کے باعث زندگی سے لطف اٹھانے
اور ۔۔۔ نازک سے قربت کے زیادہ مواقع ملتے ہیں
لئے وہاں کی شاعری میں معشوق نگاہوں کا
۔۔۔ ہے۔ اور اس کی جلوہ گری کی کوئی ادا چھوٹنے
نہیں پاتی۔ بوالہوسوں کا الگ تازیانہ ملتا ہے شعراء
کی قدر و منزلت اور شہرت انھیں استاد فن کار
اور صناع بنے اور بنانے پر مجبور کرتی ہے۔ لکھنؤ
کے شاعر کیونکہ زیادہ ڈوب کر نہیں لکھتے تھے اس لئے
عشوہ گری سے کام نکالتے ہیں۔ وہ عشق کو موضوع
سخن بنائے رہے ہیں۔ عشق کی وارفتگی ان کے بس کی نہیں۔
صرف آتش ایسے ہیں جو مصحفی کے اثر سے لکھنؤ کی
سرد فضا میں اپنی شعلہ نوائی سے کچھ گرمی قائم
رکھتے ہیں۔ فراق گورکھپوری یہاں کی شاعری
کے متعلق صحیح لکھتے ہیں۔

"پورا لکھنؤ اور لکھنؤ کے تمام شعراء ایک ہی
رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مصحفی انشاؔ
جراُت ناسخ آتش امیر اور ریاض میں
اگر کوئی فرق ہے تو یہ وہ فرق نہیں جو
میر اور سودا میں تھا۔ یہاں ہر شاعر کی
خصوصیت کے باوجود مزاج شاعری میں
یک رنگی اور یکسانیت زیادہ ہے۔ یہاں
کا بنیادی رنگ ایک ہی ہے۔ یہاں شاعری
رسمی اور روایتی پہلے ہے اور انفرادی
و حقیقی بعد کو۔۔۔۔۔۔"

گویا میر کے دور کی غم گین یکسانیت کے بالکل برعکس۔
لفظی یکسانیت لکھنؤ میں جاری و ساری نظر آتی
ہے۔ رندی ، بوالہوسی کا جہاں تک تعلق ہے یہ انشاؔ

و جراُت کے زمانے سے شروع ہوئی اسی وقت
اس میں عشق مجازی کا بھی کوئی شائبہ نظر آتا تھا
لیکن ناسخ اور ان کے بعد کے عہد میں یہ محض رسمی
ہوتا گیا۔ جو برائے شعر گفتن خوب تھا۔

لکھنؤ اور دہلی کے عشق کے نظریہ میں جو فرق
ہے کسی توضیح اور تشریح کے بعد اب دوسرے
موضوعات کے فرق کو بیان کرنا ضروری ہے۔

تہذیب و تمدن ایک دل پسند زندگی رکھتا ہے
جو اسے ذہنی غذا باہم پہنچاتا ہے اور فلسفہ زندگی
سے اس کی قدریں بنتی ہیں۔ کبھی خالص مذہبی کبھی
خالص متصوفانہ کبھی رندانہ رجحانات قوموں کے
مزاج میں سرایت کرتے رہتے ہیں۔ اور شاعری
کا تعلق جو کچھ زندگی سے ہے اس سے تفکرات
شاعری میں بھی تراوش کر جاتے ہیں۔

دہلی شاعری فقر فاقہ میں پروان چڑھی۔
اصل حال و قال درویش اور فقیر کی صحبت میں
تصوف دہلی کے تمدن کا خاص طریقہ فکر و نظر رہا
ہے۔ اور اس میں کیا ہندو اور کیا مسلمان سب ہی
شریک تھے۔ وحدت وجود ہمہ اوست ہمہ از
اوست فنا فی اللہ فنا فی الذات تزکیہ نفس
تجرید وغیرہ تمام موضوعات تصوف دہلی کو
ایران کی تمدنی و ادبی تقلید میں حاصل ہوئے
تھے۔ یہاں کی سیاسی ابتری اور بدحالی نے اس
میراث کو اور بھی تقویت دی۔ دنیا کی نا
پائیداری اور زندگی کے نقش بر آب ہونا۔
اس قسم کے جملہ مضامین وہاں کی شاعری میں
راہ پا گئے۔ برخلاف اس کے لکھنؤ میں عیاشی
مرفہ حالی اور شہوت کے باعث یہ چیز وہاں عام
نہ ہو سکی۔

تصوف کو ایک قسم کا اخلاقی فلسفہ بھی ہے۔ جس
میں خیال اور فکر کی بلندیاں زندگی سے متعلق بصیرت کی

شاہ جہاں ۔۔۔

آنکھ ہے۔ دیکھنے کے نظریے اور اقبال ایک فلسفیانہ
بھی ترکیبی انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ بقول آزاد
کے کلام میں بھی تصوف ہے مگر اس کا راستہ کچھ اور ہے
جس سے وہ واقف نہیں۔

دہلی میں دلی کے زمانے سے لے کر ذوق اور
غالب تک یہ مضمون عاشقانہ مضامین کے بعد دوسرا
درجہ رکھتا ہے۔ اور شاید ہی کسی شاعر کا کلام ایسا ہو
جس میں یہ لے پائی نہ جاتی ہو۔ بلکہ بعضوں نے تو صوفیانہ
اور اخلاقی و عقائدی شاعری کو خاص اپنا ملکہ بھی بنالیا
تھا۔ میر فضل علی دانا نے صوفیانہ شاعری کو خاص اپنا
فن بنالیا تھا۔ اسی طرح شیخ فرحت اللہ فرحت اور میر
ولایت اللہ خاں نے بھی زیادہ تر تصوف اور توحید
سے سروکار رکھا۔ اور خواجہ میر درد کا تو اپنا یہ خاص
موضوع تھا۔ بلکہ اردو شاعری میں تو انھیں کا کلام
صوفیانہ شاعری کی سب سے اچھی مثال ہے۔

غرض کہ قدما یعنی دلی کے دور سے لے کر میرو
مرزا کے زمانے تک تو یہ حال رہا کہ درویش اور شاعری
دوش بدوش چلتی رہی۔

متوسلین شعرائے دہلی میں ذوق ظفر اور غالب
کے یہاں بھی یہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ
صوفی منش نہیں تھے۔ ذوق زندگی کے تجربات کو
اخلاقی رنگ دیتے ہیں۔ غالب کا دماغ فلسفیانہ ہے۔
ظفر اللہ اپنے کو درویش سمجھتے ہیں۔ جس طرح میر کے
دور کے بعد عاشق پیشگی کم ہوتی گئی اسی طرح تصوف
کا مسلک سودا سوز میرحسن ذوق غالب وغیرہ کے یہاں
ان کی زندگی نہیں ان کی شاعری ہے۔

معاملات حسن وعشق کے علاوہ تصوف شعراء کے
لئے گویا دوسرا میدان تھا۔ جس میں ان کا تخیل اپنی
وسعتیں تلاش کرتا تھا۔ موضوع کی تبدیلی کے خیال
سے اور مذاق زمانہ کا بھی لحاظ کرتے ہوئے بہت سے
صوفی شعراء صوفیانہ مضامین باندھتے رہے۔ دہلی میں
گویا واردات قلبیہ اور تصوف کے مضامین یہی دو
چیزیں تھیں جنہیں وہ وقتاً فوقتاً اور طرح طرح سے
کام میں لاتے رہتے تھے۔ لکھنؤ میں برخلاف اس کے
شاعروں کے تخیل نے دوسرے قسم کی وسعتیں تلاش
کیں۔

۱۔ صائب کی تقلید میں مضمون بندی یا خیال بندی۔
۲۔ صائب کی تقلید میں تمثیل کا رنگ اختیار کیا۔ یعنی
کسی دلیل کو قائم کر کے اس کا ثبوت بہم پہنچایا۔
۳۔ اثنا عشری مذہب کے باعث مرثیے نے زور پکڑا
اور اس مرثیت نے غزل میں بھی جنازہ نوحہ ماتم عالم نزع
اور مرثیت کے دیگر لوازمات پیدا کر دیئے تغزل میں
ان مضامین کے علاوہ شعرائے لکھنؤ نے اصناف سخن میں
وسعت دی۔ اور مرثیہ اور ریختی مثنوی وسوخت وغیرہ
مخصوص ہیں۔

تصوف کی اس تعلیم اور اس کے دوش بدوش
درویشی کی اس تربیت نے جذبات میں عشق اور
خیالات میں بلندی تو قائم ہی رکھی تھی لیکن اسکے
ساتھ اس نے اسلوب میں متانت اور اعلیٰ ....
سنجیدگی کو بھی پیدا کیا۔

لکھنؤ میں زبان دانی اور زبان سازی کا
احساس بھی اس زعم کے تحت ہے جو انھیں اپنی
سیاسی برتری اور عالی مرفہ حالی کے باعث
پیدا ہو گیا۔ اس احساس برتری نے انھیں ہر
بات میں دہلی کی مرکزیت سے منحرف کرنے پہ اور
خود اپنا مرکز قائم کرنے پہ مجبور کیا تاکہ دیگر
فنون کی طرح شاعری اور زبان میں اپنی برتری
دکھائیں اور ثابت کریں۔ اس احساس برتری
نے لکھنوی شاعری کی زبان میں جو بالامتیاز
خصوصیات پیدا کر دیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ فارسی اور عربی الفاظ کا کثرت سے استعمال
۲۔ قافیہ پیمائی یعنی تمام قافیوں کو ختم کر دینے کے

خیال کے باعث غزلوں کی طوالت ۔
۳۔ رعایت لفظی ضلع جگت اور مراعاۃ النظیر کی کثرت۔
۴۔ تشبیہ و استعارے میں پیچ دار
۵۔ مقطع و مرصع اور رنگین بندش اور اس سے بلاغت پیدا کرنے کی کوشش ۔
۶۔ محاورات و الفاظ صرف ان کی نسبت دکھلانے کے لئے استعمال کرنا ۔
۷۔ ابتذال اور عریانی ۔

عسکری زبان سازی کے متعلق تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں :

لکھنؤ میں اس زمانے میں تحقیق الفاظ اور رعایت لفظی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا جس کی ابتدا شیخ ناسخ نے کی اور ان کے شاگردوں کی کوششوں سے یہ رنگ رام پور اور لکھنؤ میں پھیل گیا یہی لوگ اصطلاح میں زبان دان کہلاتے ہیں رشک بحر سحر جلال برق واجد علی شاہ اختر اسیر وغیرہ۔ یہ سب الفاظ کے انتخاب میں نہایت جانفشانی کرتے تھے اور خیال رکھتے تھے کہ صحیح لفظ اور محاورے استعمال کئے جائیں۔ ہندی الفاظ اور محاورات کے استعمال میں بھی لوگ مستند سمجھے جاتے تھے اس چھان بین اور دقت نظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے الفاظ خارج کر دیئے گئے اور لغات شعریہ بہت کم رہ گئی۔ اس وجہ سے زبان میں ایک کرختگی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ جو الفاظ و محاورات منتخب شدہ تھے صرف مقرر کردہ طریقے پر استعمال کئے جا سکتے تھے۔ اور مقرر قواعد کی خلاف ورزی معیوب سمجھی جاتی تھی ۔

زبان سازی و زبان دانی کے زعم میں جہاں حضرات لکھنؤ ذلیل و شریف گل و خار کو برابر جگہ دے رہے تھے

دہلی میں زبان دانی کا معیار جداگانہ تھا۔ یہاں کی خصوصیت سادگی سلاست اور متانت ہے ۔ پیچیدہ بندش تھی متقدمین تک میں یہ سلاست و سادگی قائم رہی ۔

لکھنؤ کی اچھائیوں اور برائیوں کا اثر دہلی میں بھی اس وقت ہو چلا تھا چنانچہ نصیر ذوق اور ظفر کے یہاں دہلی کی خصوصیات بیشتر کم ہیں۔ لیکن عام دہلی کی زبان کی خصوصیات یوں منضبط کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ اختصار ۲۔ متانت ۳۔ سلاست و روانی و سادگی ۴۔ شگفتگی ۵۔ فارسی ترکیبیں۔ منشی وجاہت حسین جھنجھانوی نے دونوں مقامات کی معنوی اور لفظی خصوصیات کا احاطہ اس طرح کیا ہے ۔

دہلی ..... اردوئے معلی۔ فصاحت و سادگی سلاست ، ۵۶ ۔

لکھنؤ ..... اردوئے معلی۔ بلاغت رنگینی و رعایت لفظی ، داہ ۔

لیکن اس فارمولے کو زیادہ وضاحت سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے ۔

دہلی ..... (لفظی حیثیت سے) سادگی صفائی روانی فصاحت متانت شگفتگی گھلاؤ ۔ فارسی تراکیب

دہلی ..... (معنوی حیثیت سے) روحانیت یعنی واردات قلبیہ ۔ فلسفہ تصوف علو خیال بحر نصیبی ۔

لکھنؤ ..... (معنوی حیثیت سے) خارجی مضامین خصوصاً عورتوں کا سراپا زیور اور ملبوسات کے متعلق تمثیلیت مضمون بندی ابتذال ۔

(لفظی حیثیت سے) قافیہ پیمائی رعایت لفظی لغت سازی ——— مختصر یہ کہ دہلی میں شاعر اپنی معنوی حیثیت سے ایسی بنیادوں پر کھڑا تھا جو انسان کی زندگی کے ساتھ وابستگی اور قائم رہنے والی ہیں۔ یعنی حقیقت کی روحانی واردات انسان کی

زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں۔ اس لئے دہلویت اردو شاعری میں ایک ایسی کیفیت ہے جو ہمیشہ لطف دینے ہمیشہ قائم رہنے والی اور ہمیشہ نئے رنگ و روپ میں نئے سرے سے پیدا ہونے والی ہے۔ دہلی کا اس زمانہ کا ماحول بھی تغزل کے لئے بقول امداد امام اثرؔ:-

دہلی والے شاعری کر گئے، یہ صحیح ہے کہ دہلی سے دہلیت اس کے نقصان کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ لیکن دہلویت خود ایک نفس کیفیت ہونے کے باعث ضرور کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی شاعری میں جلوہ گر ہوتی رہے گی۔ برخلاف اس کے لکھنویت زبان پر اساس کلام رکھنے کے لئے ایک مخصوص ماحول مقام اور وقت کی پابند ہو کر رہ گئی۔ یہ گویا ایک علم مجلس تھا جو مخصوص اثرات کے تحت پیدا ہو کر اپنی چمک دمک دکھا کر رخصت ہو گیا۔ اب نہ ایسے مخصوص حرکات ہوں گے نہ کبھی یہ کیفیت پیدا ہو سکے گی۔ اس لئے لکھنویت اب محض ایک تلخ حیثیت رکھے گی جس کا اہم کارنامہ رنگینی بیان لغت تراشی اور زبان سازی سمجھا جائے گا۔

●●

## شکستِ پیہم

محمد احمد جاویدؔ

بارہا ناکامی نے حسرت کی کمر توڑی ہے
ورنہ اس بخت نے کب اپنی کسر چھوڑی ہے
یہ بھی ایک ہے کہ زمانے کے ستم اٹھائے ہیں
ورنہ جاویدؔ تم نے کب اپنی ڈگر چھوڑی ہے

## لوک پبلیکیشن لمیٹڈ دہلی کا قیام

### ایک انگریزی روزنامہ کے لئے جو اقلیتوں کی ترجمانی کر سکے۔

یہ لمیٹڈ کمپنی ایک انگریزی روزنامہ کے اجراء کے لئے کمپنیز ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہو چکی ہے جس کی بنیاد آنجہانی پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم نے رکھی تھی۔ موجودہ ممبران و ڈائریکٹروں چیئرمین حسب ذیل ہیں

۱- جناب مصطفٰے رشید شیروانی صاحب ممبر پارلیمنٹ الہ آباد چیئرمین۔
۲- جناب حکیم عبدالحمید صاحب ہمدرد ٹرسٹ دہلی ممبر
۳- جناب مولانا اسعد مدنی صاحب ممبر پارلیمنٹ و ناظم جمعیتہ العلماء۔ ڈائریکٹر۔
۴- جناب ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب صدر مسلم یو پی لکھنؤ ڈائریکٹر۔
۵- جناب (سابق) جسٹس بشیر سعید صاحب مدراس۔ ممبر
۶- جناب مظفر احمد لاری صاحب لکھنؤ ڈائریکٹر۔
۷- جناب بشیر احمد صاحب ایڈوکیٹ ہائیکورٹ الہ آباد۔

کمپنی کے حصہ کی قیمت دس روپیہ رکھی گئی ہے جو حضرات کو اقلیتوں کے مفاد سے دلچسپی ہو اگر وہ اپنے صوبے، شہر، ضلع میں اسکا تنظیم قائم کریں اور حصوں کی فراہمی وصولی کے انتظام میں دلچسپی لیں جو وقت کا تقاضا ہے اور ملت کی اہم ضرورت تو انشاء اللہ تعالیٰ چند ماہ کے اندر روزنامہ کا اجرا ہو سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں۔

بشیر احمد ایڈوکیٹ ہائیکورٹ ۳۳A کانپور روڈ الہ آباد۔

# اگر آپ "سینفورائزڈ" لیبل کے پیچھے جھانک کر دیکھیں...

...آپ دیکھیں گے کہ کتنے ہی لوگ متعدد طریقوں سے تجربات اور آزمائشیں کرنے، پیمائش کرنے اور رپورٹ مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ ماہرین ان "سینفورائزڈ" کے نگہبان ہیں جو اس چیز کا اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ کپڑا نہ سکڑنے کے لئے اس ٹریڈ مارک کے مالکان کی عائد کی ہوئی شرائط کی پابندی کی جا رہی ہے۔

اگر آپ خود غور کرنے کے لئے اس لیبل پر نظر ثانی ڈالیں تو یہ بار بار دھونے پر بھی کپڑا نہ سکڑنے کی قابل اعتماد ضمانت نظر آئے گا۔ یہ آپ کو یقین دلاتا ہے کہ آپ اپنے روپے کی پوری پوری قیمت وصول کر سکتے ہیں اور آپ کے خریدے ہوئے کپڑے اپنی اصلی فٹنگ پر قائم رہیں گے۔

آئندہ جب بھی آپ سوتی یا سوت ملے ہوئے کپڑے خریدیں ہمیشہ "سینفورائزڈ" کا لیبل دیکھ کر خریدیے۔ یہ ٹریڈ مارک قطعاً قابل اعتماد ہے۔

**·SANFORIZED·**

[illegible] سینفورائزڈ [illegible] صرف ان کپڑوں کے متعلق [illegible] استعمال کیا جاتا ہے [illegible] سکڑنے کی کڑی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

# ۱۹۷۱ کا وسط المدتی چناؤ اور اس کے نتائج

شمس الاسلام ایم۔ اے رسال اول) سیاسیات
دلی یونیورسٹی دہلی

۱۹۷۱ کے وسط المدتی چناؤ سے پہلے ایک خاصے طبقہ کا خیال تھا کہ یہ ہندوستان کا آخری عام چناؤ ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ہندوستانی سیاست اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں بہتری کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس انتشار کی بنیاد اس وقت ہی ڈال دی گئی تھی جبکہ متحدہ کانگریس دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ لیکن اس خیال کے حامی اقلیت میں تھے۔ پھر بھی اکثریت کا خیال یہ تھا کہ مسز اندرا گاندھی نے وسط المدتی چناؤ کا جوا کھیلنا منظور تو کرلیا ہے لیکن بس خدا ہی حافظ ہے۔ بات تو یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے کہا کہ مسز اندرا گاندھی وزیراعظم بن تو جائیں گی لیکن وہ ایک کولیشن گورنمنٹ (ملی جلی حکومت) کی ہی سربراہ ہوسکیں گی۔ ہندوستان کے مشہور سیاسی تبصرہ نگار نہال سنگھ نے تو روزنامے اسٹیٹسمین میں یہ پیشینگوئی کردی کہ اندرا کانگریس کو ۲۲۰ سے زیادہ سیٹیں ملنا ناممکن ہے۔ یو۔ پی کے شری چرن سنگھ کو پوری امید تھی کہ وہ وزیر اعظم کے چناؤ میں ایک اہم حصہ لیں گے۔ جبکہ جن سنگھ کے کچھ بڑے لیڈروں اور جن سنگھی روزنامہ مدرلینڈ کے خیال میں شری اٹل بہاری واجپئی کے علاوہ کوئی اور اگلا وزیر اعظم ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

لیکن واقعات نے سب کو غلط ثابت کردیا۔ مسز اندرا گاندھی جو اجیت گئیں۔ اور جیت بھی ایسی ہوئی کہ انھیں بھی ایسی جیت کی امید نہیں تھی ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستانی سیاست نے ایک نیا موڑ لیا اور ایک استحکامی دور میں داخل ہوگئی بہت اندازے غلط ثابت ہوئے عظیم اتحاد جسکے روح رواں جن سنگھ، نجلنگپا کانگریس ایس۔ ایس۔ پی اور سوتنتر پارٹیاں تھیں ملاکر اتنی سیٹیں بھی حاصل نہیں کرسکیں جتنی ان سب کو ۱۹۶۷ کے عام چناؤ کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔ پچھلی پارلیمنٹ میں ان چاروں جماعتوں کے پاس ملاکر ۱۶۲ تھیں۔ یہ تعداد وسط المدتی چناؤ کے بعد گھٹ کر ۴۹ رہ گئی ایس۔ ایس۔ پی جس کا الیکشن نعرہ تھا "اندرا ہٹاؤ دیش بچاؤ" پارلیمنٹ میں نہ ہونے کے برابر ہوگئی اس کو اس بار صرف ۳ سیٹیں ملیں جبکہ پچھلی پارلیمنٹ میں اس کی ۲۳ سیٹیں تھیں۔

اس الیکشن کا سب سے بڑا دھماکہ تھا نجلنگپا کانگریس کا صفایا۔ الیکشن نے یہ بھی ثابت کردیا کہ کونسی کانگریس اصلی کانگریس ہے۔ جو صوبے نجلنگپا کانگریس کے گڑھ سمجھے جاتے تھے وہاں بھی اس کا صفایا ہوگیا گجرات میں ۲۴ سیٹوں پر

۱۱- اندرا کانگریس کو میں اور اتنی ہی نجلنگپا کانگریس
حاصل کر سکی۔ میسور میں ساری کی ساری ۲۷
سیٹوں پر اندرا کانگریس قابض ہو گئی۔ تامل ناڈو
جہاں پر یہ کہا جاتا تھا کہ نجلنگپا کانگریس کے مسٹر
کامراج حکومت بنائیں گے وہاں اسمبلی اور پارلیمنٹ
دونوں کے چناؤ میں کامراج کو ناامیدی کے سوا
کچھ نہ ملا۔ بہار اور یوپی جہاں یہ امید کی جاتی تھی
کہ نجلنگپا کانگریس کی پوزیشن کافی بہتر ہو جائیگی
وہاں بھی اس کا حال خراب رہا۔ مغربی بنگال میں
تو بابو اتولیہ گھوش کی ضمانت بھی نہ بچی۔ الیکشن
کے نتائج کے بعد ساری نجلنگپا کانگریس
پر ناامیدی کے بادل چھا گئے۔ میسور اور
گجرات میں اس کی حکومتیں ختم ہو گئیں۔ پوری
مغربی بنگال یونٹ نے فیصلہ کیا کہ وہ سب کے
سب اندرا کانگریس میں شامل ہو جائینگے۔ اور
پھر یوپی میں بھی اس کی قسمت پر مہر لگا دی
گئی۔ جب اس کے بہت سے ممبران اندرا کانگریس
میں شامل ہو گئے اور نجلنگپا کانگریس کے
لیڈر ٹی۔ این سنگھ کو استعفیٰ دینا پڑا۔

وسط المدتی چناؤ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے
کہ اس الیکشن میں جتنی بھی علاقائی یا صوبائی
پارٹیاں تھیں ان کا صفایا ہو گیا۔ ۱۹۶۷ کے
عام چناؤ کے بعد ہندوستان کے مختلف کونوں
میں کئی علاقائی پارٹیاں ابھر آئی تھیں۔ قومی
پارٹیوں کے مقابلہ پر لوگوں نے ان علاقائی
پارٹیوں کو ترجیح دی تھی۔ یہ علاقائی پارٹیاں
ہندوستانی سیاست میں بہت سی برائیوں کا
سبب تھیں۔ یہ پارٹیاں علاقہ پرستی فرقہ پرستی
پھیلا رہی تھیں۔ شو سینا مہاراشٹر میں بنگلہ
کانگریس مغربی بنگال میں، بھارتیہ کرانتی دل
یوپی میں اکالی دل پنجاب میں۔ وشال ہریانہ
پارٹی ہریانہ میں، اتکل کانگریس اڑیسہ میں
اندرا کانگریس کے ہاتھوں بری طرح پٹیں۔
ان علاقائی پارٹیوں کی ہار اس بات کی ضامن
ہے کہ ہندوستانی سیاست میں صحتمندانہ رجحان
ایک بار پھر ابھر رہے ہیں۔ اور جو پارٹیاں ملک
میں انتشار، صوبہ پرستی اور علاقہ پرستی پھیلانا
چاہتی ہیں ان کا اس ملک میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔

اس الیکشن کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا
کہ رائے دہندگان سے براہ راست تعلق قائم
کیا گیا۔ ۱۹۶۷ کے عام چناؤ تک یہ عام رواج تھا
کہ رائے دہندگان عام طور پر اپنی کوئی رائے
نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ووٹرز کچھ لوگوں کے قبضہ میں
ہوتے تھے۔ ہر گاؤں یا محلہ میں ایک چھوٹا لیڈر
ہوتا تھا جو سارے رائے دہندگان کا سربراہ
کہلاتا تھا۔ اگر صحیح الفاظ استعمال کئے جائیں تو
ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ ووٹوں کی دلالی
کرتے تھے۔ رجنی کوٹھاری نے ان لوگوں کے
لئے Bank-Vote کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہر
امیدوار کے لئے ضروری تھا کہ وہ پہلے ان سے ملے
ان کی کچھ خدمت کی جائے اور پھر یہ کچھ لے دیکر
سارے رائے دہندگان کی قسمت کا فیصلہ
کرتے تھے۔ لیکن اس الیکشن نے ان سب کا بوریا
بستر باندھ دیا۔ مسز اندرا گاندھی نے ووٹرز
سے براہ راست اپیل کی اور جو لوگ ووٹوں کے
اجارہ دار سمجھے جاتے تھے ان کی کوئی پرواہ نہیں
کی گئی۔ اس کا نتیجہ بس مسز اندرا گاندھی کے
حق میں اچھا ہی رہا۔ جب ہر ووٹر سے براہ
راست اپیل کی گئی تو اس کو اپنے ووٹ کی
اہمیت کا علم ہوا اور اس نے اس کا بہت
سوچ سمجھ کر استعمال کیا۔

ہندوستانی سیاست میں ذات پات کو بہت

اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں سیاسی پارٹیوں کی
بنیاد عام طور پر ذات پات ہی ہوتی ہے۔ مثلاً بھارتیہ
کرانتی دل یو۔پی میں جاٹوں کی جماعت ہے۔ اسی طرح
وشال ہریانہ پارٹی ہریانہ میں اہیروں کی مدد سے
قائم ہے۔ یہاں تک کہ مختلف قومی پارٹیوں کو جو مدد
مختلف صوبوں میں دی جاتی ہے وہ بھی ذات پات
کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ پھر امیدواروں کا انتخاب
اور الیکشن بھی اسی بنیاد پر لڑا جاتا ہے۔ لیکن
وسط المدتی چناؤ میں ذات پات والی سیاست کو
ایک زبردست دھکا لگا۔ عام طور پر رائے
دہندگان نے ذات پات کے چکر میں نہ پڑ کر بلکہ
قومی پارٹیوں کی پالیسیوں پر ووٹ دیا۔

یہ چناؤ ہندوستان کا پہلا پارلیمنٹ کا الیکشن
تھا کہ جس میں الیکشن بہت ہی صاف اور واضح مسئلوں کو
بنیاد بنا کر لڑا گیا۔ ایک طرف تو وہ گروپ یا جماعتیں
تھیں جو ہندوستان کو ایک قدامت پسند ملک بنائے
رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہندوستان
میں اجارہ داری ختم ہو۔ بھارتیہ کرن ان کا نعرہ تھا
"عظیم ا " ایسی ہی سب قوتوں کی نمائندگی
کرتا تھا۔ اور دوسری طرف تھیں اندرا کانگریس
اور دوسری ترقی پسند پارٹیاں۔ جو ہندوستان
میں سوشلزم لانا چاہتی تھیں۔ ۱۹۷۱ کا وسط المدتی
چناؤ POLITICAL POLARIZATIONS کرنے
میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔

اندرا کانگریس کو شاندار جیت تو حاصل ہوگئی
لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ وہ سب وعدے
پورے کر سکے گی جو اس نے رائے دہندگان
سے کئے ہیں؟ فی الحال تو یہ سب بہت مشکل نظر
آتا ہے اور جس طرح سے اندرا کانگریس ان
وعدوں کو پورا کرنا چاہتی ہے اس حساب سے
تو یہ ناممکن ہی معلوم ہوتا ہے۔ سب سے بڑا خطرہ
یہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد لیڈر شپ انہیں ہاتھوں میں
پہنچ جائیگی جن سے اندرا کانگریس نے الگ ہو کر
چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ سارے ہندوستان میں
اسمبلی کے ممبران دل بدلی کر رہے ہیں اور اندرا
کانگریس کے ممبران کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے
کیا یہ ممکن ہے کہ کل تک جو ممبران رجعت پسند
فرقہ پرست اور سرمایہ داروں کے ہمدرد تھے
اندرا کانگریس میں شامل ہوتے ہی سیکولر اور
سوشلسٹ ہو جائینگے؟ یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے
جو شاید اندرا کانگریس کا بھی وہی حال کرے جو
اور پارٹیوں کا وسط المدتی چناؤ میں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہم الیکشن کے نتائج کا حقیقت
پسندانہ جائزہ لیں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ کل ۲۷
کروڑ ہندوستانی رائے دہندگان میں سے کل
۱۵ کروڑ نے جو کہ کل کا ۵۵.۵ % فی صدی ہوتا ہے
اپنے حق کا استعمال کیا۔

ان پندرہ کروڑ ووٹ میں مختلف قومی پارٹیوں
کا جو حصہ رہا ہے وہ اس طرح ہے:
اندرا کانگریس ۲۷۵ لاکھ نجلنگپا کانگریس ۱۵۲ لاکھ
جن سنگھ ۱۰۷ ،، ایس ایس پی ۳۵ لاکھ
سی۔پی۔ایم ۷۳ ،، سی پی آئی ۶۳ لاکھ

اگر ہم سب کا فی صد نکالیں تو ہمیں پتہ لگے گا کہ
کانگریس اندرا کو ۴۳.۰۵% ووٹ ملے اور ۳۵۰
سیٹیں۔ جبکہ "عظیم " (جس میں نجلنگپا کانگریس
جن سنگھ، سوتنتر پارٹی اور ایس ایس پی شامل
ہیں) کو ۲۳.۰۳% فی صد ووٹ ملے۔ اور صرف
۴۹ سیٹیں ہی حاصل ہو سکیں۔ نجلنگپا کانگریس کا
اپنا ووٹ ۱۰.۵% فی صد تھا۔ اندرا کانگریس
نے اس سے صرف چار گنا زیادہ ووٹ حاصل
کئے جبکہ جو سیٹیں اس نے بمقابلہ نجلنگپا کانگریس
حاصل کیں ۲۲ گنا زیادہ ہیں۔ ان حالات میں
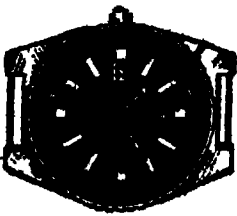
اندرا کانگریس کی جیت کو ایک عظیم جیت کہنا خود کو دھوکا دینا ہے۔ اگر اس جیت کو واقعی عظیم حقیقی روپ دینا ہے تو ان سب چیزوں کو پورا کرنا ہوگا جس کا عام لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔
اگر اس میں ناکامی ہوئی تو شاید اندرا کانگریس بھی تاریخ کے اسی کوڑے دان میں پڑی نظر آئے جو آج کل سوتنتر پارٹی، جن سنگھ، بنگلہ کانگریس اور ایس. ایس. پی کی آماجگاہ ہے۔

●●

---

# آنکھی دید
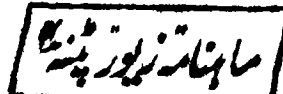

قمر الحسن خاں قمر بی۔ اے (سال اوّل)
کروڑی مل کالج دلی یونیورسٹی دہلی۔


کہتے ہیں کہ وہم کی دوا حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ اور یہ بھی درست کہ جس شخص کو وہم سے پالا پڑ گیا ہو تو یوں سمجھئے کہ اس کی زندگی کی مسرتوں کو پالا مار گیا مگر کبھی کبھی ایسے ٹھوس حقائق سامنے آتے ہیں کہ کچھ دیر کے لئے وہموں کی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کو تسلیم کرنے میں ہم حق بجانب ہوتے ہیں۔ مثلاً ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں صبح کالج جانے کے لئے جوں ہی گھر سے نکلا سامنے ایک محترمہ پر نظر پڑی۔ وہ ٹھیک میرا راستہ کاٹ کر آگے بڑھ رہی تھیں۔ کافی خوبصورت تھیں اور شاید خوب سیرت بھی۔ کیونکہ چہرے پر ایک ہلکی سی مسکان تھی خوش مزاجی کی دلیل تھی۔ مگر انھوں نے اس مسکراتے چہرے کو ذرا ادھر گھمایا تو معلوم ہوا کہ انکی ایک آنکھ پر سفید دھند کا راج تھا۔ انکی اس نیم نابینگی پر میرا دل دہل اٹھا۔ چونکہ یہ واقعہ گھر سے نکلتے ہی پیش آیا تھا لہٰذا بزرگوں کے قول کی ہلکی تہہ وہم کی صورت میں ذہن پر جمع ہو گئی۔ مگر میں نے اس وہم کی سلوٹ کو جھٹک کر صاف کر دیا۔ اور ان محترمہ سے نظریں بچاتا ہوا خوشی خوشی کالج روانہ ہو گیا۔

شام کو کالج سے آتے ہوئے اچانک مجھے صبح کا واقعہ یاد آیا۔ میں دھیرے سے مسکرایا اور سر کو جھٹک کر بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ تمام وقت بخیر و عافیت گذر گیا تھا میں بس اسٹینڈ پہنچا۔ بہت بھیڑ تھی۔ لڑکے لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف تھے اور نقرئی قہقہے فضا میں ترنم بکھیر رہے تھے کہ اچانک دور امید کے تارے کی روشنی نظر آئی، مگر جب وہ تارا پوری طرح چمکا تو مایوسی ہوئی کیونکہ وہ بس ہمارے لئے موزوں نہیں تھی۔ پھر انتظار شروع ہوا اور تقریباً دس منٹ بعد اچانک ایک بس تیزی سے مڑی اور کچھ دور جا کر رک گئی۔ تمام طالب علم دروازے کا نشانہ لیکر اپنی اپنی کتابوں کو سنبھالتے ہوئے جس طرح محاذ پر جانے والا سپاہی ہو اور ہتھیار سنبھال رہا ہو دوڑ پڑے۔ میں بھی بس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مگر اس بس کو چھونے کا شرف ابھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ ایک طرف سے دھکا لگتا تو دس قدم اُدھر نکل جاتا پھر اِدھر سے ریلا آتا اور دس قدم دوسری طرف نکل جاتا۔ اسی طرح آگے پیچھے ہوتے ہوتے اچانک ایک بار میرے ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرائے۔ اور میری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بس کا ڈنڈا تھا۔ میں نے مضبوطی سے اس ڈنڈے کو گرفت میں لے لیا اور پیر جو کہ ابتک زمین کو چوم رہے تھے، پائدان پر رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ پائدان بری طرح بھرا ہوا تھا اور اس کا فرش جوتوں کے بیچ میں سے بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اور ان جوتوں میں تھے مضبوط

سخت بوٹ، جوتے اور نرم و نازک پیر۔ ابھی ہم اپنی
کوشش میں ہی مصروف تھے کہ ظالم کنڈکٹر نے اپنا فرض
پورا کیا۔ سیٹی کیا بجائی گویا صور پھونک دیا۔ بس دھیرے
دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ میرا ہاتھ نہ جانے کس کس
کی ٹانگوں اور کس کس کی کمر کے بیچ سے ہوتا ہوا ڈنڈے
کو پکڑے ہوئے تھے۔ کہ اچانک ایک مضبوط ہاتھ کی
گرفت نے عین میرے ہاتھ کی گرفت پر جگہ لی۔ بس
تیز ہو چلی تھی۔ اب نہ تو میرا ہاتھ اوپر جگہ پا رہا ہے
اور نہ ہاتھ ہی نکل پاتا ہے۔ کہ اچانک آدھی کھڑی
ہوئی ایک خاتون کی زلفیں اڑیں اور ان کے بال
ٹھیک میری ناک کی اندرونی سطح سے ٹکرائے۔
بے اختیار ایک چھینک آئی اور اس جھٹکے سے میرا ہاتھ
اس شکنجہ سے نکل گیا۔ اور میں جو اب تک گھٹتا ہوا چل
رہا تھا سر تا پا زمین بوس ہو گیا۔

بس آگے بڑھ گئی اور میں وہاں پڑا اس
سینٹ کی مشک بار زلفوں کے بارے میں سوچ رہا تھا
کہ وہ میرے حق میں اچھی ثابت ہوئیں یا بری۔ میں
یہ سوچ رہا تھا اور اپنے آپ سے بے خبر تھا کہ کچھ
قہقہوں نے ان خیالات کو توڑ دیا۔ میں چونکا فوراً
اٹھ کھڑا ہوا۔ کتابیں سمیٹیں اور رومال سے خود کو
جھاڑتا ہوا اور کنڈکٹر کی شان میں قصیدہ گوئی کرتا
ہوا ایک کنارے جا کھڑا ہوا۔ اب جس طرف بھی نظر
اٹھتی چہروں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت
تھی۔ ناچار میں بھی آہستہ آہستہ مسکراہٹ کا جواب
مسکراہٹ سے دینے لگا۔ حالانکہ اس مسکراہٹ کو
لانا گویا جوئے شیر لانا تھا۔

خیر چھلی ہوئی کہنیوں اور گھٹنوں کی تکلیف کو
برداشت کرتا رہا اور مسکراتا رہا۔ مگر بات یہیں ختم نہیں
ہوئی۔ مجھے اپنے پیچھے اچانک کچھ نسوانی قہقہے سنائی
دیئے۔ گھوم کر دیکھا۔ فوراً ان لڑکیوں نے رومال
اپنے منہ پر رکھ لئے مگر آنکھوں سے اپنی ہنسی کا سبب بھی
بتا دیا۔ کہتے ہوئے کی زبان بھی [illegible] ہے
مگر لڑکیوں کی اس تضحیک آمیز ہنسی اور ان کی
آنکھوں کی شوخی کو نہیں روکا جا سکتا۔

میں اس مصیبت کے جھٹکے برداشت کر رہا تھا
کہ ایک سردار جی میرے پاس آئے اور ہمدردانہ
نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ پہلے تو میں ڈر گیا۔ مگر بعد میں
جب وہ اپنی داستان سنا چکے تو مجھ جان میں جان آئی
انھوں نے آتے ہی کنڈکٹر اور ڈرائیور کے خاندان
کی معزز خواتین سے اپنے رشتے واضح کئے اور پھر اپنا
حال زار بیان کیا جو کہ میرے حال کے عین مطابق تھا۔
مگر ان کی اس دلدوز داستان میں سڑک پر گرنا ہی
نہیں بلکہ سڑک ہونا بھی تھا۔ دو چار منچلے نوجوان
اس گدگدی سڑک کو پار بھی کر چکے تھے۔ ان کی بوٹ
پیر، کمر پر ان نوجوانوں کی دلیری کی مہر ثبت
تھیں۔ وہ روہانسی آواز میں اپنی سرگزشت سنا
رہے تھے اور وہاں موجود اس جم غفیر کی بے باک شرارت
بھری آنکھیں اور معصوم سی میری آنکھوں کا مرکز
تھے۔ دو ستم رسیدہ اور ایک دوسرے کے ہمدرد یعنی
میں اور سردار جی۔

جانے کتنی صدیاں گذر گئیں کہ اچانک دور
سے ایک بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں بے تحاشہ
بس کی طرف دوڑنے لگا۔ اس سے بے پرواہ کہ کس
نمبر کی بس ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح
اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ مگر اچانک
میرے قدم دوڑتے دوڑتے رک گئے اور قدموں کو
جمانے والے تھے وہ الفاظ یعنی "کیول ہی لائیں" اور
یہ گوند کی قسم کے الفاظ اس بس پر لکھے ہوئے میرا
منہ چڑا رہے تھے۔ چاروں طرف ہنسی کے فوارے
پھوٹ رہے تھے۔ اور میں پسینے میں شرابور تھا۔ میرا
تیزی سے دوڑنا اور پھر اچانک رک جانا گویا
دوسروں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرنا تھا۔ نہ

شاہجہاں پور

بھاگنے کی [illegible] تھی نہ ٹھہرتے ہی۔ ایسے میں مجھے خدا یاد آگیا اور میں نے نہایت خلوص سے زمین کے پھٹنے اور اس میں سما جانے کی دعا مانگی۔ دعا چونکہ نہایت عاجزی اور انکساری سے مانگی گئی تھی لہٰذا دربارِ ایزدی میں قبول ہو گئی۔ اور شاید اللہ میاں نے سوچا کہ اس پُر خلوص بندے کو مستقل اپنے سایۂ عافیت میں لینے کے لئے اس کی آزمائش کرو۔ مطلب یہ کہ زمین نہیں پھٹی مگر قہقہے ابلتے رہے اور میری جو حالت تھی وہ مجھے بالکل یاد نہیں (ماشا اللہ آپ بھی کالج کے طالب علم ہیں اس کا صحیح اندازہ تو آپ بخوبی لگا سکتے ہیں)

لڑکیاں میرے قریب سے گروہ در گروہ گذر رہی تھیں اور جس طرح نماز میں دونوں طرف سلام پھیرنا فرض ہے اسی طرح وہ لڑکیاں میری طرف منہ گھما کر ہنسنا اپنا فرض [illegible] رہی تھیں۔ ان کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا گویا میں انھیں قید کرنے چلا تھا اور خود ان کا قیدی بن گیا۔ میں ان حسین و نازک جلادوں میں گھرا ہوا تھا اور میری زبان بار بار ادبر کے تالو کو چھو کر اپنی مخصوص جگہ پر واپس آ رہی تھی۔ زبان پر اللہ تھا اور دل میں اس بس کے چلے جانے کی دعا۔ بس میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اپنی سہیلیوں کو بھی میری طرف متوجہ کرنے کے لئے بار بار شہادت کی انگلی میری طرف اٹھا کر مجھے دو حیلے سے قتل کر رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے بس اسٹارٹ ہوئی سارا ماحول اس سریلی آواز سے گونج اٹھا۔ کتنی سریلی آواز تھی۔ اس سہانی موسیقی نے میرے حواسِ خمسہ کو طاقت بخشی اور میں وہاں سے بھاگنے کو ہی تھا کہ بس پھر رک گئی۔ دروازے میں سے ایک سیاہ لڑکا پھول دار سرخ بشرٹ پہنے دو انگل کم ایک بالشت کا سینہ پھلائے بڑے نخرے کے ساتھ اتر رہا تھا۔ اس کے اترتے ہی بس چل پڑی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ خدا کی سب سے زیادہ نکتہ چیں مخلوق سے تو پیچھا چھوٹ چکا تھا۔ مگر جو رکے بھائی گرہ کٹ تو موجود تھے۔ خیر مجبوری کا نام ......... صبر کرتا رہا۔ طرح طرح کے فقرے دل و دماغ کو چھلنی کرتے رہے اور میری زبان تسبیح بنی رہی۔ آخرکار ایک اور بس آئی اور میں کامیابی سے اس میں سوار ہو گیا اور دور نہ جاتے ہوئے قریب ہی ایک محترمہ کے پاس بیٹھ گیا۔ سیٹ پر میرے بیٹھتے ہی انھوں نے گردن گھما کر دیکھا اور ان کے عارض شہابی ہو گئے۔ اور گردن دوبارہ گھما کر وہ تبیسی کی نمائش کرتی رہیں مختصر یہ کہ بس بھر گئی۔ اور اس سے پہلے کہ وہی غلطی پھر فضا میں پھیلے ایک بھاری آواز نے فضا کو لرزا دیا۔ "اے مسٹر" میں نے گھوم کر دیکھا۔ یہ یونیورسٹی کی ایک خاص چیز ہیں اور ایک بڑی سوشل ورکر ہیں۔ انھوں نے میری کلائی کے مانند اپنی ایک انگلی سے بس کی چھت کی طرف اشارہ کیا۔ میری نظریں اس سمت کی طرف مڑیں وہاں وہی گوندی قسم کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ مگر یہاں انھوں نے الٹا اثر کیا میں فوراً سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور انھوں نے اپنے جسم کا کچھ حصہ اس سیٹ پر ڈال دیا اور فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پے در پے حادثوں نے مجھے کبھی کمیونسٹ بنا دیا تھا۔ میں اس طرح کھڑا ہوا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور اگر ہوا بھی ہے تو میرے ساتھ نہیں ہوا۔

میں ڈھٹائی کے ساتھ کھڑا رہا اور شرارتی نظروں کا مقابلہ کرتا رہا۔ اور بس خدا کی طرف سے اس آزمائش میں میری جیت کے قریب تر ہوتی گئی اچانک ایک کرخت آواز نے "ریڈ کھپورٹ" (ریڈ فورٹ) کہا اور میری جان میں جان آئی۔

جب میں گھر کے قریب پہنچا تو کانپ اٹھا۔ سامنے ایک محترمہ پیدل جاتی ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے انھیں

آگے صفحہ ۲۳ پر

# خواب پریشاں

شمس الآفاق۔ ایف۔ ایم۔ بی۔ ایس۔ فائنل

خواب کے متعلق ہر زمانے کے پڑھے لکھے لوگوں نے مختلف نظریئے قائم کئے ہیں۔ وہ نظریئے غلط ہوں یا صحیح لیکن خواب کی دلچسپی اچھا علم ہے۔ پریشان کی صفت ممکن ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے ہو لیکن میرا خیال ہے کہ عموماً خواب پریشان ہی ہوتا ہے۔ خواب پریشاں انسان کی ایک قسم ہے جس کے مستحق بہت کم لوگ ہیں۔ اس لئے اس پر گفتگو کرنے سے کوئی خاص تفریح نہیں۔

خواب کیا ہے؟ خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب دینا صرف اپنے آپ کو فلسفی ثابت کرنا ہے۔ ورنہ خواب ہی حقیقت ہے۔ اور کچھ بھی ہو لوگ دیکھتے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ میں نے بھی اس موضوع پر مختلف مضامین پڑھے۔ کچھ کتابیں بھی پڑھیں، لیکن خواب کی حقیقت خواب سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ہمارے شعراء کرام کا خیال تو یہ ہے کہ زندگی ایک مسلسل خواب ہے۔ بس اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کبھی خواب میں دیکھتے ہیں کہ جاگ گئے اور خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن واقعتاً جب بیدار ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے یہ سب خواب ہی تھا۔

بہرحال شاعر اور فلسفی لوگ اپنی جگہ پر جو چاہیں کہیں میرا خیال یہ ہے کہ زندگی مسلسل ایک خواب پریشان ہے۔ اوسط درجے کے لوگ اس کے ہر منظر کو مشغل سمجھ کر مسرت میں وارفتہ اور غم میں از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جن کی نگاہیں حقیقت رس ہیں انکو اہل مسرت کی ... خود فراموشیوں اور غلط عقیدوں پر ہنسی آتی ہے۔ اور اہل غم کی پریشانی اور سینہ کوبی پر تعجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں خواب پریشاں کے یہ گذرنے والے مناظر ایسے ہیں جنکو مشغل سمجھ کر انسان غلط فہمی کا شکار ہو جائے یا غم سے پریشان ہو کر اپنے کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ شاید اسی مقام پر پہنچ کر ایک شاعر کہہ اٹھا ؎

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا<br>
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

انسان اپنی عقل و فہم سے یہ طے کرنے سے قاصر ہے کہ زندگی کیا خواب ہے۔ اور اس کے بعد جو عالم پیش آئیگا اس میں پہنچ کر اس زندگی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی۔

میں کوئی بہت تجربہ کار انسان نہیں ہوں، لیکن اپنے محدود تجربات کی بنا پر جب میں اپنے پچھلے واقعات کا جائزہ لیتا ہوں تو آج وہ مجھ کو خواب پریشاں سے زیادہ نہیں معلوم ہوتے۔ ایک دور تھا جب ایک مکتب کی فضا میں میں تعلیم پا رہا تھا میں خود بھی اس دار فانی میں نووارد تھا اور میرے ساتھی بھی اسی قسم کے تھے۔ لیکن زندگی کے بارے میں بہت سنجیدگی سے غور کرتا تھا

... کسی ادیب کی رائے سے کم نہیں سمجھتا ... بلکہ
اکثر مجھ کو اپنے بزرگوں پر ترس آتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ
مجھ کو سردی اور گرمی سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں۔
حالانکہ یہ چیزیں فطری ہیں۔ وہ بھی کیا سادہ دور تھا۔ آتے
جاتے نشست و برخاست اور گفتگو وغیرہ کے اتنے
سخت آداب نہیں تھے جیسے بعد میں ڈھیرے ڈھیرے
ضروری ہو گئے۔ اس وقت بھی ہم لوگ دنیا کے مسائل پر
اپنی رائے رکھتے تھے اور زندگی کے مسائل کو حل کرتے
تھے۔

آج جب ہم ان دور کے واقعات پر غور کرتے ہیں
تو وہ صرف ایک خواب پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ اس
وقت کی سنجیدہ باتوں پہ ہنسی آتی ہے۔ اور جیسے پریشان
خواب دیکھنے کے بعد انسان دیکھے ہوئے مناظر کو خیال
اور فضول چیز سمجھتا ہے۔ اسی طرح اس دور کی چیزیں
آج معلوم ہوتی ہیں۔

آج ہم بھی ایک دور سے گزر رہے ہیں۔ مسرت و
غم کے نظریے اس دور میں بھی ہمارے پاس ہیں۔ اگرچہ پچھلے
دور سے مختلف۔ اس دور میں اگر کوئی ہم کو جانوروں سے
تشبیہ دیتا تو ہمیں کوئی عجیب چیز نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن
آج الفاظ کے اتار چڑھاؤ پر ہمارا پارۂ غضب چڑھ
جاتا ہے۔ لیکن بہرحال اس دور کے نظریے ہیں۔
ممکن ہے آگے چل کر ہم اس پر بھی ہنسیں اور ان کو بھی اس
انداز پر دیکھیں جیسے پچھلے دور کے واقعات کو
دیکھتے ہیں۔ یا اس وقت دوسرے لوگ ہمارے
نقطۂ نظر کے بارے میں وہی رائے رکھتے ہوں جو
ہم ان کے بارے میں رکھتے ہیں۔ جنکو ہم عقل، علم میں
اپنے سے کم سمجھتے ہیں۔

بہرکیف زندگی کی کوئی منزل بھی ایسی نظر نہیں آتی
جو اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ مستقل ہوں اور جسکی
تمام قدریں قابل قبول سمجھی جاسکیں۔ یہی حال ادب اور
سائنس کے مختلف اداروں کا ہے۔ ادب میں ایک دور
ماہ نی اے

رومان پسندی کا تھا۔ لوگ صرف رومان پسندی پر
جان دیتے تھے اور ان افسانوں کو شوق سے پڑھتے
تھے جن میں رومانیت ہوتی تھی خواہ اس کا پلاٹ عقل
سے خارج اور وہم کی تخلیقات کے سوا کچھ نہ ہو۔ کسی
دل جلے نے کیا خوب کہا ہے ؎

محبت کے وہ مناظر جو تھے فردوس نگاہ
آج آتے ہیں نظر خواب پریشاں ہو کر۔

آخیر میں یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ زندگی شروع سے آخیر تک
ایک خواب پریشاں ہے۔ انسان مختلف مناظر سے گزرتا
ہے کبھی خوش ہوتا ہے اور کبھی رنجیدہ۔ لیکن کچھ دنوں کے
بعد گذری ہوئی باتیں افسانہ بن جاتی ہیں۔ اور آنے
والے مناظر ایک دلچسپ خواب پریشان معلوم ہوتے
ہیں۔ مقصد یہ کہ زندگی ایک خواب پریشان ہے۔
اور خواب پریشان ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اس
سے زیادہ معلوم کرنا دشوار ہے۔

(باقی اگلی دید)

پہچان لیا اور ان کی صبح والی مسکراہٹ کا مطلب بھی
سمجھ گیا۔ بجائے گھر کے میں مسجد میں پہنچا۔ اور میری اس
آمد سے مولانا حیران ہو گئے۔ وہ مجھے ایسے گھور رہے
تھے جیسے میں دوزخ سے بغیر اجازت لئے ان کی جنت میں
گھس آیا ہوں۔ اور میں بھی پہلی دفعہ اس جنت کو دیکھ
رہا تھا۔ ایک طرف جاکر میں نے وضو کیا نماز پڑھی اور دل
سے خدا سے دعا مانگی۔ یا الٰہ العالمین تو ہی سب کو روزی
دینے والا ہے۔ اس خوبصورت اور خوب سیرت خاتون
کا بھی تو ہی واحد سہارا ہے۔ مگر میرے معبود یا تو تو انکا
آفس اس راستے سے ہٹادے یا میرے غریب خانے کو
ان کی راہ سے دور کردے۔ آمین ثم آمین!

یہ آپ بیتی ہی نہیں بلکہ آپ پر بیتی ہوئی بھی ہو سکتی
آپ کو اعتراض تو نہیں؟ ○○○

# انمول سُندر اور سستی گھڑیاں

WORLD RENOWNED ALL PROOF WRIST WATCHES

یہ نئی اور خوبصورت ماڈل عمدہ مضبوط اور انوکھی گھڑیاں ہیں جو جرمنی کے بڑے اور مشہور نامی گرامی کارخانوں کی بنی ہوئی ہیں جو انتہائی پائدار ہیں اور معمولی جھٹکا لگنے سے ان کو نقصان نہیں پہنچتا۔ دیکھنے میں دو سو تین سو روپے کی گھڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اتنی کم قیمت پر گارنٹی کے ساتھ دوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ کے پاس یہ گھڑی دیکھ کر آپ کے دوست احباب بھی ہمیں آرڈر دیں گے۔ تجربہ بہترین کسوٹی ہے۔

سفید اسٹین لیس اسٹیل جرمنی
واٹر پروف شاک پروف
سفیما کالا ڈائل کیلنڈر
قیمت [illegible] محصول علاوہ

کوئی سی دو گھڑیاں ایک
ساتھ منگانے پر ایک
چین فری

جرمن میڈ سیاہ و سفید
ڈائل۔ واٹر پروف
اسپیشل کوالٹی مضبوط و خوشنما
قیمت -/85 محصول علاوہ

خوبصورت گولڈن الاسٹک چین قیمت -/10

سوئس ناولٹی ایمپوریم ۷۲۲ جامع مسجد پوسٹ بکس ۱۵۰۹ دہلی
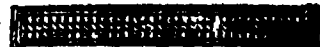
SWISS NOVELTY EMPORIUM, 722, JAMA MASJID
P. O. 1509, DELHI-6, Phone : 264920

شاہجہاں دہلی

# طویل خاموشی

نجمہ بخاری
گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول چشمہ بلڈنگ دہلی

شام کا وقت ہے۔ میں اپنے کمرے میں صوفے میں دھنسی ہوئی کتاب کے ورق گردانی کر رہی ہوں۔ ریڈیو بہت دھیمی آواز میں کوئی انگلش دھن سنا رہا ہے۔ قریب گول میز پر چائے رکھی کپ کی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ ممی رات کا کھانا پکانے میں لگی ہوئی ہیں۔ باہر والے کمرے میں نسرین اپنی سہیلی کے ساتھ کیرم کھیل رہی ہے۔ سہیل ماچس کے خالی ڈبوں سے میز کرسیاں بنانے میں مگن ہے۔

بھائی صاحب فٹ بال کھیل کر ابھی آئے ہیں۔

"ارے ........!" حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئی ہیں۔ میں چونک گئی ہوں۔ "یہ سب کچھ خواب نہیں ہو سکتا" اور بڑبڑاتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی ہوں۔ میں نے کتاب کو صوفے پر رکھا ہے۔ لیکن وہ میرے پیروں میں گر گئی ہے۔ میں اسکو اٹھانے کے لئے جھکی ہوں تو میرا دوپٹہ لٹک گیا ہے۔ میرے حواس گم ہو چکے ہیں۔ کیونکہ آج بھیا کے ساتھ وہ گھر آگیا ہے۔ "آوارہ ....... بدمعاش .....!" میں غصہ سے بھری آواز میں بڑبڑائی ہوں۔ "ایک ہفتے سے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔"

وہ اب اندر والے کمرے میں چلا گیا ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی ہوں۔ میں نے پردے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا ہے۔ وہ مینا کو گود میں لیکر پیار کر رہا ہے۔ سہیل اور نسرین اس کے قریب کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

"بے حیا! آنکھیں کیسی چلا رہا ہے جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو۔" میں غصہ سے بھری وہاں سے ہٹ گئی ہوں۔ میں نے ٹھنڈی چائے کی پیالی حلق میں انڈیل لی ہے۔ اور پھر کھڑکی میں آکر گلی میں دیکھنے لگی ہوں۔

سرکاری لائٹس ابھی نہیں جلی ہیں۔ پوری گلی میں اندھیرا ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو گلی کی تنگی ہے۔ اور دوسرے ایک گھنا اور کافی اونچا پیپل کا پیڑ ہے۔ جو مغرب سے پہلے ہی گلی میں اندھیرا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میرا دل اس تاریکی سے بھی اکتا گیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر اسکو دروازے سے جھانک کر دیکھا ہے۔

"جنگلی چائے پی رہا ہے" میرے لب ہلے ہیں۔ اور میں پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گئی ہوں۔ اور اسی کے بارے میں سوچنے لگی ہوں۔ ابھی ایک ہفتے پہلے کی تو بات ہے، میں انور جمال کے ساتھ اسکول سے آ رہی تھی۔ اسکول میں دیر کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ اور دوسرے ٹیوشن پڑھنے بھی جانا تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر پنواڑی کی دوکان پر کھڑا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ آنکھیں کچھ اداسی گھیرے تھیں۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے سگریٹ میرے پیروں میں پھینک دیا۔ سگریٹ میرے پیروں میں گرتے گرتے

بچا۔ اس وقت میں جلدی کی وجہ سے اس سے کچھ نہ کہہ سکی
اور غصہ سے بھری گھر آگئی ۔۔ اس دن وہ پھر ملا جب میں
ٹیوشن پڑھنے جا رہی تھی۔ جیسے ہی میں اس کے پاس سے
گذری وہ مجھ کو گھورنے لگا جیسے کھا ہی جائیگا۔ میں ڈر گئی
اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔
گلی میں موڑتے وقت میں نے کنکھیوں سے پیچھے مڑکر
دیکھا تھا۔ وہ گردن جھکائے آہستہ آہستہ پیچھے آرہا تھا۔
میں نے قدم اور تیز کر دیئے تھے اور جلدی سے مکان میں
داخل ہوگئی تھی۔ پھر تو وہ روز میرا پیچھا کرتا رہا۔ میرا کہیں
آنا جانا تلخ ہوگیا تھا۔ جب بھی میں گھر سے نکلی اسکو ایک ہی
جگہ کھڑا پایا۔ اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوتی، آنکھوں
میں ایک قسم کی چمک پیدا ہوتی، لیکن وہ ہمت نہیں کرپاتا تھا
مجھ سے بولنے کی ۔

میں نے سوچا تھا بھائی صاحب سے اس کی اچھی خاصی
مرمت کرادونگی ۔ یا پھر خود کچھ سہیلیوں کے ساتھ بے
چارے کا سارا عشق سینڈلوں میں چپلوں سے رفو چکر کر دونگی
لیکن میرے دل نے گواہی نہ دی۔ اور پھر میں خاموش
ہوگئی ۔

" میرا کیا حرج ہے، مجھے اس سے زیادہ اثر نہیں لینا
چاہیئے ۔" اس طرح سوچ سوچ کر میں نے اپنے دل کو
تسلی دیتی ۔

دو دن تک وہ بالکل نہ ملا۔ میرے دل کو قدرے
اطمینان ہوا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن تیسرے
دن پھر وہ وہاں موجود تھا۔ میں لرز گئی۔ میرا چہرہ خوف
اور غصہ سے تمتمانے لگا۔ اور میں پیر پٹکتی گھر واپس آگئی۔
لیکن آج ۔۔ آج وہ حضرت گھر میں تشریف فرما
ہیں۔ اور بھیا اسکو بیٹھے چائے پلا رہے ہیں ۔
" نمک حرام ۔۔ جالو کہیں کا ! "
" نجمی ۔۔۔ نجمی ۔۔۔ ! " شاید بھیا آواز دے
رہے ہیں۔ خیالات کی زنجیریں ٹوٹ گئی ہیں ۔
" بھیا کیا بات ہے ؟ " میں ان کی آواز کا جواب
بہت اکتاہٹ سے دیتی ہوں ۔
" ادھر آؤ ۔ میں تم کو ایک بہت اچھے لیکن مظلوم
آرٹسٹ سے ملواؤں ۔۔ " بھیا کے لہجے میں امنگ ہے ۔
" بھیا میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی ۔ میری طبیعت
ٹھیک نہیں ہے ۔ " میں اس ذلیل سے چھٹکارا پانے
کی غرض سے آواز بلند کہہ دیتی ہوں ۔
" لیکن نجمی ! آخر اتنی دیر میں ہو کیا جائیگا ؟ "
بھیا کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ میں بہت افسردگی کے ساتھ ان
کے پاس پہنچ گئی ہوں ۔ وہ مجھ کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے ۔
کتنی مکروہ ہے اس کی مسکراہٹ ۔" میں نے آنکھیں
جھکا لیں ہیں ۔ شاید وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا ہے ۔
" تسلیم ۔۔ ! " اس نے بہت ہی مودبانہ انداز
میں پہلی بار مجھ کو مخاطب کیا ہے ۔ کتنا شیریں ہے اسکا
لب و لہجہ ۔ میں حیرت اور استعجاب سے اس کو گھورنے
لگی ہوں ۔
" آپ ظفر ہیں، احمد آباد سے ایک ہفتہ ہوا
دہلی آئے ہیں ۔۔ " بھیا اس سے تعارف کرا رہے ہیں
" لیکن کتنے افسوس کی بات ہے ۔ ان کے خاندان
کے تین افراد فساد کی زد سے نہ بچ سکے ۔ جس میں
ایک جوان بہن اور دو چھوٹے بھائی ہیں ۔ بہن کا تو لا پتہ
ہے جسکا کچھ علم نہیں زندہ ہے یا مر گئی ۔۔ " میں محسوس
کر رہی ہوں بھیا کی آواز کپکپانے لگی ہے ۔ بھیا تعارف
جاری رکھتے ہوئے پھر کہہ رہے ہیں ۔ " وہ یہ تصویریں
بہت اچھی بناتے ہیں ۔۔ " بھیا خاموش ہو گئے ہیں ۔ میں
نے اس کے چہرے پر نظریں جما دی ہیں ۔ وہ نظریں
نیچی کئے خاموش ہے ۔ شاید رونا چاہتا ہے ۔۔
" کیا حقیقت میں یہ ہمدردی کا مستحق ہے ؟ " میں
اپنے شک کو حقیقت میں بدلنا چاہتی ہوں ۔
بھیا خاموش ہیں ۔ میں خاموش ہوں ۔ وہ خاموش
ہے ۔ فضا خاموش ہے ۔
" یہ نجمہ ہیں ۔ ہائر سیکنڈری میں تعلیم پا رہی ہیں ۔

باقی صفحہ ۲۸ پر

شاہ جہاں دہلی

# ٹیپو سلطانؒ

نجم الحسن انجم ادیب

سلطان ٹیپو ۲۰ ماہ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں بہ مقام دیون ہلی (ضلع بنگلور) میں پیدا ہوئے آپ کی والدہ کا نام فخر النسا اور والد کا نام نواب حیدر علی تھا۔ ارکاٹ کے ایک بزرگ حضرت ٹیپو مستانؒ کی دعا کا نتیجہ آپ کی ولادت تھی۔ اس لئے ان کے نام نامی آپ کا نام رکھا گیا تھا۔

آپ کو بچپن میں عربی و فارسی کی تعلیم دی گئی! فنون سپہ گری اور شہسواری کے گر بھی سکھلائے گئے، سولہ سال کی عمر ہی سے آپ اپنے والد کے ساتھ جنگوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ اور قلیل عرصہ میں بیباک سپاہی اور ایک اعلیٰ جنرل بن گئے۔

ابھی آپ تیس سال ہی کے تھے کہ آپ کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور اسی سال آپ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔ ایک عظیم شہنشاہ ہونے کے باوجود آپ سادگی پسند تھے۔ آپ کا لباس بھی بڑا سادہ تھا۔ اور انداز گفتگو میں ایسی شیرینی پائی جاتی تھی جو لوگوں کا دل موہ لیتی تھی اور گندے الفاظ منہ سے نکالنا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ آپ کی زندگی کے ہر پہلو میں اسلام کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ کبر و غرور کس چیز کا نام ہے اس کی "الف بے" سے بھی واقف نہ تھے۔ بعد نماز صبح قرآن مجید کی تلاوت کے بعد صبح کی سیر کو جاتے۔ زندگی میں کبھی نماز قضا نہ کی اس سے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے۔

"سرنگا پٹم میں آپ کی بنائی ہوئی مسجد "مسجد اعلیٰ" کے افتتاح کے موقع پر سوال یہ پیدا ہوا کہ اس مسجد میں اولین امامت کا شرف اسی کو حاصل ہوگا جو صاحب ترتیب ہوگا۔ بڑے بڑے اہل علم اور مشائخ حضرات بھی موجود تھے۔ مگر قرعۂ فال حضرت سلطان شہیدؒ کا نام نکل آیا۔ سلطان نے اعلان کیا کہ "الحمد للہ میں صاحب ترتیب ہوں۔""

آپ میں حیا کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ کیونکہ کسی نے آپ کے پاؤں گھٹنے اور کلائیوں کو برہنہ نہیں دیکھا تھا۔ اور دوسروں کی بے حیائی کے بھی وہ متحمل نہیں تھے۔ کرنل ولکس جیسا مورخ سلطان ٹیپو سے متعلق لکھتا ہے کہ:

سلطان کے محل میں کبھی تین سے زیادہ بیگمات ایک وقت میں نہ رہیں۔ سلطان کی شادی دو بیگمات سے ہوئی تھی۔ مگر سلطان کی شہادت کے وقت کوئی بیگم بھی زندہ نہ تھی۔

روایت ہے کہ عید کے دن سلطان ٹیپو اپنی والدہ کی قدم بوسی کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ قدم بوسی کے بعد وہیں آرام فرمانے لگے تو نواب حیدر علی کی حسین و جوان سال کنیزیں اپنے حجروں سے نکل کر آپ کے پیر دابنے لگیں۔ پیر کو ہاتھ لگنا ہی تھا سلطان کی آنکھ کھل گئی۔ اس منظر کو دیکھ کر سلطان نے بھانپ لیا کہ ان

کنیزوں کا ارادہ کیا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر خوف خدا سے لرزنے لگے۔

" اے کنیزو تم نے یہ کیا کیا؟ تم تو میری مائیں ہو۔ میں اس روسیاہی پر قیامت میں کیا جواب دوں گا۔" سلطان نے خواجہ سرا کو ہدایت دی کہ ان کنیزوں کو ایسی سزا دی جائے جو دوسروں کو عبرت کا باعث بنے۔

والدین کا بڑا احترام کرتے تھے۔ والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ کو ہنستے ہنستے سہہ لیتے۔ کبھی زبان سے اف تک نہ کرتے۔ دوست اور دشمن سے بھی صلہ رحمی کرتے تھے آپ رعایا پرور تھے۔ ہر لمحہ آپ کو اپنی رعایا کی آرام و آسائش کا خیال لگا رہتا تھا۔

آپ نہایت دلیر اور شجاع تھے۔ آپ میں بے تعصبی اور مذہبی رواداری بھی تھی۔ آپ کی دلی تمنا یہ تھی کہ ہر مسلمان کا بچہ بچہ اسلام کے سانچہ میں ڈھل جائے۔ آپ ایک بلند پایۂ عالم و فاضل شخص تھے علم کا بے حد شوق تھا اپنی نگرانی میں سرنگا پٹم میں "جمیع الامور" کے نام سے ایک یونیورسٹی بھی قائم کی تھی۔ یتیموں اور وارثوں کا خیال رکھتے تھے۔ اسی لئے آپ نے جابجا یتیم خانے بھی تعمیر کروائے

افسوس کہ میسور کے اس انمول جواہر نے ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمایا۔ ہر سال حکومت کی طرف سے عرس منایا جاتا ہے۔ دور دراز سے لوگ عقیدت کے پھول چڑھانے آپ کے مزار پر آتے ہیں اور گنبد سے یہ صدا انھیں سنائی دیتی ہے۔

" گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک روزہ زندگی بہتر ہے۔" ●●

---

(باقی یہ دلی ہے پیارے)

اس سے پہلے کہ رشید ہمارا نام لے کر ہمارے جھوٹ کا عقدہ کھولے۔ ہم وہاں سے فوراً چلے آئے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

(باقی طویل خاموشی)

ان کو بھی آرٹ اور ادب سے بہت لگاؤ ہے۔" میں نے خاموشی کے تسلسل کو توڑا ہے۔

" نیلوفر میری بھی ایک بہن تھی، جو فساد کی نظر ہو گئی۔ جس کا کچھ علم نہیں، خدا جانے کہاں ہے؟ زندہ ہے یا مر گئی بالکل تمہاری شکل و صورت جیسی — ہو بہو تمہارا نقشہ جس دن میں نے تمکو دیکھا میرے منہ سے نکل گیا... با" اس کی آواز رندھ گئی — وہ پھر کہہ رہا ہے۔

" میں سمجھا شاید......! " وہ کہتے کہتے رک گیا ہے۔ اس نے اپنا چہرہ رومال سے ڈھانپ لیا ہے۔ میں محسوس کر رہی ہوں — وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی زبان اس کے خیالات کو ظاہر کرنے میں اس کا ساتھ نہیں دے رہی — میرے اللہ میں کیا سن رہی ہوں — کیا کہہ رہا ہے وہ؟ کیا کہنا چاہتا ہے؟ وہ تو اب رو رہا ہے — میرا اسکو تسلی دے رہے ہیں — میں وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی ہوں — اور مسہری پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہوں — " افسوس میں نے ان کو غلط سمجھا — " میرے لب خود بخود ہلے ہیں — سارے ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی ہے —

طویل خاموشی۔

●●

---

(باقی انشاء فارسی)

دروازه های پر فروغ فردای تابان زندگی را
بر روی ماه زادان پدران آیندهٔ کشورم
بگشایم و با کمک سایر همکارانم جهل
و بیسوادی را از این مرز و بوم کهن سال
و باستانی دور سازم ●●

# انشاءِ فارسی

منتخبہ ڈاکٹر محمد یونس جعفری
شعبہ فارسی دلّی کالج دہلی

## نقشهٔ شما برای آینده چیست

سر پر شورم جولانگاه هزاران یک نقشهٔ گوناگون است و هر آن برای آینده خود نقشهٔ بزرگی طرح می کنم، اما وقتیکه بواقعیت می اندیشم و می بینم که دختر ضعیفی بیش نیستم و برای دختران در محیط ما هزاران مانع و اشکال وجود دارد تمام نقشه‌هایم بنقش بر آب میگردد و یکباره کاخ های طلائی رؤیاهای پر شکوهم در هم فرو میریزد.

بهر حال، بزرگترین هدف من در زندگی این است که طبیعت حاذق و قابلی بشوم و بخدمت همنوعان بیچاره و محرومم کمر بندم و دینی را که در قبال اجتماع و کشورم بگردن دارم ادا کنم.

هدف دیگرم این است که بدانشسرای عالی بروم و پس از ختم دورهٔ تحصیلات دبیر بشوم و با عفریت جهل و بیسوادی بجنگم و تا حد امکان بکوشم که پرده های نادانی و تاریکی را از هم بدرم و نونهالان کشورم را بسوی کمال راهنمائی کنم و زنان عقب افتادهٔ میهن عزیزم را بحقوق حقهٔ آنها آشنا سازم.

حاضرم جانم را فدا کنم و در عوض بهدف بزرگم برسم، لیکن هنگامیکه بتمام موانع موجود بسته بودن درهای دانشگاه بروی اکثریت طبقهٔ جوان کشور و دورهٔ طولانی رشتهٔ طب و از همه گذشته زندگی محدود خود. و نداشتن یک سری امکانات لازمه و سایر چیزها — می اندیشم، می بینم که هر چه بکوشم در شرائط فعلی زندگی به این مقصد نیست که بدان برسم.

از طرف دیگر وقتیکه فقر و مسکنت توان فرسای هم میهنان خود را می بینم و مشاهده می کنم که چگونه بعلت نداشتن پول کافی برای پرداخت حق ویزیت کلان و ظالمانهٔ اطباء، دسته دسته همچون موران ضعیف بر اثر امراض گوناگون جان می سپارند؛ عزمم جزم تر میگردد و بسر نفس ضعیف و جبون خود بانگ بر میدارم که «مگر نمی دانی مشکلی نیست که آسان نشود....؟»

بهر حال، فعلا در این مورد تصمیم خود را گرفته‌ام و تا پای جان برای عملی ساختن آن خواهم کوشید و وقتیکه پیش خود مجسم میکنم و می بینم دارم بیماران فقیر و مسکین را مجانی معالجه و مداوا میکنم، روحم آکنده از شعف و مملو از غرور میگردد.

آری تا سر حد امکان میکوشم و اگر خدای نکرده تیرم بسنگ خورد و نقشه‌ام عملی نشد، بهر صورت خویشتن را در بوتهٔ آزمایش خواهم گذاشت تا دبیر شوم و از این راه بتوانم بجامعه ام خدمت نمایم و

باقی صفحہ ۲۸ پر

# یہ دِلّی ہے پیارے

مزاحیہ

عتیق صدیقی

"دہلی میں شبینہ کالجوں میں مخلوط تعلیم نہیں ہے — جبکہ اسی عمارت میں دن میں مخلوط کلاسز لگتی ہیں۔"

ادارہ —

(مورخہ ۳ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کو ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوا)

"سنئے —" ایک نسوانی آواز نے ہماری سماعت کو جھنجھوڑا — اور ہم نے اس غیر متوقع آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب دیکھا صرف یہ جاننے کے لئے کہ چھ ہی بجے ہیں نا! کہیں ہم آج کالج سویرے تو نہیں آ گئے — کیونکہ مارننگ کلاسز چار بجے ختم ہو جاتی ہیں — اور مارننگ کے طلبا و طالبات پانچ ساڑھے پانچ بجے تک اپنے اپنے گھروں یا ان جگہوں کو رحلت کر جاتے ہیں جہاں انھیں کوئی پیمانِ وفا باندھنا ہوتا ہے یا ایفائے عہد کرنا ہوتا ہے — اور پھر کالج میں وہ طلبا و طالبا ...... جی نہیں صرف طلباء داخل ہوتے ہیں — جو طالب علم کم اور استاد زیادہ لگتے ہیں — ان میں کچھ ایسے بھی ہونگے جنکے فرزند اکبر کی عمر بھی شاید وہی ہو جو اس لیکچرار کی ہے جو ان کو پڑھا رہا ہے — ان کی شخصیت کے پیش نظر یہاں یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کو پڑھانے والا کوئی اور نہیں خود ان کے ہی قابل اور ہونہار برخوردار ہوں اور شائد گھر کے لئے واپسی بھی دونوں کی ایک ہی ساتھ ہوتی ہو — گھر پہنچ کر بیٹا باپ سے سوال کرتا ہے —

"ڈیڈی آج جو میں نے کلاس میں پڑھایا ذرا بتائیے کہ آپ کیا سمجھے؟"

اس پر میرے ڈیڈی بجائے ناراض یا غصہ ہونے کے اپنے بیٹے کی منت و سماجت کرتے ہوئے نہایت لجاجت سے کہتے ہوں —

"بیٹا خاموش رہو — دیکھو میری عزت کا سوال ہے تمہاری ممی سن لیں گی —"

"بڑے افسوس کی بات ہے ڈیڈی! اب آپ کی عمر وہ نہیں کہ مار پیٹ کر پڑھایا جائے — آپ تو خوب جانتے ہیں کہ آپ کی وجہ سے مجھ کو کلاس میں اور اپنے ہم جولیوں کے سامنے کتنی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے — آپ کو تو خود خیال ہو ...... —" اور اس سے پہلے کہ بیٹا اپنی بات پوری کرے، تو باپ کی بیوی اور بیٹے کی ممی آ دھمکتی ہوں —

"کیا ہوا بیٹا؟ کیا آج پھر انھوں نے کوئی غلطی کی ہے — معلوم نہیں یہ کیا کرتے رہتے ہیں —" اور اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لیکن شوہر کی جانب لہرا کر "اپنا نہیں تو کم از کم اپنے بیٹے کا ہی خیال کر لیا کرو — آخر یہ تمہارا استاد ہے — تم اب کوئی آٹھ دس سال کے ناسمجھ بچے نہیں ہو — ماشاءاللہ چالیس پینتالیس سال کی عمر ہے — اپنا اچھا برا خود سوچ سمجھ سکتے ہو —"

اس پر میرے ڈیڈی اپنا سر پیٹتے ہوں کہ وہ ایسے

شاہ جہاں دہلی

تاکہ لڑکے کے باپ ہی کیوں بنے۔ یا انھوں نے اپنے بیٹے کو اتنا قابل ہی کیوں بنایا۔ جسکی وجہ سے موصوف کو اب شرمندگی اور ندامت سے گہری دوستی کرنی پڑی۔

کچھ باپ ایسے بھی ہونگے جو اپنے بیٹے سے پڑھنے کی بجائے بیٹے کے ہمراہ زیر تعلیم ہونگے۔ یعنی وہ اپنے بیٹے کے کلاس فیلو ہونگے۔ اس صورت میں یوں تو والد محترم ہمیشہ ہی احساس کمتری کے شکار رہتے ہونگے۔ اور جب کبھی وہ اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے اپنے کسی ساتھی سے "پر اکسی" کو کہتے ہوں اور خود "شیلا" پر انٹرنیری کی فار ایڈلٹس قسم کی فلم دیکھنے جاتے ہوں۔ ایک روپیہ ساٹھ پیسے یا دو روپیہ چالیس پیسے کا ٹکٹ خرید کر جب وہ اندر ہال میں پہنچے ہوں تو پچھلی روؤں میں اپنے فرزند ارجمند کو براجمان دیکھ کر بجائے اسکو ڈانٹنے ڈپٹنے کے خود اس کی نظروں سے چھپتے ہوئے کھسک آتے ہوں ـــــ امتحان کے نزدیک نوٹس تیار کرنے کے معاملے میں وہ اپنے بیٹے کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ریک ... کاپی نکال کر نقل کرتے ہوں۔ نقل کرنے کے بعد کاپی بند کرتے وقت اس پر کلاس کے دوسرے لڑکے نہیں آدمی کا نام پڑھ کر اپنے لڑکے کو اپنے نقش قدم پر چلتا پاتے ہوں۔

تو جناب یہ حال ہے ایوننگ کلاسز کے طلبار کا ہمارے جیسے نو عمر طالب علم تو آپ اپنے دونوں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کی چند انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

ہماری گھڑی میں سوا چھ بجے تھے۔ گویا فرسٹ پیریڈ شروع ہوئے پندرہ منٹ گذر چکے تھے۔ اور ہم کو اپنی تین سالہ پرانی اور وقت کی پابند گھڑی پر پہلی بار شک ہوا کہ یہ کچھ تیز چل رہی ہے۔ کیونکہ سوا چھ بجے کالج میں کسی لڑکی کا ہونا ایسا تھا جیسے سورج کی روشنی میں کسی تارے کا نظر آنا ـــ ہم نے سوچا یہ آواز کسی لڑکی کی نہیں ہو سکتی، یہ محض ہمارا وہم ہے جس میں حقیقت کی

رمق صرف اتنی ہے جتنی الیکشن سے قبل کسی امیدوار کے کیے وعدے میں سچائی کی ـــ کیونکہ بچپن سے لیکر آج تک کسی لڑکی نے ہمارے دل کے نہاں خانوں میں جھانکا تک نہیں۔ ہائر سیکنڈری تک اسکول میں پڑھا جہاں مخلوط تعلیم نہیں ہوتی۔ اور اب کالج کی تعلیم کے لئے بھی ہماری بدقسمتی نے ہم کو ایوننگ کالج میں ڈھکیل دیا جہاں لڑکے اور لڑکیاں نہیں آدمی اور صرف آدمی پڑھتے ہیں۔ اب جب کبھی کالج چھ بجے سے بیشتر آ جانے کا اتفاق ہو جاتا ہے تو دن کی روشنی میں ہم کو اپنے کالج کی عمارت اجنبی اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ اور کلاسوں میں لڑکوں کو لڑکیوں کے ساتھ دیکھ کر ہم کو ان کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگتا ہے۔ اور ایک آہ ہمارے دل کی گہرائیوں سے دھنا کو مکدر کرتی ہوئی "کاش ہم بھی مارننگ میں ہوتے" فضا ہی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

اور پھر ایک دن ـــــ دن نہیں رات ـــ ہمارا دل پڑھائی میں نہیں لگتا۔ بلکہ ہم اپنے کسی ہم خیال دوست کے ہمراہ اپنی بدقسمتی پر ماتم سرائی کرتے کینٹین چلے جاتے ہیں، اور یا کسی فلم میں جا کر اپنا غم غلط کر لیتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک شام کا ذکر ہے کہ مارننگ کا کوئی فنکشن چل رہا تھا۔ جس میں مارننگ کے طلباء و طالبات شامل تھے۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ مگر فنکشن بحسن و خوبی جاری تھا۔

ساڑھے چھ بجے فنکشن ختم ہوا۔ ہم حسب معمول کالج پہنچ ہی چکے تھے۔ اور وہیں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ فنکشن کے حاضرین کو نکلتا دیکھ رہے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک صاحب کو نہ معلوم ایک صاحبہ کا نام کیسے معلوم تھا۔ انھوں نے ایک لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کا نام شمیم ہے" بس جیسے ہم اس کے منتظر تھے "ارے بھئی شمیم" اور اپنا نام سننے پر جب شمیم اباؤٹ ٹرن (ABOUT TURN) ہوئیں تو ہم نے اپنا سر دوسری جانب موڑتے ہوئے ایک صاحب کو کہا۔

" ذرا سنئے۔" سب سناٹے میں پڑ گئے اور محترمہ نعیم صاحبہ کھسیانی ہو کر چالیس میل کی رفتار سے پا بہ رکاب ہو گئیں۔

یہ واقعہ بھی اسی شام کا ہے کہ ہم کھڑے تھے ایک صاحبہ نہایت تیز رفتاری سے چل رہی تھیں جیسے چولہے پر رکھا دودھ ابل رہا ہو اور یہ اسکو اتارنے جا رہی ہوں۔ اس پر ہم نے بغیر ہچکچاہٹ کے کہہ دیا "اتنی جلدی کیا ہے......" ان کی چال پر جیسے بریک لگ گیا ہو۔ وہ قہر آلود نظروں سے ایک لمحہ ہم کو گھورا اور پھر اچانک جیسے ان کو ابلتے دودھ کا خیال آگیا ہو وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئیں۔ ان کے بعد ہم نے دوسری لڑکیوں کو دیکھنے کے لئے جو اپنی گردن کو موڑا تو سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر اپنے لیکچرار مسٹر خان کو کھڑا دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ ان کی نگاہیں، ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انھوں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ بس صاحب پھر کیا تھا ہم دم دبا کر بھاگ لئے۔ اب ہم آپ کو یہ کیوں بتائیں کہ بعد میں ہم کو مسٹر خان کی دی ہوئی جھڑکیوں کو بغیر تامل قبول کرنا پڑا تھا۔

" ذرا سنئے!" ہم کو خاموش دیکھ کر وہی آواز پھر گونجی۔ اور اب ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مڑ گئے۔ سامنے ایک محترمہ سہمی سہمی سی گھبرائی ہوئی ہم کو گھور رہی تھیں۔ شاید وہ ایوننگ کے طلباء و اساتذہ میں تمیز نہ کر پائی ہونگی۔ اور اب تک ان کی نظروں سے گذرے ہوئے "لوگوں" میں سے ہم ہی طالبعلم نظر آئے ہونگے۔ اسی لئے وہ ہم سے مخاطب ہوئی تھیں۔ اور ہم کو ان کی بے چارگی پر رحم آگیا۔

" فرمایئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں ؟" ہم گویا ہوئے۔

" مجھ کو رشید صاحب سے ملنا ہے۔" انھوں نے فوراً جواب دیا۔

" کیا کام ہے آپ کو ان سے۔؟" یہ ہمارا اگلا سوال تھا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ رشید ایسے شریف سے ملنے کے لئے کوئی لڑکی نہیں آسکتی۔

" ان سے ملنا ہے۔" انھوں نے ٹالنا چاہا۔

" کوئی خاص کام ہے۔؟" ہم بضد رہے۔

" جی۔ جی ہاں۔" وہ فوراً بولیں۔

" تو فرمایئے! مجھے ہی رشید کہتے ہیں۔" ہم نے یہ جانتے ہوئے کہ پورے کالج میں رشید صرف ایک ہے سفید جھوٹ بول دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رشید ہمیشہ اپنی پاکدامنی کے گن گاتا تھا۔ آج اسکی پاکدامنی کا بھانڈا پھوٹ رہا ہے۔ اسکو کوئی اور نہیں ایک لڑکی بلانے آئی ہے۔ جسکو اس سے ایک ضروری کام ہے۔

آپ سے نہیں دوسرے رشید صاحب سے ملنا ہے انھوں نے جواب دیا۔

" رشید نام کا کوئی دوسرا طالب علم تا حال کالج میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اس سال کوئی داخل ہوگا تو میں مطلع کر دونگا۔ پتہ نوٹ کرا دیجئے۔" یہ کہہ کر ہم کاغذ اور پین سنبھالنے میں مصروف ہو گئے اور اس سے پہلے کہ ہم لکھنے کو تیار ہو پاتے وہ ایک دم چیخی۔

" رشید بھائی!" ہم نے گردن اٹھائی اور سامنے سے رشید کو آتا دیکھ کر اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین کو سرکتا محسوس کرنے لگے۔ سوچا اب کیا ہوگا؟ دل میں خیال آیا کہ رشید کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی محترمہ سے معذرت کر لیں۔ مگر برا ہو دماغ کا کم بخت نے وہاں ہمارا قطعاً ساتھ نہیں دیا۔ بالآخر رشید پہنچ گیا۔

" زرینہ۔ تم۔؟ کیسے آنا ہوا؟" ہم نے رشید کو اس سے مخاطب دیکھ کر کھسکنا چاہا۔ مگر ابھی دو ہی قدم چل پائے ہونگے۔

" سنو!" رشید نے پکارا۔ "ان سے ملو یہ میری بہن ہیں زرینہ۔ یہیں مارننگ میں فرسٹ ایر میں پڑھتی ہیں۔ اور زرینہ یہ میرے دوست ......."

" یار میں چلتا ہوں میرا پیریڈ ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

باقی صفحہ ۲۸ پر

شاہجہاں علی

# خیالات کے جھروکے سے

## خطوط

قارئین

کافی عرصے سے نہایت پابندی کے ساتھ میں شاہ جہاں کا مطالعہ کر رہا ہوں — یہ حقیقت ہے کہ آپ کے رسالے نے کافی ترقی کی ہے جس کے لئے آپ اور آپ کے ساتھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ — پچھلے کئی ماہ سے (خصوصاً اپریل ۱۷) آپ توجہ افسانوں پر زیادہ ہے — میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ افسانوں کی تعداد کم کر کے ان کی جگہ تعلیمی و معیاری مضامین کو جگہ دیں تو پڑھنے والوں کی اکثریت اس کو پسند کرے گی۔

مراد آباد۔ یو۔ پی۔ — صلاح الدین

---

...... پردہ الفاظ کے پیچھے اور انشاءِ فارسی نہایت کارآمد مضامین ہیں — آپ اسی طرح کے مضامین کو جگہ دیں — افسانے وغیرہ کے لئے تو اردو کے بہت سے جرائد شائع ہوتے ہیں۔

علیگڑھ۔ — سلیم حیدر

---

..... اپریل کے شمارے میں حصہ نظم بالکل نہ ہونے کے برابر ہے — آج کے دور میں جبکہ ہر تیسرا اردو خواں شاعر ہے کسی اردو کے پرچہ میں غزل یا نظم کا نہ ہونا انتہائی تعجب کا باعث ہے — ..... بہرکیف بروقفل اور بادۂ شیراز بہت پسند آئیں۔

بھوپال — لطف النساء

---

..... اپریل کا شمارہ ملا — خوب ہے۔ پرچہ کا معیار ابھی کچھ اونچا نہیں ہوا — محنت کی ضرورت ہے — کوشش کیجئے ٹھیک ہو جائے گا۔

پٹنہ — جناب جمیل مظہری

..... آپ نے صحیح لکھا ہے (لمحہ فکر اپریل ۱۷) کہ اگر اندرا حکومت وہ توقعات جو عوام نے بالعموم اور اقلیتوں نے بالخصوص اس سے وابستہ کر رکھی ہیں پوری نہ کیں الیکشن سے پہلے وعدے وفا نہ کیے تو اس کا زوال بھی دور نہیں۔

گورکھپور۔ احمد اللہ

---

..... تعجب ہے طالب علموں کا پرچہ ہوتے بھی شاہ جہاں ہائر سیکنڈری، مڈل اور پرائمری اسکولوں کے (خصوصاً) اردو طلبہ کے زیادتی اور ظلم ہوتے دیکھ کر بھی خاموش ہے ـــــــ ہماری درخواست ہے کہ آپ اپنے نمائندے کو دہلی کے مختلف اسکولوں میں بھیج کر تحقیقات کرائیں۔ اور پھر مناسب قدم اٹھائیں ـ ہمیں آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

دہلی .....

---

..... شاہ جہاں دیکھنے کا مجھے پہلی بار اتفاق ہوا ـــــ بہت پسند آیا ـ خاص طور پر اس لائن کی وجہ سے "طالب علموں کا، طالب علموں کے لئے، طالب علموں کے ذریعے" اس سے جہاں طالب علموں کی ایک اہم ضرورت پوری ہوتی ہے وہاں ادب کی بھی زبردست خدمت ہے۔

حیدرآباد ایم. ایچ. عادل

# شاہجہاں

طالب علموں کا ۔ طالب علموں کے لئے ۔ طالب علموں کے ذریعے

جون ـــــــــ ۱۹۷۱ء

جلد ۵ ـــــــــ شمارہ ۶

| | |
|---|---|
| قیمت فی پرچہ | پچیس پیسے |
| سالانہ | تین روپئے |




شاہجہاں میں شامل افسانوں میں نام، مقام، واقعات فرضی ہیں۔ کسی سے کوئی مطابقت اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں۔

شاہجہاں آل انڈیا اسمال اردو نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (A.I.S.U.N.E.C) نئی دہلی کا ممبر ہے۔

## ہمارے مقاصد

طالب علموں ........

........ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا۔

........ کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا۔

........ کو ملک و ملت کی با مقصد خدمت کیلئے تیار کرنا۔

........ میں باہمی میل جول اور اتحاد کیلئے کوشش کرنا۔

........ کی آواز کو عوام تک پہنچانا۔

........ کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا۔ اور

........ سماجی اصلاح کے لئے جد و جہد کرنا۔

ادارہ

شاہجہاں کیلئے دلچسپ مضامین، افسانے اور غزلیں و نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کیساتھ اسکول و کالج وغیرہ کے نام علاوہ اپنے گھر کا پتہ بھی لکھیں




طابع و ناشر و مالک — محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ — اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

مقام اشاعت :۔ قاسم جان اسٹریٹ ۔ بلیماران ۔ دہلی ۔ نمبر ۶

# جرعات

## اداریہ

دلیؔ میں اردو میڈیم اسکولوں کے ساتھ دلیؔ ایڈمنسٹریشن کا سوتیلی ماں کے سے برتاؤ میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر نئے اردو میڈیم اسکول کھولنا تو درکنار سیاسی اغراض ومفاد کی وجہ سے دلی ایڈمنسٹریشن اردو کے پرانے اسکولوں کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ لڑکیوں کے اسکولوں کو سازشاً پردے دار اور مسلم علاقوں سے نکال کر دور غیر محفوظ جگہوں پر پھینک دیا گیا ہے۔ تاکہ مسلم والدین اپنی لڑکیوں کو اتنی دور داخل نہ کریں اور اسکول کو ختم کرنے کے لئے ان کے ہاتھ ایک بہانہ آسکے۔ یا ایسے اسکول جو مسلم علاقوں میں واقع ہیں ان میں ایک شفٹ ہندی کی لگائی جاتی ہے، جب کہ علاقے کی بے شمار اردو طالبات کو جگہ کی کمی کے باعث داخلہ سے منع کر دیا جاتا ہے۔ اور ہندی کی طالبات کو بہت دور سے آنا پڑتا ہے اس کے علاوہ لڑکوں کے اکثر مڈل اسکولوں میں اسٹاف مکمل نہیں ہے۔ اسی طرح کے ایک اسکول میں پچھلے دو سال سے (جب سے وہ مڈل ہوا ہے) کسی حساب کے استاد کا تا ہنوز انتظام نہیں ہوا ہے۔

مڈل کلاسز کے طلبہ کے لئے اردو کتابوں کا فقدان دلیؔ ایڈمنسٹریشن کی اردو دشمنی کی رہی سہی کسر بھی پوری کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم لفٹیننٹ گورنر چیف ایگزیکٹیو کونسلر اور دلیؔ ایڈمنسٹریشن کے ذمہ داران سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا تکالیف کو تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کرائیں اس کے ساتھ ساتھ ہم ان مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں تمام انجمنوں اور جماعتوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے والی پالیسی کو ترک کر کے ایک ساتھ مل کر کام کریں۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایک پارٹی کا نہیں ہے بلکہ پورے اردو داں طبقہ کا ہے۔

## اردو میڈیم کر دیا جائے۔؟

دلیؔ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی وفارسی میں چند دنوں سے ایک طبقہ اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ عربی اور فارسی ایم۔اے۔ کا میڈیم انگریزی کے بجائے اردو کر دیا جائے یا اردو میڈیم کو آپشنل کر دیا جائے۔ آج کے دور میں جب کہ قدم قدم پر انگریزی کی ضرورت ہوتی ہے اردو میڈیم سے ایم۔اے کرنا سود مند ہوگا۔ اسی موضوع پر ادارہ اساتذہ حضرات اور ساتھیوں کے خیالات کا خیر مقدم کرے گا۔

ادارہ

# کمرۂ امتحان سے کمرۂ عدالت تک

ایم۔ اسلم
دلی یونیورسٹی

"کیوں بھئی پرچہ کیسا ہوا؟" ہم نے اپنے ایک دوست کا چہرہ پژمردہ دیکھ کر پوچھا۔ جو اردو ایم۔ اے کا پرچہ دے کر کمرۂ امتحان سے نکل رہے تھے۔

"یار، پرچہ سارا غیر متوقع تھا۔ پہلے دو پرچے بھی ایسے ہی گئے ہیں۔ سوچ رہا ہوں ڈراپ کردوں" اُن کے پُر نور چہرے پر اور مایوسی چھا گئی۔

"ہمت نہ ہارو یار، اور کوشش کرو۔ انشاءاللہ باقی پانچ پرچوں میں اس کمی کو پورا کرلو گے۔" ہم نے اظہار ہمدردی کے ساتھ ساتھ ان کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

.........اور ان کی ہمت بندھ گئی۔

تقریباً دس دن بعد

ٹیٹوریل لائبریری کے کونے میں کرسی کا رخ دیوار کی جانب کئے ہمارے مذکورہ دوست اسٹڈی میں اتنے محو تھے کہ بہت قریب سے بھی ہماری آواز کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ ہم نے متوجہ کرنے کے لئے ان کو جھنجھوڑا تو انھوں نے اپنی گردن ہماری طرف گھمائی۔ چہرے پر ہوائیاں، آنکھوں میں وحشت اور کئی دن سے شیو نہ کرنے کے سبب ڈاڑھی حد درجہ بڑھی ہوئی۔ ایک لمحہ تو وہ پہچاننے میں بھی نہ آئے۔

"ارے! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ ایسا بھی کیا امتحان۔ اور امتحان تم اکیلے ہی تو نہیں دے رہے۔ آخر اور بھی تو طالب علم ہیں۔" ان کی یہ حالت دیکھ کر ہمیں لفظ امتحان سے نفرت سی ہونے لگی۔

"یار، اوروں نے تو سال بھر کلاسز اٹینڈ کی ہیں۔ تمام سال اسٹڈی کی ہے۔ سب میری طرح ہی تھوڑا ہیں۔ مجھ کو تو کل کے پیپر کی کتابیں ہی آج معلوم ہوئی ہیں۔ اور دیکھو کتنی مشکل ہیں۔ سمجھنا تو درکنار یہ کمبخت تو پڑھنے میں بھی نہیں آرہی ہیں۔ کل کیا ہوگا؟ یہ سوچ سوچ کر میرا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ سارے پرچے ایسے ہی ہوئے ہیں بس ایک پرچے میں سیکنڈ ڈویژن کی امید ہے۔ دو پرچے اور رہ گئے ہیں اب ڈراپ کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔" انھوں نے اپنے غم میں شریک کرنے کے لئے ہم پر اظہار غم اس طرح کیا کہ ہمیں ان پر رحم آگیا۔

"خیر! یار، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم پیپر دو چاہے جیسے بھی ہوں۔ میرے پاس ایک نکتہ ہے تمہاری ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔"

"کیا نکتہ ہے وہ؟" وہ اس طرح گویا ہوئے جیسے بھوکے کو روٹی دکھا کر چھپالی جائے۔

"وہ میں بعد میں بتاؤں گا جب تمہارے امتحان ختم ہو جائیں گے۔" ہم مصلحتاً چھپانا ہی چاہتے تھے۔

"لیکن ایسا کیوں؟ میرے لئے امتحان کا ختم ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور کیا تم سمجھتے ہو کہ اس تجسس کے

باقی صفحہ [illegible] پر

# مرزا عظیم بیگ عظیم ۔ شاگردِ سودا

ڈاکٹر خلیل احمد بشیر

مرزا محمد عظیم بیگ عظیم سودا کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ مگر بہت کم لوگ ایسے ہیں جو عظیم کے حالات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ عظیم کے حالات کو جاننے کے لئے اردو شعراء سے متعلق تذکرے بھی ہماری اس سے زیادہ رہبری نہیں کرتے کہ وہ سودا کے شاگرد تھے اور اکثر تذکروں میں انکے بارے میں قیاس سے کام لیا گیا ہے۔

مختلف تذکروں میں مرزا عظیم بیگ کے بارے میں مندرجہ ذیل ارشادات ہیں ملاحظہ ہوں۔

میر حسن لکھتے ہیں :۔

" صاحب طبع سلیم وذہن مستقیم محمد عظیم متخلص بہ عظیم مردے ست شاعر درویش ظاہر حسن بیانش از کلامش پیدا بر سادہ عذاران شیدا، از شاگردانِ مرزا رفیع سودا سلمہ اللہ۔ مدتے در فرخ آباد لباس درویشی بہ سر نبردہ، الحال شنیدہ ام در شاہجہاں آباد ست بہ طورے کہ بیش از درویشی داشت۔ غرض کہ بہر رنگے کہ باشد خوش باشد [1]

غلام ہمدانی مصحفی یوں رقمطراز ہیں :۔

" مرزا عظیم بیگ عظیم تخلص اگرچہ شہرت بہ شاگردی مرزا رفیع سودا دارد، در ابتدا چندے از شاہ حاتم استفادہ کردہ گویند چند روز در فرخ آباد کسوت قلندری بر خود داشت۔ حالا باز در لباس دنیائی آمدہ فقیر اور شاہجہاں آباد دیدہ جوان بیچیک رو بود۔ اکثر در مشاعرہای آمد بر صدر مجلس می نشست۔ دعوئے شاعری خیلے در دماغش جا داشت ہیچ کس را بہ خاطر نمی آورد و خود را از ہمہ ممتاز می دانست با آنکہ ہیچ علم وفن ندارد، مرد سپاہی پیشہ است۔ در شعر تلاشہائے نمایاں می کند۔ یک دو قصیدہ ہم بہ قوت تمام گفتہ دیوانش بلاتشبیہہ بہ شکل حمائل واقع شدہ است [2]"

مرزا علی لطف لکھتے ہیں :۔

" محمد عظیم از شاگردان مرزا محمد رفیع سودا است لشبنیدہ شد در دہلی بسر می برد [3]

عبدالسلام نے لکھا ہے :۔

" سودا کے مشہور شاگرد ہیں اور خود بھی انکو اپنی شاعری پر ناز ہے۔ [4]

" عظیم ابتدا میں حاتم سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر کچھ عرصے کے لئے خواجہ میر درد کے شاگرد رہے آخیر میں سودا کا تلمذ اختیار کیا۔ [5]

مگر جب ہم ان بیانات کو ان زندہ جاوید شعرا پہلے سامنے

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۰۹ ۔ [2] تذکرہ ہندی ص ۵۰ ۔ ۱۴۹ [3] گلشن ہند ص ۱۸۰ [4] شعر الہند ص ۱۳۵

رکھتے ہیں جو ہمیں جاورہ میں مرزا عظیم بیگ کے ایک خاندانی فرد جناب غلام ربانی خطیب صاحب سے حاصل ہوئے ہیں تو تذکرہ نگاروں کے اکثر ارشادات قیاسی اور بیشتر غلط نظر آتے ہیں۔

جناب غلام ربانی خطیب صاحب جاورہ کے شرفا میں شمار کئے جاتے ہیں خود بھی شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ لہٰذا خاصے اچھے شعر کہتے ہیں۔ موصوف کے دادا منشی امانت اللہ مرزا عظیم بیگ کے نواسے تھے جنکو مرزا عظیم نے اولاد کی طرح پالا تھا۔

۱۸۲۹ء میں جب ریاست جاورہ کی عنانِ حکومت نواب غوث محمد خان صاحب کے ہاتھ میں تھی اس وقت مرزا عظیم اولیا بیگم صاحبہ (جو نواب غفور محمد خاں صاحب بانیٔ جاورہ کی بیگم تھیں) کے ہمراہ جاورہ آئے۔ یہاں انکی قابلیت اور خداداد ذہانت کی وجہ سے انکو میر منشی ریاست جاورہ کا عہدہ بخش دیا گیا جس کو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور آخیر عمر میں جاورہ ہی میں انتقال کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۹۹ سال تھی۔ ان کے اولاد نرینہ کوئی نہیں تھی۔ صرف ایک صاحبزادی تھیں جنکی شادی منشی ہدایت اللہ مہتمم توپ خانہ ریاست جاورہ سے کردی تھی ہدایت اللہ بھی لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ان کے صاحبزادے منشی امانت اللہ کو عظیم نے اپنی اولاد کی طرح رکھا اور عظیم کے انتقال کے بعد منشی امانت اللہ ریاست کے میر منشی بنا دیئے گئے۔ ان کے پوتے غلام ربانی خطیب ہیں۔ موصوف سے ہی مرزا عظیم بیگ کے جملہ حالات فراہم کئے گئے ہیں۔ آپ کے پاس عظیم کے اردو دیوان کے کچھ قلمی اوراق محفوظ رہ گئے ہیں جنمیں تقریباً ڈھائی سو غزلیات ہیں۔

قدرت اللہ قاسم نے مرزا عظیم بیگ کو کابلی الاصل[۱] بتایا ہے جو درست نہیں ان کا اصلی وطن منگولیہ ہے۔ جہاں سے ا۔ آبا و اجداد بابر کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ اسی طرح قاسم کا یہ بیان کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے غلط ہے۔

مرزا عظیم (۱۷۶۶ء) میں بمقام لکھنؤ[۲] پیدا ہوئے لیکن عالم طفلی ہی میں اپنے والد مرزا ابو بیگ کے ہمراہ دہلی آگئے۔ وہیں ہوش سنبھالا اور قابل اساتذہ سے عربی فارسی اور ترکی کا درس حاصل کیا۔ عظیم کی طبیعت اوائل ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ چنانچہ شعر و سخن کے سلسلے میں سودا کے شاگرد ہوئے۔ چند سال مستفیض ہونے کے بعد سودا کا انتقال ہو گیا اس کے بعد شاہ حاتم سے اصلاح سخن کراتے رہے۔

مرزا عظیم بیگ کے والد کا نام مرزا ابو بیگ تھا۔ ان کے متعلق ہماری معلومات محدود ہیں۔ غلام ربانی صاحب کو بھی علم نہیں کہ ان کا پیشہ کیا تھا۔ مرزا عظیم بیگ کا پورا نام مرزا محمد عظیم بیگ ہے۔ عظیم تخلص۔ اکثر تذکروں میں مرزا عظیم بیگ لکھا ہے۔ کہیں محمد عظیم بیگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ کے سن ولادت کے متعلق تمام تذکرے خاموش نظر آتے ہیں۔ غلام ربانی خطیب صاحب کے بیان کے مطابق مرزا عظیم نے ۹۹ سال کی عمر پائی۔ اور جاورہ میں ۱۸۶۵ء میں انتقال کیا لہٰذا ان کے اس قول کی بنیاد پر عظیم کا سن ولادت ۱۷۶۶ء قرار پاتا ہے۔ اس اعتبار سے عبد الغفور نساخ کا یہ بیان کہ مرزا عظیم نے بارہ سو اکیس ہجری میں وفات پائی بالکل غلط ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرزا عظیم کا سودا سے کس طرح تعلق پیدا ہوا ہوگا ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷۶۰ء میں سودا نے دہلی ترک کیا اور ۱۱۷۶ھ میں سودا فرخ آباد میں عماد الملک کے ساتھ تھے[۳] سب سے پہلا تذکرہ جس میں

---

[۱] مجموعہ نغز بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا از خلیق انجم ص ۵۷۹ [۲] مجموعہ نغز بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا از خلیق انجم ص ۵۷۸
[۲] عظیم بیگ نے اپنی تحریروں میں خود کو لکھنوی لکھا ہے جس کے ثبوت میں ... ربانی صاحب کے پاس عظیم کی ایک قلمی نقل کتاب بحر الفصاحت محفوظ ہے جسکے اختتام پر انھوں نے مرزا عظیم بیگ لکھنوی لکھا ہے۔ [۳] شخص شعرا ص ۳۴۳ بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا از خلیق انجم ص ۵۸۱ [۴] مرزا محمد رفیع سودا ص ۱۱۶ [۵] تاریخ ادب اردو سکسینہ ص ۱۷۸

مرزا عظیم بیگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ تذکرہ شعراء اردو مصنفہ میر حسن ہے۔ یہ تذکرہ قیاس ہے کہ ۱۷۷۶ء (۱۱۹۰ھ) کے لگ بھگ لکھا گیا ہے[1]۔ اور ...... تقریباً ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء میں سودا آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ گئے اور وہیں انتقال کیا۔ اس تذکرہ میں عظیم کو دہلی میں قیام پذیر بتایا گیا ہے۔ اور اس اثنا میں سودا جو ۱۷۷۴ء میں دہلی ترک کر چکے تھے فرخ آباد و فیض آباد رہنے کے بعد لکھنؤ میں قیام کئے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ عظیم کی ملاقات سودا سے فرخ آباد میں ہوئی ہو جہاں عظیم بقول میر حسن:

"مدتے در فرخ آباد لباس درویشی بسر می بردہ"[2]

ادھر مصحفی نے اپنے تذکرہ میں (جو ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء کا مصنفہ ہے) عظیم کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے مرزا کو دہلی میں دیکھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عظیم فرخ آباد کے بعد دہلی ہی میں رہے۔

عظیم نے فرخ آباد اور دہلی کے علاوہ الہ آباد اور آگرہ جیسے مقامات کا بھی سفر کیا جیسا کہ ان کے محفوظ شدہ دیوان میں غزلوں کے حاشیوں پر کہیں آگرہ اور کہیں الہ آباد لکھا ہوا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ غزلیں آگرہ اور کچھ الہ آباد میں بھی کہی ہیں۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں عظیم بیگ کے اس واقعہ کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔ جو انشاء اللہ خاں انشا کی ذاتی خلش کی وجہ سے وجود میں آیا۔ آزاد کے کچھ اقتباسات اس واقعہ کی تفصیل کے لئے پیش ہیں۔

"دلی میں اس وقت سودا اور میر جیسے لوگ نہ تھے۔ مگر بڈھے بڈھے شوقین تھے کہ انہی بزرگوں کے نام لینے والے تھے مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراق شاگرد میر درد، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم شاگرد خواجہ میر درد، شاہ ہدایت، میاں شکیبا شاگرد میر، مرزا عظیم بیگ شاگرد سودا میر قمر الدین منت والد میر ممنون سونی پت، شیخ ولی اللہ محب شاگرد سودا وغیرہ حضرات تھے کہ دربار شاہی سے خاندانی اعزاز رکھتے تھے۔ بہر حال سید انشاء کو شبہ ہوا کہ میری مخالفت پر سب دلی والے موافق ہو گئے۔

ان میں مرزا عظیم بیگ تھے۔ سودا کے دعویٰ شاگردی اور پرانی مشق کے گھمنڈ نے ان کا دماغ بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ فقط شد بود کا علم رکھتے تھے۔ مگر اپنے تئیں سہندوستان کا صائب کہتے تھے اور خصوصاً ان معرکوں میں سب سے بڑھ کر قدم مارتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک دن میر انشاء اللہ کے پاس آئے اور غزل پڑھی کہ بحر "رجز" میں تھی مگر ناواقفیت سے کچھ اشعار "رمل" میں جا پڑے۔ سید انشاء بھی موجود تھے۔ تاڑ گئے حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے کہا کہ مرزا صاحب اسے آپ مشاعرہ (یہ مشاعرے نواب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ عرف مرزا مینڈھو میر تخلص خلف وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ کے یہاں ہوتے تھے جو دہلی میں آ کر رہے تھے) میں ضرور پڑھیں ...۔ اس نے مشاعرہ عام میں غزل پڑھی سید انشاء نے وہیں تقطیع کی فرمائش کی۔ اس وقت اس غریب پر جو گذری سو گذری مگر انشاء نے اس کے ساتھ سب کو لے ڈالا۔ بلکہ ایک مخمس بھی پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔"[3]

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

---

[1] تاریخ ادب اردو سکسینہ: ص ۱۷۸ [2] تذکرہ شعراء اردو ص ۱۰۹ [3] آب حیات بیں ص ۲۴۱ — ۳۴۲

اس کے جواب میں عظیم نے بھی ایک مخمس کہا۔ جس کے
چند شعر آبحیات میں موجود ہیں۔ اور آزاد نے لکھا ہے کہ
یہ "مشتے بعد از جنگ" کے مصداق تھا۔[1]

اس حادثے سے مرزا عظیم بیگ کو سخت تکلیف پہنچی۔
ان کا دل ٹوٹ گیا اور اب مرزا کا یہ عالم تھا کہ شعر بنا تے
وقت کہتے "با با دیوار گوش دارد" اور کلام آہستہ
پڑھتے[2]

اس واقعے نے مشاعرے میں معرکہ کی صورت
اختیار کر لی تھی۔ مرزا عظیم بیگ کے حامیوں نے بھی انشاء
کی اس نازیبا حرکت کے خلاف ہجویں کہیں۔ جن میں قاسم
شاگرد میر درد اور محب شاگرد سودا پیش پیش رہے۔
عظیم کی حمایت میں انشاء کے خلاف محب نے جو اشعار
کہے وہ یہ تھا ؎

سر سبز خط فرماں رہے تحریر کے آگے
ہو لال زباں وال میری تقریر کے آگے
دل ہے مو نگہ تیرے کے ہے تیر کے آگے
سر ہے جو خمیدہ دم شمشیر کے آگے
تدبیر پڑی ٹھوکریں کھاتی رہی پیچھے
یا حضرت انساں تری تقدیر کے آگے
ہوتا ہے نہیں محو فدائی کا بھی آداب
جا نکلے ہیں جب اس بت بے پیر کے آگے
شیطان جسے کہتے ہیں وہ اے شیخ مزور
پیچھے ہی رہے ہے تیری تزویر کے آگے
کیا معنی ہے آئینہ نہ پانی ہو بہ صد رنگ
اس بوقلموں شوخ کی تصویر کے آگے

کس طرح نہ ہو سلسلہ زنجیر کا برپا
دیوانوں سے اس زلف گرہ گیر کے آگے
مبحث میں چکے چاہیئے قضیہ شعرا کا
اس فن کے کسی صاحب توقیر کے آگے[3]
بے نقص جو شاعر ہوئے فریادی و دادی
اکبر کے حضور اور جہانگیر کے آگے
نیزے پہ ہدف کرکے رکھیں ہم سر حاسد
اور تیر قلم اپنے کے سر تیر کے آگے
ہو رستم میدان سخن کے بھی ہمارا
یک مصرع سو مصرع شمشیر کے آگے
جو عرض مطالب کرے مقصد ہی کو پہنچے
با صدق محب حضرت شبیر کے آگے[4]

مرزا عظیم نے نہایت خستہ دلی کے ساتھ کہا لایا میں
نے اپنی عرض حال میں اپنے استاد کے ایک شعر پر
قناعت کی ہے[5] کہ ابھی تضمین ہو گیا ہے[6] ؎

عظیم اب تو ہمیشہ سے ہے شعر کہنا شعار اپنا
طرف ہے ایک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا
کئی کھمن بار کھنڈ گویوں میں نہ ہو اعتبار اپنا
جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں دیا ان ہی کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالا جو بار اپنا[7]

بقول آزاد دریا کی موج کے آگے گھاس پھوس کی کیا
حقیقت[8]۔ لہٰذا انشاء نے بھی ایک غزل مخبر پہ پڑھ ڈالی
جس کا ہر شعر توپ کے گولوں کا کام کر رہا تھا۔ اس
غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اک طفل دبستاں ہے فلاطون مرے آگے
کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں میرے آگے

---

[1] آبحیات ص ۲۲۳ [2] آب حیات ص ۲۲۳ [3] آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے ان شعروں کو یوں لکھا ہے:—

مجلس میں چکے چاہیئے جھگڑا شعرا کا | ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا | اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

[4] مرزا رفیع سودا از خلیق انجم ص ۱۱ - ۶۱۰ [5] آب حیات ص ۲۲۴ [6] تا [8] آب حیات ص ۲۲۴

کیا ماں بھلا قصر فریدوں میرے آگے
کانپے ہے بڑا گنبد گردوں میرے آگے
مرغانِ دنی اجنحہ مانند کبوتر
کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے
منھ دیکھو تو نقار چیں پیل فلک سے بھی
نقارے بجا کر کہے دوں دوں میرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما و سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں میرے آگے ؎۱

اس کے بعد حکیم قدرت اللہ کے سامنے شمع آئی۔ انھوں نے بھی مرزا عظیم کی حمایت میں انشاء کو طنزاً مخاطب کیا۔ میر مشاعرہ کو خیال ہوا کہ سید انشاء پر ہجو کہی ہو گی لہٰذا بے لطفی کو تمام کرنے کی غرض سے دونوں میں صلح کرادی انشاء نے اٹھ کر حکیم قدرت اللہ کو گلے لگالیا اور کہا کہ "حضرت آپ میرے ابن عم ہیں بھلا آپ پر طنز کروں گا۔ البتہ مرزا عظیم بیگ سے شکایت ہے کہ وہ خواہ مخواہ بدنامی کرتے ہیں۔ اور داد دینی تو درکنار شعر پر سر تک نہیں ہلاتے آخر کس بیرتے پر" ؎۲

مرزا عظیم کی سیرت اور کردار پر حکیم قدرت اللہ قاسم نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:—

"بہت صاحب غیرت و عزت تھے۔ دوست نواز، دشمن گداز، مروت نہاد فتوت بنیاد، محبت پرور، مودہ گستر اور ظریف مزاج تھے" ؎۳

اردو تذکرہ نگاروں میں قدرت اللہ قاسم اور سرور نے مرزا عظیم بیگ کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔

قاسم لکھتے ہیں:—

"شعرش پختگی تمام دارد، در خیال بندی و نازک خیالی، فیلے ہنر پردازی ہا بر روئے کار آرد۔ در یں کار استوار ید طولی داشت و بیشتر بہ معانی بندی ہمت می گماشت۔ اکثر غزل در غزل بہ تلاش لفظ و معنی تاسہ و چار غزل می گفت و صنائع و بدائع بسیار می برد، زور طبعش از قصاید ریختہ طبع وقادش روشن می شود۔" ؎۴

سرور عظیم کی شاعری پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:—

"الحق کہ معانی باریک و مضامین نازک در اشعار مندرج می کرد۔۔۔۔ استاد زبان آور و خوش فکر زماں خود بود، قصائد کہ در حمد نعت و منقبت از طبع رسائے او راموزوں شدہ۔ پہلو نہ بقصائد مرزا رفیع السودا می زند" ؎۵

عظیم نے شاعری کی دنیا میں اس وقت قدم رکھا جب شاہ حاتم، سودا، میر درد اور میر آسمان شاعری کے درخشاں ستارے تھے۔ عظیم کا یہ عہد لڑکپن تھا اور ابھی ان کا ذہن شاعری کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ یہ شعراء استاد فن تصور کئے جاتے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں اثر سودا کا تھا جو عظیم نے قبول کیا ان کے یہاں بھی اسی مکتب فکر کے اثرات موجود ہیں
عظیم کی شاعری میں ایک مخصوص رنگ اور ایک مخصوص لہجہ ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سودا کی شاگردی سے کس حد تک مستفید ہوئے۔ سچ پوچھا جائے تو اردو غزل کو خارجی رنگ میں رنگنے کی پہل سودا ہی کے ہاتھوں ہوئی یہی خوبی بعد میں لکھنؤ کی امیازی خوبی تصور کی جانے لگی۔ مرزا عظیم نے بھی اپنے استاد سودا کے اس مخصوص رنگ کو اپنایا۔

---

؎۱ و ۲ آب حیات ص ۲۴۴ ؎۳ مجموعہ نغز بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا از خلیق انجم ص ۵۷۸ ؎۴ مجموعہ نغز بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا از خلیق انجم ص ۵۷۸ ؎۵ عمدہ منتخبہ ص ۴۱۶ بحوالہ مرزا رفیع سودا ص ۵۷۹

غزل اردو شعرا کی محبوب ترین صنفِ سخن رہی ہے ہر شاعر کی ادبی زندگی کے آغاز میں اس نے ہاتھ بٹایا ہے۔ غزل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کے اکثر مضامین روایتی یا رسمی ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اچھا غزل گو ان روایتی مضامین میں بھی اپنی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ عظیم کے یہاں بھی ان کی انفرادیت ہے ...... انھوں نے بھی فرسودہ اور عام مضامین میں اپنی ایک نمایاں چھاپ چھوڑی ہے۔

عظیم کی شوخ اور طرار طبیعت میں غزل کا حسن رچ گیا تھا۔ ان کے یہاں جذبات کی نزاکت دردمندی اور سوز ہے۔ ان کے لہجہ میں معصومیت کے ساتھ خلوص، نرمی اور سادگی ہے۔ خود شاعر کو بھی اپنی متانت کا احساس ہے ؎

گر ملاقات ہو آتش سے تو میں پوچھوں عظیم
مثل ناسخ کے متانت میں سخن کس کا ہے

شاعر کو اپنی کسمپرسی، بے سروسامانی اور وطن سے دوری کا اس وقت شدید احساس ہوتا ہے جب ؎

شعر مفلس اس لئے سنتا نہیں کوئی عظیم
بول بالا ہے جہاں میں مردمِ زر ریز کا

کہیں کیا شعر پُر معنی عظیم ہم آ کے غربت میں
وطن سے بے سروساماں لیے نان و نمک نکلے

گر سخت زمینِ شعر و سخن کی ہے بشدت
جُز ریختہ اس قصر کی تعمیر نہیں

عظیم کو نان و نمک کی تلاش نے ہمیشہ سرگرداں رکھا۔ دہلی الٰہ آباد، آگرہ اور جائرہ کا سفر اسی تلاش کا نتیجہ تھا۔ تاہم وطن پرست کے لئے ان مقامات میں وہ کشش کہاں وطن وطن ہی ہے، گھر گھر ہی ہے۔ لہٰذا عظیم خالق غفار سے یوں طلبگار ہیں ؎

عرض کرتا ہوں کہ دلوا کے کوئی کار عظیم
جلد پہنچا تو وطن خالق و غفار مجھے

عظیم کی شاعری کی ابتدا سودا جیسے استاد فن کے ہاتھ سے



ہوئی تھی۔ اس لئے ان کے یہاں داخلیت اور تغ
...... کا دہی حسین امتزاج ہے جس کو سودا
کیا اور بعد میں جس کو جرأت انشاء رنگین اور
عام کیا اور لکھنؤ اسکول کی بنیاد رکھی۔

عظیم کے یہاں خیال بندی، معنی آفرینی کا ایک
انھوں نے بھی سودا کی طرح سنگلاخ زمینوں م
شعر کہے ہیں جن میں حسین تشبیہات اور رنگین ا
کی بھرمار ہے۔ اور اکثر غزلیں غزل در غزل
لذیت سہ اور چہار غزلہ تک پہنچ گئی ہے۔

اس دور کے اساتذہ کو فارسی سے گہرا
شعرا کی فارسی دانی نے اردو غزل کو سجا
اور سنوارا ہے۔ بہت کم ایسے شعراء ہوں گے
فارسی سے دلگاؤ نہ رہا ہو یا فارسی میں طبع آز
ہو۔ عظیم کے یہاں بھی فارسی کا رنگ گہرا ہے۔ فا
اور اغلاقتوں سے سجے ہوئے کچھ اشعار ملاحظہ ہ

مو مو دل کو پریشانی ہے بے داری میں
خواب میں دیکھی تھی کیا زلف سیہ فام کہیں
زہر مارِ سیہ آتا ہے نظر مجھ کو عظ
عرق رخ سے نہیں کچھ زلف گرہ گیر پہ
ہر کشت زار سیل سرا شکوں سے سبز
دہقاں نظر لگاتے ہیں چشم پُر آب
عظیم کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں
سادگی نہ ہو اور انھوں نے بھی بیان کی س
کرشمہ دکھایا ہے۔ یہ اشعار فارسی تراکیب
اغلاقتوں کے بوجھ سے محفوظ ہیں۔ جید ا
قبیل کے منتخب کئے جاتے ہیں۔ بیان کی سادگی
بیانی ملاحظہ ہو ؎

آپ اگر آشنا ہمارے ہیں
پھر یہ غیروں سے کیا اشارے ہیں
کٹنے سے سرِ شمع تڑپتا ہے وہ ہر دم
کیا سمجھا ہے سوزِ دلِ پروانہ کسی نے

سیراب ہو سکے نہ وہ دریا کی باڑھ سے
تشنہ ہو جو کہ خنجرِ مژگاں کی دھار سے

ہجراں میں زندگی سے ایسا ہوں بے توقع
ہستی میں دیکھتا ہوں ہر دم عدم کی صورت

اردو غزل کی سب سے بڑی خوبی داخلیت ہے۔ اس کے امام میر تقی میرؔ تصور کئے جاتے ہیں۔ اردو میں داخلیت دو سمتوں سے داخل ہوئی کچھ تو اقتصادی بدحالی کا نتیجہ تھی اور کچھ غم جاناں کا تبرک تھا۔ انسان کی طبیعت عیش کوش ہے لہٰذا کچھ شعرائے غم جاناں میں کھو کر لب و رخسار کے المیہ کہے اور کچھ نے زندگی کی ان تلخیوں سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے تصوف کا سہارا لیا۔ عظیم کے یہاں بھی روحانی رشتہ استوار کرنے کا اپنا طریقہ اور راستہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جو یادِ الٰہی میں رہا کرتے ہیں ہر دم
تسبیح نہیں رکھتے مصلا نہیں رکھتے

دل کے ملنے میں ہے لازم رشتۂ یادِ خدا
کچھ عبادت سبحہ گردانی و سمرن میں نہیں

گو خانہ بدوش سفر و سیر ہوئے ہیں
پر کوچہ جاناں کے سوا جا نہیں رکھتے

آخر میں عظیم نے جو دعویٰ کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ ممکن ہے عظیم کا یہ دعویٰ اسی فقیری کا طفیل ہو جس کے بارے میں حسن اور مصحفی نے اپنے تذکروں[1] میں لکھا ہے ؎

ہوں میں قلندر دلی مجذوب وش
منہ سے جو کچھ بڑ میں کہا ہو گیا

عظیم کے یہاں میرؔ کے رنگ میں پر سوز اشعار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میرؔ کی طرح چھوٹی اور بڑی بحروں میں سادہ اور پر اثر مضامین ملاحظہ ہوں، ان اشعار کو پڑھتے ہی میر کا مخصوص رنگ نگاہوں میں گھوم جاتا ہے ؎

شل خورشید پھرے صبح کہیں شام کہیں
ہجر میں تیرے نہ پایا کبھی آرام کہیں

آہ کی سنتے ہی صدائے جرس
چل بسا وائے تا فلہ دل کا

ہجر کی شب میں انجم رخشاں
سوز دل کے میرے شرارے ہیں

بستی میں اسکو چین نہ ویرانے میں قرار
لیجاؤں میں کہاں دل خانہ خراب کو

اے عظیم خستہ دل تو شوروشیون چھوڑ دے
تا نہ گھبرائے تیرا ہمسایہ مسکن چھوڑ دے

ہر چند کہ صحرا میں پھرا پائے برہنہ
لیکن کبھی سر خار مغیلاں کا نہ توڑا

یاد آتی ہے مجھ کو دم تحریر کسی کی
وہ موتیوں کی لڑیوں سی تقریر کسی کی

عشق و محبت کا جذبہ فطری ہے۔ عظیم کے یہاں بھی عشق کی رنگینی ہے۔ مگر ان کے یہاں بھی عشق کا تصور عام روایتی رنگ سے نہ بچ سکا۔ عشق و محبت کی تڑپ جسم کے حصول تک محدود ہے۔ ان کے یہاں عشق کی وہ تڑپ اور کسک نہیں جس سے روح تازہ ہوتی ہے۔ انشاؔ اور رنگینؔ کے انداز میں ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس میں معشوق کا سراپا کھینچا گیا ہے ؎

مجھ کو جاناں کی خوش آتی ہے ملاوٹ خاصی
کیوں نہ اغیار سے دل کو ہو رکاوٹ خاصی

بخت تیرہ ہوئے سب دید سے اسکی روشن
کیا ہی آنکھوں میں ہے سرمہ کی گھلاوٹ خاصی

طرفۃ العین میں ہو جائیگی سر تن سے قلم
تیغ ابرو کی ہے اس وقت کھنچاوٹ خاصی

---

[1] عظیم نے چند روز فرخ آباد میں فقیری اختیار کی اور بعد میں دنیادار ہو گئے۔ تذکرہ شعرائے اردو ص ۹۵، تذکرہ ہندی ص ۱۶۹

محرم عشق کا کیونکر نہ پھنسے طائرِ دل
دام انگیا کی ہے چھاتی پہ کھنچا ڈٹ خاصی

الجھے کیونکر نہ فتح دِ پیچ سے خاطر اپنی
ہے کھجوری تری چوٹی کی گندھاوٹ خاصی

معشوق کے خارجی حسن کی تعریف کرنا بھی غزل کا ایک حصہ بن گیا تھا جو لکھنؤ اسکول کی ایک مخصوص طرز تھی۔ انگیا۔ چوٹی، محرم جیسے خارجی تفصیلات سے غزل آلودہ تھی۔ عظیم نے لکھنؤ میں آنکھ کھولی تھی اور اس دور کو بھی دیکھا تھا جس میں جراُت، انشاؔ اور رنگینؔ کی رنگین بیانیاں عام تھیں لہٰذا عظیم بھی اس رنگ سے محفوظ نہ رہ سکے۔

معشوق کے خارجی حسن کی تفصیلات میں عظیم کے کچھ اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

دستِ حنائی دیجئے قاتل نے کھول
خوں بہا عاشق کا ادا ہو گیا

باریکی کا مضمون انتظر آتا نہیں کوئی
کیا وصف لکھوں میں تیری نازک کمری کا

خامہ بل کھانے لگے مانند افعی ہاتھ میں
گر ارادہ وصف زلفوں کی کروں تحریر کا

آپ اگر چہرے سے زلفوں کو اٹھا لیتے ہیں
مہر و مہ رشک میں منھ اپنا چھپا لیتے ہیں

عظیم کو سوداؔ اور ناسخؔ کی طرح الفاظ کی مرصع سازی کا بھی شوق ہے۔ انھیں زبان پر قدرت حاصل ہے وہ اشعار کو بندش کی چستی اور الفاظ کی درستی سے آراستہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مضمون آفرینی اور خیال بندی زیادہ ہے۔ پرشکوہ الفاظ، نادر استعارات اور نئی تشبیہوں کا ایک جال ہے۔ عظیم کی شاعری دل کی کم اور دماغ کی زیادہ ہے

لہٰذا ان کے یہاں انسانی احساسات کی ترجما[ن]
اور مرصع سازی زیادہ ہے۔ غرض عظیم کے یہاں
غزلوں کی بہتات ہے جس میں خیال بندی اور و[ہ]
سازی ہی مرصع سازی ہے۔ اور ان کے اکثر ا[شعار]
نادر تشبیہوں میں رنگینی خیال لیکر سامنے آتے [ہیں]
عظیم کی خیال بندی اور مرصع سازی سے متـ[ـعلق]
کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں تشبیہوں اور
استعاروں کا انوکھا پن بھی ہے اور رنگینی بھی ؎

فوارہ ساں بلند ہے جنکا حوصلہ
دریا دلوں کو تنکے ہیں نارمیں ہیں دھار پر عے[1]

لاکھوں ہی مردے یاں تو یار نے جلا دیئے
عیسیٰ بھی واں دھرے ہی رہے آسمان پر

بجوڑی کا تکل مشکیں نہا کر جب عظیم اس نے
گہر گویا کہ داتان شب دیجور سے ٹپکے

پریشاں چہرۂ انور پہ زلف عنبر افشاں ہے
سحاب تیرہ گوں میں آفتاب چہرے نہاں ہے

چھیڑتا ہے جبکہ شانہ زلف کو
رشک سے اس وقت بل کھاتے ہیں ہم

رکھے فرش سبزہ پر پائے حنائی تو اگر
لعل ہو جائے زمرد عکس پا انداز سے

تکسرا طفل پری رو نے بنایا یہ پتنگ
ریش ملا کی کتر جھلجھل لگا نا چاہیئے۔

عظیم نے صائبؔ کی پیروی پر فخر کیا ہے جس کا اظہا[ر]
انھوں نے اس طرح کیا ہے ؎

کیجیو عظیم کو بھی یارب غریق رحمت
آوارۂ جنوں سا اک صاحب سخن تھا

اور معنی بند ایسا ہندی زباں کا صائبؔ
ہندوستاں سے لیکر مشہور تا کہ کس تھا

---

1. المجموعہ نغز بحوالہ مرزا محمد رفیع سوداؔ از خلیق انجم ص ۸۲ تا ۸۴ و ۱۸۵ سے یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

تمثیل نگاری میں عظیم صاحب کے قریب نظر آتے ہیں اسی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ایک دن جو گھر سے نکلا خط شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پہ ہر تار پیرہن تھا
دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا ۱؎

اسی رنگ میں ان کے کچھ اشعار اور نقل کیئے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عظیم خیال بندی، معنی آفرینی اور تمثیل نگاری میں کس حد تک کامیاب ہیں ؎

زیر و زبر نہ ہوئے کس طور سے زمانہ
اسیر دلبشکل مد ہے اور میم ضم کی صورت
رہے ہے کاکل شکیں کے پیچ میں ہر دم
دل حزیں یہ ہے مگر سانپ آستینوں کا
وصف میں لیلیٰ دشتوں کی شعر جب موزوں ہوا
وادیٔ کاغذ میں خامہ صورت مجنوں ہوا
جوہر کے ہوتے دیکھ تہی دست ہے چنار
یعنی ہے یاں کمال پہ رکھی نظر عبث ۲؎
کب سوز دل بجھے ہے نہ یہ چشم تر عبث
جو شمع پا بہ گل ہے مجھے رہ رو نہ کر عبث ۳؎
جوں برق آکے پاؤں نہ رکھا کہ پھر عبث
مجھ گرم رو کے مت ہو مقابل شرر عبث ۴؎
جوں صبح چاک جیب سے ذرت پھرے نہ آنکھ
یاں ہے بہ شکل مہر نظر تار تار پیرہن ۵؎
پاس سخن یہی ہے یہاں اوس کی شان پر
مانند خامہ دے جو سر اپنا زبان پہ
پابوس کو بھی یوں کوئی بیٹھے ہے منہ پسار
رکھیو سمجھ کے شمع قدم شمع دان پر

(سبب لاس)

بقیہ صفحہ نمبر ۶

## کمرہ امتحان سے . . . . . .

ساتھ جو تم نے پیدا کر دیا ہے میں اسٹڈی کر سکوں گا؟"
"اچھا، تو پھر سنو!" ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔
"حسب توقع تمہاری ڈویژن تھرڈ ہی آئے گی نا؟"
"دریں چہ شک!"
"بس تو پھر رزلٹ آنے کے ایک ہفتہ بعد کمرۂ عدالت کی طرف رجوع کر لینا۔ یعنی یونیورسٹی پر کیس دائر کر دینا کہ مجھے دشمنی میں نمبر کم دیئے گئے ہیں۔ جس سے میری سیکنڈ ڈویژن ختم ہو گئی ہے۔"
"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"
"فائدہ! ارے بے وقوف ایک تو تمہاری کمزوری پہ پردہ پڑ جائے گا اور لوگ تم پر ہنسنے کی بجائے اظہار ہمدردی کریں گے۔ اخبارات میں تمہارا نام چھپے گا اور بہت ممکن ہے کوئی تمہارا انٹرویو بھی لے لے اس طرح تمہیں ملک گیر شہرت مل جائے گی ...... اور ......"
"بس۔ بس یہی کافی ہے۔" وہ فرط مسرت سے بیتاب ہو کر میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی چیخ پڑے۔
"یار! بہت پڑھ لیا۔ آؤ ذرا کیفے ہو آئیں۔"
...... اور ان کے چہرے کی مایوسی اور وحشت کی جگہ سکون اور مسرت نے لے لی۔

●●

| مضامین خوش خط اور کاغذ کے ایک جانب ہی لکھیں ——— ادارہ |
|---|

۱؎ تا ۵؎ مجموعہ نغز بحوالہ مرزا محمد رفیع سودا از خلیق انجم ص ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱ ۵ سے یہ اشعار نقل کیئے گئے ہیں۔

# غزل

پروفیسر بخشی اختر امرتسری دہلی

نشاط زا ہے ادا ان کے مسکرانے کی
طرب شناس نہ ہو کیوں فضا زمانے کی

نہ جانے کس کی ہے یہ جنبش نظر کا اثر
کہ آج تک نہ رکیں گردشیں زمانے کی

چمن چمن میں تمہارے حسیں تصور سے
ادائیں سیکھی ہیں کلیوں نے مسکرانے کی

ہمارے عشق سے قائم جہاں کے ہنگامے
تمہارے حسن سے ہیں رونقیں زمانے کی

اٹھا کے پھینک دی اس دست حسن نے تسبیح
چمک کے رہ گئی تقدیر دانے دانے کی

چمن میں ٹوٹ کے گرتی ہے جب کبھی بجلی
قفس میں خیر مناتا ہوں آشیانے کی

کیا ہے واعظ ناداں نے جس قدر بدنام
اسی قدر بڑھی عظمت شراب خانے کی

حریم ناز سے رہ رہ کے چھا نکنے والے
کچھ اور دیر رہے مشق دل لبھانے کی

گرے تو عشق کے پہلو میں وہ گرے اختر
ادائیں سیکھ کوئی ان سے سر اٹھا کے گرانے کی

# غزل

بنارسی داس زخمی ہوشیارپوری دہلی

”دربار میں ترے کسی سفلے کی کمی نہیں“

لطف و کرم کہ رحم کی جلوہ گری نہیں
دربار میں ترے کسی سفلے کی کمی نہیں

جسکو بھی کوئی غم نہیں کوئی خوشی نہیں
اس کی بھی زندگی میں کوئی زندگی نہیں

اے غم تیرے طفیل گذرتی ہے زندگی
جو تو نہیں خدا کی قسم زندگی نہیں

اپنا یہ حال ہو تو کسی کی خبر ہو کیا
مجھ کو خبر خود اپنی کبھی ہے کبھی نہیں

زخمی نگاہ شوق کی وارفتگی نہ پوچھ
وارفتگی شوق کی کچھ آگہی نہیں

# مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی زندگی پر ایک نظر

صلاح الدین (مراد آباد)

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا دور ۱۹۱۲ء میں
وقت شروع ہوتا ہے جب مولانا نے "الہلال" کے
سے ایک اخبار نکالا۔ اور اس میں ملک کے معاملات
اپنی رائے دینی شروع کی۔ مولانا اس اخبار میں
مضامین لکھتے وہ صرف لفظوں کا ڈھیر نہیں ہوتے تھے
اس میں سوچنے سمجھنے کے لئے پورا مواد بھی ہوتا تھا
کے مضامین میں خیالات کی اونچائی ہی نہیں ہوتی تھی
وہ مضمون لکھنے کا ایک ترقی پایا ہوا طریقہ تھا جس
ہندوستان کے اچھے اچھے لکھنے والوں پر کافی اثر پڑا۔
"الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کے خیالات میں ایک
لاب اور ایک روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی کے
اتھ مولانا کے پولٹیکل خیالات عام لوگوں کے سامنے آتے
تھریہ کہ "الہلال" نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک
اری پیدا کر دی اور مسلمان سیاسی زندگی میں حصہ
نے لگے۔

الہلال ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا اور ۱۹۱۵ء میں حکومت
اسکو بند کرا دیا۔ اس لئے کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف
میدان تھا۔

جب مولانا نے کلکتہ کے حالات کو اپنے لئے مخالف پایا تو
رانچی چلے گئے۔ یہاں حکومت نے ان کو نظربند کر دیا۔ مولانا
از جب ۱۹۲۰ء میں جیل سے باہر آئے تو مسلمانوں نے آپکی
ہمت اور جرأت کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد سے
مولانا ہمیشہ ہندوستانی پالٹیکس میں حصہ لینے لگے جس
سے کانگریس کو سیاسی کاموں میں بہت مدد ملنے لگی۔

مولانا مذہب سے زیادہ اپنے وطن اور وطن والوں
کو دوست رکھتے تھے اسی لئے ملک کی خدمت کو اپنا پہلا اور
ضروری فرض سمجھتے تھے۔

مولانا کا تعلق جمیعتہ العلمائے ہند سے ہی برابر
رہا۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی بڑی خدمت کرتے
رہے۔ ہر حال میں مولانا آزاد اسلام کی صحیح روح
سے ہمیشہ قریب رہے۔ اسی سبب سے نہ وہ فرقہ پرستی
کا شکار ہوئے اور نہ قومی تعصب کا۔ مولانا نے سچائی
اور نڈرپن میں ہمیشہ حضور کے راستے پر چلنے کی
کوشش کی۔ دوسری جماعتوں نے کتنی ہی مشکلیں لاکر
کھڑی کیں مگر وہ اپنے راستے سے نہ ہٹے۔ لوگ انکے
دشمن ہو گئے۔ مگر وہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں
کے لیڈر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان کا فائدہ کس چیز
میں ہے۔ مولانا نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ چاہے
مسلمان ان سے پھر جائیں اور وہ اکیلے رہ جائیں مگر
وہ اپنا صحیح ارادہ نہ بدلیں گے۔ مولانا نے اپنی پوری
کوشش کی کہ کسی بھی طرح سے کانگریس اور لیگ میں
ایکا ہو جائے لیکن مسلم لیگ نے ہمیشہ اپنا جھنڈا

باقی صفحہ [illegible] پر

# اے عشق تیرے انجام پر رونا آیا

نا ہد اقبال پٹنہ

پٹنہ ۷ رمئی

محترمہ زہرہ صاحبہ! آداب و تسلیمات

"فلم ویکلی کے قلمی دوستی کے کالم" میں آپ کا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کے مشغلے بہت پسند آئے۔ آپ کے مشغلے پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے آپ نے اپنے نہیں بلکہ میرے مشغلے تحریر کر دیئے ہیں۔ میں بھی آپ کی طرح فلم کا دلدادہ ہوں۔ سوچا جب ہم دونوں کے مشاغل ایک ہیں تو کیوں نہیں قلمی دوستی کا سہارا لے کر آپ سے دوستی کی جائے۔ اس لئے یہ نامہ ارسال کر رہا ہوں۔

کچھ آپ کو اپنے متعلق بتا دوں۔ مجھے فروز کہتے ہیں۔ میں نے گذشتہ سال بی۔اے آنرز کیا ہے۔ میرے دلچسپ مشغلے قلمی دوستی کرنا، ہیرو ہیروئن کو خط لکھنا اور فلم دیکھنا ہے۔

آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

آپ کا اپنا فروز

---

گیا ۸ رمئی

محترمی فروز صاحب! تسلیم

آپ کا محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی آپ کے ایک ایک فقرے سے کس قدر محبت اور خلوص ٹپکتا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتی۔ آپ کے خط کو میں نے کئی بار پڑھا۔ لیکن ہر بار یہی احساس ہوا جیسے پہلی بار پڑھ رہی ہوں۔ واقعی اگر دلیپ کمار جذبات کا شہنشاہ ہے تو آپ قلم کے۔ مجھے آپ کی قلمی دوستی پر فخر ہے۔ اگر آپ نے میری دوستی کا ہاتھ تھام لیا تو میں یہ سمجھوں گی کہ میں بھی دنیا کی اس خوش نصیب میں آ ہوں جسے آپ جیسا قلمی دوست ملا ہو۔

آپ کے خط کا انتظار بے چینی سے کروں گی۔

آپ کی زہرہ

---

پٹنہ ۱۴ رمئی

پیاری زہرہ!

میں کتنا خوش نصیب انسان ہوں مجھے اپنی قسمت پر ناز ہے کہ مجھے آپ جیسی ساتھی مل گئیں۔ میرے بے شمار قلمی دوست ہیں لیکن یقین مانئے جب سے آپ کا لفافہ آ یا ہے سبھوں کا نام دھیرے دھیرے ذہن سے فرار ہو چکا ہے۔ میرے ذہن میں اگر کسی کا نام محفوظ ہے تو صرف آپ کا۔ بلا کی تحریر آپ کی۔ آپ تو نثر میں شاعری کرتی ہیں۔ آپ سے ملنے کے لئے دل بے قرار ہے۔ نہ معلوم میری خوشی کا وہ کونسا دن ہوگا جب آپ سے ملاقات ہوگی۔

اور ہاں رات جیسے ہی آنکھ لگی میں نے دیکھا کہ آپ میرے پاس بیٹھی ہیں اور میں آپ کو ایک فلم کی کہانی سنا رہا ہوں جسے آپ بڑی سنجیدگی سے سن رہی ہیں۔ آپ کی اس سنجیدگی پر مجھے اتنا پیار آیا کہ میں کچھ بیان نہیں کر سکتا

کاش! آپ خود ہوتیں اور میری حالت اپنی آنکھوں سے دیکھتیں۔
— خدا کے لئے میری حالت زار پر کرم فرمائیں۔
آپ کا اپنا — فروز

گیا ۔ ۲ مئی

مائی ڈیر فروز! تسلیم

آپ کا محبت نامہ ملا ۔ پڑھ کر خوشی سے جھوم اٹھی آپ کی تحریر آپ کی بے پناہ محبت کی عکاس ہے مجھے اپنی تقدیر پر ناز ہے ۔ بعض اوقات میں آپ کی یاد میں کچھ اس طرح کھو جاتی ہوں ۔ کچھ سہیلیاں مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں ۔ آپ سے ملنے کے لئے دل بے قرار ہے ۔ ایسا لگتا ہے کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں اور ہاں! پلیز! مجھے "آپ" نہ لکھا کریں ۔ کیونکہ آپ میں وہ قربت نہیں جو "تم" میں ہے ۔ اس لئے جب آپ مجھے "تم" لکھیں گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی ۔ اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی — اور ہاں! اپنی تصویر بھیج دیں تاکہ میری تنہائی کا سہارا ہو سکے رات کی خاموشی میں صرف آپ کا تصور ہی نہیں بلکہ آپ کی تصویر بھی ہو ۔

آپ کی اپنی ۔ زہرہ

پٹنہ ۱۴ مئی

میری پیاری زہرہ

تمہارا محبت سے بھرا ہوا محبت نامہ ملا ۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ واقعی زہرہ تمہارا خط میرے لئے مسیحا ہے ۔ اگر تمہارے خطوط کے آنے میں تاخیر ہوتی ہے تو زہرہ! تمہاری جدائی میں رات کی نیند اور دن کا سکون حرام ہے ۔ اور میری اسی حالت کو دیکھ کر یہ کم بخت اشرف کا بچہ جو میرا عزیز دوست اور روم پارٹنر بھی ہے ۔ مجھے طرح طرح سے بور کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ مجھے کچھ اس طرح گھورتا ہے ۔ جیسے وہ مجھے سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو ۔ ایک دن کہہ رہا تھا — "جب تک تکڑے سے ناشتہ نہیں کراؤ گے اور پکچر نہیں دکھاؤ گے میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ دوں گا ۔ اور ایک دن تمہاری محبوبہ کا خط اڑا لونگا اور سبھوں پر تمہاری محبت کا راز عیاں کر دونگا ۔

لیکن کاش بیٹے اشرف کو یہ خبر ہوتی کہ میں اپنی زہرہ کا خط بکس میں نہیں بلکہ تعویذ بنا کر رکھتا ہوں ۔ جس سے مجھے قدرے سکون ملتی ہے ۔

زہرہ! یہ دوری اب کب تک رہے گی ۔ اس بندھن کو توڑ کر ہم دونوں وہاں چلیں جہاں ہم دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ ہو ۔ میں اپنی محبت کا اعتراف کس طرح کروں زہرہ! شاید تمہیں یقین نہیں آتا ہو ۔ کاش! میں اپنا سینہ چیر کر دکھلا سکتا ۔

اپنی تصویر بھیج رہا ہوں جو حال ہی میں کھنچائی ہے ۔ یہ تصویر اپنی گونگی زبان سے میری پریشانی کا اظہار کرے گی ۔

اور ہاں! زہرہ اپنی ایک تصویر جو جذباتی پوز کی ہو بھیج دو ۔ تاکہ تنہائی میں تمہاری تصویر ہی سے دل بہلائیں — پلیز! زہرہ! ایک پکچر صرف ایک ۔

تمہارا اپنا — فروز

پٹنہ ۵ جون

بیٹے فروز! سلامت رہو

آگئے نہ راستے پر، بہت بنتے تھے کہ میں صرف قلمی دوستی کرتا ہوں عشق نہیں ہے ۔ یاد ہے کیا کہا تھا تم نے کہ اگر کوئی لڑکی مجھے خط بھی لکھے گی تو میں جواب نہیں دونگا لیکن اب کیسے زہرہ کا خط دیکھ کر اس کے زلفوں کے سائے میں جان دینے کے لئے پھڑپھڑانے لگے ۔ کیا کہا تھا میں نے تم سے کہ — "آجکل لوگ قلمی دوستی کے کالم" میں لڑکیوں کے نام اور پتے تلاش کرتے ہیں ۔ تاکہ شروع میں تو ان سے قلمی دوستی کی جائے ۔ اور بعد میں محبت ۔

لیکن تم نے کہا تھا کہ "میں ان لوگوں میں سے نہیں
شرط رکھ لو" لیکن آج تم شرط ہار چکے ہو۔ مگر کان
دھر کر سن لو ــــ بیٹے میں زہرہ نہیں اشرف ہوں۔
اشرف۔ اور پتہ میں نے گیا کے ایک دوست کا محض
اس لئے دیدیا تھا تاکہ مجھے خط آسانی سے مل سکے۔
بیٹے زہرہ کا خط ہی دیکھ کر عشق میں کچھ اس طرح
اندھے ہو گئے کہ یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ لفافہ پٹنے سے
چلا ہے یا گیا سے۔ تمہارے خطوط اور ایک تصویر
جس میں تم عاشق کے لوشی نظر آرہے ہو۔ میرے
پاس محفوظ ہیں۔ گھبراؤ نہیں جلد ہی اسے تمہارے
ابا حضور کے پاس ملفوف کر کے بھیج دونگا تاکہ وہ بھی
دیکھ لیں کہ میرا لخت جگر پٹنے میں پڑھ رہا ہے یا
کسی کے زلفوں کا اسیر ہے ــــ اور ہاں اگر یہے
اس خط کو پڑھنے سے تمہارا سر چکرانے لگے تو زہرہ
کے اس خط کو جس کو تم نے تعویذ بنا کر رکھا ہے
اسے گلاب کے پانی میں گھول کر پی جاؤ تاکہ تمہارے
قلب کو سکون ہو۔

بیٹے اب تم میری گرفت سے کہاں جاؤ گے!
تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ اور اگر تم اپنی بھلائی چاہتے
ہو تو ــــ ایک پیچر اور ایک گھڑا ناشتہ "بولو
منظور ہے؟ اور نہیں تو سمجھ لو، لفافہ تمہارے
ابا حضور کو پہنچ جائیگا۔ کیا خیال ہے؟ غالباً زہرہ
کی محبت مہنگی پڑی ہوگی ــــ تمہیں جنم جنم میں یاد آئےگا
تمہارا چاچا ــــ

اشرف

●●

بقیہ صہ ۱۷

مولانا ابوالکلام آزاد۔۔۔۔۔

الگ ہرانے کی کوشش کی۔
مولانا اردو کے بہت بڑے عالم تھے۔ اردو بولنے
میں بھی ان جیسا کوئی نہ تھا۔ وہ جب کبھی جیل گئے تو وہاں
انھوں نے اپنے خاص انداز میں کوئی نہ کوئی کتاب
ضرور لکھی "غبار خاطر" جیل ہی کی فرصت کا نتیجہ ہے۔
آپ انگریزی خوب جانتے تھے۔ مگر اردو کے
مقابلے میں انگریزی لکھنا یا بولنا پسند نہیں کرتے تھے۔
بہت سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ اگر مولانا مسلمانوں
کے صحیح لیڈر رہتے تو مسلمان کبھی بھی ہندوستان میں سیاسی
حیثیت سے پیچھے نہ رہتا۔ مگر انھیں یہ سچائی نہیں معلوم کہ
اگر مولانا آزاد کانگریس کے ممبر نہ ہوتے تو مسلمانوں کو
ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلے کافی نقصان رہتا۔
جس وقت ۱۹۱۶ء میں مولانا رانچی جیل میں قید کئے
گئے تھے تو آپ نے وہاں پر قرآن کا ترجمہ کیا جو انھیں ہمیشہ
زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ جب وہ جیل سے باہر آئے تو
انکا دل اداس تھا لیکن روح خوش تھی کہ انھوں نے مسلمانوں
کی رہنمائی کے لئے ایک یادگار کام کیا۔
تعجب ہے کہ مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن"
کی موجودگی میں بھی مسلمان ان کی اسلامی خدمت نہ مانیں
اور انھیں مسلمانوں کا سچا دوست اور رہنما نہ سمجھیں۔

●●

# ہندوستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرے گا؟

محمد ہارون متعلم ایم۔اے (سیاسیات)
دلی یونیورسٹی

موجودہ حکومتوں کی تعداد ایک سی نہیں رہتی۔ نئی نئی ریاستیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔ اگر یہ نئی ریاست پُرامن طریقے سے وجود میں آتی ہے جیسے پاکستان، تو ان کو تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ مگر جب یہ تشدد سے وجود میں آتی ہے تو اس کو تسلیم کرنے کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔

بین الاقوامی قوانین اس سلسلے میں ایک جامع صورت حال پیش نہیں کر سکتے۔ اب تک ریاستوں کی جو روش رہی ہے وہ متضاد ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ کسی بھی نئی ریاست کو تسلیم کرنے کا مسئلہ قانون یا جائز نا جائز کی روشنی میں نہیں بلکہ تسلیم کرنے والے ملک کی اپنی پالیسی پر منحصر ہے۔ اس سلسلے میں ذاتی مفاد اور دوسرے سیاسی مسائل ایک مؤثر رول ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب کے بعد امریکہ نے کئی سال تک روس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسرائیل کو عرب ممالک تسلیم نہیں کرتے۔ سرخ چین کو امریکہ قبول نہیں کرتا۔ اس کے برعکس دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد پولینڈ اور چیکوسلاواکیہ کی ریاستیں امریکہ، فرانس اور برطانیہ نے قبول کر لی تھیں جبکہ ان کا وجود بھی نہیں تھا۔

بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کرنے کا مسئلہ تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہندوستان کا اپنا مفاد۔
۲۔ اخلاقی تقاضہ اور
۳۔ بین الاقوامی قانون۔

ہندوستان کی مداخلت (اگر یہ مداخلت ہے) جائز ہے۔ پاکستان نے کبھی بھی کوئی ایسا موقعہ ضائع نہیں کیا جس سے ہندوستان کی معاشی یا سیاسی کمزوری ہوتی ہو۔ ناگالینڈ اور کشمیر کی مثالیں اس موقعے پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ کشمیر میں پاکستانی گوریلز کو روکنے کے لئے ہندوستان کو کافی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی فوجی طاقت بھی ہمارے لئے ایک مستقل خطرے سے کم نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری حکومت کسی بھی ایسے موقع کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہے گی جس سے پاکستانی فوجی طاقت کو زک پہنچے۔

۲۔ اقوام متحدہ کا چارٹر، بین الاقوامی قانون اور خود اخلاق کا تقاضہ ہے کہ دوسرے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیا جائے۔ مگر پہلا سوا

یہ ہے کہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات کہاں
ختم ہوتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک ملک جس چیز کو
اندرونی معاملہ قرار دیتا ہے۔ اسی مسئلہ پر
دوسرے ملک میں مداخلت پر تیار ہے۔ خود
ہماری حکومت تمام شہریوں کو عملی طور سے
مساوی حقوق نہیں دے سکی۔ مگر یو۔ این۔ او
میں پوری شدت سے اس مسئلہ پر چیخ و پکار
کی جاتی ہے۔ امریکہ کا نیگرو رویہ ٹھیک نہیں۔
مگر کمیونسٹ ممالک میں جو سیاسی آزادی سلب ہے اسکا
پروپیگنڈا پورا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک
ہی رائے ہوسکتی ہے۔ ہر حکومت اپنے اور
دوسروں کے اندرونی معاملات کی خود ہی تعریف
کرتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ اصول کبھی بھی ایمانداری
کے ساتھ نہیں مانا گیا۔ ہر ملک یہی کہے گا کہ اندرونی
معاملات میں دخل اندازی نہیں ہونی چاہیئے۔
مگر خود کریگا۔ روس نے پولینڈ ہنگری اور
چیکوسلاویکیہ میں یہی کیا۔ امریکہ ہند چین میں
یہی کر رہا ہے۔ چین ایشیائی ممالک میں دخل اندازی
کر رہا ہے۔ جہاں جس کا داؤ لگ سکتا ہے یا اسکا
قومی مفاد وابستہ ہوتا ہے فوراً دخل اندازی
ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کا چارٹر، انٹرنیشنل لا
دونوں بے جان ہیں۔ اگر ہندوستان نے بنگلہ
دیش کی سیاسی مدد کی ہے تو کیا گناہ کیا۔

۳۔ اب رہ جاتا ہے بین الاقوامی قوانین کا
مسئلہ۔ ہندوستان بنگلہ دیش کو تسلیم کر سکتا ہے
اگر بنگلہ دیش دو شرائط پوری کردے۔
(ا) کچھ رقبہ ایسا ہو جہاں پر ان کا پورا اقتدار
قبضہ ہو۔ (ب) بنگلہ دیش کی حکومت
بین الاقوامی تقاضہ بھی پورا کر سکے۔ اگر ایسا
ہو تو حکومت ہند بنگلہ دیش کو عارضی طور سے
تسلیم کر سکتی ہے۔ اس عارضی تسلیم کرنے کا مطلب صرف
یہ ہوتا ہے کہ ایک قانونی حکومت (پاکستان) موجود ہے مگر ا
متوازی حکومت (بنگلہ دیش) بھی موجود ہے جس۔
ایک علاقہ پر بھر اثر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس
لئے اس کو بھی مشروط تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ تسلیم
کسی بھی وقت واپس لیا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت
پاکستان بنگلہ دیش کو ختم کردے تو یہ عارضی
تسلیم کرنے کی بات بھی خود بخود ختم ہوجا
ہے۔

عارضی تسلیم کرنے کی بین الاقوامی قانو
اجازت دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر نئی
ریاست جو تشدد سے وجود میں آتی ہے
اس کو پہلے اسی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور
بعد میں باقاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ عارضی
تسلیم کرنا موجودہ حکومت کے خلاف نہیں ہوتی
اس کے ساتھ سفارتی تعلقات پر اثرانداز نہیں ہو
نئی ریاست اس شکل میں پورے سفارتی مراعا
کی حقدار بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ معمولی مراعات د
جا سکتی ہیں۔

اب بنگلہ دیش کی حکومت کو تسلیم کرنے کا سارا
دارومدار اس بات ہے کہ اس وقت مکتی فو
کی کیا پوزیشن ہے۔ ان کے پاس کتنا علاقہ ہے
اور وہ کس حد تک بین الاقوامی تقاضہ کو پورا
کر سکتے ہیں۔ کسی دوسرے ملک نے ابھی تک کھل کر
بنگلہ دیش کی حمایت نہیں کی۔ بلکہ پاکستانی موقف
کی حمایت کرنے والے کچھ نکل آئے ہیں۔ ہندوستان
ٹائمز نے اپنے اداریہ میں مان لیا ہے کہ خبریں
ٹھیک طرح سے چھان بین کر کے نشر نہیں کی گئیں۔
اب یہ ظاہر ہے کہ دونوں شرائط میں سے کوئی
پوری نہیں ہوتی۔ اور اس طرح شاید ہندوستان بنگلہ
دیش کو عارضی طور سے بھی تسلیم نہ کرے۔ ●●

# ہیرے کی پہچان

تحسین عالم جوہر۔
اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول دہلی

شام کا سہانا منظر تھا۔ سورج کی مدھم کرنیں بیقراری
کے ساتھ آغوشِ افق میں سمٹتی جا رہی تھیں۔ سرد ہوا
کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی
خوشبو سے سارا باغ معطر ہو رہا تھا۔ عجیب پرکیف
منظر تھا۔ اصغر اور نازبین باغ میں ایک سدا بہار
درخت کے نیچے ہرے بھرے گھاس کے فرش پر
بیٹھے ہوئے تھے۔ اصغر کی آنکھیں ندی کے بہتے
ہوئے پانی پر جمی ہوئی تھیں اور نازبین کی نگاہیں اصغر
کے حسین چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں۔

آخر نازبین نے مہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا۔
"آج آپ اتنے افسردہ کیوں ہیں؟"

اصغر نے جواب دیا "افسردہ تو نہیں ہوں لیکن
اس وقت میرے دل میں عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی
ہے! نہ جانے کیوں؟"

نازبین نے کہا "ہاں آجکل آپ کا انداز ہی کچھ
بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ تعجب ہے کہ آپ مجھ سے اس
قدر بے نیاز کیوں ہیں؟"

"نازبین آج والدہ صاحبہ میری شادی کے
متعلق گفتگو کر رہی تھیں۔ لیکن نازبین میں تو اس وقت
تک شادی نہیں کرونگا جب تک اس لڑکی سے مل کر
اظہارِ محبت نہ کر لونگا۔ کیونکہ بغیر محبت کے شادی ایک
غیر فطری چیز ہے۔"

نازبین نے حیرت سے اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے
سوال کیا۔ "آخر وہ کون لڑکی ہے؟"

اصغر نے مسکرا کر جواب دیا "میری چچا زاد بہن
زرینہ۔"

نازبین حیرت کی بات یہ ہے کہ میری آج تک اس سے
ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ مگر میں نے والدہ صاحبہ سے انکار
کر دیا ہے کہ میں جاہل لڑکی سے شادی نہیں کرونگا۔ اگر
شادی کرونگا تو پڑھی لکھی لڑکی سے ورنہ
روح القدس کی قسم! اگر اردو داں بیوی نہ ملی تو ہندی
داں ہی منظور کر لونگا۔ والدین کا کیا۔ وہ تو اپنا
فرض ادا کرنے کے لئے لڑکی کا انتخاب کر کے شادی رچا
دیتے ہیں۔ اب اولاد کی زندگی آرام سے گذرے یا
غم و فکر سے۔ انھیں اس کی پرواہ نہیں۔ مجھے ایسا رشتہ
پسند نہیں۔ میں ایسی شادی سے صاف انکار کر دونگا۔
شادی بیاہ ایک ایسا متبرک سلسلہ ہے جس سے مرد یا
عورت کو تمام عمر کے لئے ایک سنہری زنجیر میں جکڑ
دیا جاتا ہے۔ اور دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔
اور زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں اس لئے
یہ سودا خریدنے سے قبل اسے پرکھ لینا بہتر ہے۔ لیکن
ایسی لڑکی ملے گی کہاں جسے میں پرکھ سکوں۔"

نازمین نے کہا "خیال تو اچھا ہے۔ اور ایسی لڑکی مل بھی سکتی ہے آپ کو۔ "

اصغر نے حیرت سے نازمین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "آخر وہ کون لڑکی ہے نازمین۔ ذرا میں بھی تو سنوں اسکا نام۔"

نازمین نے شرمیلی نگاہوں سے اصغر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جسے سب نازمین کہتے ہیں۔"

اصغر نے تعجب سے سوال کیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو نازمین۔ کہیں مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟"

نازمین نے کہا "نہیں کوئی لڑکی اس معاملے میں مذاق نہیں کر سکتی اور نہ میں ......."

اصغر نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ "تو نازمین میں یہ سمجھ لوں کہ تم مجھ سے ......... کیا یہ خیال درست ہے؟"

نازمین نے اپنے گیسوئے پریشان کو رخ سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ "جی ہاں خیال درست ہے۔"

اصغر کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ نازمین کو اس سے محبت ہے۔ اسے یہ بات عجیب سی محسوس ہوئی۔ چند لمحے تک خاموشی کا عالم رہا۔ آخر اصغر نے نازمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نازمین بچپن سے ہم دونوں ایک ساتھ رہتے چلے آئے ہیں لیکن میں کبھی یہ نہ کہہ سکا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر مجھے تمہارے ساتھ رہ کر ایک گونہ مسرت حاصل تھی۔ اور میں اسے اپنے رنگین خوابوں کی تعبیر سمجھتا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ تم سے اپنی محبت کا اظہار کر دوں۔ لیکن پھر یہ سوچتا تھا کہ کہیں تمہیں برا نہ معلوم ہو اس لئے اس راز کو اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا۔ مگر آج تم نے خود ہی ظاہر کر دیا۔ اچھا ہی ہوا کہ آج ہم دونوں ایک دوسرے کے دلی جذبات سے واقف ہو گئے۔"

نازمین نے کہا "اچھا چلئے اب گھر چلیں۔ کیونکہ شام بہت ہو گئی ہے۔ اور ہر طرف تاریکی چھا چکی ہے زندگی بخیر رہی تو کل پھر ملاقات ہوگی۔"

نازمین ایک طوائف کی لڑکی تھی۔ جس کی ماں کی زندگی کا دارومدار عرف عصمت فروشی پر ہی چل رہا تھا۔ نازمین بہت حسین و جمیل تھی۔ اور ساتھ ہی۔ اے تک تعلیم یافتہ تھی۔ ۔ اور اب وہ فلم کے اندر ہیروئن کا رول ادا کر رہی تھی یہی وجہ تھی کہ اصغر دن رات نازمین کے محبت کے گیت گایا کرتا تھا۔

اصغر اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا اخبار پر نظر ثانی کر رہا تھا کہ نوکر کمرے میں داخل ہوا اور ایک خط اصغر کے ہاتھ میں دے کر واپس چلا گیا۔ اصغر نے لفافہ چاک کیا۔ یہ خط زرینہ کا تھا۔

جناب والا

نیاز قبول فرمائیے ——— ایک خستہ اشرت دل کا نیاز۔ آہ ------" تم بے حس تھے۔ اس قدر سنگدل۔ اس درجہ ستم آرائی کہ آپ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور میں اسکا سبب جانتی ہوں کہ آپ کسی خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

امید تو نہیں مگر تاہم اپنی نادانی کی بدولت ۱۶ جنوری کو ٹھیک شام کے پانچ بجے بڑی بے صبری اور بے قراری سے آپ چائے پر انتظار کروں گی۔

زیادہ حد آداب      امید نوازش

آپ کی دیال جان

زرینہ

اصغر نے خط پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور سوچنے لگا کہ اس خط کا جواب دیا جائے یا دفعتاً خیالات کی رو بدلی اور اصغر زرینہ کو خط لکھنے

محترمہ تسلیمات

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ
آپ ماضی کی یادوں کو بھول جائیں۔ اس لئے اب
جبکہ اس خوفناک خواب کی خوفناک تعبیر بروئے
کار آچکی ہے۔ آپ نے مجھ سے یہ توقع کی ہے کہ
آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہوں۔ معافی چاہتا ہوں

منت پذیر
آپ کا یاد ایام اصغر

اصغر نے خط لکھ کر ایک لفافہ میں بند کیا اور نوکر کو پوسٹ کرنے کے لئے دیدیا۔

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اصغر ہڑبڑا کر سنہری سے اٹھ بیٹھا۔ نازنین سے ملاقات کا وقت قریب آگیا تھا۔ صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ کپڑے پہن کر فوراً منزل مقصود کی راہ لی۔

آج کی شام کتنی پرکیف اور رنگین تھی۔ نازنین ندی کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اصغر کا انتظار کر رہی تھی۔ تقریباً ساڑھے پانچ کا عمل تھا۔

اصغر چپکے سے نازنین کے پیچھے جاکر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں۔ نازنین کے ہونٹوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور آہستہ سے بولی۔

" میرے پیارے اصغر کے سوا اور کون یہ ہمت کر سکتا ہے کہ میری آنکھوں پہ ہاتھ رکھے۔ اصغر مسکراتا ہوا اس کے برابر بیٹھ گیا۔

نازنین بولی "آپ انتظار بہت کراتے ہیں۔"

اصغر نے نازنین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

" نازنین تم کو انتظار کرنے میں لطف بھی تو بہت آتا ہے۔"

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے شام جاں کو تازہ کر رہے تھے۔ اس پُرنشاط فضا میں دو محبت کے دیوانے بیٹھے ہوئے ماضی کی یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔

رات کی تاریکی ایک نشہ بن کر ہر طرف چھا رہی تھی۔

آج اصغر بہت شاداں نظر آرہا تھا۔ اسے نازنین کیا ملی گویا ساری کائنات مل گئی تھی۔

تین ماہ بڑے لطف سے گذر گئے۔ محبت کا نازک پودا اور بھی مضبوط ہو چلا گیا۔ دونوں اپنے انجام سے بے خبر ایک دوسرے کی محبت میں گم ہو چکے تھے۔

اصغر جب بھی نازنین سے کہتا تھا کہ ان ملاقاتوں سے یہی بہتر ہے کہ ہم شادی کر لیں تاکہ دنیا ہماری طرف مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھے۔ نازنین یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی کہ ان ملاقاتوں میں بہت مزا آتا ہے۔ بیکار شادی کر کے اپنی ازدواجی زندگی کو تلخ بنایا جائے۔ اصغر یہ سن کر خاموش ہو جاتا اور اس مبارک دن کا شدت سے انتظار کرتا تھا۔ جس دن نازنین اس کی بیوی بنے گی۔

وہ انھیں خیالات میں گم تھا کہ اصغر کی کار ایک جھٹکے کے ساتھ نازنین کی کوٹھی پر رک گئی۔ ڈرائیور نے باہر آکر دروازہ کھولا۔ اور اصغر کار سے نکل کر نازنین کے کمرے کی طرف چل دیا۔ نازنین پہلے ہی سے چائے پر اصغر کا انتظار کر رہی تھی۔ آج وہ بہت ہی حسین جاذب نظر آرہی تھی۔ وہ نیلے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ جو اس کے حسن کو اور بھی دوبالا کر رہی تھی۔

اصغر نے نازنین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
"تمہیں نازنین میں سچ کہہ رہا ہوں، تمہارا ایک ایک عضو حسن کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ تم جب مسکراتی ہو تو ہزاروں بجلیاں تڑپا دیتی ہو۔ تمہاری دلفریب مسکراہٹ مجھ کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ میں جب تمہارے پاس ہوں تم بولتی ہی مسکراتی رہو اور میں دیکھا کروں۔ نازنین شرما گئی۔

اُف! ساڑھے نو بج گئے۔ اصغر نے حیرت سے نازین سے سوال کیا۔ "نازین کیا آج تم ڈیوٹی پہ نہیں جاؤ گی؟"

نازین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "نہیں آج سے میں نے ڈائریکٹر کو استعفیٰ دیدیا ہے۔ وہ بدمعاش کل میری عصمت لوٹنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے صاف صاف کہدیا کہ میں کسی اور کی ہوچکی ہوں، اور میری محبت بالکل پاک ہے۔ وہ مجھ سے پچاس ہزار کا مطالبہ کرنے لگا جو اس نے آنے والی فلم کے لئے پیشگی دیئے تھے۔" نازین یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

اب میں یہی سوچ رہی ہوں کہ اسکا مطالبہ جو کہ حق بجانب ہے کیسے پورا کروں۔ وہ تو روپیہ میں خرچ بھی کرچکی ہوں۔" یہ کہہ کر نازین خاموش ہوگئی۔

اصغر نے اپنی جیب سے جلدی سے چیک بک نکالی۔ اور پچاس ہزار کا چیک کاٹ کر نازین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لو نازین کسی بات کی فکر مت کیا کرو۔" نازین کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ گئی اور شکریہ ادا کرتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھ پہ کتنے احسانات کرتے ہیں کہ میں انکے بوجھ تلے دبی جا رہی ہوں۔ میں آپ کے یہ احسان عمر بھر نہ بھول سکوں گی۔"

نازین اب تک اصغر سے کئی لاکھ روپیہ وصول کرچکی تھی۔

اصغر اپنی زندگی کے زیادہ تر اوقات نازین کے ساتھ گزار رہا تھا۔ نازین کا حلقہ احباب اب دن بدن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ اپنی آزادی میں کسی قسم کی رکاوٹ بھی پسند نہ کرتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک دولتمند طوائف کی نور نظر تھی۔ عرصہ ہوا کہ اس کے والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اب وہ خودمختار تھی۔ تاہم اصغر بری طرح اس کے حسن کا گرویدہ تھا۔ نازین کے بغیر اسے دنیا کی تمام رنگینیاں بے کیف اور پھیکی نظر آرہی تھیں۔ اصغر بھی ایک دولتمند گھرانے کا فرد تھا۔ ابھی چند ماہ گذرے اس کی ماں کا انتقال ہوچکا تھا۔ اب وہ خودمختار تھا۔ سیاہ سفید کا مالک تھا کیونکہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔

اصغر اپنی مسہری پہ لیٹا ہوا بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اصغر نے بڑھ کر ٹیلیفون ریسیور اٹھا لیا۔ ..... ہیلو!

دوسری طرف سے کوئی عورت بول رہی تھی۔ "آپ جس نازین سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ آپ اس کی محبت کو پاکیزہ سمجھتے ہیں وہ طوائف کی لڑکی ہے اور وہ اپنا پیشہ نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آج وقت اسکی کوٹھی پہ چلے جائیے تاکہ آپ اپنی آنکھوں سے حقیقت دیکھ سکیں۔ دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔ اس کی امیدوں کے ہرے بھرے باغ میں یکایک خزاں آگئی۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا۔

اس نے جلدی سے کپڑے بدلے اور باہر آکر کار میں بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کردی۔ کار بڑی تیزی سے نازین کی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔ اصغر اپنے خیالات میں گم تھا کہ ڈرائیور نے آواز دی "سرکار کوٹھی آگئی ہے۔"

اصغر بوجھل قدموں سے کار سے اترا اور اندر داخل ہوگیا۔ مگر نازین کے کمرے کا دروازہ بند تھا وہ نازین کے کمرے کی بغل والی کھڑکی کی طرف پہنچا اور اندر کی طرف دیکھنے لگا۔

لیکن اندر کا نظارہ کرتے ہی اس کی روح فنا ہوگئی، آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے اپنی جواب دیتی ہوئی طاقت کو سنبھالا۔ اس نے وہ منظر دیکھا جو شاید زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس کی پیاری نازین ایک اجنبی شخص کی زینت آغوش بنی ہوئی تھی۔ اور سامنے میز پر دو گلاس اور ایک شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

اجنبی شخص نازمین سے کہہ رہا تھا۔ "تم اصغر سے
تنی محبت کیوں کرتی ہو۔ ؟"
نازمین نے جواب دیا "میں تو صرف اصغر کو
تو بنا کر اس سے اسکا سارا روپیہ وصول کرنا چاہتی
ہوں۔ میں ابتک اس سے دس لاکھ روپیہ وصول
کر چکی ہوں۔"
اصغر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے ذہن
سے چیخ کر کہا۔ "غدار بے وفا۔ اچھا ہوا مجھ کو پہلے سے
تیری غداری کا پتہ چل گیا۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں بگڑا ہے
یہ کہتا ہوا وہ وہاں سے باہر آگیا۔ اگر وہ چاہتا تو
ایک ہی وار میں نازمین اور اجنبی شخص کا خاتمہ کر دیتا۔
لیکن وہ خاموشی کے ساتھ گھر واپس چلا آیا۔ کمرے پر
اس کا دوست راجیش اور ایک حسین و جمیل دوشیزہ
اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اصغر اپنے دوست راجیش
سے مل کر بہت خوش ہوا۔
راجیش نے حسین و جمیل دوشیزہ کا تعارف کراتے
ہوئے کہا۔
" آپ ہمارے فلم کی ہیروئن ہیں۔ اصلی نام تو پتہ نہیں
فلمی نام نرگس ہے۔"
اصغر بولا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"
نرگس نے جواب دیا۔ "وہ میں ہی تھی جس نے آپکو
ٹیلی فون کیا تھا۔"
اصغر بڑی حیرت سے نرگس کو دیکھ رہا تھا "آپکو
کیسے پتہ چلا۔ ؟" اصغر نے بڑی بے صبری سے پوچھا۔
نرگس بولی۔ "یہ کہانی بڑی طویل ہے۔ مقصد صرف
اتنا ہے کہ نازمین میری سہیلی ہے اور مجھ کو جب اس بات
کا علم ہوا تو میں نے سوچا اچھا ہے اصغر ٹھوکر کھانے سے
پہلے ہی سنبھل جائے۔ اسی وجہ سے میں نے آپ کو ٹیلی فون
کیا تھا۔"

چائے وغیرہ پینے کے بعد جب راجیش اور نرگس
چلنے کے لئے تیار ہو گئے تو اصغر بولا۔ "اب پھر کبھی
ملاقات ہوگی یا نہیں۔ ؟" نرگس نے آہستہ سے جواب
دیا۔ "ضرور۔ اگر آپ کہیں تو میں ہی آپ کے دولت خانہ
پر حاضر ہوں۔" اصغر نے شکریہ ادا کیا۔ اور واپس آکر
اپنے بستر پر لیٹ گیا۔
اب اصغر کے یہاں نرگس برابر آنے جانے لگی۔
اصغر اور نرگس اب روزانہ باغ میں جاتے اور گھنٹوں
بیٹھے ہوئے پیار و محبت کی باتیں کیا کرتے۔ اب اصغر
نرگس کے حسن پر اس قدر فریفتہ ہو گیا کہ اسے دنیا و
ما فیہا کی خبر تک نہ رہی —— اس وقت تقریباً پانچ کا
عمل ہو گا۔ اصغر اور نرگس بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے
نرگس کی غزالی آنکھیں اور سیاہ پلکیں اس کی خوبصورتی
میں اور بھی چار چاند لگا رہی تھیں۔ اصغر نے ایک
خوشنما گلدستہ اٹھایا اور نرگس سے بولا۔ "یہ اس
محبت کا تحفہ ہے جس کا ابھی میں تم سے ذکر کر چکا ہوں۔
لاؤ اس کو تمہارے زیب سر کر دوں۔"
نرگس "اس کی کیا ضرورت ہے ؟" اصغر ملتجی اکرم
نظروں سے "نرگس اب اس کو رد نہ کرو۔ یہ تحفہ
غیر مقبول نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے مجھ کو صدمہ ہوگا۔ میں
صرف اس لئے خوش ہو جاؤنگا کہ تم اور بھی بھلی معلوم
ہونے لگو گی —— میرے اس قدر اصرار کرنے پر اس پر
نسوانیت کے قدرتی اثرات کا غلبہ ہونے لگا۔ نرگس
نے ایک سیمل گل مجاب سے سر جھکا لیا۔ اور شرمیلی نگاہوں
سے اصغر کو دیکھنے لگی۔
" نرگس میں تم سے محبت کرتا ہوں تم پر عاشق ہوں"
اصغر کہہ رہا تھا۔ "نرگس میں تم سے شادی کرنا
چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت دکھ اٹھائے
ہیں۔ میں نے جس سے سچی محبت کی اس نے مجھ کو دھوکہ دیا۔
ہے۔ میرے سارے خوابوں کا جنازہ نکال دیا ہے۔
اب میں چاہتا ہوں کہ خوشی کی زندگی بسر کر دوں۔"
اصغر نے دیکھا نرگس کی آنکھوں سے آنسو نکل
رہے تھے۔

اصغر حیرت سے "ارے یہ کیا ؟ تم رو کیوں رہی ہو نرگس ۔؟"

نرگس نے اپنے پرس سے ایک لفافہ نکالا اور اصغر کے ہاتھ میں دیدیا۔ اصغر نے لفافہ کھولا ۔

محترمہ تسلیمات

میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ ماضی کی یادوں کو بھول جائیے ۔ اس لئے جبکہ اس خوفناک خواب کی خوفناک تعبیر سیرو ئے کار آچکی ہے ۔ آپ نے مجھ سے یہ توقع کی ہے کہ آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہوں ۔ معافی چاہتا ہوں ۔

منت پذیر

آپ کا یاد ایام اصغر

اصغر کے منہ سے بے ساختہ نکلا ........ زرینہ یہ تم ہو ........ تم زرینہ ہو ۔ مگر زرینہ اپنی کار میں بیٹھ کے جا چکی تھی ۔ اور اصغر کے ہاتھ میں یہ چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ لرز رہا تھا ۔

## غزل

شاہینہ خان علیگ

خیالوں میں کسی کے اس طرح آیا نہیں کرتے
ستا کر کسی کو اس طرح مسکرایا نہیں کرتے

بے وفا ایسے کسی کو تڑپایا نہیں کرتے
ٹھکرائے ہوؤں کو اس طرح ٹھکرایا نہیں کرتے

خزاں سے کبھی تو پھول مرجھایا نہیں کرتے
غموں کے بوجھ سے شاخیں مرجھایا نہیں کرتے



شاہجہاں دہلی

# جامعہ طبیہ دہلی کا جشن سالانہ

جامعہ طبیہ (گلی قاسم جان دہلی) کا سالانہ جشن ۱۱ ر ۱۲ ر مئی ۱۹۷۱ء کو شان سے منایا گیا۔ ۱۱ ر مئی ۱۹۷۱ء شب کو ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں مقامی مگر ملک گیر شہرت کے حامل شعراء نے شرکت کی۔ مشاعرہ کامیابی کے ساتھ ڈیڑھ بجے شب اختتام پذیر ہوا۔ ۱۲ ر مئی ۱۹۷۱ء شام کو مہمان خصوصی وزارت صحت و فیملی پلاننگ کے وزیر مملکت ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ چٹ۔ اوپادھیائے نے انعامات کی تقسیم کی۔ جامعہ کے پرنسپل حکیم گورودت سنگھ الگا نے سالانہ رپورٹ پڑھی جس کا اختصار شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد جامعہ کے طلبہ اور طالبات نے رنگا رنگ کلچرل پروگرام پیش کیا جن میں تین چھوٹے ڈرامے بھی شامل ہیں جو بے حد پسند کئے گئے۔

---

## جامعہ طبیہ کی مختصر تاریخ

ہندوستان کے مختلف طبی مدارس میں نصاب وطریقۂ تعلیم میں یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کے رفقاء حکیم محمد الیاس صاحب، حکیم علامہ کبیر الدین صاحب اور حکیم فضل الرحمٰن صاحب نے ضرورت محسوس کی کہ دہلی کی مرکزی حیثیت قائم رکھنے کے لئے جو مسیح الملک کی وفات کے بعد کمزور ہونے لگی تھی دہلی میں ایک ایسا طبی ادارہ قائم کیا جائے جو مسیح الملک کی منشاء کے مطابق صحیح نصاب کے ساتھ علمی وعملی طب کی ترویج و اشاعت کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ جدید ترقیات و تجربات سے بھی طلبہ کو واقف کرائے۔ اس لائحۂ عمل کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں قرول باغ دہلی میں جامعہ طبیہ دہلی کی بنیاد رکھ کر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ تقسیم ہند نے جامعہ طبیہ کو بھی شدید طور پر متأثر کیا۔ اس کے تمام ریکارڈ، کتب خانہ، فرنیچر، دواخانہ اور دیگر ضروری سامان تلف ہو گیا۔ طلباء اور اساتذہ منتشر ہو گئے۔ اس بے سروسامانی و تباہی کے حالات میں اسے حکیم عبد الحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ (وقف) کی ذات میں ایک سہارا ملا۔ ان کی مشفقانہ سرپرستی نے اس کے لئے مسیحا کا کام کیا اور اس ادارہ کو ایک نئی زندگی ملی۔

## طلبہ کی تعداد

جولائی ۱۹۷۰ء میں یو۔ بی۔ ایم۔ ایس۔ کورس میں ۲۹ طلباء نے داخلہ لیا اور تین طلباء محض اس لئے چھوڑ گئے کہ انہیں دیگر جگہ پر بی۔ آئی۔ ایم۔ ایس۔ میں داخلہ مل گیا تھا۔

اس وقت طلباء کی کل تعداد ۱۷۲ ہے۔

کالج میں اس وقت مندرجہ ذیل کورسز کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(الف) بی۔آئی۔ایم۔ایس (فاضل الطب والجراحت)
اس کورس کے لئے چار سال سے زیادہ (؟) ... بند ہے۔
(ب) ۱۹۶۷ء شرعہ ڈگری کورس۔
(ج) یو۔بی۔ایم۔ایس۔ ڈگری کورس۔

## نتائج امتحانات

امتحانات جولائی ۱۹۷۰ء۔ تعداد شرکاء۔ پاس۔ فیل
" " " ۹۹ — ۴۹ — ۵۰ — ۴۹۰۴۹ فیصد
امتحانات جنوری ۱۹۷۱ء ۸۳ — ۵۲ — ۳۱ — ۶۲۰۶۵ "

مذکورہ بالا نتائج حوصلہ افزا ہیں۔ ماہ جنوری ۱۹۷۱ء کے امتحان میں ہمارے ہاں کے طالب علم فائنل پروفیشنل نے (؟) امتحان یاڈی کے سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ فرسٹ پروفیشنل کے امتحانات میں بھی ہمارے طلباء نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

## رپورٹ شفاخانہ جامعہ طبیہ و ہمدرد نرسنگ ہوم

جامعہ طبیہ میں شفاخانہ بھی قائم ہے جس میں یونانی و سرجیکل آؤٹ ڈور شعبے ہیں۔ اس شفاخانہ کے ہر دو شعبہ جات سے مستفید ہونے کے ساتھ ہمدرد نرسنگ ہوم آصف علی روڈ جو کہ جامعہ طبیہ کا ملحقہ ہسپتال ہے، سے بھی طلباء پورے طور پر استفادہ کرتے ہیں۔ ہمدرد نرسنگ ہوم میں ساٹھ انڈور مریضوں کی رہائش کا انتظام ہے۔

تھرڈ ایر۔ یو۔بی۔ایم۔ایس۔ و سکنڈ پروفیشنل بی۔آئی۔ایم۔ایس۔ و فائنل بی۔آئی۔ایم۔ایس۔ کے طلباء کی باری باری ان ہسپتالوں کے مختلف شعبہ جات میں ڈیوٹیز لگائی جاتی ہیں۔ ہمدرد نرسنگ ہوم میں تشخیص کے جدید و قدیم تمام ذرائع موجود ہیں۔ جن سے طلباء پورے طور پر استفادہ کرتے ہیں۔

## لائبریری جامعہ طبیہ

گذشتہ سال لائبریری کی بوسیدہ دیواروں و چھتوں کی از سر نو مرمت کرائی گئی جس سے لائبریری کا ایک بہت بڑا وسیع ہال تیار ہوگیا ہے۔ اس کے لئے نیا فرنیچر، شوکیس بنوائے گئے۔ اس وقت لائبریری میں ۱۷۷۵ کتابیں و پچاس عدد رسالہ جات موجود ہیں۔

## جامعہ طبیہ کی عمارت

اپنے محدود ذرائع سے جس حد تک بھی ہم سے ہو سکا عمارتوں کے حصول مرمت اور توسیع سے کام لیکر ادارہ کی ضروریات پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت ادارہ میں چھ لیکچر روم، ایک سائنس لیبارٹری۔ ایک ڈرگ میوزیم و ڈائی سیکشن ہال و اناٹمیکل میوزیم موجود ہے۔ نیز اساتذہ کرام کے لئے ایک اسٹاف روم بھی اسی عمارت میں موجود ہے۔ طلباء کے لئے ایک چھوٹا سا ہوسٹل بھی کالج کی عمارت کے ساتھ موجود ہے۔ ہوسٹل کرایہ کی عمارت میں ہے۔ اسے فنڈز کے حصول کے بعد معیاری بنانے کی کوشش کی جائے گی۔

## جامعہ طبیہ کی نمایاں خصوصیت

(۱) اس کالج کے سند یافتہ آج مشہور لکچرار، پرنسپل، پروفیسر، مصنف، مؤلف، بہترین معالج، مشہور طبیب اور ملک کے اکثر بڑے دواخانوں و نرسنگ ہومز کے مالک ہیں۔

(۲) علامہ حکیم کبیرالدین صاحب نے جو کہ ادارہ کے بانیوں میں سے ایک ہیں اور جنہوں نے جامعہ طبیہ کے افتتاح کے بعد "کلیات ادویہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جو فن طب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے علاوہ اس کے آج کل ہندوستان کے جتنے بھی سرکاری وغیر سرکاری طبی کالج ہیں ان کے نصاب میں علامہ صاحب کی تصنیف و تالیف کردہ کتابیں شامل ہیں۔ یہ فخر صرف جامعہ طبیہ کو ہے۔

(۳) ملکی تقسیم کے بعد طبی سرمایہ ضائع ہوگیا۔

جس کی وجہ سے تعلیم و تدریس میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس دقت کو دور کرنے کے لئے جامعہ طبیہ نے گزشتہ سال دو نصابی کتابیں شائع کرائی ہیں۔

(۱) مبادی منطق و فلسفہ (۲) عربی کی کتاب۔

اس طرح موجودہ نصابی کتب کی کمیابی و دقت کے مطابق تر ہونے کی دقت کو دور کرنے کے لئے پرنسپل جامعہ طبیہ نے تشریح جیسے دقیق مضمون کی کتاب کے حصہ اوّل کا مسوّدہ تیار کر کے جناب پریسیڈنٹ صاحب جامعہ طبیہ کو پیش کر دیا ہے۔ امید ہے کہ اسے بھی جلدی شائع کرا دیا جائے گا۔ تشریح بقیہ حصّوں کو مکمل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو آئندہ تعلیمی سال کے آغاز تک شائع کرا دیا جائے گا۔

## گیمس و اسپورٹس

ہمارے پاس کوئی باقاعدہ کھیل کا میدان نہیں ہے جہاں ہمارے طلبہ روزمرہ کھیلوں کی پریکٹس کر سکیں لیکن اس دقت کے باوجود ہمارے طلبہ فٹ بال، کرکٹ، والی بال، بیڈمنٹن، شارٹ پٹ۔ انڈور گیمس میں کیرم، چیس، رنگ، کھو کھو وغیرہ کے مشتاق ہیں۔

## اسٹوڈنٹ یونین

جامعہ طبیہ کی اسٹوڈنٹ یونین (مجلس مذاکرہ) ایک Democratic Forum ہے۔ جس کے ذریعہ طلباء کو اپنے خیالات کا اظہار، صحیح رائے قائم کرنا اور آپس میں مل جل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ مجلس مذاکرہ نہ صرف طلباء میں بیداری پیدا کرتی ہے بلکہ انھیں اپنے فرائض صحیح طور پر سمجھنے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ اس یونین اور اساتذہ کے درمیان میل جول ہے اور اس وجہ سے ہمارے طلباء ڈسپلن کے پابند ہیں۔ اور انتظامیہ کے انتظامات میں بجائے خلل کے معاونت کا باعث بنتے ہیں۔ اس اچھی کارکردگی کے لئے اساتذہ کے ساتھ نعمت اللہ پریزیڈنٹ اور محمد خالد صدیقی سکریٹری مجلس مذاکرہ خاص طور پر تعریف کے قابل ہیں۔ یونین کے ان عہدیداروں نے اپنے تعلیمی مشاغل کے باوجود اس کے کاموں کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ گیمس کیٹی کے مختلف کیپٹنز بھی تعریف کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود تھوڑے عرصہ میں اسپورٹس کو نہایت ہی محنت اور خوش اسلوبی سے مکمل کرایا۔

## جامعہ طبیہ کا مستقبل

جامعہ طبیہ کی نئی زندگی کو شروع ہوئے ۲۴ سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں اس نے سخت مشکلوں کے باوجود قدم آگے بڑھایا ہے۔ اور دیسی طب کی خدمت کی ہے جامعہ کے ان پروگراموں کو جن کو پورا ہونے سے اسے ملک کے اندر نمایاں حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے پورا نہیں کیا جا سکتا کہ فنڈز کی کمی قدم قدم پر حائل ہوتی ہے۔ ایک اچھے تعلیمی ادارے کی ضرورتوں کا آپ سے زیادہ اور کون احساس کر سکتا ہے۔ اس لئے جامعہ طبیہ آپ کی ذات گرامی سے توقع کرتا ہے کہ دیسی طبوں کی فلاح و بہبودی کے مقرر کردہ فنڈز میں سے گرانقدر رقم جامعہ طبیہ کی فلاح و ترقی کے لئے مخصوص کی جائے تاکہ یہ ادارہ ملک و قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت سرانجام دے سکے۔

آخر میں اپنی و اسٹاف جامعہ طبیہ۔ گورننگ و جنرل باڈی و مجلس منتظمہ کی طرف سے عزت مآب مہمان خصوصی آنریبل پروفیسر ڈاکٹر ڈی۔ پی۔ چٹوپادھیائے کا خاص طور پر اور دیگر معزز مہمان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت نکال کر جشن سالانہ کی تقریب میں شریک ہو کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔

# خیالات کے جھروکے سے ... خطوط

## قارئین

ماہ مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا ـــ مضامین پہلے سے بہتر ہیں خصوصاً ہمارے لئے انشاءِ فارسی بہت مفید ثابت ہو رہی ہے ـــ ہم چاہتے ہیں کہ اگر اسی طرح عربی کے مضامین بھی شائع کئے جائیں تو اس سے بہت سے طلبہ کو فائدہ پہنچے گا ـ ان کو بھی جو عربی مدارس میں پڑھتے ہیں اور ان کو بھی جو کالج میں عربی کو ایک مضمون کی حیثیت سے لیتے ہیں

ع . و . ظلمی
دھلی

---

اپریل اور مئی کے شمارے وقت پر موصول ہوئے ـــ اپریل کے پرچے میں شہاب عراقی صاحب کی نظم اور برو قفل از شمس الاسلام بے حد پسند آئیں ـ شمس الاسلام صاحب کی ایک آدھ نظم اور شائع کیجئے تاکہ تشنگی دور ہو ـــ

مئی کے شمارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون دہلویت کافی معلومات افزا ہے .

رسالے کا معیار بڑھانے کے لئے علمی و ادبی مضامین کے علاوہ تعمیری افسانے اور جدید نظم کا اضافہ ضروری ہے ـ

احمد رشید (علیگ)
دھولپور.

---

آپ نے (ماہ مئی اے) صحیح لکھا ہے کہ دلی میں خاص طور پر اردو ایم اے یا بی. اے میں صرف اس لئے لیتے ہیں کہ وہ کسی اور مضمون میں داخلہ کے اہل نہیں ہوتے لیکن ڈگری لینے کی غرض سے اور ذرا کالج کی زندگی کو قریب

سے دیکھتے ہیں بہت سے طلبہ اس کو پیتے ہیں ــــ دلی یونیورسٹی کے اردو طلبہ کی یہ بدقسمتی ہے کہ یہاں کئی گروپ ہیں اور تقریباً تقریباً ہر استاد کسی نہ کسی گروپ سے تعلق رکھتا فرد ہے جس کی وجہ سے ان کا زیادہ تر وقت جوڑ توڑ میں گزرتا ہے اور طلبہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے پاتے دوسرے اپنے گروپ کے فایدے کے لئے وہ طلبہ کا آزادانہ استعمال کرتے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں اسی وجہ سے طلبہ کو یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ اسکی ڈویژن ختم کرنے کے ذمہ دار دوسرے گروپ کے استاد ہیں (ایک اسی نوعیت کا مقدمہ زیر سماعت ہے) ــــ ہمیں بڑی مسرت ہے کہ آپ (جو ابھی تک ایک گروپ کے آلہ کار بنے ہوئے تھے) نے سچ بات کہی ــ ــ ــ ــ

محمد اسلم ـ ایم. والیٔ
دھلی .

ــــ شاہ جہاں کبھی کسی کا آلہ کار نہیں رہا ـ اس نے ہر قدم طلبہ کے مفاد کے پیش نظر اٹھایا ہے کسی خاص گروپ کے فائدے کیلئے نہیں ــــ

ادارہ

ــــ

مئی کا شمارہ ملا ـ مضامین معیاری ہیں ــ اب شاہ جہاں کا معیار ایک حد تک مناسب ہے ــ اس سلسلے میں آپ سے استدعا ہے کہ خدارا ایسے مضامین خاص طور پر نظمیں نہ شائع کیا کریں جن کا نہ سر ہو اور نہ پیر اور جو معیار اب آپ نے بنا لیا ہے اسکو برقرار رکھیے .

محمد
کلکتہ

ــــ

کیا دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں دنیا بھر کی برائیاں آپ کو ہی نظر آتی ہیں ــــ ؟

. . .
دھلی

ــــ برائیاں تو سب کو نظر آتی ہیں لیکن عام طور پر اسکے خلاف آواز اٹھانے یا غم و غصہ کے اظہار میں اخلاقی پستی اور ذاتی مفاد مانع رہتے ہیں .

ادارہ

ــــ

فری ٹیوشن کلاسز کے بعد داخلہ میں طلبہ و طالبات کو مدد دینے (مئی ۷۱) کیلئے ایڈوائزری کمیٹی کے قیام کیلئے آپ یقیناً قابل مبارکباد ہیں ـ

صلاح الدین ـ آسیہ
جمال احمد ـ نور محمد ـ افسر
احمد بہت سے ساتھی

شاہ جہا

ماہنامہ

# شاہجہاں

دہلی

طالبعلموں کا - طالبعلموں کیلئے - طالبعلموں کے ذریعے

جولائی ———— ۱۹۷۱ء

جلد ۵ ———— شمارہ ۷

قیمت فی پرچہ ———— پچیس پیسے

سالانہ ———— تین روپئے




شاہجہاں میں شامل افسانوں میں نام ، مقام وواقعات فرضی ہیں۔ کسی سے کوئی مطابقت اتفاقیہ ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں۔

## ہمارے مقاصد

طالب علموں

——— میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنا

——— کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا

——— کو ملک ملت کی با مقصد خدمت کے لئے تیار کرنا

——— میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا

——— کی آواز کو عوام تک پہنچانا

——— کو اخلاق ، تہذیب اور ملی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا ............... اور سماجی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا۔

ادارہ

شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین ، افسانے اور غزلیں ونظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ ضرور لکھئے۔

ادارہ




شاہجہاں آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (A.I.S.U.N.E.C.) نئی دہلی کا ممبر ہے۔

طابع وناشر ومالک ———— محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ ———— اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلی ماران دہلی

مقام اشاعت :- قاسم جان اسٹریٹ بلی ماران دہلی نمبر ۶

# تجربات

# اداریہ

ہم نے پچھلے ماہ بھی اس بات کی نشان دہی کی تھی کہ دلی میں اردو میڈیم اسکولوں کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ نہ ان میں اسٹاف مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی ان کو درسی کتب فراہم کی جاتی ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان اسکولوں کا رزلٹ اچھا نہیں ہوتا۔ اور جو طلبہ کامیاب ہوتے ہیں ان میں سے بھی اکثر اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں سے آئے ہوئے طالب علم احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو تو بس کالج میں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے اور وہ اپنے اس شوق کو اردو یا کوئی اور "غیر ضروری" مضمون لے کر پورا کرتے ہیں ورنہ کئی کئی سال تک ایک ہی کلاس میں رکے رہتے ہیں۔

پچھلے تعلیمی سال میں (جیسا کہ قارئین کو علم ہوگا) ہم نے فری ٹیوشن کلاسز کا انتظام کیا تھا جس سے دلی کے مختلف اسکولوں کے تقریباً پانچ سو طلبہ نے استفادہ کیا۔ اس سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ ان تمام اسکولوں کا معیارِ تعلیم تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اچھے اسکولوں کے مقابلے میں بہت برا نہیں تو برا ضرور ہے۔ ان کا یہ حال جہاں دلی ایڈمنسٹریشن کے عدم تعاون کے سبب ہے وہاں اس میں اساتذہ کی آپسی گروپ بندی اور مفاد پرست اور نا اہل اساتذہ کی موجودگی کو بھی برابر کا دخل ہے۔

مڈل اور پرائمری اسکولوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ مڈل اسکولوں کو دلی ایڈمنسٹریشن اور پرائمری اسکولوں کو کارپوریشن چلاتی ہے۔ پرائمری اسکول والوں کو یہ ہدایت ہیں کہ وہ ہر ممکن یہ کوشش کریں کہ کمزور سے کمزور طالب علم بھی کامیاب ہو جائے لہٰذا وہاں کے اساتذہ ان ہدایات پر کاربند رہتے ہیں اور اسکولوں میں اکثر اساتذہ پڑھانے کی غرض سے نہیں بلکہ چائے اور سگریٹ پینے اور بچوں سے پاؤں دبوانے آتے ہیں ——— جہاں تک مڈل اسکولوں کا تعلق ہے بہت سے ایسے اسکول بھی ہماری نظر میں ہیں جہاں کہ اساتذہ یہ زحمت لینے کیلئے اسکول آنے کی [illegible] گوارا نہیں کرتے وہ گھر ہی رہتے ہیں البتہ اسکول میں انکی حاضری لگ جاتی ہے۔ اور اگر بھولے بھٹکے اسکول آ بھی جاتے ہیں تو یہ وقت طالب علموں کو پڑھانے کے بجائے [illegible] گزارتے ہیں۔

مڈل اسکولوں میں ہم صرف منظیر الاسلام مڈل اسکول کو مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔ یہاں کے طالب علم

باقی صفحے پر

# مڈل اسکول گلی قاسم جان

ادارہ

گلی قاسم جان میں لڑکوں کا ایک سرکاری مڈل اسکول واقع ہے۔ اسکی حالت بھی ملحقہ نگر بیں مذکورہ اسکولوں سے قطعاً مختلف نہیں۔ چونکہ یہاں کا رزلٹ سو فیصد رہا ہے (ہم یہاں کے معیار سے واقف ہیں کیونکہ یہاں کے بہت سے طلبہ ہماری ٹیوشن کلاسز میں آیا کرتے تھے) اسلئے رزلٹ کا یہ تناسب ہمارے لئے باعث استعجاب تھا۔ جب مذکورہ اسکول کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اسمیں اسٹاف بھی مکمل نہیں ہے اور جو اسٹاف موجود ہے وہ اردو سے بھی نابلد ہے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب سے رجوع کیا گیا۔ اردو میڈیم اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے پنجابی آمیز اردو میں گفتگو کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنی بہت سی شکایتیں گنوانی شروع کیں جن میں جو جائز تھیں وہ یہ ہیں کہ مڈل سیکشن کے پاس صرف ... بتی کمرے ہیں جو ناکافی ہیں منتظمین کو چاہیئے کہ وہ مڈل سیکشن کو کسی دوسری بڑی جگہ منتقل کردے۔ اسکے علاوہ دوسری شکایت اسٹاف کی کمی تھی۔ اسی کمی کے باعث پرائمری سیکشن کے ایک استاد حساب کی کلاس لیتے ہیں۔ (پرائمری سیکشن کا مڈل سیکشن کو تعاون قابل قدر بھی ہے اور قابل ستائش بھی) ــــ دوسری شکایات کے ... اسکول کے دیگر اساتذہ سے گفتگو کر ... پتہ چلا کہ مذکورہ ہیڈ

ماسٹر صاحب کا رویہ اپنے اسٹاف کے ... اتنا گندہ رہتا ہے کہ کوئی بھی استاد ا... ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور ... کوئی ایسا ٹیچر آجاتا ہے جو پڑھانا چاہتا ... یہ صاحب اُن کو لڑ جھگڑ کر اور اپنی اعلیٰ ... سے اپنے تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ... دیتے ہیں۔ اب جبکہ اسٹاف کم ہے اور ا... ہمنوا ہے تو وہ اپنی عادت سے مجبور ہوکر ... کا چار گھنٹے کا وقت پرائمری سیکشن کے ا... کو آپس میں لڑانے اور پھر خود لڑنے میں ... ہیں۔

ایک سوال ہمارے ذہن میں مصروف گر... تھا کہ امتحان سے پندرہ دن پہلے تک تو ہم... کلاسز لی تھیں اور خدا شاہد ہے ہم ان کو ... نیت سے پڑھا رہے تھے کہ اگلے سال یہ ا... سے کامیاب ہو سکیں کیونکہ اس سال تو پا... کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــ مگر ان پندرہ ... میں اسکول کے اساتذہ نے ایسا کون سا جا... طلبہ کو سکھا دیا تھا یا ایسا کیا گھول کر پلا د... کہ ایسے طلبہ بھی جو آٹھویں میں پاس ہونا تو ... اس کلاس میں رہنے کے قابل بھی نہیں ... پاس ہو گئے ـــ؟ تقریباً آدھ گھنٹے کی گفتگ... ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ پندرہ دنوں میں طلبہ کو ... سکھایا یا کچھ گھول کر نہیں پلایا گیا بلکہ یہ ... دن ان کو نقل کرنے کے گر سکھانے میں

[illegible] میں دو سرے اسکولوں سے طالب علم
سے زیادہ ذہین اور زیادہ تیز ہوتے ہیں یہ
ی وجہ ہے کہ یہاں کا رزلٹ سو فیصد رہتا
ہے اور امسال بھی اس نے اپنی اس
روایت کو برقرار رکھا ہے۔

آخر میں ہم دلی ایڈمنسٹریشن کے ذمہ داران
سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اردو میڈیم اسکولوں
کو بھی اسی نظر سے دیکھے جس سے کہ وہ اور
دوسرے اسکولوں کو دیکھتی ہے۔ —— ہم اساتذہ
سے مؤدبانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ آپسی
گروپ بندی پر طلبہ کے مفاد کو ترجیح دیں
اور اپنے اسکول کے رزلٹ کو بہتر سے بہتر بنانے
پر توجہ دیں۔

---

## مرانڈا ہاؤس میں شعبہ اردو کا اجراء

مرانڈا ہاؤس دلی کے اچھے کالجوں میں
سے ایک ہے۔ بلکہ اپنے اعلیٰ معیار تعلیم اور
بہترین ڈسپلن کی وجہ سے لڑکیوں کے کالجوں
میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سال
اس میں اردو کا شعبہ بھی کھولا جا رہا ہے،
یونیورسٹی کیمپس کا یہ تیسرا کالج ہے جہاں
اردو کا شعبہ قائم کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل
کروڑی مل کالج اور ہندو کالج میں اردو پڑھائی
جاتی ہے۔ ہندو کالج کا شعبہ پچھلے دو سال سے
بند پڑا ہے کیونکہ اس دوران وہاں کسی
اردو کے طالب علم نے داخلہ نہیں لیا۔ البتہ
کروڑی مل کالج میں شعبہ اردو ترقی کی راہ پر گامزن
ہے۔ —— اب مرانڈا ہاؤس میں شعبہ [illegible]
جہاں دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کو [illegible]
وقت کی ایک اہم ضرورت [illegible] پوری ہو گی۔

سے ہے [illegible] طلبہ جو سال بھر تک اپنے استاد
کا بنایا ہوا [illegible] سبق بھی یاد نہ کر سکے ان پندرہ
دنوں میں نقل کرنے کے ایسے ایسے گر سیکھ گئے
کہ ان کو نقل کرنے میں انکی کند ذہنی اور
نصاب سے [illegible] ناواقفیت بھی کارآمد ثابت
نہ ہو سکی۔ ہم نے حقائق کے اظہار میں مبالغہ آرائی
سے قطعاً کام نہیں لیا ہے۔

اسکے علاوہ ہمیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے بارے
میں بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئی ہیں جن کی
ہمیں تا ہنوز تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ تصدیق
ہونے پر ان تمام خامیوں کو منظر عام پر لایا جائے
گا ——

ہم ان سے نہایت مؤدبانہ درخواست کرتے
ہیں کہ وہ بچوں کے مستقبل کی خاطر، محنتی اساتذہ
اور اسکول کی فلاح و بہبودی کے لیے وہ
اپنی اس روش کو چھوڑ دیں یا کسی اور
با اخلاق اور محنتی استاد کے لیے راستہ
صاف کر دیں۔ ان کے اس عمل سے اردو کو
فائدہ پہنچے گا اور اردو کے طالب علموں کو
ترقی کرنے کا موقعہ ملے گا اسی کے ساتھ
ساتھ انکا یہ عمل ہم پر احسان عظیم ہوگا
—— ہم اس اسکول کے پرائمری سیکشن
کے اساتذہ سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ
ذاتی اختلافات کو پس پشت ڈال
کر ہمیشہ کی طرح آئندہ بھی مڈل سیکشن
کے ساتھ تعاون کرتے رہیں۔

[illegible] ایڈمنسٹریشن کے [illegible]
سے اپیل کرتے ہیں کہ [illegible]
[illegible] اور [illegible] توجہ دیں
اور [illegible] کے حالات سمجھنے
سے [illegible]

# مجھے حق ہوتا اپنی پسند پر

نعیم صدیقی۔
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

"ندیم! ناہید بی۔اے۔ فائنل کئے بغیر ہی کالج چھوڑ رہی ہے۔" سہیل کے یہ کہتے ہی میری آنکھوں کے سامنے سیاہ بادل چھا گئے۔ اور دوسرے ہی لمحے ایک ٹھنڈی سانس نکلی جس میں ایک تڑپ تھی ایک کرب تھا۔ اور احساس جدائی کی ایک چبھن۔

ایسا لگا کہ گویا میرے قدموں تلے کی زمین سہیل کے چند الفاظ کی لپیٹ میں آگئی۔ فوراً ہی سہیل کو احساس ہوا۔ اور اس نے سہارا دیتے ہوئے انکساری لہجے میں کہا "مجھے معلوم نہ تھا تمہیں اتنا صدمہ پہنچے گا۔"

"ہاں سہیل! کئی ماہ سے سن رہا تھا۔ لیکن آج تم نے تصدیقی لہجے میں کہہ کر میرے امیدوں کا خون کر دیا۔ خیر! اس میں تمہاری کیا غلطی۔ غلطی تو میری ہے کہ میں نے کسی پہ ذہبی کو دل دے کر اسے زندگی بھر کے لئے اپنانا چاہا۔ اور اگر آج یہ اس کے احساس کی چبھن نہ ہوگی تو کیا ہوگا؟"

"ہاں ندیم! مجھے معلوم ہے تمہارے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ میں نے تو تمہیں اپنا سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ کیونکہ تم میرے جتنے قریب ہو شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ آج نہیں کل تمہیں معلوم ہی ہو جاتا۔ لیکن جب معلوم ہونے پر تم پر کیا گذرتی؟ اس کا احساس ہی مجھے تھا۔ اسی احساس کی وجہ سے میں نے ناہید کے جانے سے پہلے ہی تمہیں مطلع کرنا مناسب سمجھا کہ اگر تم ناہید تک کوئی پیغام پہنچانا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"ہاں سہیل! یہ تم نے بہت اچھا کیا، ورنہ آخری تک کی حسرت دل ہی میں رہ جاتی۔ حسرت دیدار کو آنکھیں ترستی رہتیں۔ اب میں اپنی ناہید کو آج اور قریب تر ہو کر دیر تک دیکھتا رہوں گا۔ آج میری آنکھیں اس کے دلچسپ انداز گفتگو، گھنیری زلفوں، اور نیلگوں نگاہوں کا تعاقب کرتی رہیں گی۔ آج میں کوئی کلاس اٹینڈ نہیں کروں گا۔ صرف ناہید کے آخری قدموں تک اس کا تعاقب کروں گا۔"

"ندیم! ناہید آج کلیرینس کرانے آئے گی، اگر تم کہو تو میں تمہیں کینٹین میں اس سے ملوا دوں؟"

"نہیں سہیل! بس تم آج میرا ناہید سے آخری سلام کہہ دینا۔"

"نہیں ندیم! اتنا چھوٹا دل نہ کرو۔ زندگی اتنی بڑی ہے۔ اور زندگی میں نہ جانے کیسے کیسے اتفاق پیش آتے ہیں۔ آج تو تم میری معرفت آخری سلام کہلا کر بھیج رہے ہو اور اتفاق سے کبھی ناہید کی تم سے ملاقات ہو گئی اور اس نے تمہیں سلام کیا تو...!"

"ایسی قسمت کہاں۔ کہ وہ مجھے سلام کرے۔"

• میں نے کہا ندیم! زندگی اتفاق پر منحصر ہے۔ اور اتفاق سے نہ جانے کیا کیا ہو جاتا ہے! امیر غریب ہو جاتے ہیں — غریب امیر ہو جاتے ہیں — نزدیکیاں دوریوں میں بدل جاتی ہیں — اور دوریاں نزدیکیوں میں اسی طرح تمہاری دوریاں نزدیکیوں میں بدل سکتی ہیں۔ کیونکہ تمہیں ناہید سے سچی محبت ہے — کہتے ہیں کہ سچے لوگ ضرور ایک نہ ایک دن ایک دوسرے کو اتفاق سے ملتے ہیں۔ اسی طرح مجھے تم پر بھی ناز ہے کہ تم نے سچی محبت کا ثبوت اپنی سیریس محبت میں دیا — اور ایک روز ناہید تمہارے بالمقابل ہو کر اپنی محبت کا اظہار کرے گی۔ اس گفتگو میں جو حقیقت پنہا ہوگی اس کا احساس تمہیں اسی وقت ہوگا۔ اور تم کہو گے کہ سہیل نے بالکل سچ کہا تھا۔"

"کبھی کبھی دوستوں کی باتیں بھی سچ ہو جاتی ہیں، اس میں میرا پورا اعتماد ہے — یاد ہے ایک روز میں نے کہا تھا کہ تمہاری پسند کی لڑکی مل گئی سہیل — اور آج تم ایک ایسی ہی لڑکی سے وابستہ ہو — شگفتہ! جتنا حسین نام ہے اتنا ہی حسین کردار بھی — جو تمہاری پسند کا انتخاب ہے — خدا کرے تمہارا کہنا بھی سچ ہو جائے سہیل! اور میری تمام اداسیوں میں خوشی کی کرنیں پھوٹ جائیں۔"

سارے دن ندیم کی آنکھیں کالج کے دروازے پر لگی رہیں۔ وہ کالج کے دروازے کے بالکل سامنے والے کمرے میں اکیلا بیٹھا رہا۔ لیکن آج اس کی آنکھوں سے ناہید کی پرچھائی بھی نہ گزری۔ بس اس کے تصورات کے آئینہ میں ناہید کی بے شمار تصویریں تھیں — وہ سارے دن ان تصوراتی تصویروں سے کھیلتا رہا اور دل بہلاتا رہا — کبھی سوچتا کہ وہ اس طرح آتی تھی۔ اس طرح جاتی تھی اس طرح باتیں کرتی تھی، اس طرح ہنستی تھی، اس طرح پڑھتی تھی — اور اس طرح ......!

کئی مرتبہ اس نے دوسروں کی تصویروں میں اپنی ناہید کی بے شمار تصویریں دیکھیں۔ لیکن آج ناہید کو نہ آنا تھا — اور وہ نہ آئی۔ وہ نڈھال قدموں سے شام ڈھلے گھر لوٹنے لگا۔ لیکن ناہید کے تصور میں وہ کئی مرتبہ کئی چیزوں سے ٹکراتا ہوا گھر کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ ایک سچی لگن لئے، ایک سچی محبت لئے۔ اچانک سامنے جنرل اسٹور پر اس کی نظر پہنچی! ناہید کی دھندلی سی پرچھائیاں نظر سے گزریں۔ وہ کچھ سامان خرید رہی تھی — "میری ناہید" ندیم کی خاموش نگاہیں بھی کچھ سوچنے لگیں اور ہونٹوں پر ایک ہلکی سی لہر دوڑی — وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگا — لیکن ابھی تک اس نے آنکھ سے آنکھ نہ ملائی — پھر اس نے دوری کو نزدیکی میں بدلا۔ اور دکان کے قریب پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا اور رومال خریدنے کی غرض سے دوکاندار کو متوجہ کرنے لگا — فوراً ہی ناہید نے آواز کا تعاقب کیا۔ وہ ندیم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی اور ندیم کی بھی آنکھیں صرف ناہید کی طرف دیدہ ریز تھیں — ناہید نے ایک قمیص دوکاندار سے منگانے لئے کہا۔ جب اس نے سائز پوچھا —؛ تو ناہید نے ندیم کی طرف اشارہ کیا — اور ندیم فوراً ہی اس کے اس اشارے سے چونکا، لیکن کچھ کہہ نہ سکا دکاندار نے ناہید کا حساب کر کے اسے پیسے واپس دیئے۔ کئی پیکٹ لئے دوکان سے دور ہو گئی۔ ندیم ربنا کچھ لئے آگے بڑھا اور اس نے اپنے ہونٹوں کی ثبت مہر خموشی کو توڑ دیا — اس نے ناہید کو آگے بڑھ کر آواز دی — لیکن فوراً ہی اس نے دیکھا کہ ایک کار آ کر رکی اور وہ اس میں دراز ہو گئی — ندیم اسے دیکھنے کے لئے آگے بڑھتا رہا — تھوڑی دور پہنچ کے ہی کار سے ڈرائیور ایک پیکٹ

"جناب! یہ میڈم نے دیا ہے۔" یہ سنتے ہی ندیم پیکٹ لیکر کار کے دروازہ پر پہنچا — "ناہید!" وہ آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اسنے ناہید کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہوئے دیکھے۔

ناہید نے خدا حافظ کہا — اور ایکبار پھر اس نے ندیم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا —— اب اس کی کار کافی دور جا چکی تھی۔ ندیم کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

"شاید! یہ آخری ملاقات تھی!!" یہ سوچتا ہوا ندیم آگے بڑھا — ایسا لگا کہ گویا اس کے قدموں کی سکت ختم ہو گئی، اس کا جسم ٹوٹ گیا، اس کے سینے سے کوئی پتھر باندھ دیا گیا —— اتنا بڑا پتھر کہ زندگی بھر جسکا بوجھ سنبھالنا ندیم کے لئے شاید ممکن نہ ہو — ایک ایسا بوجھ جسکی جسامت تو نہیں، لیکن درد و کرب کا لازوال احساس!! جس کی کسک سے اس کی زندگی میں سسکتے آنسوؤں کا انبار رہے گا۔

گھر آتے ہی وہ نڈھال بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھیں اداسیوں میں ڈوب گئیں ان اداسیوں میں ناہید کی لا تعداد ادھوری تصویریں تھیں جو اد جعل نہ ہو سکیں۔

ندیم کی نگاہ آرام کرسی پر پڑے لفافے پر پڑی جو اس کی بہن شاہینہ کے نام تھا۔ اس نے لفافے میں سے کارڈ نکالا۔ اس کی آنکھیں اس پر جم نہ سکیں — جس پر انگریزی کے موٹے موٹے لفظوں میں لکھا تھا۔

"ناہید ویڈز سکندر آن سنڈے ایٹ سکس پی۔ ایم ایٹ مغل سرائے۔"

ندیم کی آنکھوں سے درد و کرب میں ڈوبے آنسو بہنے لگے۔

[...] بوجھ بڑھتا گیا — لہو بہتا رہا۔

آج پورے دو سال بعد ناہید شاہینہ سے ملنے آئی — سامنے میز پر ایک فوٹو فریم میں دیکھ وہ اور آگے بڑھی — اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جب اس نے پڑھا "اختر ندیم مرحوم"

"کاش مجھے حق ہوتا — اپنی پسند پر!!" آواز اس کے سانسوں میں گھٹ کر رہ گئی۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

جناب نعیم صدیقی

دھلی کے مشہور ویڈیو آرٹسٹ، ڈرامہ آرٹسٹ اور ..... بہت کچھ ہیں۔

# اُردو ادب میں رومانویت کا مفہوم

ایم ۔ اے ۔ بشیر ۔
کلکتہ یونیورسٹی

اردو ادب میں ترقی کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں ۔ ان میں ایک رومانویت بھی ہے ۔ جس نے انسانی ذہن کو نہ صرف خوابوں کی دنیا سے آشنا کیا بلکہ عشق و محبت کی نئی راہیں بھی دکھائیں ۔ رومانویت کے اضافے نے اسلوب پر بھی اثر ڈالا ۔ اس طرح زبان و بیان کے ساتھ انداز بیان پر بھی زور صرف کیا جانے لگا ۔ نئی طرز سے تراش خراش ہونے لگی ۔ اور یہ نظریہ ابھر کے سامنے آیا کہ " رومانویت کے اچھے جوہروں کو اپنانا ۔ اور اس کے سطحی جذباتیت ، اضمحلال یا افراد پرستی ، تشبیہ و استعارے کی پرستش اور ماورائی دھند میں گمشدگی سے حفاظت فن کاروں کا فرض ہے " اور بقول ل احمد اکبر آبادی " رومان زندگی کا ہی ایک رخ اور اہم رخ ہے ۔ رومان سے زندگی میں مفر اس لئے نہیں ہے کہ رومان جزو زیست ہے ۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی اختلاف کی دراڑیں بھی سامنے آئیں ۔ رشید احمد صدیقی کی آواز کی لہر سو پھیل گئی ۔ اردو ادب میں رومانویت کو تحریک نہیں کہا جا سکتا ۔ جن معنوں میں یورپ خصوصًا انگلستان کے ادب میں اسکا نشان ملتا ہے ۔ جبکہ جے ۔ ایس ۔ برائٹ لکھتا ہے ۔

" رومانویت ، فنی آداب اور ضابطہ بندی کے رد کرنے اور اظہار بیان کے غیر مشروط خلوص اور سچائی کو اختیار کرنے کا نام ہے " مگر سلیم احمد کا کہنا ہے ۔

" رومانویت کی معصومیت بالآخر اس شیطنیت تک پہنچتی ہے ۔ وہ عورت تو کیا ماں کا احترام بھی نہیں کر سکتی ۔ اور اس طرح پوری گھریلو زندگی سے متنفر اور انسانیت اور تہذیب کی بنیادی قدروں کی دشمن بن جاتی ہے ۔ وہ عورت ، ماں ، بیوی اور حقیقی زندگی کے بجائے حور ، پری ، سلمیٰ ، اور شاعرانہ زندگی کی دلدادہ ہوتی ہے ۔ اور نہیں جانتی کہ عورت کی یہ ساری مصنوعی شکلیں کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں ہیں دراصل شیطانی عورتیں ۔ "

رومانویت کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ لفظ " رومان " کو پہلی بار ۱۷۸۱ء میں مارٹن اور ہرڈ نے استعمال کیا تھا ۔ ۱۸۰۲ء میں گوئٹے اور شیلر نے اس کو باضابطہ ادب میں داخل کیا ۔ اور اصطلاحی شکل میں رائج کرنے کا سہرا مادام ڈی اسٹائل کے سر ہے ۔ اس طرح بقول مخفی " یہ لفظ جو پہلے زبان کا نام تھا ، اس کے بعد ..... ادبیات اور داستان کا لقب ملا ۔ پھر ادب میں ماورائیت ، آراستگی ۔ عہد وسطیٰ کی قدروں کی نمائندگی کرنے لگا ۔ اور آہستہ آہستہ ادب کے ایک مخصوص مزاج کا مظہر بن گیا ۔ "

دراصل لفظ "رومان" رومانس ROMANCE سے نکلا ہے۔ جس کے لفظی معنی، ناول۔ قصہ، اور افسانہ کے ہیں۔ اس لفظ "رومان" کا اطلاق "عہدِ وسطیٰ کی جنگ اور خطرات سے کھیلنے والے نوجوانوں کی کہانی اور داستان ـــ اور عشق و محبت کی باتوں پر ہوتا ہے۔ جن سے شان و شوکت اور امارت کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک مصنف نے رومان کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے اس کو تین خاص حصوں میں منقسم کیا ہے:-

۱۔ عشق و محبت سے متعلق باتیں۔

۲۔ شان و شکوہ۔ غیر معمولی آرائشگی اور محاکاتی تفصیل۔

۳۔ قدامت پسندی، ماضی پرستی اور عہد وسطیٰ سے متعلق چیزوں سے لگاؤ۔

رومانیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے کلاسیکیت، سے متعلق واقفیت ازحد ضروری ہے۔ بغیر اس کی معلومات کے رومانویت کے خدوخال کو سمجھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ کلاسیکیت کے کھنڈر پر رومانویت کا پودا اگا ہے۔ کلاسیکیت نے زندگی اور ادب سے متعلق جو اصول و ضوابط بنائے، دستور کی تشکیل کی تھی۔ اس پر رومانی تحریک نے ایک طرح سے خاک ڈال دی۔ اس کے لگائے ہوئے کاری ضرب نے "طریقۂ راسخۂ قدما" کا صفایا کیا اور ساتھ ہی نئے اصول بنائے۔ بارزن نے اس تصور کے تحت حقیقت پسندی، نیچرل، سوریلزم اور اظہاریت کو رومانیت کی مختلف شکلیں بتائی ہیں۔ جبکہ ایڈ اور برنان نے سوریلزم کو اعلیٰ رومانیت کی حیثیت دی ہے۔

الغرض رومانیت اور کلاسیکی ادب کے درمیان گہرا ربط ہے۔ اور بغیر ان کے واقفیت کے اردو ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنا مشکل ہے کیونکہ کلاسیکیت میں زندگی کی ہر پہلو مقید تھیں۔ اصول اور ضوابط کے دائرے میں بنتی تھیں۔ جبکہ رومانیت نے ان دیرینہ اصول و ضوابط کی دھجیاں اڑا دیں۔ ناسخ اور اشک اور زبیر کی شاعری کلاسیکی ادب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ جبکہ رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب اپنے دامن میں مرصع اور مسجع عبارت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اور ان ہی پابندیوں کی وجہ سے دریائے لطافت اور انشائے سرور میں طویل فاصلہ ہونے کے باوجود "بے روح اصول پرستی" کی جھلک یکساں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر، قائم، اور سوز کے لب و لہجہ سے ناسخ کا لکھنؤ مانوس نہیں ہے۔ غالب کے یہاں رومانیت کی جھلک ملتی ہے، مگر فلسفہ ان کے یہاں حاوی ہے۔ ایک ترقی پسند نقاد کے بقول "اردو شاعری کی ذہنی سطح حالی کے زمانے سے پہلے غالب کی شاعری کو چھوڑ کر پست رہی ہے۔ اس کا سبب جاگیردارانہ نظام کا وہ انحطاطی دور تھا جبکہ اس عہد کی کسی بھی ذہنی پیداوار میں جان باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کی آخری ہچکی مردہ، بے حس اور انحطاط کے منتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اور غالب کی شاعری میں وہ پستی اسلئے دور ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کہ اس نے انحطاط پر غور کیا۔ کچھ نئے حالات کی طرف بھی مڑ کر دیکھا اور پرانی قدروں پر شک و شبہ کی نگاہ ڈالی۔"

کلاسیکی اور اردو ادب میں سب سے پہلے الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں رومانیت کے خلاف آواز بلند کی۔ مگر مروجہ اصولوں سے وہ بھی اپنے دامن کو جھٹک نہ سکے۔ کیونکہ ان کے یہاں سنجیدہ عقلیت اور سماجی پس منظر کی جھلک پرانے اصولوں کے دائرے میں ہچکولے کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ محمد حسین آزاد کی "شب قدر" حالی کی "مسدس" اور شبلی کی صبح امید کو رومانیت سے

باقی صفحہ ۱۵ پر

شاہ جہاں دہلی

# ان سے ملیئے

اظہر ندیم نقوی

کوئی دو سال اُدھر کی بات ہے۔ کالج کے ایک سمینار میں میری ایک دوست نے مجھے ثمینہ سے متعارف کرایا "ان سے ملیئے یہ میری بہن ثمینہ ہیں" میں نے نظریں اٹھائیں تو مجھے ایک تیکھے نقوش والی لڑکی خالص بیگماتی انداز میں آداب کرتی نظر آئی۔ کالا رنگ اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت، بڑی بڑی کاجل سے مزین آنکھیں جن میں ساری شرارتیں سمٹی ہوئی، پتلے پتلے متبسم ہونٹ، گول چہرہ، بھرداں رخسار، ناک دوہن مناسب، چوٹی داجبی، متناسب مگر کسی قدر بھاری جسم، میانہ قد و قامت، کرتہ آڑا پاجامہ نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں، جدید فیشن کے سبھی قسم کے کپڑے پہنتی ہیں، لیکن جب ساڑی پہنتی ہیں تو ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے، وجیہہ اور جامہ زیب ہیں۔ ہر لباس ان پر پھبتا ہے۔ مزاج میں نفاست ہے۔ ثمینہ سے میری سرسری ملاقات طویل ملاقاتوں میں تبدیل ہوتی گئی، ہم گھنٹوں بیٹھے مختلف مسائل پر گفتگو کیا کرتے وہ ایک متوسط مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔

ان کا سن پیدائش کیا ہے؟ ان سے یہ معلوم کرنا بے کار ہے کیونکہ لڑکیاں عام طور پر اپنا سن پیدائش نہیں بتاتیں۔ اور اگر کبھی بتانا ہی پڑا تو غلط سلط بتا دیتی ہیں۔

ان کے ماضی کے تار چھیڑنے پر معلوم ہوا کہ بچپن میں والدہ ماجدہ کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئیں۔ اس سانحہ سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ کھانا چھوٹ گیا۔ والدہ کی یاد میں نالہ گرم و آہ سرد جب دل بہت بے قابو ہوتا تو گھر سے نکل کھڑی ہوتیں اور شہر سے ایک میل دور قبرستان میں جا پہنچتیں۔ کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ روح کا یہ زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو گیا۔ مگر اسکا داغ ان کے دل پر ساری عمر کے لئے رہ گیا۔ والد اور نانا مرحوم سے انھیں بہت محبت ہے۔ والدہ کا ذکر آتے ہی ان کا گلا رندھ جاتا ہے آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور ماحول پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ والد بقید حیات ہیں، ایک بڑی بہن دو بھائی جن کی روایتی طور پر بچپن میں شادیاں ہو چکی ہیں۔ ایک متوسط طبقہ کے مسلمان گھرانے میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے ان کے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔ اس طبقہ کی ناامیدیوں، ناکامیوں، مایوسیوں اور جراحتوں کی وجہ سے جو اس طبقہ کا مقدر ہیں نے انھیں حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ وہ اپنے

انسان دوستی ان کا مسلک ہے۔ ان کے حلقہ احباب میں نہ صرف مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے افراد شامل ہیں بلکہ سکھ بھی ہیں، ہندو بھی اور عیسائی بھی۔ وہ خود کو ترقی پسند کہتی ہیں۔ لیکن ان کے بعض خیالات اور تصورات ان کے اس دعوے کی نفی کرتے ہیں۔ ان کا زندگی کے بارے میں وہ سائنسی نقطہ نظر نہیں ہے جس پر ترقی پسند کاربند ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلکہ اس معاشرے کا قصور ہے جس میں وہ پلی بڑھی ہیں، جس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ تبدیلیاں صرف خارجی طور پر لائی جائیں اور داخلی طور پر نام نہاد قدیم اقتدار سے چپکے رہنے میں ہی نجات سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے خیالات میں تضاد پایا جاتا ہے۔

چنانچہ بعض پیچیدہ مسائل پر بحث مباحثہ کے وقت ان کا جلال و جمال دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اس وقت وہ بپھری ہوئی شیر کی طرح نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ کیفیت شاذونادر ہی دیکھنے میں آتی ہے جب کوئی ان کے دل کے نازک تاروں کو حقیقت کی مضراب سے چھیڑ دیتا ہے۔

ثمینہ کئی خوبیوں کی مالک ہیں جو کم از کم میری نظر میں خوبیاں نہیں بلکہ خرابیاں ہیں۔ ان میں سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ وہ بے حد ملنسار ہیں اور اس ملنساری کا نتیجہ ہے کہ ان کے دوست احباب کالج کی لائبریری کو ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتے ہیں، میں جب بھی ملاقات کیلئے گیا انھیں دوستوں میں گھرا ہوا پایا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے ہیں جو اپنی شخصیت میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات رکھتی ہیں جو دوسروں کی توجہ کھینچنے میں ثمینہ کی مخصوص مسکراہٹ کو دخل ہے یا پھر ان کی مخصوص چال کو — ان کی سچائی پر غالباً دوسرے یہ کہو نگا کہ ثمینہ بڑے خلوص اور صفائی سے جھوٹ بولتی ہیں۔ اور جب ان سے باز پرس کی جاتی ہے تو بڑی محبت سے کوئی خوبصورت عذر تراش دیتی ہیں اور ان کے اس بھولپن پر غصہ کے بجائے پیار آجاتا ہے — وہ وعدہ کرلینگی کل ٹھیک صبح دس بجے آؤنگی۔ مگر اگلے دن وہ سرے سے آئینگی ہی نہیں۔ اگر ان سے معلوم کیا جاتا ہے کہ کل کہاں رہ گئی تھیں؟ کافی انتظار کرایا تو ان کا جواب ہوتا ہے — "کیا بتاؤں پرسوں منہ بولی والدہ کے گھر گئی تھی۔ انھوں نے رات کو واپس گھر جانے نہیں دیا۔ لہٰذا صبح سویرا ہوتے ہی گھر چلی گئی اس لئے نہیں آسکی۔"

یہ ذرا سی بات میں ناراض ہوجاتی ہیں اور ذرا سی بات میں خوش بھی ہوجاتی ہیں۔ بہن سے کسی بات پر اختلاف ہوتا ہے تو بولنا بند کردیتی ہیں لیکن پھر خود بخود صلح صفائی کرلیتی ہیں۔ غرور ان میں نام کو نہیں ہے۔ ہر ایک سے اچھی طرح پیش آتی ہیں۔ یہاں تک کہ بدخواہوں اور دشمنوں سے بھی۔

فوٹوگرافی کا انھیں شوق ہے۔ ان کی فوٹوگرافی سے دلچسپی خالی از علت نہیں ہے۔ اس میں شوق سے زیادہ مصلحت کو دخل ہے۔ کہتی ہیں کہ موسیقی اور رقص سے بھی دلچسپی ہے۔ خدا معلوم کہاں تک درست ہے۔ کیونکہ ان کا رقص دیکھنے اور گانا سننے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ گفتگو میں آواز کے زیر و بم سے اندازہ ہوتا ہے کہ موسیقی سے کچھ شدبد ہوسکتی ہے۔

ثمینہ کی زندگی خود ساختہ ہے۔ خود ساختہ افراد کی زندگی اکثر و بیشتر خشک اور ناہموار گزرتی ہے۔ وہ حقیقت سے آنکھیں نہیں موندتے لیکن مجھے ان کے یہاں یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ وہ

شاہجہاں علی

زیادہ مقصدی ادب کا نمونہ کہنا مناسب اور موزوں ہے۔

اقبال کے یہاں بھی رومانیت کی جھلک ملتی ہے۔ مگر مقصدی ادب کے دائرے میں۔ ابوالکلام آزاد کے یہاں رومانیت پر خطیبانہ رنگ چڑھا ہوا ہے۔ غرضکہ کے مضامین نے اردو میں رومانوی تحریک کا باقاعدہ اسلوب کی طرح آغاز کیا، لیکن خلیق "حجاب" اور نیاز فتح پوری کے یہاں اس کی واضح تصویر ملتی ہے۔ مہدی افادی اور سجاد حسین کے یہاں یہ زیادہ نازک اور لطیف ہوگئی ہے۔ جبکہ حجاب اور امتیاز کے یہاں معصومیت کی سچی تصویر کا عکس ملتا ہے۔ جذبات اور دلکشی کو موجزن بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

مہدی افادی اور سجاد حسین کے یہاں "تلاش حسن" کی تکمیل ہوئی۔ مگر قاضی عبدالغفار نے اپنے مختصر ناولوں کے ذریعہ، اردو ادب کو رومانیت کے ایک اور دلکش و دلفریب حسن سے واقف کرایا۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے رومانیت کا رجحان اختر شیرانی کے یہاں زیادہ واضح اور دلآویز شکل میں نظر آتا ہے۔

لیکن رفتار زمانہ نے رومانوی تحریک کو بھی، ماضی کی دھند میں غائب کر دیا۔ اس کی روشن پرچھائیوں سے بہت ساری راہیں نکلیں۔ ادب کے کئی گمنام گوشے روشن ہو گئے اور پھر رومانوی تحریک بھی کلاسیکی ادب کی طرح ہمارے لئے بے معنی ہو گئی۔ اور رومانویت کو کسی پرانے لبادے کی طرح اتار کر پھینک دیا گیا۔ اور میرے ان الفاظ کی صداقت کا ایک بہترین ثبوت محمد حسن صاحب کے یہ الفاظ ہیں "یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ رومانیت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نسل اور حالات ختم ہو چکے ہیں جنہوں نے اسے جنم دیا تھا۔" ***



باقی صفحہ ۔۔۔ "ان سے ملئے"

ہمیشہ شگفتہ کلی کی طرح کھلتی نظر آتی ہیں۔ خندہ دنداں نما کے ساتھ ان کے رخساروں پر سینکڑوں ننھے ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خوش رہ کر غم دنیا سے بچنے اور ماضی کی تلخیوں اور ناکامیوں کو بھلانے کی کوشش کرتی ہوں، اپنے ماضی اور حال پر ان کی گہری نظر ہے لیکن مستقبل ان کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ خود ان کے الفاظ ہیں "میرا ماضی اور حال میرے ساتھ ہے۔ دونوں میری زندگی کے اہم جز ہیں۔ اور ان پر میری زندگی کا انحصار ہے۔ لیکن میرا مستقبل نہ معلوم ۔۔۔"

ان میں سخن فہمی، بذلہ سنجی اور برمحل صحیح بات کہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ انکی شخصیت میں جاذبیت اور ان کی محفل میں تابانی کا امتزاج یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے ؎

خدا کے فضل سے یوسف جمال کہلائے
اب اور چاہئے کیا ہو جو ہمسری مل جائے

ان کے گفتگو کے انداز میں ایک نشہ ہے۔ وہ پہلی ملاقات میں ہی ملاقاتی کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں ایک مرتبہ ملنے کے بعد یہ خواہش ہوتی ہے کہ بار بار ملاقات کی جائے۔

غرضکہ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انھیں ہر ایک کے لئے محبوب بنائے رکھتی ہیں۔ ان کی سادگی اور جاذب نظر شخصیت سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ جذبات و خیالات کے لحاظ سے مجھے ان سے قربت ہے اور جب جذبات و خیالات میں مکمل ہم آہنگی ہو تو دوری کیسے ہو سکتی ہے۔

محمد شفیق ظفر مرادآبادی
طبیہ کالج قرولباغ - دہلی

عشق کے حال پہ یہ لطف وکرم رہنے دے
نگہہ نازکو مائل بہ ستم رہنے دے

اپنے عشاق پہ احسان کرم رہنے دے
دل کو مانوس وفا چشم کو نم رہنے دے

جو سمجھتا نہیں غم کی حقیقت کیا ہے
ایسے انسان کو محروم کرم رہنے دے

واعظا توڑ دے محفل کے کھنکتے ساغر
دل کو مت توڑ محبت کا بھرم رہنے دے

اے اجل! آج وہ آئیں گے ضرور آئیں گے
طالب دید ہوں کچھ آنکھ میں دم رہنے دے

اسقدر شاد نہ ہو عشق و محبت میں ظفرؔ
دل میں کچھ تھوڑی سی گنجائش غم رہنے دے

٭٭٭

# دلِ شعلہ بجاں

ناصر عتیق تلوی

بستی کی عورتوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ شہناز باری باری مل مل کر رو رہی تھی۔ آج وہ اپنی زندگی کے سب سے اہم موڑ پر گامزن تھی......!

ایک طرف کھڑا بختیار پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہناز کو کس طرح سمجھائے؟ شہناز نے بختیار کو دیکھا تو سب عورتوں کو چیرتی پھاڑتی اس کی طرف بڑھی اور پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑے ہوئے بختیار سے لپٹ گئی ـــــ مگر آج تو بختیار کی آنکھیں بھی اسے دھوکا دے رہی تھیں۔ ان میں ایک بھی آنسو نہ تھا جانے اس کی ماں مامتا کا رشتہ اسے بھول گیا تھا! اب سے پہلے تو وہ جب کبھی شہناز کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹتا اور شہناز پیار سے "میرے بختی بھیا" کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی تو ـــــ فرط مسرت سے اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ خود کو اسقدر مضبوط محسوس کرنے لگتا کہ اگر اس کا بس چلے تو تمام دنیا کی نعمتیں بہن کے قدموں پر نچھاور کر دے۔ اسکے لئے آسمان سے ستارے توڑ لائے۔ آج تو اسے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے سارے سپنے ٹوٹ چکے تھے۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کا جسم بٹ رہا تھا تو کمسن بختیار کو بھی ایک حصہ ملا تھا۔ اور وہ تھی اس کی بڑی بہن "شہناز اور اس کی بچی ردھی۔"

شہناز کی شادی ایک بڑے زمیندار کے یہاں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر ایک خوبرو جوان ـــــ مگر جواری اور ناکارہ تھا۔ یہ عیوب اسکو وراثت میں ملے تھے۔ امیرزادے اسکو عیب نہ سمجھتے بلکہ بصورت دیگر سوسائٹی میں اچھے سمجھے جاتے تھے۔ اور تعلیم حاصل کرنے میں بھی کوتاہی برتتے تھے۔ یہی حال شہناز کے شوہر کا تھا۔ وہ بھی ساتویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکا۔

پاکستان بنتے ہی شہناز کے سسرال والے اپنی تمام جائیداد چھوڑ کر چلدیئے۔ شہناز ان دنوں اپنے میکے میں تھی۔ اس کے سسرال والوں کا خیال تھا کہ ہم یہاں غیر محفوظ ہیں، وہاں محفوظ رہ سکیں گے۔ تبادلہ جائیداد حاصل کر لیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا ـــ یہاں سے جو کچھ جمع پونجی لے کر گئے تھے۔ اسی ٹھاٹ باٹ میں برباد کردی جیسا کہ ان کا معمول رہا تھا۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ نوکری کرنے کی نوبت آ گئی۔ پڑھے لکھے نہ ہونے کی وجہ سے نوکری بھی دل پسند نہ ملی۔ معمولی نوکری کرنا ان کے نزدیک کسرِ شان تھا۔ اس لئے کبھی بھی ماہ دو ماہ سے زیادہ جم کر کام نہ کر سکے۔

بختیار کو اپنے مرحوم باپ کی وصیت یاد تھی۔ انھوں نے مرنے سے پہلے شہناز اور روحی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیکر کہا تھا "تم ابھی کمسن ضرور ہو۔ مگر میں تمہیں ایک ذمہ داری سپرد کرتا ہوں کہ ان دونوں بچیوں کو تمہاری سپردگی میں کوئی تکلیف ہوئی تو میری روح کو صدمہ ہوگا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کرونگا۔"

جوں جوں بختیار سنِ شعور کو پہنچتا گیا اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور باپ کی وصیت کا نقش بھی گہرا ہوتا گیا۔ وہ جان توڑ محنت اور کوشش سے اپنے فرائض کی تکمیل کرتا رہا۔ اسنے شہناز کے مزاج کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھایا تھا۔ اور اس کی بچی (روحی) کو بھی جان سے زیادہ عزیز رکھا — آٹھ سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اب بختیار بھی شادی شدہ تھا......

---

ایک شام اچانک شہناز کا شوہر ہندوستان آپہنچا۔ بختیار اور شہناز بہت خوش تھے۔ بختیار کبھی کبھی یہ سوچ کر کہ — میری بہن ازدواجی زندگی میں اس ناکارہ (بہنوئی) کے ساتھ خوش نہ رہ سکے گی، اداس ہو جاتا، تو شہناز ایک وفادار ہندوستانی عورت کی طرح اسے سمجھاتی "اگر خدانخواستہ شادی کے بعد وہ اپاہج ہو جاتے تو کیا میں ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاتی بھیا۔ اپنے باپ دادا کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بنتی۔ میرا تو ایمان یہی ہے کہ میں اپنی تمام تر کوششیں اپنے اجڑے ہوئے گھر کو بنانے میں صرف کر دوں۔ اور مجھے خود پر، اپنے خدا پر اعتماد ہے کہ کبھی ناکام نہ رہوں گی۔" بختیار اپنی بہن کے عزم کو دیکھ کر خوشی تو محسوس کرتا۔ مگر اس کا قلب مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اور اپنی بہن کے گلے لگ کر سسک سسک کر رونے لگتا۔ اسے ایسا لگتا اس کی دنیا اس سے چھن رہی ہے، باپ کی وصیت اس کے ضمیر کو ٹھکرا رہی ہے۔ اور خونی رشتہ اسکو ملامت ہے۔ مگر بیٹی تو پرائی ہی ہوتی ہے نا۔ آخر ایک روز پرائے گھر جانا ہوتا ہے۔ اور یہ غم، خوبصورت پتھر بیٹی والے کے دل پر رکھا جاتا وہ اداس سا ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو جا

• بختیار نے اپنی تمام خدمات — اب بہنوئی وقف کر دی تھیں۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اسکو دیا۔ اس کی آسائش کی تمام چیزیں مہیا کر دیں۔ "اندھے کو تو دو آنکھیں ہی چاہئیں۔"

جب اس نے دیکھا کہ بختیار جیسا سالا اور تجھے کہاں ملے گا، پاکستان جانے کا ارادہ ہی ترک کر اور بختیار سے بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کر بختیار نے اسی روز سے اپنے دل میں ٹھان کہ میری جو کچھ جائیداد ہے بہن کے نام کر دونگا جس سے بہن بہنوئی گزر بسر کر سکیں خود مزدوری کر کھا لونگا۔

بہنوئی کے پاسپورٹ کا ویزا ختم ہونے والا تو اس نے میعاد بڑھا کر پاسپورٹ کینسل کرا کی کوشش شروع کر دی۔ مگر اسے ہر جگہ ناکا سامنا کرنا پڑا۔ تین سال کی مسلسل کوشش کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ پاسپورٹ کینسل نہیں ہو سکتا۔ ناچار کلکٹر کی پرسنل اتھارٹی کے ذریعہ بہنوئی کو واپس ہی لوٹنا پڑا۔

---

شہناز اور بختیار مع اپنے کنبے کے خوش و خرم زندگی بسر کرتے رہے۔ مزید بارہ سال بھی اسی طرح گذر گئے......!

بختیار کی بیوی بھی ایک فراخ دل اور وفادار عورت تھی اس نے بختیار سے بھی زیادہ شہناز کے دل میں ایک مقام بنا لیا تھا۔ روحی نے بھی اپنے ماموں زا



شاہ جہاں پلیہ

خذبات بھی اس کے سامنے ہیچ ہو گئیں۔ روحی سیانی ہو چکی تھی۔ اور بختیار بھی اب پانچ بچوں کا باپ تھا۔ گھر کا ہر فرد بہت خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ گھر ان حالات میں ایک جنت کدہ معلوم ہوتا تھا۔

بختیار کو اب ایک ہی لگن تھی کہ زیادہ سے زیادہ بچت کر کے روحی کے ہاتھ پیلے کر دوں۔ ادھر شہناز اپنے بھائی پر روحی کی شادی کا بوجھ ڈالنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسی جذبے کے تحت اس نے بختیار کے پس پردہ اپنے سسرال والوں کے ایک ہندوستانی عزیز کے ذریعہ اپنا امر جنسی بنوانے کے لئے کچھ ضروری کاغذات پاکستان بھجوا دیئے تھے۔

---

امر جنسی بن کر آ چکا تھا۔ بختیار مصر تھا کہ اب جبکہ آپ کو میرے پاس رہتے ہوئے ۲۲ سال گزر گئے ہیں اس عرصہ میں آپ نے میری ہی خدمت کی ہے اور عمر بھی آپ کی تینتالیس کے قریب ہو چکی ہے) میں نہیں جانے دوں گا۔ آپ نے اپنی عمر کا حسین حصہ تو میرے اور میرے بچوں پر قربان کر دیا اب میری خدمت کا وقت آیا ہے تو یہ حق بھی مجھ سے چھین رہی ہیں ---- میں تو اب اپنی روحی کی شادی کر دوں گا وہ بے چاری تو یہ بھی نہیں جانتی ہے کہ میرا باپ کس شکل کا ہے، دادا کیسے ہیں۔ آپ وہ بچپن والا پیار ان لوگوں سے کیسے پا سکتی ہے۔ البتہ لحاظ تو پا سکتی ہے۔

شہناز بضد تھی "روحی" ان کی امانت ہے مجھے اس کو انہیں کے ہاتھوں رخصت کرانا ہے" آج وہ اپنی بیٹی کے لئے کتنی سخت ہو گئی تھی۔ بھائی بھتیجے پر آمادہ رہتی تھی) پرواہ کئے بغیر اپنے فیصلے پر بدستور قائم تھی ---- وہ پھولی نہ سماتی جب بھتیجے بھتیجیاں اس کے گلے سے لپٹ کر اپنی اپنی ضد منوایا کرتے تھے۔ آج بھی یہی عالم تھا۔ شہناز انہیں باری باری چپٹا چپٹا کر رو رہی تھی۔ بچے بھی اس کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے تھے اور اس سے جدا ہونے کو تیار نہ تھے۔ اس کے چاروں طرف سے معصوم آوازیں ابھر رہی تھیں "پھوپی جان مت جاؤ۔ ہمیں بھی ساتھ لے چلو۔ ہم نہیں جانے دیں گے ---" یہ معصوم آوازیں بڑی جگر خراش تھیں، شہناز کی برداشت سے باہر تھیں وہ اس کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی۔ اس کا بختی بھیا بختیار بھی تڑپ اٹھا تھا۔ اور امر جنسی سارٹیفکیٹ پھاڑ ڈالنے کے لئے آگے بڑھا۔ مگر کچھ لوگوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

---

شہناز کی حالت قدرے سکون بخش تھی، مگر اپنا ارادہ بدلنے کے لئے تیار نہ تھی۔ صرف اس لئے کہ بھائی پر میری بیٹی کا بار نہ پڑے۔ کس قدر اندھی اور بے رحم محبت تھی اس کی ---- بختیار جان توڑ کوشش کرتا رہا تھا کہ گھر کے معاشی حالات اس قدر سنوار دوں کہ بہن کے ذہن سے "بار" کا نقش مٹ جائے۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں بھی کیں۔ کئی بار لاٹری کے ٹکٹ بھی روحی کے نام پر خریدے تھے۔ مگر ہر بار ناکام رہا۔ اور کل بھی ایک ٹکٹ خریدا تھا ---- اس کی تمام آرزوئیں دم توڑ چکی تھیں۔ وہ خود کو بہن کی آرزو کے مطابق مالدار نہ بنا سکا تھا جس سے وہ یہ سمجھتی کہ بھائی پر بار نہ ہو گا۔

---

شہناز ٹرین میں سوار ہو چکی تھی۔ بارڈر تک وہ

باقی صفحہ ۲۳ پر

# ارے جناب

"موصوف سے معذرت کے ساتھ کہ میں اپنے جذبات پر کس طرح قابو نہیں پا سکا"

انیس الرحمٰن متعلم دلی کالج
دہلی

اگر آپ کو سائنس یا اس کے مشتقات مثلاً کیمسٹری، فزکس، بیالوجی، باٹنی وغیرہ کے بارے میں کوئی اشکال ہے یا آپ کوئی جدید ترین معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں یا آپ کو کوئی تاریخی معلومات حاصل کرنی ہے، یا کسی مرض کی وجہ تسمیہ معلوم کرنا ہے یا اس مرض لاعلاج کا کوئی علاج معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ یا سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی، مذہبی حالات پر کوئی سیر حاصل تبصرہ چاہتے ہیں تو آپ کو ان تمام چیزوں کے لئے کسی سائنسداں یا لیبارٹری کا رخ نہیں کرنا چاہئیے۔ نہ ہی آپ تاریخی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے معلومات حاصل کرنے کے فرسودہ طریقہ کو اپنا کر اپنا وقت ضائع کریں۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کسی تاریخی ندامت کے علمبردار معاشیات اور اقتصادیات کے ماہرین اور مذہب کے ٹھیکیداروں کو تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جائیں گے بشرطیکہ آپ میری بات پوری ہمدردی سے غور کریں۔ اور ایک بار تجربہ کرکے میرے دعوے کو حق بجانب ثابت کریں تو لیجئے۔ میں آپ کو کیمیا کے ایک پوشیدہ نسخہ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ "عقلمند را اشارہ کافی است" ہوا ہے۔ قاسم جان گلی سے آج سے تقریباً ڈھائی سو برس پہلے اسی گلی میں داد دہے اور جو انھیں کے نام سے آج بھی گلی قاسم جان کے نام سے معروف ہے۔

گلی قاسم جان وہ گلی ہے جس نے ہمیشہ نام آور لوگوں کو اپنے یہاں جگہ دی۔ میں آپ کو تھوڑے سے نام بتاتا ہوں مثلاً مرزا غالب، حکیم اجمل خاں، مولانا حفظ الرحمٰن، حسرت موہانی، شوکت تھانوی کے استاد اخبار ہمدم کے ایڈیٹر ہاشمی، مولانا مظہر الدین، پیر و غلیبر مجدد وغیرہ۔ اتنے نام بتانے کے بعد ایک اور شخص ہیں، اسم گرامی (تھوڑے بہت تصرف کے ساتھ) جناب سید کاظم علی امین تخلص فرماتے ہیں۔ گلی قاسم جان کی ایک دوکان پر جہاں پر شروع شروع ایک لبا نت کی لوبیا بکنے والے تھے زمانہ کے تصرف کے ساتھ ساتھ بہا مختلف لوبیاں بولیاں لوبئے دانے اور متضاد چہرے رکھنے والے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ یہ دوکان ایک چھوٹا اقوام متحدہ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ بہر حال ہمیں سا گٹھلی چوسنے سے ہے یا چھلکا پھینکنے سے۔ ہم تو گٹھلی کے ہیں اور باقی چھلکوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ کر آگے چلتے ہیں۔

تو جناب میر کاظم علی امین کا قد ایک اندازہ کے مطابق پانچ فٹ چار انچ اور ایک سینٹی میٹر ہے۔ جو ڈرائی کلیس "ہے" بدن پر اپنی وضع کا آپ کرتا چہرے پر داڑھی جو کان کی لو سے ایسی معلوم ہوتی جیسے کہ صنف نازک کی پتلی انگلی۔ اسکے بعد یہ اپنی دم

درازی کم کرتی ہوئی آخیر میں ایک ناقص داڑھی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس داڑھی میں بلا مبالغہ کم از کم ۲۳۴ بال تو ہوں گے ہی۔ مونچھیں کبھی مونچھیں معلوم ہوتی ہیں اور کبھی داڑھی کا ایک جز لاینفک۔ منہ پان سے مرصع۔ پان ڈبیہ ہمیشہ ردیف کی طرح ان کے ساتھ ہے۔ چہرہ پر چشمہ قافیہ کی طرح ہے۔ جو وقتاً فوقتاً اترتا چڑھتا رہتا ہے، لیکن اسکی ہیئت نہیں بدلتی۔ وہی ایک طرف کی کمانی غائب، شیشوں پر ایک ایک چھوٹا نک دھول پھر ناقابل شکن آلود وغیرہ وغیرہ —

اب کوئی صاحب آئے اور انھوں نے سلام کیا۔ تھوڑی دیر مراقبہ میں بیٹھے رہے پھر اچانک جیسے کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آ جائے، سر اٹھایا اور فوراً ہاتھ بڑھایا۔ مقابل یہ سمجھا کہ یہ میرے گریبان پر حملہ کر رہے ہیں۔ اور وہ دو قدم پیچھے ہٹا کہ یہ چار قدم آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کر لیتے ہیں۔ اپنی مصروفیت کے تمام دروازے بند کر کے صرف باتیں کرنے کا ایک جھروکہ کھول دیا۔ اور پھر اس جھروکہ میں سے خشک خشک معلومات سے بھرپور باتوں کے جھونکے آنے لگے۔ اب یہ جھونکے اس وقت تو قابل برداشت ہیں جبتک وہ جھونکے رہیں لیکن جونہی وہ جھکڑ کی شکل اختیار کرتے ہیں مدمقابل اپنی جگہ سے ہل ہل جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ مدمقابل نے روگردانی کی کوشش کی تو انھوں نے "ارے جناب" کہکر ایک بھرپور ہاتھ اس کے کندھے یا ران پر مارا۔ اور وہ بیچارہ "سی" کر کے رہ جاتا ہے اب اس کی تکلیف دو آتشہ ہو گئی۔ پہلے تو اسے روحانی عذاب مل ہی رہا تھا۔ اب ساتھ ساتھ اسے جسمانی سزا بھی ملنی شروع ہو گئی، چار و ناچار اس نے بات ٹالنے کیلئے کہہ دیا کہ کاظم صاحب آج تو سر میں بہت درد ہے" پھر کیا تھا کہ شروع ہو گئے "پیاس بھی لگتی ہوگی، اب کوئی پوچھے کہ جون کی گرمی میں اگر پیاس نہیں لگے گی تو کیا بھوک لگے گی۔ "پیشاب بھی زیادہ آتا ہوگا" اب بتائیے اگر پانی زیادہ پیا جائے تو پیشاب نہیں کوئی خضاب آئیگا لیکن آپ ہیں کہ بات میں سے بات نکال کر آنے والے کا پوسٹ مارٹم کرتے جا رہے ہیں۔ اور اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ اسے صدائے احتجاج بلند کرنے کی مہلت بھی نہیں دی جا رہی ہے۔ اور پھر آخیر میں بڑے رازدارانہ انداز میں سمجھایا کہ "ارے جناب اگر آپ شربت راحت جاں استعمال کریں تو ارے جناب یہ تمام تکالیف دور ہو جائینگی۔" اور پھر شربت راحت جاں کے فوائد، نسخہ، بنانے کے طریقہ پر بحث شروع کرنے والے ہوتے ہیں کہ مدمقابل نے کسی آتے جاتے کا سہارا لیکر کسی شناسا کو پکارا "ارے میاں عتیق مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا۔ یہ کہکر وہ اٹھے اور ادھر کاظم علی کی ناگفتہ بہ حالت، لیکن مصیبت زدہ اٹھا اور اٹھ کر ایسا گیا کہ اس کی صورت کو ترس گئے۔ اب ان کے پیچھے ہیں دردے کہ کسی طرح اپنا کلام پورا کریں۔ لیکن کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ آخر ادھر دیکھا ادھر دیکھا۔ اور جب کوئی نظر نہ آیا تو پیروں میں ۱۹۲۰ء کے دریافت شدہ سندھ کی تہذیب کی مانند مقدس جوتوں کو ڈالا اور ایک ہاتھ مصروف داڑھی رکھ کر سڑک پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اور جب وقت کے شربت نے ان کے درد کو ہلکا کیا تو وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک مچھلی والا آگیا۔ فوراً اسے آواز دی۔ ———— کہو کیا حال ہے" کہکر آغاز تکلم کیا، اب اگر مچھلی والا پہلی مرتبہ شومیٔ قسمت سے ان سے شرف ملاقات حاصل کر رہا ہے تو اسکی، حالت کی مختصر اور جامع کیفیت ایسی ہوگی جیسے کسی نوجوان کی شادی کے روز اور پھر شادی کے ایک سال بعد کی حالت ہوتی ہے، مچھلی والا مسکرایا، ادھر یہ بھی تبسم ریز ہوئے، وہ سمجھا کہ مچھلی تو روز ہی شکار کرتے ہیں آج مکر مچھ ہی سہی۔ ادھر یہ کیا سمجھ رہے ہیں کہ شکار کرنے والا بھی تو خود شکار ہو جاتا ہے۔ بہرحال اسی پوشیدہ باہمی افہام و تفہیم کے بعد اصل مسئلہ پر بحث

کم تین دن یہ برف میں دبی رہی ہے۔ اور برف بھی نہایت
معذرت استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچا برف تھا۔ اچھی طرح
تیار ہونے سے پہلے ہی مارکیٹ میں آگیا ہے۔"

مچھلی فروش سمجھا کہ یہ شاید برف بناتے ہیں۔ اور
اگر برف بناتے نہیں تو کم از کم برف کی ایجنسی ضرور ہوگی۔
ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا ہوگا کہ ایک دم آپ دھماکہ خیز
انکشاف فرمائیں گے، ارے جناب یہ مچھلی تو مادہ ہے۔ مچھلی فروش
گھبرا کر پوچھتا ہے آپ نے یہ کیسے پتہ پایا کر یہ مادہ ہے۔ بس پھر
کیا تھا۔ انھوں نے دریائے ستلج سے راوی تک گنگا سے
لیکر جمنا تک اپنے تجربات اور شکار کی تفصیل سنانی شروع
کردی۔ ادھر مچھلی والا یہ سوچ رہا ہے کہ ہمارے جدا مجد کی
روح ان میں تحلیل کر گئی ہے۔ اب اگر اس درمیان کوئی
دوسرا گاہک آگیا تو اسے انھوں نے سر کے ہلکے سے جنبش
سے ظاہر کر دیا کہ مچھلی کی دال میں کچھ کالا ہے۔ اسے اس
طریقہ سے مچھلی کے نقائص سے آگاہ کیا کہ اگر وہ چار روپے
کلو خود خرید کر لایا ہے تو دو روپے میں فروخت کرنا ہی
باعث عافیت سمجھیگا۔ اور جناب میر کاظم چار روپے کی
چیز دو روپے میں لیکر ایسے خوش ہوتے ہیں جتنا اکبر
چتوڑ گڑھ کا قلعہ فتح کرکے خوش نہ ہو سکا تھا۔ مچھلی کی
خریداری ختم، اس کی مدح و محاسن کی لازوال بحث
شروع، اور یہ یک طرفہ بحث اس وقت تک جاری رہتی
جب تک کوئی دوسرا شغل ہاتھ نہ لگتا۔ بقرعید کا زمانہ تھا
آپ تیار تھے کہ آج تو بکرا ہی لیں گے۔ دیکھا ایک دیہاتی
چند بکروں کے ساتھ گذر رہا ہے۔ دیکھ کر آواز سے
زیادہ رفتار یا رفتار سے زیادہ آواز کے ساتھ وہ
اس کی طرف لپکے، بکرے کی رسی ہاتھ میں لی ادھر دیکھا
ادھر ٹٹولا، کبھی آگے ہاتھ ڈالا کبھی پیچھے، بکرا سمجھا کہ
آگیا آخری وقت۔ لیکن اس کی التجا بھری نظریں زبان
حال سے کہہ رہی ہیں کہ ایک دفعہ چھری پھیر کر میری جان
لے لو۔ یہ عضو عضو کو دبانا اور ٹٹولنا اس کی جان آدھی

غور کرنا تو کیا اس کی رحم طلب نظروں کی طرف دیکھ
گوارا نہیں کیا۔ رسی ہاتھ میں لیکر پہلے تو خود آگے بھا
اور بکرا پیچھے۔ اور بعد کی یہ حالت آپ پیچھے اور بکرا
آگے، بکرے کی جولانئی طبیعت اپنے عروج پر پہنچ
بکرا بھاگے جا رہا تھا اور آپ گھسٹتے جا رہے تھے۔ چار و نا چار
کسی طرح کسی راہگیر یا کھمبے کا سہارا لیکر اپنے سانس کی
موسیقی کو درست کیا۔ اور پھر واپس بکرے والے کے
پاس آکر معلوم کیا۔ کیا مانگ رہے ہو؟" اس نے جواب
دیا کہ میاں جی 200 روپے مانگے ہیں۔ اپنا منہ اس
کان کے پاس یا اس کا کان پکڑا اپنے منہ کے پاس
لائے۔ کچھ بد بدائے، اور پھر بکرے والے کی حالت
قابل دید ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے
اس کے کان میں کہا ہو کہ" ارے جناب میں موت کا
فرشتہ ہوں مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہاری جان بلا
پس و پیش لے لوں" میاں جی ایک پیسہ کم ہو۔" بکرے
والا بولا — ابے کیا دماغ خراب ہے۔ ریوں کو یہ
کہتا ہے۔" میاں جی میرا مطلب یہ ہے کہ.....
بس بس چپ رہ، ابے اور کیا لے گا، بکرے کو کھا
گھاس تو کھلائی ہے۔ دانہ تو اسے سنگھایا بھی نہیں
اس کے پیپڑے بھی داغدار ہیں۔ ایک گردہ بھی ...
ہے۔ گوشت بھی تو کلو سے زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی
کیا کم لگایا ہے؟" بکرے والا پہلے تو ہاتھ نہیں رکھ
دے رہا تھا اب یہ حالت کہ وہ صفائی پر آمادہ
آخر کار بات پٹ ہوئی۔ اور نہ جانے کس طرح
بکرے کی رسی میر کاظم علی کے ہاتھ میں آگئی۔ دریافت
کیا تو بتایا کہ پہلے -/35 روپے لگائے تھے۔ اور اب
چالیس میں لے لیا ہے، کہو کیسا ہے؟ بس رائے زنی
ان کی بارگاہ میں قابل تعریف ہے۔ اب اگر رائے
کی تو گیا کام سے۔ اور اگر تہی دامانی سے کام لیا تو سنا
چھوٹا، یہ ان کی ذاتی زندگی کے رخ کا حرف اوّل ہے

میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ آپکا محل امروہہ شریف ہے جہاں آپ نے سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی، مذہبی خدمات بیک وقت انجام دی ہیں۔

امروہہ کے ایک نازک موڑ پر آپ نے چھوٹی سی دوکان کھولی، جہاں پان چھالی کتھا وغیرہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ اس دوکان میں منوں چھالی، منوں کتھا اور بے حساب پان فروخت کرکے اسی دوکان کے سامنے والی مسجد میں روزانہ تفسیر قرآن بیان کرکے اور پھر تحریک ترک موالات میں اپنی دوکان کو ہرا بھرا چھوڑ کر مولانا محمد میاں کی قیادت میں نکلنے والے جلوس میں شامل ہوکر ایک انوکھا ریکارڈ قائم کر دیا۔

مشہور سائنسداں گلیلیو نے بھی زمین کی گردش کو ثابت کرنے میں آپ کا تعاون حاصل کیا تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے تمام تاریخی واقعات آپ کے سامنے ہوئے۔ مثلاً: قطب الدین ایبک کا قطب مینار، اکبر کی پانی پت کی لڑائی میں آپ اس کے ہمرکاب رہے۔ جہانگیر کے مصاحب اور نورجہاں کے مشیر۔ شاہجہاں نے آپ کے ایما پر ہی تاج محل بنوایا۔ مجدد الف ثانی کے تحریری مشیر۔ فتاویٰ عالمگیری آپ کے ہی زیر سایہ مرتب ہوا۔ اگر آپ میری باتوں کو مبالغہ پر محمول فرمائیں تو میں اسے آپ کی کج عقلی سمجھونگا۔ ۔ میری پیشگی دعا ہے کہ "حق مغفرت کرے۔ عجیب آزاد مرد ہے۔"

بقیہ صفحہ ۱۹

ساتھ گیا تھا۔ ہندوستانی بارڈر کی تلاشی کے بعد جب شہناز ۔۔ (ان سنگلاخ حدوں کو پار کر رہی تھی جو دلوں کو، خونی رشتوں کو ملکوں کے فاصلوں میں تقسیم کر دیتی ہے) مڑ مڑ کر اپنے پیارے پیارے [illegible] کو دیکھتی جا رہی تھی اور باہیں پھیلا کر اسے اپنی آغوش میں چھپا لینا چاہتی تھی مگر ۔۔۔۔ آج تو وہ اپنے فیصلہ پر بے بس تھی۔ ادھر یہ سنگلاخ حد میں بختیار کے دل و جگر کو تیر نیم کشش کی طرح تڑپا رہی تھیں جنھوں نے اسے شہناز سے دور کر دیا تھا۔ وہ سکتے کے سے عالم میں اس طرح بتیر بیر ہاتھ پھیلائے کھڑا رہ گیا تھا گویا اسے صلیب پر چڑھا دیا گیا ہے۔

بختیار کی نظروں سے شہناز کا دھندلا سا نقش بھی غائب ہوتا جا رہا تھا۔ آج وہ اپنا سب کچھ کھو چکا تھا تمنائیں، آرزوئیں، روحی کی شادی، باپ کی وصیت شہناز کا پیار۔ اور شہناز کے عیش اپنی تمام تر ذمہ داریاں اب اسے کوئی خواہش نہ تھی ۔۔۔۔ آج اسے دنیا کی کوئی طلب نہ تھی۔

"پورے ۔۔ ڈھائی لاکھ" بختیار صاحب مبارک ہو! پورے ڈھائی لاکھ آپ کی لاٹری کا پہلا انعام ہے۔ دوسرے ہی لمحے بختیار کا شانہ ہلاتے ہوئے لاٹری کا سیکنڈمین کہہ رہا تھا!!

مضامین خوشخط اور کاغذ کے ایک جانب لکھیں ۔۔ جواب کے لئے ٹکٹ ساتھ بھیجیں

ادارہ

# سلطان محمد قلی قطب شاہ دوم

## حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا بانی

ایم۔ ایچ عادل۔
ایوننگ کالج حیدرآباد

بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر دکن کی پانچ حصوں میں تقسیم عمل میں آئی۔ جس میں سے ایک حصہ پر قطب شاہیوں کی حکومت تھی۔ اس آزاد اور خود مختار حکومت کی بنیاد ۱۵۱۸ء میں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے رکھی تھی۔ اس کے شمال میں گونڈوانہ اور برار تھے، مغرب میں بیدر، جنوب میں وجیا نگر کی ریاست اس کا جنوبی اور مشرقی ساحل کنارے سے اڑیسہ تک پھیلا ہوا تھا۔ قلی قطب شاہ کا تعلق ایران کے ایک مشہور خاندان سے تھا۔ ان کے باپ کا نام اویس قلی تھا۔ اویس قلی شاہ ایران کے دست راست تھے۔ شاہ امیر خلیل کی وفات کے بعد ان کا بیٹا شاہ امیر یعقوب تخت نشین ہوا جو اویس قلی ایران کے بیٹے کا دشمن تھا۔ اویس قلی نے اپنے بیٹے کی جان کی حفاظت کی خاطر قلی قطب شاہ کو دکن روانہ کر دیا۔ قلی قطب شاہ نے بہمنی سلطنت کے آخری تاجدار محمود شاہ بہمنی کے ہاں ملازمت اختیار کی۔ محمود شاہ بہمنی نے انہیں محلات شاہی کا منتظم مقرر کیا تھا۔ قلی قطب شاہ نے بڑی دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ تلنگانہ کی کئی جاگیروں سے بہمنی شاہ بہمنی کو خراج وصول طلب تھا۔ قلی نے روپیہ وصول کر کے شاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ شاہ نے خوش ہو کر انہیں گولکنڈہ کا گورنر مقرر کیا۔ اور قطب الملک کا خطاب عطا کیا محمود شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی گورنروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا ۱۵۱۸ء میں قطب شاہی حکومت کی بنیاد رکھی۔ بعد میں یہ گولکنڈہ کی حکومت کے نام سے موسوم ہوئی۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت ایک سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ اس پر سات حکمرانوں نے کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ گولکنڈہ کے چوتھے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کا تیسرا بیٹا سلطان محمد قلی قطب شاہ دوم گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار تھا جو ۴ رمضان ۹۷۳ھ ۱۵۶۵ء کو پیدا ہوا۔ قلی قطب شاہ کا پورا نام ابوالفتح محمد قلی قطب شاہ تھا۔ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۵۸۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ تخت نشینی کے فوراً بعد مرزا اصفہانی کی لڑکی سے جو سادات طباطبائی سے تھی نکاح کیا۔ گولکنڈہ کی آبادی ابراہیم قطب شاہ ہی کے دور سے بہت بڑھ گئی تھی۔ اور خاندان بہمنی کی حکومت بھی اجڑ گئی تھی۔ اکثر لوگوں نے یہاں سے نقل مقام کر چکے تھے۔ بہتوں نے آکر گولکنڈہ میں پناہ لی۔ اس لئے گولکنڈہ کے علاوہ ایک دوسرا

بڑا شہر بسانے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔
ایک دفعہ ۱۵۹۹ء میں جب قلی قطب شاہ سیر و شکار کو نکلا تو گولکنڈہ سے دور موسیٰ پہنچا۔ جہاں اب شہر حیدر آباد واقع ہے۔ یہ میدان موسیٰ کے کنارے سرسبز و شاداب نظر آیا۔ اس نے اس شہر کی بنیاد ۱۵۹۱ء میں ڈالی۔ اس شہر میں انتہائی بڑی چار کمانیں اور سڑکیں تعمیر کروائیں جو ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتی ہیں۔ سڑکوں کے کنارے نہریں اور سائے دار درخت لگوائے اور اپنے رہائشی محلات ندی کے شمالی جانب تعمیر کروائے۔

کہتے ہیں کہ ان کی تعمیر کردہ دکانیں ایک ہزار تھیں حمام اور خانقاہ، مدرسے، مسجد، لنگر خانے، سیاح خانے وغیرہ کوئی بارہ ہزار کے قریب تھے۔ اور جتنی عمارتیں تھیں تمام کی تمام چونے اور پتھر کی تعمیر کی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کو ایک خوبصورت عورت سے عشق ہو گیا جس کا نام "بھاگ متی" تھا۔ اسی لئے انھوں نے اس نئے شہر کا نام اس کے نام پر "بھاگ نگر" رکھا۔ بعد ازاں انھوں نے اسے حیدر محل کا خطاب عطا کیا۔ اور شہر کا نام بھی تبدیل کر کے حیدر آباد کر دیا۔ محمد قلی کے ہی دور میں حیدر آباد کی آبادی میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے باغات اور تفریح گاہیں چاروں طرف شہر سے دس دس میل تک پھیل گئیں۔ ابوالفتح سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اپنی رعایا سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ ہمیشہ ان کے دکھ درد کا خیال رکھتا تھا۔ اس کے دور میں ملک میں امن اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ اس نے کبھی کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ محمد قلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے رعایا میں میل ملاپ اور بھائی چارگی کے جذبات کو اجاگر کیا۔ اس کی سلطنت کا پھیلاؤ اتنا ہی تھا جتنا کہ آجکل ریاست آندھرا پردیش کا

[illegible]

کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے خاص کر اردو اور تلگو زبان کے شاعروں کی سرپرستی کی۔ وہ خود ان دونوں زبانوں کا ماہر تھا۔ اردو میں ان کی غزلوں اور نظموں کا بڑا مجموعہ چھوڑا ہے۔ اس کو عمارتیں تعمیر کروانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے شہر حیدر آباد، چار مینار، جامع مسجد، چار کمان دارالشفاء، عاشور خانہ اور مختلف شاہی محلات تعمیر کروائے۔ یہ عمارتیں خصوصاً "چار مینار" فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اور صدیوں تک محمد قلی قطب شاہ کی یاد کو تازہ رکھیں گے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا (۴۹) سال کی عمر میں ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء کو انتقال ہوا۔ اور انھیں گولکنڈہ کے شاہی گنبدوں میں ہی دفن کیا گیا ہے۔

●●

# آپ کتنے ذہین ہیں

محمد رشید منصوری

ذیل میں دس سوالات دیئے گئے ہیں۔ ہر ایک کا جواب کم سے کم وقت میں دینے کی کوشش کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ نتیجہ دیکھ کر آپ کچھ پریشان ہونے لگیں لیکن اس غصہ کے عوض آپ یہی سوالات اپنے دوستوں سے کر کے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

- اس صحیح ہونے کا مطلب ہے کہ آپ جینیس ہیں۔
- سات آٹھ صحیح جوابات آپ کے ذہین ہونے کا ثبوت ہے۔
- پانچ چھ ٹھیک جوابات اطمینان بخش ہیں۔ لیکن اس سے کم کا مطلب ہے کہ آپ ذہن سے بہت کم کام لیتے ہیں

۱: ایک بے اور گیند کی قیمت ۲۵ روپے ہے بے کی قیمت گیند سے ۲۰ روپے زیادہ ہے گیند کی قیمت بتلائیے۔

۲: ایک برقی گاڑی (ELECTRIC TRAIN) ... میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مشرق سے مغرب کو جا رہی ہے لیکن ہوا ۱۵ میل فی گھنٹہ شمال سے جنوب کو چل رہی ہے۔ دھواں کس سمت میں اور کس رفتار سے جائیگا۔

۳: ایک خاتون نے بازار کو ڈیڑھ سات روپے میں ... اور دوکاندار کو ... کا نوٹ دیا دکاندار کے پاس ریزگاری نہ تھی اس نے پڑوسی دکان سے نوٹ تڑوایا اور خاتون کو باقی تین روپے دیدے۔ کچھ دیر بعد موخر الذکر دکاندار نے یہ کہکر نوٹ واپس کر دیا کہ یہ جعلی ہے۔ چنانچہ پہلے دکاندار نے اسے دو نوٹ دیدیا۔ اس کاروبار میں اسے مجموعی طور سے کتنا نقصان ہوا۔؟

۴: ایک شیٹ میں ایک پیسے والے ۲۰ ٹکٹ ہوں دو پیسے والے کتنے ٹکٹ ہونگے؟

۵: کسی جگہ کھدائی کے دوران میں ایک ماہر آثار قدیمہ نے اعلان کیا کہ یہاں سے ایسے چاندی کے سکے برآمد ہوئے ہیں جن پر ۹۲۷ ق۔م لکھا ہوا ہے۔ یہ سنکر کسی نے کہا کہ یہ شخص جھوٹا ہے یا نہیں کچھ سمجھتا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

۶: مندرجہ ذیل طریق پر رکھنے کے لئے کم از کم کتنے ... درکار ہونگے؟

(ا) دو آگے ایک پیچھے (ب) ایک آگے دو پیچھے
(ج) ایک آگے ایک پیچھے ایک درمیان میں۔
(د) ایک دائیں ایک بائیں ایک درمیان میں۔

۷: ایک بندر ۲۱ فٹ گہرے کنوئیں میں گر گیا۔ ایک دن میں وہ تین فٹ اونچا اچھلتا ہے لیکن دو فٹ نیچے آ جاتا ہے۔ وہ کتنے دنوں میں باہر جائیگا؟

باقی صفحہ ۲۸ پر

# اُردو کا جدید ادب

## کفس — جوگندر پال

اپنی خوشی سے کون فرشتہ بنتا ہے میرے دوست، میرے ساتھ بھی یہی ہوا کہ فرشتہ بنے بغیر کوئی چارہ نہ رہا — نہیں، کوئی وضاحت طلب نہ کرو۔ میں آپ ہی اپنی تمام سرگذشت سنائے دیتا ہوں۔

پہلے پہل میں درخت تھا، شاید پیپل کا درخت، بڑا اونچا، بڑا گہرا، بڑا گھنا، اور میرے دور دور کوئی اور نہ تھا، بس ایک میں ہی تھا — نہیں بولو مت بس سنتے جاؤ — اور پھر یہ ہوا کہ میرے آس پاس دیکھتے ہی دیکھتے درخت ہی درخت ہو گئے۔ اور اپنی ذات کے اس بے محابا جنگل سے میری جان پر بن آئی۔ جمائی لینے کے لئے اپنے بازو ذرا سے چوڑے کرنا چاہتا تو میری ٹہنیاں دیگر درختوں میں جا پھنستیں اور سدا کے لئے وہیں رہ جاتیں۔ یہ جنگل بڑھتا چلا گیا۔ اور دھرتی کے چپے چپے سے اور نیچے کئی کئی جھاڑ برآمد ہونے لگے۔ اور ان جھاڑوں کی چھینا جھپٹ سے بچ کر تھوڑی سی خوراک میری جڑوں تک پہنچ جاتی تو میں ذرا سا ہرا ہو کر اپنے خدا کا شکر بجا لاتا، ورنہ کئی کئی ہفتے بھوک سے تڑپ تڑپ کر گذار دیتا — اور سنو، پھر یہ ہوا کہ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور ایک صبح کو پورے زور سے اچھل کر میں نے اپنی ہی جڑوں کو زمین سے اکھاڑ لیا۔

اور وہاں سے نکل کر ایک طرف چل نکلا۔

تعجب کی بات ہے کہ میں چلا کیسے، لیکن تھوڑی دور چل کر میں نے بغور دیکھا کہ میں واقعی چل رہا ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ میری اکھڑی ہوئی جڑیں میرے اندر ہی اندر مڑ کر کہیں غائب ہو چکی تھیں۔ اور میری چلنے کی خواہش کی شدت سے نہ جانے کہاں سے میرے دو پاؤں نکل آتے تھے۔

میں چلتا رہا۔ کھلی ہوا کے آگے اور کھلی ہوا، کھلی زمین۔ اب — با! کتنی بڑی دنیا ہے!

اور چل چل کر میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تو ایک جگہ میں ٹھہر گیا۔ درخت نہ رہا ہی میں کم سے کم انسان تو بن ہی چکا تھا۔ میری جڑیں مڑ مڑ کر میرے کلیجے میں اٹکی ہوئی تھیں۔ میں وہیں ٹھہر گیا، وہیں اپنا گھر بنا لیا، بنا کر بسا لیا اور رہنے سہنے لگا۔ اور ہوتے ہوتے اپنا پچھلا سارا دکھ درد بھولنے لگا۔

نہیں بولو نہیں دوست، میری کہانی پوری ہو لینے دو۔ میری بدنصیبی کہہ لو کہ میری یہ نئی دنیا بھی بس بس کر گنجلک اور گنجان ہو گئی۔ کہاں وہ دن تھے کہ ایک میں تھا، اور ایک میں، اور ایک میں — بس میں ہی میں، اور کہاں یہ دن کہ ایک میں نہ رہا اور دیگر سب ہو بہو کر اور زیادہ ہوتے گئے، میرے اوپر نیچے، آگے پیچھے، دائیں بائیں، ہر سمت لوگوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہو گئے اور میں ان ڈھیروں میں

ایسا غائب ہوا کہ مجھے اپنا اتہ پتہ بھی نہ رہا۔ میری جڑیں میرے دل کے ارد گرد کستی چلی گئیں، میرا دم گھٹتا رہا اور آخر گھٹ گھٹ کر نکل گیا تو میری جان میں جان آئی، اور میں نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو اپنی دنیا کے حجم غفیر سے باہر پایا۔ — یہ خلاء ہی خلا — اور اس سے آگے اور خلاء — بھیڑ کی گھٹن سے دم نکلا تھا تو مجھے ڈر تھا کہ اس بھیڑ سے بچ کر دم بے چارہ جائیگا کہاں، مگر اب آنکھ کھلی اس بے کراں وسعت میں، جہاں میرے سوا کوئی نہیں، اور چونکہ میں بھی بے وجود ہو چکا تھا اس لئے میں بھی نہیں — بس انسان سے گھٹ کر فرشتہ بن کر رہ گیا۔

نہیں دوست، ابھی میرا قصہ ختم نہیں ہوا:۔

جب سے میں فرشتہ بنا ہوں تب سے اس الجھن میں ہوں کہ میں ہوں بھی، یا نہیں ہوں؟ — ہوں تو پھر کیوں نہیں ہوں، بغیر؟ البتہ کیوں، ہو گیا ہوں — اور نہیں ہوں تو کیا ہوں؟ — میں کیا ہوں؟ — کیا ہوں؟ کیا؟ — ک —

نہیں دوست، مرتے —! پھر کون دوست؟ میں کس سے مخاطب ہوں؟ میرا دوست یا دشمن کون ہے؟ یہاں ہے کون؟ — صرف میں! — تو پھر کیا میں اپنے آپ سے ہی مخاطب ہوں؟ — پر میں بھی تو اب غیر موجود ہو گیا ہوں — ہوئے بغیر ہوں (کیا ہوں؟) سوچے بغیر سوچ رہا ہوں (کیا سوچ رہا ہوں؟) — میری سمجھ کام نہیں کر رہی ہے (میری سمجھ؟ — میں ہی نہیں تو میری سمجھ کیا؟) — میں بے بیج ہو کر رہ گیا ہوں۔ میرا بیج میرے پیچھے نہ جانے کہاں رہ گیا ہے — مجھے اپنی پہچان نہیں رہی! — کیا — کیا —؟ نہیں! — نہیں میرے خدا، مجھے قبول ہے کہ مجھ میں خدا بننے کی تاب نہیں! — اب میرے ارتقا کا یہ سلسلہ توڑ دو، میری خواہش ادھوری رہنے دو، میری خواہش پوری کر کے مجھے اب اور نہ گھٹاؤ — مجھے خدا نہیں بننا ہے — نہیں! ▲▲▲

(شب کون)

۸: موہن کی ماں کے تین بیٹے تھے۔ ایک کا نام من دوسرے کا نام سیم تھا۔ تیسرے کا نام بتائیے۔

۹: آپ نے ۲۰۰ صفحات والی پانچ کتابیں ترتیب شیلف میں لگا رکھی تھیں یعنی کل ۱۰۰۰ صفحات ایک کیڑا پہلی کتاب کے پہلے ورق سے آخری کتاب کے آخری ورق تک چاٹ گیا۔ اس نے کل کتنے صفحات چاٹ لئے؟

۱۰: قرآن پاک کی کس سورت میں یہ فقرہ بار بار دہرایا گیا ہے کہ ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟

# جوابات

۱۔ ۲۵۰ روپے

۲۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ دھوکا کھا گئے۔ برف کی ڈلی کا وزن کم یا زیادہ ہوتا ہی نہیں۔

۳۔ دس روپے، تین روپے، سات روپے، سودے

۴۔ ۲۰ ٹکٹ

۵۔ ارے! کیا آپ چاندی کی تاریخ کی طرف نکل گئے وہ جھوٹ کہتا تھا۔ ۹۳ سال قبل اس زمانے لوگوں کو کیسے علم ہو گیا تھا کہ حضرت مسیح ۹۳ سال پیدا ہوں گے۔

۶۔ صرف تین۔

۷۔ ۱۹ دن میں

۸۔ موہن۔

۹۔ ۶۰۰ صفحات شیلف دیکھئے۔ آپ جان جائینگے کہ اور آخری کتاب کے ۱۹۸ صفحات سلامت رہیں۔

۱۰۔ سورۂ قمر میں

شاہجہاں دہلی

# بنگلہ دیش اور ہندوستان

شمس الاسلام - متعلم ایم - اے (سیاسیات)
دلی یونیورسٹی

تقریباً پچھلے ڈھائی ماہ سے ہمارے ملک میں بنگلہ دیش میں ہو رہے سیاسی واقعات میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا جا تا رہا ہے - اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے اور ممالک نے اس مسئلہ کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا جیسا کہ بھارتی حکومت نے کیا - یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اس مسئلہ کے دوران ہمارے اخبارات فرقہ وارانہ پارٹیاں اور حکومت کے ترجمانوں نے بہت زیادہ خوش فہمی اور غلط بیانی سے کام لیا - ہندوستانی عوام اور ساری دنیا پر ایسا ظاہر کیا گیا کہ جیسے سارا مشرقی بنگال بس اب آزاد ہو گیا ہے -

جب ریڈیو مغربی پاکستان نے یہ کہا کہ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا ہے' تو ہماری ساری مشینری نے دعویٰ کیا "کہ نہیں وہ آزاد ہے - اور مجیب نگر سے آزاد حکومت کا کام کاج چلا رہا ہے - اس کا انجام کیا ہوا ؟ ہم سب کو معلوم ہے - ہم کو رسوائی ملی اور جھوٹا بننا پڑا - حقیقت میں یہ بات مغربی پاکستانی حکومت کے حق میں گئی - انھوں نے پوری کامیابی کے ساتھ ہماری اس غلط بیانی سے فائدہ اٹھایا -

ہندوستان آخر تحریک بنگلہ دیش کا کیوں ساتھ دے رہا ہے ؟" یہ وہ سوال ہے جو ہر ایک کو پریشان کئے ہوئے ہے - سرکاری ترجمانوں اور کچھ لوگوں کے مطابق ہم اس وجہ سے اس تحریک کا ساتھ دے رہے ہیں - کیونکہ یہ بہت زیادہ مرکزیت کے خلاف اور صوبائی اختیارات حاصل کرنے کے لئے ایک جدو جہد ہے —— ہندوستان چونکہ جمہوریت کا علمبردار رہا ہے - اس لئے ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اس تحریک کی حمایت کریں - لیکن اگر ہم ان بیانات کا تنقیدی جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ یہ سب ایک خام خیالی ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں - ہم ایسا کیوں کہتے ہیں ؟ اسے جاننے کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل حقائق پر نگاہ ڈالنی پڑیگی -

سب کو معلوم ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہنگاموں کے ساتھ ساتھ ہمارے ایک اور پڑوسی ملک میں بھی بغاوت ہوئی - سیلون میں چی گویرا (Che Guevera) تحریک پسندوں نے وہاں کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی - یہاں پر ہندوستانی حکومت نے سیلون حکومت کی مدد کیلئے توپیں، ہوائی جہاز اور بحری جنگی جہاز تک فراہم کئے - مغربی پاکستانی حکومت جس نے مشرقی بنگال میں قتل عام کیا اس کی فوجیوں کے ساتھ ہندوستانی نوجوانوں نے

ملکر ایک ہی کمانڈ کے تحت ان حریت پسندوں کا
خاتمہ کیا۔ یاد رہے کہ یہ وہی سیلونی حکومت ہے
جس نے مغربی پاکستانی حکومت کو ہوائی اڈے
بندرگاہیں اور پیٹرول فراہم کیا۔ جبکہ بنگلہ دیش
تحریک کو دبانے کے لئے مغربی پاکستان سے اور
فوجیں اور ہتھیار بھیجنے کی ضرورت پیش آئی۔
اس کے علاوہ ہمیں دوسروں کے لئے رونے
سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھنا چاہیئے۔
کیا ہمارا سیاسی ڈھانچہ مرکزیت نما
(Centralized) نہیں ہے؟ راجگوپال آچاریہ
نے سوراجیہ میں ایک بار لکھا تھا کہ ہندوستان میں
جو تعلقات صوبوں اور مرکز میں پائے جاتے ہیں
وہ فیڈرل نظام (Federation) پر مبنی
نہیں ہیں۔ بلکہ صوبوں کی حیثیت ایک سینٹرل ایجنسی
(Central Agency) کی ہیرا ایجنٹوں کی سی
ہے۔ جو کچھ بھی مرکزی ایجنسی کی مرضی ہوتی ہے وہی صوبوں
کو کرنا پڑتا ہے۔ حال ہی میں جب ایک اپوزیشن لیڈر
نے یہ کہا کہ جب ہم بنگلہ دیش تحریک کی حمایت کر رہے
ہیں تو ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہمیں اپنے
ملک کے صوبوں کے لئے بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ
بات ہماری حکومت کو پسند نہیں آئی۔ اور فوراً
یہ بیان دیا گیا کہ اگر ہم ہندوستان کی بھلائی چاہتے
ہیں تو ہمیں مرکز کو زیادہ اختیارات دینے ہی
پڑیں گے۔ یہ کیا ہے؟ ہم نے ایک ہی چیز کے لئے
دو پیمانے بنا رکھے ہیں۔ ان حالات میں ہم کس طرح
تحریک بنگلہ دیش کی حمایت کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی حکومت کو یاد دہانی
کرانی پڑے گی کہ "خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے"۔
حقیقت تو یہ ہے کہ ہم بنگلہ دیش تحریک کی
صرف اس وجہ سے حمایت کر رہے ہیں کیونکہ ہم
اپنے روایتی دشمن پاکستان کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔

اس جگہ ہماری حکومت اور جن سنگھ کا نقطہ
نگاہ ایک جیسا معلوم ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش تحریک کو
صرف اس وجہ سے مدد دی جا رہی ہے کہ اس
طرح پاکستان بہت کمزور ہو جائے گا اور اس کی کوئی
حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ
سارے سرمایہ دار پریس نے بنگلہ دیش
تحریک کی حمایت کی؟ جواب بہت صاف ہے۔
یہاں ہمارا معاشی فائدہ چھپا ہوا ہے۔ یہ بات کسی
سے چھپی نہیں ہے کہ مشرقی بنگال صنعتی طور پر پسماندہ
پچھڑا ہوا علاقہ ہے۔ ان کو اپنی ضروریات کی
چیزیں جو کہ (Finished goods) کی شکل
ہوتی ہیں۔ مغربی پاکستان سے درآمد کرنی پڑتی
ہیں۔ اگر ہم مشرقی بنگال کا مغربی پاکستان سے
تعلق ختم کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کا
مطلب یہ ہوگا کہ یہ صنعتی طور پر پسماندہ علاقہ اپنی
ضروریات کی چیزیں لامحالہ ہندوستان سے
درآمد کرے گا۔ یہ وہ فائدہ ہے جس کیلئے
سارے اخباروں نے اس تحریک کی حمایت کی
ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے اس
مسئلہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالنا ناگوار خاطر ہو
لیکن کیا کیا جائے حقیقتیں عام طور پر تلخ ہی ہو
کرتی ہیں۔
تحریک بنگلہ دیش کی حمایت کرتے ہوئے
ہماری کیا نیت ہے۔ یہ تو اس بات سے واضح
ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی فرقہ پرست اور
تارننٹ جماعتیں اور کسی حد تک حکومت بھی اس
مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش
کر رہی ہے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ پاکستانی
فوجیوں نے صرف ہندوؤں کو ظلم و ستم کا نشانہ
بنایا ہے۔ ریفیوجی صرف ہندو ہیں۔ مسلمانوں کی
تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ایک اور



شاہجہاں

کو واپس لے گا۔ اور ہندوؤں کو یہیں رہنا پڑیگا۔
آخران سب باتوں کا کیا مطلب ہے؟ ہم تو ایک
جنگ آزادی کی حمایت کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہم خود
جمہوریت۔ برابری اور آزادی کے علمبردار ہیں۔
کیا یہ سب باتیں ہم کو زیب دیتی ہیں؟

جو لوگ مشرقی بنگال کے رفیوجیوں کے لئے
مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں یہ وہی لوگ ہیں
جنہوں نے تباہ حال اور پریشان رفیوجیوں
سے ۱۰۰۔ ۱۰۰ روپیہ والے پاکستانی کرنسی
نوٹ 30۔3 ہندوستانی کرنسی نوٹوں کے عوض
لئے ہیں۔ یہ ہمارے رفیوجی جب اپنے ملک میں
تھے تو مغربی پاکستانی ان کا خون چوس رہے تھے
اور جب یہ پناہ کے لئے سرزمین ہند پر پہنچے تو
بنگال کے سودخوروں نے ان کے بچے کھچے اثاثہ
کو لوٹ کر ان کو ننگا کر دیا۔ اور آج یہ بے یارو
مددگار بھوکے، بیماریوں سے پریشان ریلوے
اسٹیشنوں، سڑکوں پارکوں اور کیمپوں میں پڑے
ہوئے ہیں۔ جو کچھ مدد ان لوگوں کے لئے بھیجی
جارہی ہے اس میں سے آدھی ہی ان لوگوں تک
پہنچ پاتی ہے۔ اور آدھی کرپٹ سرکاری
ملازمین کے نذر ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ کا ایک اور حیران کن پہلو ہندوستانی
مسلمان اور پریس کا رویہ ہے۔ عام طور پر ہندوستانی
مسلمانوں میں خیال پایا جاتا ہے کہ مشرقی بنگال میں
جو کچھ ہو رہا ہے وہ بغاوت ہے۔ اور یہ ایک لڑائی
ہے مسلم طاقتوں کے درمیان جن میں سے ایک
(مغربی پاکستان) مسلم اتحاد کے لئے ہے جبکہ دوسری
(بنگالی) ایک مسلم ملک میں نفاق پھیلانا چاہتی ہے اس
وجہ سے ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ مغربی پاکستانی
نقطۂ نظر کی حمایت کریں۔ یہ سب پورے مسئلہ کی
دماغ سے سوچیں اور بتائیں کہ جن حالات میں مشرقی
بنگال کے لوگ رہ رہے تھے اگر وہ خود ان حالات
سے گذر رہے ہوتے تو وہ کیا کرتے۔ ہم سب کو معلوم
ہے کہ مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان کی
آبادی سے ایک کروڑ زیادہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے
لوگ کل ملکی آمدنی کا 70% فراہم کرتے ہیں جبکہ 30%
مغربی پاکستان کے لوگوں کا حصہ ہے۔ اور جب
اس روپیہ کے استعمال کا وقت آتا ہے تو مشرقی
بنگال پر صرف 30% خرچ کیا جاتا ہے اور باقی
70% مغربی پاکستان کی حکومت استعمال کرسکتی ہے
اسی طرح سے بینکوں میں جو روپیہ ہے اس کا صرف
20% تو مشرقی بنگال میں رہتا ہے۔ جبکہ 80%
مغربی پاکستان کے بینکوں میں رکھا جاتا ہے۔
جہاں تک نوکریوں میں مشرقی بنگال کے لوگوں کے
حصہ کا تعلق ہے۔ اگر اسکو دیکھا جائے تو یقیناً سب
لوگوں کو حیرانی ہوگی۔ حالانکہ یہ لوگ تعداد میں
ایک کروڑ زیادہ ہیں لیکن سول سروسز میں انکا
حصہ صرف 27% فیصدی ہے۔ اور ملٹری سروسز میں
صرف 8% ۔ کیا کوئی بھی ہوشمند آدمی اس نابرابری
کی حمایت کر سکتا ہے۔ ہم کو چاہئے تھا کہ ہم
سارے مسئلہ کا ہوشمندی اور دانشمندانہ جائزہ
لیتے۔ اس کے برعکس ہم ہمیشہ کی طرح اس جگہ بھی
جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ ہندوستانی مسلمانوں
کو تو اس جدوجہد کی بہت فراخدلی کے ساتھ حمایت
کرنی چاہئے۔ کیونکہ ان کے مسائل بھی کچھ اسی
طرح کے ہیں۔ ▲▲▲

شہاب کراتی
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

انفاس کے چراغ جلائے ہوئے ہے دل
سینے پہ کوئی بوجھ اٹھائے ہوئے ہے دل

احساس کے دیار میں ہر شاہراہ پر
تخیل کی دکان سجائے ہوئے ہے دل

پلکوں پہ آنسوؤں کے محل جگمگا اٹھے
آنکھوں میں کوئی شہر بسائے ہوئے ہے دل

ڈرتا ہوں جل نہ جائے کہیں روح کا حصار
چنگاریوں کی فوج چھپائے ہوئے ہے دل

چھوٹی سی اس غزل کے لئے آج پھر شہاب
مجھ کو تمام رات جگائے ہوئے ہے دل

# Introducing the thirstiest towel of them all!

DCM's SKIN-GLOW towels soak up every drop of water from your body in seconds—because of a super-absorbent blend of fine cottons that makes them the thirstiest towels of them all! And longer lasting. You'll find Skin-glow towels drenched in colour, and in a vibrant choice of Dobby and Jacquard designs. No wonder they're getting their fill of compliments in 60 countries around the world.

**DCM** always have something special in store for you

...ب علموں کا، طالب علموں کے لئے۔ طالب علموں کے لئے

...ست ——— ۱۹۷۱ء

...لد ۵ ——— شمارہ ۸

...پرچہ ——— پچیس پیسے

...لانہ ——— تین روپئے


## مجلس ادارت



...ہجہاں میں شامل افسانوں میں نام، مقام و ...عات قطعی فرضی ہیں کسی سے مطابقت محض ...اق ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر یا مصنف ذمہ دار نہیں

...ہجہاں آل انڈیا اسمال اردو ...ز پیپر ایڈیٹرز کونسل (A.I.S.U.N.E.C) ...ن دہلی کا ممبر ہے۔

## ہمارے مقاصد

طالب علموں

——— میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا

——— کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا

——— کو ملک و ملت کی بامقصد خدمت کے لئے تیار کرنا

——— میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا

——— کی آواز کو عوام تک پہنچانا

——— کو ملکی سیاسی غذا بہم پہنچانا

——— کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے

——— روشناس کرانا اور

——— سماجی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا۔

ادارہ

شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے اور غزلیں و نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول و کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں۔

ادارہ




طابع و ناشر و مالک ——— محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ ——— اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی

مقام اشاعت: قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی ۶

# جرعات



خطاطی محمد نور الحق (نیپالی)

# لمحۂ فکر

ادارہ

تقریباً دو سال قبل نئی دہلی میں کل ہند پیمانے پر اردو کے چھوٹے اخبارات و رسائل کی ایک انجمن "آل انڈیا اردو اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل" کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ ملک بھر کے اخباروں اور رسالوں نے اس کونسل کے بانیوں کو (جس میں "پیڈم" کے ایڈیٹر جناب رفیق الدین صاحب صدیقی کا نام سرفہرست ہے) حتی الامکان تعاون دیا۔ اور زیادہ سے زیادہ ممبرشپ قبول کی۔ یہاں تعاون سے ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان کا یہ تعاون دینا گویا کونسل پر احسان کرنا تھا بلکہ یہ ان کا فرض تھا جو انھوں نے ادا کیا۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کونسل نے اس عرصے میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کیا اقدامات کئے؟ اور ان میں کہاں تک کامیابی حاصل کی؟ بدقسمتی سے اس کا جواب کونسل کے ذمہ داران خاطر خواہ نہیں دے سکیں گے۔ یہ حقیقت ہے اور اس سے انکار خود فریبی کے سوا کچھ نہیں کہ کونسل اتنے سارے ممبر رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکی۔ اور اپنے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے اول تو قدم نہیں اٹھایا اور اگر اٹھایا بھی تو نہایت بھونڈے اور بھوڑے طریقے سے جس کا کوئی صحیح نتیجہ نکلنا بعید از امکان تھا اور ہے۔ اور ان سب چیزوں کی ذمہ داری کونسل کے عہدیداران کے کندھوں پر پڑتی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کونسل کی بدقسمتی ہے کہ بعض ممبر اخبارات و رسائل نے محض ذاتی پرخاش یا کوئی عہدہ نہ دیا جانے کی وجہ سے انتہائی گھٹیا تنقید اور فقرے بازی کی ہے جو اخبار نویسی کی شان کے منافی ہے۔ مثلاً حیدرآباد کا ایک معاصر رقم طراز ہے کہ سپرو ہاؤس نئی دہلی میں ہوئے ۹ رمئی ۱۹۷۱ء کے سیمینار میں جو پوریاں دوپہر کے کھانے میں کھلائی گئی تھیں وہ میدے کی تھیں۔ دہلی کے ایک ہفتہ وار جریدے نے کونسل پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا ہے۔ (ہندوستان میں ہر اس تنظیم کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے جس کے محرکین مسلمان ہوں) اول تو فرقہ پرستی، اقربا پرستی یا کسی اور پرستی کا سوال اس وقت پیدا ہوتا جب کونسل سے کوئی فائدہ کسی کو پہنچ رہا ہو۔ دوسرے پھر بھی کونسل کے ذمہ دار مناصب پر مسلم، ہندو اور عیسائی سب ہی فائز ہیں۔ اس

صورت میں ان کا الزام سراسر بے بنیاد ہے اور عہدے کے
لئے ان کی دلی خواہش کی غمازی کرتا ہے۔

آخر میں ہم کونسل کے ذمہ داران سے درخواست
کرتے ہیں کہ وہ سپرو ہاؤس نئی دہلی میں ۹ رمئی ۱۹۸۱ء
کو ہوئے سیمنار میں شری کلدیپ نائر کی پیش کردہ تجاویز
اور کونسل کی منظور قرار دادوں پر جلد از جلد عمل کرنے
کے لئے راہ ہموار کریں۔ یا ان پر مزید غور کرنے اور پھر
عمل کرنے کے لئے کسی سب کمیٹی کا قیام عمل میں لائیں۔
اس کے علاوہ ہم تمام ممبر معاصرین سے اپیل کرتے ہیں کہ
وہ کونسل پر (ذاتی مفاد کی وجہ سے) بے وجہ اور غلط تنقید
سے احتراز کریں اور ایک ساتھ مل کر چلیں کہ اسی میں کونسل
کا فائدہ ہے اور اسی میں ہم سب کا فائدہ ہے۔

## پھر وہی فرقہ پرستی

ہندوستان بھر کے عموماً اور دلی کے خصوصاً
تعلیم سے متعلق حضرات کے ذہنوں سے ابھی مسٹر
جاوید عالم کا واقعہ اچھی طرح ختم بھی نہ ہونے پایا ہوگا
کہ اسی قسم کا ایک اور واقعہ دلی میں ہی ظہور پذیر ہوگیا۔
فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ایک مسلمان لڑکے نے ہندو
لڑکی سے شادی کی تھی اور اب ایک ہندو لڑکی نے
مسلمان ہو کر مسلمان لڑکے سے شادی کی ہوتی ہے۔
پہلے بے سوچے سمجھے محض شادی ہی کو وجہ بنا کر نوکری
سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ مگر اب کی مرتبہ ایک
سوچی سمجھی منظم سازش کے تحت ایسا کیا گیا۔
مسز عصمت انصاری دلی یونیورسٹی سے ملحق
لڑکیوں کے ایک کالج لیڈی شری رام کالج میں
سائیکولوجی کی لکچرار ہیں۔ مسز انصاری شادی سے
پہلے غیر مسلم تھیں۔ کالج کی گورننگ باڈی نے ان کے
کو غیر اطمینان بخش قرار دے کر ۱۴ رمئی ۱۹۸۱ء کو انھ
برخاست کرنے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اگلے دن ۱۵ رمئی
کو مسز انصاری نے خود استعفا پیش کر دیا۔ استعفےٰ
مسز انصاری نے کچھ ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے
اگر صحیح ہیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ انھیں نوکر
برخاست اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان کا کام اطمینا
نہیں ہے بلکہ صرف ایک وجہ ہے اور وہ ہے ایک مـ
سے شادی۔

مسز انصاری نے بتایا کہ ان کے تقرر سے شعـ
کی صدر مسز کشور یا خوش نہیں تھیں اسی لئے ان کا
ان کے تئیں کچھ اچھا نہیں رہا وہ کچھ لوگوں سے اـ
اور صاف الفاظ میں کہا کرتی تھیں کہ مسز انصاری۔
اپنے خاندان والوں کو دھوکہ دیا ہے۔ لہٰذا وہ لڑ
کو پڑھانے کے لئے قابل اعتماد نہیں ہیں۔ مسز انصـ
نے مزید بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے دھمکی دیتے ہو
کہا تھا "تم ان (طالبات) کے لئے گندی مثال ہو
ہی نکال دی جاؤ گی۔" مسز انصاری بھی اکثر اپنی
ساتھیوں سے شادی کے سبب بے انصافی کے خو
اظہار کرتی رہتی تھیں۔

مسز انصاری کو ٹرمینیٹ (Terminate
سے قبل پرنسپل کالج نے دو خط ان کو بھیجے جن میں انـ
کا غیر اطمینان بخش ہونے کا ذکر کیا تھا۔ پھر بعد میں اـ
منظور کرتے ہوئے پرنسپل نے اپنے خط میں لکھا
"شاید تم کو علم ہو گیا ہے کہ گورننگ باڈی نے تم کو بر
کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" اب مسز انصاری نے پر
سے اپنا استعفیٰ واپس لینے کی اجازت مانگی ہے۔

باقی صفحہ
شاہجہا

# بنگلہ دیش اور ہندوستان (دوسری قسط)

شمس الاسلام متعلم ایم۔ اے (سیاسیات)
دلی یونیورسٹی

میں نے اپنے پچھلے مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستانی حمایت برائے بنگلہ دیش خودغرضی پر مبنی ہے۔ اور ہندوستانی حکومت کسی طرح بھی اس بات کا دعویٰ نہیں نہیں کر سکتی کہ وہ بنگلہ دیش کی حمایت اس وجہ سے کر رہی ہے کیونکہ یہ ایک انقلابی جدوجہد، ڈکٹیٹر شپ کے خلاف ایک لڑائی ہے۔ قتل و غارت گری کے خلاف جو کہ جمہوریت پسند طاقتوں کے ذریعہ لڑی جا رہی ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے جو حقائق پچھلی قسط میں دیئے جا چکے ہیں اس کے علاوہ بھی کئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ مجھے اس بات سے بالکل اتفاق ہے کہ بنگلہ دیش میں پاکستان کی فوجوں نے وہ ظلم و ستم ڈھائے ہیں جن کے سامنے ہٹلر کے مظالم بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ہے۔ تقریباً دس لاکھ آدمیوں کو قتل کر کے آج یحییٰ خان کی فوجیں بنگلہ دیش کے کل عوام کو غلام بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔ لیکن کوئی بھی ہوش مند آدمی اس توجیہہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا کہ ہندوستانی حکومت ایک جمہوری جذبہ کے تحت اس ظلم و ستم کے خلاف ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے ہم ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سب باتوں کے ظہور میں آنے کے خواہش مند تھے۔ اگر سب رفیوجی واپس بھی جانا چاہیں تو شاید ہم انھیں بھیجنے کے لئے رضامند نہ ہوں گے۔ کیوں کہ رفیوجی جن کی تعداد ۶۵ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے ہمارے لئے ایک طرح کا مال غنیمت ہیں۔ ہندوستان میں کئی سال سے Labour unrest "مزدور بے چینی" کافی بڑھ چکی تھی۔ اب ۶۵ لاکھ لوگوں کی جو Manpower ہمیں ان رفیوجیوں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے وہ ہمیں زیادہ سستی پڑے گی اور جو مقامی مزدور طبقہ ہے اس کو ہم نظر انداز کر سکیں گے۔ اس طرح مقامی مزدور اپنے جائز حقوق کے لئے جس unrest بے چینی کا باعث بنتے ہیں سرمایہ داروں کے خیال میں اس کا اختتام ہو سکے گا۔ اس نظریہ کو اس وقت اور تقویت ملتی ہے جبکہ نئی نئی صنعتیں قائم

کی جارہی ہیں۔ مثلاً زیادہ رفیوجیوں کو ڈنڈی (اڈیآباد)
مدھیہ پردیش، راجستھان، یوپی اور مہاراشٹر کے
ان علاقوں میں بھیجا جارہا ہے جہاں پر گورنمنٹ کا پلان ہے
کہ سرمایہ دار صنعتیں قائم کریں۔ ان رفیوجیوں کو وہاں اس
وجہ سے بھیجا جارہا ہے کہ یہ لوگ سستی مزدوری پر بغیر کسی
بے چینی کے سرمایہ داری کے نظام کو اور مستحکم کردیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسئلہ بنگلہ دیش کو ہم صرف اپنے
اور اپنے فائدے کے لئے دو اور محاذوں پر استعمال کرنا
چاہتے ہیں۔ پہلا ہے اندرونی محاذ Home Front
ہماری حکومت جو کہ سوشلزم کی دعویدار ہے (یا رہی ہے) یہ
سوشلزم بہت ہی عجیب و غریب قسم کا ہے۔ شاید ایسے ہی
سوشلزم کے بارے میں مشہور سیاسی مفکر سی۔ ایم۔ جوڈ
C.M. Joad نے کہا تھا "سوشلزم ایک ایسا ہیٹ
ہے جس کو ہر آدمی پہننے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس طرح
اس کی شکل [illegible] خراب ہوگئی ہے۔" بنگلہ دیش کا عذر
بیان کرکے ہمیں آگے کئی سالوں تک کئی تلخ اور ٹیکس سے
بھرا بجٹ دے سکتی ہے۔ آپ جب بھی چلائیں گے کہ بھئی
یہ کیا مذاق ہے ہم سے تو سوشلزم کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن یہ
سب تو شوشلزم ہو رہا ہے۔ تو سیاسی لیڈر فوراً ارشاد
کریں گے کہ اے عزیز ہم تو سوشلزم لانا چاہتے تھے
لیکن کیا کریں۔ بھلا ہو رفیوجیوں کا اور بنگلہ دیش کے لوگوں کا
کہ انہوں نے موقع ہی نہیں دیا۔ اس طرح سے ایک ناکامی
کے لئے ہماری حکومت کو ایک بہت ہی شاندار عذر ——
Decent Excuse حاصل ہوگیا ہے۔ اس شاندار
معذرت کے ذریعہ ہمارے ملک کی پریشان اور بدحال عوام
کو کئی سال تک اور دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔

بنگلہ دیش مسئلہ سے ہم نے ایک بیرونی محاذ پر بھی فائدہ
اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس میں کسی حد تک کامیا
بھی رہے ہیں۔ یہ بیرونی محاذ تھا بین الاقوامی محاذ۔ ہم
اپنا پروپیگنڈہ جس کی بنیاد صرف بنگلہ دیش تھی کے ذریعہ
دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے زیادہ مدد حاصل کی جو ہمیں
کئی سالوں سے نہیں مل رہی تھی۔ یہ بھیک دینے والے ممالک
تقریباً پچھلے تین سال سے قرضے اور مدد دینے سے جھجکتے
تھے۔ لیکن بنگلہ دیش کو ہم نے اپنے پروپیگنڈہ کی بنیاد بنا کر
ان سب ممالک کو پھر رام کرلیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا
ثبوت یہ ہے کہ حال ہی میں ہیں Aid India Consortium
نے 640 ملین ڈالر (تقریباً نو ارب ۱۴ کروڑ روپے)
کی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اتنی رقم ہمیں پچھلے تین سالوں
میں مسلسل کوششوں کے باوجود نہیں ملی تھیں۔ اس کے
علاوہ بنگلہ دیش کے رفیوجیوں کے نام پر اب تک ہمیں [illegible]
روپیہ کی امداد مل چکی ہے۔
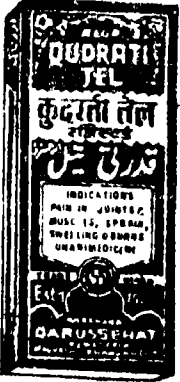
اب ہم اس مسئلہ کے سب سے افسوسناک پہلو پر
آتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی ٹریجڈی پر مگرمچھ کے آنسو بہانے
والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اپنے ہی مادر وطن میں انھوں نے
کتنی جگہ جمہوریت کا قتل عام کیا ہے۔ ایک جیتی جاگتی مثال
ہمارا ایک صوبہ مغربی بنگال ہے۔ مرکز بالکل نہیں چاہتا کہ
وہاں پر عوامی نمائندوں کی حکومت قائم ہو بلکہ ہمیشہ اسے
مرکز کے زیر انتظام رکھنا چاہتے ہیں اور یہ مرکزی دور حکومت
بنگال کے عوام کے لئے ایک بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ سے
کم نہیں ہے۔ آج بنگال میں سڑکوں پر لوگ کم اور فوج کے
جوان زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ بنگال میں آج بندوق کا
راج ہے۔ انسانیت ماتم کررہی ہے۔ نوکیلے بوٹ، بم
اور سنگینیں کب کس کی قسمت ہوں گی۔ کوئی نہیں جانتا۔ ماؤں
کے چہرے افسردہ ہیں۔ بیٹے، بنگال کے نوجوان پریشان

اور اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ حال ہی کے
الہ ارتی چناؤ کے ساتھ ہی ساتھ مغربی بنگال اسمبلی
الیکشن بھی ہوئے تھے۔ اور ان الیکشنوں کے بعد ایک
یشن حکومت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس کے سربراہ
ے مکرجی تھے۔ لیکن مرکز نے اسے زیادہ دن نہیں چلنے دیا۔
چیف منسٹر نے مرکز کے مشورہ سے اپنی حکومت کا استعفیٰ
ی کر دیا۔ اور اس کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ مرکز کا
ں پھر راج ہو جائے۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ (۴) ۳۵۶
تحت کسی بھی صوبہ میں صدارتی حکومت (مرکزی حکومت)
سال سے زیادہ نہیں چل سکتی۔ چنانچہ بنگال میں جمہوریت
ساتھ ایک بہت ہی شرمناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یہ
ب کچھ اس سرزمین پر ہو گا جس نے گاندھی، نہرو، ٹیگور
نم دیا۔ شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا ہو گا۔ کیوں کہ تین
ل تک صدارتی حکومت کے قائم رہنے کے بعد اس کا
ی بھی ہندوستانی صوبہ میں جاری رہنا غیر قانونی ہو جاتا
۔ تو اس سے بچنے کے لئے بھی ایک راہ تلاش کر لی گئی ہے۔
ڈھائی سال تک صدارتی حکومت قائم رکھی جاتی ہے۔
ں کے بعد ایک الیکشن کیا جاتا ہے اور جو حکومت قائم ہوتی
ے چند ہی مہینوں میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں
اس صوبائی حکومت کے لئے سوائے اس کے اور کوئی
رہ نہیں رہتا کہ وہ استعفیٰ دیدے۔ اور صدارتی حکومت
ے لئے راستہ صاف کر دے۔ یہ سب کچھ آخر کیا ہے؟ یحیٰی
ں بنگلہ دیش میں کیا کرنا چاہتا تھا؟ وہ چاہتا تھا ڈکٹیٹر
ب عوام پر۔ وہ چاہتا تھا کہ کہیں عوام کے چنے ہوئے
ومت نہ کرنے لگیں۔ ہم آج مغربی بنگال میں کیا کر رہے ہیں
...... شاید وقت ہی فیصلہ کرے گا۔

آخر میں ایک خبر الجمعیۃ سے نقل کی جا رہی ہے۔ شاید
یہ کچھ کام کی ہو۔

## اب بنیے پناہ گزینوں کو لوٹ رہے ہیں

۷ رجولائی ........ سرحدی علاقوں میں بدقسمت پناہ گزینوں سے پچاس فی صد کم پر مویشی، برتن وغیرہ فروخت کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی اشیاء ۳۰٪ سے ۴۰٪ زیادہ قیمت پر پناہ گزینوں کو خریدنے پر مجبور کیا جاتا ہے...... پیتل کے برتن چار یا پانچ روپے کلو میں ہی خرید لئے جاتے ہیں۔ مویشی صرف چند روپوں میں بک جاتے ہیں۔ دوکاندار بھی خوب لوٹ رہے ہیں۔

• •

بقیہ لٹ فکر

کی گورننگ باڈی کے چیئرمین مسٹر بھرت رام نے مضحکہ خیز طور پر لکچرار کی شادی سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ اور ساتھ ہی وائس چانسلر کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی سے بھی چشم پوشی کی ہے۔ اور وائس چانسلر کے اس بیان کے (جب تک کمیٹی اپنی رپورٹ نہ دے تو کالج کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔) بارے میں فرمایا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم کوئی کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ اور جب لکچرار نے استعفےٰ دے دیا تو سارا معاملہ ختم ہوگیا۔"

معلوم ہوا ہے کہ جب وائس چانسلر ڈاکٹر سروپ سنگھ کو مذکورہ لکچرار کے خلاف بہت سی شکایتیں موصول ہوئیں (جو لکچرار کو ہٹانے کی مبینہ سازش کا ایک حصہ تھی) تو انھوں نے ۲۳ اپریل ۸۱ء کو معاملہ کی چھان بین کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کردی تھی۔

اب اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ لکچرار کے خلاف پڑھانے کے قابل نہ ہونے کا الزام غلط ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا بھی [illegible] ہے کہ ان کو ہٹانے میں فرقہ وارانہ جذبہ کارفرما تھا۔ [illegible] نے مشورہ دیا ہے کہ چونکہ اختلاف اور جھگڑے [illegible] داغ بیل پڑ گئی ہے اس لئے مناسب ہے کہ [illegible] تبادلہ کسی اور کالج میں کردیا جائے۔

جہاں تک کمیٹی کے مشورہ کا تعلق ہے وہ نہایت قابل قبول ہے۔ لیکن اس کی نظر میں نہ تو ان کو اس لئے الگ کیا گیا ہے کہ ان کی پڑھائی غیر اطمینان بخش تھی۔ اور نہ ہی ان کو ہٹانے کا سبب فرقہ وارانہ جذبہ ہے۔ تو پھر وہ کیا بات تھی جس نے گورننگ باڈی کو انھیں ہٹانے پر مجبور کیا؟ اس کا جواب رپورٹ میں کہیں نہیں ملتا۔

اور ابھی ہنوز تشریح طلب ہے۔ در حقیقت تحقیقاتی رپورٹ سے انحراف کمیٹی کی اخلاقی پستی کی غمازی کر

## اردو، فارسی میں صنف نازک سرفہرست

امسال دلی یونیورسٹی کے اردو اور فارسی ایم۔اے کے نتائج میں سرفہرست مس زینب بیگم نے ۴۹ نمبر [illegible] دوسرے تمام طلبہ و طالبات کو مات دی ہے۔ (پریویس) کے امتحان میں بھی پچھلے سال انھوں نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے۔ اور فارسی میں مسز نجمہ مزمل نے ۵۱۸ نمبر حاصل کر کے دوسرے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ محترمہ نجمہ صاحبہ [illegible] کی مجلس ادارت سے بھی منسلک ہیں۔ البتہ شعبہ [illegible] (جو بدقسمتی سے تاہنوز صنف نازک کی آمد سے محروم ہے) میں جناب انیس الرحمٰن صاحب نے ۵۲۰ نمبر لے کر فرسٹ ڈویژن اور امتیازی حیثیت حاصل کی۔ [illegible] بی۔اے۔ آنرز میں بھی سب سے زیادہ نمبر حاصل [illegible] ہم تینوں کو ان کی شاندار کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور آئندہ بھی کامیابی و کامرانی کے لئے دعا کرتے ہیں۔

ادارہ

...دا ان کی مدد کرتا

جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں

شا

## جو کچھ بھی اس زمین پر ہے فانی ہے
## صرف خدا کی ذات باقی ہے۔ (قرآن)

اپنے عزیز از جان

حافظ تنویر الحسن مرحوم

کے لئے قارئین سے دعائے مغفرت کا طالب ہوں۔

جو اتوار ۲ر جون ۱۹۷۱ء کو عالم نوجوانی

میں ایک حادثہ کا شکار ہو گئے اور اپنے

پسماندگان کو روتا بلکتا چھوڑ گئے۔

**انا للہ وانا الیہ راجعون**

عتیق صدیقی

# پڑھنے والوں سے

آپ شاہجہاں کا ہر ماہ مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں آپ کو بہت سی چیزیں ایسی ملتی ہیں جو آپ کی نظر میں بہت اچھی ہیں۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو اچھی تو ہیں لیکن اگر ان کو آپ کے خیال میں دوسرے انداز سے پیش کیا جائے تو بہت اچھی ہو سکتی ہیں۔ اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا آپ کی نظر میں نہ ہونا بہتر ہے۔ اس کے علاوہ "شاہجہاں" میں آپ کو کچھ چیزیں ایسی نہیں ملتی ہیں جن کا اس میں ہونا آپ کی نظر میں اشد ضروری ہے۔

اس سلسلے میں ہماری آپ سے درخواست ہے کہ اپنی گراں قدر رائے جلد از جلد ارسال فرمائیں۔ اور "شاہجہاں" کو بہتر سے بہتر بنانے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔

ادارہ

# انتقام

مس شاہینہ خان
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

تم کو یہ لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں میرا قلم لرز رہا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور...... اور...... بہت کوشش کے باوجود بھی تم کو یہ نہیں لکھ پا رہی ہوں کہ میری تم سے محبت ایک دھوکہ تھی۔ ایک فریب تھی۔ میں نے تمہیں کبھی دل سے نہیں چاہا۔ کبھی میں نے تمہارے خواب نہیں دیکھے اور (جیسا کہ میں پہلے لکھتی رہی ہوں) نہ ہی کبھی تم میری تنہائی کے ساتھی بنے۔ محض قلمی دوستی کے سہارے میرا تمہاری طرف اس طرح بڑھنا تم سے محبت یا انس کے سبب نہیں تھا۔ حالانکہ قلمی دوستی کے کالم میں چھپی میری تصویر دیکھ کر تم نے ہی دوستی کی شروعات یہ لکھ کر کی تھی کہ میری شکل تمہاری مرحومہ دوست سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور میں نے خود آہستہ آہستہ اپنی تحریر کے ذریعے تمہارے دل سے تمہاری دوست کی یادوں کو کھرچ کر پھینک دیا اور اس میں اپنے لئے وہ جگہ منتخب کی جو مرد کے دل میں اس کی محبوبہ یا شریک حیات کا ہی حق ہوتی ہے۔ اب جب کہ تم میرے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر وقت میری تصویر کو دل سے لگائے رہتے ہو اور بقول تمہارے خود میں تمہارے دل و دماغ پر بری طرح مسلط ہوں۔ اب میرا یہ لکھنا کہ میری محبت ایک دھوکہ تھی تمہیں پاگل بنانے اور تباہ کرنے کے لئے کافی ہے جاوید تم سوچو گے کہ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں۔ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ میں تم سے کس بات کا انتقام لے رہی ہوں۔ اور مجھے تمہیں تباہ کر کے یا پاگل بنا کر کیا ملے گا؟ تو سنو جاوید! میں نے تمہیں آج تک دیکھا نہیں ہے۔ صرف خطوں کے ذریعے ہی تمہاری طرف اس تیزی سے بڑھنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں یا خدانخواستہ تم کو اپنانا چاہتی ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بالکل درست ہے کہ تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا اور میں تم سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتی تھی۔ اور نہ ہی تم سے میری کوئی دشمنی تھی۔

تم اب یہ کہو گے کہ جب کوئی ایسی بات نہیں تھی تو پھر مجھے اس جگہ لا کر کیوں چھوڑ دیا جہاں سے نہ آگے جا سکتا

ہوں اور نہ ہی واپس لوٹ سکتا ہوں۔ جاوید یہی سوال
میں نے ندیم سے اس وقت کیا تھا جب وہ مجھ کو اس سے بھی
آگے...... بہت آگے...... جب منزل دو ہاتھ رہ گئی تھی
چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ندیم جس کی ایک دیوتا مان کر میں نے پوجا
کی تھی۔ اپنی کشتیٔ حیات کا ناخدا سمجھ کر عبادت کی تھی۔ اور...
اور...... جس کو میں نے اپنا سب کچھ دے دیا تھا......
سب...... کچھ......

اور جب شاہد کے دنیا میں آنے میں صرف دو ماہ
رہ گئے تو میرا یہ دیوتا قدموں میں جھکے میرے سر کو اپنے
آہنی پاؤں کے ٹھوکر سے زخمی کر کے چلا گیا۔ میرا یہ ناخدا
میری کشتی کو منجدھار میں پھنسا کر چلتا بنا۔ اس وقت میں نے
بھی اس سے یہی پوچھا تھا۔ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا۔ تم
مجھ سے کس بات کا انتقام لے رہے ہو۔ مجھے برباد کر کے
تمہیں کیا ملے گا؟ اس وقت جانتے ہو اس نے کیا جواب دیا۔
اس نے کہا میں مجبور ہوں ثمینہ (ثمینہ میرا اصلی نام ہے۔ اب
حالات نے میرا نام بدل کر فرزانہ رکھ دیا ہے) میں کچھ نہیں کر سکتا۔
وہ مرد ہوتے ہوئے بھی مجبور تھا۔ مرد! جو عورت پر حکومت
کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ جو پریشانیوں اور تکلیفوں کو
صرف روایتًا جانتے ہیں۔

ہمارا سماج جس میں ہم سانس لیتے ہیں ایک ایسے گناہ
کے لئے صرف عورت کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے جو بغیر کسی مرد
کے ممکن نہیں اور جس میں مرد بھی اتنا ہی ذمہ دار (بلکہ اس
سے بھی زیادہ) ہوتا ہے جتنا کہ کمزور و نادار عورت۔ یہ
سماج مرد کو معاف کر دیتا ہے اور بے چاری مظلوم عورت
پر ظلم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا ہے۔ میں بھی تو
ایک عورت تھی۔ کمزور اور احساس کمتری کی ماری بیچاری
عورت۔

؎ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں۔ کے مصداق
مرد اور سماج کا ظلم سہتے سہتے مجھے مرد کی کمزوری معلوم ہو گئی
پھر میں نے اپنی بے چارگی کو خیرباد کہہ کر خود کو احساس کمتری
کے آہنی پنجوں سے نکالا اور...... اور...... مرد سے اپنی
بے عزتی کا، اپنی بے حرمتی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

اب اخبارات کے قلمی دوستی کے کالموں میں اپنا
فوٹو چھپواتی ہوں۔ بڑے بڑے اور بدنام ہوٹلوں میں جاتی
ہوں اور طرح طرح کے مردوں کو اپنے حسن کے ذریعے
اپنی تحریر کے ذریعے دامِ محبت میں گرفتار کرتی ہوں۔ اور
پھر...... پھر جب وہ اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جس پر
کہ تم پہنچ چکے ہو تو میں زندہ مچھلی کی طرح ان کے ہاتھ سے
پھسل کر اپنا دامن چھڑا لیتی ہوں۔ وہ تڑپتے ہیں۔ بلبلاتے
ہیں۔ مچلتے ہیں۔ ان کی اس تڑپ اور بلبلاہٹ کو دیکھ کر
میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے
میری مرحومہ ماں کی سرگرداں روح کو قرار آگیا ہو۔ چین
آگیا ہو۔ میری بیوہ اور غریب ماں جو میری بدنامی برداشت
نہ کر سکی اور اس گندے سماج کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
چلی گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تڑپنے والا کوئی
دوسرا مرد نہیں بلکہ ندیم ہے۔

اس کو اسی طرح تڑپتا چھوڑ کر دوسرے کی طرف
بڑھ جاتی ہوں۔ پھر تیسرا۔ چوتھا۔ اور اسی طرح تم پچیسویں
مرد ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں تمھیں یہ خط لکھتے ہوئے میرا قلم
لرز رہا ہے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی ہے۔ شاہد
میرے پاس ہی بیٹھا ہوا ہے۔ اور اپنی توتلی زبان سے
پوچھ رہا ہے۔ "ممی! کیا پاپا کو خط لکھ رہی ہو؟" مجھے خط
لکھتے دیکھ کر یہ ہمیشہ پوچھتا ہے تو میں کہہ دیتی ہوں کہ
تمھارے پاپا کو لکھ رہی ہوں۔ "ممی! ان کو یہ لکھنا۔"

شاہد بولے جا رہا ہے۔ "کہ اب جلدی سے آجاؤ ورنہ
میں کبھی نہیں بولوں گا۔" "ہاں ہاں لکھ دیا اب خاموش
ہوجاؤ۔" یہ کہہ کر میں اس سے اپنا پیچھا چھڑا لیتی ہوں۔
جاوید، تم ہی بتاؤ کہ میں اس کے علاوہ اور کیا کہوں۔

**جاوید اب میں مرد سے انتقام لیتے لیتے تھک گئی**
ہوں۔ مجھے مرد پر رحم آنے لگا ہے۔ اب میں اپنے البم کے
آخری اور خالی ورق پر تمہاری تصویر لگانا چاہتی ہوں۔
تم سے پہلے چوبیس مردوں کے فوٹو اور حالات سب اس
البم میں درج ہیں۔ اس آخری صفحہ پر تمہاری تصویر لگا کر
اس البم کو بند کر دینا چاہتی ہوں۔ ابھی میں یہ خط ختم بھی کرنے
پائی تھی کہ شاہد نے ایک لفافہ لا کر مجھے دیا۔ پتہ تمہارے
ہاتھ کا لکھا دیکھ کر میں فوراً کھولتی ہوں۔ اس میں تمہارا
فوٹو اور چھوٹا سا ایک پرچہ ہے۔ کسی مرد کا فوٹو میرے
لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے میں پرچہ پڑھتی ہوں۔
تم نے اس میں مجھے اپنانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ تم
میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجھ سے شادی
اس لئے کرنا چاہتے ہو کہ تم اپنی ایک سابقہ بے گناہ محبوبہ
کو ٹھکرانے کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ جس نے اسی وجہ سے
خودکشی کر لی تھی۔ شادی اور دیگر بات چیت کے
لئے تم جلد ہی میرے پاس آرہے ہو۔ خط ختم کر کے میں
نیچے پڑا ہوا تمہارا فوٹو اٹھاتی ہوں۔ اف ۔۔۔! میرے خدا۔
یہ کیا ۔۔۔۔ جاوید ۔۔۔۔ ندیم ۔۔۔۔۔ ندیم ۔۔۔۔۔۔ جاوید
۔۔۔۔ یہ تم ہو ندیم۔ کاش! تمہیں معلوم ہوتا میں مری
نہیں زندہ ہوں۔ فرزانہ نہیں ثمینہ ہوں۔ تمہاری ثمینہ۔
"کیوں کیا ہوا ممی؟" مجھ کو خاموش دیکھ کر شاہد بولا۔
"کیا پاپا کا خط ہے؟ کیا لکھا ہے انھوں نے۔ کیا آرہے
ہیں۔ کب آرہے ہیں۔ بولو۔ تم بولتی کیوں نہیں ممی؟" شاہد
مجھے جھنجوڑ رہا ہے۔

●●

میں حیوان کی طرح ننگا پھرتا ہوں
میں حیوان کی طرح خون پیتا ہوں
میں حیوان کی طرح خون پلاتا ہوں
میں حیوان کی طرح خون میں نہاتا ہوں
میں حیوان کی طرح خون بہاتا ہوں
میں حیوان کی طرح بھائی کو مارتا ہوں
میں حیوان کی طرح کسی کی عزت نہیں کرتا
میں حیوان کی طرح اپنے بچوں کو مار دیتا ہوں
میں حیوان کی طرح کھاتا ہوں
میں حیوان کی طرح پیتا ہوں
غرض کہ
میں حیوان کی طرح زندگی بسر کرتا ہوں
پھر بھی
میں انسان کہلاتا ہوں
صرف اسلئے کہ
میرے پُرکھا انسان تھے

# ہدیۂ تہنیت

نجمہ خاتون صدیقی ایم۔اے۔
رکن مجلس ادارت شاہ جہاں
کی شادی
محمد مزمل ایم۔اے۔بی۔ایڈ
کے ہمراہ ۴ر جولائی ۱۹۷۱ء کو
دہلی میں
نہایت تزک و احتشام کے ساتھ
بحسن و خوبی
عمل میں آئی
ہم دونوں کی زندگی کے
ہر شعبہ میں کامیابی کے لئے
دعا گو ہیں۔

ادارہ

# رُوحی

*سراج الدین صدیقی - (ایف-ایم-بی-ایس)
پھولپور- الٰہ آباد

سنئے!
فرمائیے!
ابھی فرمانا بھی پڑے گا؟
مجھے علم غیب نہیں جو بغیر فرمائے آپ کا مقصد سمجھ سکوں۔
مجھے افسوس ہے اس کا۔
کس بات کا؟
آپ اتنے نادان کیوں بن رہے ہیں؟
میرے سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ آخر بات کیا ہے؟
کیا واقعی مجھے کہنا ہی پڑے گا؟
اگر کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے تعلق رکھتی ہے اور تم کہنا چاہتی ہو تو ضرور کہو۔
کہوں؟
کیا نکاح کی طرح بغیر تین مرتبہ اقرار کئے تمہیں یقین نہیں آئے گا؟
اچھا سنئے پھر۔

میں نے سنا ہے کہ عالم وجود میں آنے سے پہلے عالم ارواح میں روحیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی رہتی ہیں۔ اور ان کا بھی ایک حلقۂ احباب اسی طرح ہوتا ہے جیسے دنیا میں اور......
آپ اپنا مقصد کہئے۔ مجھے فلسفہ پڑھنے کی فرصت نہیں ہے۔
میں فلسفہ کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ بلکہ ایک حقیقت آپ کے سامنے کہہ رہی ہوں۔ بشرطیکہ آپ سننا گوارا کریں
اچھا کہہ بھی ڈالو جو کچھ کہنا ہو۔
آپ توبیچ میں بات کاٹ دیتے ہیں۔
کیا کہوں؟
ارے! تم تو ناراض ہوتی جارہی ہو۔
کیا کریں۔ آپ بات بھی تو ایسی ہی کرتے ہیں۔
اچھا بھئی معاف کرنا۔ اب نہیں بولوں گا۔ تم تو بس ذرا سی بات میں ناراض ہو جاتی ہو۔
آفاق......! تمہیں شاید نہیں معلوم کہ لوگ اپنے

ہی سے ناراض ہوتے ہیں۔ اپنوں ہی کا گلہ بھی کرتے ہیں۔

اور میں ....... میں تم کو اپنا ہی سمجھتی ہوں۔

تم تو جانے کہاں بہک گئی ہو۔ کہنا کیا چاہتی ہو؟ اسے کہو۔

اب کیا کہوں گی خاک۔ آپ نے تو موڈ ہی خراب کر دیا۔

---

روحی!

جی حضور!

مجھے اس کا بہت افسوس ہے کہ اس روز تم کچھ کہتے کہتے نہ کہہ سکیں اور اس کی وجہ شاید میں ہی تھا [illegible] جب تک مجھے معاف نہیں کرتیں اور وہ بات کہہ نہیں لیتی ہو مجھے سکون نہیں مل سکتا۔ لہٰذا اب تو مان جائیے اور اپنے لئے نہیں بلکہ میری خاطر اسے کہہ ڈالو۔

ارے! آپ اتنا سوچنے لگے۔ وہ تو ایک وقتی بات تھی۔

بہر حال جو بھی اب کہہ بھی ڈالو۔

میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ جب انسان ایک اجنبی سے ملتا ہے تو اکثر اس سے بات کرنے کو طبیعت چاہتی ہے۔ اور فلاسفروں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ........

دیکھو پھر تم نے فلاسفروں کی بات چھیڑ دی۔

جب تمھیں سننا نہیں تھا تو چھیڑا کیوں؟

اچھا کہو اب نہیں بولوں گا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ فلاسفروں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ عالم ارواح میں یہ روحیں آپس میں ایک دوست کی حیثیت سے رہ چکی ہوتی ہیں اور وہی روح جب کسی انسانی ڈھانچے میں ملتی ہے تو انسان پہلے ہی اجنبی ہو لیکن روح اس اجنبیت کو ختم کر کے اس دنیا میں بھی مل جانے کی کوشش کرتی ہیں۔

تو؟

تو کیا؟ کیا اب بھی آپ نہیں سمجھے؟

جی نہیں! در اصل میں فلسفہ سمجھ نہیں پاتا۔

اس میں فلسفہ کی کیا بات ہے؟

اچھا فلسفہ کی بات نہیں ہے تو نہ سہی۔ لیکن ذرا اس کی وضاحت تو کرو۔

وضاحت کی کیا ضرورت۔ بات صاف ہے کہ جب میں اس ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے آئی تھی تو جہاں [illegible] بہت سے لوگ [illegible] لیکن طبیعت نہ معلوم کیوں نہیں سے بات کرنے کو چاہ رہی تھی۔ اور [illegible] تم بھی [illegible] رہے تھے۔

[illegible]

آخر [illegible] سمجھتے ہو کہ [illegible] صرف [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] روحیں پہلے ہی [illegible]

[illegible] نہیں ہو کیا [illegible] ہیں؟

ہاں [illegible] تک تو نہیں۔ لیکن میں ایسا ملنا چاہتی ہوں۔ کہ ہم اور تم ایک ...... بالکل ایک ہو جائیں۔

روحی [illegible] یہ بات کہتے کیوں نہیں [illegible] روحیں آپس میں مل چکی ہوتی ہیں تو پھر ........ پھر روح ایک ہی ہوتی ہے اور قالب دو۔

آپ بالکل صحیح فرما رہے ہیں۔ اور اب یہ روحی صرف نام کی روحی رہ گئی ہے۔ یہ جسم اب روح سے خالی ہو چکا ہے۔

کے اس بو تھڑے میں آپ روح پھونکے۔
روحی! اب زیادہ نہ چھیڑو۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا ہے۔

---

آفاق!
کہو رحمان! کیسے آنا ہوا؟ بہت دن بعد دکھلائی
ہو۔
کیا کہوں یار۔ عجیب دام میں گرفتار ہوں۔
آخر کیا ہوا؟
یار کیا بتاؤں؟
ارے! تم تو دبلے بھی ہو گئے۔ خدانخواستہ بیمار
تھے؟
بیمار تو ہوں ضرور۔ لیکن ......!
لیکن کیا؟ کیا علاج نہیں کرایا؟
یار یہ مرض علاج سے نہیں بلکہ مسیحائی سے جائیگا۔
مسیحائی؟ عشق تو نہیں فرمانے لگے حضرت؟
دیوانہ صورت بنا رکھی ہے۔
اب جو کچھ بھی سمجھو۔ لیکن اتنا جان لو کہ میں اِک بلا
گرفتار ہوں۔ اور تم سے مدد لینے کی غرض سے آیا ہوں۔
میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟
خدمت نہیں بلکہ مسیحائی۔
لیکن میں تو مسیحا نہیں بلکہ ڈاکٹر ہوں صرف
ڈاکٹر۔
ہاں آفاق! تم صرف ایک ڈاکٹر ہو۔ اور ڈاکٹر
کام ہے مرتے ہوئے کو بچا لینا۔ ایک نئی زندگی دینا۔
اس وقت مرض عشق میں مبتلا ہوں۔ میری زندگی
تباہ ہو چکی ہے۔ میری دنیا لٹ چکی ہے۔ اور تم سے
نئی زندگی کا سوال کرنے آیا ہوں۔ تم مجھے مرنے سے
بچالو۔ مجھے نئی زندگی کی بھیک دو۔ ورنہ میں ...... میں
...... آفاق!...... !میرے دوست!......! تم سے
بڑھ کر میرا کوئی نہیں۔ تم چاہو تو مجھے جان بخش سکتے ہو۔ ورنہ
پھر...... پھر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔
آخر میں کیا کر سکتا ہوں؟
تم! تم مجھے زندگی عطا کر سکتے ہو۔ میری اجڑی دنیا
میں بہار لا سکتے ہو۔ اس کلی کو کھلا سکتے ہو جو کھلنے سے پہلے
مرجھانے جا رہی ہے۔
رحمان! معاف کرنا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔
آفاق! سوچتا ہوں صاف صاف کہہ دوں۔ پر ہمت
نہیں پڑتی۔
رحمان! کیا ایسا شخص بھی کوئی ہوگا جو ایسی حالت میں
اپنے دوست کے کام نہ آئے۔ اور میں ...... ! تم مجھ سے
اچھی طرح واقف ہو آج تک میں نے تمہاری کوئی بات ٹالی
نہیں۔ رد نہیں کی۔ اگر تمھیں اب بھی یقین نہیں آتا تو میں زبان
دیتا ہوں تم نے میرے ساتھ جو احسانات کئے ہیں وہ کبھی
بھلائے نہیں جا سکتے۔ والدین اور استاد کے بعد میرے
لئے چوتھی ہستی تم ہو جس کے احسان کو میں کبھی چکا نہیں سکتا۔
جب کہ میں تمہارے حکم پر جان تک دینے کو تیار ہوں۔ تو اب
اس سے بھی بڑھ کر کون سی چیز ہو سکتی ہے جسے میں پورا
نہ کر سکوں۔ بشرطیکہ وہ میری قدرت میں ہو۔ بولو۔ اب تو
بولو کہ کیا چاہتے ہو؟
آفاق! آج تک تم نے میری کوئی بات رد نہیں کی۔ اس
لئے میں تمہارا احسان مند ہوں۔ اور آج تم سے ایک بھیک
مانگتا ہوں۔ بھیک۔ مجھے دیکھو! غور سے دیکھو! دیکھو
میرا جسم روح سے خالی ہوا چاہتا ہے۔ اور یہ گوشت
کا لوتھڑا روح کے لئے بے قرار ہے۔ لیکن روحی کے لئے۔

بولو آفاق! آفاق........!

رحمان! یہ........یہ........ک.......ک....کیا کہہ رہے ہو؟

آفاق! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں صحیح کہہ رہا ہوں۔

رحمان! اتنا سخت امتحان؟

آفاق! یہ امتحان نہیں ہے۔ میں تو صرف بھیک مانگ رہا ہوں۔ بھیک۔ ایک زندگی کی۔ اب یہ تم پر ہے کہ مجھے زندگی دیتے ہو یا........؟

---

روحی! تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟

کیا اس میں بھی کچھ شک ہے؟

کیوں کرتی ہو؟

یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ یہ تو دل کی بات ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں دل تم پر آ ہی گیا۔ اور اب تو ایسا جی چاہتا ہے کہ تم پر ہر شے قربان کر دوں۔ یقین مانو آفاق! اب تمہارے بغیر ایک پل بھی گذارنا دشوار ہو جاتا ہے۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا جب ہم تم ایک... بالکل ایک ہو جائیں گے۔

روحی! میری تمہاری روحیں جب مل چکی ہیں تو پھر اب ایک ہونے کے کیا معنی؟

روحیں تو بہر حال ایک ہیں۔ اب صرف کچھ رسموں کے بندھن باقی ہیں۔

روحی! قبل اس کے کہ ہم دونوں پابندِ رسوم ہو کر ایک بندھن میں بندھ جائیں، کیا میں تم سے کچھ مانگ سکتا ہوں؟

آپ کا یہ حکم میری آنکھوں پر۔ جان بھی مانگ لیں تو حاضر ہے۔

روحی۔ میرا امتحان ہو رہا ہے۔ اب تک کسی بھی امتحان میں ناکامی نے بھول کر بھی میری طرف رخ نہیں کیا۔ اور آج......آج........

آفاق! کہو تو کیا بات ہے۔ کیسا امتحان؟ ارے یہ تمہاری آنکھیں کیوں نم ہو گئیں؟

روحی! یہ امتحان ہی اتنا سخت ہے کہ بتانے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ خوب رو لوں۔ شدید سے شدید غم پڑنے پر بھی میری آنکھ سے ایک قطرۂ آنسو نکلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ اور آج ............ روحی مجھے سہارا دو! سہارا!

آفاق! بس کرو! دیکھو میرا آنچل بالکل بھیگ گیا۔ کہیں مرد بھی اتنے نازک دل ہوتے ہیں۔ اور تم! تم تو ایک ڈاکٹر ہو۔ ڈاکٹر۔ جب تمہاری یہ حالت ہوگی تو مریض کی کیا حالت ہوگی؟ آفاق......! آفاق! اب بولو گے بھی۔ دیکھو میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔

روحی! کیا تم اسے برداشت کر سکو گی؟

آخر؟

رحمان کو تم جانتی ہو۔ اس نے میرے ساتھ جو احسانات کئے ہیں اس سے بھی تم اچھی طرح واقف ہو۔ آج اس نے میری دوستی کا امتحان لیا ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں اپنے اس امتحان میں بھی کامیاب رہوں تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔

آفاق! اب تو تمہارا درد میرا درد ہے۔ تمہارا امتحان میرا امتحان ہے۔ اور میں کب یہ چاہوں گی کہ امتحان میں کامیابی سے سرفراز نہ ہوؤں؟

روحی! تمہارا یہ احسان ہمیشہ میرے سر رہے گا۔ روحی! رحمان نے مجھ سے تمہیں کو مانگا ہے۔ روحی کو مانگا ہے۔ میری روح کو مانگا ہے۔

باقی صفحہ پر

شاہ جہاں دہلی

# اس کی زندگی

ہنس راج اُلفت

آنند بے حد اداس تھا۔ اس کے چہرے کی بشاشت اب سنجیدگی میں بدل چکی تھی۔ گہری سنجیدگی میں اور سرخ و سپید رنگت زردی میں۔ اس کی ہر وقت مسکراتی رہنے والی آنکھوں میں گہری یاسیت چھائی ہوئی تھی۔

۲۰ اپ ایکسپریس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ اُس کمپارٹمنٹ میں لوگ اس طرح بھرے پڑے تھے جیسے کسی ڈربے میں مرغے مرغیاں بند کر دی گئی ہوں۔ اوپر نیچے کی سبھی سیٹیں اسی طرح بھری ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ سیٹوں کے درمیان خالی جگہوں پر اور دونوں دروازوں کے آگے بھی لوگ بال بچوں سمیت بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔

نصف سے زیادہ شب بیت چکی تھی۔ گرمی کی شدت کم ہو چکی تھی اور ہوا کے جھونکوں میں خنکی آ چلی تھی۔ نیند مسافروں پر اپنا غلبہ جما رہی تھی اور لوگ اونگھ رہے تھے۔

اُس کی برتھ کے سرے پر ایک لڑکی اپنے شوہر کی آغوش میں منہ چھپائے سو رہی تھی۔ جس کے سر اور پشت پر اُس کا شوہر پیار سے ہاتھ تھپ تھپا رہا تھا۔ وہ جوان تھا۔ لیکن خوب صورت تھا نہ قبول صورت اور نہ ہی بدصورت۔ بس یونہی سا حلیہ تھا اُس کا۔ جب کہ اُس کی بیوی قبول صورت اور پرکشش جسم کی مالک تھی۔

سامنے کی سنگل برتھ پر ایک سانولے سے رنگ کی عورت اپنے بلاؤز کے نچلے بٹن کھولے۔ گود میں لئے بچے کو دودھ پلاتے ہوئے سو گئی تھی۔ اُس کا بچہ بھی دودھ پیتے پیتے سو گیا تھا۔ اور اس کی ادھ ننگی چھاتی دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔

اس کی پشت پر یا دوسری سیٹ پر ایک دوسرا جوڑا ایک دوسرے کے جسم کا سہارا لئے خواب ناک سہانی وادیوں میں کھو گیا تھا۔ ایک دوسرے کے جسم کی حرارت، ملائمت اور گداز سے دونوں پُرکیف لمحات سے مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں لیکن مسکراہٹ کی کلیاں دونوں کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھیں۔ اور ان بشاش بشاش اور مسرور جوڑوں میں وہ اداس اور اکیلا تھا۔

ایکسپریس دھوئیں کے بادل اڑاتی، گرد و غبار اچھالتی اور حشر بپا کرتی ہوئی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔

چھوٹے اسٹیشن، وہاں کے کوارٹر، دیہات اور جنگل کے تناور پیڑ بڑی تیزی سے پیچھے کی جانب بھاگ رہے تھے۔ اس کے خیالات کا رخ بھی پیچھے کی جانب مڑ گیا۔ وہ خیالوں میں گم سوچ رہا تھا۔ اگر میری ماں درمیان میں لین دین کا جھگڑا کھڑا نہ کرتیں، جہیز کی مزید مانگ کر کے لڑکی والوں کو پریشان کر کے رشتہ توڑنے پر مجبور نہ کر دیتیں تو آج وہ بھی ایک نئی زندگی سے آشنا اور ایک نئی منزل سے ہم کنار ہوتا۔ اس کی بے کیف، خشک اور سونی زندگی میں بھی آج بہاریں رقصاں ہوتیں۔ تپتے ہوئے کسی صحرا کی سی اس کی زندگی آج بہار بداماں ہوتی۔ لیکن برا ہو سماج کے ان فرسودہ رواجوں اور برائیوں کا کہ ان کی وجہ سے کتنی ہی زندگیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ جہیز کی لعنت کی وجہ سے کتنے ہی بدنصیب باپ اپنے سر چھپانے کے ٹھکانوں تک کو کوڑیوں کے مول بیچ دیتے ہیں۔ جن کے پاس یہ بھی نہیں ہوتا وہ اپنی لاڈوں پلی بیٹیوں کی آہ وزاری اور سوگواری برداشت نہ کر کے وقت سے پہلے ہی گھُل گھُل کر راہیٔ ملکِ عدم ہوتے ہیں۔ اور پس ماندگان بیچارے مزید مصیبتوں اور مسلسل عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اگر لڑکی کے والد کی منت سماجت، خوشامد اور میری مخالفت اپنا کچھ اثر دکھا دیتیں۔ تو آج ریشما میرے سپنوں کی رانی ہوتی۔ آج اُس کی محبوب بھی اُس کی ہم سفر ہوتی۔ وہ دونوں بھی ان مسرور جوڑوں کی طرح پہلو بہ پہلو خوشیوں کے ساگر میں غوطہ زن اور مسرتوں کی مے سے سرشار سیر و تفریح سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے۔ وہ بھی ریشما کے حسن کی شراب سے مست و مدہوش ہو کر اپنی زندگی کی ساری بے کیفیوں اور تلخیوں کو بھول جاتا۔ لیکن وائے ری محرومی! سب کچھ درہم برہم ہو گئے سپنے بکھر گئے۔

آرزو کی کلیاں بن کھلے مرجھا گئیں۔

بہاریں زندگی کے چمن میں آنے سے پہلے ہی مڑ گئیں۔

اُس برتھ والے جوڑے نے اب اپنی پوزیشن بدل لی تھی پہلے وہ اپنی شریکِ حیات کو اپنی آغوش میں سُلا رہا تھا۔ مگر اب پو پھٹتے پھٹتے عاشق اپنی محبوب کی ران پر سر رکھ کر میٹھی نیند سو گیا تھا۔ اس کی محبوب نے اس کے سر کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

لیکن اُس کا کوئی ہم سفر نہیں تھا!

اُس کا کوئی ہمراہی نہ تھا!

اُس کا محبوب تھا، لیکن سماج نے، اُس کے حرص اور لالچ نے دونوں کو ایک دوسرے جدا کر دیا تھا۔ اور وہ کسی بھی حالت میں اپنے ماں باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہ کر سکا تھا۔

اُس کی زندگی اب بھی پہلے کی طرح خشک اور بے کیف تھی۔ وہ پیاسا تھا اور اکیلا بھی۔ اُس کی زندگی میں بہاریں آتے آتے رہ گئی تھیں۔

اور دہرہ دون ایکسپریس اپنی پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی۔

●●

درخواست:

جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ کا ہم رشتہ ہونا ضروری ہے۔

شہاب عراقی

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی


پتھروں کی مورتی میں آنکھ شیشے کی لگاؤ
جس طرح بھی ہو زمانے کو تماشائی بناؤ

زندگی اِک حادثہ ہے حادثوں میں ہے اسیر
بن سکے جیسے بھی اپنے زخم کی شمعیں جلاؤ

آنسوؤں کی جھیل ہی کیوں اس طرح ساکن رہے
دائرہ بننے لگے ایسا کوئی پتھر گراؤ

شیش محلوں سے پرے اب ایک بھی شیشہ نہیں
قمقموں کی روشنی گر مل سکے تو چاٹ جاؤ

رات کی تاریکیوں میں کیوں جدا ہو کر رہیں
دھوپ کی شدت سے ان پرچھائیوں کو مت بچاؤ

خواب ہی کی شکل میں رہنے دو خوابوں کو شہاب
دھند بڑھ جائے گی تو تعبیر کے پیچھے نہ جاؤ

# غزل

محمد شفیق ظفر مراد آبادی
طلبہ کالج قرول باغ نئی دہلی

سکوں نظارے فریب دیتے ہیں
تیری نظر کے اشارے فریب دیتے ہیں

کسی کی یاد میں گم کرکے بارہا مجھکو
مسرتوں کے کنارے فریب دیتے ہیں

کہیں پہ لالہ و گل ہیں کہیں پہ مہر و اختر
قدم قدم پہ نظارے فریب دیتے ہیں

تمہاری مانگ میں افشاں جبیں پہ لٹ سیاہ
گھٹا میں چاند ستارے فریب دیتے ہیں

جوان سے بھیک محبت کی مانگتا ہو ظفر
وہ خود ہی ہاتھ پسارے فریب دیتے ہیں

# بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان

عتیق صدیقی

کہا جاتا ہے کہ تاریخ واقعات کو دہرایا کرتی ہے۔ مشرقی بنگال میں تاریخ نے جتنی جلد واقعات کو دہرایا ہے اس کی دوسری مثال مشکل سے ہی مل سکے گی۔ ۱۹۰۵ میں برطانوی اقتدار نے اپنے سامراجی مفاد کو تقویت پہنچانے کے لئے بنگال کو ہندو مسلم علاقوں میں تقسیم کیا تھا۔ بنگالیوں نے بلا تفریق مذہب اس تقسیم کو ختم کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اسی شورش نے بنگال میں وحشت پسند تحریک کو جنم دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان گیر تحریک بن گئی۔ پانچ سال تک منظم [illegible] رہنے کے بعد بالآخر [illegible] مصالحت ہوئی اور حکومت نے ۱۹۱۵ء میں اس تقسیم کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس واقعہ کے صرف ۳۷ سال بعد برطانوی سامراج نے صرف بنگال ہی کو نہیں بلکہ شمالی مغربی ہند کو بھی دو حصوں میں بانٹ دیا اور آزاد برصغیر میں دو مملکتیں وجود میں آ گئیں۔

پاکستان کا ایک مبہم سا تخیل سب سے پہلے ڈاکٹر محمد اقبال نے دیا تھا جو سیاستدان نہیں بلکہ شاعر تھے۔ ان کے تصور کی آنکھوں نے ہندوستان کے شمال و مغرب (پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ) میں ایک وفاقی ریاست کو تشکیل پاتے دیکھا تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد غالباً علامہ اقبال ہی کی تحریک پر چودھری رحمت علی نے آکسفورڈ میں بیٹھ کر پاکستان کا نقشہ تیار کیا۔ مسلم لیگ نے اسی منصوبہ کو سامنے رکھ کر ۱۹۴۰ کے [illegible] پاکستان [illegible] تھا اور [illegible] علاقوں [illegible] جن پر آگے چل کر پاکستان کو تشکیل ہونا تھا۔ اس تجویز میں ڈاکٹر اقبال اور رحمت علی کے منصوبوں پر اتنا اضافہ ضرور کیا گیا تھا کہ مشرقی ہند کے مسلم اکثریتی علاقوں، بنگال اور آسام کا اس میں ذکر کیا گیا تھا۔ جن کی ایک الگ وفاقی ریاست بنتی تھی۔ اس تجویز کی متعلقہ عبارت یہ ہے۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی جچی تلی رائے
یہ ہے کہ وہ علاقے جہاں تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت
ہے جیسے کہ شمالی و مغربی اور مشرقی طبقوں میں ہے ان کو
ایک جا کر کے آزاد مملکتیں بنائی جائیں اور ان میں شامل ہونے
والے علاقے خود مختار اور بااقتدار رہوں۔"

اس تجویز کے مطابق مسلم اکثریت کی دو آزاد وفاقی ریاستیں
وجود میں آئیں تھیں۔ ایک شمال و مغرب میں دوسری مشرقی
ہند میں لیکن ۱۹۴۷ میں جب تقسیم کا آخری فیصلہ کیا گیا تو ان
دونوں منطقوں کو جو ایک دوسرے سے دو ہزار کلومیٹر کی
دوری پر تھے اور جن میں نسلی، لسانی، ثقافتی اور جغرافیائی
ہم آہنگی بھی نہ تھی۔ ایک وحدانی ریاست بنادیا گیا۔

پاکستان کے ان منطقوں کے غیر فطری اتحاد کو کچھ عرصہ
تک برقرار رکھنے کے لئے کم از کم دو باتوں کی اشد ضرورت
تھی جسے پاکستان کے ارباب حل و عقد نے یکسر نظر انداز
کیا۔ پہلی اور سب سے اہم شرط یہ تھی کہ مشرقی پاکستان
کی اکثریتی حیثیت کو تسلیم کیا جاتا جہاں پاکستان کی ۵۶ فیصدی
آبادی رہتی ہے۔ پاکستان کے داخلی و خارجی معاملات
میں مشرقی بنگال کی مؤثر آواز ہونی چاہئے تھی۔ پاکستان
کے ترقیاتی منصوبوں میں مشرقی بنگال کو آبادی کے تناسب
سے حصہ ملنا چاہئے۔ پاکستان نے ان میں سے کوئی بات
بھی نہیں کی۔ اس کے برعکس مراعتیں پاکستان کے اقلیتی حصہ
مغربی پاکستان کو ملیں۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم شرط یہ تھی کہ ہندوستان
کے ساتھ ساتھ پاکستان دوستانہ اور عزیزانہ تعلقات
رکھتا۔ کیونکہ پاکستان کے دونوں منطقوں کے درمیان
خشکی کی راہ سے رابطہ ہندوستان ہی کی دوستی سے قائم
رہ سکتا تھا۔ لیکن پاکستان کی ہر حکومت نے ہندوستان
کے ساتھ تعلقات خراب سے خراب تر کرنے میں اپنے
پیش رو پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ یحییٰ خان نے تو
اس میدان میں سب کو مات کر دیا۔ برسر اقتدار آتے ہی
انھوں نے ہندوستان کے ساتھ سیاسی ہی نہیں بلکہ سیا
تعلقات منقطع کرنے کی مہم شروع کر دی۔ دونوں ملکوں
کے درمیان آمد و رفت کے وسائل محدود کرنے کی حد تک
انھوں نے محدود کر دیئے۔ کتابوں، رسالوں اور اخبار
کا تبادلہ بھی یکسر بند ہے۔ یہ ساری باتیں یحییٰ خان کے
مزاج کی انتہا پسندی اور اپنی فوجی قوت پر بے انتہا
بھروسہ کرنے کی غمازی کرتی ہیں۔ مشرقی بنگال کے ساتھ
یحییٰ خان کے تصادم کی تہ میں بھی ان کا یہی مزاج
کارفرما ہے۔

برسر اقتدار آنے کے وقت سے لے کر پاکستان
کے پہلے عام انتخابات تک یحییٰ خان کے اقدامات
نیز ان کے بیانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں اس
کا کلی احساس ہے کہ پاکستان اپنے قیام کے وقت
سے سیاسی قحط سالی کا شکار ہو رہا ہے۔ جس کا واحد
علاج یہ ہے کہ ملک میں ایک نمائندہ سول حکومت کا قیام
جلد سے جلد عمل میں آئے۔ لیکن انتخابات کے نتائج شاید
ان کی توقع کے خلاف ظہور میں آئے اور وہ اپنے ہوش
و حواس کھو بیٹھے۔ چنانچہ اس کے بعد ان کے جتنے بیانات
آئے ان سے دو باتوں کا گمان ہوتا تھا۔ ایک تو یہ کہ
شاید وہ اقتدار سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے۔
دوسرے یہ کہ مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان پر
یا یوں کہئے کہ اقلیت کو اکثریت پر جو بالادستی اب تک
حاصل رہی ہے اس کو وہ ہاتھ سے جانے دینا نہیں
چاہتے۔ اس حقیقت کا احساس سب سے زیادہ

شیخ مجیب الرحمٰن کو تھا۔ جو عام انتخابات کے بعد
پاکستان کے مسلّم اور واحد لیڈر کی حیثیت سے سامنے
آئے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے احساسات سے یحییٰ خان
بھی بے خبر نہ تھے۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں
قیام پاکستان کے وقت سے جو کشمکش شروع ہو رہی
تھی۔ اور جو کبھی لسانی اور کبھی سماجی آویزش کی شکل
میں سامنے آتی تھی۔ عام انتخابات کے بعد وہ پوری شدت
وقوت کے ساتھ اُبھری اور اسی نے پاکستان کے دونوں
بازوؤں کو دو محارب قوتوں میں بدل دیا۔

یحییٰ خان اور مجیب الرحمٰن کی گفت وشنید ہفتوں
تک جاری رہی اس گفت وشنید کے سلسلہ میں یحییٰ خان
کی نیت پر جو شبہ کیا جاتا ہے اس سے قطع نظر انھوں نے
اس تمام عرصہ میں صدر مملکت کی حیثیت سے نہیں بلکہ
مغربی پاکستان کے مفاد کے محافظ کی حیثیت سے
بات چیت کی اور فوجی قوت کے بل پر اپنی بات منوانی چاہی۔
ان حالات میں یحییٰ مجیب گفت وشنید کی ناکامی کی صورت
میں "آزاد بنگلہ ریاست" کے قیام کا اعلان قطعاً
غیر متوقع نہ تھا۔ اور اس کے جواب میں یحییٰ خان کی
طرف سے فوجی قوت کا استعمال بھی اسی قدر قطعی تھا۔
اسی کے پیش نظر دونوں فریقوں نے اپنے اپنے اندازے
کے مطابق صورت حال کا مقابلہ کرنے کی تیاری بھی کر لی
تھی۔ لیکن حالات کی روش نے دونوں کے اندازوں کا
ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو یہ خوش
فہمی تھی اور عام خیال بھی یہی تھا کہ عام انتخابات میں
جو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار بالغ رائے دہندگی
کے اصول پر عمل میں آئے تھے ان کی پارٹی کو ۹۹ فیصدی
کامیابی نصیب ہوئی ہے اور اس کامیابی کے بعد

مشرقی بنگال کے عوام نے جس کامیابی و اتحاد کے
ایک مہینہ تک عوام عدم تعاون کی تحریک چلائی۔
یحییٰ خان اس پیمانے پر جارحانہ اقدامات کرنے کی
نہ کر سکے جس پیمانہ پر انھوں نے کئے۔ دوسری
یحییٰ خان کو یہ غلط فہمی تھی کہ مشرقی بنگال نے مرکز
کٹ کر علیحدہ ہونے کی اگر ہمت کی تو اپنی فوجی قوت
حرکت میں لا کر وہ ایک ہفتہ میں صورت حال پر قابو
گے۔ یحییٰ خان کا یہ خیال مشرقی بنگال کے مسلمانو
تاریخ سے عدم واقفیت پر مبنی تھا۔ انھیں اس کا
نہیں تھا کہ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست
لے کر ۱۸۵۷ء تک مشرقی بنگال کے عوام نے یہ
تنہا برطانوی سامراج کا جنگی پیمانے پر مقابلہ کیا
یحییٰ خان نے بنگالیوں کی مقاومت کو ختم کرنے کے
پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی طاقت کو استعما
مشرقی بنگال میں ہلاکو و چنگیز کی تاریخ دہرا دی۔
مشرقی بنگال کے اس بہیمانہ قتل عام کی
دوسری مثال تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکے گی
میں رد عمل ہونا قدرتی اور لازمی تھا۔ چنانچہ
ملک میں عموماً اور مغربی بنگال نے خصوصاً مشرقی
کے مظلوم عوام کے ساتھ اپنی ہمدردی کا زبانی
بلکہ عملی ثبوت دیا۔ ہندوستانی عوام کا یہ عمل ان
روایات کے عین مطابق ہے۔

# چھیڑ خوباں سے چلی جائے .......

نشتر باز

● دلّی میں اس سال سے لڑکیوں کے ایک کالج میں اردو ڈیپارٹمنٹ کھولا گیا ہے۔

—— دلّی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ترقی اور وسعت کا مسلّم ثبوت ہے —— یا

—— یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایک معزز استاد کی دختر نیک اختر ایم۔ اے۔ میں اور انھیں لڑکوں کے ساتھ کلاسز لیتے ہوئے حجاب آتا ہے اس لئے لڑکیوں کے کالج میں اردو قائم کی گئی ہے تاکہ .......

● اس سال دلّی کا اردو ایم۔ اے۔ کا رزلٹ پچھلے سال کے رزلٹ سے بھی زیادہ اچھا رہا ہے۔ بائیس امیدواروں میں سے صرف دو فرسٹ ڈویژن لانے میں کامیاب ہو پائے ہیں۔

—— اس سال زیادہ بے ایمانی ہوئی ہے —— یا رزلٹ اچھا بنانے کے لئے بے ایمانی کا موقع نہیں ملا۔

● بلیماران (دہلی) کے میونسپل کونسلر کا علاقے کی گندگی اور بری حالت کے خلاف مع ووٹروں کے سمیت میئر کے دفتر پہ دھرنا۔

—— پچھلے دس سال کے دوران نیند میں علاقے کے لوگوں کی تکلیف کا اچانک احساس —— ان قابلِ رحم حالات سے متاثر ہوکر ہے —— یا الیکشن دوبارہ ہونے کے امکان کے سبب۔

● دلّی کالج دہلی کے باہر کالج کے طلبہ کا چانسلر ی صدر نہ حاصل کرنے والے امیدواروں کو داخلہ نہ دینے کے خلاف احتجاجیہ دھرنا۔

—— داخلہ نہ ملنے والے تمام طلبہ و طالبات سے ہمدردی کے طفیل ہے —— یا کسی خاص امیدوار کو داخلہ نہ دیئے جانے کے سبب۔

● ہتک آمیز اردو لکھنے والے ایک اخبار نے آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل کے صدر پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ان صحافیوں کو "فخر اردو" کے خطاب سے نوازا ہے جنھیں اخبار نکالتے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں

باقی صفحہ ۳۱ پر

# یادیں

احمد رشید
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

پیاری رضیہ ......... سنو!

کچھ ہوا تیز تھی کھلی تھی کتاب ۔ ایک پچھلا ورق الٹ آیا ۔

"یاد ماضی عذاب ہے یا رب" عجیب طوفانی رات ہے ۔ سوتے وقت زمانہ حال اور ماضی کی کشمکش دماغ پر مسلط ہے ۔ ایک پل چین نہیں پوری رات اضطراب میں بسر ہوئی ۔ دل نے کہا "زمانہ وفاؤں کا پاس کیوں نہیں کرتا؟" دماغ نے غور کیا اور ایک ایسے مقام پر آکر رکا جہاں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا ۔ جب انسان زندگی کے دریا میں تیرتا ہوا نئے کناروں کی گونجی ہوئی فضاؤں سے جا ملتا ہے تو پرانے کناروں کی غمگین صدائیں وہاں تک نہیں پہنچ پاتیں ۔ اے شب ہجراں زندگی میں ایسے بھی موڑ آتے ہیں جہاں آگے بڑھنے سے بشر جرم الفت کا باعث بنتا ہے ۔ پیچھے ہٹنے سے زمانہ ہنستا ہے اور یاد ماضی زندگی کے ہر نئے موڑ پر گرد کی مانند جھاڑ دی جاتی ہے ۔

دیکھو رضیہ! زندگی ایک سفر ہے جو متضاد منزلوں پر مشتمل ہے ۔ جس کی مسافت انسان طے کرتا ہے ۔ عہد طفلی، عہد جوانی اور عہد پیری یہ تین منزلیں ہیں اور چوتھی منزل زیست ہے جس کو ہم منزل نہیں بلکہ منزل مقصود کہتے ہیں ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے انسان کا سفر شروع ہوتا ہے اور یہیں اس کا عزم سفر ختم ہوتا ہے ۔ ہر نئی منزل کے آغاز پر قدیم منزل بھلا دی جاتی ہیں ۔ نئی ہواؤں کی فضا میں پرانے چراغ بجھا دیئے جاتے ہیں ۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ حالات اور واقعات کے نشانات بالکل مٹ جاتے ہوں ان کا فسانہ تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہو جاتا ہے ۔ اور دماغوں کے شعور میں پنہاں ہو جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً جذبات کے تأثر سے عیاں ہوتا رہتا ہے ۔ بالکل اسی طرح گوشۂ تنہائی میں جان بہار کم نمودار ہوئے ۔ حسرت کا ایک شعر سنو!

مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر اسے عجب
یاد یار آتی ہے کیوں بے اختیار اکثر برس

اور انھیں واقعات میں بہت سے واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھلانے پر بھی مدتوں نہیں بھلائے جاتے

جس میں ایک فریب الفت بھی ہے۔ جس کو یاد کرکے انسان ہنس دیا کرتا ہے یا اضطراب کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اور بہتے بہتے وہ ایسے ساحل سے ٹکراتا ہے جہاں فریبِ الفت "یادِ ماضی" بن کر غمِ حیات کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اسی لئے میں نے یادِ ماضی کے لئے لفظ "عذاب" استعمال کیا ہے۔

دیکھو! جس منزل سے شروع ہوا ہوں اسی مقام پر میری تحریر کا عزمِ سفر ختم ہوتا ہے۔ بالکل زندگی کے سفر کی طرح۔

"یادِ ماضی عذاب ہے یارب"

●●

---

بقیہ رومی

---

ایک دھڑام کی آواز ہوتی ہے۔ اور رومی زمین پر بے حس و حرکت پڑ جاتی ہے۔

آفاق رومی کو کار میں لٹا کر فوراً امرجنسی وارڈ کی طرف بھاگتا ہے۔ آفاق کے بھی ہوش اڑ چکے ہیں۔ وہ کار اسٹارٹ کرتا ہے اور پھر........

پھر سڑک کے کنارے نالے کے چاروں طرف تماشائی کا ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے اور آفاق و رومی ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔

●●

---

بقیہ چھیڑ خوباں سے ۔۔

یہ الزام یا اعتراض ان دو سے ہمدردی اور لگاؤ کے پیشِ نظر ہے ـــــــــ یا خود کو خطاب نہ دیئے جانے کی وجہ سے۔

●●

# عورت اور اقوال

(انیس الرحمٰن)
متعلم دلی کالج دہلی

عورت گناہ اور تباہی کی تاریخ کی سرخی ہے (

عورت ایک حسین ناگن ہے جسکے کاٹے کا علاج نہیں۔

عورت دنیا کی تباہی کا باعث ہے۔

دنیا میں مزا چکھانے والی ہستی عورت ہے

عورت رشک و حسد کی پتلی ہے۔

عورت دنیا کے تمام دہشت انگیز درندوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ (یوحنا)

عورت کی کشش سے ہزار درجہ اس کا وجود منسلک ہے۔ (نپولین)

سانپ بچھو دوستی کرنا اچھا۔ لیکن عورت سے دوستی کرنا ان سے بھی برا (انٹونی)

عورت مکر و فساد کی حامی اور فساد کی محرک ہے۔ (عاصم ابن رشیق)

چھری، تباہی، موت اور عورت ایک چیز کے مختلف نام ہیں (سانپ)

آئے دن جور و جفا کرتے ہو
اس پہ امید وفا کرتے ہو

کس کی جرأت ہے جو اتنے پوچھے
کس خطا پر یہ جفا کرتے ہو

زندگی سے ہے جو اپنی بیزار
اس کے جینے کی دعا کرتے ہو

ہم جو کہتے تھے کہ پچھتاؤ گے
آج روتے ہو گلا کرتے ہو

چھیڑ کر قصۂ پارینۂ دل
مندمل زخم ہرا کرتے ہو

کیسے فریاد نہ آئے لب پر
ظلم جب حد سے سوا کرتے ہو

اس پہ کہتے ہو کہ فریاد نہ کر
آئے دن جور و جفا کرتے ہو

کتنے بے رحم ہو خود پر شاکر
توبہ کر کے بھی خطا کرتے ہو
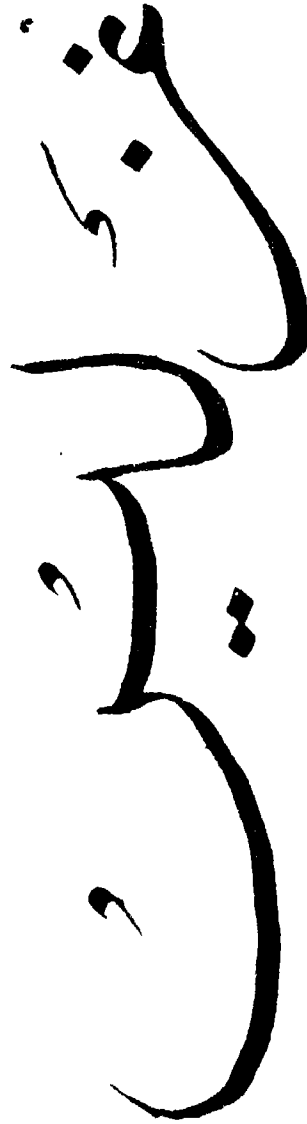
وہ ستاتے ہیں جفا کرتے ہیں
پھر بھی ہم جان فدا کرتے ہیں

جانتا ہے مرا ربِّ غفار
ابنِ آدم ہیں خطا کرتے ہیں

دل لرزتا ہے خدا خیر کرے
پھر وہ پیمانِ وفا کرتے ہیں

اپنی تذلیل خود اپنے ہاتھوں
بندۂ حرص و ہوس کرتے ہیں

کوسئے پھر اسی انداز کے ساتھ
لوگ سمجھیں کہ دعا کرتے ہیں

روبرو غیر دے دشنام مجھے
آپ کس دل سے سُنا کرتے ہیں

ایسے بندوں کو خدا سمجھے
دوست بن کے جو دغا کرتے ہیں

بے وجہ ہم کو ستانے والے
اپنے حق میں ہی بُرا کرتے ہیں

آہ اب ان کا یہ عالم شاکر
اجنبی جیسے ملا کرتے ہیں

لیتھو اور
آفسٹ کی
اعلیٰ طباعت کا مرکز

قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی ۶

خدمت کا موقع دیجئے۔

مجلس ادارت: محمد عتیق صدیقی
نجمہ منزل
انیس الرحمٰن

ستمبر ۷۱ء

جلد ۵
شمارہ ۹

ہندوستان کو اپنے طالب علموں پر بڑا فخر ہے۔ وہ جانتے ہیں ملک ایک آزمائش سے گزر رہا ہے۔ اس آزمائش میں جو فرض ان پر واجب ہے، اُسے ادا کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ نیشنل کیڈٹ کور میں بھرتی ہو کر، اپنا خون دے کر، شہری بچاؤ کے کام میں ہاتھ بٹا کر اور چندہ اکٹھا کر کے وہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی پڑھائی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں پڑھائی پوری کر کے وہ ملک کے اور زیادہ کام آسکیں گے۔ ہمارے طالب علم ملک کی خدمت میں جٹے ہوئے ہیں۔

سوچیں تو! آپ ملک کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

## ایک عظیم ملک ہمارا
## ایک عظیم قوم

فی پرچہ
۲۵ پیسے
سالانہ
۳ روپے

طابع و ناشر
محمد عتیق صدیقی
مطبوعہ
اعلیٰ پریس دہلی

# جرعات

## دلی ایڈمنسٹریشن کی اردو دشمنی اور اب ......

یہ حقیقت تو سب ہی جانتے ہیں کہ دلی میں مڈل کلاسز کی اردو کتب کو دلی ایڈمنسٹریشن نے سازشاً ختم کر دیا ہے کہ اردو کی کتابیں ہونگی اور نہ ہی اردو پڑھائی جا سکے گی۔ لہٰذا ایسے طلبہ جو اردو پڑھتے ہیں ان کو ساتھ میں ہندی زبان کا تقریباً پورا کورس اور حساب، سائنس و دیگر مضامین کی کتابیں ہندی میں ہی پڑھنی پڑتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہندی طلبہ کے مقابلے میں تعلیمی اعتبار سے کمتر ہوتے ہیں اور یہ کمتری اور کمزوری ان کے مستقبل (کیریر) پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ بہت سے تو مایوس ہو کر پڑھائی چھوڑ دیتے ہیں اور جو پڑھتے رہتے ہیں وہ بیچارے کسی اچھے کورس میں داخلے کے اہل نہیں ہو پاتے۔

پچھلے دنوں الیکشن کے وقت تمام پارٹیوں کو طلبہ کی اس بے چارگی پر بڑا ترس آیا تھا اور انھوں نے نہایت جوش میں ان کے تئیں ہمدردی ظاہر کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی جنگ لڑی تھی مگر اب جب کہ الیکشن ختم ہو گئے ہیں ان کا جوش بھی ختم ہو گیا۔ ان کی ہمدردیاں غائب ہو گئیں اور یہ طلبہ ... بے چارے طلبہ آج بھی مکمل طرح پریشانیوں اور رکاوٹوں کا سامنا کر رہے ہیں۔

ان مفاد پرست سیاستدانوں اور نام نہاد سماجی کارکنوں کے اس رویہ کا عتاب بھی ان بے چارے طالب علموں پر نازل ہو رہا ہے۔ اب دلی ایڈمنسٹریشن نے ان نام نہاد اور موقعہ پرست رہنماؤں کی کمزوری سے فایدہ اٹھاتے ہوئے ان طالب علموں کو مکمل طور پر تباہ کرنے کیلئے خطرناک حد تک ایک قدم بڑھایا ہے۔ اس نے مڈل کلاسز سے فارسی کو خارج از کورس قرار دیکر سنسکرت کو لازمی مضمون کا درجہ دیا ہے۔ یہ قدم

ایسے طلبہ کے لئے جو ہندی کا بمشکل تمام چلا پاتے ہیں جہاں ایک زبردست پریشانی کا باعث ہے۔ وہاں ہائر سیکنڈری اسکول اور کالج کے اساتذہ کے لئے بھی لمحہ فکر یہ ہے — کیونکہ ایک ایسا طالب علم جس نے پہلے کبھی فارسی نہ پڑھی ہو تو وہ آگے فارسی کیسے لے گا جہاں ضخیم اور مشکل کتب ہوتی ہیں اور اگر لے بھی لے گا تو وہ کس طرح چلا پائے گا۔

ہم ان تمام رہنماؤں سے اور اردو کے بہی خواہوں سے دست بستہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی اس ہمدردی کا اظہار نہ کریں اور بابیر پوری لگن کے ساتھ اسکے لئے بے لاگ کام کریں — اسکے علاوہ ہم دلی ایڈمنسٹریشن کو متنبہ کردینا چاہتے ہیں کہ اسکا یہ عمل اردو داں طبقے کو اور خاص طور پر طلبہ کو بھڑکانے اور آمادہ تشدد کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکے گا۔

## یہ طریقہ غیر جمہوری ہے

ہم نے پچھے ماہ آل انڈیا اسمال اردو نیوز پیپرز ایڈیٹرز کونسل نئی دہلی کے انتشار کی نشان دہی کی تھی اور ساتھ ہی ممبر معاصرین سے متحد رہنے کی درخواست بھی — لیکن کچھ شر اور تخریب پسندوں نے کونسل میں انتشار ڈال ہی دیا۔ کونسل کے صدر جناب صدیقی صاحب نے کچھ عہدیداران کو ممبری سے خارج کردیا اور کونسل کے صدر اعلیٰ ہونے کے ناطے نئے عہدیداران اور ممبران ورکنگ کمیٹی کو نامزد فرمادیا۔

صدیقی صاحب نے بھلے ہی یہ قدم کونسل کی بہتری اور بھلائی کیلئے اٹھایا ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک ایسی باڈی کے عہدیداران کا تقرر الیکشن کے بجائے نامزدگی کے ذریعے کرنا ایک غیر جمہوری فعل ہے۔

---

حسب سابق اس سال بھی

**فتحپوری مسلم ہائر سیکنڈری اسکول**

دہلی

میں آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں کلاسوں کے لئے

## مفت ٹیوشن کلاسز

شروع ہوگئی ہیں۔

# عظمت عبدالقیوم کی شاعری

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، صدر شعبہ اردو،
جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ نے جب اپنی محبوبہ بھاگ متی کے نام پر بھاگیہ نگر (حیدرآباد) بسایا ہوگا تو اسے علم نہ ہوگا کہ اس بھاگ متی کے نام پر بسائے ہوئے بھاگ نگر میں اردو کی ایسی شاعرات پیدا ہوں گی جو اردو ادب کے ماتھے کا جھومر بن کر چمکیں گی۔ محمد قلی کے دلیں میں لطف النساء امتیاز اور ماہ لقا بائی چندا کے روشن کئے ہوئے چراغ اب بھی عظمت عبدالقیوم، بشیر النساء بشیر، خورشید نذیر بانو، طاہرہ سعید اور روحی علی اصغر کے کاشانوں میں جگمگا رہے ہیں۔ اور کاشانوں ہی کی رونق نہیں۔ شاہراہوں کی بھی عظمت بڑھا رہے ہیں۔ یعنی صرف غزل کے ذریعہ داخلی احساسات کی ترجمانی نہیں۔ نظم کے ذریعہ خارجی واقعات کی عکاسی بھی کر رہے ہیں۔ اس خصوص میں حیدرآبادی شاعرات میں عظمت کی شاعری ممتاز ہے۔

عظمت نے غزل میں زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور جدید تصورات کو بڑی خوبی سے ہم کنار کر دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں واقعی آہنگ ہے۔ وہیں ان کی نظموں میں خارجی رنگ بھی ملتا ہے۔ انھوں نے اب سے پچیس سال پہلے سے لکھنا شروع کیا۔ اس کے باوجود عظمت نے اکائی کا وہ حصار توڑ دیا ہے جس میں اردو غزل گھٹ کر رہ گئی تھی اس کے یہ معنی نہیں کہ بقول فیض:

> ؎ صرف غم دوراں کے ڈھنڈورچی ہیں
> سچ تو یہ ہے کہ وہ غم جاناں کی مطربہ ہیں

ان کی غزلوں میں مجاز کی شاعری کی طرح بہاروں کے دن کی سی رنگینی اور سرما کی دھوپ کی سی دل آویزی ہے۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کا کلام بھی دل موہ لیتا ہے۔ اور یہ شاعری کی سب سے بڑی فتح ہے۔

عظمت نے حیدرآباد (وہ حیدرآباد جہاں اردو پلی اور بڑھی۔ جہاں والوں نے اردو کے بودے کو خون جگر سے سینچا) کے ایک ذی علم اور معزز گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے والد محترم نواب غوث یار جنگ محکمہ مال کے کمشنر تھے اور شوہر مولوی عبدالقیوم خاں حیدرآباد کے مشہور انجینیر جو چیف انجینیری کی خدمت سے وظیفہ پانے کے بعد اب حیدرآباد پالی ٹکنیک کے پرنسپل ہیں۔ شوہر نے جہاں حیدرآباد کی مادی تعمیر و آرائش میں حصہ لیا۔ وہیں بیوی

حیدرآباد کی روحانی تعمیر اور آرائش میں مشغول ہیں۔
نواب غوث یار جنگ نے اپنے زمانہ قیام گلبرگہ میں درگاہ
حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی وسعت و ترقی میں خاص دلچسپی
لی تھی۔ شاید ان ہی بزرگ کے روحانی فیضان کا اثر ہے۔
نواب غوث یار جنگ کی سب سے چہیتی بیٹی خواجہ بندہ نواز
کے لگائے ہوئے پودے کو خونِ جگر سے سینچ رہی ہیں۔
ادب اردو نظم و نثر کے دامن کو موتیوں سے مالا مال کر رہی
ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ عظمت اردو کی بلند پایہ
شاعرہ ہی نہیں۔ نثر میں بھی ایک بے مثال اسلوب کی
مالک ہیں۔ بالخصوص حیدرآبادی ثقافت اور معاشرت
پر عظمت نے بڑے ہی معلومات آفریں مضامین لکھے
ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کی شاعری کی شہرت نے
ان کی نثر کو پس پشت ڈال دیا۔ عظمت حیدرآباد کی کہنہ
مشق جانی پہچانی شاعرہ ہیں۔ جہاں مخدومؔ، وحیدؔ اور
میکشؔ کے ترانے محفلِ شعر میں گونج رہے تھے۔
وہیں عظمت اور بشیر النساء بیگم بشیرؔ کے نغمے دلوں
کو برما رہے تھے۔

عظمت نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی۔ لیکن
ان کا خاص میدان غزل ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل
اپنے پورے واضح امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔
وصل، فراق، آس، یاس، وفا، جفا، تصویرِ محبت،
کے سب پہلو اور جہتیں ان کے یہاں موجود ہیں۔ ساتھ
ہی اس میں وجدان، تخیل، مطالعات، تجربات،
و مشاہدات کی ایک دنیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اسلوب لکھنے والے کی شخصیت کا پرتو
ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کے حسن و بانکپن اور دل آویزی
کو دیکھ کر لکھنے والی شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی
ہے۔ غزل میں جذبات محبت کی تفسیر بہت عام بلکہ پامال
موضوع ہے۔ ندرت اور رنگینی ملتی ہے ؎

غم بہت ہے کہ خوشی غور طلب ہے لیکن
اتنی فرصت بھی محبت میں کہاں ہوتی ہے

فراق کا بیان دیکھئے ؎

رگ و پے میں کوئی بجلی سی لہرائے تو کیا ہوگا
بھلایا ہے جسے دل نے وہ یاد آتے تو کیا ہوگا

وصل کی کیفیت سنئے ؎

غم کو جو کیف مسرت سے بدل دیتی ہے
ان نگاہوں کو فسوں کار بھی کہہ سکتے ہیں

فلسفیانہ رنگ ملاحظہ ہو ؎

زندگانی ہیں مسرت کی تمنا گویا
وہ دعا ہے جو بھٹکتی ہے اثر سے پہلے

محاکاتی انداز دیکھئے ؎

بڑے خلوص سے پوچھا ہے حال دل اس نے
مگر یہ صرف مروت ہے دوستی تو نہیں

عظمت نے غزل میں زندگی کے بدلتے ہو۔
رجحانات اور جدید تصورات کو بڑی خوبی سے ہمکنار
کر دیا ہے ؎

میکدے سیکڑوں بنے لیکن
زندگانی ہے تشنہ کام ابھی

مانا طلوع صبح کا عالم ہے یہ مگر
تاریکیاں ضرور ہیں کچھ روشنی کے ساتھ

یوں تو ان کی ایک ساتھی بانو طاہرہ سعید کے
الفاظ میں عظمت ملکۂ تغزل ہیں یعنی انھوں نے زیادہ
غزلیں لکھیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ عظمت نے شاعری کی
اصناف حمد، نعت، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ کو بڑے
باقی ...

# اردو افسانوی ادب میں

# بنگال کا حصہ

ایم۔اے۔نصر
کلکتہ یونی ورسٹی

دورِ جدید میں افسانہ نگاری، محض تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں رہی۔ بلکہ انسانی ذہن کی بالیدگی اور نشو نما کے لئے محرک بھی ثابت ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے افسانوں نے سماجی شعور کو بیدار اور پختہ کرنے میں اہم اور موثر رول ادا کیا ہے۔ بقول سید احتشام حسین۔ "افسانے میں جذبات نگاری کرنا، کردار کے خیالات کی رو کا انداز لگانا اور انفرادی یا اجتماعی زندگی سے پیدا ہونے والی خواہشوں اور امنگوں کی اساسی شکلوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔" اور ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی کے الفاظ میں۔ "ادب کا بنیادی تعلق محض جذبات و احساسات سے ہے۔ جذبات و احساسات سے متاثر ہونے یا ان کو متاثر کرنے ہی کا نام ادب ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہم ادب یا شاعری میں زندگی سے دور نہیں جا سکتے۔" اردو کے مشہور نقاد مجنوں گورکھپوری نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ "کامیاب ترین ادب وہ ہے جو ماحول کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقعیت، تخلیت، افادیت اور جمالیت ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوں۔ جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں۔ جو ہمارے ذوقِ حسن اور شعورِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔"

اردو ادب میں "داستان گوئی" کا رواج ابتدا ہی سے ملتا ہے۔ اور افسانہ نویسی دراصل داستان کی جدید شکل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داستان میں مافوق الفطرت کردار ہوتے تھے جن کا کام صرف قاری کو تفریحی مواد مہیا کرنا تھا۔ مگر افسانہ میں زندہ جاوید کردار ہوتے ہیں۔ گوشت پوست کا انسان اپنے تمام حرکات و سکنات کے ساتھ اس میں نظر آتا ہے۔ اس کے احساسات و خیالات کو افسانے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے ذریعہ سے انسانی ذہن کو ہموار کرنے کا بھی کام لیا جاتا

ہے۔ جیساکہ ایلیا اہرن برگ کے انسان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ "کسی ادیب کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو ہمیشہ کے لئے ہو۔ بلکہ اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قادر ہونا چاہیے جو خواہ ایک لمحے کے لئے ہو لیکن اس لمحے میں قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔"

**لیکن** اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ادیب کے ذہن میں جو بھی خیال آئے وہ قابل وقعت ہو اور تحریری سانچے میں ڈھلنے کے بعد اس کو ادب ہونے کی سند مل جائے۔ بلکہ بقول اطہر پرویز، "اگر کوئی تحریر اپنا مواد، زندگی کے مظاہر اور انسانی قدروں سے حاصل کرتی ہے تو وہ اپنی جگہ پر مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تک وہ جمالیاتی اور تخلیقی شرائط کو پورا نہیں کرتی۔ اس وقت تک ادب کے دائرے میں نہیں آ سکتی۔ انھیں شرائط کا نام ادبیت یا ادبی قدریں ہیں۔" اور ممتاز حسین کی نظر میں "ادب کا تعلق براہ راست انسانوں کی زندگی سے، ان کے نفسیاتی اور سماجی مظہر سے جن کا مطالعہ کسی بھی طبقاتی سماج غیر جانبدارانہ ہو سکتا ہے۔" الغرض ایک مشہور نقاد کے خیال کے مطابق "ہر افسانہ چند ایسے مباحث کا مجموعہ ہے جو موضوع قصہ کے مختلف پہلو پر ہو سکتے ہیں۔ اور جن کا اظہار مکالمے کے ذریعہ کیا گیا ہے۔" رچرڈ برٹن نے "فن داستان گوئی" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اگر انجیل مقدس کی بعض روایات کو جن میں تاریخی واقعات، ادبی اور تخلیلی نزاکتوں کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، قصہ کہتے ہیں تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مشرق کے ریگستانوں میں قصہ گوئی اسی وقت باضابطہ شکل اختیار کر چکی تھی جس وقت دنیا ابھی تحریر سے واقف بھی نہیں تھی۔ نثری روایات جن میں رزم و بزم کے واقعات یا مقامی حالات کا ذکر ہوتا تھا۔ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آئی اور حافظہ کی مدد سے محفوظ کر لی جاتی تھیں۔ جس قابلیت سے یہ روایات گھڑی گئی ہیں وہ حقیقت میں ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔"

**اس** سلسلے میں محترم سید احتشام حسین کے یہ الفاظ بھی غور طلب ہیں:۔

"**انسان** ابتدا ہی سے سماجی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ سماج کو بدلتا ہے۔ اور سماج کے ساتھ خود بدلتا رہا ہے۔ سماج کو بناتا اور سماج کے ساتھ خود بنتا رہا ہے۔ زمان و مکان کی وسعت میں یہی تغیر ہے۔ جس نے علم الاساطیر، دیو مالا، مذہبی کہانیاں، داستان، افسانے اور ناول پیدا کئے۔ اردو افسانے میں حقیقت کی تحریک کا مطالعہ ہندستانی سیاست اور افکار میں حقیقت کے مطالعے کا حصہ ہے۔ اس کی پیدائش میں اس عقلیت پسندی اور تغیر پرستی کا ہاتھ ہے جو مغربی اور مشرقی بنگال کے تصادم سے پیدا ہوئی تھی۔ اور تاریخی حیثیت سے یہاں کی معاشی، معاشرتی کشمکش کی صورت میں پیدا ہوئی۔"

**بعض** نقادوں نے ملا وجہی کی "سب رس" کو اردو کی پہلی داستان کہا ہے۔ مگر اس میں اختلاف رائے ہے۔ نوطرز مرصع (عطا حسین خان تحسین) اور رانی کیتکی (انشا) کو چھوڑ کر جو بھی داستانیں تصنیف اور تالیف ہوئیں وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ترتیب دی گئیں۔ مثلاً میرامن (باغ و بہار) حیدر بخش حیدری (آرائش محفل) (توتا کہانی) نہال چند لاہوری (مذہب عشق) مرزا کاظم علی جوان (شکنتلا ناٹک) نہال چند لاہوری (قصہ تاج الملوک اور گل بکاؤلی) للو لال جی (بیتال پچیسی) وغیرہ نے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ مگر شمالی ہندوستان بھی اس باب میں خاموش نہیں تھا۔ وہاں بہت

سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اور تالیف ہوئیں۔ فسانہ عجائب (رجب علی بیگ سرور) فسانۂ آزاد (رتن ناتھ سرشار) طلسم ہوش ربا، بوستان خیال اور گلِ صنوبر (نیم چند کھتری) نورتن (محمد بخش مہجور) سروش سخن (سخی دہلوی) طلسم حیرت (شیون) الف لیلہ (مرزا حیرت اور رتن ناتھ سرشار) بہت مشہور اور مقبول ہوئیں۔

**داستان گوئی** کی مقبولیت سے نثر اردو نے ترقی کی کچھ اور منازل طے کرلیں تو ناول نگاری کے فن پر توجہ دی گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے فن داستان گوئی کو ترقی کی ایک اور منزل سے آشنا کیا۔ گرچہ ان کی تخلیق ناول کے کینوس پر پوری نہیں اترتی۔ پھر بھی بعض نقاد کے خیال میں نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں۔ اور ان کے ناول مرآۃ العروس' میں ناول کا بھر پور عکس (سبھی لوازمات) نہ سہی مگر جھلک ضرور ملتی ہے۔ جس کے سہارے ناول کی شبیہہ کو ابھارنے میں مدد ملی ہے۔

**ڈپٹی نذیر احمد** کے بنائے ہوئے خاکے میں سرشار اور شرر (تاریخی ناول) نے رنگ بھرا اور مرزا ہادی رسوا کی شعوری اور غیر شعوری کوششوں نے منتشر شبیہوں کو یکجا کرکے ناول کے ڈھانچے کی تشکیل کی اور امراؤ جان ادا کی شکل میں اردو کا پہلا مکمل اور جامع ناول وجود میں آیا۔

**ناول** کے بعد انگریزی ادب کے اثرات سے افسانہ نگاری کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جیسے جیسے اس میں نکھار آیا۔ اس کی گرفت دلوں پر مضبوط ہوتی گئی۔ اہل ادب اس کی زلفوں کے اسیر ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری نے رومانی افسانے لکھے۔ پریم چند نے افسانہ نویسی کو نیا موڑ دیا۔ اور ترقی پسند تحریک جو "انگارے" سے شروع ہوئی۔ اس کے اثر سے پریم چند نے اس فن کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔ پریم چند نے اردو ادب کو کئی معیاری اور بہت ہی اچھے افسانے دیئے، جن میں "کفن" اور "حج اکبر" بہت مشہور و مقبول ہوئیں۔

**۱۹۳۶ء** کے قریب انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل باضابطہ ڈالی گئی۔ پریم چند اس کے روحِ رواں تھے۔ اس طرح اردو میں مختصر کہانیوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسین منٹو، علی عباس حسینی، اپندر ناتھ اشک، احمد علی، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، احمد اکبر آبادی، اختر انصاری، قاضی عبدالستار، حیات اللہ انصاری، حجاب، عصمت چغتائی۔ اور ان کے فوراً بعد میں غلام عباس (ندی) دیویندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، شفیق الرحمٰن، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، نسیم چھتاری ابھر کے سامنے آئے۔ اور آزادی ۱۹۴۷ء کے بعد انتظار حسین۔ اے حمید، شوکت صدیقی، جاویدنہال، رتن سنگھ، غیاث احمد گدی، ظفر اوگانوی، دیویندر اسر، بلراج ہنس راج، مہندر ناتھ، سرلا دیوی، عفت موہانی، انور عظیم، ضمیر الدین، اقبال مجید، انور، اقبال متین، عابد سہیل، اشفاق احمد، جیلانی بانو، صادق حسین، غلام چودھری نمایاں ہوئے۔ ان لوگوں نے اردو افسانہ نگاری کو ایک ایسے مقام پر پہنچایا جہاں سے یہ دوسری زبانوں کے افسانوں سے آنکھ ملانے کے قابل ہوا۔

**مغربی** بنگال نے بھی دوسرے صوبوں کا اثر قبول کیا مگر نثر کا چلن نہ یہاں بیسویں صدی کی تیسری ... شاہجہا

رچوتھی دہائی تک بہت کم ہوا۔ پھر بھی افسانے کی
ن مغربی بنگال کے افسانہ نگاروں نے دھیان دیا۔
۱۹۴۲ء سے کئی اچھے افسانے لکھے گئے۔ یونس احمر،
، مظفر پوری (جواب شین مظفر پوری ہوگئے ہیں۔)
مر نشاط (جو نشاط الایمان بن گئے) سہیل واسطی اور
لیل الرحمٰن لکھنوی نے افسانوی دنیا میں قدم رکھا اور
ہرت حاصل کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ سنگریزے
ائع ہوا۔

آزادی کے بعد افسانہ نگاری کلکتہ میں اور
ی مقبول صنف بنی۔ جاوید نہال (پھول رانی) شمس
ابری، راشد القادری، صادق القادری، ادیب سہیل،
مد سعدی۔ کئی اچھے افسانہ نگار ابھرے۔ صادق القادری
ور احمد سعدی مشرقی پاکستان چلے گئے۔ صرف جاوید
ہال اور کچھ دنوں تک یونس احمر اور شین مظفر پوری
ے کلکتہ میں افسانہ نگاری کے چراغ کو روشن رکھا۔
یونس احمر اور شین مظفر پوری بھی کلکتہ چھوڑ کر چلے گئے۔)

اسی زمانے میں ۱۹۵۴ء سے نئے افسانہ نگاروں
کی نئی پود ابھری۔ ان میں قیصر نشاط نے نیا چولا بدلکر
نشاط الایمان کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ سجاد نظر نے
بھی "افکار" اور دوسرے رسالوں میں اچھی کہانیاں لکھیں۔
نجمہ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی نے بھی بیسویں صدی میں کئی
اچھے افسانے لکھے۔ چند برسوں میں اور بھی کئی اچھے
فسانہ نگاروں کا اضافہ ہوا ہے۔ جن کی فنکارانہ صلاحیتوں
کو دیکھتے ہوئے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ بنگال
میں افسانوی ادب کو ترقی دینے میں معاون و مددگار
ثابت ہوں گے۔ جن میں فیروز عابد، مشتاق اعظمی، معین
اعجاز، خورشید شیدائی، انیس رفیع، نصرت جمیل،
تسکین انصاری، عشرت بیتاب، جلیل عشرت، اعجاز
کامل، نور پیکر، امر امیری، نوید ہاشمی، انور اعظم، وہاب
پردیسی، عزم حمیدی، عابد عباسی، نعیم اشفاق کے
نام قابل ذکر ہیں۔

گذشتہ چند برسوں میں ڈاکٹر ظفر
اوگانوی کے کلکتے میں منتقل ہو جانے پر بنگال بالخصوص
کلکتہ میں جدیدیت بھی مقبول ہوئی۔ جدیدیت کا رجحان
پرورش پا رہا ہے۔ اور اس میں اچھی تخلیقیں بھی دیکھنے میں
آئی ہیں۔ ترقی پسند ادیب و شاعر نے بھی جدید رنگ کو
اپنانا شروع کر دیا ہے۔ جاوید نہال صاحب کے یہاں
بھی تبدیلی نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں میں اب جدید
اسلوب نے ایک خاص جگہ بنا لی ہے۔ جو قابل ستائش
و تحسین ہے۔ جاوید نہال صاحب نے جدید رنگ
اپنانے کے باوجود ترقی پسند ڈگر پر چل رہے ہیں۔ ان کی
کہانیوں میں سماجی اور معاشرتی زندگی کی بھرپور عکاسی
ہوئی۔ گو اسلوب میں نمایاں فرق آ گیا ہے۔

جاوید نہال صاحب کے علاوہ انیس
رفیع، فیروز عابد، تسکین انصاری، معین اعجاز، سجاد نظر
نے بھی نئے رنگ کو اپنایا۔ انیس رفیع نے جدید رنگ
کو اپنانے کے باوجود لایعنی یا بے مقصد کہانیاں نہیں
لکھی ہیں۔ بلکہ موجودہ نظام اور معاشرے کی حقیقی تصویر کو
من و عن پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کے ہاں
الجھاؤ ہے۔ علامتوں کے بے جا استعمال سے ان کی کہانیاں
ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ فیروز عابد، اور تسکین انصاری پر جدیدیت
کا بھوت سوار ہے، اور انھوں نے مبہم اور بے مقصد افسانوں
کی تخلیق کو ہی عظمت کا راز سمجھ لیا ہے، یہی ان کی بڑی کمزوری
ہے اور اردو افسانوی ادب میں شاید ہی ان کا نام باقی رہے۔

شمع دہلی

## عظمت عبد القیوم ۔۔۔۔

سے برتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا انداز جدید ہے۔ قصیدہ کے صنف کی ان کی نظمیں جو انھوں نے "امیر کارواں نہرو" "شہزادہ کرم جاہ"، "بھیم سین"، "سحر" اور "شاعر مشرق" کے عنوانات سے لکھیں۔ قابل ذکر ہیں۔ اس میں جدیدیت اس درجہ ہے کہ یہ مبالغہ اور غلو سے پاک ہیں۔ جگر کی موت پر ان کی نظم مرثیہ کی اچھی مثال ہے۔ "نوید آزادی" اور "چینی حملہ آوروں کے نام" والی نظموں میں پُر جوش فضا اور چونکا دینے والے انداز ہیں۔
عظمت کی شاعری مواد کے اعتبار ہی سے قابل تعریف نہیں بلکہ اسلوب کے لحاظ سے بھی باعظمت ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی شاعری میں نئے تراکیب اور استعاروں کے ساتھ ترنم، روانی، اور جدت تخیل کا خیال رکھا ہے۔ اس طرح اردو کے شعری ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ جس کی طرف ایک عورت کا کلام ہونے کی وجہ سے موجودہ نقادوں نے توجہ نہیں دی۔
عظمت کا شعری مجموعہ "زرگل" اردو شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ جس کا مطالعہ کیف و انبساط کا باعث ہوگا۔

●●

بقیہ - اردو ادب ۔۔۔۔

سجاد نظر کی کہانیاں ترقی پسند ہیں، اسلوب بھی اچھا ہے لیکن اب انھوں نے لکھنا کم کر دیا ہے۔ آمرامیری، نئے نئے ابھرے ہیں، ان کی ابتدا جدیدیت سے ہوئی ہے، انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ان سے مستقبل میں کوئی امید وابستہ نہیں کی جا سکتی،
ان میں سے افسانہ نگاروں میں، خورشید شیدائی، نصرت جمیل، عشرت اچھے ہیں، مگر ان کو ابھی مشاہدے اور مطالعے کی ضرورت ہے، اور سخت محنت کے بعد ہی، بنگال کے افسانوی میں کوئی جگہ بنا سکتے ہیں،

●●

**یشپال** — **ترجمہ: رخشندہ بہار**
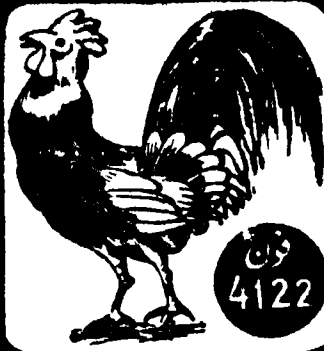
# احتیاج

عروس البلاد بمبئی کی ہنگامہ خیز زندگی میں چوپاٹی کو مرکز سکون کی حیثیت حاصل ہے۔ کولتار کی صاف شفاف سڑک سمندر کے کنارے کنارے اس طرح چلی گئی ہے کہ اگر کوئی مالابار ہل سے اسے دیکھے تو اسے ایسا محسوس ہو جیسے کوئی سیاہ ناگن یکایک چلتے چلتے سٹک کر کھڑی ہو گئی ہے۔

ساحل کے کنارے بچھی ہوئی بنچوں پر بیٹھ کر لوگ تھوڑی دیر کے لئے غم جاناں اور غم دوراں کو فراموش کر جاتے ہیں۔ بنچیں اس ترتیب سے بچھی ہوئی ہیں کہ کسی کا رخ سمندر کی طرف ہے اور کسی کی پشت سمندر کی جانب۔ مغرب سے لیکر نصف شب تک سکون کے متلاشی ان بنچوں پر بیٹھے رہتے ہیں کچھ لوگ بجلی کی تیز روشنی میں آتی جاتی موٹروں اور پیدل چلنے والوں کو گھورا کرتے ہیں اور کچھ سڑک کی طرف پشت کئے اندھیرے میں سمندر کی اچھلتی کودتی اور جھاگ اگلتی ہوئی لہروں کو دیکھا کرتے ہیں۔

رندھیر آج ساڑھے سات بجے آ کر چوپاٹی کی ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا تھا مسلسل دو گھنٹے تک اس کی منتظر نگاہیں مالابار ہل سے اترتی ہوئی موٹروں کا طواف کرتی رہیں۔ اور وہ سڑک کی تیز روشنی سے اکتا کر اس بنچ پر جا بیٹھا جس کا رخ "سوئمنگ باتھ کلب" کی طرف تھا۔ اس حصہ میں کافی تاریکی تھی۔ عموماً رندھیر کو تاریکی پسند نہ تھی۔ وہ تو تلاش سکون اور سنسان ماحول کا قائل نہیں تھا۔ مگر آج ہی نہ جانے کیوں وہ بیس برس کے طویل عرصہ میں پہلی بار ایسی خاموش تاریکی میں آ کر چپ چاپ بیٹھ گیا تھا۔

یوم آزادی کی وجہ سے آج سارا شہر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ہر کس و ناکس کی زبان پہ شہر کی جگمگاتی ہوئی روشنی کی دھوم تھی۔ رندھیر کو روشنی دیکھنے کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ لیکن اس کے ایک خاص دوست نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ تم ساڑھے سات بجے چوپاٹی پر ضرور آ جانا میں مالابار ہل سے گاڑی لیکر آؤں گا اور پھر ہم تم دونوں روشنی دیکھنے قلابہ، فورٹ و دیگر قابل دید مقامات پر چلیں گے اگر تم نہیں آؤگے تو مجھے بے حد رنج ہوگا۔ تمہارے ساتھ ہونے سے روشنی دیکھنے کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔ مگر اس قدر خلوص سے دعوت دینے والا یہ دوست جب ساڑھے نو بجے تک بھی نہ آیا تو وہ کھسیانا ہو کر سڑک کی چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی سے بچنے کے لئے اندھیرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ گھر واپس جا کر بھی وہ کیا کرتا۔ اور گھر کے علاوہ جاتا بھی تو کہاں جاتا تو سب ہی لوگ روشنی دیکھنے گئے ہوں گے۔ اکیلے بیٹھ کر وقت گزارنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ جب وہ تنہا ہوتا عجیب عجیب فرسودہ باتیں ماضی کے پردوں کو ہٹاتی ہوئی اس کے ذہن میں عجیب طریقہ سے ناچنے لگتیں۔ حالانکہ اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ مگر باتیں بغیر سوچے سمجھے پھر بھی یاد آتی ہی رہتی ہیں۔ کیوں؟ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

سامنے سمندر کی لہریں گرج گرج کر ریتیلے میدان کی چھاتی پر رینگ رہی تھیں اور آگے بڑھ کر کسی چٹان کو چھوتیں اور چھو کر پیچھے ہٹتیں کچھ شور ہوتا، کچھ جھاگ اٹھتے۔ لہریں لہروں میں مدغم ہو جاتیں پھر اسی زور شور سے اٹھتیں ایسا معلوم ہوتا جیسے لہریں جب لہروں سے ملتی ہیں تو آپس میں کوئی نیا پیمان کرتی ہیں۔ اور نئے عزم کے ساتھ منزل مقصود کی طرف بڑھتی ہیں۔ یہی تماشہ اس وقت

جاری تھا۔ رندھیر ان لہروں کو دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مضطرب لہریں زمین پر آتی ہیں۔ بڑھتی ہیں کہ پھر پیچھے ہی لوٹ سکیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان لہروں کی آمد و رفت جاری ہے یہ انہی باتیں سوچنے کے اسی انداز سے یاد آنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اس کی زندگی میں بھی ایک بار بہت تیزی سے ایک لہر اٹھی تھی۔ اتنی تیزی سے کہ خاندانی رسم و رواج کے آئین کو توڑ کر یہ لہر ریت کے میدان میں آتی دور بڑھ گئی کہ پھر وہ پیچھے نہ لوٹ سکی اور وہیں خشک ہو کر رہ گئی اگر اس کی زندگی کی اس لہر میں اتنی جلد بازی نہ ہوتی اور اس کی زندگی کی یہ لہر بھی ان لہروں کی طرح ہوتی جو دوسرے لوگوں کی زندگی میں اٹھا کرتی ہیں تو پھر اس کی زندگی میں بھی لہروں کا تسلسل جاری رہتا۔ لہریں اٹھتیں، دائیں ہوتیں۔ ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور پھر یہی تصادم نئی لہروں کی تخلیق کا باعث ہوتا۔

مگر اب ان باتوں کو یاد کر لینے سے کیا فائدہ ہے۔ چالیس برس کی عمر میں تو ویسے بھی آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس کا دل تو آج سے ۲۰ سال قبل ہی بوڑھا ہو چکا تھا۔ یکایک بنچ کو جھٹکا سا لگا جیسے کوئی دوسرا شخص بنچ پر آ کر بیٹھ گیا ہو۔ رندھیر نے کنکھیوں سے آنے والے کو دیکھا۔... ایک خاتون اور ایک چھوٹی سی چار پانچ سالہ لڑکی دونوں کو دیکھ کر اسے کچھ تعجب سا ہوا۔ جوان عورت کی قربت سے مرد کو کچھ نہ کچھ محسوس ہوتا ہی ہے ایک انجانی سی لطیف کیفیت! اگر یہ چار پانچ سالہ لڑکی اس عورت کے ساتھ نہ ہوتی تو وہ یقیناً گھبرا جاتا۔ اور غالباً بغیر کسی پس و پیش کے وہ فوراً یہ بنچ خالی کر دیتا۔ لیکن اب وہ اس بنچ کے حقوق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کو یہ کہہ کر مطمئن کر رہا تھا کہ اس بنچ پر آ کر بیٹھنے کی ذمہ داری خود اس عورت پر عائد ہوتی ہے۔ اس نے بیٹھنے سے پہلے ضرور مجھے دیکھا ہوگا اگر وہ چاہتی تو پاس والی خالی بنچ پر بیٹھ سکتی تھی۔ مگر اس نے جان بوجھ کر میری بنچ کا انتخاب کیا۔ تاکہ میں اس کی نسائیت سے متاثر ہو کر یہاں سے اٹھ جاؤں اور وہ خوش ہو کہ اس نے ایک مرد کو ہرا دیا۔ — نسائیت کے احترام کے معنی یہ تو نہیں کہ خواہ مخواہ شکست تسلیم کر لی جائے۔ قبضہ مخالفانہ جائز قرار دیا جائے۔ اس نے پھر ایک بار عورت کے سراپا پر نظر ڈالی یہی ۲۲-۲۳ برس کی عمر ہوگی اور آنے والی عورت اس وقت بہت آہستہ آہستہ لڑکی سے کچھ باتیں کر رہی تھی۔ کیسا باتیں؟

ان باتوں کو سننے یا سمجھنے کی رندھیر نے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ تو بس یہی سوچ رہا تھا۔ اس کے باوجود کہ میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیوں نہ میں اخلاقاً اس بنچ کو خالی کر دوں اگر وہ میری اس شکست سے ذہنی طور پر مسرت بھی حاصل کرے تو آخر میرا اس میں کیا نقصان ہے لیکن اٹھنے کے باوجود نہیں اٹھ رہا تھا۔ اور جب وہ اٹھنے کا ارادہ کرتا تو اسے پوری شدت سے محسوس ہوتا کہ ایک عورت اس کے قریب آ کر انتہائی اطمینان سے بیٹھ گئی ہے۔ اور بوڑھے جذبات کے باوجود کئی برس کے بعد اسے یہ احساس رہ رہ کر ستا رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت کی قربت اسے میسر ہے۔

"— کیا چپ ہی بیٹھے رہیں گے آپ؟ — کچھ سنائی دیا —

جناب کو!

آواز میں اتفاق کے ساتھ محبوبیت بھی شامل تھی جیسے بے باکی نے حیا پر جبر کیا ہو۔ رندھیر اس آواز سے چونک پڑا اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور کسی کو اپنے قریب نہ پا کر عورت کی طرف دیکھا عورت کی نظریں دور افق میں ستاروں کے قریب نہ جانے کس تلاش میں مصروف تھیں۔ اور عورت کی اس محویت کے باوجود اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

محترمہ! کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟

تو اور یہاں کون ہے۔ یہ کہہ کر عورت نے مسکراتے ہوئے اپنی نظریں رندھیر پر مرکوز کر دیں۔

—— کیا کہوں؟ رندھیر بولا۔ مجھے کچھ کہنا نہیں ہے شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے اور کسی دوسرے شخص کا آپ کو مجھ پر دھوکا ہوا ہے۔ کیونکہ میں تو آپ سے متعارف نہیں ہوں۔

ایک ہی سانس میں رندھیر نے سب کچھ کہہ دیا۔

اگر پہلے سے تعارف نہ ہو تو کیا بات کر لینا گناہ ہے۔ یہ کہہ کر عورت شوخی سے مسکرا دی۔

یہ جملہ سنتے ہی رندھیر گھبرا گیا اور اس نے جلدی سے کہا۔ نہیں نہیں۔ یہ تو نہیں مگر مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔

تو پھر اس اندھیرے اور سنسان مقام پر بیٹھنے کی آپ کو کیا ضرورت تھی۔ ایسے پرسکون ماحول میں پریشان اور تھکے انسان ہی

تھوڑی دیر کسی سے گفتگو کر کے اپنا دل ہلکا کر لیا کرتے ہیں جناب ۔

عورت کی اس گفتگو میں ایک عجیب سحر کیفیت تھی ۔

رندھیر یہ سن کر کچھ نہ کہہ سکا ۔ اس تنہائی میں اسے عورت کے یہ جملے بہت بھلے لگے ۔ ویسے بھی اس عورت کے کپڑوں کی خوشبو اسے اچھی لگ رہی تھی ۔ اور اسی لئے اس کے اس احساس میں ایک شیرینی سی پیدا ہوگئی جو اس کے آنے کے وقت اسے ہوا تھا مگر یہ احساس نہ جانے کیوں پھر اسے ماضی کی طرف کھینچ لے گیا ۔ ماضی کی پرانی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے تابندہ و شوخ رنگوں کے ساتھ گھومنے لگیں ۔

........ شانتی ! مرقع رنگ و بو ! قدرت کی صناعی کا مکمل نمونہ ! کس طرح وہ تڑپ تڑپ کر کینیٹری میں بیٹھی شانتی کا انتظار کیا کرتا اور پھر اس کے ساتھ اس چوپاٹی پر بھی آتا تھا ۔ دور لوگوں کی نظروں سے بچ کر وہ دونوں بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کو دیکھا کرتے مسلسل ! اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ ان لہروں اور ساحل کی ریت کے ذرات کو گواہ بنا کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جانے کا وعدہ کیا کرتے ۔ شانتی کو ہمیشہ لوٹنے کی جلدی ہوتی ۔ مگر اس جلدی کے باوجود روزانہ اس وعدہ کا ایفا کیا جاتا کہ وہ ایک دوسرے کے ہی ہو کر زندہ رہیں گے ۔ ورنہ زندگی پر موت کو ترجیح دیں گے ۔

کیا آپ سگرٹ نہیں پیتے ہیں ۔ اس آواز نے اس کے تصوراتی نظام کو درہم برہم کر دیا ۔ شانتی کی حسین تصویر دن کے تمام شوخ رنگ ماند پڑ گئے اور وہ کچھ جھنجھلا سا گیا ۔ یہ عورت کیا ہو سکتی ہے ؟ جو عورت سگرٹ پیئے ؟ کیا اسے ایک شریف خاتون سمجھا جا سکتا ہے
رندھیر نے خود اپنے سے سوال کیا اور پھر سگرٹ کیس نکالے بغیر اس نے عورت سے پوچھا ۔

" کیا آپ سگرٹ پیتی ہیں ؟ "

" جی نہیں ۔ آپ پیجئے ۔ مجھے تو صرف اس کی خوشبو اچھی لگتی ہے اور جب آپ سگرٹ پئیں گے تو کم از کم میں یہ تو محسوس کر سکوں گی کہ میرے پاس کوئی بیٹھا ہے ۔"

رندھیر کو یہ جملے خلوص میں ڈوبے ہوئے نظر آئے ۔ محض اس لئے کہ کم از کم اس دنیا میں اس وقت تو ایک ہستی ایسی موجود ہے جسے اس کا سگرٹ پینا اچھا لگے گا ...... ایک مرد ایک عورت کی قربت سے جو میٹھا میٹھا کیف محسوس کرتا ہے ۔ وہی کیف اب پوری طرح رندھیر پر طاری ہو چکا تھا اور اسی کیف سے متاثر ہو کر اس نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا ۔

" آپ بھی پیجئے ۔ تاکہ خوشبو کے ساتھ ساتھ آپ اس کی لذت بھی محسوس کر سکیں ۔ یوں بھی تنہا سگرٹ پینے میں لطف نہیں آتا ۔"

شکریہ ! اور یہ کہہ کر عورت رندھیر کے قریب سرک آئی ۔

" پیجئے نا ! ....... رندھیر نے زور دیا ۔

" ---- نہیں آپ ہی پیجئے ! میں نہیں پیتی ۔ ایک بار پینے سے بار بار پینے کو دل چاہے گا ۔ بلا وجہ ایک عادت اور پڑ جائے گی ۔ اور پھر پریشان ہونا پڑے گا ۔"

رندھیر عورت کے ان جملوں سے مرعوب ہو گیا ۔ اسے اس کے خد و خال میں ذمہ داری ۔ عالی ظرفی اور شرافت نفس کی ملی جلی کیفیات جھانکتی نظر آئیں ۔ بہت دیر تک وہ سگرٹ سے متعلق دلچسپ لطائف عورت کو سناتا رہا ۔ عورت بھی کبھی کبھی مسکرانے کے بجائے قہقہہ لگاتی اور رندھیر کو ان قہقہوں پر جل ترنگ کا گمان ہونے لگتا ۔ گفتگو کے اس تسلسل نے شانتی کے تصور پر ایک گہرا پردہ ڈال دیا ۔ گیارہ کا گھنٹہ بجے بھی کافی دیر ہو چکی تھی مگر باتیں ابھی باقی تھیں ۔ یکایک رسماً رندھیر نے سوال کیا ...... آپ یہاں کس جگہ رہتی ہیں ؟ دیکھنے میں تو آپ یو پی کی معلوم ہوتی ہیں ۔ کم از کم شرنارتھی

" جی ہاں میں آگرہ کی رہنے والی ہوں ۔ اور یہاں سے بالکل قریب گرانٹ روڈ پر میرا مکان ہے ۔"

" آپ کے گھر کے لوگ تو آپ کے ساتھ ہی ہوں گے ۔" رندھیر ویسے ہی پوچھ بیٹھا ۔

عورت نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ۔" گھر کے لوگ تو سبھی کے ساتھ ہوتے ہیں ۔"

" تو پھر رات میں اکیلے کیسے آئیں آپ ؟"

" جب اکیلے آنا پڑتا ہے تو اکیلی ہی آجاتی ہوں ۔ کیا کروں بیٹھے بیٹھے کیسے چل سکتا ہے ۔ عورت نے نظریں جھکاتے ہوئے ریت پر اپنی چپل سے لکیریں بناتے ہوئے جواب دیا ۔"

رندھیر نے بمبئی میں اس طرح تنہا مل جانے والی عورتوں کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں سن رکھی تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر سنسنی خیز! سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگا۔ مگر اس عورت کے رنگ ڈھنگ اور گفتگو سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اچھے گھر کی شریف عورت ہے۔

"یہاں بیٹھے بیٹھے آخر کیا کریں گے آپ آیئے چلئے نا کہیں تھوڑا سا گھومیں؟"

رندھیر چونکتے ہوئے بولا "کیا روشنی دیکھنے؟"

"روشنی میں کیا رکھا ہے؟ وہ تو لڑکی ضد کر رہی تھی اسے دکھانے لے آئی تھی۔ چلئے اگر آپ کے ہاں جگہ ہو تو وہاں چلیں ورنہ میرے گھر چلئے —"

— عورت یہ نہ کہنے والی بات نہ جانے کیسے کہہ گئی۔ یہ سنتے ہی رندھیر کا ہاتھ جو سگرٹ کو منہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ کانپ گیا... بیس برس کے درمیان پر ابھی ابھی جو ایک پردہ سا پڑ گیا تھا۔ وہ اس جملے سے تار تار ہو گیا اور پرانے مناظر پھر نظر آنے لگے۔ شانتی بے تابیاں، جوانی کی نئی امنگیں، شانتی کے حصول کی تمنا، باپ کی مخالفت۔ اس مخالفت سے تنگ آ کر اس نے گھر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور ایک کمرہ کرایہ پر لے کر اس میں رہائش پذیر ہو گیا اور پھر ایک دن محبت کے نشہ میں سرشار شانتی کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ دونوں پہلی بار آزادی کے ساتھ ملے اور اس آزادی کے ساتھ انھیں یہ کچھ یاد نہ رہا کہ وقت اپنی منزلیں برابر طے کر رہا ہے۔ نصف شب کو جب محبت کا خمار ٹوٹا۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ دو بجے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ شانتی نے لرزتی ہوئی آواز میں اس سے سوال کیا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ گیندے کے پھولوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ مگر اس نے شانتی کی اس گھبراہٹ کے باوجود کس مستقل مزاجی سے جواب دیا تھا۔

شانتی! جو نہیں ہونا چاہیئے تھا وہ ہو گیا...... مگر جو ہو گیا سو ہو گیا...... اس لئے اب تم گھر نہ جاؤ۔ آج سے ہم تم دونوں ایک ہیں۔ میں تمہاری خاطر ساری دنیا سے ٹکر لینے کو تیار ہوں۔ مگر شانتی یہ سن کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ گھر جانے کو مصر تھی اور اس کی ضد سے تنگ آ کر وہ اسے چھوڑنے چلا۔ شانتی اپنے گھر کی طرف اس طرح جا رہی تھی جیسے ملزم تختہ دار کی طرف جاتا ہے وہ اس درجہ پابند نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ پیچھے لوٹنا چاہتی ہے۔ مگر کوئی غیبی طاقت اسے پیچھے نہیں لوٹنے دیتی۔ گھر کی گلی کے قریب پہنچ کر اس نے اسے کس حیرت سے دیکھا تھا کتنی التجائیں اور سوگوار یاں اس کی منفعل نگاہوں میں کانپ رہی تھیں۔

پھر کیا ہوا؟........ کیسے ہوا؟....... اور کیوں ہوا؟ اس کا تو اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اگلے دن وہ شانتی سے ملنے کے لئے کس قدر بیتاب تھا دن گزارنا اسے دوبھر ہو رہا تھا ایک ایک لمحہ اسے ایک ایک صدی معلوم ہو رہا تھا۔ شام کو جب وہ شانتی کے محلہ میں پہنچا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ رات کو اندھیرے میں اس کی شانتی مکان کی چوتھی منزل سے گر کر اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے اور لوگ اسے سپرد آتش کرنے گئے ہیں۔ یہ سن کر وہ پاگل سا ہو گیا...... مگر زندہ رہا...... وہ بزدل تھا — وہ شانتی کی طرح بہادر نہیں تھا جبھی تو مسلسل عزائم کے باوجود وہ خودکشی نہ کر سکا۔

— اور بیس برس سے اپنے باپ کی ناانصافی اور اس رات کی اس اندوہناک لغزش کے کفارے کے طور پر وہ اپنے آپ سے لڑ رہا ہے۔ اپنی زندگی سے جنگ کر رہا ہے۔ ہر خوشی اور ہر مسرت اس کے لئے گناہ کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ خوشیوں اور مسرتوں سے بھاگتا ہے۔ اسے غم سے پیار ہے وہ اپنے جسم کو مختلف سزائیں دیا کرتا ہے۔ اچھا کھانا، اچھے کپڑے اور تفریحات اس نے ان سب کو اپنے لئے ممنوع قرار دیدیا ہے۔ اور شادی یا عورت کی رعنائیوں کے مفہوم سے تو قطعی ناآشنا ہو چکا ہے لیکن بیس برس کا یہ طویل عرصہ بھی اس رات کی لغزش کی تابانی کو ذرا بھی دھندلا نہ کر سکا ہے۔ مگر آج آدھی رات کے وقت اور وہ بھی ایک عورت کے منہ سے گھر چلنے کی دعوت اس کے لئے ایک معمہ بن گئی تھی۔ اس لئے اس نے تعجب سے اس عورت سے سوال کیا۔

"میں آپ کے گھر چلوں! یہی کہہ رہی ہیں نا آپ"

شاہجہاں دہلی

"جی! وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہاں آپ بینچ پر بیٹھے ہیں۔ سڑک ہے اور غیر مانوس ماحول ہم یہاں آزادی سے گفتگو بھی تو نہیں کر سکتے۔ وہ گھر ہے۔ گھر کی سی راحت آپ کو وہاں ملے گی۔ اگر آپ چاہیں تو صبح تک آپ وہاں قیام کر سکتے ہیں۔

اس دعوت نے رندھیر کے ان خیالات کی تردید کر دی جو ابھی نصف گھنٹہ قبل اس نے اس عورت کے بارے میں قائم کئے تھے۔ اسی لئے اس نے جرأت سے سوال کیا۔

"آخر آپ کو میرے آرام کی اتنی پرواہ کیوں ہے اور آپ کا اس سے کیا مطلب ہے؟"

مطلب کیا ہے؟ اس نے آنکھیں چراتے ہوئے بہت آہستگی سے کہا۔

"....... آپ چلیں گے تو بس پچیس...... اور نہیں تو۔ کم از کم دس پندرہ روپیہ تو...... دے ہی جائیں گے...... فاحشہ رنڈی! بے حیا! بے ساختہ اس کے دل نے کہا۔ مگر اس کے باوجود اس کا غصہ کم نہ ہو سکا۔ جی چاہتا تھا کہ وہ ان زہر آلود تینوں لفظوں کو ادا کر سکے اس بدکار عورت کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ مگر جلد ہی اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کاروباری لہجہ میں سوال کیا

"آپ نے ابھی کہا تھا کہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر کے لوگ بھی ہیں۔ کیا ان لوگوں کو میری موجودگی ناگوار نہیں ہوگی۔ اور کیا وہ اس پر معترض نہیں ہوں گے؟"

"کاش کوئی اعتراض کرنے والا ہوتا۔ عورت کی آواز غم میں ڈوبی ہوئی تھی:

"غم تو یہی ہے کہ کوئی اعتراض کرنے والا نہیں۔ میرے شوہر تین سال قبل اپنے ماں باپ سے لڑ کر مجھے ساتھ لے کر یہاں نوکری تلاش کرنے آئے تھے۔ یہاں میں اپنی بہن کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی تین ماہ کی مسلسل جد و جہد کے بعد نوکری سے مایوس ہو کر میرے شوہر تنہا واپس ہو گئے کیونکہ ہم سب کے جانے کا کرایہ ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ آئندہ مہینہ کرایہ بھیج کر بلالوں گا مگر آج تک کرایہ نہیں آیا۔ میرے بہنوئی بھی بیکار ہیں۔ سنیما میں نہ جانے کیا کرتے ہیں۔ صرف ایک بار گھر آتے تھے وہ بھی اس لئے کہ تین دن کے بھوکے تھے۔ ان تین سالوں میں انہوں نے ایک ہی بار ان کی صورت دیکھی ہے اس کے بعد سے تو وہ گھر کبھی آئے نہیں ہمیں تو اب یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے۔ میری یہ لڑکی ہے میری بہن کے دو بچے ہیں اور خود میں اور میری بہن ہے۔ پانچ جانیں ہیں چالیس روپیہ اس کھولی کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔ جسے مالک مکان فلیٹ کہتا ہے۔ کوئی زیور کوئی برتن اور کوئی پونجی ہمارے پاس نہیں ہے۔ صرف لے دے کر ہمارے پاس ہمارا یہ جسم ہے۔ اور اس آڑے وقت میں یہی کام آرہا ہے۔ اور بھوک اس جسم فروشی پر قطعی معترض نہیں ہوتی۔ عورت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی مگر آنسو ختم نہیں ہوئے تھے۔

رندھیر کچھ نہ بول سکا۔ اس کی نظروں کے سامنے ہزاروں بھوکے عریاں جسم اور فاقہ زدہ چہرے ناچنے لگے۔ عورت اب سسکیاں لے رہی تھی اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سیتا رو رہی ہو۔ نہ جانے ہندوستان کی کتنی سیتاؤں کا تقدس اس پیٹ کی وجہ سے مجروح ہو چکا ہے اور کتنی جوانیاں عصمت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں اور پھر اسے یکایک اپنے اوپر غصہ آنے لگا کہ اس نے اس مجبور بے سہارا اور بے کس عورت کو رنڈی، فاحشہ اور بے حیا کیوں سمجھا یہ اس کی اپنی بہن بھی تو ہو سکتی تھی۔ اس کی ماں بھی تو ہو سکتی تھی اور کیا معلوم یہ مستقبل کے اس ننھے انسان کو جنم دینے والی ماں ہو جو کل اس ماحول کو بدل دے گا۔ جب جوانیاں بھوک کی خاطر جسم نہیں بیچیں گی، جب سیتا کا تقدس مجروح نہ ہوگا جب عورت ہوگی۔ وہ ایک بہن ہوگی۔ ایک ماں ہوگی، اور اس ماں کی پاکیزہ آغوش میں نیا انسان پلے گا ایسا انسان جو اتنا مجبور نہ ہوگا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اجنبی شہر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ کر اور خود بھاگ جائے۔

●●

اطلاع:

جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ ساتھ ہی ارسال فرمائیں۔

منیجر

# عہدِ رفتہ

شفیق صدیقی
جامعہ کالج نئی دہلی

## کل

ایک شہر تھا مشرقی روایات کا
گہوارہ تھا مشرقی تمدن کا
نمونہ تھا اعلیٰ کردار کا۔ ہندوستانی تہذیب کا۔ اخلاق کا۔
مرکز تھا صحت مند سیاست کا۔
مسکن تھا عزت وآبرو کا۔

## مگر آج

ایک شہر ہے "آزاد ہندوستان" کا۔
امتزاج ہے مشرقی ومغربی تمدن کا۔
بدترین دھبہ ہے ہندوستانی تہذیب واخلاق کا۔
مرکز ہے گری ہوئی سیاست کا۔
گڑھ ہے دھوکہ بازوں کا۔ عصمت فروشوں کا۔ بے شرموں کا۔ بداخلاقوں کا۔
ڈاکو ہے عزت وآبرو کا۔

## اور

ل ہم غلام تھے۔
ج ہم آزاد ہیں۔

شاہجہان دہلی

# بنگلہ دیش اور جن سنگھ (تیسری قسط)

شمس الاسلام
متعلم ایم۔ اے۔ (سیاسیات)
دلی یونیورسٹی دہلی

**پرانے** شکاری نیا جال لے آئے تو ہیں۔ جن سنگھ کا بنگلہ دیش کے لئے ستیہ آگرہ شروع ہو چکا ہے۔ بنگلہ دیش میں جو کچھ جمہوریت آزادی اور انسانی حقوق کے خلاف ڈکیٹر یحییٰ خاں نے کیا ہے جن سنگھی لیڈر شپ اس سے بہت متاثر دکھائی پڑتی ہے۔ اس بہت ظلم و بربریت کے خلاف جن سنگھی نیتاؤں کے آنسو روتے نہیں رکتے۔ یہ ستیہ گرہ حکومت ہند کی بنگلہ دیش پالیسیوں کے خلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بھارتی حکومت نے امریکہ اور چین کے دباؤ میں آکر یحییٰ خاں کو بنگلہ دیش میں من مانی کرنے کی چھوٹ دی رکھی ہے۔ ان کے مطابق حکومت ہند کو فوراً اعلان جنگ کر دینا چاہئیے تاکہ ہندوستانی فوجوں کو بنگلہ دیش آزاد کرانے کے لئے روانہ کیا جا سکے۔ اور فوراً بنگلہ دیش کی تاج الدین حکومت کو تسلیم کر لینا چاہئیے۔ بنگلہ دیش کے عوام کے لئے جن سنگھ کا یہ درد اور محبت کتنی بھلی معلوم دیتی ہے۔ ان کی تقاریر اور باتیں سن کر یہ احساس ہوتا ہے جیسا کہ ساری دنیا میں جن سنگھ سے بہتر بنگلہ واسیوں کا کوئی دوست نہیں اور بنگلہ دیش میں جمہوریت کے قتل عام پر ان غریبوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ لیکن جو چیز چمکتی ہے ضروری نہیں کہ سونا ہی ہو۔ جن سنگھ کے ستیہ آگرہ کا مقصد بنگلہ دیش کی بھلائی یا ان کی آزادی کی لڑائی میں ان کی مدد کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس ستیہ گرہ کے ذریعہ وہ اپنی سیاسی مارکیٹ میں Goodwill بنانا چاہتے ہیں جسے پچھلے الیکشن میں بہت زبردست دھکا لگا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جن سنگھ کے پاس کوئی ایسا معاشی یا سماجی سدھار کا پروگرام نہیں ہے جس کی بنیاد پر وہ ووٹروں کو اپنی طرف مائل کر سکے۔ پچھلے سارے الیکشنوں میں جن سنگھ نے بہت چالاکی سے عوام کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے اس قسم کی تحریکیں چلائیں کہ جن کا عقل و حقیقی مسائل

سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً پچھلے دو الیکشنوں میں اس
نے شری شیاما پرشاد مکرجی کی موت کو الیکشن اسٹنٹ
بناتے رکھا۔ پچھلے دو الیکشن اس نے گائے کے نام پر
لڑے۔ لیکن چونکہ اس سب کے باوجود اس کی حالت
قابل رحم رہی تو یہ ان کا نیا شوشہ ہے انھیں بنگلہ دیش
سے بالکل محبت نہیں یہ بنگلہ دیش ستیہ آگرہ کے ذریعہ
صرف بھارت میں کچھ سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتے
ہیں۔

جن سنگھ جن پالیسیوں پر اپنے ہی ملک میں
عمل کر رہی ہے ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کیسے یقین
کر لیں کہ جن سنگھ واقعی آزاد بنگلہ دیش کا قیام چاہتی
ہے۔ اگر آپ جن سنگھ کے پچھلے انتخابی منشوروں
(Manifesto) اور پارٹی لیڈروں کے
بیانات کا جائزہ لیں تو اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ
جن سنگھ کسی بھی طرح بنگلہ دیش کی جدجہد کی حامی
ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہم ایسا اس لئے کہتے
ہیں کیونکہ بہت سے تلخ حقائق ہمارے سامنے ہیں۔

جن سنگھ بنگلہ دیش کی حمایت کا دعویٰ کرتی
ہے۔ ہماری حکومت کی طرح اس کے لیڈروں کا کہنا ہے کہ
اس جدجہد کی حمایت کرنا ہمارا فرض ہے کیونکہ یہ جدجہد
بہت زیادہ مرکزیت اور مرکز کے ہاتھوں میں ضرورت سے
زیادہ طاقت کے اجتماع کے خلاف ہے۔ یہ کہتے ہوئے
جن سنگھ کے حامی یہ بھول جاتے ہیں کہ خود ہندستان
میں وہ ایک طاقت ور مرکز کے لئے لڑتے رہے ہیں۔ وہ وفاقی
جزیہ (Federalism) کے خلاف ہیں۔ اپنے
پچھلے سارے الیکشنوں کے پروگراموں میں انھوں نے اس
بات پر اصرار کیا ہے کہ اگر بھارت کی بھلائی ہمارا مقصد ہے "
اور ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا اتحاد برقرار رہے تو
ہمیں مرکز کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے پڑیں گے۔
جن سنگھ کی لیڈرشپ نے ہمیشہ کسی بھی اس قدم کی مخالفت
کی ہے جس کے ذریعہ صوبوں کو کچھ اور اختیارات دینے
کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ جب علاقائی عوام کی مانگ پر نئی ریاستیں
وجود میں آنے لگیں تو جن سنگھ نے ہمیشہ اس کی مخالفت
کی۔ ان حالات میں کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے کہ جن سنگھ
بنگلہ دیش کے لئے ستیہ آگرہ کر سکتی ہے۔

جن سنگھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ بنگلہ دیش کی حمایت
کرنا ایک طرح سے ہمارا فرض ہو جاتا ہے کیوں کہ ہم
جمہوریت کے متوالے ہیں اور بنگلہ دیش میں یحییٰ خاں
کی ڈکٹیٹر شپ نے جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔
وہاں پر عوام کا قتل عام صرف اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ
انھوں نے بہادری سے کھڑے ہو کر اپنے جائز حقوق
کی مانگ کی ہے۔ بہت خوب۔ یہ وہی جن سنگھی ہیں
جنھوں نے ہندوستان میں جمہوریت کا خاتمہ کرنے
کی کوشش کی ہے۔ جب مغربی بنگال میں جمہوریت
کا جنازہ نکل رہا ہے تو یہ چین کی بنسری بجا رہے ہیں۔
ان کے مطابق جو ظلم و ستم کا دور مغربی بنگال میں شروع
ہو چکا ہے اس سے "جمہوریت بچاؤ" تحریک کو بہت
فائدہ حاصل ہوگا۔ یہی بات یحییٰ خاں بھی کہتا ہے۔ اس کے
مطابق "پاکستانی جمہوریت" کی حفاظت کے لئے بنگلہ
دیش واسیوں کو ایک سخت قسم کا سبق سکھانے کے لئے
ان کا قتل عام ضروری ہے۔ یحییٰ خاں جو کچھ بنگالیوں
کے ساتھ کر رہے ہیں بہت افسوسناک اور شرمناک
ہے۔ لیکن جن سنگھ کا جو نقطۂ نگاہ مغربی بنگال کے مسئلہ
کے حل کے لئے ہے وہ مغربی بنگال کے بنگالیوں کے

سلوک و برتاؤ کرنے کا خواہش مند ہے۔ وہ بھی بنگالیوں کو ایک مزیدار سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ بنگال میں جو قتل عام اور ظلم پولیس اور فوج کے ذریعہ کیا جارہا ہے۔ جن سنگھ نے اس کے لئے کتنی آہیں بھری ہیں۔ اس دوغلی پالیسی سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ان کا کیا مقصد ہے؟ یقیناً ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہم کیسے یقین کرلیں کہ وہ لوگ جو اپنے ملک میں جمہوریت کی رسوائی کر رہے ہیں اس کا گلا گھونٹ رہے ہیں وہ کسی غیر ملک کے عوام کی جمہوری لڑائی سے ہمدردی رکھ سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہمیں پورا پورا حق حاصل ہے کہ جن سنگھ کی بنگلہ دیش حمایت کو شبہ کی نظر سے دیکھیں۔

بنگلہ دیش کی ٹریجڈی پر مگر مچھ کے آنسو بہانے والے جن سنگھی کیا اس بات کا جواب دے سکتے ہیں کہ وہ بنگلہ دیش کے حمایتی ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں جب کہ اپنے ہی ملک میں اقلیتوں کو ان کے حقوق نہیں ملنے دیتے۔ اردو کی ہمیشہ مخالفت کی اپنے ملک میں اقلیتی زبانوں کی قبر کھودنے والے جب کہتے ہوئے سنے جاتے تھے کہ بنگلہ زبان کے ساتھ پاکستان میں ناانصافی کی جارہی تھی بنگالیوں کی تہذیب خطرے میں تھی تو ہنسی آنے لگتی ہے۔ کہیں اردو زبان کو ہندوستان میں اس کا حق نہ مل جائے اس کے لئے انھوں نے وہ حرکتیں کی ہیں کہ جس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ جب یو پی میں پہلی SVD گورنمنٹ کا قیام عمل میں آیا تو اس سے پہلے سب پارٹیوں نے سوائے جن سنگھ کے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ اردو کو ریاست کی دوسری زبان تسلیم کیا جائے گا۔ جب اور سیاسی پارٹیوں جو اس SVD کی ممبر تھیں اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو جن سنگھ نے پوری قوت سے اس کی مخالفت کی۔ سبھاش چندر کیشپ نے اپنی کتاب "دل بدل کی سیاست" (Pointy of Defectoing) اس دشمنانہ رویّہ کے بارے میں لکھا ہے کہ جن سنگھی نائب وزیر اعلیٰ شری رام پرکاش نے ایک پریس کانفرنس میں واضح کہا ہے کہ اگر اردو کو ریاست کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا جو کہ SVD کی سب سے بڑی پارٹی بھی ہے SVD سے الگ ہوجائے گی ۴ر اگست کو ایک پالیسی دستاویز میں جن سنگھ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے اس بات کو ایک بار پھر دہرایا کہ اگر یو پی اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا تو دونوں جگہ متحدہ مورچوں کی حکومت سے الگ ہو جائیگی

جن سنگھ کا ایک اور تذاق ملاحظہ ہو۔ بنگلہ دیش:

وہ مغربی پاکستانی سرمایہ داروں کے معاشی استحصال [illegible] کے خلاف ہیں۔ مغربی پاکستانی سرمایہ داروں نے سارے بنگلہ دیش کی دولت مغربی پاکستان پہنچادی ہے۔ آج بنگلہ دیش بھوکا ننگا غریبی سے دوچار ہے کیونکہ وہاں کے سارے معاشی ذریعوں پر مغربی پاکستانیوں کا قبضہ ہے۔ لیکن اسی جن سنگھی ہندوستان میں راجواڑوں ان کی مدد سے الیکشن لڑتے ہیں۔ سرمایہ داروں سے بھائی چارے کی وجہ سے یہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہندوستانی آئین میں دیئے گئے جائیداد کے حق property کو عام لوگوں کے فائدے کے لئے بدل دیا جائے۔ جب پارلیمنٹ میں راجواڑوں کا وظیفہ ختم کرنے کے لئے بل پیش کیا گیا تو یہ اس بات کی حمایت کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔

جن سنگھ نے حکومت سے یہ بھی مانگا کہ

باقی صفحہ

# قطعات

نورالحسن انور ادیب، ایم اے۔ (انگریزی) ایم۔اے (فارسی، اردو

(۱)

کس سے جا کر کہوں بتا اے دوست
زندگی کس طرح گذرتی ہے
زندگی کے تمام دکھ سہہ کر
اک نئے رنگ سے نکھرتی ہے

(۲)

غم دوراں کی مشکلوں میں بھی
جب وہ ہمدرد پھر یاد آتی ہے
سارے دکھ درد بھول جاتے ہیں
اور تبسم سا کھیل جاتا ہے

(۳)

عالم یاس کے اندھیرے میں
ڈوب جاتا ہوں اور ابھرتا ہوں
مجھ کو خود بھی خبر نہیں ہوتی
میں کسی کی تلاش کرتا ہوں

(۴)

خون دل ہو کہ ہو شراب ناب
ہم اے ساقی ضرور پی لیں گے
بے وفاؤں کو یاد کر کر کے
خود ہی اپنا غرور پی لیں گے

(۵)

یاس تنہائی اور غم دوراں
یہ بھی اب جزو ہیں زندگانی کے
دیکھ کر رقص جام و مینا آج
یاد آتے ہیں دن جوانی کے

(۶)

ایک عصمت فروش کی خاطر
ہم نے اپنا ہی گھر جلایا ہے
جانتے بوجھتے بھی اے ہمدم
کیا ظالم فریب کھایا ہے

بقیہ صـــ ۲

بنگلہ دیش کی حمایت میں ہندوستانی فوجوں کو فوراً سرحد پار کرا کے آزاد کرا لینا چاہئے۔ جن سنگھی ہوائی قلعے بنا رہے ہیں۔ عقل کا استعمال کرنا شاید وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔ عقلمندی تو یہ تھی کہ تاریخ سے کچھ سبق حاصل کیا جاتا۔ انسان کی زندگی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ سارے تجربات خود ہی حاصل کرے۔ اس کو اپنی چھوٹی سی زندگی کامیابی سے گذارنے کے لئے اپنے سے پہلے پیدا ہوئے لوگوں اور بہت سی دوسری چیزوں کے تجربات پر منحصر رہنا پڑتا ہے۔ جن سنگھیوں نے اس سبق کی بالکل بھلا دیا وہ یہ بھول گئے کہ Export of revolution "انقلاب کو برآمد" کرنے کی تھیوری ناکام ہو چکی ہے۔ انڈونیشیا اس تھیوری کی ناکامی کی سب سے بڑی مثال ہے۔ انقلاب اور تبدیلی مقامی لوگ ہی لا سکتے ہیں۔ ہندوستانی فوجیں وہاں جا کر قبضہ تو کر سکتی ہیں۔ لیکن بنگلہ دیش کو آزاد نہیں کرا سکتیں۔ کیا آزادی اسی کو کہتے ہیں کہ ایک حملہ آور فوج کو نکالنے کے چکر میں غیر ممالک کی فوجوں کا قبضہ ہو جائے۔

**حقیقت** میں تو جن سنگھ کو بنگلہ دیش سے سبق حاصل کرنا چاہئے تھا۔ بنگلہ دیش جدوجہد نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ مذہب کبھی بھی اتحاد کی بنیاد نہیں ہو سکتا۔ مذہب قوموں کو متحد رکھنے میں ایک ناکام طریقہ کار ثابت ہوا ہے۔ عرب ممالک اس میدان میں مذہب کے ناکامی کی ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔ قومیں مذہب کی بنیاد پر متحد نہیں رہ سکتیں بلکہ ان کے ایک ساتھ رہنے کا فیصلہ معاشی تعلقات کرتے ہیں۔ جن سنگھی جو کہ "اکھنڈ بھارت" کا نعرہ لگاتے ہیں ان کے لئے تو یہ بہت افسوسناک خبر ہونی چاہئے۔ بنگلہ دیش کے واقعات نے تو ان کی پارٹی کے بنیادی اصولوں کو ہی غلط ثابت کر دیا۔ "بھارتیہ کرن" کتاب کے مصنف شری بلراج مدھوک نے پتہ نہیں بنگلہ دیش کے اس پہلو پر غور کیا ہے یا نہیں؟

**اگر** جن سنگھ حقیقت پسند ہے اور بنگلہ دیش کے لئے اخلاص سے کام کرنا چاہتی ہے تو اس کو چاہئے کہ بجائے پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے ستیہ آگرہ کرنے کے وہ اپنے ممبران کو تیار کرے کہ وہ سرحد پار کر کے بنگلہ دیش جائیں اور وہاں کی "مکتی بہنی" کی مدد کریں۔ بنگلہ دیش کے مسئلہ کا حل پارلیمنٹ اسٹریٹ اور دہلی کی گلیوں میں نہیں ہونا ہے بلکہ اس کی قسمت کا فیصلہ تو بنگلہ دیش کی سرزمین پر کیا جائے گا۔ بنگلہ دیش کو آزادی جن سنگھ یا بھارتی حکومت نہیں دلا سکتی یہ عظیم کام وہیں کے عوام کو دینا ہوگا۔ جن سنگھ کی لیڈرشپ کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت اچھے مقرر تو ہیں لیکن مخلص کارکن نہیں۔ ان کا صرف ایک مقصد ہے کہ کسی طرح حکومت پر قبضہ کر لیں اور پھر ایک بار ہندوستان لوٹ جائے جاگیرداروں اور رجواڑوں کے دور میں۔ لیکن شاید ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ ہندوستانی عوام اب کافی ہوشیار ہو چکے ہیں۔ وہ اب شعبدہ بازی کے چکر میں نہ پڑ کر ناپسند نہیں کرتے ۱۹۷۱ء کا وسط مدتی چناؤ اس کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ جن سنگھ بنگلہ دیش مسئلہ کو ایک فرقہ وارانہ مسئلہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن وہ اپنے پلان میں ایک بار پھر منہ کی کھائیں گے۔ اگر مذہب بطور بنیادِ سیاست بنگلہ دیش، پاکستان میں فیل ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں بھی وہ ناکام نہ ہو۔ جہاں تک جن سنگھ کے ستیہ آگرہ کا تعلق ہے وہ "دورِدھ آگرہ" زیادہ ہے۔ اور ستیہ گرہ کو دھوکہ دینے کی ایک بہت معیوب لیکن دردبھری ترکیب ہے

شاہجہاں دہلی

# غزل

عبدالوحید واحد فیاضی

خلوت میں شمعِ اشک فروزاں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں دل کا چاک گریباں کئے ہوئے

شعلہ بداماں برقیں اچھلتی نقاب سے
آتا ہے کوئی حشر کا ساماں کئے ہوئے

غارتگرِ تحمل و ایمان و صبر و ضبط
لاکھوں قلوب زلف میں پنہاں کئے ہوئے

اہل جہاں میں کوئی بھی ایسا ہی دوستو!
گردشِ زمانہ جس کو پریشاں کئے ہوئے

شاید مجھ ہی پہ ختم ہے رودادِ رنج و غم
سب لے چلا ہوں سینے میں پنہاں کئے ہوئے

یہ دردِ بیکراں میں چھپاؤں تو اف کہاں
بنتی نہیں بغیر نمایاں کئے ہوئے

واحد نہ ذکر کیجئے ابرِ بہار کا
لوٹا ابھی ہوں دل کو مسلماں کئے ہوئے

سید جعفر عسکری

الہ آباد یونیورسٹی

دور تک امید کا اپنی شجر کوئی نہ تھا
تھا سفر دشتِ بلا اور ہمسفر کوئی نہ تھا

بعد مدت کے ملا تھا ایک منزل کا سراغ
جب بڑھا آگے نشانِ رہگذر کوئی نہ تھا

سرد زنداں میں مکانوں کے ہیں سب ہی اسیر
گرم باہر کی فضا سے باخبر کوئی نہ تھا

دیکھنے والوں کی نظروں میں تماشا بن گئے
شہر میں کچھ لوگ، واجن پرکر در کوئی نہ تھا

شب میں اب کیوں یاد آتے ہیں فایارکے
خواب کچھ ایسے کہ جن میں معتبر کوئی نہ تھا

اور جیسے اس کا کلیجہ پھٹ گیا۔

"جمال ......!"

"ہوں ......!"

"کچھ سنا تم نے ۔"

"ہاں میں سن چکا ہوں ۔ تم کسی اور کی ہو چلیں"،
سسکتے ہوئے کہا اس نے ۔

"میں مجبور تھی جمال ...... میں مجبور ہوں جمال،
کیا کہوں ؟ کیسے کہوں ؟"

"کچھ نہیں ...... یہ نہیں ہو سکتا پردین، تم کسی
اور کی نہیں ہو سکتیں، تمہیں کوئی اور نہیں لے جا سکتا تم میری
ہو ...... میری پردین ...... میری دلہن"

وہ برداشت نہ کر سکی اور آنسوؤں کی مالا بہہ نکلی۔
اس کے رخساروں پر۔ جمال نے سسکی لی اور آنسو
چھپانے کی کوشش کرتا ہوا دور خلاؤں میں کھو گیا۔

"اب کیا ہوگا جمال!" درد بھری آواز میں پردین
نے پوچھا۔

"فیصلہ ...... انصاف ......!"

"کب ؟"

"اسی وقت ۔"

"کیسے ؟"

"آؤ میرے ساتھ!"

"مگر کہاں ؟"

"آؤ تو!"

"یہ کیا! پستول ؟ یہ تو ڈیڈی کا ہے ۔"

"ہاں ...... یہی انصاف اور فیصلہ کرے گا، اس
کی آواز ہی تو گونگے اور بہرے سماج کے کان کھولے
گی اور ازل سے اندھی آنکھیں کچھ دیکھ سکیں گی ۔

پھر پردین محبت کے پجاری سکون کا سانس لے سکیں
گے ...... مگر تم خاموش کیوں ہو؟ ذرا میرے پاس
آؤ ...... اور نزدیک! وہ دیکھو آسمان پر ستارے
چاند سے اٹھکھیلیاں کر رہے ہیں، چاند مسکرا رہا ہے
ہمارے ملن پر، سحر آگیں نظارے خنداں ہیں ہماری
محبت پر، اور یہ فضا کتنی حسین ہے پردین ...... کیوں نہ ہم
اس پرکیف ماحول میں اس ظالم سماج کے آہنی پنجوں
سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کے ہو جائیں، کیا تم میرا
ساتھ نہ دو گی پردین؟"

"میں تمہاری ہوں جمال ...... صرف تمہاری۔"

"پھر دیر کس لئے، لو پستول اور دکھا دو سماج
کو کہ محبت کے پرستار یوں بھی ملتے ہیں ۔"

"میرے سرتاج ...... اس مقدس ماحول کی قسم
پردین تمہاری ہے، تمہارے لئے ہے، اس کا سب کچھ
تمہارا ہے، آج سماج کے اندھے اور بہرے دیوتا دیکھ
سکیں گے، کچھ سن سکیں گے ۔"

"میری پردین! ...... میری اچھی پردین ......
چلاؤ نہ جلد پستول مجھے نیند سی آنے لگی ہے تمہاری آغوش
میں ...... عزم ...... حوصلہ ...... میرے خدا!
پردین ...... میری جان ...... میری ...... دل ...... ہن!"

"جمال ...... میرے اچھے جمال! ...... میں بھی
چلوں گی تمہارے ساتھ، مجھے بھی تو ساتھ لے لو۔"

دوسری گولی کی آواز۔

"میرے آقا ...... میرے مالک ......!"

اس نے گھاس پر سسکتے ہوئے جمال کے گلے
میں باہیں ڈال دیں۔

"میں بھی آگئی میرے سر ...... تا ...... ج!"

شاہ جہاں دہلی

# بدلتا وقت

شمس الاسلام

سدا خندہ زن

اداسی کا دشمن

محفلوں کی جان

قہقہہ رزم و بزم کا سرتاج

روتوں کو ہنسانے والا

خوشی کا پیکر، شادمانی کا پیمبر

کچھ سنا۔۔۔۔؟

آج اس نے بھی غم سے گھبرا کر

خودکشی کر لی۔!
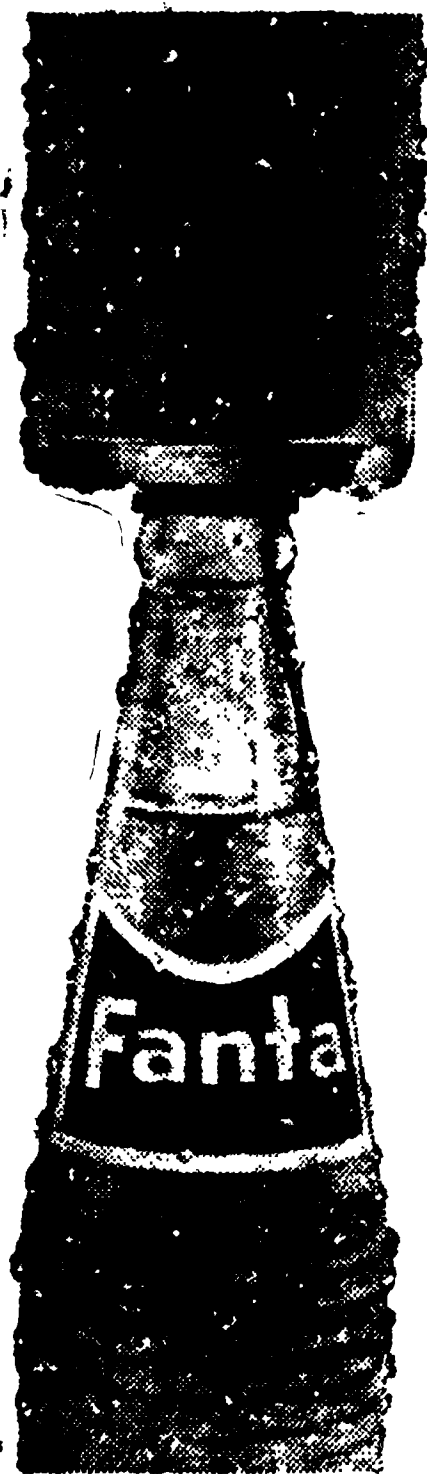
# DID YOU EVER TASTE A BOTTLE OF FUN?

**FANTA ORANGE TASTES SO GOOD, IT'S FUN TO BE THIRSTY.**

Bottled under authority of the Coca-Cola Co...

**PURE DRINKS (NEW DELHI) PRIVATE LTD.**

شاہد

# خیالات کے جھروکے سے ۔ ۔ ۔ ۔

## قارئین کے خطوط کے اقتباسات

●

.....اگست ۷۱ کا شمارہ ہر لحاظ سے ادبی اور معیاری پرچوں کی برابری کرتا ہے کتابت کی غلطیاں جو شاہجہاں کا طرۂ امتیاز رہی ہیں اس میں نہ ہونے کے برابر ہیں ــــ شمس الاسلام صاحب کے مضامین سیاسی بصیرت اور معلومات عامہ میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں ــ زیر نظر شمارے میں محترمہ شاہینہ خاں کا افسانہ دل پر اثر کرتا ہے۔ انکا انداز تحریر اور انداز بیان خوب ہے اور لائق ستائش ہے ــــ نیا عنوان "چھیڑ خوباں سے چلی جائے" پسند آیا اپنے نشتر باز کو مبارکباد پیش کر دیجئے۔

لکھنؤ — افضال احمد

●

.... محترمہ نجمہ بہن کی شادی کی مبارکباد میری طرف سے بھی قبول ہو

علی گڑھ — سلمہ خاتون

●

... ہر چند شاہجہاں ترقی کی طرف گامزن ہے مگر معاف کیجیے گا بہت سست رفتاری سے ــ ابھی اس میں بہت سی کمیاں ہیں اور بہت سی چیزیں غیر ضروری ہیں۔ شاہجہاں کو طلبہ کیلئے مفید بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ایسے مضامین شائع کیے جائیں جو طالب علموں کے لیے مستقبل میں مشعل راہ ہوں مثلاً کون کون سی یونیورسٹیوں میں کیا کیا کورس پڑھائے جاتے ہیں اور ان کے لئے اہلیت کیا ہے۔ بی۔اے۔ یا ایم۔اے۔ کے بعد نوکری کس طرح مل سکتی ہے روزگار کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ چیزیں شاہجہاں میں چھاپی جائیں تو یہ آپکا نہ صرف طلبہ پر احسان ہوگا بلکہ ملک کی بھی ایک عظیم خدمت ہوگی۔

دہلی — اکرام الدین

●

.... اگست کے شاہجہاں میں شائع شدہ افسانوں میں مس شاہدہ خاں کا افسانہ دوسرے تمام افسانوں

پر اپنے اچھوتے پلاٹ اور بہترین اندازِ بیان کی وجہ سے حاوی ہے۔ غزلوں میں شباب عراقی کی غزل قابلِ تعریف ہے۔ ہماری طرف سے ہر دو حضرات کو اسکے مبارکباد دیجئے۔

روزینہ، پروین، شکیلہ
علی گڑھ

●

.... محترمہ نجمہ مزمل کو ان کی شادی پر ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ قبول فرمائیے۔

بہت سے ساتھی

—— محترمہ نجمہ صاحبہ کو بہت سے ساتھیوں نے مبارکباد کے خطوط ارسال فرمائیں —— ادارہ سب کا شکرگزار ہے۔

●

.... پچھلے دنوں آپ نے دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا اب اس سلسلے میں آپ کی پُراسرار خاموشی اپنے سینے میں کوئی راز رکھتی ہے ——؟

اسلم جاوید
الہ آباد

—— ہم نے شعبہ اردو کے خلاف کچھ نہیں لکھا تھا بلکہ ہم نے مشترکہ میں اردو ایم۔ اے۔ کے رزلٹ میں مبینہ خرد برد کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ جسکے ٹھوس ثبوت بتایا جاتا ہے کہ طلبہ کے پاس ہیں۔ اب چونکہ یہ مسئلہ مقدمے کی شکل میں عدالت میں زیرِ سماعت ہے اسلئے اس پر اظہارِ رائے توہینِ عدالت کے مترادف ہوگا۔

ادارہ

●

.... شاہ جہاں میں طالب علموں کے انٹرویو یا "افکارِ نو" کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیجئے اور آپ نے تو "....رسوا کیا مجھے۔" بھی بند کر دیا۔ حالانکہ یہ چیزیں بہت ضروری ہیں۔

نسیمہ نواب
دھلی

●

.... شمس الاسلام صاحب اگر اس سیاست کو چھوڑ کر اپنی ادبی صلاحیتوں کی طرف توجہ دیں تو جلد کامیاب ہو سکتے ہیں —— محترمہ شاہینہ خاں کا افسانہ انتقام بہت خوب ہے۔ شاہینہ صاحبہ نظم کی بجائے نثر کی طرف توجہ دیں۔ ان کی نثر اچھی ہے۔

احمد رشید
علی گڑھ

● ●

---

**شاہ جہاں** کو بہتر بنانے کیلئے اپنے گراں قدر مشوروں اور رائے سے ضرور نوازیں۔ ——

منیجر

---

# جرعات

شاہجہاں دہلی

# لمحۂ فکر

## دلی یونیورسٹی میں انتخابات

پچھلے ماہ دہلی یونیورسٹی میں ہوئے دو الیکشن یونیورسٹی کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلا الیکشن دہلی یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن (D.U.T.A) کے صدر اور مجلس عاملہ مستقلہ (Executive Committee) کے ۱۵ ممبران کو چننے کے لئے ۳۱ راگست کو ہوا۔ دوسرا الیکشن دہلی یونیورسٹی اسٹوڈنٹ یونین کے صدر، نائب صدر، سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری کو چننے کے لئے یکم ستمبر کو مختلف کالجوں میں ہوا۔ ٹیچرز یونین الیکشن میں رائے دہندگان کی تعداد تقریباً ۲۰۰۰ تھی۔ جب کہ جن لوگوں کو اسٹوڈنٹ یونین کے عہدیداران کو چننا تھا ان کی تعداد صرف ۱۲ ہزار تھی۔

ٹیچرز یونین کے الیکشن میں صدارت کے لئے دہلی کالج کے بنگالی کے لکچرار مسٹر کمار ریش چکرورتی نے دوسرے تین امیدواروں کو شکست فاش دی مسٹر کمار ریش چکرورتی کو ۹۱۳ ووٹ ملے جب کہ دیش بندھو گپتا کالج کے مسٹر او۔ پی۔ کوہلی کو ۶۹۲ اور اسی کالج کے مسٹر نراش کو ۲۰۲، ہنس راج کالج کے مسٹر اوما شنکر ماتھر کو ۱۰۵، اور سناتن دھرم کالج کے مسٹر آر۔ سی۔ رستوگی کو صرف ۵ ووٹ ملے۔ اس کے علاوہ مجلس عاملہ کے لئے مندرجہ ذیل لوگ منتخب ہوئے۔

لتیکا سرکار (لا فیکلٹی) کوشل کمار (دیش بندھو) وی۔ پی۔ تلوار (دہلی کالج) چندل (کارسپونڈنس) آر۔ این۔ وج (ہنس راج) کے۔ ایس۔ سلیل (ہنس راج) بی۔ پی۔ سنگھ (والمیکی) آر۔ اے۔ مینی (وی۔ جی۔ اے۔ ایس) مہندر سنگھ (کارسپونڈنس) وی۔ کے۔ سیٹھی (ستیہ وتی دھرم) آر۔ این۔ متل (راج دھانی) سبھاش چکرورتی (سینٹ اسٹیفن) ایچ۔ پی۔ سود (جگت سنگھ) ایچ۔ سی۔ نارنگ (ہستناپور) اور ایس۔ ایس۔ رندھاوا (خالصہ کالج)

اس الیکشن کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ ہر امیدوار کسی نہ کسی سیاسی جماعت کا حمایت کردہ تھا۔ صدارت کے لئے کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ) کے امیدوار مسٹر کمار ریش چکرورتی تھے۔ جب کہ جن سنگھ کے امیدوار مسٹر او۔ پی۔ کوہلی جو کہ اکھل بھارتی ودیارتھی پریشد (جن سنگھ کی طلباء کی تنظیم) کے صدر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ

[illegible]

۔ جن سنگھ نے اپنے امیدوار کو جتوانے کے لئے
ے ذرائع استعمال کئے۔ پارٹی کے بڑے بڑے
ں نے ذاتی طور پر اس الیکشن میں کام کیا۔
س کے باوجود بھی بد قسمتی نے ان کا پیچھا نہیں
۔

مسٹر کمارلیش چکرورتی کی جیت صرف اس وجہ
رتی کہ وہ CPM کے امیدوار تھے۔ بلکہ ان کی
بت کی وجہ تھی ان کا کام جو انھوں نے پچھلے کئی
ں سے اساتذہ کے لئے دہلی یونیورسٹی میں کیا۔
ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اساتذہ کو ان کے جائز
ملیں۔ پچھلے سال وہ یونیورسٹی کی Teachers
Grievances com کے چیرمین تھے اور اس
نے قابل ذکر کارنامے انجام دیئے۔ ان کی مخالفت
سنگھ اور کمیونسٹ پارٹی ایک ہی پلیٹ فارم پر
ا ہوئی نظر آئیں۔ ان کے خلاف سب سے زیادہ
نڈا اس بات کا کیا گیا کہ وہ مارکسسٹ ہیں۔ مسٹر کمار
چکرورتی نے اس بات کا برملا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک
کے دوران کروڑی مل کالج میں کہا کہ وہ کمیونسٹ
ارکسسٹ کو پسند کرتے ہیں۔ اور ایک پکے مارکسسٹ
مختصر یہ کہ اس الیکشن میں جن سنگھ کو شکست
ہوئی۔ اور اس کے مقابلہ میں پروگریسیو گروپ
ریونین پر قبضہ ہو گیا۔

لیکن جن سنگھ نے اپنی اس ہار کا بدلہ دوسرے
ہ لے لیا۔ اسٹوڈنٹ یونین کے الیکشن میں ان کی
ت کردہ امیدوار بھگوان سنگھ (ہندو کالج) نے
ووٹ حاصل کرکے تین دوسرے امیدواروں کو

[illegible]

رام کشن شرما عرف کوشک (ایس۔ ایس۔ پی) ۷۰ ووٹ
دنیش کھوسلہ (آزاد) ۶۰ ووٹ اور قنوج چترویدی (کانگریس)
۳۰ ووٹ، اس طرح کئی سالوں کے بعد جن سنگھ نے
دہلی یونیورسٹی یونین پر قبضہ کر لیا۔ جن سنگھ کی جیت
اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ طلبا جن سنگھ کو پسند کرتے
ہیں، بلکہ یہ ناکامی تھی یونیورسٹی کے ترقی پسند اور
جمہوریت پسند جماعتوں کی جو ایک مشترکہ فاشسٹ
دشمن کے خلاف متحد نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن سنگھ کے
ووٹ تو ایک ہی جگہ گئے اور اس کے خلاف ووٹ
تین جگہ بٹ گئے۔

| جن سنگھ کے حامی ووٹ | | جن سنگھ کے مخالف ووٹ | |
|---|---|---|---|
| (۱) جن سنگھ کے حامی ووٹ | ۱۳۶ | کوشک (ایس۔ ایس۔ پی) جن سنگھ کے مخالف ووٹ | ۷۰ |
| | | دنیش کھوسلہ (آزاد) جن سنگھ کے مخالف | ۶۰ |
| | | قنوج چترویدی (کانگریس) | ۳۶ |
| کل میزان | ۱۳۶ | کل میزان | ۱۶۶ |

پھر بھی یہ کہنا بہت زیادہ صحیح نہیں ہوگا کہ بھگوان سنگھ
جن سنگھ کے امیدوار تھے۔ وہ کانگریس کے زیادہ
قریب تھے لیکن الیکشن کے دوران جن سنگھ نے بہت
چالاکی سے اپنی حمایت کا یقین دلا کر انھیں اپنے ساتھ
ملا لیا۔ جہاں تک نائب صدر کا تعلق ہے اس آفس
کے لئے پہلی بار کسی بھی کمیونسٹ پارٹی کا امیدوار
کامیاب ہوا ہے۔ کامیاب ہونے والے امیدوار کا
نام ہے اوم پرکاش سمن جو کہ آتما رام سناتن دھرم کالج
کے طالب علم ہیں۔ یہ DSU کے سرگرم کارکن ہیں جو کہ
سوشلسٹ یونیٹی سینٹر پارٹی (SUC) کے طلبا کی

شاہجہاں دہلی

تنظیم ہے۔

ان دونوں الیکشنوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ قومی سیاسی جماعتیں اب کیمپس سیاست Campus Politics میں زور و شور سے اور کھلے عام حصہ لے رہی ہیں۔ اور یہ نعرہ کہ طلبا کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔ (Depoliticalize the Students) اپنی ساری اہمیت کھو چکا ہے۔

اس کے علاوہ دونوں الیکشن دو متضاد رجحانوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ایک الیکشن میں تو ساری یونیورسٹی کے اساتذہ نے مارکسی امیدوار کو کامیاب بنایا۔ اور اس کے ایک ہی دن بعد اس ہی یونیورسٹی کے طلبا نے پچھلے دن کے الیکشن کے بالکل برعکس ایک فاسسٹ جماعت کو یونین میں لے جا بٹھایا۔

اسٹوڈنٹ یونین کا جن سنگھ کے قبضہ میں چلا جانا بہت سی مشکلات کا باعث ہو سکتا ہے۔ جن سنگھ کھلم کھلا یونیورسٹی انتظامیہ کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ اسے ایڈمنسٹریشن کے کالجوں میں من مانی نہیں کرنے دیتے۔ چنانچہ وہ یونین کے صدر کو اپنے ناجائز مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ وہ کوشش کریں گے کہ یونیورسٹی میں زیادہ سے زیادہ گڑبڑ ہو تاکہ یونیورسٹی انتظامیہ کا ان کی طرف سے دھیان ہٹا رہے۔ اس کے علاوہ جن سنگھ کے کامیاب ہونے پر کئی کرپٹ پروفیسر اور ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ چین کی سانس لے رہے ہیں۔ کیوں کہ وہ اسٹوڈنٹ یونین کی مدد سے اب اس کوڑے کرکٹ کو یونیورسٹی میں برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ جیسے پچھلے کئی سالوں سے صاف کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اسٹوڈنٹ یونین کے لئے جن سنگھ کی کامیابی جمہوریت پر ایک ضرب کاری ہے۔ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ اب بھی جمہوریت پسند اور ترقی پسند طاقتیں اپنی غلطیوں کو صحیح کر سکتے ہیں۔ آپس میں لڑنے کی بجائے ان کو چاہئے کہ وہ ایک متحدہ محاذ United Front کی تشکیل کریں جس کا بنیادی مقصد ہو دہلی یونیورسٹی سے غیر جمہوری اور فاسسٹ طاقتوں کا خاتمہ اور ان کا اختتام۔ اگر اب بھی انھوں نے اس بات کی اہمیت کو نہیں سمجھا تو ان کی داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ نہ ہی کسی کے لئے ٹھہرتا ہے۔ کامیابی انھیں لوگوں کے قدم چومتی ہے جو وقت کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور صحیح وقت پر صحیح قدم اٹھاتے ہیں۔

●●

# جھوٹی بستی

خصیب الاسلام

جھوٹی بستی
سچے لوگ
آخر کیوں......؟

بستی کے رہبر
سب ہیں چور
ہمارا جیون
ان کا کھلونا
ہمارا پسینہ
ان کا سونا
ہماری لاشیں
ان کے ایواں
ہماری غربت
ان کی عظمت
ہماری ظلمت
ان کی روشن شب

اے ہم نفسو.....!
تم سچے........
جھوٹی بستی پھر کیوں ہو
آواز دو.......
تم کہاں ہو، کہاں ہو

شاہجہاں مرلی

# میسور کی بازاری اردو

نجم الحسن انجم آدیب

بازاری زبان سے مراد وہ زبان ہے جسے عوام عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور تحریر کی صورت بدل کر لکھتے ہیں۔ اور خواص تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں ان کے برعکس صحیح اردو بولتے اور لکھتے ہیں۔

میسور کی بازاری زبان ہی میں نہیں عام طور پر دنیا کی اور زبانوں میں بھی، تقریر کی صورت کی بہ نسبت تحریری صورت کے لفظی اختصار کی ایک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

میسور میں تقریباً ڈیڑھ دو سو برس سے اردو زبان میں کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں اور جو ایک تاریخی ترقی کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اور اب میسور میں اردو زبان کے کئی نثار اور شاعر موجود ہیں۔ جن میں ہر ایک ایک خاص طرز کا موجد ہے۔ مدتوں سے یہاں علامت فاعل "نے" کا غلط استعمال ہوتا آیا ہے۔ اس سے متعلق اب سے ساٹھ باسٹھ سال پہلے شاہ ابوالحسن ادیبؔ نے سیر حاصل بحث کی تھی۔ مولانا شاہ ابوالحسن ادیب یہاں کے کثیر التصانیف ادیبوں میں سے تھے۔ آپ ہی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنی تصنیف کردہ کتابیں پہلی مرتبہ سرکاری مدارس میں داخل کروائیں۔ اور مرتے دم تک مسلسل لکھتے رہے۔

آج کل یہاں کئی صاحب تصانیف پائے جاتے ہیں۔ یہاں سے تین روزنامے آزاد، سالار، اور پاسبان نکلتے ہیں۔ اس سے پہلے الکلام اور سلطان بھی نکلے تھے۔ ہفتہ وار پرچوں میں "دلنشین" "کارواں"، "جمہوریت"، "تنظیم"، "لیڈر"، "قوم"، "ذاکر"، "حیات نو" اور "خطیب" نکلتے ہیں۔ مگر کوئی ماہنامہ نہیں نکلتا۔ پہلے ممتاز شیریں کا "نیا دور"، جمیل کا "ترقی"، اور شباب یزدانی کا "غزل" ماہنامے نکلتے تھے۔ اور سہ ماہی رسالوں میں محمود ایاز کا "سوغات"، نورالحسن کا "نیا دور" نکلتے تھے۔ مگر اب کوئی سہ ماہی پرچہ بھی نہیں نکلتا۔

میسور کی بازاری زبان پر اب سے ساٹھ باسٹھ سال پہلے مولانا شاہ ابوالحسن ادیبؔ نے "جوہر اردو" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ جسے الکلام پریس بنگلور نے شائع کیا تھا۔ اس میں ثابت کیا گیا تھا کہ یہاں افعال

مختصر کرکے بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ:
جاؤں (جاتا ہوں) آؤں (آتا ہوں) وہ آتیں (وہ آتے ہیں) وغیرہ۔ اسی طرح ضمیروں کا بھی حال ہے۔ چنانچہ:
اُنے (اُس نے) اِنے (اِس نے) مُنجے (مجھے) ہمنا (ہمیں یا ہم کو) تمنا (تمہیں یا تم کو) خواہ وہ افعال ہوں یا ضمائر یا اسما پورے پورے بولے جائیں تو شمالی ہند کی اردو کا صحیح نمونہ ہوگا۔
کاں (کہاں) واں (وہاں) کی (کیوں) کاکو (کاہے کو) ہیاں (یہاں) جاں (جہاں) وغیرہ وغیرہ۔
اس کتاب میں ایسی باتیں اور تذکیر و تانیث کا اختلاف دکھلاکر ملک کے طالب علموں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ صحیح اردو بولنے کی عادت ڈالیں۔ اب میں یہاں ان الفاظ کا ذکر کرتا ہوں جو عام طور پر میسور کی بازاری زبان میں بولے جاتے ہیں اور دلی کی ٹکسالی زبان میں ان کی جگہ دوسرے الفاظ بولے جاتے ہیں۔

| میسور کی بازاری زبان کے الفاظ | دلی کی ٹکسالی زبان کے الفاظ |
|---|---|
| چھاتی | سینہ |
| پھسلی | پسلی |
| کمبر | کمر |
| گربنگا | گھٹنا |
| کلّا | رخسار |
| انکھیاں | آنکھیں |
| کندھا | بازو |
| منڈی | گردن |
| گوراگٹا | خوب صورت |
| پوں | پیر |
| لٹو ہونا | عاشق ہونا |
| تڑا آسامی | مالدار |
| ننگا منگا | برہنہ |
| پلو | دامن |
| پٹھا | شاگرد |
| رنڈی | طوائف |
| جھاڑ | درخت |
| بھیترے | ٹماٹر |
| بیری | ثمر علی |
| پھوٹ | خربوزہ |
| کلنگڑا | تربوز |
| مچھی | مچھلی |
| سپلک | چھپکلی |
| کنڈم | نالائق |
| جورو | بیگم |
| ٹوال | تولیہ |
| نگوس | نیولہ |
| فضر | فجر |
| دوفار | دوپہر |
| ٹھنڈ کالا | موسم سرما |
| دھوپ کالا | موسم گرما |
| پیپل کے جھاڑ | برگد کے درخت |
| درفہ | درگاہ |
| غلاٹا | گڑبڑ |
| چکلاٹے | تنگی |
| کھٹو ہونا | شرمندہ ہونا |

شاہجہاں پوری

| | | | |
|---|---|---|---|
| ایر | افسوس | باوزی | باؤلی |
| وٹ سگت | متجملہ | باسن | برتن |
| اپرُوپ | تعجب | ترکس | ٹیڑھا |
| آنگی | خیف | تارخ | تالو |
| ہٹ | منڈ | پتیانہ | یقین کرنا |
| بھنو | ابرو | گنا | وقت گذرنا |
| دیوڑی | آنگن | گت | مشغلہ |
| کھڑاڑہ | گھروندہ | گنڈ | چشمہ |
| چمنڈی | تالہ | گھات | قریب |
| چمنی | چراغ | بھار | باہر |
| | | پجرنا | رسنا |
| انکار | آگ | کھورا | خار |
| بھڑکا | جلن | لام | خطار |
| چرانہ | دھوکا دینا | گیا گذرا | ناکارہ |
| بچھراٹ | جدائی | لانڈگا | ہٹا کٹا |
| دلندر | منحوس | مردمانا | مرد |
| موچنا | بند کرنا | بائی کو | عورت |
| اوس | شبنم | گھاڑ | احمق |
| جھجھر | گہوارہ | سینتنا | قرینہ سے رکھنا |
| الس | سست | کھوپڑا | ناریل کا مغز |
| ارے رے | افسوس | جمنا | جمع ہونا |
| آس پیس | آس پاس | کھوٹا | کینہ پرور |
| الیور | ورے | گنڈم | صدمہ |
| پائیلور | پرے | پکڑبندی | گرفت |
| ان گھتر | نادان | تاغیل | کچھوا |
| اتاتا | مغرور | جھونگر | جھینگر |
| تڑتڑا | بلبلہ | باگ | شیر |

| میسور کی بازاری زبان کے الفاظ | دلی کی ٹکسالی زبان کے الفاظ |
| --- | --- |
| گدی | گدھیا |
| گدل | چمگادڑ |
| چمٹی | چیونٹی |
| ناٹ | شہتیر |
| پھتر | پتھر |
| چکڑ | کیچڑ |
| انلا | اندھا |
| نہیوں | بارش |
| پاڑا | بچھڑا |
| اڑسک رستہ | پگڈنڈی |
| کھون | کھٹمل |

"درمہ"

فارسی کا لفظ درہم سے نکلا ہے - یہاں کی بازاری اردو میں "تنخواہ" کے معنی میں مستعمل ہے۔

"بھلا"

یہ لفظ کنڑ اکا ہے جو ?? کے مترادف ہے۔

"ٹکیا"

یہ لفظ روز مرہ میں مستعمل ہے اور "ردّ کرنے" کے معنی میں مستعمل ہے۔

"دادا بھائی"

یہاں بڑے بھائی کو مخاطب کرتے ہیں۔ دراصل "دادا" باپ کے باپ کو کہتے ہیں۔ مگر بنگالی زبان میں دادا کے معنی بڑے کے ہیں اس لئے وہ یہاں "بڑے بھائی" کے معنی میں مستعمل ہے۔

"روبرو"

روبرو سے مراد ہے "چہرہ چہرہ" مگر اکثر اوقات یہ لفظ غلط استعمال ہوتا ہے - اور لوگ یوں کہتے ہیں۔

"روبرو" کی صف واکے صفیں درست کر لیجئے۔

یہ غلط ہے "آگے" کی صفیں درست کر لیجئے۔ یہ صحیح ہے

●●

---

بقیہ — انٹرویو ٹکنیک

کیجئے۔ ان کی بات فوراً مان جائیے۔ کبھی بھی یقینی جواب نہ دیجئے۔ مثلاً اگر پوچھا جائے کہ "کیا بنگلہ دیش آزاد ہو جائے گا؟" تو ہاں یا نہ مت کیجئے بلکہ کچھ اس طرح کہئے "مستقبل میں تو کوئی امید نظر نہیں آتی" یا پھر "کہا نہیں جا سکتا" "مگر کسی کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔" مگر یہ اصول ایسے سوالات پر لاگو نہیں ہوگا جس کا جواب ہی ایک ہے - جیسے پارلیمنٹ کے ممبران کی تعداد، کسی کی عمر وغیرہ۔ نکتہ چینی سے بچئے۔ ورنہ آپ کو ضمنی سوالات سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ موقع لگتے ہی کوئی لطیفہ بھی چھوڑ دیجئے یا پھر اکی جھجھک کم کر دیجئے مگر احتیاط سے۔

اپنی عملی زندگی میں ان باتوں کا خیال رکھنے کی کوشش کیجئے۔ اچھی عادتیں ہر جگہ کام آتی ہیں - بری عادت سے آپ انٹرویو میں پیچھا نہ چھڑا پائیں گے۔ اپنے سے بڑے بزرگوار سے ملاقات کرتے رہئے انٹرویو کی بہت اچھی مشق ہوگی کبھی بھی نروس نہ ہو پائیں گے۔

●●

# دوست بھی دشمن بھی

انگریزی ——— بالی چوپڑہ
اردو ترجمہ ——— منصورہ عالم
جامعہ کالج نئی دہلی

یہ اس زمانے کی بات ہے جب کہ پاکستان عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ اور کشمیر سے کنیا کماری تک اور سندھ سے آسام تک صرف ایک ملک تھا۔ ہندستان۔ اس سرزمین کا ایک حصہ تھا پنجاب جو اپنے رہنے والوں کے عالی حوصلہ اور مضبوط ہونے پر بجا طور پر فخر کر سکتا تھا۔ پنجاب کے دو شہروں لاہور اور وزیرآباد کے درمیان ایک چھوٹا سا قصبہ گجرانوالہ ہے۔

گوجرانوالہ کے دو مشہور چوک اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے تھے۔ بڑا چوک اور چھوٹا چوک۔ اور دونوں چوکوں کو ایک پتلی گلی "پل والی گلی" ملاتی تھی۔ اس گلی میں رہنے والے ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ مسلم حصے کے آخری مکان میں میاں فیروزالدین رہتے تھے۔ اور ان سے اگلے مکان میں جہاں سے ہندوؤں کا حصہ شروع ہوتا تھا لالہ نندلال رہتے تھے۔ دونوں مکانوں کی ایک مشترکہ دیوار تھی۔

لالہ نندلال کے پاس ایک زرخیز زمین تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے علاقے کے سب سے مالدار آدمی تھے۔ دوسری طرف میاں فیروزالدین اپنے فرقے میں سب سے زیادہ مالدار شخص تھے۔ دونوں خاندانی شریف اور ایمان دار تھے۔ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لئے بے انتہا انس اور محبت رکھتے تھے۔

لالہ نندلال کے دو لڑکے اور ایک بیوہ لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا میٹرک میں اور چھوٹا چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا۔ میاں فیروزالدین کے بھی دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ ان کا چھوٹا لڑکا مجید لالہ جی کے چھوٹے لڑکے مدن کا ہم جماعت اور دوست تھا۔ وہ دونوں اسکول ساتھ ہی آتے جاتے اور ہر وقت ساتھ رہتے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے کہ جمعہ کی نماز دونوں ساتھ ادا کرتے اور منگل کو ساتھ ہی مندر جاتے۔ ان کی دونوں مذہب کے فرائض کی ادائگی،

کسی مذہبی انسیت یا تاثر کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دونوں ایک منٹ بھی کسی کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

**دونوں** دوست کبھی کبھی اسکول سے بھاگ جاتے اور میونسپل باغ میں وقت گذارتے یا کوئی فلم دیکھا کرتے۔ مجید اور مدن دونوں ہاکی کے بہترین کھلاڑی بھی تھے۔ ایک مرتبہ اسلامیہ اسکول کے خلاف میچ میں اسکول کے پی۔ ٹی۔ آئی۔ نے مجید کو کپتان بنانا چاہا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ یہ اعزاز مدن کو ملے اور مدن اس کو۔ بالآخر کسی دوسرے کو کپتان بنایا گیا۔

**دونوں** خاندان آپس میں حد درجہ ملے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ مجید نے دیکھا کہ کسی مسلم غنڈے نے مدن کی بیوہ بہن کو چھیڑا ہے۔ وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اور اس پر عقاب کی طرح جھپٹ پڑا۔ "بدمعاش! میری بہن کو چھیڑنے کی تیری ہمت کیسے ہوئی؟" غنڈے نے چاقو نکال لیا۔ اور اگر لوگ پکڑ نہ لیتے تو وہ مجید پر وار کر دیتا۔

**پل** والی گلی مسلمانوں کی واحد گلی تھی جہاں کے مسلمان گائے کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ اور یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ وہ دوسرے فرقے (ہندو) کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

**سنہ ۱۹۴۷ء** آیا جب تقسیم کی وجہ سے پورا پنجاب فرقہ وارانہ آگ میں جل اٹھا۔ ابتدا میں گوجرانوالہ تشدد سے محفوظ تھا۔ لیکن ہر طرف پھیلے ہوئے دونوں فرقوں کے باہمی تنفر سے یہ شہر کب تک بچ سکتا تھا۔ قتل و غارت گری دن کا معمول بن گئی۔ پھر بھی پل والی گلی کے رہنے والے آپس میں میل جول سے رہ رہے تھے۔ اور دو فرقوں کے برادرانہ تعلقات کو ختم کرنے کے لئے یہاں معمولی سی جھڑپ بھی نہیں ہوئی۔

**ایک** دن شام کو اچانک علاقے کے قصاب گل خاں نے زور دار نعرہ بلند کیا۔ "اللہ اکبر" ہندو خوف زدہ ہو گئے۔ اس کے بعد ایک دل دہلا دینے والی چیخ بلند ہوئی۔ لالہ نند لال نے سوچا کہ کوئی ہندو مارا گیا۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ کسی نے گل خاں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا تھا۔ کیا اس کو مارنے والا کوئی ہندو تھا؟ نہیں۔ اس کو اس کے مسلمان پڑوسی نے ہی مارا تھا۔ میاں فیروزالدین اپنی پوری طاقت سے چیخ رہے تھے۔ "یہ کون جہنمی ایسے نعرے لگا رہا ہے۔ کیا وہ ہمارے صدیوں پرانے پیار و محبت کے رشتوں اور پر امن فضا کو ختم کرنا چاہتا ہے۔"

**میاں** اور لالہ ہی محلے کے ایسے شخص تھے جن کے پاس بندوقیں تھیں۔ ان دونوں نے علاقے پہرہ دینا شروع کر دیا۔ شہر میں چوبیس گھنٹے کا کرفیو نافذ ہو گیا۔ مجید اور مدن کو ملنے سے یہ کرفیو بھی نہ روک سکا۔ وہ گھر کی منڈیر کی دیوار پھاندتے اور ملتے۔

**آہستہ** آہستہ پل والی گلی کے ہندوؤں نے اپنے مکانات کو چھوڑنا شروع کر دیا اور محلہ میں قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ لیکن لالہ نند لال اور اس کا خاندان وہیں رہا۔ میاں فیروز نے لالہ سے کہا۔ "نند لال جی تم کو یہ جگہ چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔"

**حالات** مزید خراب ہو گئے۔ اور ایک وقت آیا جب لالہ نند لال نے اپنا آبائی مکان چھوڑنے کا

...بند کر لیا۔ میاں فیروز نے ان سے رکنے کی بہت
...ند کی مگر انھوں نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ یا دلِ ناخواستہ
...یاں فیروز بھی رضامند ہوگئے۔ اور سامان باندھنے میں
...ن کی مدد کی۔

لالہ نندلال کے لئے گھر کا ہر سامان لے جانا ممکن
...ہیں تھا۔ میاں فیروز نے ایسے سامان کا معاوضہ دینا
...یا ہا جو نہیں لے جائے جا سکتے تھے۔ مگر لالہ نندلال اس
...ے لئے راضی نہ ہوئے اور بولے۔ "فیروز بھیا آج
...کل لوگوں کے جذبات انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ لیکن
...یک نہ ایک دن حالات پرسکون ہوجائیں گے اور ہم واپس
آئیں گے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کے بغیر کیسے رہ سکتے
ہیں۔ تم ہمارا یہ سامان اس وقت تک رکھ لو۔"

مجید اور مدن دونوں نے مل کر سامان لاری میں
ٹرک میں بھروایا اور آنسو بھری آنکھوں اور غم سے
نڈھال دل کے ساتھ لالہ نندلال کا خاندان اپنے
مسلم پڑوسیوں سے جدا ہوا۔ جدا ہوتے وقت دونوں
نے سلسلۂ مراسلت کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا۔

مدن نے مجید کو پہلا خط ۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو
لکھا۔ وہ اب کالج میں پڑھ رہا تھا۔ مجید نے فوراً جواب
دیا۔ پھر دونوں اپنے خطوں میں ایک ساتھ گذارے
ہوئے وقت کا ذکر کرتے رہے۔ ۱۹۵۱ء میں مدن اپنے بھائی کے
ساتھ رہنے کے لئے جالندھر چلا گیا۔ اس نے مجید کو
اپنے نئے پتے کے بارے میں لکھا تاکہ خط و کتابت کا سلسلہ
جاری رہے۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

ہنگامی زندگی کے جذبے سے سرشار مدن
نے انڈین ایرفورس میں کمیشن کے لئے درخواست دی
اور وہ منتخب کر لیا گیا۔ تقرر کے بعد اسکو بامبر
پائیلیٹ (Bomber Pilot) کی ٹریننگ دی گئی۔
وقت گذرتا رہا۔ ایک مرتبہ وہ دفاعی وفد کے ساتھ
لندن گیا۔ لندن کے ہوائی اڈے پر اترنے کے فوراً
بعد ایک جانا پہچانا چہرہ دیکھ کر اس کو تعجب ہوا۔
وہ مجید تھا اس کے بچپن کا دوست۔ یہ استعجاب
فوراً فرطِ مسرت میں تبدیل ہوگیا۔ دونوں کی آنکھوں
میں خوشی کے آنسو چھلک گئے۔ اور پاگلوں کی طرح
ایک دوسرے سے بری طرح چمٹ گئے۔ مجید نے بتایا
کہ وہ بھی پاکستان ایرفورس میں پائلٹ ہے۔ لندن کے
قیام کے دوران فرصت کے لمحات دونوں نے ساتھ
گذارے۔

پرانے دوستوں کے درمیان مدت سے بند
ہوئی خط و کتابت پھر سے شروع ہوئی۔ اب لالہ نندلال
اور میاں فیروزالدین اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ان دونوں
کی شادیاں ہوچکی تھیں۔

اچانک ہندو پاک میں تنازعہ کا وقت آیا۔ یکم ستمبر
۱۹۶۵ء کو پاکستان نے بھاری پیٹن ٹینک اور سوبر جیٹ
کے ساتھ چھمب جوڑیاں پر حملہ کر دیا۔ امرتسر کی سرحد پر
خطرے کے پیشِ نظر ہندوستانی ہوائی فوج حرکت میں
آگئی۔ ہندوستانی ہوائی فوج کے بامبر پاکستان کی
مشینری پر بم گراتے اور بعافیت واپس آجاتے۔ مدن
بھی چونکہ ہوائی فوج میں تھا اس لئے وہ بھی دشمن کے
ٹھکانوں پر بمباری کرنے جاتا اور واپس آجاتا۔

ایک دن صبح کو مدن کو دوسرے پائیلٹوں کے
ساتھ سرگودھا ہوائی اڈے پر بمباری کرنے کا آرڈر ملا۔
بمباری کے بعد مدن کے علاوہ تمام پائیلٹ صحیح سلامت
واپس آگئے۔ دشمن کے ٹھکانوں پر بمباری کرتے وقت
۲ دسمبر ۷۱ء

# انٹرویو ٹکنیک

محمد ہارون ایم۔ اے۔ دلی یونیورسٹی

آپ نے یہ ضرور سنا ہوگا کہ فلاں انٹرویو میں ایک
ابل فرسٹ کلاس طالب علم کو رد کر کے کسی درمیانے درجے
کے امیدوار کو چن لیا گیا۔ اس کو آپ چمچہ گیری یا سفارش کا
ا کرشمہ کہہ سکتے ہیں۔ فرقہ پرستی کو بیچ میں لا سکتے ہیں کہ آپ
و مسلمان ہونے کی وجہ سے نہیں لیا گیا ورنہ آپ تو بڑے
ابل تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہو۔ مگر یہ بھی تو
یک حقیقت ہے کہ انٹرویو ایک آرٹ ہے جو کسی کالج یا
ونیورسٹی میں حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ کی عملی زندگی کا ایک
جز ہے۔ یہی آپ کی شخصیت ہے۔

انٹرویو کے موقع پر اگر کچھ باتیں مدنظر رکھی جائیں تو
ہتر نتائج کی امید کی جا سکتی ہے۔ مثلاً لباس۔ دھیان
ذرا اس طرف آپ نے پہلے بھی دیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے نیا جوڑا
سلوایا ہو۔ ٹائی سوٹ مانگ لی ہو۔ ٹھیک ہے۔ مگر یہ بتائیے
ا اس سے پہلے آپ نے ٹائی باندھی ہے؟ سوٹ پہنا ہے؟
اگر ہاں تو ٹھیک ہے ورنہ لباس خود ایک پیارا مذاق
ہو جائے گا۔ ذرا سوچئے ایک شخص جسے ٹائی کی عادت
ہی نہ ہو وہ کیا کرے گا۔ بار بار گرہ ٹھیک کرے گا۔ گردن
مشق کرتی نظر آئے گی بہتر یہی ہے کہ کوئی بھی ایسا لباس
نہ پہنئے جس کی آپ کو عادت نہ ہو۔ دھیان رکھئے کہ بڑی
عمر کے لوگ بھڑک دار کپڑے پسند نہیں کرتے۔ بالکل نیا یا
قیمتی لباس بھی اچھا اثر نہیں چھوڑتا۔ ہلکے رنگ اچھے
رہتے ہیں۔

لباس کے بعد آپ کا برتاؤ۔ زیادہ بننے کی کوشش
نہ کیجئے۔ آپ کا اپنا قدرتی انداز ہی ٹھیک رہے گا۔ صرف
الفاظ پر غور کیجئے۔ پوری بات سنئے۔ چند لمحات سوچئے۔
آنکھیں زمین پر مت گاڑے رکھئے۔ نہ ہی سوال کرنے
والے کی جانب گھور کر دیکھئے۔ احساس کمتری اور برتری
دونوں سے بچ کر مناسب الفاظ میں جواب دیجئے —
انٹرویو کے لئے اگر آپ نے بے تحاشا پڑھا ہے تو نروس
ہونا لازمی ہے۔

ایک بات اور دھیان میں رکھئے۔ جو لوگ سلیکشن
کمیٹی میں شامل ہیں ان کو احساس برتری ہے۔ وہ خود کو
زیادہ قابل سمجھتے ہیں۔ ان سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔
آپ خود مطمئن ہوں یا نہ ہوں ان کو مطمئن کرنے کی کوشش

آگے صفحہ ۱۲ پر

شمارہ جہاں دہلی :

آپ کے سکھ دکھ کا ساتھی
پنجاب نیشنل بنک
پنجاب نیشنل بنک

# غزل

دلدارؔ بیسپوری (نینی تال)

جائیں گے الفت میں کس منزل سے ہم　　پوچھ لیتے کاش اپنے دل سے ہم

کیا چھپے گا ہم سے اُو پردہ نشیں　　دیکھتے ہیں تجھ کو چشمِ دل سے ہم

تیرے حسنِ سحر پرور کی قسم　　اٹھے ہیں بے مدعا محفل سے ہم

قیس کی تھی یہ تمنا دیکھتے......!　　حسنِ لیلیٰ پردۂ محمل سے ہم

ہو گئے ٹکڑے جگر کے الاماں　　تنگ آئے ہیں مزاجِ دل سے ہم

ہو نہ جائے یہ کسی پہلو عیاں　　ڈرتے ہیں ہر وقت رازِ دل سے ہم

اپنی دنیا سے مٹا دیں گے تجھے
کہتے ہیں دلدار عزمِ دل سے ہم

# ممتا

زاہد اقبال

"ممی، ممی! اوپر چھت پر بلی نے بچے دیئے ہیں ـــ"
پرویز نے بھاگ کر ڈائننگ روم میں آتے ہی کہا اور قریب تھا کہ وہ اپنی ممی کے گود میں چڑھ جاتا کہ اس کی ممی نے جھڑک دیا۔ "پرویز! تم کو جس بات کے لئے بار بار منع کرتی ہوں تم جان بوجھ کر اسی کام کو کرتے ہو۔ تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ بلی کو بھگا دو لیکن تم نے ایک دسنی اور اب تم بلی کے بچے میں لگے ہو۔ دیکھو! آنے دو پاپا کو آج تمہاری ٹھیک سے مرمت کرواتی ہوں کہ نہیں۔ تم بات سے نہیں مانو گے۔"

پرویز کچھ نہ بولا۔ گم سم کھڑا رہا کھسیانا سا صرف اپنے دائیں ہاتھ کے شہادت کی انگلی کا ناخون کترنے لگا۔ ہاں اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ اب رو یا کہ تب رو دیا۔

حالانکہ پرویز اپنی ممی کے مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے وہ کبھی غلطی سے بھی اپنی ممی کے پاس نہیں پھٹکتا اور خصوصیت سے جب سے اس نے بلی پال رکھی تھی۔ اس کی ممی نہیں چاہتی تھیں کہ پرویز بلی پالے۔ اس لئے ان کو بلی سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ پرویز اُن سے ڈرا ڈرا، سہما سہما رہتا تھا۔ لیکن اس روز غیر شعوری طور پر بچے کی خوشی میں بھاگتا ہوا اپنی ممی کے پاس پہنچا لیکن ممی کی ڈانٹ نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

پرویز کی ممی کی تعلیم مغربی تو نہیں تھی لیکن مغربی تہذیب کی دلدادہ تھیں۔ ناول پڑھنا اور پکچر دیکھنا ان کی ہابی تھی اور یہی وجہ تھی کہ پرویز کی پرورش ماما کی گود میں ہوئی۔ جب اس کو بھوک لگتی تو ماما ہی ڈبے کا دودھ بنا کر دیتی۔ اس کی ممی کو فرصت ہی کہاں رہتی کہ خود سے دیکھ بھال کرتیں۔ گود لینے سے کپڑے گندے نہ ہو جاتے؟ اپنا دودھ پلاتی تو سینے سکڑ نہیں جاتے؟ انھوں نے خوبصورت سا بہانہ تراش لیا تھا کہ "دودھ نہیں اترتا سینہ سوکھ گیا ہے۔" ایسا لگتا تھا جیسے دودھ کے ساتھ ساتھ ان کی ممتا بھی سوکھ چکی ہو۔ اور یہی وجہ تھی کہ پرویز کی عمر سات آٹھ سال ہونے کے

باوجود کچھ اس طرح اپنی ممی سے خوف کھاتا تھا جیسے
اس کی ممی گوشت پوست والی وہ عورت نہیں جس کے
پہلو میں ممتا دھڑک رہی ہو۔ بلکہ پتھر ہو پتھر۔
کچھ دیر تک پرویز کھڑا رہا۔ پھر اسے یاد آیا۔ پوسی
بھوکی ہوگی۔ اپنی ممی کو ڈرائنگ روم میں دیکھ کر اس
نے موقع غنیمت جانا۔ وہ ڈرائنگ روم سے دبے
پاؤں نکل کر باورچی خانہ آیا۔ وہاں کسی کو نہ پاکر دودھ
کا ڈبہ نکلا اور جھٹ پٹ پانی میں گھول دیا۔ اور دوسرے
ہی لمحے ممی کی نظروں سے بچتے بچاتے چھت پر پہنچ گیا۔
جہاں اس کی پوسی نے "میاؤں" سے اس کا استقبال
کیا۔ اور کچھ ہی لمحے کے بعد بلّی چپ چپ دودھ پی
رہی تھی۔ اور پرویز کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ
دودھ بلّی نہیں وہ خود پی رہا ہو۔

پرویز کی طبیعت کلاس میں نہیں لگتی۔ اس لئے
جیسے ہی چھٹی ہوتی، بھاگتا ہوا آتا اور بچّے کو پوسی
کے دودھ میں لگا کر باری باری دودھ پلاتا۔
پھر ڈبہ کا دودھ گھول کر پوسی کو پلاتا۔ پوسی بھی
اس سے بہت مانوس ہوگئی تھی۔ وہ بچے کو گود لے
یا ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھے۔ وہ کچھ نہیں کہتی۔
چپ چاپ پڑی دیکھتی رہتی۔ لیکن پرویز کی ممی کو
پرویز کی یہ عادت ایک آنکھ نہ بھاتی۔ اس لئے جب
بھی وہ پرویز کو بلّی کے پاس دیکھتی خوب ڈانٹتی۔
ایک دن جب پرویز ڈبہ کا دودھ گھول رہا تھا کہ
اس کی ممی کی نظر پڑ گئی۔ اس روز انھوں نے پرویز کو
خوب ڈانٹا اور کہا کہ "اب تک بلی اور اس کے بچے
کو نہیں پھینکوا دوں گی تمہیں چین نہیں ہوگا۔"
اور تب سے پرویز کو کچھ یقین سا ہوگیا تھا کہ اگر
بلّی کو یہاں سے نہیں ہٹائے گا تو اس کی ممی بلّی کے بچے
کو کہیں پھینکوا دیں گی۔ اس لئے اس نے ایک پھٹی دری
لی اور باغ کے ایک کونے میں پڑے ہوئے ایک پرانے
ڈرام میں بچھا دیا۔ اور جب اس کی ممی باہر چلی گئیں تو
بچے کو گود میں لیا اور بلّی سے کہا۔ "چل پوسی تمہارا
الگ انتظام کر دیا ہے۔ ممی تمہارے بچے کو مار دیں گی۔"
ایسا لگا کہ بلّی اس کی بات کو سمجھ گئی۔ اور اس کے ساتھ
پیچھے پیچھے ہولی۔ اور جب وہ بچے کو لے کر ڈرام کے پاس
پہنچا تو اس کی جان میں جان آئی۔ بچّے کو ڈرام میں رکھ
کر ایک بار پھر سمجھایا۔ "پوسی! یہیں رہنا۔ گھر مت آنا۔
بچّے کو بھی آنے مت دینا۔ ورنہ ممی مروا دیں گی تیرے بچّے
کو۔ سمجھی۔" اس بار بلّی نے بھی دھیرے سے کہا "میاؤں"
اس طرح کچھ دن بیت گئے۔

ایک دن اس کی طبیعت کلاس میں نہیں لگی۔ اسے
ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی پوسی کو کچھ ہوگیا ہو۔ اس
لئے وہ بھاگا ہوا گھر پہنچا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے
باغ پہنچا جہاں ڈرام خالی پڑا تھا۔ پوسی اور اس کے
بچے نہیں تھے۔ وہ کہیں بھی تلاش کرنے نہیں گیا۔ سیدھا
گھر لوٹ آیا۔ اس نے گھور کر اپنی ممی کو دیکھا۔ وہ بہت
خوش تھیں۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"پرویز! تم آگئے۔ آج بہت سویرے چھٹی
ہوگئی بیٹا" اس کی ممی نے بہت ہی پیار سے کہا۔

لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ آج اس کو اپنی ممی کی بولی اچھی نہیں
لگ رہی تھی۔ وہ اپنے کان میں انگلی دینا چاہتا تھا۔ حالانکہ
اس کی ممی نے ہزار ضد کی لیکن اس نے کھانا نہیں کھایا۔
رات کو بھوکا ہی سوگیا۔ دوسرے روز اس کو کافی تیز بخار
تھا۔ وہ جل رہا تھا بخار سے، اس کی آنکھیں بند تھیں۔

اور وہ بے سدھ پڑا تھا۔

دو تین روز ہو گئے لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اور بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ گرم گرم بھاپ کمرے میں پھیل رہی تھی۔ اور پرویز کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ڈیڈی نے اس کی ممی کو گھور کر دیکھا۔ انھوں نے نظر جھکا لی اور باہر چلی گئیں۔ پھر کچھ ہی دیر بعد آئیں۔ اور بولیں۔ "اور بیٹے آنکھیں کھولو۔ دیکھو تو میں تمہاری ممی بول رہی ہوں۔" لیکن پرویز نے کچھ جواب نہیں دیا۔ پھر انھوں نے کہا: "دیکھو! تمہاری پوسی تمھیں دیکھنے آئی ہے۔" اور راستے میں پوسی نے کہا۔ "میاؤں"

اور جب پرویز نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ پوسی اس کے پاس کھڑی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ پوسی کو سہلانے لگا۔ اور اس کی ممی پوسی کے بچے کو نیچے سے اٹھا کر پلنگ پر رکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے۔ انھوں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ضبط نہ ہو سکا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "میرے بچے! میرے لال!"

اور دوسرے ہی لمحہ پرویز اپنی ممی کی باہوں میں جکڑا سسکیاں لے رہا تھا۔

●●



بقیہ دوستی بھی دشمنی بھی

ایک پاکستانی جہاز نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر فضا میں دونوں جہازوں میں لڑائی ہوتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے پر فوقیت لے جانا چاہتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر دو جہاز آپس میں ٹکرا گئے۔ دونوں پائیلٹ چھتری لگا کر کود پڑے اور گوجرانوالہ کے ایک اسکول کے میدان میں بے ہوشی کے عالم میں جا پڑے۔ وہ دونوں مشکل سے دو گز کی دوری پر پڑے ہوں گے۔ ان کی سانسیں غیر یقینی طور پر چل رہی تھیں۔

بہت دیر کے بعد مدن کو تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا۔ بہت مشکل کے بعد اس نے اپنی گردن پاس ہی پڑے دشمن کی طرف گھمائی۔

"مجید!" اس کے منہ سے ایک دم نکلا۔ اور پھر موت کے آہنی پنجوں نے اس کی آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجید کو بھی ہوش آیا مگر صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کا دشمن کوئی اور نہیں بلکہ اس کے بچپن کا ساتھی مدن تھا۔ وہی مدن جو اس کے ساتھ اسی میدان میں بارہا میچ کھیلا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ مدن کے مردہ جسم کی طرف بڑھایا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اور اگلے ہی لمحے وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ مسکراہٹ اب بھی اس کے چہرے پر مسلط تھی۔

آسمان دونوں طرف سے چل رہی گولیوں اور بموں کی آواز اور دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا — ادھر دور سرگودھے کے ایک اسکول کے میدان میں پڑے ان دو مردہ جسموں پر کوئی سرگوشی کر رہا تھا۔ "یہاں دو انسانی جسم مردہ پڑے ہیں۔ جن کی دوستی اور دشمنی ہمیشہ ناقابل پرستش رہا ہے اور رہے گی۔"

# قطعات

## محمد حنیف انجاؔن کاشی پوری

موج ہستی میں چند لمحوں کو
آج کا آدمی جو کھو جائے
عقدۂ موت و زندگی اسیر
مثل آئینہ صاف ہو جائے

کمالِ شوق کی جرأت تو ملاحظہ کیجے
جمالِ یار کو اپنا جمال سمجھا ہوں
زمانہ سمجھا ہے جس کو تمہارا عجز و کمال
میں اس کو اپنی نظر کا کمال سمجھا ہوں

التفات و خلوص کو انجاؔن
آپ اپنا شعار کر لیتے
ہم بھی اس طرح زندگی اپنی
کچھ نہ کچھ استوار کر لیتے

رنگ دیکھا گلوں پہ چار ہی دن
تازگی بھی دو چار دن پائی
کھلتا دیکھا خزاں کے آنے تک
پر نہ دیکھی حیات رعنائی

شاہ راہِ حیات پر آ کے
سوچتا ہوں کہ اب کدھر جاؤں
سنگِ شاہ راہ کی طرح انجاؔن
اچھا ہے رہبری ہی کر جاؤں

# محبّت

شمس الآفاق آئی۔ایس سی۔ایف۔ایم۔بی۔ایس
الہ آباد

صبح کا وقت ہے۔اجالا پھیل رہا ہے۔کرن بکھر رہی ہے۔سنگم کا کنارہ ہے۔ریت چمک رہی ہے۔ملاحوں نے اپنے اپنے بیڑے سنبھالے۔کشتیاں تیرنے لگی ہیں۔
رجنی سنگم پر اشنان کے لئے کھڑی ہے۔مناظر قدرت میں محو ہے۔ایک طرف سے کوئی یکایک دوڑتا ہوا آتا ہے۔سنگم میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔لوگ اِدھر اُدھر دوڑتے ہیں۔رجنی ملاحوں سے بچانے کو کہتی ہے۔

"دو سو لگیں گے۔"

"پہلے جان بچاؤ ہم تین سو دیں گے۔"

نیم مردہ جسم سنگم کے کنارے۔رجنی ٹیکسی کرتی ہے۔ٹیکسی ڈے میموریل ہاسپٹل پہنچتی ہے۔راجو بے ہوش ہے۔امرجنسی وارڈ ہے۔شام کے چار بجے ہیں۔رجنی اپنی ڈیوٹی پر ہے۔راجو کو دوا پلانے آتی ہے۔راجو آنکھ بند کئے ہوئے بیڈ پر پڑا ہے۔

"سنیئے!"

"کون؟"

"رجنی کو دیکھ کر" مجھے کس نے بچایا؟"

"میں نے"

"کیوں؟"

"زندہ رہنے کے لئے۔"

"مجھے زندگی پسند نہیں۔مجھے زہر دے دو۔"

"کیوں؟"

"میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

"لیکن زندہ رہنا ہوگا۔"

"زندگی وہ تلخی ہے جسے میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"یہ تلخی، تلخی نہیں۔یہ مٹھاس میں بھی تو بدل سکتی ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"آج کی دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔انسان چاہے تو بڑے سے بڑا کام آسان ہو جائے۔دیکھئے آج کا انسان جب چاند پر جا سکتا ہے تو کیا تلخی مٹھاس میں نہیں بدل سکتی؟"

"آپ نے ابھی زندگی دیکھی نہیں ہے"

"بہت سی زندگیاں دیکھی ہیں۔"

"پھر سمجھا نہیں۔"
"بہت کوشش کی۔"
"پھر؟"
"وہی ہوا۔"
"کیا ہوا؟"
"جو ہوتا تھا۔ یعنی کہ زندگی تلخ تھی۔ تلخ نظر آئی۔"
"کبھی اس زندگی کو بدلنا چاہا تھا؟"
"ہزار بار۔"
"نتیجہ؟"
"آج یہاں تک پہنچا ہوں۔"
"اب کیا ارادہ ہے؟"
"مرنا چاہتا ہوں۔"
"اچھا! ارادہ تو ٹھیک ہے۔ کافی عقل مند اور ذہین ہیں جناب۔"
رجنی دوا پلا کر چلی دیتی ہے۔
آج کے دن ڈیوٹیاں تبدیل ہو چکی ہیں۔ رجنی سات بجے شام ڈیوٹی پر آئی۔ وہی ایمرجنسی وارڈ ہے۔ رجنی کے ہاتھوں میں دوا کی شیشی۔ راجو اچھی طرح جاگ رہا ہے۔
رجنی کو دیکھ کر بولا۔
"یہ کیا ہے؟"
"زہر ہے۔"
"کیا ہوگا؟"
"تمہیں پلا دوں گی۔"
"کیوں؟"
"کیونکہ تم مرنا چاہتے ہو۔"
"ایک بار مجھے پھر موقع دو۔"
"کس لئے؟"
"زندگی کو حسین بنانے کے لئے۔"
"ٹھیک ہے۔"
"لیکن۔"
"لیکن کیا؟"
"مجھے سہارا چاہیے۔"
"کس کا سہارا۔"
"میں اس جہان میں بالکل اکیلا ہوں۔"
"تو؟"
"تو کیا آپ میری مدد کریں گی؟"
"حتی الامکان۔ نباہ سکو گے؟"
"قسم کھاؤ۔"
"لو قسم کھاتی ہوں۔"
"تو پھر؟"
"پھر کیا؟"
"میں محبت کا مارا ہوں۔ محبت ہی کا بھوکا ہوں۔ محبت ملے گی؟"
"ملے گی کیوں نہیں؟"
"کیسی محبت ملے گی؟"
"جو جاوداں ہوگی۔ جو بے لوث ہوگی۔ جو پاک ہوگی۔ اور جو کبھی ختم نہ ہوگی۔"
"پھر تم کب ملوگی؟"
"تم کب ڈسچارج ہو رہے ہو؟"
"کل صبح دس بجے۔"
"میں ساڑھے دس بجے وارڈ میں ملوں گی۔"
پونے گیارہ بجے ہیں۔ راجو رجنی کے انتظار میں ہے۔
دروازہ کھلا۔ راجو نے دروازے کی طرف دیکھا۔
کوئی اجنبی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"آپ کون؟"

"میں گلشن ہوں۔"

"کیسے آنا ہوا؟"

"رجنی نے بھیجا ہے۔"

"رجنی کون ہے؟"

"وہی نرس ہے جس نے تم سے ساڑھے دس بجے یہاں ملنے کو کہا تھا۔"

"اچھا تو پھر؟"

"پھر کیا اس نے مجھے بھیجا ہے۔"

"کس لئے؟"

"آپ کو بلانے کے لئے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"گھر پر ہے۔"

"چلئے۔"

گلشن اور راجو ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے میز لگی ہے۔ رجنی ایک خوبصورت ساڑی میں ملبوس نظر آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں راکھی ہے اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ایک دو سالہ بچی پکڑے ہے۔

راجو کی طرف اشارہ کرکے۔

"بیٹی منجو!"

"کیا ممی؟"

"ماما جی سے نمستے کرو۔"

"نمستے ماما جی۔"

"جیتی رہو بیٹی۔"

رجنی راجو کے ہاتھ میں راکھی باندھنے لگتی ہے۔

"یہ کیا ہے رجنی؟"

"راکھی۔"

"راکھی۔"

"ہاں، راکھی۔"

"تم نے کیا کہا تھا؟"

"آپ نے کیا چاہا تھا؟"

"میں نے محبت کی بھیک مانگی تھی۔"

"تو؟"

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔"

"کیا وعدہ؟"

"محبت کا۔"

"ہاں، ہاں، میں نے محبت کا وعدہ کیا تھا۔"

"تو؟"

"اب وعدہ وفا کرتی ہوں۔ بہن کی سچی محبت دے کر جو میرے اختیار میں ہے۔ وہ محبت جو پاک ہے بے لوث ہے۔ جو جاوداں ہے۔" اور رجنی راجو کے ہاتھ میں راکھی باندھ دیتی ہے۔ اور گلشن کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے۔

"یہ ہیں آپ کے بہنوئی جی۔ سگے بھائی کی محبت ان کے اختیار میں ہے وہ آپ کے لئے میں پہلے ہی مانگ چکی ہوں۔"

●●

# بادۂ شیراز

پروفیسر بخشی اختر امرتسری

صبح دم آمد ایں صدائے سروش — خیز از بستر و بجو [illegible]

میکدہ واکن و شراب فروش — منشیں ساقیا بخانہ خموش

در چمن موسم بہار رسید — شاخ شاخ شجر پہ ہیں گلپوش

بشنو اے شمع حال دل گوید — خاکِ پروانہ با صدائے خموش

حسنِ اوّل بقلب میدارم۔ — جلوۂ دلکشاست درآغوش

اے کلیم آرزوئے جلوہ مکن — یک تجلّی ترا کند بے ہوش

بادہ از ابر می چکد ساقی — میکشاں راست شغلی نوشانوش

جلوہ فرماست ہر عروسِ چمن — دو قطار ایستادہ دوش بدوش

لطفِ دیوانگی یہ ہیں اختر

بے ہُشی را بخر ہُشی بفروش

# رباعیات

پروفیسر بخشی اختر امرتسری

(۱)

صہباکشِ آں ذات کسے ہست کجا

از بادۂ تحریص کسے رُست کجا

شیدائے حرم بمن چہ نسبت دارد

آں شیخ کجا است و من مست کجا

(۲)

ہوشیار کہ ابرِ فصلِ باراں آمد

یعنی بہ چمن موسمِ یاراں آمد

گل ہا ہمہ آیند نظر جام بدست

مے افشاں شبنمِ بہاراں آمد

# سر کا درد یا دردِ سر

ڈاکٹر عبداللہ شمس الزماں

سر درد کو آپ دردِ سر بھی کہہ سکتے ہیں۔ سر درد تو وہ تکلیف ہے جس کی وجہ سے اکثر لوگ پریشان رہتے ہیں۔ اور سر کے دردوں کی وجہ سے اسپرو، اناسین، اور کوڈو پائرین جیسی گولیوں کی اچھی خاصی کھپت ہو جاتی ہے۔ سر درد اگر کبھی کسی وقت ہو جائے تب تو یہ واقعی سر درد ہی ہوتا ہے یہ کسی معمولی سی تدبیر سے بھی چلا جاتا ہے۔ لیکن جب سر درد بار بار ہونے لگے تو یہ سر درد نہیں بلکہ دردِ سر یعنی مستقل مصیبت، وبالِ جان بن جاتا ہے۔ لوگ سر کے درد کے بارے ہی اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر صاحب کوئی آسان سا نسخہ بتائیے۔ تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا سوال واقعی میرے لئے قابلِ غور ہے۔ اور قابلِ غور ہونا ہی چاہیئے۔ چونکہ ایک معالج کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ اس پر غور کر کے کوئی مناسب تدبیر بتاؤں تو لیجئے۔ پہلی بات تو یہ سمجھئے کہ سر درد بذاتِ خود کوئی بیماری نہیں۔ بلکہ بیماریوں کی علامت ہوا کرتا ہے۔ آگ کو جلتے ہوئے آپ نے دیکھا ہوگا۔ آگ جلتی ہے تو دھواں بھی اٹھتا ہے۔ آگ بجھ جاتی ہے تو دھواں بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ ایسی بیماریاں ہیں اور کچھ ایسے حالات ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ سر میں درد ضرور ہوتا ہے۔ اور جب وہ وجوہات دور ہو جاتی ہیں تو سر کا درد خود بخود غائب ہو جاتا ہے۔ اس لئے علاج سر کے درد کا نہیں کیا جاتا بلکہ اس سبب کو ہی دور کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سر کا درد ہوتا ہے۔ میں نے مختلف مریضوں کا مشاہدہ و معائنہ کر کے جو تحقیق کی ہے تو اب تک مجھے پچپن باتیں ایسی معلوم ہوئی ہیں جن کی وجہ سے سر کا درد ہوتا ہے۔ اور وہ تمام ہی وجوہات ایسی ہیں کہ ان کی موجودگی میں سر درد کو دور کرنے والی چاہے کوئی کیسی بھی دوا کھا لے مرض سے وقتی طور پر سکون تو مل سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی چاہے کہ معمولی سی گولیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مستقل آرام مل جائے یہ بات قطعی ناممکن ہے۔ بلکہ اکثر

ایسا دیکھا گیا ہے کہ ان کے اثرات بہت نقصان دہ
ہوتے ہیں۔ مردوں کو سردرد کی شکایت کی وجہ
عام طور پر پیٹ کی بیماریاں، مثانے اور جگر کی
گرمی ہوتی ہے۔ دماغی کمزوری بھی عام طور پر
اس کا سبب ہوتی ہے۔ دماغی کمزوری کے سبب
جو سردرد ہوتا ہے اس میں عام طور پر اسکولوں
وغیرہ کے طلباء یا دماغی کام کرنے والے لوگ
مبتلا ہوتے ہیں۔ پیٹ کی خرابیوں اور مثانے و
جگر کی گرمی سے جو سردرد ہوتا ہے وہ سارے
ہی طبقہ کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ ویسے جو لوگ
چائے یا بیڑی سگریٹ کثرت سے استعمال کرتے
ہیں وہ اس میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ عورتوں کو
عام طور پر یہ شکایت رحم کی خرابیوں کی وجہ سے
ہوتی ہے۔ ماہواری کا صحیح نہ ہونا، نلوں اور
رحم کا ورم۔ بچہ کی پیدائش کے بعد رحم کا اچھی طرح
صاف نہ ہونا وغیرہ اسباب سے عام طور پر
عورتیں اس تکلیف میں مبتلا ہوتی ہیں۔ پاخانہ نہ
صاف نہ ہونے سے بھی سردرد ہو جاتا ہے۔ خاص
کروہ جو سورج نکلنے تک سوتے رہتے ہیں
اور سورج نکلنے پر پاخانے جاتے ہیں وہ لوگ
اکثر اس تکلیف کا شکار ہوتے ہیں۔

سردرد اگر وقتی ہو تو اس وقت آرام یا
کسی احتیاطی تدبیر کے ساتھ اگر اناسین اور اسپرو
جیسی گولیاں بھی استعمال کر لی جائیں۔ تو کوئی
حرج نہیں ہے۔ لیکن جب سردرد بار بار ہونے
لگے تو اس وقت اناسین اسپرو یا اس طرح کی کسی اور
دوا کو اپنا سہارا بنانا اپنے کو تباہی کے حوالے کرنا
ہے۔ اس وقت میں بازاری گلیوں کا سہارا لینے کے
بجائے کسی معالج کو اپنی ساری تکلیفیں بتا کر اس سے
اصل بیماری کا علاج کرانا چاہئے۔ اگر کسی ایسے شخص
کو دیکھا یا جائے جو حکیمی اور ڈاکٹری دونوں ہی اصولوں
کو اچھی طرح جانتا ہو تو وہ مریضوں کے اوپر غور و فکر بھی
کرتا ہو تو زیادہ فائدہ کی امید کی جا سکتی ہے۔ جو سردرد
پرانا ہو اس میں بازاری دوا کبھی اس وجہ سے استعمال
نہیں کرنی چاہئے کہ اس سے وہ بیماری جس کی وجہ سے
سردرد ہوا کرتا ہے اور بڑھ جاتی ہے اور اس بیماری
کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی وجہ سے اور
بھی بہت سی تکلیفیں جیسے مثلاً دل کی کمزوری۔ دل کی
گھبراہٹ۔ دل کا دورہ وغیرہ شکایتیں پیدا ہو جاتی
ہیں۔



شاہجہاں کی سرپرستی آپ کا ادبی فریضہ ہے — ادارہ

# انشائے فارسی

منتخبہ: ڈاکٹر محمد یونس جعفری
شعبۂ فارسی دلی کالج دہلی

## آیا زندگی در شهر را ترجیح میدهید یا زندگی در ده را —؟

من هیچ وجه آدم راحت طلبی نیستم و معتقدم که برای تأمین زندگی، انسان باید دائماً در تلاش باشد و از هیچ کس و هیچ چیز نه هراسد و از هیچ مانعی وحشتناک نگردد، بلکه اگر از یک طرف مشکلی در سر راهش ایجاد شد از طرف دیگر اقدام نماید و آن قدر بکوشد تا بر مرکب مراد سوار شود و بسر منزل مقصود برسد. اما برای این که یک آدم مبارز در جنگ جو بتواند فاتح شود، به تنی سالم و نیرومند احتیاج دارد. فرق نمی کند گاهی صحنهٔ کارزار مرد جنگجو میدان نبرد حقیقی است و گاهی هم عرصهٔ اجتماع. و حتی می توان گفت کسب پیروزی در عرصهٔ زندگی و اجتماع به مراتب مشکل تر از بدست آوردن ظفر در میدان جنگ است. در میدان جنگ شاید فقط دلیری و مهارت کافی باشد، لیکن در صحنهٔ اجتماع علاوه بر این دو صفت، هزاران صفت دیگر هم ضروری و لازم است.

در شهر عوامل بسیاری وجود دارد که می توانند در عرض مدت کمی نیرومندترین فرد را تبدیل به شخصی نحیف و بیچاره ای سازد. دود غلیظ و تیرهٔ کارخانه ها، گرد و خاک خیابانها، سر و صدای جگر خراش وسائل نقلیه، هوای آلوده و ناپاک و بالاخره زندگی ماشینی ای که همه چیز حتی معنویات انسان را تحت الشعاع قرار داده نمونهٔ کوچکی از این عوامل می باشند. زندگی در شهر دائماً توأم با اضطراب و هراس است و شهرنشینان مانند گرگهای خون خوار بیابانی پیوسته در صدد این هستند که لقمهٔ رفیق شان را از دهان او بگیرند. حرص و آرزو بدبینی و تقلید به نسبت وسیعی در زندگی شهری ریشه دوانده

آگے صفحہ ۳۲ پر

---



رخشاں جہاں دہلی

# بھوکے لوگ

پی - ایف - اعظمی - بی - اے

مال روڈ پر چہل پہل اپنے شباب پر تھی - رنگین ساریوں اور چست جمپروں میں ملبوس - حسین اور نوجوان لڑکیاں کاروں سے اترتیں اور سر کو مغرورانہ انداز میں جھٹکتی ہوئی واٹگار ریسٹورنٹ میں گھس جاتیں - واٹگار ریسٹورنٹ شہر کا سب سے مشہور اور مہنگا ریسٹورنٹ تھا - جس میں صرف اونچے طبقے کے لوگ ہی جا سکتے تھے - متوسط اور معمولی طبقے کے لوگ صرف باہر ہی سے ریسٹورنٹ کی جلتی اور بجھتی ہوئی لائٹوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے -

ریسٹورنٹ سے دو تین قدم کے فاصلے پر ایک دبلا پتلا اور خارش زدہ کتا اپنے سر کو دونوں ٹانگوں کے بیچ میں چھپائے ہوئے لیٹا تھا - جب بھی کوئی کار ہوٹل کے پاس رکتی تو کتے کی نیند کھل جاتی - اور وہ سر اٹھا کر بھونکنے لگتا - لیکن کمزوری اور بھوک کی وجہ سے بھونکنے کا سلسلہ دیر تک نہ چل پاتا - اور مجبوراً وہ تھک کر پھر اپنے سر کو ٹانگوں میں چھپا لیتا -

ایک لمبی اور شاندار کار ہوٹل کے سامنے آ کر رکی - گیٹ میں کھڑے ہوئے سفید پوش بیرے نے دوڑ کر کار کا دروازہ کھولا - ایک مغرب زدہ ہندوستانی لڑکی منی اسکرٹ پہنے ہوئے کار سے اتری اور فٹ پاتھ پر چلنے والوں پر حقارت بھری نظر ڈالتے ہوئے ہوٹل کے اندر چلی گئی -

لڑکی کے اندر داخل ہوتے ہی کئی بھوکی نگاہیں اس پر ٹوٹ پڑیں - اندر بیٹھے ہوئے لوگ اس کی ننگی ٹانگوں کو اور جسم کے دلکش خطوط کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ لڑکی نہیں بلکہ آئس کریم ہے جسے دیکھ کر لوگوں کے منہ میں پانی بھر آیا ہے - لڑکی شان بے اعتنائی کے ساتھ آگے بڑھتی گئی اور ایک خالی میز پر جا کر بیٹھ گئی - اس کے بیٹھتے ہی بیرے نے پانی کا گلاس اس کے آگے رکھ دیا اور آرڈر کے انتظار میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا - لڑکی نے ایک پیگ وہسکی کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی - اندر بیٹھے ہوئے بڈھے اور جوان سبھی کنکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے - دھیرے دھیرے شراب اپنا رنگ دکھانے لگی —— لوگ جھومنے لگے

بیرے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے - شراب، آملیٹ، مچھلی اور کباب کی خوشبو لوگوں کو دیوانہ بنا رہی تھی - لوگ جھوم رہے تھے - گنگنا رہے تھے - ڈانسر نے جسم کے کپڑے ایک ایک کر کے اتار دیے تھے اور اب وہ بالکل برہنہ

ہو رہا تھا پر رہی تھی کسی کو بھی اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔
ہر شخص بھوکا تھا۔ اور یہ بھوک برابر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔
یکایک روشنیاں گل کر دی گئیں۔ اور بھوکے لوگ اپنی بھوک مٹانے میں مشغول ہو گئے۔ میزیں الٹ گئیں۔ شراب فرش پہ پانی کی طرح بہنے لگی۔ سیکڑوں پلیٹیں ٹوٹ گئیں۔ اور ان میں رکھے ہوئے کھانے کے سامان فرش پہ بکھر گئے۔
بھوکے لوگوں نے ان کو اپنے پیروں تلے روند دیا۔
اور ریسٹورانٹ کے باہر۔
ریسٹورانٹ کے باہر سڑک کی دوسری طرف ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا ندیدی نظروں سے ہوٹل کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بھوک سے اس کا پیٹ اور پیٹھ مل کر ایک ہو گئے تھے۔ کپڑے کے نام پر اس کے بدن پہ ایک پھٹا ہوا اٹھارہ روپیہ تھا۔ جو اس کی برہنگی کو مکمل طور سے ڈھکنے میں کامیاب ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے پاس سے گذرتی ہوئی ایک عورت کے سامنے جھکتے ہوئے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ عورت نے لڑکے کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ اور بڑبڑانے لگی۔ دور ہٹ کمینے کہیں کے۔ میری اتنی قیمتی ساڑی کو ہاتھ لگا کر گندا کر دیا۔ پتہ نہیں کہاں سے آجاتے ہیں۔
یہ ذلیل لوگ مرتے بھی نہیں۔ لڑکا سہم گیا۔ اور آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا کانپتا رہا۔ اس درمیان میں کئی لوگ اس کے پاس سے گذرے لیکن پھر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ہمت اسے نہیں ہوئی۔
اچانک شور غل کی آواز سن کر لڑکے نے آنکھیں کھولیں۔ تو اس نے دیکھا کہ انسانوں کا ایک سمندر بڑھتا چلا آرہا ہے۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے ”انقلاب زندہ باد“ ”روٹی روزی کپڑا دو“ ”لال جھنڈا اونچا ہو“
لڑکا بھی انسانوں کے اس سمندر میں شامل ہو گیا۔ اور نعرے لگانے لگا۔ ”لال جھنڈا اونچا ہو“
لیکن بھوک کی وجہ سے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی۔ لڑکا کچھ دور تو جلوس کے ساتھ نعرے لگاتا ہوا چلا۔ لیکن پھر تھک کر اپنی جگہ واپس لوٹ آیا۔

جلوس نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ لیکن شاید اس دور میں جینے کا حق مانگنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس لئے جلوس نے فائرنگ شروع کر دی۔ سیکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور جلوس منتشر ہو گیا لیکن آج نہیں تو کل یہ جلوس پھر اٹھے گا۔ بھوکے لوگ اپنا حق مانگیں گے۔ عوام کی طاقت کو بندوق اور سنگینوں سے دبایا نہیں جا سکتا۔ انقلاب کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ سرمایہ داری نظام کا جو محل مزدوروں اور کسانوں کی لاشوں پر بنایا گیا ہے۔ اسے تو ایک دن گرنا ہی ہے۔ وہ جتنی جلدی گر جائے اتنا ہی اس کے لئے بہتر ہے۔
ہنگامہ ختم ہو گیا تھا۔ زندگی پھر معمول پہ آچکی تھی۔ ریسٹورانٹ کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو شاید باہر جو کچھ ہوا۔ اس کی خبر بھی نہیں ہے۔
دو تین سو مزدوروں کا مر جانا یا مار دیا جانا کوئی اہم بات نہیں ہے۔
ہوٹل کے سامنے ایک کار آکر رکی کتے نے پھر سر اٹھایا۔ لیکن اب کی بار وہ بھونکا نہیں۔ کتے نے لڑکے کی طرف اور لڑکے نے کتے کی طرف دیکھا۔ شاید دونوں نے ایک دوسرے کی پریشانیوں کو سمجھ لیا تھا۔ کتے نے پھر اپنا منہ ٹانگوں کے بیچ میں چھپا لیا۔ لڑکا بھی سردی سے بچنے کے لئے بالکل گٹھری سا بن گیا۔ اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔
لیکن بھوک کی وجہ سے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ چار پانچ لڑکیوں کا ایک غول زرق برق لباس پہنے ہوئے ادھر سے گذرا۔ اور لڑکے کو ٹھوکر مارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ نالی کا کیڑا ہے۔ جسے لوگ پیروں تلے روند دینا چاہتے ہیں۔ لڑکے نے ایک نظر ان کے قیمتی لباس پہ ڈالا اور سوچنے لگا کہ ابھی کچھ دن ہی پہلے دیہات میں جب میری ماں مری تھی تو اس کے لئے کفن کا بھی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ اور ایک یہ لڑکیاں اور عورتیں ہیں جن کی صرف چپلیں ہی پچیس تیس روپئے کی ہیں۔ جبھی تو یہ انسانوں کو ٹھوکر مارتی ہوئی چلتی ہیں۔ اور یہاں پر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہزاروں

شاہجہاں دہلی

روپے صرف شراب و کباب میں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ اور دوسری
طرف یہیں پر لاکھوں اور کروڑوں انسان ایسے بھی ہیں جن کی
...یں بھوکی مر جاتی ہیں۔ اور مرنے کے بعد ان کو کفن بھی نصیب
نہیں ہوتا۔

لڑکا کچھ دور چل کر ایک پان والے کی دوکان کے پاس
کھڑا ہوگیا۔ دوکان پر رکھے ہوئے ریڈیو سے خبریں نشر ہو رہی
تھیں۔

اناؤنسر کہہ رہا تھا کہ آج ایک بجلی گھر کا افتتاح کرتے
ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ ہم دیش میں سماج واد لانے
کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم ایسا انتظام کر رہے ہیں جس
سے ہر آدمی کو روزگار مل سکے۔ مکان، روٹی اور کپڑا مل
سکے۔ ہم بنگلہ دیش سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کو ہر ممکن
مدد کر رہے ہیں۔ اور کریں گے۔ اور ایک بھی آدمی کو بھوک سے
مرنے نہیں دیا جائے گا۔ لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں یہ بنگلہ دیش کہاں ہے؟ یہ سماج واد
کیا ہے؟ اور وہ وقت کب آئے گا جب سب کو روٹی، روزی
اور کپڑا ملے گا۔ اس کے لئے شاید قیامت تک انتظار کرنا پڑیگا۔
تب تک تو لاکھوں سہاگنوں کے سہاگ اجڑ چکے ہونگے۔ نہ
جانے کتنی ماؤں کی گودیں سونی ہو چکی ہوں گی۔ اور کروڑوں
لاشیں بے کفن دفنائی جا چکی ہوں گی۔

لڑکا یہی سب سوچتا ہوا ابھی اپنی جگہ آکر بیٹھا ہی
تھا کہ ایک عورت جو جلدی میں سڑک پار کر رہی تھی، اس کے
ہاتھ سے پتے کا ایک دونا جس میں کچھ سموسے تھے گر پڑا۔
اور سموسے سڑک پر بکھر گئے۔ گرے ہوئے سموسوں کو دیکھ
کر لڑکا اور کتا دونوں دوڑ پڑے۔ ابھی وہ دونوں گرے ہوئے
سموسوں کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ اچانک ایک بھاری بھرکم
ٹرک نے دونوں کو روند ڈالا۔ دونوں کی ملی جلی چیخ فضا
میں بلند ہوئی۔ اور ٹریفک کے ہنگاموں میں گم ہو کر رہ گئی۔

(اردو میل کانپور)

بقیہ انشائے فارسی

و آن را کاملاً غیر قابل تحمل ساختہ است۔

لیکن زندگی آرام دہ بیشتر و سالمی دہ درست
نقطہ مقابل زندگی پرجنجال و آشوب زندگی در شہر
می باشد۔ ممکن است گفتہ شود دامنہ فعالیت در دہ
محدود است۔ ولی این حرف بہیچ وجہ قابل قبول نیست
و اگر انسان بخواہد کار کند و حقیقتاً مرد عمل باشد ہیچ
چیز نمی تواند جلو دامنہ فعالیت او را سد نماید۔
ہوای لطیف و نشاط آور، مزارع و درختان
سرسبز و زیبا، آسمان آبی دہ کدہ، و تماس با مردم
سادہ و بی ریای روستائی برای انسان تولید نشاط
می نماید و ہمین نشاطی تواند سرچشمہ فعالیت ہای
فراوانی شود۔

بر اثر این دلایل و دلایل بیشمار دیگر، من زندگی
در دہ را بر زندگی در شہر ترجیح می دہم۔

# دوڑ پیچھے کی طرف . . . .

ایک بار پنڈت سندر لال نے یو۔ پی۔ کے پہلے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور شکوہ کیا کہ "پنت جی! اردو کو کیوں ختم کر رہے ہو؟ اردو تو ایک مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی زندہ علامت ہے۔"

پنت جی نے اس بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "پنڈت جی! کوئی اور بات کیجئے۔" لیکن پنڈت جی بضد رہے وہ پنت جی سے اردو دشمنی کی وضاحت کرا لینا چاہتے تھے۔

پنڈت سندر لال نے جب زیادہ اصرار کیا تو پنت جی نے جواب دیا۔

"پنڈت جی! اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک ہم پر راج کیا ہے اب ہمیں راج کرنے کا موقع ملا ہے۔ اب مسلمان محکوم ہیں ذرا انھیں مزہ تو چکھ لینے دیجئے۔"

# شاہجہاں

طالب علموں کا | طالب علموں کے لئے | طالب علموں کے ذریعے

نومبر ............ ۱۹۷۱ء

جلد ۵ ............ شمارہ ۱۱

قیمت فی پرچہ - - - - - - - پچیس پیسے

سالانہ .......... تین روپے


## ہمارے مقاصد

طالب علموں ——————
———— میں علمی ادبی ذوق پیدا کرنا
———— کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا
———— کو ملک وملت کی بامقصد خدمت کے لئے تیار کرنا
———— میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا
———— کی آواز کو عوام تک پہنچانا
———— کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا ———— اور
———— سماجی اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا

ادارہ



شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے اور غزلیں ونظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول وکالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں۔

ادارہ



شاہجہاں آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (A.I.S.N.E.C) نئی دہلی کا ممبر ہے۔


طابع، ناشر ومالک محمد عتیق صد[یقی]
مطبوعہ اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران

مقام اشاعت:۔ قاسم جان اسٹریٹ بلی ماران دہلی نمبر 6

# جرعات

# three facts make your skin lovely.

AFGHAN SNOW

Between the age of 25 and 30 your skin loses moisture. Afghan Snow replenishes the moisture loss and keeps your skin young.

Sebum secreted lubricates the skin and prevents dryness. Excess sebum leads to skin disorders. Afghan snow screens the dust from reaching sebum which is the main cause for unsightly pimples and acne.

Every day or so your skin renews itself. Afghan Snow protects the new-born cells from the ravages of weather. Use AFGHAN SNOW for constant loveliness.

**AFGHAN SNOW**

E.S. PATANWALA, BOMBAY-86

شاہجہاں دہلی

# لمحۂ فکر

## آل انڈیا اسمال اردو نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل نئی دہلی

ہم پہلے بھی ان ہی صفحات میں کونسل کے انتشار کا ذکر کر چکے ہیں۔ موجودہ صورت حال کے پیش نظر ہم ایک بار پھر قلم اٹھانے پر مجبور ہیں۔

ہم اس عمل کو نہ صرف اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جو اخبار برادری کے مفاد کے خلاف ہو بلکہ قابل مذمت سمجھتے ہیں۔ خواہ یہ قدم برسراقتدار گروپ کی ہی طرف سے کیوں نہ اٹھایا گیا ہو۔ دونوں گروپوں کی کئی ماہ کی آپسی فقرے بازی اور گالی گفتار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کونسل کے جنرل سکریٹری مسٹر رضی بدایونی ماکونسل کے صدر مسٹر رفیق الدین صدیقی کے دفتر میں ملازمت کرتے تھے۔ کوئی بزنس فائدہ نہ دیکھتے ہوئے مسٹر صدیقی نے مسٹر رضی کی ذمہ داری کو کم کر دیا اور اسی کے ساتھ ساتھ تنخواہ میں بھی کمی کر دی جس کا ان کو قلق ہونا لازمی تھا۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب تک ان کی تنخواہ میں کمی نہیں ہوئی تھی وہ صدیقی صاحب کے ہم نوا تھے اور ان کے قصیدے الاپتے تھے مگر اس کے بعد وہ ان کے دشمن نمبر ایک بن گئے اور محض ذاتی پرخاش کی وجہ سے چند تیسرے نمبر کے صحافیوں کو اکٹھا کر کے صدر اعلیٰ بننے کے خواب دیکھنے لگے۔ دوسری طرف کونسل کے "صدر اعلیٰ" مسٹر رفیق الدین صدیقی کو اپنی ایک کار، ایک اسکوٹر اور بے شمار دولت ہونے پر گھمنڈ ہے۔ وہ اسی کے سہارے اور اپنی اقتدار کی ہوس کی تکمیل کے لئے موروثی "صدر اعلیٰ" بنے رہنا چاہتے ہیں۔ کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ کونسل کو بنے ہوئے قریب دو سال کا عرصہ ہو گیا مگر آج تک ایک بھی جنرل باڈی کی میٹنگ نہیں بلائی گئی اور نہ ہی آج تک جمہوری انتخاب عمل میں آیا ہے۔ انھوں نے مخالفوں کو بالفاظ دیگر باغیوں کو مخالفت یا بغاوت کی سزا یہ دی کہ انھیں کونسل کی بنیادی ممبرشپ سے ہی خارج کر دیا گیا۔ اور بڑی بڑی ریاستوں کی طرح ہر صوبے میں "گورنر" مقرر کئے جانے کا اعلان کر دیا گیا۔

ہم نہ رضی صاحب اور ان کے ہمنواؤں کو صحیح سمجھتے ہیں اور نہ ہی صدیقی صاحب کے عمل کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں حضرات محض ذاتی لڑائی اور ذاتی مفاد کی خاطر ممبر معاصرین کا استعمال کر کے اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔

۳ر اکتوبر ۷۱ء کو باغی گروپ نے دلّی میں ایک جنرل باڈی کی میٹنگ بلائی تھی۔ اس میں دلّی اور بیرون دلّی کے تقریباً دس پندرہ صحافیوں نے شرکت کی اور

بھی اکثریت کا یہی خیال تھا کہ ہر دو حضرات غلط ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ کونسل کی ازسر نو تشکیل کیجائے اور موجودہ کونسل کو ختم کردیا جائے۔ اس کے لئے ۱۱ ممبروں پر مشتمل ایک ایڈہاک کمیٹی مقرر کردی گئی تھی مگر یہ بات نہایت افسوسناک ہے کہ اپنی تخریبانہ ذہنیت یہاں بھی شامل حال رہی اور انھوں نے اس میں اپنے ہمنواؤں کے نام شامل کرکے اگلے دن اخبارات میں ۱۴ ممبران کا اعلان کیا گیا۔

ہم دونوں گروپوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ذاتی مفاد کو بالائے طاق رکھیں اور اخبار برادری کے ساتھ غداری نہ کریں اور یا تو ایک ساتھ مل کر چلیں یا پھر تعمیری کام کرنے والوں کے لئے راستہ صاف کردیں۔





شاہجہان دہلی

# لہجے کی الاپ

امر آمیری

میں نے احساس کے زینے سے کبھی
تیری پرنور سی دنیا میں بھٹکنا چاہا
ذہنِ بالیدہ لئے طغرۂ افکار کے ساتھ
آنچ ناگفتہ خیالوں کو جلانے کے لئے
اپنے ہی نقش کفِ پا پہ قائم رکھتے ہوئے
اپنی ہی عظمت پارینہ کو پانے کے لئے
تیری گفتار کی گونجی ہوئی یہ لے آخر
دشت میں پاؤں کی آہٹ سے پیاری کیوں ہے
اور پھر تیرگیٔ شب کو سمیٹی ہوئی زلف
آس کے لمحوں کی زنجیر بنی ہی کیوں ہے
یہ بتا تیرے کھنکتے ہوئے لہجے کی الاپ
میرے احساس کے سانچے میں کبھی ڈھل بھی سکی؟
جب کہ ہر لحظہ تیری ذات سے وابستہ ہوں

# دشتِ تنہائی (سانیٹ)

کشور۔ بی۔ ایس۔ سی بنگلور۔

دشتِ تنہائی میں بھٹکے ہوئے راہی کی طرح
یا کسی جنگ میں لاچار سپاہی کی طرح
ڈھونڈتا پھرتا ہوں امّید کا ٹوٹا ہتھیار
جو مرے عزم کی تکمیل کا سامان بنے
اور ملے راحتِ جاں روح کو آجائے قرار
کھینچ لائی ہے کہاں عمرِ رواں ٹھہر ذرا
دھندلی دھندلی سی نظر آتی ہے ہر راہ گذر
دور تک میری طرح کوئی مسافر بھی نہیں
لوٹ آئی ہے تھکی ماندی تجسّس میں نظر
دور کی دھوپ ہے احساس کے شعلے جاگے
مضمحل جسم دہکنے لگا سانسوں کے تلے
نبض چلتی ہے سنبھلتی ہوئی دھیمے دھیمے
دلِ بیتاب نہ کر آہ و فغاں ٹھہر ذرا
زیست بن جائے نہ ہر لمحہ گراں ٹھہر ذرا

# قلم کی نوک سے

(تبصرہ)

"اعتمادیہ" (اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول کی میگزین ۱۹۶۹-۷۰ء)
ایڈیٹر انچارج - محمد قاسم صدیقی - ایم - اے
ایڈیٹر - تمیز الدین سروش

اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول دلی کے قدیم اور ممتاز اسکولوں میں سے ایک ہے۔ دلی کا یہ ایک واحد اسکول ہے جہاں ہائر سیکنڈری کی تعلیم اردو اور ہندی میڈیم میں الگ الگ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور اسکولوں میں یا تو ہندی اور یا صرف اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ اردو اور ہندی میڈیم میں تعلیم ہونے کے سبب یہ اسکول قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کا بھی علمبردار ہے۔ اسکول کی سالانہ میگزین کا نام اسکول کے بانی غازی الدین اعتماد الدولہ کے نام پر "اعتمادیہ" رکھا گیا ہے۔

ہمارے سامنے "اعتمادیہ ۱۹۶۹-۷۰ء" ہے۔ میگزین ۱۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی میں اردو، ہندی اور انگلش کے الگ الگ حصے ہیں۔ گٹ اپ خوبصورت ہے۔ ٹائٹل پر اسکول اور اسکول کی مسجد کی خوب صورت تصویریں دی گئی ہیں میگزین کی کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے مواد کا تعلق ہے اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ کیونکہ ہم اس مرکزی خیال کے حامل ہیں کہ اسکول یا کالج میگزین میں قطعی طور پر صرف طلبہ کو ہی موقع دیا جانا چاہئے۔ مگر اس کے برخلاف زیر نظر میگزین میں فہرست کے مطابق اکتیس (۳۱) مضامین میں سے صرف سات مضمون طلبہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور وہ طلبہ بھی صرف دو کلاسوں سے متعلق ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ میگزین کو دیکھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسکول کے اساتذہ حضرات نے طلبہ کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہوئے اس میگزین کے ذریعہ صفحہ قرطاس پر نمودار ہونے کی ذاتی خواہش کی تکمیل فرمائی ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعًا ناقابل قبول ہے کہ ایک ایسا اسکول جس نے کل سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، آصف علی بیرسٹر جیسے ہزاروں ایسے طالب علم پیدا کئے ہیں جو نہ صرف قوم بلکہ ملک کے لئے بھی وجہ افتخار بنے۔ آج وہی اسکول ایسے طالب علم بھی پیدا نہیں کر سکتا جو کم از کم اسکول میگزین کے لئے ہی مضمون لکھ سکیں۔

ادارہ

# غزل

کمالؔ جعفری
ایم۔اے۔فاضل کلکتہ یونیورسٹی

آوازِ اپنے دل کی ہوں بانگِ درا نہیں
پیچھے مرے نہ آئے جو درد آشنا نہیں

غیروں سے بھی نباہ تمہارا نہ ہو سکا
کیا اب بھی یہی کہو گے کہ تم بیوفا نہیں

چہروں میں اختلاف صداؤں میں انتشار
اس شہرِ اجنبی میں کوئی ہمنوا نہیں

اِس کا شعور ہو گا تجھے اے غمِ حیات
تجھ سے ہی تو بلند مرا حوصلہ نہیں

یوں گمرہی میں آج ہے ہر شخص مبتلا
جیسے زمانے بھر میں کوئی رہنما نہیں

انسانیت کا قتل ہے ہر شاہراہ پہ
دیکھا ہے اپنی آنکھ سے میں نے سنا نہیں

منزل کدھر ہے اور کدھر راستہ کمالؔ
وہ کیا بتائے جس کو خود اپنا پتا نہیں

# فن کار

ہربنس ساہنی

رام پوری چاقوؤں والی دکان پر نواب صاحب کھڑے ہو گئے تھے۔ جاوید نے مڑ کر دیکھا تو نواب صاحب ایک چاقو ہاتھ میں لئے سب کو ہانکیں لگا رہے تھے۔

"یہاں آؤ بھئی ہمیں ایک چاقو خرید وا دو"

جاوید، میں اور شنکر مجبوراً الٹے پاؤں دربار واٹ بازار کی کونے والی دکان کی جانب لپکے۔ جاوید نے منہ ہی منہ میں نواب صاحب کو ایک موٹی سی گالی بکی اور کہنے لگا۔

"آج پھر سالے کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنا ہوگا"

جاوید کی بات غلط نہ تھی۔ نواب صاحب کسی ریاست یا جاگیر کے نواب نہ تھے صرف دوستوں کے دیئے ہوئے نام کے نواب تھے اس لئے نواب صاحب ہو گئے تھے کیونکہ صرف نواب جچتا نہ تھا خلیفہ رشید بال بنانے آیا تو "نواب صاحب" کی آواز لگا رہا ہے، بدھی حلوائی کبوتروں کی پرواز کے سلسلے میں صدا لگا رہا ہے تو "نواب صاحب۔ نواب صاحب" کی گونج گلی میں سنائی دے رہی ہے۔ میونسپل کمیٹی کا چپراسی کسی دفتر کے کاروبار کے چکر میں انسپکٹر کے گھر آیا تو "نواب صاحب" پکار رہا ہے — نواب صاحب ویسے میونسپل بورڈ کی چونگی کے انسپکٹر تھے سوا سو روپیہ ماہانہ کے ملازم تھے۔ چونکہ آٹے میں نمک ملا کر کھانے کے عادی تھے اس لئے کبھی کبھی بالائی آمدنی کے ذرائع ڈھونڈنے سے کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ گھر میں روٹی گوشت چل رہا تھا والد محترم بڑھاپے میں کبھی چار پانچ روپے کے روز پیٹ لیتے تھے۔ بڑے بازار میں ایک دکان پہ [illegible]

لگا کر بیٹھے رہتے۔ بیس سال بڑے ہسپتال میں نوکری کی تھی ان کے تجربے کی دھاک آبادی اور قبرستان یکساں طور پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا بھائی چار سال سے ہائی اسکول کا امتحان دے رہا تھا اور اس سے چھوٹا مڈل سے دو سال ابھی دور تھا۔ نواب صاحب کی ماں ان کے والد صاحب کی طرح ہی زندہ دل تھیں نواب صاحب کے دوستوں سے ڈاکٹر صاحب اور ڈاکٹرنی صاحبہ بڑی محبت کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ نواب کی بیٹھک کا دروازہ کبھی بند نہ ملتا تھا۔ کوئی نہ کوئی پلنگ پر ٹانگیں پھیلائے یا زمانہ قدیم کی رکھی ہوئی آرام کرسی میں دھنسا ہوا ضرور ملتا تھا۔ جاوید کی آواز نواب صاحب کی گلی میں اکثر یوں سنی جاتی "نواب صاحب۔ اے نواب صاحب" کوئی جواب نہ ملتا تو اس کی آواز اونچی ہو جاتی "او نواب کے بچے۔ کہاں ہے بے چپڑ کٹے۔ ملیٹر پانڈے" نواب صاحب کی ماں بیٹے کے طرح طرح لقب سنتی۔ تو اندر ہی سے جواب دیتی۔

"اندر جاؤ بیٹھو بیٹھک میں۔ نواب صاحب ابھی ابھی ٹاؤن ہال تک گئے ہیں"

اسی طرح کوئی نہ کوئی نواب صاحب کی حاضری میں ہی رہتا۔ ان کے ہاں جما رہتا اور ان کی موٹی دھوتیوں سے ماری ہوئی ملور کی کیتلی میں چائے کا پانی ہر وقت گرم ہوتا رہتا۔ [illegible] نواب صاحب کی بیٹھک تک بند شاعروں، سازندوں، چوکڑیں لڑانے والے گپ بازوں، شطرنج کے کھلاڑیوں اور کبوتر بازوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہر موضوع پر یہاں لوگ اپنے اپنے

فن کے تذکرے کرتے تھکتے نہ تھے اور نواب صاحب اتنے وضع دار کہ کبھی ان کے شور و شر یا بھیڑ بھاڑ سے اکتاتے نہ تھے ان کے ہاں جتنا بڑا مجمع ہوتا ان کی چھاتی پھول اور پھیل کر اور چوڑی ہو جاتی ان کی گردن فخر سے دو انگل اور لمبی ہو جاتی۔ وہ خود کسی جھگڑے کسی بحث میں پڑے بغیر لوگوں کی ضروریات کی طرف اپنی پوری توجہ کئے ہوئے پلنگ پر پڑے حقے کے کش لیتے رہتے تھے اور کبھی کبھی حقے کی نے منہ میں دبائے دبائے ہی اس قسم کی آوازیں نکالتے رہتے۔ "کالو پانی دے جا حکیم صاحب کو" "پان لگوا کے لے آ" "اچھن میاں کے لئے" "ماچس لے آ" شنکر سگریٹ سلگائیں گے"۔

حقہ گڑگڑاتے رہتے اور کبوتروں کے کھیل شطرنج کی شہ مات اشعار کی رنگینی اور گلے کی مرکیوں سے خاموش پڑے لطف اندوز ہوتے رہتے بولنے پر آتے تو اپنے دو چار بے تکلف دوستوں سے ماں کی بہن کی کرتے رہتے یا پھر شکار کا ذکر لے کر بیٹھ جاتے۔ شکار کی انہیں رٹ تھی اسی لئے مل ملا کر ایک چیکوسلواکین ایک نالی والی بندوق بھی خرید لائے تھے۔ بندوق آتے ہی شکار کا جنون سر پر سنبھالے یاروں دوستوں کو ... اکٹھا کرتے ہوئے نظر آتے شکار کے علاوہ ایک شوق انہیں میلوں ٹھیلوں پر جانے کا بھی تھا جیسے وہ شکار پر چلا ہی کیا کرتے تھے ان کے لئے وہ فنکار گاہ ہی تھی جنگل میں جا کر وہ ہرن۔ پاڑے اور تیتر مارتے تھے اور میلوں اور نمائشوں میں آ کر وہ چشمے، کنگھیاں، رومال، چوڑیاں اور جانے کیا کیا اڑا لیتے تھے ان کی اس عادت سے ہم سب دوست اکثر ان سے جھگڑ پڑتے تھے یہ بھی کوئی شرفا کی باتیں تھیں لیکن ان کو ہماری نصیحتوں سے کبھی اتفاق نہ ہوا۔ ان کے دلائل چونکہ کسی حد تک وزن رکھتے تھے اس لئے ہم کبھی ان کو قائل نہ کر سکے۔ گو ان کی اس بری عادت کو چھڑوانے اور ان کے شکار کو خراب کرنے کے ہم ہمیشہ ذمہ دار رہتے تھے۔

آج صبح سے ہی جاوید، شنکر، نواب صاحب اور میں نوچندی کی نمائش میں گھوم رہے تھے دوپہر میں شو دیکھنے کے لئے سینما ہال در چلے گئے تھے اور پھر شام کو نوچندی میں آ گھسے تھے ہم تینوں جہاں نوچندی کی جوان بہاروں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ہلکے پھلکے قدم اٹھا رہے تھے وہاں نواب صاحب ہر دکان جھانکتے ہوئے کوئی نہ کوئی چیز پسند کرتے پھر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے انہیں رام پوری چاقو پسند آیا تھا۔ اور اب وہ چاقوؤں والے دکاندار کی موت بنے اس کی دکان پر منڈلا رہے تھے ہم تینوں قریب پہنچے تو فرمانے لگے "بھئی تم لوگ تو بھاگے جا رہے ہو، یہاں رام پور والوں کی دکان دیکھ کر رک گیا تھا کہ شاید کوئی کام کا چاقو ملے۔ لیکن بس اب نام ہی رہ گیا ہے مجھے تو کوئی بھی پسند نہیں آیا" دکان دار سر خم کئے کھسیانی ہنسی منہ پر چپکائے یوں جھکا رہا تھا جیسے کسی ملک کے نواب صاحب اس کی دکان پر خوش قسمتی سے آ گئے تھے۔ لیکن بدقسمتی اس کی کہ انہیں کوئی چاقو پسند نہیں آیا ورنہ منہ بولے دام وصول جاتے شنکر نے بازار میں ہاتھ ڈالتے ہوئے نواب صاحب کو کھینچنا چاہا لیکن نواب صاحب نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گرج پڑے۔

"چلتے ہیں بھئی بدتمیزی کا مظاہرہ کیوں کر رہے ہو پہلے ہی ہمارا موڈ خراب کر دیا ہے۔ رام پور والوں نے بہت دنوں سے آس لگا رکھی تھی کہ کوئی چاقو لیں گے"

دکان دار کی گردن اندر نیچے ڈھلک گئی۔ نواب صاحب کف افسوس ملتے برا منہ بناتے ہوئے سب کو ساتھ لئے آگے بڑھ آئے۔ جاوید جیسے ان کی ایکٹنگ دیکھ کر بھانپ گیا تھا دس قدم نکلتے ہی بول پڑا۔ "آج پھر چاقو مار دیا ہے نا نواب کے بچے قسم خدا کی تمہارے ساتھ آئندہ کبھی ایک قدم بھی نہیں چلوں گا کسی روز ہم سب کی عزت بھی خاک میں ملاؤ گے پکڑے گئے اگر کسی روز۔"

نواب صاحب کے دل میں جیسے رامپوری چاقو جاوید نے اتار دیا ہو برسوں ہی تو پڑے رہے چپ رہو خبر ہے بچے تو یاد ہے فن کیا ہے۔

نواب صاحب کے غصے سے بھرے ہوئے اس جواب کو سن کر ہم تینوں قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے اس طرح دکان دار کی آنکھ میں دھول جھونک کر مال اڑانے کو فن منوانے کی ادا کی داد کے آگے ہم نہ صرف سر جھکا دیتے تھے بلکہ ان کے فن کو گھڑی دو گھڑی زیر بحث لا کر نواب صاحب کو خوش بھی کر دیا کرتے تھے "ہاں نواب صاحب! دکھائیے تو کیسا ہے وہ چاقو؟" میں نے بناوٹی ستائش بھری نظروں کے ساتھ کہا۔

شاہجہاں پور

نواب صاحب کا ایک ہاتھ ابھی تک اپنے اوور کوٹ کی جیب میں تھا ایک شان امتیازی سے انھوں نے وہ ہاتھ جیب میں سے باہر نکالا۔ ہاتھ کا پنجہ ابھی تک بند تھا اور چاقو کا دستہ سنبھالے ہوئے تھے چاقو کا بقیہ حصہ اوور کوٹ کی آستین کے اندر تھا آستین میں سے چاقو نکالا اور میرے ہاتھ میں دے دیا ہاتھ بھر کے لمبے چاقو کو کس چابکدستی سے اڑایا تھا ہم دل ہی دل میں ان کے ہاتھ کی صفائی کے کم از کم قائل ہوئے اگرچہ ان کے اس فعل سے ہمیں کبھی اتفاق نہ ہوا اور نہ ہم اسے کبھی فن تسلیم کرسکے۔ نواب صاحب کے تقریباً سبھی دوستوں نے ان کی اس عادت کے متعلق سنجیدگی سے غور کیا تھا اور انہیں اس عادت بد کو چھوڑ دینے پر ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی سعی ناکام کی تھی لیکن وہ ہمیشہ یہ کہکر خفا ہو جایا کرتے تھے کہ "یہ میری ہابی ہے اور اس کی مخالفت میرے نجی معاملات میں دخل اندازی ہے"

اپنے اس کرم کو وہ ہابی تسلیم کروانے کے لئے بڑے بڑے لوگوں کے حوالے دیا کرتے تھے ایک بار فرمانے لگے۔

"دنیا کا ایک سب سے بڑا حکمراں جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہ ہوا تھا اس کی یہی ہابی تھی کہتے ہیں ایک بار ایک بہت بڑے اسٹور کے وزٹ کے دوران بادشاہ سلامت نے موزے اڑا لئے تھے۔ اب آپ ہی بتایئے بھلا موزے خریدنے کی بھی ان کی اوقات نہ تھی اس سچی اور حقیقی بات کو سن کر بھی آپ سب کی عقل نہیں مانتی کہ یہ ہابی ہے نہ کہ کوئی گھٹیا درجے کی حرکت۔ اور سنو بانسی پور کے کنور صاحب کو کس بات کی کمی تھی ایک بار میرٹھ تشریف لائے تو کٹھا کر ہر بندر سنگھ کے توسل سے ان کا تعارف نصیب ہوا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم پر شاپنگ کے لئے گئے۔ کنور صاحب نے دیکھتے دیکھتے یوں چشمہ پار کر دیا کہ عقل دنگ رہ گئی ماہر فن مانتے ہی بنی۔ دکان دار نے ان کے سامنے چشموں کا ڈھیر لگا دیا تھا نظر بچا کر آپ نے ایک چشمہ آنکھوں پر چڑھا لیا۔ اور باقی چشموں میں سے اپنی پسند کا انتخاب جاری رکھا۔ دو منٹ بعد اپنی آنکھوں کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دکان دار سے مخاطب ہوئے۔"

"ایسا چشمہ نہیں ہے آپ کے پاس لیکن فریم کا کلر دوسرا ہونا چاہئے"

دکاندار نے مایوسی سے سر ہلایا اور معذرت چاہنے لگا۔ "حضور اسی رنگ کا ہے مگر دوسرے رنگ میں نہیں ہے"

"سنتے ہو جاوید میاں! یہ ہیں دو زندہ مثالیں ان لوگوں کی جن کے بارے میں آپ یہ کہنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتے کہ بڑی ہستیوں میں ان چیزوں کو خریدنے کی قوت نہ تھی ان کے علاوہ ہزاروں مثالیں ایسی پڑی ہیں ان ماہر فن کی جو اپنے آپ کو چھپائے ہوئے ہیں اور آرٹ کی دنیا میں گمنام ہیں۔"

نواب صاحب اسی طرح بڑے بڑے نوابوں۔ راجاؤں اور بادشاہوں کو گرہ کٹی کے شوق میں مبتلا بتلا کر ہم کو رام کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

"وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ نواب صاحب اور ان کے ہمجولیوں کی کنپٹیوں پر کے بال سفید ہونے لگے۔ غم جاناں کا ذکر بھول کر غم روزگار کے شکار ہو گئے۔ نواب صاحب کی بیٹھک ویران رہنے لگی نواب صاحب کے والد محترم ان کو ہی نہیں بلکہ ان کے ان گنت دوستوں کو بھی اپنی شفقت سے محروم کر کے چلتے بنے۔ نواب صاحب کی ٹکڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی اب لوگ ملتے بھی تو یونہی رسم سی پوری کرنے کے لئے۔ جاوید کو ملٹری میں کمیشن مل گیا تھا وہ لیفٹیننٹ ہو گیا تھا۔ شنکر بھی لکھنؤ کے پاس کسی کواپریٹو سوسائٹی کی شوگر مل میں ملازم ہو گیا تھا۔ کبھی ... چھ ماہ کے بعد ادھر کا چکر لگاتا تھا تو نواب صاحب کی بیٹھک کچھ گھڑیوں کے لئے سہاگن ہو جاتی تھی دور دور تک قہقہے سنائی دیتے تھے تو آنے جانے والے کچھ دیر کے لئے رک جاتے اور اس وہم میں مبتلا ہو جاتے کہ شاید وہ دن پھر پلٹ آئے ہیں۔ نواب صاحب اور ان کے بے فکرے یار پھر سے جوان ہو گئے ہیں۔

نواب صاحب اب پچاس کے پیٹے میں تھے بہت احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ پھر بھی خدا کے فضل و کرم سے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں نواب کی اولاد ہونے کا شرف رکھتے تھے گردش حالات نے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ صاحبزادے

اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے۔ اپنی پرانی واقفیت اور وضع داری کی مدد سے صاحبزادوں کو شہر میں ہی چھوٹے موٹے کام مل گئے تھے بڑھاپا نواب صاحب پر وقت سے پہلے ہی حاوی ہو چکا تھا۔ چھوٹی موٹی تکلیف ان کو گھیرے ہوتے رہتی تھی۔ گو نواب صاحب نے ان معمولی جسمانی تکالیف کو کبھی اہمیت نہ دی تھی لیکن ایسے موقع پر جب کہ ان کی بڑی لڑکی کا نکاح سر پر آن پہنچا تھا ذیابیطس جیسے موذی مرض نے حملہ کیا نواب صاحب اپنی صاحبزادی کا بیاہ کسی پڑھے لکھے بارزگار نوجوان سے کرنا چاہتے تھے۔ اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے امروہہ، مرادآباد میرٹھ اور سہارنپور تک چکر لگائے تھے۔ مگر اپنی من پسند کا لڑکا کہیں نظر نہ پڑا تھا۔ اور آخر بات پکی ہوئی تو ایک ہائی اسکول پاس کانسٹبل سے اور وہ بھی اس کی کئی طرح کی نامعقول قسم کی شرائط کو مان کر۔ شادی میں ایک ہزار روپے نقد۔ پانچ طرح کے زیور اور دونوں دولہا اور دلہن کے لئے کئی جوڑے کپڑے بھی نواب صاحب کے ذمہ ہی ڈال دیئے گئے تھے۔

اب نواب صاحب اس عمر میں ان ڈھیر ساری چیزوں کو اکٹھا کرنا موت سے کم نہ سمجھتے تھے۔ جب سے رشتہ طے کر کے آئے تھے آدھے رہ گئے تھے دن رات اپنی عزت بچانے اور وعدے کو پورا کرنے کا غم ان کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا اور ذیابیطس نے بھی ان کی صحت کو خاصا متاثر کیا تھا

نواب صاحب کی پریشانیوں کے دن کاٹے نہیں کٹ رہے تھے۔ ایک دن نواب صاحب کا خیال اس زور سے ستانے لگا کہ ان کے پاس جانے ہی بنی۔ پہنچا تو انہیں دوبارہ میں ہی ایک ڈھیلی ڈھالی کھاٹ پر اوندھا پڑا پایا۔

"اماں نواب صاحب! اٹھو بھی۔ کیوں جی کو ہارے پڑے ہو۔ اللہ مددگار ہے سب کام اپنے آپ سنوار دے گا"

"کام کہاں سنوارے گا اللہ میاں۔ گھر میں صبح و شام کو دال روٹی تو میسر نہیں۔ اس اوپر سے کانسٹبل کے چونچلے کون پورے کرے گا یہاں کبھی سالا اپنے پولیس پنے سے باز نہیں آیا"

نواب صاحب کو مفلسی، بڑھاپے اور بیماری نے چڑچڑا کر دیا تھا۔ تمام زندہ دلی کافور ہو گئی تھی منہ میں گالیاں پہلے ہی کی طرح تیار لعاب کی طرح رکھی تھیں لیکن مسرت اور خوش مذاقی کے خلوص سے عاری۔ اب گالیوں میں کرختگی اور جھنجھلاہٹ کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے پاس بیٹھتے ہوئے ڈھارس بندھائی

"میاں گھبرا کر رگھوویر سنگھ سے مل کر دو ہزار روپوں کے قرضے کا انتظام کیا جا سکتا ہے اس وقت کام نہ آئے تو بچپن کی یاری کس کام آئے گی"

نواب صاحب کی مٹیالی آنکھوں میں ایک امید افزا چمک ابھری۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی لکیر لبوں پر کمان کی طرح تن گئی میں شام تک وہاں بیٹھا رہا تھا۔ اٹھتے ہوئے اجازت مانگی کیونکہ مجھے دہرہ میڈیکل ہال میں جانا تھا۔ نواب صاحب نے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ شاید اپنے لئے دوا لاتے ہونگے دہرہ میڈیکل ہال میں پہنچکر میں تو دوائی خریدنے میں لگا تھا نواب صاحب سارے میڈیکل ہال کا طواف کرنے لگے۔ دوائیوں کے ریک کے پاس کھڑے اونچی آواز میں دوائیوں کے نام اس انداز سے پڑھتے ہوئے چہل قدمی کر رہے تھے جیسے وہ کبھی کبھار اخبار کی سرخیاں پڑھا کرتے تھے میں دوائی لیکر فارغ ہوا تو نواب صاحب کے پاس پہنچا جو ایک الماری کے پاس کھڑے اس میں رکھی ہوئی ہری پیلی بند ڈبیوں کو گھورے جا رہے تھے ان کے بازو میں بازو اڑاتے ہوئے میں بول اٹھا۔

"چلو میاں! ان دوائیوں کو کیوں گھورے جا رہے ہو یہ بھی کوئی مٹھائی کی گولیاں ہیں؟"

"مٹھائی کی گولیاں کھانے کے دن اب کہاں ہیں بھائی۔ اب تو ان کڑوی گولیوں کے نگلنے کے لئے رہ گئے ہیں یہ حرامزادہ ڈاکٹر نصیر روزانہ ایک نئی سی نئی دوا لکھ دیتا ہے۔ اب بھلا میں انہیں کہاں سے خریدتا پھروں" نواب صاحب نے یہ جملہ پورا کیا تو ہم دہرہ میڈیکل ہال سے باہر نکل کر دس قدم آگے بڑھ چکے تھے نواب صاحب نے اپنے بوسیدہ کوٹ کی جیب ٹٹولتے ہوئے اس میں سے ایک پیکٹ نکالا۔ ذیابیطس کی دوائی انگلش

شاہ جہاں دہلی

سکے بند دواکھی۔ آنکھیں ملتے ہی نواب صاحب کے جھرّیوں زدہ چہرے پر ایک پھیکی سی ہنسی پھیل گئی۔ میری جانب ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے غزور سے بولے۔

"میاں! یہ ہاتھ کا فن اس آڑے وقت میں اندھے کی لاٹھی بنا ہوا ہے۔ دوائی پر پیسے خرچ کرنا میں ویسے بھی حرام سمجھتا ہوں"

میں نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

"نواب صاحب! اب تمہاری عمر اس ہابی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس ساری عمر میں اگر پول نہیں کھلوایا تو اب بھی موقع ہے اس عادت کو خیر باد کہہ دو تاکہ اس سفیدی میں کہیں خوار نہ ہونا پڑے"

نواب صاحب نے اپنی جوانی والی ہیکڑی میں ہی گردن تان کر جواب دیا۔

"ہاں ہاں ہو گئی نصیحت۔ فن نہ ہوا مذاق ہوا۔ ہاتھ میں کالا ہو اور دوائی پر پیسہ خرچ کیا جائے لعنت ہے"

نواب صاحب سے اس موضوع پر بحث کرنا فضول تھا۔ اتنی عمر گزر نے پر بھی وہ قائل نہ کئے جا سکے تھے کہ اس کو اٹھائی گیرا پن مان لیں۔

عید کے بعد نواب صاحب کی صاحبزادی کے نکاح کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ اپنا دادا الٰہی مکان گروی رکھ کر بمشکل تمام دو ہزار روپے اکٹھا کئے تھے۔ نواب صاحب کو مکان گروی رکھنے کا بڑا قلق تھا۔ کہتے تھے کہ کہیں سے غیبی طاقت مدد کرے اور یہ روپیہ ہاتھ آ جائے۔ تو اس بے عزتی اور بے شرمی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مکان چھڑایا جائے۔ یار دوست تسلی دیتے اور کہتے "میاں اس میں بے عزتی کیا ہے۔ اپنا مکان ہے ضرورت کے وقت کام آئے تو برا کیا ہے" لیکن نواب صاحب کے اپنے خیالات تھے جو وہ سوچتے تھے اور سمجھتے تھے وہ دوسرے کسی اور کے پلے نہ پڑتا تھا۔ نواب صاحب کیپٹن جاوید کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ جھانسی سے آئے تو میرٹھ پنڈی والے صراف کی دوکان پر زیور خرید نے چلیں۔ نواب صاحب پنڈی والے صراف سے ہی زیور خریدنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اپنے اچھوتے ڈیزائنوں کے لئے دور دور تک مشہور تھا۔ کیپٹن جاوید کا ٹیلیگرام ملا تھا کہ وہ یقیناً عید سے ایک دن پہلے پہنچ جائے گا۔

چلچلاتی دھوپ تھی جب ہم تینوں پنڈی والے صراف کی دکان کے سامنے رکشا پر سے اترے۔ دکان کے چہرے پر ٹاٹ کے تہہ اڑے کا نقاب پڑا ہوا تھا۔ دکان کھلی تھی لیکن حقیقی معنوں میں بند ہی تھی معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ ایک بجے سے لیکر بعد دوپہر چار بجے تک دکان اسی طرح سے نیم بند سی رہتی ہے ہم تینوں ٹاٹ کا پردہ سرکا کر اندر پہنچ گئے۔ پنڈی والے صراف کے دونوں لڑکے جو دکان کے کارندے تھے اور کاروبار چلاتے تھے گھر آرام فرمانے چلے گئے تھے۔ اس کا بڈھا باپ گدی پر چاندنی سی سفید بھی چادر پر نیم دراز تھا کیپٹن جاوید نے مدعا بیان کیا تو بڈھا صراف بولا۔

"صاحبان! لڑکے تو ہیں، نہیں مجھے اب ٹھیک دکھائی بھی نہیں دیتا۔ میں آپ کو آپ کی پسند کی چیزیں نہیں دکھا سکوں گا" جواب میں نواب صاحب بول پڑے۔ "ہم چیزیں پسند کر لیں گے بڑے میاں اب چالیس میل سفر طے کر کے آئے ہیں۔ ہمیں زیادہ انتظار نہ کراؤ۔ چار پانچ چیزیں تو لینی ہیں" بڈھا صراف نواب صاحب کے اصرار پر راضی ہو گیا اور اپنی ٹیالی مٹیالی روشنی سے خالی آنکھوں سے گھورتا ہوا اندر نکلیں۔ ڈبیوں کو ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر سنا و زیور نکال کر دکھانے لگا شیشے کے شوکیس پر درجنوں قسم کی انگوٹھیاں ماتھے کے ٹیکے نیکلس وغیرہ پڑے تھے۔ نواب صاحب بڑے غور سے ڈیزائن پسند کر رہے تھے مگر میری اور کیپٹن جاوید کی نگاہوں نے آپس میں سوال جواب کئے۔ صاف نواب کو ساری عمر اندھا دکاندار نہ ملا ہوگا اور وہ بھی صراف اور اس ضرورت کے وقت" سارا قرضہ ادا ہو جائے گا آج ہی۔ گروی رکھا ہوا مکان بھی واگذار ہو جائے۔ کیا قسمت ہے نواب صاحب کی بھی" نگاہوں نے اپنی اپنی کہہ سن لی تو اب نواب کی حرکتوں کا بغور جائزہ لینے لگے۔ کافی انتظار کے بعد بھی نواب صاحب کے ہاتھوں نے کوئی کمال نہ



ماہ نو میرا

دکھایا۔ ضرورت کے زیورات نواب صاحب نے خرید لئے
اور قیمت کی ادائیگی کے بعد دکان سے باہر نکلے تو ہم دونوں نواب
صاحب کو یوں گھور رہے تھے جیسے انہیں کچا ہی چبا جائیں گے۔
سالا ساری عمر دو دو پیسے کی گرہ کٹی کرتا رہا اور آج اس مصیبت
میں دکاندار کے اندھے پن سے فائدہ نہ اٹھا سکا دنیا یکدم الٹ
گئی تھی نواب صاحب پارسا ہوگئے تھے اور ان کی مجبوریاں
اور ضروریات نے ہماری نیتیں بدل دی تھیں۔ سڑک پار کرتے
ہی کیپٹن جاوید سے رہا نہ گیا۔ اور نواب صاحب سے مخاطب
ہوا، کیوں بے آج مومن بن گیا۔ پانچ سات زیور پار کر دیتا
تو آج سارے دلدر دور ہو جاتے۔ اندھے دکاندار کے سامنے
تم بھی اندھے ہو گئے تھے کیا؟ نواب صاحب کا جواب سننے
کے لئے میں نے منہ اٹھایا تو جب تک نواب صاحب کیپٹن
جاوید کے گریبان تک اچھل کر پہنچ چکے تھے کیپٹن جاوید کی
سفید سلکن کی اچکن کا پھٹا ہوا نواب صاحب کے ہاتھ میں
آرہا۔ نواب صاحب کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور وہ
بے تکان بولے جا رہے تھے۔۔ ابے مجھے چور سمجھتا ہے الو کے
پٹھے ساری عمر میرے ساتھ رہ کر بھی مجھے نہیں سمجھ پایا مجھکو
اس بڑھاپے میں یوں مجھے بیچ بازار ذلیل کرنا تھا، اس اندھے
دکاندار پہ ہاتھ پھیرتا؟ لعنت ہے میرے فن پہ۔ میں فنکار
ہوں میاں۔ چور نہیں ہوں۔ ○○○

---

**سالنامہ کے لیے**

**اپنی تخلیقات**

**جلد از جلد**

**بھیجیے۔**

ادارہ

---

# وہ بے وفا ہیں؟

زبیدہ سلطانہ

بعض لڑکیوں کو اپنے شوہر کے بارے میں شبہات ہو جانے میں جس سے ان کی ازدواجی زندگی میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے ذیل کے مضمون میں زبیدہ بہن نے اسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے

---

میرے پاس شادی شدہ لڑکیوں کے جو خطوط آتے رہتے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے خطوط ہوتے ہیں جن میں کہ شوہروں کی بے اعتنائی اور لاپرواہی کی شکایت ہوتی ہے مثال کے طور پر پچھلے دنوں ایک خوشحال گھرانے کی لڑکی کا ایک خط مجھے ملا تھا جس میں کہ اس لڑکی نے اپنے شوہر کی بے اعتنائی کی شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ان کی بے اعتنائی روز بروز مجھے پریشان کرتی چلی جا رہی ہے میں اس شبہ میں مبتلا ہو گئی ہوں کہ کہیں وہ کسی دوسری عورت کی محبت میں تو مبتلا نہیں ہو گئے ہیں کیونکہ میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ میری جانب بہت ہی کم توجہ کرتے ہیں مجھے ان سے بے حد محبت ہے مگر میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا جا رہا"

یہ ہے اس لڑکی کے طویل خط کا ایک حصہ۔ یہ لڑکی ایک کامیاب ڈاکٹر کی بیوی ہے جن کے لئے عیش و آرام کے تمام سامان فراہم ہیں اس کی شادی کو ڈھائی تین سال ہو گئے ہیں۔ اس لڑکی کا کہنا ہے کہ اگرچہ اسے ہر قسم کا عیش میسر ہے لیکن شوہر کی محبت کو ترس رہی ہے اپنے اس خط میں یہ لڑکی لکھتی ہے۔

"میرے شوہر ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں ہر وقت مریضوں میں گھرے رہتے ہیں صبح ہوتے ہی مریضوں کو دیکھنے چلے جاتے ہیں نو بجے سے مطب شروع ہو جاتا ہے دو بجے گھر میں آتے ہیں اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد پھر شام کا مطب شروع ہو جاتا ہے جو رات تک جاری رہتا ہے رات کو آکر سو جاتے ہیں اور اکثر اوقات رات کو بھی مریض چین نہیں لینے دیتے غرضکہ انہیں اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ مجھ سے اظہار محبت کر سکیں مگر پھر بھی غنیمت ہے کہ وہ میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں دنیا کی تمام نعمتیں مجھے میسر ہیں نوکر چاکر ہر وقت خدمت کے لئے موجود ہیں مگر جب محبت ہی نہیں تو ان سب نعمتوں کو لے کر کیا کروں"

غرضکہ یہ لڑکی اپنے شوہر کی غیر معمولی مصروفیت سے بے حد پریشان ہے اور اس پریشانی نے اسے طرح طرح کے شبہات میں مبتلا کر دیا ہے یہ لڑکی لکھتی ہے کہ

"یہ تو میں مانتی ہوں کہ وہ بے حد مصروف ہیں لیکن ایسی بھی کیا مصروفیت کہ وہ بیوی کی جانب توجہ ہی نہ کر سکیں ان کی بے توجہی نے مجھے شبہ میں ڈال دیا ہے

کہ وہ کسی دوسری عورت کی محبت میں تو مبتلا نہیں ہو گئے
اور چونکہ مریضوں کے گھروں پر بھی وہ برابر جاتے
رہتے ہیں اس لئے انہیں کافی مواقع حاصل ہیں
وہ مریضوں کے نام پر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں ۔
ان شبہات نے مجھے بری طرح ذہنی کوفت میں مبتلا
کر دیا ہے مجھے مشورہ دیجئے کہ میں کیا کروں ۔ اور یہ
کوفت کیسے دور ہو "

ایک اسی لڑکی پر کیا موقوف ہے عموماً ایسی تمام عورتیں اپنے شوہروں سے بدظن رہتی ہیں جن کے شوہروں کی زندگیاں بے حد مصروف ہوتی ہیں نپولین بونا پارٹ اگرچہ عورتوں کا بے حد دلدادہ تھا لیکن جنگی مصروفیت کی بنا پر وہ نہیوں اپنی کسی بیوی کی جانب توجہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس کی بیویاں ہمیشہ اس سے بدظن رہتی تھیں یہاں تک کہ بعض عورتوں نے نپولین سے قطع تعلق تک کر لیا تھا ۔

تاریخ اور سوانح کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مصروف آدمی ہوئے ہیں ان کی بیویاں ان سے خوش نہیں رہتیں ۔ چنانچہ امریکہ کے نجات دہندہ ابراہم لنکن کی بیوی ہمیشہ آزردہ خاطر رہتی تھی ۔ نامور موجد مارکونی کی بیوی نے اس کی بے توجہی کی بنا پر علیحدگی اختیار کر لی تھی ایسی حالت میں اگر یہ لڑکی اپنے شوہر کی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے آزردہ خاطر ہوتی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ عورت کی یہ فطرت ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ خواہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں اس کا شوہر اس سے محبت کا اظہار کرتا رہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو عورت طرح طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔

اب میں اس لڑکی سے دردمند باتیں کرنا چاہتی ہوں بیٹی خود تمہارے خط کے کسی حصے سے کبھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تمہارا شوہر واقعی کسی دوسری عورت کی محبت میں مبتلا ہے محض اس کی بے توجہی اور مصروفیت نے تمہیں طرح طرح کے شبہات میں مبتلا کر دیا ہے میں چونکہ خود بھی ایک عورت ہوں ۔ اس لئے ایک عورت کے احساسات سے بخوبی واقف ہوں واقعی تمہیں ذہنی اذیت پہنچ رہی ہے لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ بے بنیاد شبہات کا پیدا ہونا بھی بے حد خطرناک اور ازدواجی زندگی کے لئے تباہ کن ہے میرے سامنے ایک دو نہیں بلکہ ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں کہ اس قسم کے بے بنیاد شبہات نے بہت سے گھروں کو تباہ و برباد کر دیا ہے اس لئے میں تم کو مشورہ دوں گی کہ بے بنیاد شبہات کو دل سے نکالنے کے بعد حقائق اور واقعات پر غور کرو ۔

میں اس سلسلہ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ جو مرد مصروف زندگی گزارتے ہیں ان میں اور عام مردوں میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے ان کا پیشہ ان کا کاروبار اور ان کی مصروف زندگی کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھر والوں سے بہت کم رابطہ اور تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت میں انہیں اپنے گھر والوں سے بہت زیادہ تعلق ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنے گھر والوں کے عیش و آرام کیلئے جملہ ساز و سامان فراہم کرنے میں ایک مسرت سی محسوس کرتے ہیں خود تم کہہ رہی ہو کہ تمہارے شوہر نے تمہارے لئے عیش آرام کا تمام سامان مہیا کر رکھا ہے اور یہ چیزیں اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتیں جب تک کہ کوئی شوہر محبت کرنے والا اور فرض شناس نہ ہو ۔

ایک بات اور بھی بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں "عشق و عاشقی اور ازدواجی زندگی" دو جداگانہ چیزیں ہیں عشق و عاشقی تو جذبات اور جوانی کا ایک کھیل ہوتا ہے جو صرف چند روز کے بعد ختم ہو جاتا لیکن "ازدواجی زندگی" ایک ایسا معاشرتی فریضہ ہے جس کی ادائیگی بڑھاپے تک لازمی ہے اس فریضہ کو جتنی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے اتنی ہی ازدواجی زندگی کامیاب ثابت ہوتی ہے لیکن عام طور پر یا غلطی سے "عشق و عاشقی" اور "ازدواجی زندگی" کو ایک ہی چیز سمجھ لیا گیا ہے یاد رکھو ازدواجی زندگی سینما کا تماشہ نہیں ہے کہ جس سے وقتی طور پر لطف حاصل کر لیا جائے بلکہ یہ ذمہ داریوں کا ایک ایسا بوجھ ہے کہ جس سے عورت مرد دونوں ہی کی کمر دوہری ہو جاتی ہے ۔

بیٹی تمہارے خط سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم ازدواجی زندگی کی اہمیت کو نظر انداز کر کے "عشق و عاشقی" کا کھیل چاہتی ہو ۔ ایسے ایک فرض شناس شوہر کی بے اعتنائی کی شکایت کر رہی ہو دراصل اس شوہر سے بہتر کون سا شوہر ہو سکتا ہے جس نے کہ اپنے اور تمہارے

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

شاہ جہاں دہلی

# مقصد کی اہمیت

پروفیسر حفیظ صدیقی

کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پیش نظر کوئی مقصد ہو۔ اور وہ مقصد صحیح معنوں میں اس قابل بھی ہو کہ اس کے حصول کے لئے کوشش کی جائے۔ جب کوئی شخص کہیں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اسے کس سمت چلنا ہے اور چل کر کیا مقصد حاصل کرنا ہے۔ بے سوچے سمجھے اور بے مقصد یونہی کسی طرف کو چل دینے والا انسان کچھ حاصل نہیں کر سکتا کوئی کارخانہ دار جب کسی کارخانہ کی تعمیر کا ارادہ کرتا ہے تو اپنی مصنوعات کے عین مطابق اس کی تعمیر کرتا ہے وہ اپنی ضروریات کے پیش نظر سات آٹھ منزلوں کا کارخانہ بنا لیتا ہے یا محض ایک ہی منزل پر اکتفا کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ اپنی مصنوعات کے پیش نظر کرتا ہے۔ یہی حال ہماری زندگی کا ہے ہم اگر زندگی میں کامیاب ہونے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہمیں طے کر لینا چاہئے کہ ہمیں زندگی کے کس میدان میں کامیابی کا حصول مقصود ہے۔ اس کے بغیر اعلیٰ تعمیری ذہن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی زندگی میں نمایاں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ہمارے اکثر نوجوان بزعم خود اپنے مقصد کے لئے بہت بے تاب ہوتے ہیں انہیں کچھ بننے اور کچھ کرنے کی بڑی لگن ہوتی ہے حالانکہ ان کے پاس صرف خواہشات کا ذخیرہ ہوتا ہے جو انہیں خود فریبی میں تو مبتلا کر سکتا ہے کسی مقام پر پہنچا نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ جانتے ہی نہیں انہیں کیا بننا ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ ان کے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہوتا ہی نہیں۔ اور کسی واضح مقصد کے بغیر اور قوت ارادی کے بنا سچی لگن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خواہشات تو ہر شخص کی ہوتی ہیں مگر واضح خواہشات کے حصول کے لئے کمربستہ ہونا الگ بات ہے اور اس کے لئے خاص قوت ارادی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یونہی بستر میں پڑے پڑے سوچتے رہنا کہ ہم بھی دوسروں کی طرح خوش کیوں نہیں۔ ہمارے پاس بھی اتنا روپیہ کیوں نہیں جتنا دوسروں کے پاس ہے۔ کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ہاں ذہن میں ایسے سوالات کا پیدا ہونا بری بات نہیں۔ خواہشات کی مثال بیج کی سی ہے ہر کامیاب انسان کے مستقبل کی ابتدا خواہشات ہی سے ہے۔ مگر محض خواہشات کسی کام نہیں آ سکتیں۔ صرف خواہشات سے روپیہ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بیج کی قیمت تب تک نہیں بنتی جب تک اسے بویا نہ جائے اسی طرح خواہشات کی قیمت تب تک کچھ نہیں ہوتی جب تک ان خواہشات کی روشنی میں اپنے ذہن میں کوئی واضح اور غیر مبہم مقصد نہ بٹھا لیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے قوت ارادی، مناسب مطالعہ، مسلسل کام اور اصلاح سے پیدا کی جا سکتی ہے اور پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر پہلے مقصد کا تعین ضروری ہے اور یہ شرط بیس سال کے تن درست نوجوان کے لئے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی ساٹھ برس کے کسی کروڑپتی کے لئے۔

جب کوئی نوجوان کسی کام کے کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا لیتا ہے تو اس کی قوت ارادی پہلے سے مضبوط ہو جاتی ہے اس کے ذہن میں خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور خود ترسی اور ناامیدی کے احساسات از خود اس کے ذہن سے خارج

ہونے لگتے ہیں وہ صحیح معنوں میں کچھ کرنے اور کچھ بننے کے لئے بے تاب
ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر ایک خاص لگن پیدا ہوجاتی ہے جس کی
موجودگی میں وہ جو ارادہ کرتا ہے اس کی تکمیل کرلیتا ہے۔ اس کی
خواہشات تجاوز کا روپ دھارنے لگتی ہیں وہ محسوس کرنے لگتا ہے
کہ اس میں بہت کچھ کرنے کی اہلیت موجود ہے وہ اپنی صلاحیتوں کو
سراہنے لگتا ہے اور خوداعتمادی کے ساتھ مشکل سے مشکل کام کرنے
کے لئے بھی تیار ہوجاتا ہے۔

چنانچہ سمجھنے کی بات یہی ہے کہ تنہا خواہشات سے نہ تو
کامیابی حاصل ہوسکتی ہے نہ خوشی مل سکتی ہے البتہ ناکامی کی صورت
میں ایسی خواہشات ناخوشی کا باعث ضرور بنتی ہیں۔ دنیا میں شاید
ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے ہر وہ چیز حاصل کرلی جس کی اسنے
خواہش کی۔ مگر اکثر و بیشتر قوت ارادی اور مستقل مزاجی سے خواب
کو حقیقت کے روپ میں دیکھا جاسکتا ہے

جب تک کوئی ایک واضح مقصد نہ بن جائے خواہشات
انسان کو پریشان کرتی ہیں اور تذبذب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ وہ بے چینی
کے عالم میں پیشہ بدلتا ہے۔ ملازمتیں تبدیل کرتا ہے اور ایک وقت
آتا ہے جب ہر چیز سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ شخص
جو وقتی مشکلات سے گھبرا کر ایک پیشہ سے دوسری طرف بھاگتا ہے
کبھی کاروبار کی طرف آتا ہے کبھی ملازمت کی طرف دوڑتا ہے۔
وہ بالآخر کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے سامنے واضح مقصد نہیں۔
وہ نہیں جانتا اسے زندگی کے اس میدان میں نمایاں کامیابی حاصل
کرنی چاہئے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ اسے اپنی تمام تر توجہ اسی کام پر مرکوز
رکھنی چاہئے جس کے بارے میں وہ کچھ جانتا ہے اور جس کی خاطر
وہ کچھ نہ کچھ مشکلات برداشت کرنے کو بھی تیار ہے کسی ایک پیشہ یا
ملازمت سے جب اکتاہٹ پیدا ہونے لگے تو اس میں تبدیلی کی
ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے جس پیشہ سے
ہم منسلک ہوں۔ مناسب اصلاحات اور مسلسل جدوجہد سے اسی میں
نیا پن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ جب ہم اکتاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ تو
قصور پیشہ کا نہیں ہوتا۔ گناہ ملازمت کا نہیں ہوتا۔ قصور خود ہمارا
ہوتا ہے جب ہم کام کو محض مشینی انداز میں کرتے ہیں۔ سیکھنے
سمجھنے اور ذہنی تعمیر کی مسلسل کوشش کو ترک کردیں تو اکتاہٹ
اور بیزاری کی ایک کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور ہم سست پڑجاتے
ہیں۔ اگر اس اکتاہٹ اور بیزاری کے عالم میں ہم اس کام سے بھی
مشکل تر کسی کام کو کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تو تبدیلی کی یہ خواہش
اچھی علامت ہے، مگر عام طور سے یہی بہتر ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ جانتے
ہیں۔ اسی سے وابستہ رہیں اور ملازمت اور پیشہ کو اصلاح اور
توسیع سے دلچسپ بناتے چلے جائیں۔

جب تک آدمی کا کوئی واضح مقصد نہ ہو وہ یہ نہیں جانتا کہ کیا
کچھ سیکھے۔ کئی باہمت نوجوان کئی قسم کا علم حاصل کرنے کا ارادہ کرلیتے ہیں
وہ کئی مضامین کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ بہت کچھ پڑھ لیتے ہیں
ان کا مطالعہ بہت وسیع ہوجاتا ہے۔ ان کے ذہن کی بھی خوب اصلاح
ہوجاتی ہے ان کے پاس معلومات کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی ہوجاتا ہے
لیکن عملی دنیا میں وہ اپنا مقام پیدا نہیں کرسکتا۔ ان کے پاس علم
تو بہت ہوجاتا ہے مگر وہ علم اسے کاروباری دنیا میں فائدہ نہیں دیتا
کیونکہ اس نے کسی خاص نصب العین کے مطابق علم کا حصول نہیں
کیا ہوتا اس کی مثال اس آدمی کی ہوتی ہے جس نے خوب نہا دھو کر
بڑھیا لباس زیب تن کیا ہو مگر اسے جانا کہیں نہ ہو۔ یہ مثال خاص
طور سے ان لوگوں پہ صادق آتی ہے جو بے مقصد ہر نوع کا علم پڑھتے
چلے جاتے ہیں اور بزعم خود عالم بننے کی ٹھان لیتے ہیں چنانچہ اگر کوئی
شخص انسائیکلوپیڈیا تمام کی تمام پڑھ جانے اور یاد کرلینے کا تہیہ
کرے۔ اور ایسا کر بھی لے۔ تو بے شک اس کے پاس معلومات کا
بہت سا ذخیرہ ہوجائے گا۔ لیکن عملی زندگی میں اسے استعمال کہاں
کرے گا۔

زندگی سے پورا پورا استفادہ کرنے کے لئے ہمارے کچھ نظریات
بھی ہونے چاہئیں۔ بقول ایمرسن کے قابلیت اور مہارت کا ایک
اصول یہ بھی ہے کہ انسان کے کچھ نظریات ہوں۔ آدمی کے ذہن
میں "جو کچھ وہ بننا چاہتا ہے یا جو کچھ وہ سمجھتا ہے کہ کرسکتا ہے"
کی مکمل تصویر ہونی چاہئے جو شخص اپنے آپ سے اور اپنے کام سے
مطمئن ہیں اس کا کوئی نظریہ نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کام
"اچھا خاصا" ہے مگر وہ "اچھا" اور "اچھا خاصا" کا فرق نہیں سمجھتا

بشاہ جہان دہلی

نظریات کی عدم موجودگی میں آدمی مطمئن ہوجاتا ہے۔ وہ نااہلیت پر ہی قانع ہوجاتا ہے چونکہ اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا وہ بھٹکتا رہتا ہے وہ حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں کرتا۔ اس لئے حالات کا مقابلہ نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے شب و روز کے معمول ہی سے وابستہ ہو کے رہ جاتا ہے چنانچہ بعض کارخانہ دار اپنے کارخانوں کی بے ترتیبی سے اس طرح مانوس ہوچکے ہوتے ہیں کہ وہ بے ترتیبی انہیں کھٹکتی ہی نہیں۔ جب کہ ترتیب اور صفائی کے عادی مالک کے کارخانہ میں ذرا سی بھی بے ترتیبی ہو فوراً اسے کھٹکتی ہے اور وہ اس کی اصلاح پر مائل ہوجاتا ہے۔ دونوں میں بنیادی فرق یہی ہے۔ کہ ایک کے پیش نظر کوئی واضح مقصد نہیں جبکہ دوسرے کے سامنے ایک خاص مقصد ہے۔

واضح مقصد کا انتخاب ذہن کو باقاعدہ صحت مند تحریک بخشتا ہے اور پریشاں خیالی سے نجات دے کر تمام ذہنی قوا کو ایک خاص مقصد کی طرف مرکوز کردیتا ہے۔ جب کوئی شخص یہ جان لیتا ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے وہ اپنے مقصد کی جانب گامزن بھی ہوجاتا ہے وہ حالات اور مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور بالآخر ایک ایسا مقام حاصل کرلیتا ہے کہ سب اسے خوش قسمت کہنے لگتے ہیں یہ سب مقصد کی رہنمائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

کوئی ایک صدی پہلے کا واقعہ ہے ۱۸۴۳ء میں ڈن فرملین کے نزدیک کسی امیر آدمی کی جاگیر میں ایک بارہ برس کا لڑکا داخل ہوا۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا مالک نے اس کا بری طرح پیچھا کیا۔ وہ پچھلی دیوار سے اتر رہا تھا تو دل میں تہیہ کرچکا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ جاگیر خرید کے رہوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ چالیس برس بعد وہ وہیں گیا اور وہ جگہ بہت بڑی قیمت ادا کرکے خرید لی۔ اور خرید چکنے کے بعد اس قصبہ کو دیدی یہی جگہ آجکل "پٹن کریون پارک" کے نام سے مشہور ہے اور اس فرم کا مالک ڈیل کارنیگی ایک کامیاب انسان کے طور سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ تو ایک معمولی سی مثال ہے ورنہ کارنیگی نے زندگی میں بہت سے مقاصد کے لئے کام کیا ہے۔ اور بالآخران میں کامیابی حاصل کی۔ اسنے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ مگر زندگی بھر بچپن کے اس واقعہ کو فراموش نہ کرسکا۔

(ماہ نو میرا)

ایام جوانی میں لارڈ ڈزریلی نے کہا تھا میں ایک امیر عورت سے شادی کروں گا۔ ڈربی جیتوں گا۔ وزیر اعظم بنوں گا۔ اور اس نے نہ صرف یہ کہ یہ تینوں چیزیں حاصل کرلیں بلکہ ہمارے لئے ایک عظیم مثال بھی قائم کردی۔ کہ کس طرح واضح مقصد موجود ہو۔ تو مستقبل کی تعریف کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ زندگی میں کامیاب رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے پیش نظر کوئی واضح مقصد ہو۔ ہاں مقصد کے متعلق ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ یہ کوئی کرنے کی چیز ہونی چاہیئے نہ کہ محض [illegible] "حاصل کرنے کی"۔ "بیشک حاصل کرنا بھی بری بات نہیں۔ مگر ہر وقت یہی خیال سوار نہیں رہنا چاہیئے" جس شخص کا خیال زیادہ تر دوسروں سے روپیہ یا جائیداد حاصل کرنے کی طرف رہتا ہے وہ بنک کے حسابات کو تو کامیاب بنا سکتا ہے مگر اپنی زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ بہترین مقصد جو کسی نوجوان کے پیش نظر ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ تجارت، صنعت یا اپنے پسندیدہ کسی بھی پیشہ کے ذریعہ سے عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے۔ وہ شہر میں بہترین دوکان بنائے یا اچھا معمار بن کے خوبصورت اور آرام دہ گھر تعمیر کرے۔ یا چھوٹے سے چھوٹے کھلونے بنانے کے کارخانے قائم کرے یا کسی بھی پیشہ میں [illegible] کے ساتھ کام کرے۔ بہتر صورت اس کے پیش نظر ذاتی منافع کے علاوہ خدمت کا نظریہ بھی ہونا چاہیئے پورے عزم کے ساتھ کچھ بننے یا کچھ بھی کرنے کا تہیہ کرلیا جائے تو اس میں کامیابی ہوجاتی ہے مگر صحیح معنوں میں کامیابی تبھی شمار ہوگی جبکہ اس سے [illegible] عوام کو بھی فائدہ پہنچے۔

## قطعہ — سلیم گیلانی مرادآبادی

سوادِ زیست سے واقف نہیں ہو تم اب تک
ذرا یہ خاک محبت کبھی پھانک کر دیکھو
جو اپنے حسن کی تصویر دیکھنا ہے تمہیں
تو آج تم مری آنکھوں میں جھانک کر دیکھو

"میری جگہ یہ نہیں!
میں تو جنگل کا باسی تھا جہاں میں آزادانہ گھومتا پھرتا تھا۔
میں معصوم تھا۔ اس آدمی کے پاس ایک بندوق تھی۔ ایک روز جب میں اپنے
بچے کے ساتھ کھیل رہا تھا، اس نے مجھے نشانہ بنایا۔ اس نے بے خیالی میں
مجھ پر گولی چلائی۔
میرا بچہ اب تک بڑا ہو چکا ہوگا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اب کوئی دوسرا سرپھرا آدمی اس پر گولی
نہیں چلائے گا۔ ہمیں اپنی نسل پر فخر ہے اور آدمیوں کی پچھلی پشت نے بھی اس کی
تعریف کی ہے مگر موجودہ پشت ہمیں بڑے ڈھنگ سے تباہ کرنے میں لگی ہے۔"
جنگلی جانوروں کی حفاظت کیجئے —— یہ قدرت کا عطیہ ہیں
devp 71/260

یہ اکتوبر ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے جب کہ دوسری جنگ عظیم کو چھڑے ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ گٹھے ہوئے تندرست جسم والا ۴۵ سالہ فرانسیسی مائیکل ہولارڈ سوئٹزرلینڈ کے غیر جانبدار علاقے میں پہنچنے کے لئے سرحد کے قریب موقع کا منتظر تھا۔ اس کی پیٹھ پر آلوؤں سے بھرا ہوا ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ وہ وضع قطع سے بالکل ایک لکڑہارا معلوم ہوتا تھا اس حلئے میں وہ سرحد کے قریب حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور ایک صبح سویرے ہی وہ درختوں کی اوٹ میں دبے پاؤں آگے بڑھا —— ایک ہلکی سی آواز بھی اس کی موت کا سبب بن سکتی تھی کیونکہ جنگل کے اندر اور پہاڑیوں کے عقب میں جرمنوں کے گشتی دستے کتوں کی طرح بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

ہولارڈ فرانس کا ایک صنعتی ڈیزائنر تھا اور اس نے دوران جنگ اپنے ملک کی خدمت اور تحفظ کے لئے جاسوسی اختیار کر لی تھی —— وہ ۹۴ مرتبہ فرانس سے سرحد پار کر کے سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ اور ہر مرتبہ وہ اہم فوجی راز برطانیہ کے لئے لایا۔ اس نے اور ساتھیوں نے فرانس میں نازیوں کے خفیہ ہوائی اڈوں کی نشاندہی ساحلی مورچوں اور سمندری توپ خانوں کا پتہ لگایا اور آبدوزوں یک خفیہ اڈا بوں کے مقام پر دریافت کیا یہ تمام معلومات بیحد اہم تھیں لیکن اس بار جس راز کو سرحد پار پہنچانے کیلئے وہ دبے پاؤں درختوں کی آڑ لیتا ہوا مناسب موقع کی تلاش میں تھا وہ اس کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ تھا جس نے جنگ کا نقشہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس کی پیٹھ پہ لدی ہوئی ٹوکری میں آلوؤں کے درمیان ایک کاغذ چھپا ہوا تھا —— ایک نیلا سا معمولی کاغذ —— جسے نہ صرف لندن کو مکمل تباہی سے بچالیا بلکہ جنگ کے بھی کئی ماہ قبل خاتمے کا سبب بنا

ہٹلر کے منصوبے کے مطابق لندن کو نیست و نابود کرنے کیلئے پچاس ہزار روزانہ بم اس شہر میں برسائے جانے تھے —— یہ بم ایک مہینے میں پانچ ہزار کی شرح سے گراتے جاتے لندن پر بمباری کی اس مہم کی تیاریوں میں انتہائی رازداری برتی گئی تھی اور لانچنگ کے اڈوں کی تعمیر کے لئے مزدور بھی ایسے ہی ملازم رکھے گئے تھے جو فرانسیسی زبان سے نابلد تھے۔ تاکہ ان کی گفتگو سے بات عام لوگوں تک پہنچنے کا امکان باقی نہ رہے —۔ ان میں سے بیشتر پولستانی اور ولندیزی تھے اور انہیں خفیہ اڈوں کی تعمیر کے لئے جبری بھرتی کے ذریعہ ملازم رکھا گیا تھا۔ یہ اڈے سو سے زائد مقامات پر تکمیل کے قریب تھے۔

اس منصوبے کی تفصیل جاننے والا اتحادیوں کا واحد آدمی مائیکل ہولارڈ اب سرحد کے نزدیک پہنچ گیا تھا اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ خاردار تاروں تک پہنچ گیا جو فرانس اور سوئٹزرلینڈ کو جدا کرتے تھے۔ جیسے ہی اس نے اپنا تھیلا اور کلہاڑی دوسری جانب پھینکی اچانک اس کا گھٹنا کسی آہنی شکنجے نے جکڑ لیا۔ جرمن پولس کے قد آور کتے کے مضبوط جبڑوں نے اس کے قدم روک لئے تھے۔ کتا اسے قابو میں کئے محض روکے کھڑا تھا۔ ہولارڈ بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ

جانتا تھا کہ اس کا حرکت کرنا بیحد ضروری ہے اس لئے کہ کتے کے ساتھ کام کرنے والے محافظین قرب وجوار میں یقیناً موجود ہوں گے۔ اسکے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ایک سادہ لوح دیہاتی کے روپ میں کوئی ہتھیار اس کے پاس ہونا بھی نہیں چاہئے تھا۔ اس لئے کہ تلاشی کی صورت میں اس کے پاس ہتھیار کی موجودگی شک کا باعث بن سکتی تھی ہولارڈ نے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنے اطراف نظریں دوڑائیں۔ خوش قسمتی سے اسے ایک موزوں ترین چیز نظر آگئی یہ ایک لمبی سی مضبوط چھڑی تھی کتے کے جبڑوں کے درمیان چھڑی کو حرکت دیتے ہوئے اس نے اپنی پوری قوت سے اسے حلق کے اندر تک سانس کی نالی میں ٹھونس دیا۔ ایک صبر آزما لمحے تک کچھ نہیں ہوا۔ اس کے بعد کتے نے اپنی گرفت ڈھیلی کردی اور لڑکھڑاتا ہوا چھڑی میں جھول گیا اس کا جسم بے جان ہوچکا تھا۔

اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے بعد جیسے ہی ہولارڈ نے خاردار تار پھلانگ کر اپنا تھیلا اٹھایا اس نے ایک مسلح سوئس سرحدی محافظ کو دیکھا جس کی بندوق کا رخ ہولارڈ کی بجائے دو[2] جرمن فوجیوں کی جانب تھا جو ہولارڈ کو شوٹ کرنے ہی والے تھے۔ جرمنوں نے اپنی رائفلیں اتار دیں اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

ہولارڈ کو سرحد پار کئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اتحادیوں کے بمبار طیاروں نے وی ون بموں کے اڈوں پر حملے شروع کر دیئے اور پانچ ہفتوں کے اندر اندر تہتر اڈے یا تو مکمل طور پر تباہ کردیئے گئے یا انہیں اتنا شدید نقصان پہنچایا گیا کہ وہ دوبارہ استعمال کے قابل نہیں رہے گو بعد میں نازیوں نے چند اور چھوٹے چھوٹے اڈے تعمیر کئے لیکن لندن کو نیست و نابود کرنے کا "عظیم منصوبہ" ناکام ہوگیا۔ منصوبے کے مطابق ہٹلر پچاس ہزار بم برسانے میں کامیاب نہ ہوسکا بلکہ صرف دو ہزار بم برسائے جاسکے۔ اور یہ بم بھی ۱۹۴۳ء میں نہیں برسائے جاسکے جبکہ ان کا حملہ کاری ہوسکتا تھا اور جو اسکا مناسب وقت تھا بلکہ نازیوں کا یہ حملہ ۱۹۴۴ء کے وسط میں ممکن ہوسکا اس طرح منصوبے سے بہت بعد اور مقررہ تعداد سے کہیں کم تعداد میں بم برسائے جاسکے۔

CRUSADE IN EUROPE) میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر جرمن نئے اڈوں کا ... کرنے اور ان ہتھیاروں کو درست کرکے استعمال کرنے میں چھ ... قبل بھی کامیاب ہوجاتے تو یورپ پر ہمارا حملہ انتہائی دشوار ... ناممکن ہوجاتا"

اس قصے کا حیرتناک پہلو یہ ہے کہ جنگ کا نقشہ پلٹنے میں ... کردار ادا کرنے والے مائیکل ہولارڈ نے یہ سب کچھ اپنی مرضی ... اس سے نہ تو کسی نے مخبر بننے کے لئے کہا اور نہ ہی کسی نے اس ... میں اس کی مدد کی۔ اسے جب کوئی اطلاع یا راز پہنچانا ہوتا ... پار کرکے سوئٹزرلینڈ پہنچ جاتا۔ اس کے پاس نہ تو ریڈیو تھا ... ہی اندرون ملک ہرکاروں اور پیغام رسانوں کا اس کے پا... انتظام تھا۔

مائیکل ہولارڈ ایک بے حد سادہ انسان ہے وہ جنگ ... سے قبل ایک صنعتی تحقیقی ادارے کا ایک ناکافی تنخواہ پانے والا ملازم تھا لیکن جب جرمن پیرس میں داخل ہوئے اور اس کے افسر جرمنوں کے مفاد میں کام کرنے لگے تو اس نے محسوس کیا کہ حالات اب بدل چکے ہیں۔ اس نے احتجاجاً اپنی ملازمت سے استعفا دے ... اور ایک گیس بنانے والے کارخانے میں بطور ایجنٹ ملازم ہوگیا۔ اسے کارخانے میں چارکول گیس کی تیاری کیلئے موزوں لکڑی کی تلاش کے سلسلے میں اکثر جنگلات کا دورہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ جنگلات سرحد کے قریب واقع تھے۔ اور اکثر دوروں میں اسے جرمنوں کی بعض نقل وحمل کے متعلق معلومات بھی حاصل ہوجاتی تھیں یہیں سے اس کے دل میں جاسوسی کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور جاسوسی کے مقصد کے لئے اس کی یہ ملازمت بڑی مفید ثابت ہوئی۔ کیونکہ گیس کمپنی کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے سرحدی جنگلات میں اس کی نقل وحرکت کا معقول عذر موجود تھا۔

ایک روز سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود مسلح محافظوں کی نظر بچا کر اس نے سرحد عبور کرکے سوئٹزرلینڈ میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ وہ برطانیہ کو اپنی خدمات بطور جاسوسی پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ جرمنوں کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ تاہم وہ ... کا بہانہ کرکے بچ گیا۔ دوسری دفعہ وہ سرحد عبور کر...

تتاہ جہا

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے" آئزن ہاور جہاد یورپ (کر EUROPE)

اس کی پیش کش کے جواب میں برطانیہ نے اسے جرمن فوج
ں کی نشاندہی کرنے اور ان کی نقل و حرکت کی اطلاعات
ں ہدایت کی۔
ں بار تین برس تک ہولارڈ مسلسل دوڑ دھوپ میں مصروف
ں کی ایک حسین بیوی اور تین بچے تھے جن سے وہ بیحد محبت
لیکن ان سے وہ محض اسلئے بہت کم ملتا تھا کہ مبادا کہیں
ں کی وجہ سے کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں ـــــ اپنی
ں کے ابتدائی چند مہینے اس نے فرانس میں اپنی تنظیم قائم
یں لگا دیئے ۔ اس مقصد کے لئے اس نے مختلف پیشوں
ن رکھنے والے افراد کو اپنے ساتھ ملایا ـــ ان فرانسیسیوں
لوے ملازمین، ٹرک ڈرائیور، ہوٹل کے بار والے اور مالکان
وغیرہ شامل تھے۔ ابتدا میں اس کی جاسوسی تنظیم صرف
افراد پر مشتمل تھی۔ لیکن آخر میں اس کے ارکین کی تعداد
تے بڑھتے ایک سو بیس تک پہنچ گئی تھی جن میں سے بتیس ۳۲
ن گرفتار ہو گئے اور جرمنوں کے ہاتھوں موت کی سزا پائی۔
زخمی ہوتے اور حیرت انگیز طور پر جرمنوں کے پنجے سے نکل
گئے۔

ہولارڈ کا اہم ترین کارنامہ دی ون نامی طیاروں کا سراغ
ا ـــ اس سراغ کی ابتدا اگست ۱۹۴۳ء میں ہوئی جبکہ
ن نامی شہر کے ایک کیفے میں متعین اس کے ایک ایجنٹ نے
تعمیراتی ٹھیکداروں کی عجیب و غریب گفتگو سے اسے مطلع
۔ یہ ٹھیکدار کسی غیر معمولی قسم کے تعمیراتی کام کے سلسلے میں گفتگو
رہے تھے ۔ اور دونوں گفتگو کے دوران کنکریٹ کی اس غیر
معمولی مقدار پر سخت حیرت و تعجب کا اظہار کر رہے تھے . جو
رمنوں کی ہدایت کے بموجب اس تعمیر میں استعمال کی گئی۔
اس اطلاع کے ملنے کے دوسرے ہی دن ہولارڈ رودن میں تھا
سیاہ پوشاک میں ملبوس وہ ایک دفتر ملازمت میں
پہنچا اور اپنے آپ کو مزدوروں کی روحانی بھلائی سے دلچسپی
رکھنے والی ایک مذہبی تنظیم کا نمائندہ ظاہر کرتے ہوئے اسنے
بے شمار بائبلیں پیش کیں۔ اور مزید تقسیم کے لئے اس نے
ملاقو مسرا

علاقے میں کسی قریبی تعمیراتی مہم کے متعلق دریافت کیا۔ اسے بتایا
گیا کہ رودن سے تقریباً بیئس میل دور "آفے" نامی مقام پر ایک
جگہ کام ہو رہا ہے۔
گھنٹے بھر بعد وہ مزدوروں جیسا نیلا لباس پہنے آفے میں
موجود تھا۔ شہر کے باہر چار شاہراہیں تھیں۔ اس نے باری باری
تین راستوں پر جاکر تعمیراتی کام کی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی
لیکن ہر دفعہ مایوسی ہوئی چوتھی دفعہ وہ ایک کھلے ہوئے بہت
وسیع قطعے میں پہنچ گیا جہاں اسے کئی سو مزدور کام میں مصروف
نظر آئے ۔ کنکریٹ ڈالی جا رہی تھی اور عمارتیں اوپر اٹھتی جا رہی
تھیں۔

ہولارڈ نے ایک ٹھیلے پر قبضہ جماکر اسے اینٹوں سے بھرا اور
دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام میں شامل ہو گیا ـــ لیکن اسے
کسی نے نہیں ٹوکا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید گیراج کی تعمیر کرنے والے
مزدوروں سے اسے کسی قسم کی معلومات حاصل ہو سکیں لیکن
بیشتر مزدور فرانسیسی زبان سے نابلد تھے ۔ عمارتوں میں خاص
بات یہ تھی کہ وہ بیحد چھوٹی تھیں اور اس قدر چھوٹی چھوٹی
عمارتوں کی تعمیر کسی بھی عام نوعیت کے استعمال کے لئے بیکار
تھی اس لئے یقینی طور پر ان کے اس عجیب و غریب ڈیزائن کا کوئی
خاص مقصد تھا۔ اس کے علاوہ نزدیک ترین شہر سے میلوں دور
ویرانے میں گیرج کی تعمیر کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ یہ چیزیں ہولارڈ
کے تجسس کو ابھارنے کیلئے کافی تھیں ۔ لیکن سب سے زیادہ
جس چیز نے اسے متوجہ کیا وہ نیلے دھاگے کی ایک لمبی سی رہنمائی
لائن کے ساتھ ایک پچاس گز طویل ڈھلان دار پٹی تھی یہ پٹی
واضح طور پر کسی غیر سطح اور ڈھالو توپ نما چیز کا چبوترا معلوم
ہوتی تھی ۔ ہولارڈ نے قطب نما کی مدد سے جب اس کا رخ معلوم
کیا تو اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ پٹی کا رخ براہ راست
لندن کی جانب تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس تعمیری مہم کو
تیزی سے مکمل کرنے کیلئے جرمن تین شفٹوں میں چوبیس گھنٹے
مزدوروں سے کام لے رہے ہیں تو وہ فوراً برطانیہ کو اطلاع
کے لئے واپس روانہ ہو گیا۔

لندن میں اتحادی رہنما بشمول سر ونسٹن چرچل اور جنرل
آئزن ہاور جرمنوں کی سرگرمیوں سے متعلق اطلاعات پر بیحد
توجہ دے رہے تھے۔ پینے مونڈے نامی جگہ سے بغیر ہوا باز کے
اڑنے والے طیاروں کی تیاری سے متعلق اطلاع مل چکی تھی۔ اور
بورن ہالم میں ایک ساحل پر ڈنمارک کے ایک باشندے نے
آسمان سے اچانک حملہ کرنے والے ایک نہایت عجیب ہتھیار
کا تباہ شدہ ڈھانچہ دیکھا تھا۔ ان اطلاعات کی بنیاد پر کسی نئی
خوفناک چیز کی تیاری سے متعلق قیاسات کئے جا رہے تھے
لیکن وہ چیز کیا ہو سکتی ہے اور کس قدر خطرناک ہو سکتی ہے یہ
کوئی نہیں جانتا تھا۔

عجیب و غریب چبوترا نما پٹی کے انکشاف کے بعد ہولارڈ
نے اسی قسم کے دیگر مقامات کی چھان بین کے لئے نقشوں کی
مدد سے ایک منظم پروگرام بنایا۔

اس پروگرام کے مطابق اس نے اور اس کے چار ایجنٹوں
نے سائیکلوں پر منظم طریقے سے شمالی فرانس کا دورہ شروع کیا
۔ ان کا طریقہ کار بے حد سادہ تھا۔ وہ سائیکلوں پر ایک جگہ جاتے
اور وہاں دوران گفتگو لوگوں سے دوسری جگہوں کے بارے
میں معلومات حاصل کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھتے۔ اس
طرح انہوں نے تین ہفتوں میں ساٹھ سے زائد پر اسرار مقامات
کا پتا چلا لیا۔ بعد کے چند ہفتوں میں انہوں نے مزید چالیس
جگہوں کے بارے میں معلومات جمع کر لیں۔ یہ سب کی سب
ساحل سمندر کے متوازی ایک دو سو میل لمبے اور تیس میل چوڑے
قطعے میں واقع تھیں ۔ اور سارے چبوتروں کا رخ لندن
کی جانب تھا۔ لیکن یہ کیا چیزیں تھیں؟ یہ بات ابھی ان کی
سمجھ سے بالا تھی ۔ اور بظاہر یہ معما حل ہوتا نظر نہ آتا تھا
۔ لیکن جاسوسی میں اتفاقات بعض اوقات بڑا اہم
کردار ادا کرتے ہیں۔ اور اتفاقات ہی کے ایک سلسلے نے ہولارڈ
کو ہٹلر کے خفیہ ترین راز تک پہنچا دیا ہولارڈ ایک روز اسی
سلسلے پر اپنے ایک ایجنٹ سے مشورہ کر رہا تھا۔ دوران گفتگو
ایجنٹ نے رابرٹ نامی اپنے ایک دوست کا ذکر کیا جو جرمنوں
سے سخت نفرت کرتا تھا اور ان کو نقصان پہنچانے کے لئے
مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ ایجنٹ نے خفیہ تنظیم میں اپنے دوست
کو شریک کرنے کی بھی سفارش کی۔ چنانچہ ہولارڈ نے رابرٹ کو
ایک ایرپورٹ پر ایک ملازمت دلا دی۔ رابرٹ نے اینڈری
نامی اپنے ایک ڈیزائنر دوست کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ
جرمنوں کی ایک خالی آسامی کے لئے اپنی خدمات پیش کر دے
جس کے لئے اینڈری کو بولس کیدی نامی ایک دوسرے مقام پر
جانا پڑا جہاں پر اسرار عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ اپنی نئی ذمہ داری
سنبھالنے کے ایک ہفتے کے بعد اینڈری نے ہولارڈ کو اس تعمیر
سے متعلق اطلاعات کے علاوہ ان نقشوں اور منصوبوں کی
نقلیں بھی فراہم کیں جو اس کے ہاتھ سے گزر چکے تھے اس کے ساتھ
ہی اس نے آئندہ کے لئے اطلاعات کی فراہمی سے معذوری
کا اظہار کیا۔ اس نے بتایا کہ ملازمت کے سلسلے میں جرمنوں نے
اس سے ایک معاہدے پر دستخط کرائے ہیں جس کے تحت وہ اپنے
فرائض خفیہ رکھنے اور ان سے تعلق رکھنے والی معلومات کسی
پر ظاہر نہ کرنے کا پابند ہے ۔

ہولارڈ ایک شریف النفس انسان ہے اور وہ کسی شخص
کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کرنے کا قائل نہیں اس نے ہمیشہ
ایک محب وطن فرانسیسی ہونے کی حیثیت سے دوسروں کو
متاثر کیا۔ انہیں فرانسیسی ہونے کی حیثیت سے خود ان کی ذمہ داری
کا احساس دلایا اور اس طرح ان کا تعاون حاصل کیا۔ اینڈری
جن پابندیوں کو خود قبول کر چکا تھا ان کو توڑنے پر اسے مجبور کرنا
ہولارڈ کی طبیعت کے خلاف تھا ۔ دوسری جانب اپنے
اپنے ملک کو غیر ملکی حکمرانوں کے پنجے سے نجات دلانے کا عظیم
مقصد رکھتا ۔ اور پر اسرار اڈوں سے متعلق اطلاعات کو مربوط
کرنے کے لئے منصوبوں اور نقشوں کا حصول ضروری تھا ۔
چنانچہ اس نے اینڈری کو سمجھا بجھا کر اس بات پر آمادہ کرنے
کی کوشش کی کہ وہ جرمنوں کے ماسٹر پلان کی ایک نقل کسی
طرح سے حاصل کر لے ۔ اینڈری تعاون پر آمادہ ہو گیا۔
بولس کیری میں متعین جرمن انچارج ماسٹر پلان کو اپنے

درکوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تھا اور دفتر تک میں پہنے رہتا تھا ۔۔۔ اس اوورکوٹ کے اس کے جسم سے علیحدہ ہونے کا واحد وقت نو بجے صبح کا تھا جب وہ بیت الخلاء جانے کے لئے اسے اتارتا تھا جرمن انچارج کی صبح کی اس غیر حاضری کا وقفہ بھی بہت مختصر ہوتا تھا۔ اینڈری کافی دنوں تک ان غیر حاضریوں کے وقت کا اندازہ کرتا رہا ۔۔۔ یہ وقفہ تین اور پانچ منٹ کے درمیان ہوتا تھا ۔۔۔ چنانچہ ایک روز جیسے ہی جرمن نے اپنا کوٹ اتار کر بیت الخلاء کا رخ کیا اینڈری نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے کوٹ سے ماسٹر پلان نکال کر پھرتی سے اس کا چربہ اتارا اور جرمن کی واپسی کے وقت سے پہلے اپنی ڈیسک پر واپس آگیا ۔

ہفتے کے اختتام پر ہولارڈ کی ہدایت کے بموجب اسنے ایک دوا استعمال کی اور شدید درد شکم کی شکایت کی ۔ جرمن ڈاکٹر نے اس بات پر اس کا مذاق اڑایا ۔ لیکن جب اینڈری نے قے کرنا شروع کیا تو اسے سنجیدگی کے ساتھ اسکی شکایت پر یقین کرنا پڑا ۔۔۔ چنانچہ اس نے اسے پیرس جا کر "خاندانی ڈاکٹر" سے علاج کرانے کی اجازت دیدی

پیرس میں اینڈری اور ہولارڈ دونوں نے مل کر دوسرے منصوبوں کی مدد سے ماسٹر پلان کی نقل کو ترتیب دینا شروع کر دیا۔ پھر انھوں نے عین موقع پر جا کر اپنے مشاہدات کی روشنی میں نقشوں کی جانچ پڑتال کی ۔ یہ ایک بے حد دشوار کام تھا بالآخر انہوں نے تمام اطلاعات اور تمام ٹکڑوں کو ماسٹر پلان میں ترتیب دے لیا یہ نہایت عمدگی اور وضاحت کے ساتھ وی دن طیاروں کے صدر کیمپ کا نقشہ تھا ۔۔۔ اور یہی کاغذ دراصل آلوؤں کے درمیان اس وقت چھپا ہوا تھا ۔ جب جرمن پولیس کے کتے نے سرحد پار کرتے ہوئے ہولارڈ کی ٹانگ پکڑ لی تھی ۔

ہولارڈ کے اس زبردست کارنامے کے بعد اسے لندن سے ایک تار موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔ منافع کی رقم بحفاظت مل گئی مبارک باد، ہولارڈ مطمئن ہو گیا ۔ نقشہ مناسب ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا اور اس کی محنت ٹھکانے لگ چکی تھی ۔۔۔ لیکن اب وہ مسلسل دوڑ دھوپ اور خطرات کی زندگی سے تھک چکا تھا ۔۔۔ وہ آرام کرنا چاہتا تھا ۔ برطانوی نمائندوں نے اسے سوئٹزرلینڈ میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا ۔۔۔ وہ کچھ عرصے سے وہیں ٹھہرا لیکن پھر اس کے دماغ میں ایک نئے خیال نے جنم لیا ۔ اور وہ ٹرینوں کی نقل و حرکت سے متعلق اسٹیشن ماسٹروں کی فہرستیں حاصل کرنے کے ارادے سے واپس فرانس چلا گیا ۔ جہاں چند ہی ماہ بعد ایک ساتھی کی غلطی سے پکڑا گیا ۔۔۔ اسے شدید اذیتیں پہنچائی گئیں لیکن اس نے اپنی زبان بند رکھی ۔ جاسوسی کی سازش میں اس کی شرکت کا ثبوت بھی فراہم نہ کیا جا سکا اس لئے اسے گولی مار کر ہلاک کرنے کی بجائے ایک کیمپ میں قید کر دیا گیا ۔

جب جنگ اختتام کے قریب پہنچی تو جرمنوں نے کیمپ خالی کرنے شروع کئے ۔۔۔ قیدیوں کو ہانک کر چند بڑی کشتیوں میں قید کر دیا اور کشتیوں کو شمالی سمندر میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا ۔

انہیں یقین تھا کہ یہ تمام کشتیاں اتحادی طیاروں کی بمباری سے تباہ ہو جائیں گی ۔۔۔ لیکن معجزانہ طور پر سینکڑوں افراد کے ساتھ ایک کشتی پر مقید ہولارڈ کو آخری لمحوں میں سویڈش ریڈ کراس کے ایک بحری جہاز پر منتقل کر دیا گیا ۔

ہولارڈ کی حالت اس قدر خراب و خستہ ہو چکی تھی کہ اسے چلنے پھرنے کے قابل ہونے کے لئے چھ ہفتے ہسپتال میں گزارنے پڑے ۔۔۔ جس کے بعد برطانیہ کی شاہی فوج نے اسے لندن لانے کے لئے ایک ہوائی جہاز بھیجا ۔۔۔ لندن میں اسے برطانوی فوج کا غیر ملکیوں کو دیا جانے والا سب سے بڑا اعزازی نشان پیش کیا گیا ۔ دریں اثنا حکومت فرانس بھی اسے اعزاز دینے کا اعلان کر چکے تھے ۔ چنانچہ بعد میں اسے پیرس میں اعزاز سے نوازا گیا ۔

آجکل وہ ایک بجلی کا سامان فراہم کرنے والی فرم کا ضلعی سیلز سپروائزر ہے ۔ اسکے زمانۂ جنگ کے کارناموں سے متعلق برطانوی[۲]

[۲] فوج آزادی کے تیسویں دستے کے کمانڈر لیفٹننٹ جنرل ہوروکس کا کہنا ہے کہ "ہولارڈ بلاشبہ بہادری و شجاعت کے اعلیٰ ترین اعزاز کا مستحق تھا درحقیقت لندن کو تباہی سے بچانے والا شخص ہولارڈ ہے" ●

تبت کے لوگ مہمان کا استقبال کرنے کے لئے زبان نکالکر بڑھانے کا سامنہ بناتے ہیں۔ جنوبی جزائر کے لوگ مہمان کے سر پہ پانی انڈیلتے ہیں ہندوستان کے کچھ حصوں میں پانی پیروں پہ ڈال دیا جاتا ہے۔ افریقہ کے ایک فرقہ کے لوگ ملتے وقت مہمان کے کپڑے اتار کر اس کے جسم پر لپیٹ دیتے ہیں۔

... ....... ...

ایک قیاس کے مطابق تاش کے چار رنگ چار موسموں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تین تصویروں کا مطلب ہے ہر موسم کے تین ماہ اور ہر رنگ کے تیرہ پتوں کا مطلب ہے ہر موسم کے تیرہ ہفتے۔ کل ۵۲ پتوں کا مطلب سال کے ۵۲ ہفتے ہیں تو بارہ تصویروں کا مطلب بارہ مہینے پورے تاش کے ۳۶۵ نکتے سال کے پورے دنوں کے برابر ہیں۔

....... .. .........

کینیا کے پہاڑی علاقہ کے لوگوں کی صداقت کا امتحان مقصود ہو تو ان کی زبان پہ تلوار چلائی جاتی ہے۔

... .. .. ......

ڈم کے جان گریو کو بغیر لائسنس لئے مذہبی تبلیغ کے جرم میں ۱½ سال جیل کی ایک قطعاً اندھیری کوٹھری میں رکھا گیا تھا اور اسی اندھیری کوٹھری میں اس نے "رسالہ انسان" نامی کتاب لکھی تھی۔

.... ...

ماہ نو نمبر ۱۱/ر

فرانس کے دیہی علاقوں میں لوگ شہد کی مکھیاں کاروباری پیمانے پر پالتے ہیں۔ گھر میں کسی کے فرد کی موت ہو جانے پر شہد کی مکھیوں کے چھتے کو کالی ربن سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ایسا نہ کرنے سے شہد کی مکھیاں چھتے پر واپس نہیں لوٹتیں۔

... . ..........

فرانسس میتھو ۸ سال کی عمر میں ایک مانا ہوا فرانسیسی شاعر بن گیا تھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں لاپتہ ہو گیا تھا۔

..... ......

باسٹی مور (اسپین) میں رائل بینک میں رابرٹ مکل نے ۳۰ سال تک لگاتار ملازمت کی تھی اور گلیڈسٹن ۶۰ سال تک برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر رہا تھا

... ... ....

آسٹریلیا کی ساٹن باور نامی چڑیا اپنے گھونسلے کو کئی رنگوں سے رنگ کر سجاتی ہیں

... .. .....

امریکہ کے انڈیز پہاڑوں میں ایک پودا جب ڈیڑھ سو سال کی عمر کا ہو جاتا ہے تو اس میں سے تیس فیٹ اونچا پھولوں کا ایک گچھا نکلتا ہے جس میں تقریباً ۸ ہزار پھول کھلتے ہیں۔

... ..........

فرانس اور اسپین کے درمیان ... پہاڑ ...

سے ۹ ہزار فیٹ کی بلندی پر عجیب برفانی غار ہیں۔ ان میں کمرے سے بنے ہوئے ہیں اور سیڑھیاں بھی گرمی میں بھی ان کی برف نہیں پگھلتی اور ان میں اتنی سرد ہوا چلتی ہے کہ گیلا کپڑا آن کی آن میں جم کر اکڑ جاتا ہے۔

............

کلکتہ کے ۲۷ سالہ نوجوان مراری موہن نے گذشتہ ۸ سال سے اپنے بائیں ہاتھ کے ناخون نہیں تراشے۔ اس کے ناخنوں کی لمبائی مختلف انگلیوں پہ ۴ انچ سے ۱۶ انچ تک ہے۔ وہ اپنے کو ناخنوں کا بادشاہ کہتا ہے۔

............

بارہ سنگھے کے سینگ کی شاخیں اتنی ہی ہوتی ہیں جتنے سال اس کی عمر!

............

سوفٹ نامی پرندہ دنیا کا سب سے تیز رفتار پرندہ ہے جو ۲۰۰ میل فی گھنٹہ اڑتا ہے۔

............

۱۶۰۰ء میں یورپ میں ایک ایسی گھڑی بنی تھی جس میں گھنٹے بجنے کی آواز ہوائی فائروں سے ہوتی تھی۔ سالار جنگ میوزیم میں آج بھی ایک ایسی گھڑی موجود ہے جس میں گھنٹہ بجنے کے وقت دروازہ کھلتا ہے اور ایک مشینی آدمی باہر نکل کر گھنٹہ بجاتا ہے۔

............

اٹلی کے ایک شہنشاہ نے ایک ایسا تالا بنوایا تھا جو جتنی بار کھلتا تھا اتنی ہی تعداد اس کے ڈائل پر خود بخود درج ہوجاتی تھی غیر موجودگی میں تالا کھلنے پر اس طرح آسانی سے پتہ لگ سکتا تھا۔

............

انگلینڈ میں پتھر کا بنا ایک ایسا قدیم مینار ہے جو نیچے ۶ فیٹ جنوب کی طرف اور اوپر جاکر ۱/۲ ۴ فیٹ مغرب کی طرف جھکا ہے پھر بھی صدیوں سے قائم ہے۔

............

زمانہ قدیم سے چین میں ایک عجیب وغریب کھیل جاری ہے

ہانگ کانگ کے پاس موسم بہار شروع ہونے پر عوامی پیمانے پر جھینگر بازی زور شور سے ہوتی ہے اس مقصد کے لئے جھینگر خصوصی طور سے پالے جاتے ہیں۔ ایک لڑاکو جھینگر کی قیمت ساڑھے سات روپیہ سے لے کر ساڑھے سات سو روپیہ تک ہوتی ہے۔

میدان میں چھوڑنے سے پہلے جھینگر کی مونچھ کو ایک برش سے ہلاکر اس کو غصہ دلایا جاتا ہے۔ دو جھینگر لڑتے ہیں اور تھک جانے پر ان کی مونچھ کو پھر چھیڑا جاتا ہے۔ جو جھینگر لڑنے سے بالکل انکار کردیتا ہے وہ ہارا ہوا مانا جاتا ہے۔ اس کھیل سے جوئے باز خوب فائدہ اٹھاتے ہیں بڑے بڑے ہوٹلوں میں میزوں پر لڑنے جھینگر ہزاروں روپیہ ذرا سی دیر میں ایک جیب سے دوسری جیب تک پہنچا دیتے ہیں۔

............

جرنیل ولیم کاپٹن جو کہ شاہی فوجوں کا کمانڈر تھا بینک بری کے محاصرہ کے دوران ۱۹ جولائی ۱۶۴۴ء سے ۲۶ اکتوبر تک یعنی کہ چودہ مہینے بستر پہ لیٹ کر آرام سے نہیں سویا۔ اپنے فرض کو مستعدی کے ساتھ پورا کرتے کرتے بہت تھک جانے پر وہ کھڑے کھڑے ٹیک لگا کر یا بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا اونگھ ضرور لیتا تھا۔ ●

---

بقیہ۔

---

دونوں کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کے لئے سب کچھ بھلا دیا ہے وہ دن رات اگر مصروف رہتا ہے تو اس سے تمہارا اور تمہارے بچوں کا مستقبل خوشگوار بنے گا تمہیں چاہئے کہ ایسے شوہر کی قدر کرو اور اس کی مصروفیت کو بھی اپنے ساتھ ایک قسم کی محبت ہی سمجھو۔

میرے نزدیک سچا محبت کرنے والا شوہر وہ نہیں ہے جو چکنی چپڑی باتیں کرتا رہے اور بیوی کے ساتھ عشق و محبت کا کھیل کھیلتا رہے بلکہ سچی محبت کرنے والا شوہر وہ ہے جو اپنے بیوی، بچوں کے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے دن رات جدوجہد میں مصروف رہے جوانی کا یہ خواب تو چند روز میں ختم ہوجائے گا۔ اس کے بعد تمہارے شوہر کی وہی مصروف زندگی تمہارے کام آئے گی جس سے کہ آج تم نالاں ہو۔ ●●

شاہ جہاں دہلی

# پیغام نصر قریشی

بہت دن بعد مجھکو پھر ترا پیغام آیا ہے
بھلا دوں عہدِ ماضی، پیار کی باتوں کے افسانے
سجا لوں اپنی پلکوں پر لرزتے اشکوں کے موتی
مٹا دوں نقشِ رفتہ، بھیگی برساتوں کے افسانے
اگر ہونٹوں پہ بھولے سے کوئی نغمہ مچل اٹھے
نہ چھیڑوں ساز پہ خوشیوں بھری راتوں کا افسانے
کہیں جب بھی کھنک اٹھے پسِ منظر کوئی چوڑی
نہ دہراؤں کبھی رنگین سوغاتوں کے افسانے

ازل سے حسن نے یہ عشق کو پیغام بھیجا ہے
کہ توقیر محبت کھو نہ جائے غم کی راہوں میں
غم و آلام کے سائے میں الفت کی قسم کھا کر
نصیبہ عشق کا ڈھلتا رہا ہے چند آہوں میں
کبھی آنسو کے انگارے، کبھی شعلے نگاہوں کے
دہکتے ہی رہے ہیں عشق کی کمزور باہوں میں

ترا پیغام آیا ہے مرے دل کی فغاں بنکر
مری بے لوث الفت کی سسکتی داستاں بنکر
تری زر کار فطرت کی ہوس کا رانہ چاہت پر
مرا دل ہر گھڑی روتا ہے اک سیلِ رواں بنکر
تری محفل میں بکھریں گے کبھی جب پیار کے نغمے
مرے آنسو جلائیں گے تجھے برقِ تپاں بنکر
یہ مانا آج تیری زندگی محوِ بہاراں ہے
تباہی رنگ لائے گی مری اک دن خزاں بنکر

تجھے اور تیری باتوں کو بھلانا تو نہیں ممکن
میں عہدِ ترکِ الفت آج سے لیکن نبھاؤں گا
کوئی رنگین آنچل، زلفِ شبگوں خواہ لہرائے
حریمِ ناز کی سرحد سے کوسوں دور جاؤں گا

مجھے منسوب تجھ سے کر کے چھیڑے گی مری دنیا
میں ترا نام بھولے سے بھی ہونٹوں پر نہ لاؤں گا
مجھے ڈستی رہے ہر لمحہ روز و شب کی تنہائی
تری خلوت کی باتیں، عہدِ ماضی بھی بھلاؤں گا
چناروں، دیواروں، شبنمی پیڑوں کے سایوں میں
حسیں راتوں میں نغمے پیار کے اب تو نہ گاؤں گا
اگر سوزِ دروں، یونہی مرے دل کو جلاتے گا
غم و آلام کے سائے میں پل کر مسکراؤں گا
مبارک ہوں تجھے ایوانِ رفعت، اونچے بام و در
دریچوں کی طرف تیرے نہ اب نظریں اٹھاؤں گا

مگر اک بات رہ رہ کر کھٹکتی ہے مرے دل کو
جوانی بیت جانے پر ترا انجام کیا ہوگا
یہ بھونرے مست ہونٹوں کا شہد پی کر بہاروں میں
جب اڑ جائیں گے تو پھر اے خزاں کی شام کیا ہوگا
یہ اپنی اندازِ رسوائی، یہ اپنی حالِ سیہ کاری
ترے پچھتانے سے پھر اے دلِ بدنام، کیا ہوگا
تجھے محسوس ہوگی جب ضرورت اک سہارے کی
خدا جانے شکارِ گردشِ ایام، کیا ہوگا

تجھے پھر چاندنی راتوں کا عالم یاد آئے گا
تری تنہائی تیرے حال پر آنسو بہائے گی
تجھے ڈس لیں گی تیری فطرت زر کار کی باتیں
تری یہ روحِ تشنہ کس طرح تسکین پائے گی
ترا یہ جسمِ مرمر، حسن کھو دے گا نگاہوں میں
یہ دنیا تیری صورت کی ہنسی اک دن اڑائے گی

تجھے ایسے میں ہر پل، ہر گھڑی میں یاد آؤں گا
تری ویرانیوں پہ طنز بنکر مسکراؤں گا

ماہ نو میر ۷۱ء

## وسیم فاضلی

○

ناز خفگی کے اٹھانے کے لئے آیا ہوں میں
روٹھنے والے منانے کے لئے آیا ہوں میں

ہفتخوانِ وادیٔ غربت کو طے کرتا ہوا
جنّتِ گم کردہ پانے کے لئے آیا ہوں میں

جو ترے الفاظ میں تھیں مظہر جذباتِ حسن
آج وہ غزلیں سنانے کے لئے آیا ہوں میں

ذہن و دل پر ہجر کے عنواں سے جو چھائی رہی
آج وہ ظلمت مٹانے کے لئے آیا ہوں میں

وقت نے گم کر دیا ہے دشتِ غربت میں جیسے
وہ سکونِ قلب پانے کے لئے آیا ہوں میں

ہائے یہ تجدیدِ عہدِ عشق یہ عزمِ وفا
جیسے اب سچ مچ نہ جانے کے لئے آیا ہوں میں

## بدرالزماں بدرؔ علیگ

○

احساسِ غم دوریٔ منزل سے گزر کر
آغازِ خوشی انجام پہ بھی ایک نظر کر

شاید کوئی مل جائے شناسائے محبت
اے عمرِ گریزاں ہمیں چلنا ہے ٹھہر کر

اب کوئی سماتا ہی نہیں اپنی نظر میں
کیا ہو گئیں آنکھیں ترے جلووں سے نکھر کر

رہنے دے یونہی سلسلۂ کیفیتِ شوق
منسوبِ نظر کر کے نہ محرومِ نظر کر

خود پاؤں میں آجائے گی ہر منزلِ مقصود
اے قافلۂ عشق ذرا عزمِ سفر کر

انسان نکھرتا ہے بدرؔ آتشِ غم سے
پھولوں کی تمنا ہے تو کانٹوں میں بسر کر

شاہ جہاں پور دہلی

## شاہد احسن

غمِ فراق نے یہ حال کر کے چھوڑا ہے
ہمارے سینے میں اب دل نہیں ہے پھوڑا ہے
نہ دور تک کوئی جادہ نہ منزلوں کے نشاں
یہ راہبر نے کدھر کارواں کو موڑا ہے
مری دعا ہے ملے منزلِ مراد انہیں
وہی جنہوں نے مجھے راستے میں چھوڑا ہے
خدا ہی جانے کہ اب نظمِ میکدہ کیا ہو
کسی نے عالمِ مستی میں جام توڑا ہے
بھری بہار میں اب کے برس بھی گلچیں نے
حسیں گلوں کی رگوں سے لہو نچوڑا ہے
اداس اداس ہے سارا آئینہ خانہ
انہوں نے آج کسی آئینہ کو توڑا ہے
سوائے تیرے کسی کا خیال کیا آتے
تیرے خیال نے کس کا خیال چھوڑا ہے
لہو لہو ہے دلِ بے گناہ سینے میں
نگاہِ ناز نے کیا یہ تیر چھوڑا ہے
جواں ہوا ہے جو کانٹوں کے سائے میں احسنؔ
کس احتیاط سے ہم نے وہ پھول توڑا ہے

## علیم اختر

دل میں کوئی ارمان نہیں ہے
جسم میں جیسے جان نہیں ہے
جینا تو دشوار ہے لیکن
مرنا بھی آسان نہیں ہے
کلیاں افسردہ، افسردہ
پھولوں میں مسکان نہیں ہے
راہزنوں کی اس دنیا میں
کیا کوئی انسان نہیں ہے
شوق کی منزل جادہ جادہ
راہِ طلب سنسان نہیں ہے
پاس نہ جانا آئینے کے
آئینہ بے جان نہیں ہے
دل میں یاد ہے خوشبو خوشبو
یہ بستی ویران نہیں ہے
ہم بھی اُن سے رُوٹھ سکیں گے
ایسا کوئی امکان نہیں ہے
تم ہی خود کو نہ جانو اخترؔ
اُن کی نظر انجان نہیں ہے

## اکبر حیدرآبادی

درد جتنے بھی تھے سب دل کے قریں ٹھہرے ہیں
قافلے یادوں کے آ آ کے یہیں ٹھہرے ہیں
داغ دل بن کے رہے دل میں تمنا کے نقوش
کہیں ابھرے تو یہی داغ جبیں ٹھہرے ہیں
اور کیا چاہیئے واں دل کی خرابی کے لیئے؟
دشمنِ دل ہی جہاں دل کے مکیں ٹھہرے ہیں
عین فطرت ہے عناصر کے لئے شوقِ نمود
لالہ و گل بھی کہاں زیرِ زمیں ٹھہرے ہیں
شش جہت جن کے لیئے بن گئے اک راہ گذر
وہ مسافر کسی منزل پہ نہیں ٹھہرے ہیں
ہم نے روندے ہوئے پھولوں سے محبت کی ہے
قہرِ گلشن کے سزاوار ہمیں ٹھہرے ہیں
وہ ستارے جنہیں سورج سے رہی نسبتِ خاص
وادیٔ شب میں اجالوں کے امیں ٹھہرے ہیں
نہ ملا جن کو زمانے سے کوئی حسنِ حیات
میری دنیا میں وہی لوگ حسیں ٹھہرے ہیں
اک زمانہ ہے کہ سرگرمِ سفر ہے اکبر
ایک ہم ہیں کہ جہاں تھے سو وہیں ٹھہرے ہیں

## ناصر کرنولی

وابستہ حادثات سے جو دل نہیں رہا
وہ آشنائے لذتِ منزل نہیں رہا
سب مصلحت شناس طے راہ شوق میں
رہبر بھی اعتبار کے قابل نہیں رہا
ترکِ تعلقات سے بھی فائدہ ہے کیا
پابندِ اختیار اگر دل نہیں رہا
کیا کہیئے دلفریب بھٹکنے کی لذتیں
گم کردہ راہِ طالبِ منزل نہیں رہا
آ کر قریب وہ جو بہت دور ہو گئے
شاید مرا خلوص ہی کامل نہیں رہا
آنکھیں بچھائے راہ میں کب سے ہیں منزلیں
افسوس کوئی قافلۂ دل نہیں رہا
طوفاں سے کھیلنے کا سلیقہ تو آ گیا
مانا کہ دل میں جذبۂ ساحل نہیں رہا
جو کر گیا وفا کے تقاضوں سے انحراف
وہ احترامِ عشق کے قابل نہیں رہا
ناصر بقولِ حضرتِ غالب بہ فیضِ غم
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

# شاہجہاں

طالب علموں کا | طالب علموں کے لئے | طالب علموں کے ذریعے

# ہمارے مقاصد

دسمبر ——— ۱۹۷۱ء

جلد ۵ ——— شمارہ ۱۲

قیمت فی پرچہ ——— پچیس پیسے

سالانہ ——— تین روپئے


## طالب علموں

——— میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنا

——— کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا

——— کو ملک وملت کی بامقصد خدمت کے لئے تیار کرنا

——— میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا

——— کی آواز کو عوام تک پہنچانا

——— کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے روشناس

——— کرانا ——— اور

——— سماجی اصلاح کے لئے جد جہد کرنا

ادارہ


## مجلس ادارت

محمد عتیق صدیقی ایم۔اے۔ ریسرچ اسکالر دلی یونیورسٹی

نجمہ مزمل ״ ״ ״ ״ ״ ״

انیس الرحمٰن ... متعلم ——— دلی کالج دلی


شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے اور غزلیں ونظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول وکالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں۔
ادارہ



شاہجہاں آل انڈیا اسمال نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (A.I.S.N.E.C) نئی دہلی کا ممبر ہے۔


طابع، ناشر ومالک ——— محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ ——— اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران

مقام اشاعت :- قاسم جان اسٹریٹ بلی ماران دہلی نمبر ۱

شاہجہاں پور

# دلی کالج کا وقار برقرار رکھئے

دلی کالج، دہلی کے ان قدیم اور باوقار کالجوں میں سے ایک ہے جو ابتداء ہی سے نہ صرف اپنی تہذیب اور اعلیٰ معیار کے لئے مشہور ہیں بلکہ انھوں نے ملک کو ایسے فرزند عطا کئے ہیں جو اس کے لئے وجہ افتخار رہتے ہیں۔

دلی کالج شروع ہی سے ایسے طالب علم پیدا کرتا رہا جنہوں نے سیاسی، علمی، ادبی، ثقافتی غرض زندگی کے ہر میدان میں ناموری حاصل کی ہے۔ آج ترقی یافتہ دور میں بھی دلی کالج مشرقی تہذیب کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ اور یہاں کے طلبہ و طالبات نوجوانوں میں تیزی سے پھیلی ہوئی غلط روش سے محفوظ ہیں۔

مشرقی تہذیب کے واحد نمائندہ دہلی کے اس کالج میں اس سال طلبہ کی یونین کی افتتاحی تقریب میں جو کچھ ہوا وہ نہ صرف کالج کے بے داغ ماضی پر بدنما دھبہ ہے بلکہ کالج کے اساتذہ و طلبہ اور بہی خواہوں کا سر شرم سے جھکانے کے لئے کافی ہے۔

۹ر نومبر ۸۱ء کالج کے لئے منحوس دن تھا۔ اس دن کالج کے طلبہ کی یونین کا افتتاحی فنکشن (Inaugural function) تھا۔ فنکشن کے مہمان خصوصی مرکزی وزیر برائے صحت و فیملی پلاننگ جناب اوما شنکر دکشت تھے۔ فنکشن نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہا تھا۔ فنکشن کے ہر آئٹم (جس میں قوالی، ڈرامہ اور فنی طلبہ کا گیت وغیرہ شامل ہیں) نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی۔ معلوم ہوا ہے کہ آخر میں فنکشن کی متوقع کامیابی کے پیش نظر یونین کے عہدیداران اور کالج کے پرنسپل صاحب نے S.F.I. (جو نکسلی طلبہ کی خفیہ تحریک ہے) کے اشتراک سے ایک انتہائی فحش اور بدنام زمانہ سیاسی ڈرامہ پیش کرنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ جہاں مارکسزم کی تبلیغ کرتا ہے وہاں انتہائی فحش مکالمات اور بازاری غنڈوں کی زبان پر مشتمل ہے۔

حسب پروگرام جب مذکورہ ڈرامہ شروع ہوا اور ڈرامے کے کرداروں نے اپنے مکروہ انداز میں اسٹیج پر فحش کلامی شروع کی تو یہ کالج کے غیرت مند طلبہ کو اپنی خودداری پر براہ راست حملہ محسوس ہوا۔ انھوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور منتظمین جن میں یونین کے صدر، سکریٹری اور کالج کے پرنسپل شامل ہیں سے التجا کی کہ ایک ایسا ڈرامہ جو طلبہ کے اخلاق و کردار پر برا اثر ڈالے کم از کم دلی کالج میں اس طرح اسٹیج کرنا مناسب نہیں۔ بہتر ہے کہ آپ اس کو بند کرا دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اقتدار کے نشے میں چور ان لوگوں نے ان طلبہ کی درخواست کا قطعاً خیال نہیں کیا بلکہ ان پر الزام لگایا کہ آپ چونکہ ہمارے "مخالف" ہیں اس لئے فنکشن کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ بلکہ یونین کے ایک ذمہ دار نے تو دو ہاتھ آگے جاتے ہوئے مائک پر برملا کہہ دیا کہ یہ غنڈے ہیں ہمیں ان سے سلٹنا ہے۔ حالانکہ یہی صاحب جو آج اس طرح مائک پر دوسرے کو غنڈے کہہ رہے تھے کل ہاتھ میں

پاقو لئے قتل کی اور لڑکیوں کو اغوا کرنے کی دھمکیاں دیتے پھرتے تھے۔ ان کے مار دھاڑ کے کتنے ہی واقعات مشہور ہیں۔ پرنسپل صاحب نے طلبہ کے اس فنکشن میں بے جا مداخلت کرتے ہوئے احتجاجی طلبہ کو ہندوستانی تہذیب کا دشمن گردانا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کی بات کرنے والے پرنسپل صاحب خود ہندوستانی زبان تک سے نابلد ہیں۔ اس کے علاوہ برسر اقتدار گروپ کے حامی (جن کو عرف عام میں چمچے کہا جاتا ہے) چند لڑکوں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر نہایت بازاری قسم کی گالیاں دیں۔ ان لڑکوں میں ایک صاحب وہ بھی شامل تھے جو خود کو M. P. C کا رکن کہتے ہیں اور نظام الدین میں واقع عالیشان بنگلہ میں مخملی گدوں پر بیٹھ کر جھگیوں میں رہنے والے ننگے اور سسکتے ہوئے لوگوں کی بات کرتے ہیں۔

المختصر زیادہ مخالفت دیکھ کر منتظمین فنکشن کو مجبوراً یہ ڈرامہ پروگرام سے حذف کرنا پڑا۔ ڈرامہ بند ہونے کے بعد فنکشن بحسن و خوبی جاری رہا۔

مذکورہ بالا واقعہ کو ہم اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اور اس تمام ہنگامے کا ذمہ دار یونین کے سربراہ اور کالج کے پرنسپل صاحب کو سمجھتے ہیں۔ اگر یہ حضرات ان طلبہ کے احتجاج پر متنازعہ ڈرامے کو پہلے ہی بند کر دیتے تو اس گڑبڑ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک احتجاج کرنے والے طلبہ کا تعلق ہے ہم ان کے اس عمل کو جرأتمندانہ اور مستحسن قدم سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے اس اظہار ناراضگی کے لئے کوئی اور طریق کار استعمال کرتے تو بہتر ہوتا۔ بہر حال پھر بھی ہم ان کے اس طریقے کو غلط نہیں کہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ کالج فنکشنز میں پیش کئے جانے والا ہر آئٹم اساتذہ اور طلبہ کی ایک ملی جلی کونسل میں منظور کرایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اسٹیج ہوتا ہے۔ مگر یہ متنازعہ ڈرامہ ایسی کسی کونسل سے منظور نہیں کرایا گیا۔ جب کہ اس فنکشن کا ہر آئٹم منظور شدہ تھا۔ اس کے علاوہ اس ڈرامے میں کام کرنے والے سب کالج کے باہر کے تھے۔ مزید یہ کہ اس کی ریہرسل وغیرہ بھی کالج میں نہیں ہوئی۔

طلبا کی ایسی ہر تقریب کو اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ لیکن موجودہ فنکشن میں صرف گنتی کے دو یا تین اساتذہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا، یہاں پر اس خدشہ کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے کہ تمام اسٹاف کا فنکشن سے بائیکاٹ کہیں اسی ڈرامہ کی وجہ سے نہ ہو۔ ہو سکتا ہے یہ ڈرامہ اسٹاف کونسل میں رکھا گیا ہو۔ اور اسٹاف کی اکثریت نے اس کی مخالفت کی ہو۔ لیکن جب پرنسپل اور یونین کے عہدیداروں نے ایک نہ مانی تو ان کی غیر حاضری احتجاجاً ہو۔ فنکشن سے تین دن پہلے یونین ایڈوائزر کے استعفی کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ انھوں نے غبن اور بدعنوانی کی روک تھام کی کوشش کی جسے پرنسپل اور سکریٹری برداشت نہ کر سکے اور انھیں مجبور کیا کہ وہ استعفی دیدیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ طلبا کی یونین کے بارے میں پرنسپل کا رویہ کہاں تک جائز ہے؟ کیا یونین ایڈوائزر کا استعفی شکوک کو تقویت نہیں دیتا؟

ہم اس بات کو سوچنے پر مجبور ہیں کہ آیا اس سے قبل کبھی ایسا ہنگامہ یا لاقانونیت کیوں نہیں ہوئی؟

کیا ان سب وجوہات کا یہ سبب نہیں ہے کہ کالج کا باقاعدہ مستقل پرنسپل نہیں جو نہ صرف احساس ذمہ داری کے ساتھ کالج کا نظم و نسق چلائے بلکہ کالج کی دیرینہ مشرقی تہذیب کا بھی امین ہو۔

اس سلسلہ میں ہم چیرمین گورننگ باڈی دلی کالج سے درخواست کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اس کالج میں جلد سے جلد مستقل نئے پرنسپل کے تقرر کا اعلان کریں اور جب تک اس کالج میں نئے پرنسپل کا تقرر نہ ہو اس کا انتظام گورننگ باڈی کے ہاتھ میں لے لیا جائے۔

ممبران اسٹاف کونسل (دلی کالج) نے بھی ہر موقع پر کالج کا وقار قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس دشوار گذار مرحلے میں ہم امید کرتے ہیں کہ وہ پوری ذمہ داری کا ثبوت دیں گے۔ اور دلی کالج کی تہذیب، قومی ایکتا اور امن و انتظام قائم رکھنے میں اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کریں گے۔

ساقی صولت الکلیم
شاہجہان دہلی

# ادب اور زندگی

سراج الآفاق صدیقی
ایم۔اے (عربی) ایم۔اے (فارسی) الہ آباد

ارباب علم وادب نے ادب کی بے شمار تعریفیں کی ہیں۔ کوئی ادب کو زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار سمجھتا ہے۔ کسی کے خیال میں ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے، کسی کے خیال میں خیالات اور احساسات کا نچوڑ ہے۔ وغیرہ وغیرہ،

انگلستان کا مایۂ ناز ادیب اور نقاد میتھو آرنلڈ ادب کو زندگی کی تنقید سمجھتا ہے، درحقیقت وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔

ادب اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے، ادب اپنے ماحول سے جدا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے ماحول کے تاثرات کو بیان کرتا ہے، یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ ادب کا اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق ہے اجتماعی زندگی انفرادی زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے، وہ زندگی بسر کرنے کے لئے سماجی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جماعت کے بغیر کوئی فرد اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ فرد کی شخصیت، فرد کی سیرت اور فرد کی تشکیل جماعت میں ہی ہوتی ہے۔ سوسائٹی کے بغیر فرد میں آدمیت پیدا نہیں ہو سکتی، کیوں کہ جماعت ہی اس کے اندر ضبط کا کا مادہ پیدا کرتی ہے، اور اس کو قانون کا احترام سکھاتی ہے۔ اجتماعی زندگی کی بدولت فرد کی سیرت پختہ تر ہو جاتی ہے۔ انسان حقیقت میں اسوقت تک انسان ہے، جب تک کہ جماعت کا فرد ہے۔ اقبال کی رائے میں فرد اور جماعت دونوں آپس میں مربوط ہیں، اور ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی پر موقوف ہے۔ دونوں میں کامل ہم آہنگی، اور توافق ہے۔ فرد کی زندگی، جماعتی زندگی سے جداگانہ کوئی شے نہیں، اس لئے ادب کا موضوع، فرد کی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی ہو جاتا ہے۔ اگر ہم غزل کی معنوی حیثیت کا تجزیہ کریں تو ہم دیکھیں گے، کہ میر اور درد کے صوفیانہ کلام میں، انفرادی ذہنیت کارفرما ہے۔ میر تقی میر کے کلام میں زمانے کے سیاسی افکار اور جماعتی انتشار کی جھلک موجود ہے۔ انشاء اللہ خاں اور ان کے معاصرین کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت کا گہرا اثر ان کے کلام پر پڑا ہے۔ ایک طرف لکھنؤ کے ابتدائی شاعر

موجود ہے، اور دوسری طرف رعایتِ لفظی، ابتذالِ
معنوی اور فضول مرقعت طرازی ہے۔ یہ عشقیہ شاعری
اپنے عہد کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی زندگی
سے گہرا واسطہ رکھتی ہے۔ عصرِ حاضر کے غزل گو شعرا
کی غزلوں میں، اور میر، درد و انشاء کی غزلوں
میں معانی و مطالب کے لحاظ سے کافی فرق ہے۔
یہ فرق سیاسی و سماجی ماحول کا ہی طرۂ امتیاز
ہے۔ غزل گو شعرا اپنے معاشرتی اور اقتصادی
ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے
اور اردو غزل خارجی زندگی اور سماجی زندگی اور
اس کی حقیقتوں سے گہرا ربط رکھتی ہے۔

اردو غزل پر ہی یہ منحصر نہیں ہے، بلکہ دنیا کے
تمام فنی کارناموں میں اس زمانے کے سیاسی،
معاشی اور سماجی ماحول کا عکس نظر آتا ہے۔ انگریزی
زبان کا مشہور ادیب آسکر وائلڈ، آرٹ برائے
آرٹ کا حامی و علمبردار ہے۔ وہ ادب میں انفرادیت
اور جمالیاتی ادب کا حامی ہے۔ اگرچہ ادبی تخلیقات
کا دامن بھی اجتماعی زندگی کشمکش سے محفوظ نہیں
رہا ہے۔

منظر نگار شاعروں کے کلام میں بھی اجتماعی
زندگی کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ دنیا کے بکثرت
شاعروں نے موسم کی تبدیلی، پرندوں کی موسیقی،
مرغزاروں کی بہار اور اسی طرح کے دیگر موضوعات
پر بے شمار نظمیں کہی ہیں، انکی نظمیں سماجی زندگی
کے رجحان کی ترجمان ہیں۔

ادیب کے خیالات و عقائد اسی جماعت کے
خیالات اور عقائد ہوتے ہیں جس جماعت کا وہ
فرد ہوتا ہے، وہ ایک مخصوص سماجی ماحول کے
باعث زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے عقائد و افکار،
اس کے اطوار و عادات، اس کی زبان و گفتار

یہ دور سائنس کا ہے، سائنس سے ہمیں کائنات
کا بھی علم ہوا ہے۔ سائنس کے جدید انکشافات و
ایجادات نے ہمارے خیالات و ذہن کو ایک بڑی
حد تک متاثر کیا ہے اور زندگی کی ایک لہر دوڑا دی
ہے۔ یہ سائنس ہی کا فیض ہے کہ آج زندگی ایک
نئے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے اور سماج ایک
دورِ تغیر سے گزر رہا ہے۔ ایسی صورت میں ادب کا
تقاضا یہ ہے کہ وہ عصری میلانات اور خصوصیات
کا حامل اور صحیح معنوں میں زندگی کا ترجمان اور
خارجی حالات کا مرقع ہو۔

مختصر یہ کہ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب
نہ اپنی منزل تلاش کر سکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے۔
ادب زندگی کا ترجمان ہے اور حقیقت کی تفسیر
ہے۔ اور حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے۔ وہ بجا
طور پر زندگی کا ترجمان اور خارجی حالات کا مرقع اور گرد و
پیش کی تمام زندگی کا آئینہ دار ہے۔ ادب جذبات
کی تصویر ہے۔ اور ادب اور زندگی کے مقاصد ایک
ہی ہیں۔
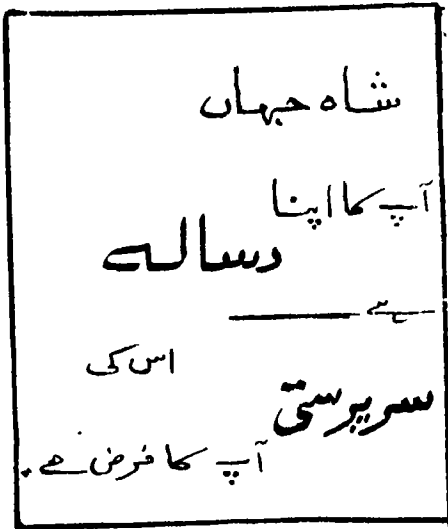
# ملک کی معاشی ترقی میں تعلیم کی اہمیت

مرزا لیاقت علی
بی۔ اے۔ (معاشیات) دہلی کالج دہلی

کسی بھی ملک کی اقتصادی و معاشی ترقی کے پیچھے انسان کا ہی دماغ کام کرتا نظر آتا ہے۔ قدرت نے انسان کے سامنے ذرائع کا ایک انبار لگا رکھا ہے۔ انسان ان موجودہ ذرائع کو معاشی ترقی کے مختلف پروگراموں کے مطابق لگاتا اور ان کے صحیح مصرف کے لئے معاشی میدان میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کی معاشی ترقی کے لئے اس ملک میں تعلیم کے فروغ پر پوری توجہ دی جائے۔ تعلیم چاہے وہ پرائمری درجہ کے لئے ہو یا سکنڈری درجہ کے لئے۔ یونیورسٹی سطح کی ہو یا تکنیکی، سائنسی، نفسیاتی یا عام تعلیم ہو، ملک کی ترقی کے لئے ایک اہم رول ادا کرتی ہے اور ملک کی ترقی میں جہاں اور بہت سے عاملین ہیں وہاں تعلیم بھی ایک ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک ہندوستان میں شروع ہی سے تعلیم کی اہمیت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ آزادی کے بعد تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا جانا چاہئے تھا۔ آزادی کے بعد ہم نے پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے مختلف میدانوں میں بہت بڑی بڑی رقمیں صرف کیں لیکن تعلیم جو کہ معاشی ترقی میں بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت کو پوری طرح سے نہ سمجھ سکے۔ ابھی تک ہمارے ملک میں تین پانچسالہ منصوبے ختم ہو چکے ہیں۔ چوتھا منصوبہ چل رہا ہے۔ ان تین منصوبوں پر تسلی بخش رقم لگائی گئی وہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے واضح ہو جاتا ہے۔

| منصوبے | روپے کروڑوں میں | فی صد |
| --- | --- | --- |
| پہلا پانچسالہ منصوبہ | ۱۴۹ | ۷٫۶ |
| دوسرا 〃 〃 | ۲۰۰ | ۵٫۶۳ |
| تیسرا 〃 〃 | ۶۶۰ | ۷٫۷ |

مندرجہ بالا اعداد و شمار پبلک سیکٹر کے کل خرچ سے نکالے گئے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہیں کہ دوسرے پانچسالہ منصوبے میں سماجی فلاح و بہبود کے لئے حکومت نے ۸۵۰ کروڑ روپئے منظور کئے تھے۔ انھیں ۸۵۰ کروڑ روپے میں سے صرف ۲۰۰ کروڑ روپے تعلیم کے لئے رکھے گئے۔ یعنی الگ سے کوئی مد تعلیم کے لئے نہیں رکھی گئی تھی۔

ایک طرف جہاں ہمارے ملک میں تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف ہمارے ملک میں جہالت بڑھتی جا رہی

ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ہندوستان میں ہر سال چار
ملیون لوگ جاہلوں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔ جہالت
بڑھنے کے بھی کئی اسباب ہیں۔ مثلاً تعلیم کی طرف رجحان
نہ ہونا۔ ہندوستان میں صرف ۷۷ر۸ فی صد بچے ۶
اور ۱۱ سال کی عمر کے درمیان اسکول جاتے ہیں۔
اور باقی ۲۲ر۲ فی صد بچے جاہل رہ جاتے ہیں۔ دوسری
بات یہ کہ ۷۷ر۸ فیصد بچے جو اسکول جاتے ہیں ان میں
سے بھی ۲۳ فی صد ایسے ہوتے ہیں جو پرائمری درجات
مکمل کرنے سے پہلے ہی تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک اندازہ
کے مطابق ۸ر۲ ملیون بچے ہر سال اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔
اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ہندوستان
میں مردوں سے زیادہ عورتوں میں جہالت ہے۔ عورتوں
میں جہالت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ۱۹۶۱ میں
عورتوں میں جہالت ۱۰ر۸۷ فی صد تھی جب کہ مردوں
میں صرف ۶ر۶۵ فی صد تھی۔

ان سب باتوں سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے
کہ ملک کی معاشی ترقی میں تعلیم کی کمی ایک بہت بڑی رکاوٹ
ہے۔ تعلیم کی کمی ہمارے ملک کے لوگوں میں کام کرنے کی
مہارت، نئی نئی ایجادیں اور ملکی ترقی کے لئے اچھے اچھے
خیالات سے محروم رکھتی ہے۔ کسی بھی ملک میں اس کی
معاشی ترقی کا ضامن اس ملک کا انسانی سرمایہ ہوتا
ہے۔ یہی انسانی سرمایہ ہندوستان میں بڑی تعداد میں
موجود ہے لیکن ہنرمند اور تعلیم یافتہ انسانی سرمایہ نہ ہونے
کے برابر ہے۔ تعلیم کے بغیر ہمارے ملک کے مزدور اور
کسان اپنے کام کرنے کی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتے۔
جس کا اثر ملک کی ترقی پر براہ راست پڑتا ہے۔

اگرچہ ۱۹۶۰ میں یونیورسٹی میں طلبار کے داخلہ کی
تعداد ۷۴ر۰ ملین تھی لیکن اب اس میں اضافہ ہو کر
تعداد ۶۹ر۱ ملین ہو گئی ہے۔ پھر بھی ملک کی آبادی
کے پیش نظر یہ تعداد بہت کم ہے۔ چوتھے پانچسالہ منصوبے
میں بھی ۱۹۷۳ر۷۴ کے آخر تک طلبار کا یونیورسٹی میں
داخلہ کا (Target) نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ ۲۴۴ر۲ ملین
ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کالجوں اور یونیورسٹی
کی تعداد بڑھانے کی بھی مزید ضرورت ہے تاکہ طلبار کو
زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھپایا جاسکے۔ اسی کے ساتھ
کئی زراعتی وصنعتی اداروں میں تجربہ گاہیں کھولنی ہیں اور
کئی صنعتوں اور دوسرے پیشوں کے لئے پروجیکٹ تیار
کرتے ہیں۔

تکنیکی تعلیم کا دائرہ بھی ۱۹۶۰ سے لیکر ۱۹۶۸ تک بہت
وسیع ہوا ہے۔ ۱۹۶۸ تک سائنسدانوں اور تکنیکی انسانوں
کی کل تعداد ۹۵ر۹ لاکھ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ
انجینیرنگ اور ٹیکنالوجیکل اداروں میں ڈگری لیول کے لئے
طلبار کی تعداد ۱۴۰۰۰ سے ۲۵۰۰۰ ہو گئی ہے اور ڈپلوما
سطح پر ۲۶۰۰۰ سے ۴۸۶۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔ ہمیں یہ بڑھتے
ہوئے اعداد وشمار دیکھ کر خوشی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ
اونچی تعلیم کے حصول کے لئے جو کچھ سہولیات مہیا کی
جاتی تھیں وہ ابھی اپنے پرائمری اسٹیج سے زیادہ نہیں
بڑھ پائی ہیں۔

اس کے برخلاف یہ بات درست ہے کہ اونچی تعلیم
حاصل کرنے والے طلبار کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔
اگر تعلیم کی ترقی ہوتی ہے تو اس کمی کو دور کیا جانا چاہئے۔
اس کو حل کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ تعلیم کے حصول کے
لئے جو سہولیات مہیا ہو سکیں کی جائیں اور یہ لازمی قرار
دے دیا جائے کہ اونچی کلاسوں تک تعلیم حاصل کی جائے۔
طلبار کے اونچی تعلیم حاصل کرنے کی پہلی وجہ تو غریبی ہے۔
اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی ہے کہ تعلیم مکمل
کرنے کے بعد بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ
والدین بھی اخراجات کا بوجھ بڑھنے کی وجہ سے اونچی تعلیم
حاصل کرنے کے لئے اپنے لڑکے لڑکیوں کی ہمت افزائی
نہیں کرتے۔ اس صورت حال کا سامنا کرنے کا ایک حل یہ
بھی ہے کہ ہائر سکنڈری کی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کو کچھ
(Part time) فالتو وقت کام فراہم کیا جائے۔ اس کے

لئے ضروری ہے کہ ذمہ داران ان کو چھوٹے موٹے کام فراہم کریں۔ جیسے دستکاری، صنعت کاری اور چھوٹے موٹے گھریلو استعمال میں آنے والی چیزوں کی پیداوار کرنے والے کارخانے۔ اس میں داخلہ ان ہی لڑکوں کو دیا جائے جو ہائر سکنڈری کی کلاسوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ نہ صرف طلبار کی تعداد میں اضافہ ہوگا بلکہ وہ دوسری صنعتوں میں مہارت بھی حاصل کر سکیں گے۔ جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ طلبار اپنا تعلیمی بار خود برداشت کر سکیں گے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اونچی تعلیم کے حصول کے لئے طلبار کی تعداد بھی بڑھے گی۔ والدین بھی اپنی اولاد کو اونچی تعلیم دلانے کی طرف راغب ہوں گے۔ اس طرح تعلیم کے ساتھ روزگار فراہم کرنے سے نہ صرف ملک معاشی میدان میں ترقی کریگا بلکہ ہمارا عظیم مسئلہ بیروزگاری بھی کسی حد تک حل ہو سکے گا۔

اس دور میں سائنس اور تکنولوجی میدان میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان حالات میں ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جس سے ہم نہ صرف نئی نئی چیزوں سے جانکاری حاصل کریں۔ بلکہ اس میں کچھ اضافہ بھی کریں۔ ہندوستان میں پہلے ہی تعلیم ناکافی ہے۔ پھر بھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اس بات کے لئے بالکل تیار نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال سکے۔ اس بات کی نشان دہی اس بات سے ہوتی ہے کہ ہمارے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اور دفتروں میں کام کرنے والے افسران کسی بھی تبدیلی سے گھبراتے ہیں۔ مثلاً کسی نئی تکنیکی مشینوں کے استعمال میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں نئی نئی تکنیکیں درآمد کرنے کی باتیں کی جاتی ہیں۔ جس میں ہمارے ملک کا زرِمبادلہ خرچ ہوتا ہے۔ حالانکہ دوسرے ملکوں سے نئی نئی تکنیک کو درآمد کرنا ایک اچھا طریقہ ہے اور اس نے ہمارے ملک کی معاشی ترقی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ابھی تک ہمارے ملک نے جو ترقی کی ہے اس کا بیشتر حصہ دوسرے ملکوں کے سر ہے۔ اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کے سائنسدان اور نئی نئی تکنیک جاننے والے اپنے ملک میں اچھی اور اونچی نوکری کے مواقع نہ پاکر دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں۔ کوشش یہ کی جانی چاہئے کہ ان کو ہندوستان ہی میں مواقع فراہم کرکے ملک کی ترقی کے کاموں میں لگایا جائے۔

ہم دوسرے ملکوں سے تکنیک (Import) درآمد کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں سوچتے کہ آیا یہ تکنیک ہمارے ملک کے لئے مناسب و موزوں بھی ہے کہ نہیں۔ بغیر اس کے سوچے سمجھے آج تک ہم نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ نئی نئی تکنیک کی درآمد سے گریز کیا جانا چاہئے۔ اور اپنے ہی ملک میں موجودہ تکنیک کو استعمال کیا جائے۔ اور اس میں اضافہ کیا جائے۔

آخر میں یہی کہا جائے گا کہ معاشی ترقی کے لئے تعلیم ازحد ضروری ہے۔ ہندوستان اس وقت ترقی کی راہ پر ہے اور ایسے وقت میں تعلیم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ تعلیم کے حصول کے لئے کوئی کوتاہی نہیں برتنی چاہئے خواہ وہ پرائمری، سکنڈری، یونیورسٹی سطح کی، سائنسی و ٹیکنولوجیکل ہو۔ ایسے مواقع ہاتھ سے نہ جانے دیئے جائیں جس میں ایسے ذرائع کو جن سے گاؤں دیہاتوں میں جہاں ابھی تک تعلیم کے حصول کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہوا جو ہونا چاہئے، استعمال میں لایا جائے۔ ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا پروگرام تیار کیا جائے جس میں تعلیم کو جدید سے جدید طریقوں سے روشناس کرانے کی کوشش کی جائے۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم جہالت کے خلاف جنگ چھیڑ دیں۔ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو کالجوں اور دوسرے صنعتی اداروں سے آنے والے طلبار کو بتا سکے کہ وہ کس جگہ مناسب رہیں گے اور ان کو ان کی صلاحیت و قابلیت کے مطابق لگانے میں ایسے سینٹر مددگار ثابت ہوں۔ اس کے ساتھ اس بات کو یاد رکھا جائے کہ ایسی تعلیمی اسکیم بنائی جائے جس میں تعلیم کے ساتھ روزگار
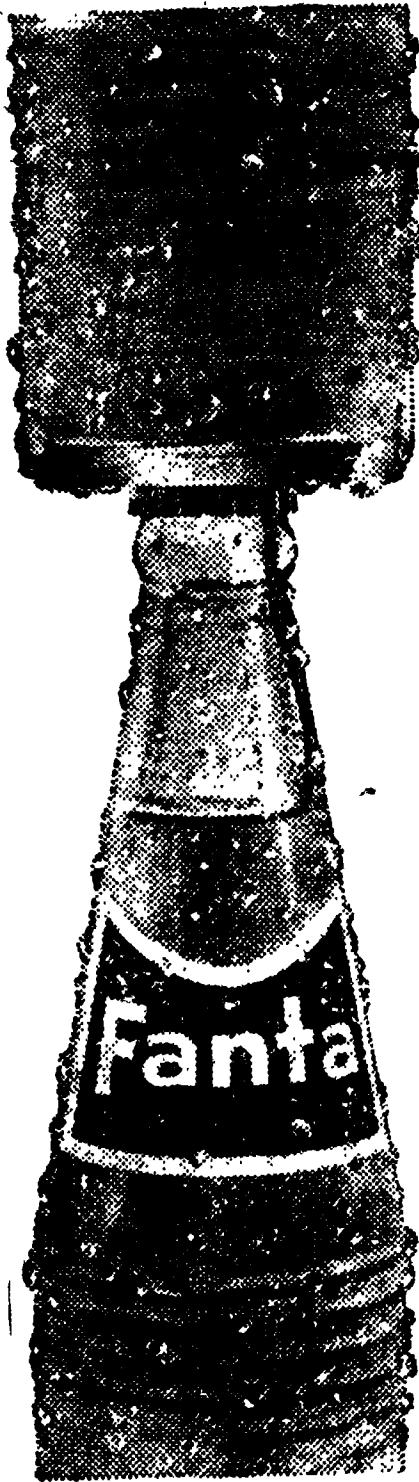
# DID YOU EVER TASTE A BOTTLE OF FUN?

FANTA ORANGE TASTES SO GOOD, IT'S FUN TO BE THIRSTY.

# پردۂ الفاظ کے پیچھے

محمد راشد انصاری
مندھوروی :

## گول

آپ جانتے ہو گول کن کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے ، آپ کہتے ہیں زمین گول ہے ۔ آپ گول ہو جانا بھی محاورہ عام طور پر استعمال کرتے ہیں اور کسی شخصیت کے بارے میں بتلاتے ہوئے گول چہرہ بھی استعمال کرتے ہیں ۔ دائرے کی شکل میں اگر کوئی چیز آپ کے سامنے موجود ہو تو اسے بھی آپ گول ہی کہیں گے ۔ اس طرح آپ بہت سی جگہ لفظ گول استعمال کرتے ہیں ، لیکن آپ یہ معلوم کر کے شاید حیران ہوں گے کہ فارسی میں گول کے معنی ہیں ، احمق ، نادان ، مکر و فریب ، اب بتائیے مروجہ معنی کہاں سے آ گئے ۔ بہرحال یہ معنی جہاں سے بھی آئے انہیں صحیح ماننے پر مجبور ہیں اس کے علاوہ واؤ غیر محفوظ چھوٹے تالاب کو بھی گول کہتے ہیں ۔ اور فقیروں کے اوڑھنے کی کملی بھی اس کے معنی ہیں ، اسی طرح معنی مذکور کو دیکھتے ہوئے کسی فلمی شاعر نے ٹھیک کہا ہے کہ :

" یہ دنیا گول ہے "

دسمبر [illegible]ء

## زُہرا

اس لفظ کے استعمال میں بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے ، تھوڑے سے فرق سے ہی معنی بالکل مختلف ہو جاتے ہیں زَہرا کے معنی ہیں (زبر کے ساتھ) چمکدار روشن اور یہ حضرت فاطمہؓ بنتِ رسول اللہؐ کا لقب ہے یعنی فاطمہ الزہرا ، ایک لفظ ہے زُہرہ (پیش کے ساتھ) جو مشہور ستارہ کا نام ہے ، اسے فارسی میں ناہید کہتے ہیں ۔ ایک مشہور روایت کی رو سے یہ ایک عورت کا نام بھی ہے ۔ جس پر روایت کے مطابق دو فرشتے ہاروت و ماروت فریفتہ ہو کر مبتلائے مصیبت ہوئے تھے ، اس کے معنی حسن اور سفید رنگ بھی ہے ۔ زہرہ (زبر کے ساتھ) عربی میں شگوفہ ، خوبی ، آرائش ، تازگی کے معنی آتے ہیں اور پیش کے ساتھ فارسی میں دلیری شجاعت اور قوت کے معنی آتے ہیں

ایک لفظ زہرہ ہے جسے اردو میں پتہ کہتے ہیں ۔ یہ جسم کے اندر ایک عضو ہے جس میں نیلے رنگ کا تلخ پانی بھرا ہوتا ہے ۔ اس سے مراد لی جاتی ہے ، جرأت حوصلہ مندی ۔ مثلاً کہتے ہیں ایسا کس کا زہرہ ہے کہ اسے رد کرے اسی سے محاورہ بنا ہے ۔ زہرہ

[illegible]

مظالم ایسے ظلموں کو کہتے ہیں جو پتے کو پگھلانے والے یعنی بے حد گھبراہٹ پیدا کرنے والے ہوں۔

## طوائف

یہ طائفہ کی جمع ہے، طائفہ گروہ اور منڈلی کو کہتے ہیں طوائف بہت سے گروہ اور منڈلیوں۔ اردو میں اس کے معنی ہوں کے ناچنے گانے والی

عورت [illegible] ہوتا ہے یعنی طوائف ناچنے گانے والی عورت کو کہتے ہیں ۔ اس لفظ کی اصل طوف ہے جس کے معنیٰ ہیں گھومنا اور چکّر لگانا، اسی سے وہ طواف بنا ہے جس کا مطلب ہے خانہ کعبہ کے گرد خاص نیت اور خاص طریقے سے چکر لگانا

••

---

# غزل —— صباح الدین اختر شہزاد

یہ حسین پرکیف لمحے غم میں بدل جائیں گے
یاد کی شمع بنے غم میں پگھل جائیں گے

جب بھی آئے گا تجھے میری محبّت کا یقیں
صورتِ اشک تری آنکھوں میں مچل جائیں گے

تم مسیحا نہ بنو، غم کا مداوا نہ کرو،
ہم ہی زخموں کو لئے دور نکل جائیں گے

تو ذرا ایک نظر دیکھ تو اُن کی جانب
بس تری ایک نظر ہی سے سنبھل جائیں گے

آج بھی اپنی محبّت پہ ہوں نازاں شہزاد
دل کو دھڑکا تھا یہی آپ بدل جائیں گے

# خاموشی

ق - وسین، متعلم، بی۔ اے
(لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ)

ٹھیک دو مہینے بعد آج کالج کھلا ہے۔

مگر نہ اب وہ پہلی خوشی ہے نہ مسرت، مجھے ہر طرف خاموشی ہی خاموشی نظر آرہی ہے میں اس کالج میں چار سال سے پڑھ رہا ہوں، جب پتاجی کا تبادلہ "بھروا" سے کرشنانگر ہوا، اس وقت میں نے ترکھون کالج کی نویں کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ اور اب میں نے انٹر پاس کر لیا ہے اس سال ڈگری کورس شروع کروں گا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ فکر بھی لاحق ہے کہ پرانے ساتھی نہ جانے کہاں سے B. A. کر رہے ہیں، ان کی جدائی کا احساس بری طرح میرے دل کو ملول کر رہا ہے۔ میں کوئی قطعی فیصلہ کر کے اپنے دل کو مطمئن نہیں کر پا رہا ہوں۔

صبح کے نو بجے ہیں، میں کپڑے بدلے جلدی جلدی تیار ہو کر، کالج کی جانب روانہ ہو گیا۔ آج یاسمین بازار بھی بے رونق لگ رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو تیز بارش ہو گئی تھی، اس کی وجہ سے بازار کی سڑکیں بے رونق ہو گئی تھیں۔ گڑھوں میں جگہ جگہ پانی بھر گیا تھا۔ اور امیر لوگوں کی تیز رفتار سواریاں بڑی بے دردی سے پیدل چلنے والوں کو نہلاتی گزر جاتی تھیں۔

میں کالج کے گیٹ پر پہونچا تو میرے سامنے ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ نئے اور پرانے چہروں پر مشتمل، میرا دل جذبات سے پر تھا اور میں لمبے لمبے ڈگ بھر کے گھڑی بھر کے اس اژدہام میں کھو کر رہ گیا، پھر کسی کو تلاش کرنے لگا۔ کچھ جانے والے ملے مگر رسمی علیک سلیک کے بعد غائب ہو گئے۔ ہر کوئی اپنے بھتیجے، بھانجے اور چھوٹے بھائیوں کے داخلے کے چکر میں تھا۔

میں اکیلا کھڑا کھڑا بور ہونے لگا تھا، اس لئے دھیرے سے سرک کے نوٹس بورڈ کے پاس پہنچ گیا کہ دیکھیں، B.A. میں اب تک کتنے نام آچکے ہیں۔ شیشے کی کیس میں لگے ہوئے نوٹس کو غور سے پڑھنے لگا۔ یہ نوٹس داخلے کی تاریخ بڑھ جانے کا تھا۔

نوٹس نمبر ۲ "نیپال (Nepal) سوشل سروس لیگ" کا اشتہار تھا۔ کچھ انڈر پاس گریجویٹ روں

دھری اور مس روحی جیسی بد ذوق نے بھی بہانہ
ہیں گیا۔ شہر سے دور "چھروا" جیسے سرسبز و
شاداب مقام سے کس کا دل اچاٹ ہوتا ہے
ہرے کھیت، پاس بہتی ہوئی بن گنگا، ندی
کے کنارے مہوے کے باغوں سے عجیب سی
خوشبو آ رہی تھی۔

صبح کی نرم نرم ہوائیں درختوں اور کھیتوں سے
اٹکھیلیاں کر رہی تھیں اور پتوں میں دلکش
نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔ آموں کے پیڑوں میں
بور آنے شروع ہو گئے تھے، جنہیں چھو کر ہوائیں
فضا میں تیز خوشبوؤں کا سیلاب بکھیرتی چلی
رہی تھیں۔ ہر کوئی اس حسین منظر سے مسحور
ہوا جا رہا تھا۔ کچھ بد ذوق تاش کھیلنے میں جٹ
گئے تھے۔ چودھری اور روحی نہ جانے کس بات
پر قہقہہ لگا رہی تھیں۔ رتنا اچک اچک کر ایک
درخت کی لٹکی شاخ کو پکڑنے کی کوشش کر
رہی تھی جسے۔ شاہد، گنگا دھر، سب کھڑے
جیسے غور سے دیکھ رہے تھے شاید یہ لوگ کوئی
کھیل کھیل رہے تھے۔ میں ندی کی طرف بڑھ آیا
تھا۔ آج پانی کتنا ساکت تھا، بالکل امیتا
جیسا سنجیدہ۔ امیتا کا خیال آتے ہی میں اس
ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ اسے پا لینے میں کوئی
خاص دقت محسوس نہیں ہوئی۔ مجھ سے تھوڑے
فاصلے پر گھنے پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھی ٹرانسسٹر
سن رہی تھی۔ میں چپ چاپ جا کر اس کے پاس
کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری جانب مسکرا کر
دیکھا۔

"امیتا جی کتنا سہانا منظر ہے، لگتا ہے حسن
کی دیوی یہاں سما گئی ہو!"

"مجھے یہ منظر بہت پسند ہے۔" اس نے
جملہ بہت آہستہ ادا کیا

میں نے ایک گلاب کا پھول جو اپنے ساتھ
شہر سے لے آیا تھا، ہمت کر کے اس کے
بالوں میں لگا دیا۔ وہ گھبرا کر میری طرف دیکھنے لگی۔
میں اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا،
کہ کب اٹھیں اور پھول نوچ کر پھینک دیں، مگر
نہیں، وہ ایسا نہ کر سکی۔ اسے بھی شاید مجھ سے
کچھ انس ہو گیا تھا۔ یکایک وہ گھبرا کر کھڑے ہونے
کی کوشش کرنے لگی اس کا دوپٹہ ڈھلک کر
زمین پر گر گیا تھا۔ اس کے ریشمی بال لہرانے لگے،
بھویں تن گئیں، آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں، میں
بڑے اطمینان سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں
میں جکڑے بیٹھا تھا۔

"امیتا جی ــــ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں،
اس سہانے منظر سے بھی کہیں زیادہ، اور معلوم
نہیں جذبات میں کیا کیا کہہ گیا تھا وہ چپ
چاپ بیٹھی رہی، پھر بول پڑی:

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں" لاری" بالو۔
دیکھئے ہاتھ چھوڑ دیجئے، "پلیز" کوئی دیکھ نہ لے،
اس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چاہے ساری دنیا دیکھ لے "امیتا جی" مجھے کسی
کا خوف نہیں میری گرفت اور سخت ہو گئی تھی۔
لیکن فوراً مجھے کچھ ہوش آ گیا، میں نے ہاتھ ڈھیلا
کر دیا۔

"یہ تڑپ برداشت سے باہر ہو گئی تھی" امیتا
اس لئے اظہار کر دیا اگر ناگوار گزری ہو تو معاف
کر دینا۔"

میں الگ ہٹ آیا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی
تھیں۔ اس کے لب دھیرے سے ہلے۔ "آخر میں بھی
تو دل رکھتی ہوں:"

اور پھر میں نے محبت کی بازی جیت لی میرے
خیالات کا سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ کہ ایک آواز نے

چونکا دیا۔ ایک جانی پہچانی آواز جس سے خیالات کے تانے بانے ٹوٹ گئے۔
دیکھا تو سامنے کالج کا چپراسی دروازہ بند کرنے جا رہا تھا۔
"بابو جی، ایک بج رہا ہے۔ سب لوگ بھی چلے گئے"۔
میں بوجھل قدموں کے ساتھ کلاس سے باہر آیا۔ ساری بھیڑ بھاڑ ختم ہو گئی تھی۔ اِکّا، دُکّا لڑکے اب بھی آفس کے پاس کھڑے تھے۔ یہ وہی کالج ہے جہاں ہم صبح و شام خوشی سے چہکتے پھرتے تھے۔ اس کا ایک ایک لمحہ خوشگوار ہوتا تھا۔ مگر اب یہاں قدم رکھتے ہی وحشت معلوم ہونے لگتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہ ماحول مجھے ڈس لے گا۔ اس کا ایک ایک لمحہ میرے لئے پہاڑ ہو جاتا ہے۔ اس کے ہر ایک گوشے سے اجنبیت کی بو آ رہی ہے۔ نہ کوئی ساتھی ہے نہ ہمدم، بس میں ہوں، تنہا۔ بالکل تنہا... میرے ہونٹوں پر کسی نامعلوم شاعر کا یہ شعر آ جاتا ہے... اس نے شاید میرے لئے ہی کہا ہوگا۔

ساحل کی خاموشی کہتی ہے
ساحل پہ تمہارا کوئی نہیں

---

دلدار جسپوری
(نینی تال)

# قطعات

○

فہم و ادراک کا تقاضہ ہے
روز اِک انقلاب پیدا کر
ابنِ آدم ہے تو ترا حق ہے
کچھ تو اپنا جواب پیدا کر

○

کتنے بھولے ہیں کیسے ناداں ہیں
بے وجہ التفات کرتے ہیں
سانس لینا بھی ہم کو بھاری ہے
لوگ جینے کی بات کرتے ہیں

○

اس قدر محوِ یاد رہتا ہوں
جھلملاتے ہیں اشک پلکوں میں
عکس تیرا دکھائی دیتا ہے
شام کے سرمئی دھندلکوں میں

○

سازِ ہستی پہ گیت گا جاؤ
سحرِ اعجاز بن کے چھا جاؤ
وقت مہماں ہے چند لمحوں کا
اب تو دلدار آ جاؤ، آ جاؤ

# تمہاری تصویر

چاند کا رات پہ چھایا ہوا پر نورِ شباب
جگمگاتے ہوئے رنگین نظاروں کا ہجوم
یہ مہکتی ہوئی رنگین و دل آویز فضا
گدگداتی ہوئی احساس کو بھینی سی ہوا
بحرِ تخئیل کی بے پایاں روانی بے بحر
سوچتا ہوں کہ اس عالم میں کوئی نظم کہوں

لیکن افسوس تمہاری ہی کمی کا احساس
منتشر کرکے رہا میرا نظام تخئیل
کیا کروں میں کہ وہی ہجر و الم کے لمحے
ذہن و افکار پہ چھائے ہیں قیامت بنکر
پھر وہی ہوک سی اٹھتی ہے مرے دل کے قریب
پھر وہی درد، وہی سوزِ جگر ہے پیدا
آگ برساتا ہے ہر سمت نظاروں کا جمال
یہ ستارے بھی تو ہنس ہنس کے رلاتے ہیں مجھے
اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا
میری الفت، مری چاہت کا اڑاتی ہے مذاق
ایسے عالم میں ذرا تم ہی بتاؤ مجھ کو
کیسے الفاظ میں ڈھالوں میں تمہاری تصویر

ماہ عالم
بی اے (آنرز) سالِ دوم
دھلی کالج دھلی

# تلخ یاد

گرتے ہوئے ویران کھنڈر میں
بکھری ہوئی یادوں کا جمود
سلگتی ہوئی خلش سے اٹھتا ہوا
افسردگی کا عمیق دھواں
گرتے ہوئے در و دیوار تلے
مسمار ہوتی آرزوئیں
آتشی آہیں
تڑپتی ہوئی ہوک، اور اس پہ ستم
ڈستی ہوئی تنہائی
نحیف بے حرکت وقت
دل کو تڑپانے کے لئے
پھر اک یاد، خیالات میں ابھری

زاہدہ نسرین
دھلی کالج دھلی

# مرجھائی کلی

**تاجور بانو** طالبہ جماعت نہم
گورنمنٹ گرلز اسکول، تبلیغی خانہ
دلی

"تم ابھی تک نہیں سوئیں یاسمین، کیا بات ہے؟" سینی ٹوریم کی آن ڈیوٹی نرس نے یاسمین کو کروٹیں بدلتے دیکھ کر پوچھا۔ یاسمین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور نہایت لاچاری و بے چارگی کے عالم میں بولی۔

"کیا کروں سسٹر نیند جو نہیں آتی۔"

"آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ، نیند اپنے آپ آجائے گی۔ اگر سوؤ گی نہیں تو اچھی کیسے ہو گی۔"

"نہیں" یاسمین چیخی "میرا دل کہتا ہے کہ میں اب کبھی اچھی نہ ہو سکوں گی۔"

"چھی بری بات، یاسمین ایسی باتیں نہیں کیا کرتے اور ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے جو موت کی خواہش کر رہی ہو۔ دیکھو رات کافی ہو چکی ہے۔ بس اب تم سو جاؤ۔" نرس نصیحت کر کے چلی گئی۔ یاسمین نے نرس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں، مگر نیند کوسوں دور تھی۔

یاسمین کو سینی ٹوریم میں داخل ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے مگر اس کی حالت سدھرنے کے بجائے دن بدن بگڑتی جا رہی تھی، ڈاکٹروں اور اسپتال کے دیگر عملے کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں، وہ سب اس کو بچانے میں ہمہ تن مصروف تھے اور موسم بہار کی اس معصوم کلی کو مرجھانے نہیں دینا چاہتے تھے۔ مگر ان کی تمام کاوشیں تاہنوز بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔

نیند یاسمین کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ آنکھیں کئے کروٹیں بدل رہی تھی اور اس کا ذہن بیتے دنوں کے حسین لمحوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

یاسمین سیکنڈ ایر میں پڑھتی تھی، بہت خاموش اور پڑھاکو مشہور تھی۔ کالج میں لڑکے اس سے بات کرنے کے لئے ترستے تھے، اس سلسلے میں یہ بڑی ان سوشل (un socially) واقع ہوئی تھی نہ کسی سے بات کرتی اور نہ ہی کالج میں زیادہ دیر ٹھہرتی، اس کی یہ حالت دیکھ کر کالج کے شریر لڑکوں نے اس کا نام (The Dumb Beauty) گونگا حسن رکھ دیا تھا

اچانک انور اس کی زندگی میں چور راستے سے داخل ہوا اور اس کے دل پر قبضہ کر کے حکومت کرنے لگا، گونگے حسن کو زبان دی۔ یاسمین انور کو خود پر اس درجہ مسلط دیکھ کر مبہوت رہ گئی اور پھر والہانہ پیار کرنے لگی — اور وہ دونوں ایک دوسرے کی

بن گئے۔

یاسمین کے حالات نے بی، اے کے بعد سلسلہ
ری رکھنے کی اجازت نہ دی اور مجبوراً اسے
ی کرنی پڑی۔ الور آسودہ حال خاندان کا واحد
چراغ تھا، مزید تعلیم کے لئے اس کو ولایت
گیا۔

جس دن الور ولایت کے لئے فلائی کر رہا تھا۔
دن تمام رات یاسمین سو نہ سکی، اور اپنی آنکھوں
پنے دامن کو تر کرتی رہی۔ اگلے دن جب جب
امہ الور سے اس کی ملاقات ہوئی وہ دیکھکر سکتہ
رہ گیا اور سمجھانے والے لہجے میں گویا ہوا —
بگلی تو رو رو کر کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے میں
پر تھوڑا ہی جا رہا ہوں میں تو اپنے مستقبل
ید تابناک بنانے اور خود کو کسی قابل بنانے
رہا ہوں، دو ہی سال کی تو بات ہے، پلک
لتے بیت جائیں گے پھر... پھر... جانتی ہو
ہوگا، بے وقوف لڑکی —"

"کیا ہوگا — ؟" یاسمین نے نہایت معصومیت
کہا۔

"پھر — پھر —" الور نے بولنا شروع کیا "ہم
دن ایک ہو جائیں گے، الگ مکان ہوگا، میں ہوں
تم ہونگی، اور آنگن میں کھیلتے ہوئے ہمارے
— " الور نے یہ بات اس انداز میں کہی کہ یاسمین
بے ساختہ ہنسی آگئی۔

ہنسی کو یاسمین کے خوبصورت چہرے پر کھیلتے دیکھ کر
نے فرطِ جذبات میں بے ساختہ یاسمین کو گلے لگا لیا۔
فوراً ہی یاسمین اس کی گرفت سے آزاد ہوگئی۔ شرم
حیا کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا

"دیکھو یاسمین تم اسی طرح ہنستی رہنا، غم مت کرنا
تم نے مجھے آنسوؤں کے ساتھ رخصت کیا تو یاد رکھو کہ
کہیں کا نہیں رہوں گا۔ اور تمہاری یہ افسردگی میرے
مستقبل کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے، تم مسکراؤ کہ اسی میں
میری کامیابی ہے۔ اچھا خدا حافظ — اور ہاں دیکھو میرے
خطوں کا جواب ضرور دیا کرنا۔ الور چلا گیا، یاسمین اس
کے جانے کے بعد بے انتہا روئی۔

الور نے وہاں پہنچنے کے بعد ایک خط بھی نہیں بھیجا یہ اس کے
دل کو مغموم اور افسردہ کرنے کیلئے کافی تھا، وہ اداس اداس
رہنے لگی۔ اسکی یہ حالت دیکھکر ماں کو تشویش لاحق ہوئی اسکے
لئے اچھے اچھے رشتے آئے مگر اس نے ہر رشتہ ٹھکرا دیا۔
وہ تو الور کی تھی، وہ الور کے ساتھ بیوفائی کیسے کر سکتی ہے۔
آہستہ آہستہ الور کو گئے چار سال کا طویل عرصہ گزر گیا مگر
اس کا کوئی خط، کوئی خیریت نہیں آئی۔ ایکدن ماں نے اسے
سمجھاتے ہوئے کہا، بیٹی میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں تو میرے
سامنے ہی شادی کرلے اس نے اسکے جواب میں ماں سے صاف
صاف کہدیا کہ مجھے شادی وادی نہیں کرنی وہ دن بدن
الور کی فکر میں گھلتی رہی، گھلتی رہی۔

ایکدن ڈاکٹر نے اسکی ماں کو مشورہ دیا کہ وہ اسے فوراً سینی ٹوریم
میں داخل کرادیں — یہاں آتے ہوئے بھی اسکو چھ ماہ کا عرصہ گزر
گیا تھا، اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے کب یاسمین کی آنکھ لگ گئی
علی الصبح جب اسکی آنکھ کھلی تو اس کے چاروں طرف ڈاکٹر و نرسیں
کھڑی تھیں اور ماں سرہانے بیٹھی تھی اس کے کپڑے خون میں لت
پت تھے، غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ابھی ابھی خون کی قے ہوئی ہے۔
بیٹی کی آنکھ کھلی دیکھ کر ماں نے اسے چمٹا لیا "میری بچی
کو بچا لو ڈاکٹر، یہ تو ابھی معصوم کلی ہے۔

عین اسی وقت الور دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔
"یاسمین۔ پیاری یاسمین۔ خدا کے لئے مجھے معاف کردو۔ میں
تمہیں سب کچھ بتا دونگا۔ آنکھیں کھولو" یاسمین نے ہلکے
سے آنکھیں کھولیں "ارے... الور... تم... آگئے... بہت
دیر کردی... تم نے... الور... بہت دیر..." اور ایک
ہچکی کے ساتھ اس کی گردن ایک طرف کو لڑھک گئی۔ —
سنگدل ڈاکٹر بھی اس معصوم کلی کے مرجھا جانے پر
آنسو بہائے بنا نہ رہ سکے۔

شاہجہاں دہلی

# تلاشِ منزل

نایاب الدین
دلی کالج

وہ جارہی تھی ــــ ہاں وہ جارہی تھی۔ اپنا سب کچھ چھوڑکر، ایک نئی منزل کی تلاش میں۔ بس ایک ننھی سی جان اپنی کوکھ میں لئے ہوئے جو اس کی غلطی اور اس کے گناہ کا ثمر تھا۔ وہ گھر کی چہار دیواری میں رہ کر بھی ایک بدچلن لڑکی بن گئی تھی۔ وہ بدچلن تھی کہاں؟ ـــــ سماج نے اور زمانہ نے اس کو یہ راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔

وہ میری پڑوسن تھی۔ بڑے لاڈ پیار کی پروردہ، میں اس کو پانچ سال سے جانتا تھا۔ بھولی بھالی، کشادہ چہرہ، بادامی آنکھیں، کمر تک لٹکے ہوئے سیاہ بال، گورا چٹا رنگ، کسی حد تک خوبصورت تھی۔ علاقے میں ہر شخص کی نگاہ اس پر اٹھتی، لیکن اس نے کبھی کسی کو نظر بھر کر بھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اب وہ حالات کے ہاتھوں بک گئی تھی۔ مجھے بہت عزیز تھی اپنے گھر والوں کی طرح جس کے ساتھ میں نے زندگی کے رات دن گزارے تھے، ہاں وہ میری شاگرد بھی رہ چکی تھی انگریزی اور الجبرا کی، کیوں کہ عام طور پر لڑکیاں حساب میں کمزور ہوا کرتی ہیں۔ اس کو کسی قدر مجھ سے محبت ہو چکی تھی، مگر میں اس کی محبت سے

بالکل بے خبر تھا۔ پڑھائی کے بعد وہ دُنیا و جہاں کی باتوں میں کھو جاتی اور میں ان میں الجھ کر سب کچھ بھول جاتا کبھی وہ ٹیک لگا کر اپنی زلفوں کو بکھیر دیتی اور میں اُن سے کھیلنے لگتا۔

ایک شام میں کالج کی ایک ارجنٹ میٹنگ میں گیا ہوا تھا جہاں سائنس کے طلباء کو ایک لیکچر دینا تھا، جلدی میں اس سے نہ کہہ سکا، جب واپس لوٹا دیکھا وہ میرے بستر پر لیٹی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور کتاب الٹی سیدھی بند کرکے شیلف میں اڑس دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، اس کے جذبات ابھر رہے تھے اور وہ انگڑائیاں توڑتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ کافی دیر کے انتظار کے بعد تک وہ نہ آسکی، جب میں اسٹڈی کے لئے بیٹھا تو معلوم ہوا، وہ کتاب سیکس کی تھی، جس میں کچھ جنسیاتی فیچر بالتصویر تھے۔ ایسی کتابیں مجھے قطعی پسند نہ تھیں۔ لیکن ایک سائنس کے پروفیسر ہونے کے ناطے ان کا مطالعہ بہت ضروری تھا۔ مجھے افسوس ہوا، لیکن ہر طرح مجبور تھا۔ دوسرے دن وہ میرے پاس نہیں آ

ہاں ایکبار جھانک کر ضرور بھاگ گئی تھی۔ کچھ شرارت بھری مسکراہٹ لئے۔ جب اگلے روز میرے پاس آئی تو اس کی آنکھوں میں ایک بلا کی شرم تھی، وہ مجھ سے آنکھ نہ ملا سکی، لیکن کچھ دیر بعد اس کے انداز و زاویئے بدلنے لگے اور وہ صرف تین سوال حل کر کے بیٹھ گئی۔ اور پھر۔۔۔ پھر اپنی گھنیری زلفوں کے پھندے بنا کر ان سے کھیلنے لگی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور اس کا بدن انگڑائیاں توڑ رہا تھا اس نے مجھے گھورا اور ایک شرارت بھری مسکراہٹ لئے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے اس کی یہ حرکتیں بالکل پسند نہ تھیں، کیونکہ میں نے اس کو گھر کا ایک فرد سمجھا تھا۔ وہ اب پڑھائی سے زیادہ باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ اور ایک اچھی طالبہ ہو کر ادھر سے بھٹک رہی تھی اس کے قدم ایک نئی منزل کی طرف گامزن تھے۔ اس نے پڑھائی ترک کر دی، اس کے سینے میں جوان امنگیں مچلنے لگیں اور وہ ایک پیاسی روح کی طرح ادھر ادھر بھٹکنے لگی۔

۱۷ نومبر کی اس بھیانک تاریک رات کے سناٹے میں ایک شور اٹھا درد بھری آہیں فضا میں بکھرنے لگیں، لوگ بیدار ہو کر اس کے گھر کی طرف دوڑنے لگے۔ دیکھا وہ ایک ہجوم میں اپنی ماں کے سرہانے بیٹھی رو رہی تھی، اس کی آواز سے خاموش فضا میں اداسی چھانے لگی۔ اس کی ماں چل بسی تھی جس کو ٹی بی کی بیماری تھی، اور جو اپنی جوان لڑکی کی فکر میں دن رات گھل رہی تھی، جس کا بوجھ اس کے بعد کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔ آج وہ تنہا رہ گئی تھی، صرف دو چھوٹے بھائی اس کے ساتھی تھے اور ایک ننھی سی بہن، بوڑھیاں اسے دلاسہ دے رہی تھیں، مگر وہ ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑک پھڑک کر اپنا غم ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رات خاموش سے خاموش تر ہوتی گئی صرف آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیاں چیخ چیخ کر اس کا سکوت توڑ رہی تھیں، وہ اپنی مردہ ماں کو بری طرح گھور رہی تھی، جیسے اس کی تصویر ہمیشہ کے لئے اپنے دل پر نقش کر رہی ہو۔ اب وہ خاموش تھی بالکل خاموش، سکتہ کا عالم طاری تھا اور گھر میں چند عورتیں باقی رہ گئی تھیں۔ اچانک فضا میں ایک آواز گونجی۔ "ہائے میری پیاری امی" اور سب کے دلوں کو چیرتی ہوئی یہ آواز خاموشی میں گم ہو گئی۔

کچھ روز اسی طرح گزر گئے، وہ اپنے بھائی، بہن کے ساتھ ایک سادہ زندگی گزارتی رہی۔ آس پڑوس کی عورتوں نے ہر طرح کا خیال رکھا، لیکن یہ کب تک ممکن تھا۔ آہستہ آہستہ سب کنارہ کش ہو گئیں اور وہ معاشی حالت بگڑنے کی وجہ سے پریشان رہنے لگی تھی، بھائیوں کی پڑھائی ترک کرا کے کاروبار میں لگا دیا تھا تا کہ کچھ سہارا ہو سکے۔

ایک روز میں کمرے میں بیٹھا اسٹڈی کر رہا تھا وہ میرے پاس آئی، بڑی مایوس تھی، دیوانوں کی سی حالت بنائی تھی۔ بکھری ہوئی زلفیں، پھیکا پھیکا رنگ، آنکھوں کے گرد حلقے، زردی مائل رنگ، اس کا سارا شباب ڈھل چکا تھا۔ اور وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ "ارے تم اپنا بھی تو کچھ خیال کرو۔ اتنا غم نہیں کرتے، کیوں کہ مردہ کو تکلیف پہنچتی ہے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی، "پروفیسر صاحب اب مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔ کاش تم مجھے سہارا دے سکو، میں بے سہارا ہوں، مجھے سہارا دو پروفیسر، مجھے سہارا دو" وہ جذبات کی رو میں بہہ چلی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں

کے آنسوؤں کے بہتے سیلاب میں ڈوب کر رہ گئیں۔
میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے طوفان موجیں مارنے لگے، اور میں اس کی ہر طرح سے مدد کرتا رہا۔ کچھ عرصہ تو وہ گھر کی چہار دیواری میں رہی لیکن، پھر وہ گھر سے غائب رہنے لگی تھی۔ گھنٹوں تک اس کا کہیں پتہ نہ چلتا۔ ڈر تھا، کہیں اس کے جوان سپنے، جواں جذبات اور سینے میں مچلتی ہوئی امنگیں کسی غلط راہ پر نہ موڑ دیں۔
کیوں کہ اس کو ایک سہارے کی ضرورت تھی، وہ آسانی سے بہک سکتی تھی۔ وہی ہوا اس نے کچھ لوگوں سے تعلقات جوڑ لئے جو صرف وقتی تھے جو اس کے مستقبل پر ایک بدنما داغ تھے۔ ہر زبان پر اس کے چرچے ہونے لگے۔ اور ہر شخص کی انگلی اس پر اٹھنے لگی۔ بہت سمجھانے کے بعد وہ نہ سنبھل سکی، اور جوانی کے جوش میں ایک تیز دھارے کی طرح بہتی چلی گئی۔
اس نے ایک بار پھر سہارا مانگا، لیکن اب میں کچھ سوچنے پر مجبور تھا۔ کیوں کہ ایک بے سہارا کو دنیا سہارا دے سکتی ہے، لیکن ایک بد چلن اور آوارہ لڑکی کو کوئی پناہ نہیں دے سکتا ہے۔ ہاں اس کے جذبات سے سب کھیل سکتے ہیں، اس کو سنہرے خواب دکھا کر اس کی عظمت لوٹی جا سکتی ہے، لیکن اس کی تعبیر کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ اس کی ان حرکتوں نے میرے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا، اب اس کا میرے تنہا کمرے میں داخل ہونا تک پسند نہ تھا میں اس سے دور رہنے لگا، کیوں کہ اس نے میری ہر نصیحت کو ٹھکرا دیا تھا، پھر بھی روپیہ پیسے سے اس کی مدد کرتا رہا۔ کیوں کہ:
"غریبی اور بے روزگاری ہی انسان کو غلط راستہ دکھاتے ہیں" —— اور وہ بھی اس راہ سے نہ بچ سکی۔
ایک شام ایک اجنبی شخص کو اس کے گھر سے نکلتے دیکھا، میرا یہ اندازہ کسی طرح غلط نہ تھا کہ اس کے اس سے ناجائز تعلقات تھے۔ تقریباً ۵ ماہ سے۔ جو کئی راتیں بھی یہاں گزار چکا تھا۔ وہ اپنے گھر میں تنہا تھی اس لئے ہر کوئی اس کے مچلتے ہوئے جذبات سے کھیل جاتا، صرف چند سکوں کے عوض —— لیکن کوئی اس کو سنوار نہ سکا، اور وہ بگڑتی ہی چلی گئی
ایک بار پھر لوگوں کی انگلیاں اس پر اٹھیں اور حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے، اس کے سائے تک سے بچنے لگے۔ اب وہ لڑکی سے عورت بن چکی تھی، جس کی کوکھ میں ایک ننھی سی جان پرورش پا رہی تھی، جس نے دنیا کی نگاہ میں اسے رسوا و بدنام کر دیا تھا، اور جو بہت کوشش کے باوجود بھی دب کر نہ رہ سکی اور ایک دن مہتاب بن کر دنیا کی نگاہ میں سما گئی، لیکن وہ ان سب باتوں سے بے فکر تھی، اس کی نظر میں خاندان کی عزت کچھ بھی نہ تھی، ہوتی بھی کیوں وہ بے سہارا تھی، اس کو ایک ساتھی کی ضرورت تھی اور دنیا نے اسے ایک ننھی سی جان کے علاوہ کسی چیز کا سہارا نہ دیا۔ اب اسے کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ معصوم جان ہی اس کے لئے کافی تھی، اس لئے کوئی بھی اسے نہ روک سکا۔ اور وہ جا رہی تھی ایک نئی منزل کی تلاش میں!

●●

## رخسانہ کنول صدیقی

تیری تصویر دیکھ کر ہی جیا کرتے ہیں
تیری یادوں کے شمع ہی جلایا کرتے ہیں
غم حیات سے اب تک نجات مل گئی ہوتی
پر تجھے دیکھ کر غم اپنے بھلایا کرتے ہیں
کیا خبر ہیں کسی بھی صبح کی تہ لیکن
شام تو اس کی زلف تلے کیا کرتے ہیں
اے ستمگر یہ بتا یاد میری آئی تجھے
ہم تو رہ رہ کے تیرا نام لیا کرتے ہیں
دیکھا ہوتا کنول کو بھی ایک نظر تو نے
بات کیا ہے جو لوگ اس کا ذکر کیا کرتے ہیں

## شاہینہ خاں علیگڑھ

یہ کیسا انوکھا منظر میں دیکھ رہی ہوں
یہ کچھ دنوں سے کیسا اثر دیکھ رہی ہوں
کہاں سے لائے ہو خرید کر شمشیر نظر اپنی
تمہاری نظر میں ایک اور سحر دیکھ رہی ہوں
تمہاری گفتگو کا اب وہ سوز و گداز کہاں
تمہاری زندگی کا شام و سحر دیکھ رہی ہوں
تمہارے بہکے بہکے قدم اے میرے گلشن کے نگہباں
تمہارے قدموں میں گلشن کی خزاں دیکھ رہی ہوں
تمہاری زندگی کے اندھیرے ہوں سدا روشن
میں اپنے مقدر کا کہر دیکھ رہی ہوں
کہاں کے خواب میں ڈوبی ہوئی ہو اے شاہین
تیرے خوابوں کے ساگر میں لہر دیکھ رہی ہوں

**بہت** سے ساتھی غیر اصلاح شدہ مضامین و غزلیں بھیج دیتے ہیں اور پھر جلد چھاپنے کے تقاضے کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم ایسے مضامین کو بعد اصلاح کے شائع کرتے ہیں جس کے سبب تاخیر ناگزیر ہے —
ادارہ

# خوابوں کے کھنڈر

ایس، ایم مسلم
دلّی کالج

آج وہ بے حد خوش تھا۔
کیوں کہ آج سلمہ ڈیڑھ سال بعد بمبئی سے واپس آرہی تھی۔ جس کو اپنانے کے لئے اس نے گھر والوں کی پسند کے کئی رشتے ٹھکرا دیئے تھے۔
اس نے پہلی بار سلمہ کو قریبی رشتہ کی بہن پروین کے یہاں دیکھا تھا جس دن سے اس نے سلمہ کو دیکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی پرستش کرنے لگا تھا۔ اس نے نہ تو اس خواہش کا اظہار پروین پر کیا اور نہ ہی سلمہ پر، اس نے کبھی سلمہ کے دل میں جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی، پتہ نہیں کیوں؟ یہ اس کو یقین سا ہو گیا تھا کہ سلمہ اسے دھوکہ نہیں دیگی اور وہ کسی بھی دن اسے اپنا لے گا۔
سلمہ کے والد بمبئی میں سرکاری ملازمت پر تھے۔ اس کو گانے کا بے حد شوق تھا، اس کی آواز بہت دلکش اور درد بھری تھی۔ جب وہ اپنی آواز میں کبھی غزل سرا ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا، جیسے دنیا بھر کا سوز و گداز اس کی آواز میں سما گیا ہو۔ اکثر رات میں جب وہ کمرے میں لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا یا تصویر بنا رہا ہوتا اور سلمہ اپنی درد بھری آواز میں کوئی غزل گنگنانے لگتی تو وہ کتاب میز پر پھینک دیتا اور پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ سلمہ کے پاس جائے اور اس سے التجا کرے کہ وہ ایسے درد بھرے گیت نہ گایا کرے لیکن وہ جیسے مفلوج ہو جاتا اور اس کے پیر جواب دے جاتے، اور وہ واپس بستر پر آ پڑتا۔ تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا اور سلمہ کی محبت اس کے دل میں گھر کرتی رہی۔
ایک روز جب وہ آفس سے گھر آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ادھوری تصویر کو مکمل کرے گا۔ جس کو وہ کئی ہفتوں سے بنا نہیں پایا ہے، اس نے برش اور کینوس سنبھالا اور تصویر پر جھک گیا ابھی وہ رنگوں کی میچنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کو کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس کی آنکھیں سلمہ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر خوشی اور حیرت سے پھیل گئیں

وہ برش اور کینوس رکھ کر کھڑا ہو گیا۔
"معاف کیجئے گا" میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا!
سلمٰی نے قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"کوئی بات نہیں طبیعت بور ہو رہی تھی، سوچا
تصویر مکمل کر لوں" اس نے سلمٰی کے سراپے کا جائزہ
لیتے ہوئے کہا۔"
"پروین نے مجھے بتایا تھا کہ آپ بہت اچھی
تصویریں بناتے ہیں" سلمٰی پھر گویا ہوئی۔
"اتنی اچھی تو نہیں!" ویسے جو لوگ میری
تصویروں کی تعریف کرتے ہیں، ان کی ذرہ نوازی
اور حوصلہ افزائی کا شکریہ!" اس نے سیدھے سادھے
انداز میں جملہ پورا کیا۔
"سلمٰی چائے پیو گی؟" اس نے بہت بے تکلفی سے
پوچھا۔
ہاں ہاں کیوں نہیں؟ — آپ یہ تصویر بھی جب
مکمل ہو جائے تو مجھے دیدیں، سلمٰی نے بہت
اپنائیت اور پرخلوص لہجے میں کہا۔ اس کو یہ
صاف گوئی بہت پسند آئی اور چائے لینے چلا گیا۔
"کیا تم کو بھی میری تصویریں اتنی ہی پسند ہیں" اس
نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں! یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے اس نے
ادھوری تصویر کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
"مس سلمٰی! اس تصویر میں میں نے دل و
جان سے محنت کی ہے، وہ سلمٰی کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے بولا — سلمٰی میں تمہارا ایک
پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں، کیا تم اس کوشش میں
مدد کرو گی؟
"مجھے کوئی اعتراض نہیں" سلمٰی نے جواب دیا۔
"تو ٹھیک ہے میں آج اس تصویر کو مکمل کر
لیتا ہوں اور کل سے تمہارا پورٹریٹ بنانا شروع کروں
گا۔ اور اس نے تصویر پر برش پھیرنا شروع کر دیا۔

"کتنے دن لگ جائیں گے" سلمٰی نے اشتیاق
آمیز لہجے میں پوچھا۔
"یہ تو تمہارے اوپر منحصر ہے"
"میرے اوپر؟" وہ چونک کر بولی۔
"جی ہاں" تم کتنا وقت دے سکتی ہو؟
"تصویر تو تم کو بنانی ہے" سلمٰی نے پھر پوچھا۔
"کبھی تم کو سامنے بٹھا کر ہی تو بناؤں گا۔ اتنا
کہہ کر وہ تصویر پر جھک گیا۔
"اچھا۔ اچھا میں سمجھ گئی" یہ کہہ کر وہ کمرے سے
چلی گئی۔ اور وہ تمام رات تصویر کو مکمل کرنے میں
لگا رہا اور تمام رات کی محنت کے بعد وہ تصویر
بنانے میں کامیاب ہو گیا اور سلمٰی وہ تصویر دوسرے
دن آ کر لے گئی۔
سلمٰی اب روز اس کے پاس آتی اور وہ اس کو
سامنے بٹھا کر تصویر بنانے لگتا لیکن وہ پنسل ہاتھ
میں لئے صرف اس کو گھورے جاتا، کینوس پر پنسل
سے اسکیچ بنانا چاہتا تو آڑھی، ترچھی لکیروں کے
سوا کچھ نہ بنتا۔ ایسا روز ہوتا رہا اور سلمٰی پندرہ
بیس منٹ بیٹھ کر چلی جاتی وہ سوچتا آخر ایسی
کونسی بات ہے جو سلمٰی کو سامنے بٹھا کر میرے ہاتھ حرکت
کرنی بند کر دیتے ہیں، اگر یہ تصویر مکمل ہو جائے
تو میرا بہترین شاہکار بنے لیکن تصویر نہ بنی
اور سلمٰی نے بھی ادھر دلچسپی لینی کم کر دی۔
ایک شام وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا
فضا میں جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک سلمٰی
اس کے کمرے میں آ گئی، اس کو دیکھ کر وہ پلٹا اور
صوفے پر دراز ہو گیا
"سلمٰی آج تو کوئی غزل سنا دو" اس نے
اپنی خواہش کا اظہار کیا۔
"غزل اور میں؟" اس نے انجان بنتے ہوئے کہا
"سلمٰی خدا کے واسطے میں کوئی بہانا سننا نہیں

شاہجہاں دہلی

چاہتا ہیں صرف تمہاری پسند کی کوئی غزل سننا چاہتا ہوں، اس نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے دھیرے دھیرے غزل کے بول اٹھانا شروع کئے، سلمیٰ غزل کیا پڑھ رہی تھی، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دونوں درد کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ فضا خاموش تھی اور اس خاموش فضا میں سلمیٰ کی درد بھری آواز روح پھونک رہی تھی، غزل ختم ہو گئی لیکن وہ خالی خالی نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہا تھا، سلمیٰ نے اسے ٹوکا دیا ـــ سچ سلمیٰ تم تو بہت اچھا گالیتی ہو، تمہاری آواز کے سحر نے مجھے مدہوش کر دیا۔ اس نے سلمیٰ کے چہرے کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے کہا۔

"رہنے دیجئے" زیادہ باتیں نہ بنائیے۔ شاید اسے اپنی تعریف سننی پسند نہ تھی اس لئے وہ کمرے سے چلی گئی۔

ایک شام اس نے سلمیٰ اور پروین کے ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ سلمیٰ کو فلم بہت پسند آئی، اور اس کے بعد اکثر سلمیٰ خود فلم دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتی۔ اس طرح رات دن گزر گئے۔ سلمیٰ اس سے تصویر بنانے کی فرمائش کرتی رہتی اور وہ غزلیں اور گیت سننے کی خواہش کا اظہار کرتا رہتا۔ وہ آفس جانے سے پہلے اس کے کمرے میں آتی، اس کا ناشتہ تیار کرتی اور کمرے کو سنوارتی اور اس سے ادھوری تصویروں کو مکمل کرنے کو کہتی۔ وہ اس کا ہر طرح خیال رکھتی۔ جب اس نے سلمیٰ کی اتنی چاہت دیکھی تو اپنی محبت کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور وہ اس کی خاموش پرستش کرتا رہا وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کو چاہتا رہا۔

وہ پورے چاند کی رات تھی اور وہ کینوس پر جھکا ہوا بے مقصد برش سے آڑھی، ترچھی لکیریں بنا رہا تھا، آج کی رات وہ بہت اداس تھا کیوں کہ سلمیٰ اور پروین تاج محل دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ ارادہ تو اس نے بھی کیا تھا لیکن آفس سے اسے چھٹی نہ مل سکی تھی اور وہ اپنی تمناؤں کا خون کئے ایک نئی تصویر کو کینوس پر ابھارنے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔ اس نے کینوس قریب پٹخ دیا۔ آج کی رات وہ سلمیٰ سے کوئی گیت سننا چاہتا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج سلمیٰ اس کو اپنی آغوش میں لے لے۔ اس کو اپنے لمبے گھنے بالوں میں چھپا لے اور پھر اس کو لوریاں دیکر سلا دے، لیکن یہ سب کچھ کیسے پورا ہوتا، یہ سب کچھ تو ایک انسان کا سوچا ہوا تھا۔ اور انسان کا سوچا بھی کبھی پورا ہوا ہے۔

برسات کی ایک بھیگی شام تھی جب وہ وقت سے پہلے ہی آفس سے چلا آیا تھا۔ تو اس نے دیکھا تھا۔ سلمیٰ واپسی کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اسے جیسے سناٹا سا لگا، اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور وہ خاموش اپنے کمرے میں آکر دراز ہو گیا وہ پلنگ پر چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اس کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں اس کا جسم جیسے ساکت ہو گیا تھا لیکن سلمیٰ کی آواز نے اس میں جان ڈال دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تو سلمیٰ تم جا رہی ہو؟" اس نے بجھے بجھے دل سے پوچھا۔

"ہاں پرویز، اب مجھے جانا ہی پڑے گا! میں بہت جلد واپس آؤں گی۔ اس نے اتنا کہا اور چلی گئی ـــ وہ اس کو جاتا دیکھتا رہا" خدا حافظ اس کے بجھے بجھے ہونٹوں سے نکلا۔ اور کمرے کی تنہائی میں گم ہو گیا۔

سلمیٰ بھی چلی گئی اور اس کو بے چین کر گئی وہ اکیلا رہ گیا۔ اس کے دن رات بھاری ہو گئے، آ

کی راتیں سونی ہوگئیں۔ دو روز تک وہ آفس بھی نہیں گیا۔ بس منہ اوندھائے بستر پر پڑا رہا۔ نہ کھانے کی فکر نہ سونے جاگنے کا خیال۔ کہتے ہیں کہ وقت سے بڑا کوئی معالج نہیں اور وقت ہی زخم دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سلمیٰ کی یاد اس سے کم ہوتی گئی۔ اس کو دکھ تو اس بات کا تھا کہ سلمیٰ نے اس کو ایک خط بھی نہ بھیجا تھا۔ اور آج صبح پروین نے اسے خوشخبری سنائی ہے کہ کل صبح کی ٹرین سے سلمیٰ آرہی ہے۔ وہ بہت خوش ہوا اور اس کی سوئی ہوئی آرزوئیں جاگ اٹھیں۔ آج ڈیڑھ سال بعد سلمیٰ دہلی آرہی تھی وہ سلمیٰ جو اس کی محبوبہ تھی جس کو اپنانے کے لئے اس نے گھر والوں کی پسند کے کئی رشتے ٹھکرا دیئے تھے ___ اس نے جلدی جلدی شیو کیا، غسل سے فارغ ہوا اور کپڑے تبدیل کرکے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹرین لیٹ تھی، اس نے سوچا "لیٹ" اور "سوری" تو ہماری قسمت بن گیا ہے اور یہ دونوں لفظ ہماری زندگی کے لازمی جز بن گئے ہیں وہ ٹائم پاس کرنے کے لئے بک اسٹال پر چلا گیا اور آج کا تازہ ترین اخبار پڑھنے لگا۔ اس کی نگاہ بار بار گھڑی پر جاتی اور اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا رہتا۔ اس نے اخبار لپیٹ لیا اور پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ ٹرین دور سے آتی دکھائی دی اور اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ڈیڑھ سال بعد سلمیٰ مجھ کو دیکھ کر مجھ سے لپٹ جائے گی اور میں اس سے شکایت کروں گا کہ تم نے مجھے خط کیوں نہیں لکھا۔ ٹرین قریب آتی جارہی تھی، قلی بھاگ رہے تھے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر رک گئی اور وہ پاگلوں کی طرح کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے چہروں کو پہچاننے لگا، لیکن سلمیٰ نظر نہ آئی، لوگ ٹرین سے اترتے رہے اور ان کے عزیز و اقارب ان کو لے جاتے رہے، لیکن وہ ابھی تک سلمیٰ کی تلاش میں

پلیٹ فارم پر گھوم رہا تھا وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکا، رکا اور غور سے دیکھنے لگا وہ، تو سلمیٰ ہی تھی۔ مگر یہ کیا؟ اس کے ساتھ یہ مرد کون ہے؟... اور یہ بچہ ......! یہ سب کچھ کیا ہے؟ وہ سلمیٰ کے سامنے آچکا تھا۔

"ارے تم ___! یہاں ___!! کیسے؟ سلمیٰ نے اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر ایکدم سے تین سوال کر ڈالے، اس نے اپنی بدحواسی پر پردہ ڈالتے ہوئے کہا، میرا ایک دوست آرہا ہے اس کو خوش آمدید کہنے آیا تھا ___ لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔

"ارے ہاں ___ ان سے ملو یہ ہیں میرے ہسبینڈ"

"اوہ ___ وہ جارہا ہے میرا دوست!" وہ سلمیٰ کی بات سنے بغیر وہاں سے بھاگ گیا۔

اس میں اب آگے سننے کی تاب نہیں تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، اور وہ سوچ رہا تھا سلمیٰ کے بارے میں ___ وہ سلمیٰ جس نے اس سے محبت کی تھی جو اس کے ساتھ گھومی پھری تھی، سینما ہال میں، تنہا کمرے میں، اس نے اپنا ٹائم گزارا تھا۔ یہ وہی سلمیٰ تھی جس نے بلا جھجک اس سے فرمائشیں کی تھیں اور اس نے اس کی ہر جائز اور ناجائز فرمائش کو پورا کیا تھا۔ وہ سلمیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے سوچا کیا عورت روپئے پیسے سے محبت کرتی ہے؟ کیا وہ زندگی کا مقصد نام و نمود کی نمائش جانتی ہے؟ کیا عورت کے نزدیک پیار پیر کی جوتی کے برابر ہے جس کو پرانا ہونے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے؟ کیا عورت کسی سے اس لئے پیار کرتی ہے کہ اس کی تنہائیاں کسی حد تک دور ہوجائیں؟ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفر جو عورت کو عظیم اور مقدس سمجھتے ہیں جو کہتے ہیں عورت زندگی میں صرف ایک بار پیار کرتی ہے اور تمام عمر اس میں گزار دیتی ہے سراسر جھوٹ ہے، عورت کے نزدیک پیار

ر محبت کی کوئی وقعت کوئی ویلیو نہیں ، آج عورت
یار کو بھی فیشن سمجھتی ہے ، جس طرح وقت کے ساتھ
یشن بدلتا رہتا ہے ، اسی طرح عورت اپنا پیار
ور اپنی محبت تبدیل کرتی رہتی ہے اس نے پھر سوچا
کیا یہ وہی نجمہ ہے جس کی خاطر اس نے کئی رشتے
ٹھکرا دیئے تھے ۔ جس کی خاطر اس نے اپنے رات
دن برباد کئے اور جس کی خاطر اس نے تمام یار دوستوں
کو چھوڑا ، وہ اتنی بے وفا نکلی کہ اپنی شادی کی خبر
تک نہ دی تاکہ میں اس کے خیال سے آزاد ہو جاتا
اس کی تمام خوشیاں غم کی کبھی نہ ابھرنے والی گہرائیوں
میں ڈوب گئیں اور وہ اپنی ناکام امیدوں کا جنازہ
لئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا ——— ••

---

بقیہ لمحۂ فکر

دلی کالج کی خوش قسمتی ہے کہ اسی کالج کے ایک رکن کریش چکرورتی DUTA کے صدر ہیں ، ان سے بھی ہم درخواست کرتے ہیں کہ وہ طلبا کی موجودہ بے چینی کو ختم کرنے اور مستقل پرنسپل کے تقرر کے لئے اپنا فرض منصبی ادا کریں ۔

آخر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دلی کالج یونین کے صدر جن سنگھ کے زیر اثر طالب علموں کی انجمن ، اکھل بھارتیہ ودیارتی پریشد (A.B.V.P) کے نمائندہ ، یونیورسٹی کے صدر بھگوان سنگھ کے ساتھ راتوں کو ان کی کار میں اکثر گھومتے نظر آتے ہیں ، جب کہ جنرل سکریٹری S.F.I کے دلی کالج میں روح رواں ہیں ۔

دلی کالج کے طلبہ اس ناپاک گٹھ جوڑ کو کبھی برداشت نہیں کریں گے ۔ یہ صرف طلبا کو بے وقوف بنانے اور گمراہ کرنے کی ایک سوچی سمجھی اسکیم ہے ۔ طلبا ان کی تخریبی کارروائیوں سے باخبر ہیں ۔

A.B.V.P ایک فرقہ پرست تنظیم ہے جب کہ S.F.I صرف تخریبی کارروائیوں پر یقین رکھتی ۔ ایسی

---

# لئے کاغذ قلم بیٹھا تھا ——— ایڈیٹر سمجھ بیٹھے

بے دھڑک

بلاتے ہیں ادھر آ کوئی سوداگر سمجھ بیٹھے
نہیں تو شاید اپنے باپ کا نوکر سمجھ بیٹھے
مرے کمرے کو تم اخبار کا دفتر سمجھ بیٹھے
لئے کاغذ قلم بیٹھا تھا ، ایڈیٹر سمجھ بیٹھے
ہمیں جب دردِ فرقت نے گھلا کر کر دیا دبلا
سینما دیکھنے والے ہمیں جوکر سمجھ بیٹھے
کوئی گر دردِ انسانی کی شدت سے ذرا اچھلا
سیاست کے مداری جھٹ اسے بندر سمجھ بیٹھے
میسر کرتے میں اتنے بیل بوٹے ٹانک دے ٹیلر
کہ ماڈرن ایج کی لڑکی اسے جمپر سمجھ بیٹھے !

---

ہر تنظیم جو طلبا کو گمراہی کی طرف لے جائے ۔ اس کی مخالفت ہمارا ایمان ہے ، جب کہ طلبا کے مفاد میں ہونے والی ہر جائز اور پرامن تحریک کو ہم صادق دلی سے خوش آمدید کہتے ہیں ۔ ادارہ

---

**شاہجہاں**
میں کیا ہے ——— جو آپ نہیں چاہتے
میں کیا نہیں ہے ——— جو آپ چاہتے ہیں ۔
ضرور لکھ کر بھیجیں ——— ادارہ

# بدمزاج بیوی

محمود پال

کہتے ہیں کہ چچی کی شادی جب قصبہ کے خوبرو ڈاکٹر سے قرار پائی تو کتنی ہی کنواریوں کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ قصبہ میں وہی تو ایک نوجوان ڈاکٹر تھا اور پھر اتنا حسین اور اتنا وجیہہ کہ لڑکیاں خواہ مخواہ بیمار پڑ جایا کرتی تھیں اور جب تک ان کا علاج ڈاکٹر کے ہاتھوں نہیں ہوتا وہ بیمار ہی رہتیں۔ ظاہر ہے کہ جب اس ڈاکٹر سے ہماری چچی کی شادی طے پا گئی تو سینہ پر سانپ ضرور لوٹے ہونگے بعض لڑکیوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جادو ٹونے سے ہتیایا ہوگا۔ ورنہ اس مردوے میں کیا رکھا ہے خیر یہ جملہ تو معترضہ تھا ورنہ کہا جاتا ہے کہ چچی جیسا حسن تو دور دور تک کسی لڑکی کا نہیں تھا لیکن کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ جتنی وہ حسین تھیں اس سے کہیں زیادہ تنک مزاج بھی تھیں۔

خیر سے شادی ہو گئی، چچی اپنی قسمت پہ نازاں تھیں اور ڈاکٹر اپنی قسمت پر۔ جس نے بھی اس جوڑے کو دیکھا یہی کہا کہ قدرت نے انہیں ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا کیا تھا۔ شادی کے چند مہینے بعد تک تو وہ لوگ قصبہ میں ہی رہے لیکن پھر ڈاکٹر نے شہر میں اپنا دواخانہ کھول لیا اور قصبہ کو خیرباد کہا۔

بہت دنوں تک تو ان کی کوئی خیر خبر نہیں ملی لیکن تقریباً کوئی ایک سال بعد ایک صاحب جو کسی کام سے شہر گئے تھے جب لوٹے ہیں تو اپنے ساتھ عجیب عجیب کہانیوں کا پلندہ اٹھا لائے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ہماری چچی اور ان کے میاں میں قطعی نہیں بنتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بیزار معلوم ہوتے ہیں جھگڑے کی جڑ چچی کو ہی بتایا گیا کہ اپنی تنک مزاجی اور غصیلے مزاج کی وجہ سے اپنا گھر برباد کر رہی ہیں۔ شریف بہو بیٹیوں میں بردباری اور برداشت کا مادہ ہونا چاہئے وہ ان میں نہیں ہے اگر میاں کی پیشانی پر ہلکا سا بل بھی پڑ جاتا تو یہ سارا گھر سر پہ اٹھا لیتیں۔ اور اگر کبھی ڈاکٹر بہت زیادہ غصہ ہو جاتا اور اپنا غصہ برتنوں پر اتارتا تو ہماری چچی دس اور برتنوں کا ناس کر کے رکھ دیتیں۔ قصبہ کے بڑے بوڑھوں نے جب یہ سنا تو کانوں پر ہاتھ دھر لیا۔ عورتوں نے اسے گھر گھر پھیلا دیا اور لڑکیاں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ہماری چچی سے انہیں بغض تو تھا ہی لہٰذا ان کا خوش ہونا قدرتی بات تھی۔

دو تین سال اور بیت گئے کتنی ہی کنواریوں کے سہرے کے پھول کھلے، کتنوں کی گود ہری ہوئی اور کتنے ہی عمر رسیدہ لوگ اس دنیا سے سدھار گئے لوگ چچی اور ڈاکٹر کے کشیدہ تعلقات کو بھولتے جا رہے تھے کہ ایک دن ایک رکشا ہمارے دروازہ پر آ کر رکا اور چچی دندناتی ہوئی اس میں سے برآمد ہوئیں۔ ساتھ میں ڈاکٹر نہیں تھا لہٰذا لوگوں نے دانتوں میں انگلی داب لی۔ تم جانو آجکل کا زمانہ تو تھا نہیں کہ اگر بیاہتا عورت اپنے شوہر کو چھوڑ آئے تو رشتہ دار اور

ماں باپ اسے اور دم دلاسہ دیں اور اس کے اس اقدام کو سراہیں، وہ زمانہ ہی اور تھا۔ وداع کے وقت لڑکی سے کہہ دیا جاتا تھا کہ اس گھر سے تو ڈولی جا رہی ہے میاں کے یہاں سے اب ڈولا (جنازہ) ہی نکلے۔ لیکن چچی کا اس طرح رکشا سے نکلنا بڑا معیوب سمجھا گیا اور انگلیاں اٹھنے لگیں دیکھئے انگلی اٹھتی بھی ہے بڑی جلدی !۔
اٹھتی رہیں چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

لیکن ایسا جان پڑتا تھا جیسے چچی ان باتوں سے بالکل بے نیاز ہوں۔ انہیں گویا اپنے اس اقدام پر کوئی ندامت نہیں تھی خاندان کے بزرگوں نے جب چچی کو اس پر کہا سنا، تو انھوں نے صرف ایک ہی جواب دیا تھا کہ اگر کوئی لڑکی اس شخص کے ساتھ نباہ کرے تو اپنا چونڈا منڈوا دوں، وہ انسان نہیں ہے بالکل درندہ صفت ہے، اب تو میں عمر بھر اس شخص کی صورت نہیں دیکھوں گی۔ چاہے آپ لوگ کچھ ہی کہیں۔

چہ میگوئیاں بڑھتی ہی گئیں، بھلا اتنی بڑی بات کو کوئی کیسے برداشت کرے کہ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کو چھوڑ کر چلی آئے۔ شوہر تو مجازی خدا ہوتا ہے اس کے قدموں پر تو جان دیدینا چاہئے نہ کہ اس طرح بھاگتی پھرے۔ قصبہ کے مولوی عنایت اللہ نے اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا کہ ایسی عورتیں جہنم کا ایندھن بنیں گی۔ مولوی صاحب قبلہ کی چار بیویاں ہمیشہ بقید حیات رہیں، جب ایک کا انتقال ہو جاتا تو یہ فوراً چار کی تعداد پوری کر لیا کرتے تھے اور پھر اس نجات دہندہ کے پلے جو بھی پڑی اس کی قسمت کا کیا کہنا۔ کم از کم جہنم کا ایندھن بننے سے تو بچ جاتی تھی۔ پنڈتوں نے اپنے ملنے والوں سے کہا کہ ایسی بیہودہ حرکت تو ایک مسلمان لڑکی ہی کر سکتی ہے۔ ہندوؤں کے یہاں تو پتی دیوتا سمان ہوتا ہے ہرے ہرے کیسا زمانہ آ گیا ہے، چچی یہ سب کچھ سنتی رہیں لیکن ماں باپ کا گھر نہیں چھوڑا۔ باپ کو اپنی پگڑی اچھلنے کا بڑا غم تھا لیکن اپنی بیوی کی وجہ سے مجبور تھا جس کی ممتا اپنی بیٹی کو جیتے جی جہنم میں جھونکنا نہیں چاہتی تھی۔

کئی سال اور بیت گئے۔ اس دوران میں چچی نے کبھی بھول کر بھی ڈاکٹر کا نام نہ لیا اور نہ ڈاکٹر نے کبھی چچی کو پیغام بھجوایا۔ لیکن ایک دن چچی کے کوئی دور کے رشتہ کے چچا زاد بھائی شہر سے آئے اور ان کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ پریکٹس اب ان کی چلتی نہیں ہے مریض ان کے پاس جاتے ڈرتے ہیں کبھی کبھی تو بالکل پاگلوں کی سی کیفیت رہتی ہے گھر کے سارے ملازمین ایک ایک کر کے چلے گئے۔ صرف پرانی بڑھیا ملازم ہے اڑوس پڑوس کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اچھا ہوا ڈاکٹر کی بیوی چلی گئی ورنہ پتہ نہیں اس بیچاری کا کیا حال ہوتا؟ جو یہ قصہ سن رہے تھے ان لوگوں نے اس طرح سر ہلایا جیسے کہہ رہے ہوں ٹھیک ہی ہوا ورنہ اس بیچاری کا کیا حال ہوتا اور رحم کی نگاہ سے ہماری چچی کو دیکھنے لگے۔ لیکن چچی کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا وہ بڑی دیر تک چپ چاپ اپنے چچا زاد بھائی کی صورت تکتی رہیں۔

"کیا یہ ممکن ہے" انہوں نے نہایت آہستگی سے اس طرح کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہوں "کیا یہ ہو سکتا ہے"

"میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں" ان کے چچا زاد بھائی نے کہا وہ اس طرح ان پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اگر چچی کو اپنے اقدام پر کوئی ندامت ہے تو اب اسے وہ محسوس نہ کریں "وہ تو بالکل پاگل ہو گیا ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اسے چھوڑ دیا۔ ایسے پاگل کے ساتھ کون رہ سکتا ہے جو بات بات پر مارنے دوڑے وہ تو خیر گزری کہ اب تک وہ پاگل خانہ نہیں پہنچایا گیا"

کہتے ہیں کہ اس کے بعد چچی نے کچھ نہیں کہا، صرف ایک آہ ان کے منہ سے نکلی اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ چچی نے اپنا سامان باندھ رکھا ہے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنے شوہر

اس جا رہی ہیں تو لوگ حیرت میں آگئے کچھ تو یہ سمجھنے لگے
بھی پاگل ہو گئی ہیں۔ چچی کے والدین اور دیگر رشتہ داروں
نہیں بہت کچھ سمجھایا لیکن وہ چپ چاپ بیٹھی رہیں ـــ
یا سامان تانگہ پر رکھ دیا گیا اور چچی بھی بیٹھ گئیں تو انہوں
اپنے ماں باپ اور دوسروں کی طرف دیکھ کر صرف اتنا
کہا۔" یہ نہ بھولو کہ وہ میرے شوہر ہیں۔"

چچی کے جانے کے چند سال بعد ڈاکٹر کا انتقال ہو گیا
۔ اس دوران میں جنہوں نے چچی کو دیکھا ہے ان کا کہنا
کہ وہ بالکل بدل گئی تھیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا
یہی تنک مزاج عورت تھی جو اپنے شوہر کے ساتھ نباہ
سکی۔ ڈاکٹر پر پاگل پن کے دورے جب پڑتے تھے تو
بعض اوقات وہ ان پر ہاتھ بھی اٹھا دیتا تھا۔ لیکن یہ
اور بردباری سے کام لیتیں کبھی ڈاکٹر خفا ہو جاتے
سے منالیتی تھیں۔ کھانے کی میز پر وہی کھانے چنے جاتے
جو ڈاکٹر کے پسندیدہ تھے۔ کبھی اگر غصہ میں یا دیوانگی
عالم میں وہ اپنے سامنے رکھا ہوا کھانا پھینک دیتا تو
ان کے سامنے کوئی اور لذیذ چیز رکھ دیتیں۔ بہرکیف چچی
مکمل ایک آئیڈیل بیوی بن کر رہ گئیں اور اس کا اثر یہ ہوا
ڈاکٹر کی حالت پہلے سے کسی حد تک سدھر گئی۔ میاں بیوی
، تعلقات استوار ہو گئے تھے کبھی کبھی تو ڈاکٹر انہیں
ئی کتاب پڑھ کر سناتا اور یہ ڈاکٹر کا سوئٹر بنتے ہوئے بڑے
میان سے سنتیں۔

چند سال بعد اطلاع ملی کہ ڈاکٹر کا انتقال ہو گیا۔
یہ واقعات میرے ہوش سے پہلے کے ہیں کبھی کبھی والدہ
ہ میری بہنوں کو ازدواجی زندگی کے متعلق نصیحت کرتی
ہیں تو یہ واقعات دہراتی تھیں۔ میں نے تو ڈاکٹر کو دیکھا
ں اس لئے کہ میری پیدائش سے پہلے چچی کی شادی ہوئی
ں اور قصبہ سے وہ لوگ چلے گئے تھے لیکن چچی اب بھی
ت ہیں، میرا شہر اکثر آنا جانا رہتا ہے لہذا جب بھی
تا ہوں چچی سے ضرور ملتا ہوں اپنے شوہر کے انتقال کے
بعد سے انہوں نے کبھی سنگھار نہیں کیا۔ کبھی بالوں میں تیل
نہیں ڈالا، رنگین کپڑے نہیں پہنے، ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ
ان سے چھن گئی ان کی ویران آنکھوں میں غم و اندوہ کی
لکیریں ابھرتی رہیں۔

کبھی کبھی ڈاکٹر کے پاگل پن کے زمانہ کو یاد کرتے ہوئے
وہ کہتیں کہ وہ چند سال ان کی زندگی کے بہترین لمحات تھے
اس عرصہ میں وہ جان سکیں کہ شوہر کی رفاقت کیا چیز ہوتی
ہے پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ماضی کے دیئے
جل اٹھتے اور پھر وہ اس طرح کہنے لگتیں جیسے اپنے آپ
سے کہہ رہی ہوں۔

" یہ سب میرا قصور تھا۔ مجھے ان سے جدا نہیں ہونا چاہئے
تھا۔ میری بدمزاجی نے ہی ان کو پاگل پن کا شکار بنایا۔ یہ
میں نے کیا کیا۔ اوہ میں کتنی بے وقوف تھی۔ مجھے نہیں معلوم
تھا کہ میرا ہر وقت کا جھگڑنا ان کو پاگل کر دے گا ورنہ میں
انہیں چھوڑ کر نہیں جاتی۔ کبھی نہیں جاتی۔"

●●

جنوری ............ ۱۹۷۲ء

جلد ۶ ............ شمارہ ۱

قیمت فی پرچہ ........ پچیس پیسے

سالانہ ........ تین روپے



شاہجہاں میں شامل افسانوں میں نام، مقام و واقعات قطعی فرضی ہیں۔ کسی سے مطابقت محض اتفاق ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا مصنف ذمہ دار نہیں۔

شاہجہاں آل انڈیا اسمال اردو نیوز پیپر ایڈیٹرز کونسل (A.I.S.N.E.C) نئی دہلی کا ممبر ہے۔

## ہمارے مقاصد

طالب علموں ______

______ میں علمی و ادبی ذوق پیدا کرنا

______ کو تخریب سے بچانا اور تعمیر میں لگانا

______ کو ملک و ملت کی بامقصد خدمت کے لئے تیار کرنا

______ میں باہمی میل جول اور اتحاد کے لئے کوشش کرنا

______ کی آواز عوام تک پہنچانا

______ کو اخلاق، تہذیب اور ان کی ذمہ داریوں سے روشناس کرانا ______ اور

______ سماجی اصلاح کے لئے جد وجہد کرنا

ادارہ

شاہجہاں کے لئے دلچسپ مضامین، افسانے اور غزلیں و نظمیں وغیرہ ارسال فرمائیے۔ اپنے نام کے ساتھ اسکول و کالج وغیرہ کے نام کے علاوہ اپنے گھر کا پورا پتہ لکھیں۔

ادارہ

شاہجہاں میں شائع ہونے والے تمام مضامین نقل کئے جا سکتے ہیں لیکن ماہنامہ شاہجہاں دہلی کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

طابع، ناشر و مالک : محمد عتیق صدیقی

مطبوعہ : اعلیٰ پرنٹنگ پریس، بلیماران، دہلی

مقام اشاعت: قاسم جان اسٹریٹ بلی ماران دہلی نمبر ۶

# جرعات

# لمحۂ فکر

۱۰ر دسمبر ۷۱ء دلی یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک اہم دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے دلی یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کی ایک عدیم المثال کثیر تعداد کو خطاب کیا۔ یونیورسٹی کے کرکٹ گراؤنڈ میں جمع طلبہ و طالبات کے سر فخر سے بلند تھے کیونکہ وزیر اعظم نے ان کو خطاب کرنے کی درخواست منظور فرمالی تھی۔ فخر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ شروع ہونے کے بعد وزیر اعظم کا کسی پبلک میٹنگ میں تقریر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے صرف چوبیس گھنٹہ میں سب انتظام کیا تھا۔ اس موقع پر وائس چانسلر ڈاکٹر سروپ سنگھ نے مسز گاندھی کو ایک لاکھ ایک ہزار روپے کا چیک قومی دفاعی فنڈ میں دیا۔

## سالنامہ؟

سابقہ اعلان کے مطابق یہ شمارہ سالنامہ ہونا چاہیے تھا مگر ملک میں ہنگامی حالات ہونے کی وجہ سے ہم اس ماہ سالنامہ پیش نہ کر سکے۔
اس کے لئے آئندہ اعلان کیا جائے گا

(ادارہ)

دلی یونیورسٹی کے طلبہ نے اپنی تعداد اور جذبے سے اس دن وزیر اعظم کو جو تاثر دیا وہ عرصے سے تعلیمی حلقوں سے ناپید تھا۔ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے صدر نے وزیر اعظم کو طلبہ کی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ وہ قومی دفاع کی خاطر اپنی جان بھی قربان کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سروپ سنگھ نے تعلیمی حلقے کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ مسز گاندھی نے ہماری عظمت اور خود اعتمادی کو ایک قوم کی حیثیت سے برقرار رکھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ خود اعتمادی اور عظمت ہی اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لازمی ہیں۔

وزیر اعظم نے فرمایا کہ اس وقت ہمارا کام فوجی جوانوں کو یہ یقین دلانا ہے کہ پورا ملک متحد ہے مضبوط ہے اور ان کے پیچھے ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اس وقت ہم آپس تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیں اور ہندوستان اور بنگلہ دیش پر حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ہو کر حکومت کا ساتھ دیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے طلبہ و اساتذہ اور پورا ملک متحد ہو کر خطرے کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اس عظیم کاز میں دنیا کی کوئی طاقت ہمارے اتحاد کو نہیں توڑ سکتی۔

مسز گاندھی نے طلبہ کے جد وجہد آزادی میں حصے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بغیر ان کے تعاون کے ہم اتنی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اور مجھے امید ہے کہ آج بھی آپ لوگ قومی دفاعی کاموں میں پیش پیش ہوں گے۔

آئیے ہم دکھا دیں کہ آج کے طالب علم قومی خدمت میں کسی طرح بھی آزادی سے پہلے کے طالب علم سے پیچھے نہیں ہیں

●●

# حیدرآباد کے ادبی نگینے

ڈاکٹر سید محمد عقیل

## مخدوم

ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا۔ ہم لوگ الوئنگ کرسچین کالج الہ آباد میں پڑھتے تھے کہ مخدوم کی نظم "جنگِ آزادی" غالباً کسی رسالے میں دیکھی، پھر کہیں سے ڈھونڈھ کر تیغ الہ آبادی کا (مصطفیٰ زیدی) سرخ سویرا لے آئے۔ اور ہم لوگ دوپہر کو کالج کیمپس میں "یہ جنگ ہے جنگ آزادی، آزادی کے پرچم تلے" کورس میں پڑھتے۔ کچھ اور نوجوان شامل ہو جاتے۔ کمیونسٹ پارٹی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ہم لوگوں کو بھی نئی نئی دلچسپی ہوئی تھی۔ ترقی پسند بننا اس وقت بغاوت اور شہادت کی منزل میں پہنچنا تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی اس وقت تک مخدوم کو نہیں دیکھا تھا۔ پھر اسی زمانے میں نئے ادب کے معمار، کے عنوان سے ترقی پسند ادیبوں سے متعلق ایک سیریز نکلی جس کے پہلے ہی صفحہ پر ادیبوں کی تصویریں اور ان کا کلام شائع ہوا تھا۔ یہ ایک طرح کا انتخاب تھا۔ پہلی دفعہ اس میں مخدوم کی تصویر دیکھی اور ان کے حالات پڑھے۔ انتخاب، علی سردار جعفری کا تھا۔ پھر ہندوستان آزاد ہو گیا اور کچھ دنوں بعد تلنگانہ کی تحریک شروع ہوتے ہی مخدوم پر ایک طرف تو سرکار کی زبردست پابندی لگی اور دوسری طرف وہ عوام کے ہردلعزیز بن گئے۔

پہلی دفعہ میں نے انہیں فروری ۱۹۵۸ء کی دلی اردو کانفرنس میں دیکھا جس میں مولانا آزاد نے اردو کے حق میں ایک مختصر تقریر فرمائی تھی اور جواہر لال نہرو نے بھی اردو کو جائز حق دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ مخدوم اور پروفیسر عبدالقادر سروری قریب ہی بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے مجھے ان دونوں حضرات سے ملایا۔ مخدوم اپنی فطری مسکراہٹ کے ساتھ ملے۔ اس وقت وہ ... آندھرا اسمبلی کے ممبر تھے یا آندھرا کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہیں دیکھ کر میری زبان پر جوش کا یہ مصرعہ جاری ہوا ؎

سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی سنگتراش نے مخدوم کا چہرہ پتھر سے تراش کر مجسمہ کی شکل میں ڈھال دیا ہے۔

اس وقت نہ ان کے حالات کا بہت زیادہ علم تھا اور نہ کے مشاغل کا۔ کیوں کہ میں انہیں اس وقت تک صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا جب میں حیدرآباد گیا تو میں ان کی مقبولیت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایک عوامی کو کس قدر ہردلعزیز ہونا چاہئے یہ صورت صرف جواہر لال نہرو اور مخدوم محی الدین ہی میں میں نے دیکھی۔

جس زمانے میں حیدرآباد گیا تھا اس وقت مخدوم
ا اسمبلی کے کمیونسٹ ممبر تھے اور آدرش نگر کے پاس
ایم۔ ایل۔ اے کوارٹرس میں رہتے تھے۔ سری نواس لاہوٹی
نب کے ساتھ دو مرتبہ ملنے گیا مگر ملاقات نہ ہوئی معلوم
ہ کہیں گئے ہوتے ہیں، پھر لاہوٹی صاحب نے کہا آ بتیے
سری ترکیب نکالتے ہیں، مخدوم دوپہر کو بندرابن ہوٹل
ضرور نظر آتے ہیں۔ وہاں یقیناً ملاقات ہوگی ہم لوگ
پہر کو بندرابن ہوٹل پہونچے اور بیٹھ کر چائے پینے لگے کہ
بارگی لاہوٹی صاحب اپنی جگہ سے اچھلے کہ مخدوم
ئے۔ مگر مجھے وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں نے کہا
ائی آپ کو کہاں دکھائی دے رہے ہیں مخدوم؟ میں تو
ی کو نہیں دیکھتا۔ لاہوٹی صاحب ہنسنے لگے اور بولے۔
ب مخدوم کی نظمیں اور گانے کے ریکارڈ اس ہوٹل
ں بجنے لگیں تو یہ مخدوم کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔ وہ
یئے ان کی نظم کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ میں نے غور کیا تو
قعی سو

دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
اک چنبیلی کے منڈوے تلے

ریکارڈ بج رہا تھا۔ لاہوٹی صاحب نے ایک غوطہ مارا
رغائب۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ بسکٹ کے رنگ کی
رٹ پہنے ہوئے، مخدوم، لاہوٹی صاحب کے ساتھ
لے آرہے ہیں۔ وہی سنگِ اسود کی چٹانوں سے تراشا
ا ابلورا کی مورتیوں جیسا چہرہ وہی مسکراہٹ، وہی بے
ہی سنجیدگی، چہرہ پرعزم ذہانت اور سخت کوشی کے
وش۔ اب چند نوجوان بھی مخدوم کے قریب سمٹ
ئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک صاحب سیاہ چشمہ لگائے
ئے اور بڑی خاموشی سے آکر اس محفل میں شریک ہوگئے
ندوم نے مجھے ان سے ملوایا یہ شاذ تمکنت ہیں۔ میں
شاذ صاحب سے کبھی نہیں ملا تھا، مگر ان کے نامِ نامی
ے متعارف تھا۔ پھر مخدوم نے آلہ آباد کی ادبی اور
سیاسی ہستیوں کو پوچھا۔ —— احتشام حسین صاحب،

فراق صاحب، پنا اس چندر پنت، ڈاکٹر اعجاز [illegible]،
اشک کے متعلق اس دلچسپی سے پوچھتے رہے کہ مجھے ان
کی اپنی ملاقاتیوں سے محبت اور ان پر رشک آنے
لگا۔ محفلِ مشاعرہ جم سکتی تھی کیونکہ اس وقت تک
وقار خلیل، منظور احمد منظور، شاذ، صلاح الدین نیر بھی آگئے
تھے۔ مگر مخدوم کو کسی ضروری کام سے کہیں جانا تھا اس
لئے محفل برخاست ہوگئی۔ جاتے وقت اپنے گھر پر ملنے
کی دعوت دے گئے۔

ایک دن نظام کالج ہوسٹل سے یونہی ٹہلتا ہوا ان
کے کوارٹر پہنچ گیا۔ موجود تھے بڑی محبت اور تپاک سے
ملے اس وقت ان کے پاس ایک [illegible] خوبصورت نوجوان
بیٹھے تھے۔ مخدوم نے ان سے میرا تعارف کرایا کہ یہ ہماری
پارٹی کے سرگرم کارکن ہونے کے علاوہ پارٹی کے مشہور
فلسفہ طراز بھی ہیں۔ ہندوستان کی معاشیات پر مارکسی
انداز فکر سے ان کی بہت گہری نظر ہے۔ یہ نوجوان موہن
سین تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں جانے کہاں سے
مجھے تلاش کرتے ہوئے وقار خلیل صاحب بھی پہنچ گئے۔
میں نے آج اس موقع کو غنیمت جانا اور اشعار سنانے کی
فرمائش کی۔ بڑی خوشی سے انہوں نے فرمائش قبول کرلی،
نظم، بساطِ رقص، تھی پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں سالار
جنگ لائبریری کے متعلق باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ اتنا بڑا
ادبی ذخیرہ حکومت کی لاپرواہی کا شکار ہو رہا ہے۔ نہ
لائبریری کو کسی ڈھنگ سے رکھنے کا کوئی انتظام ہے نہ
کتابوں کی باقاعدہ مرمت کے لئے کوئی سالانہ فنڈ ہے۔
آپ اسمبلی میں کوئی بات کیوں نہیں اٹھاتے، ہنسے اور کہنے
لگے میں نے آپ کا مضمون اسی لائبریری کے متعلق سیاست
میں پڑھا تھا۔ مجھے بھی اس کا خیال ہے مگر اردو والوں
کی بے حسی بھی کچھ کم افسوس ناک نہیں۔ اگر حیدرآباد میں
کے تمام اردو ادیب، شاعر اور دانشور مل کر حکومت
کو اس طرف متوجہ کریں تو میرے ہاتھ بھی مضبوط ہوں گے اور
اسمبلی میں یہ سوال زوردار طریقے سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

پھر کوئی صاحب کامریڈ ڈانگے کی ایک میٹنگ کے سلسلہ
میں پروگرام بنانے آگئے اور محفل ختم ہوگئی۔ میں اور وقار
خلیل وہیں سے اٹھ کر نوبت پہاڑ چلے گئے۔ پھر مخدوم
سے قیامِ حیدر آباد کے دوران باقاعدہ ملاقات نہ ہو سکی۔
آخری بار غالباً فروری ۱۹۶۹ء میں الہ آباد آئے، یہ
ایک الیکشن کے سلسلہ کا دورہ تھا۔ قریب دو بجے دن
میں شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی ہم لوگوں سے ملنے آئے
احتشام صاحب سے انہیں خاص طور پر ملنا تھا۔
وہیں ہم سبھوں سے بھی ملاقات ہوگئی ان کے ساتھی یوپی
کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری اور کامریڈ ضیاء الحق بھی تھے
تھے۔ یہ لوگ مخدوم کے ساتھ الیکشن کا طوفانی دورہ
کر رہے تھے۔ مخدوم کے چہرے پر وہی شگفتگی، وہی
مسکراہٹ وہی زندگی کی امنگ نظر آئی تھی کسے معلوم
تھا کہ ہم لوگوں سے ان کی یہ آخری ملاقات ہے۔ بڑی
دیر تک ادھر ادھر کے لطیفے سناتے رہے۔ کچھ چین
اور کچھ روس کے لطیفے بھی تھے اور پھر ہم لوگوں کی درخواست
پر اپنی مشہور نظم سنائی جو انہوں نے روس سے واپس
ہوتے ہوئے ہوائی جہاز میں کہی تھی۔ بڑی دیر تک بیٹھے رہے،
پھر ہم لوگوں سے رخصت ہو کر الیکشن کے دورے پر نکل گئے۔ مخدوم
کے انتقال کی خبر سن کر الہ آباد کے دوستوں اور ملنے والوں کو
جتنا رنج ہوا اسے کیا بیان کیا جائے۔ مخدوم کے ساتھ نہ صرف
ایک اچھا شاعر مر گیا بلکہ ایک ایسا مخلص ایسے لگن کا انسان
بھی جاتا رہا، جس کا جواب مدتوں حیدر آباد کی سرزمین پیدا نہ
کر سکے گی۔ مخدوم کے مرنے پر حیدر آباد اور دلی میں بڑے
بڑے تعزیتی جلسے ہوتے لیکن اس کے علاوہ مخدوم کے لئے اہلِ
ہندوستان اور خصوصاً اہلِ حیدر آباد نے کیا کیا۔ مخدوم
جو ہندوستان کا دھڑکتا ہوا دل تھا، حیدر آباد کی سرزمین
جس کی مسکراہٹ سے جگمگاتی تھی آج اس کی یاد لوگوں
کے دلوں سے تقریباً فراموش ہو چکی ہے۔ شاید مردہ
پرست ہندوستان نے مخدوم کی جو قدر اس کی زندگی میں
کی تھی اس کا بدلہ اس کے مرنے کے بعد اسے بھلا کر

ے لیا۔

# زینت ساجدہ

یہ تو معلوم نہیں کہ سجدوں اور عبادت میں کس قدر
شغف ہے مگر جہاں بھی ہوتی ہیں زینت محفل ضرور بن جاتی ہیں
ہر طرف سے زینت، زینت کی پکار ہوتی ہے۔ نوجوانوں کی
محفل میں زینت آپا، بزرگوں کی محفل میں زینت، ہم سنوں
کی محفل میں مقبول، غرض کہ جس جگہ اور جہاں بھی ہوں گی
ساری محفل کی توجہ ان ہی کی طرف رہتی ہے۔ پہلی دفعہ
ان کو علی گڑھ کے ایک سمینار میں دیکھا تھا۔ خالص حیدرآبادی
رنگ و روپ، ہونٹ بالوں کی سرخی سے سیاہی کی حد
تک لال، بٹوہ کبھی ہاتھ میں کبھی جیب میں، لمبا کوٹ
پہنے ہوتے ہر طرف چہکتی پھرتی تھیں ہر مضمون پڑھے
جانے کے بعد زینت صاحبہ کا اٹھ کر سوال کرنا لازمی سا تھا
ویسے علی گڑھ میں بھی کچھ مستقل قسم کے سوال کرنے والے
لوگ ہیں۔ جو آرٹ اور پینٹنگ، انجینئرنگ، ریاضی، سائنس
ہر مضمون پر سوال کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ ان کا
مضمون نہیں لیکن زینت صاحبہ کی شان یہ نہ تھی اردو
کے اس سمینار میں وہ معقول اور مناسب موقع پر سوال
کرتی تھیں ورنہ ان کے سوالوں میں محض برائے سوال کی شان
نہ ہوتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے خود بھی کوئی مضمون
پڑھا تھا یا نہیں؟ لیکن یاد ہے کہ تقریر بڑی دلچسپ کی تھی
تقریر بڑی باغ و بہار قسم کی تھی۔ رہ رہ کر ہر طرف سے صدائے
تحسین بلند ہو جاتی تھی اردو کے اساتذہ میں کم عورتوں
کو ایسی دلچسپ تقریر کرتے میں نے سنا ہے۔ اردو کے
اساتذہ یوں بھی شرماتے لجاتے سمینار میں بیٹھے رہتے ہیں
بہت ہوا تو پاس کے بیٹھے ہوئے کسی ملاقاتی کے کان میں
مسکرا کر کچھ کہہ دیا، وہ بھی مقرر پر کوئی اعتراض ہو
ہے اور یہ بھی اس لئے کہ انہیں لوگ کم قابل نہ سمجھنے لگیں
چہ جائیکہ خواتین اساتذہ بیچاریاں گردن ڈالے بیٹھی رہتی
اور ہر مقرر کی باتیں سننے کے اور ان کے بس میں کچھ نقطہ

نہیں آتا۔ مگر زینت صاحبہ ان لوگوں میں نہیں خود بھی قرینِ بے بدل ہیں اور اگر کوئی انہیں ایک کہے تو یہ چار سنانے تیار ہیں اس لئے زینت صاحبہ سے الجھنا کچھ آسان نہیں مجھے ان کے سن و سال کا تو یقین نہیں لیکن یہ اندازہ ضرور ہے کہ عمر کی ایک فیصلہ کن منزل میں پہنچ چکی ہیں جہاں خیالات کو ایک پختگی حاصل ہو جاتی ہے۔

حیدرآباد پہونچ کر اور بھی بہت سی معلومات ان کے متعلق ہوئیں ۔ مثلاً یہ کہ وہاں کے بزرگوں کے خود ادبی کیمپ ہیں، ان میں یہ زور صاحب کے کیمپ میں تھیں۔ سروری صاحب کے کیمپ میں ان کا درخور زیادہ تھا اور یہ کہ یونیورسٹی کے بجائے، زمانہ کالج میں اردو کی استاد ہیں ۔ لیکن جو تیور اور مقبولیت کا عالم میں نے علی گڑھ میں دیکھا تھا اس سے کئی گنا حیدرآباد میں پایا۔ حیدرآباد پہنچتے ہی خیال آیا کہ زینت صاحبہ سے ملاقات کی جائے تھوڑی بہت ملاقات چوں کہ علی گڑھ میں ہو چکی تھی، اس لئے ملنے میں کچھ ہچکچاہٹ بھی نہ تھی۔ میں نے حسن صاحب سے کہا کہ میں زینت صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ احسن صاحب نے ٹیلیفون ملا کر بات چیت شروع کی تو آپ آئیں گے یا میں عقیل صاحب کو لے کر آؤں

"اچھا تو اب آپ اپنے نئے مکان میں چلے گئے ہیں"

"ٹھیک ہے میں عقیل صاحب کو لے کر آتا ہوں ۔

آپ جائیں گے نہیں! میں حیدرآباد کے اس اندازِ تخاطب سے واقف نہ تھا، جیسے ہی احسن صاحب نے ٹیلیفون رکھا فوراً پوچھنے لگا کہ آپ کس سے ملنے کی باتیں کر رہے تھے میں نے زینت ساجدہ سے ملنے کو کہا تھا آپ تو کسی مرد سے باتیں کر رہے تھے، کیا ان کے شوہر حسینی شاہد تھے ؟

احسن صاحب زور سے ہنسے، بولے کہ نہیں بھئی زینت ہی سے باتیں کر رہا تھا، حیدرآباد میں عورت مرد کی گفتگو میں وہ تخصیص نہیں برتی جاتی جو ہماری طرف یوپی میں ہے۔ میں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ ہم لوگ چلنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ نظام کلب جس کے احسن صاحب سکریٹری بھی تھے اس کا کوئی اہم مسئلہ اسی وقت آ گیا اس لئے زینت صاحبہ سے اس وقت ملنے کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔

دوسرے دن ادارہ ادبیات اردو سے وقار خلیل صاحب کے ساتھ زینت صاحبہ کے گھر پہونچا۔ زینت صاحبہ نے ان ہی دنوں اپنا نیا مکان تعمیر کرایا تھا، جو ایک پہاڑی کے ٹکڑے پر دور سے معلق سا نظر آتا ہے۔ پہاڑ کی رعایت سے مکان کا نام بھی "کہسار" رکھا ہے۔ زینت صاحبہ اسی خندہ پیشانی سے اور اخلاق سے ملیں جو ان کا وصف ہے مگر مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے علی گڑھ کی صحبتوں کو غالباً بھلا دیا کیونکہ ان کے التفات میں وہ گرمی نہ تھی جو عموماً پرانی ملاقاتیوں سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ باتیں دلچسپ کرنا اور گرمیٔ محفل کو قائم رکھنا جو زینت صاحبہ کا سب سے بڑا وصف ہے، وہ اس مختصر محفل میں بھی قائم تھا میں نے حسینی شاہد کو پوچھا معلوم ہوا کہ گھر پر نہیں ہیں۔ زینت صاحبہ کا ڈرائنگ روم اگرچہ ابھی حیدرآباد کے معیار کے مطابق نہیں سجا تھا۔ مگر کچھ مجسمے اور کچھ کتابیں اور تھوڑا بہت تزئین کا سامان موجود تھا۔ ایک طرف ایک شیشہ کی الماری میں بچوں کے کھلونے سجی سجائی گڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جنہیں غالباً بچوں کی دسترس سے بچانے یا انہیں للچانے کے لئے تالے میں بند کر دیا گیا تھا

زینت صاحبہ نے چائے منگوائی اور ہم لوگ الہ آباد علی گڑھ، دلی اور نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں لے بیٹھے، یونیورسٹی کی پالیٹکس، احتشام صاحب اور سرور صاحب کے تذکرے، زور صاحب اور سروری صاحب کے کشمیر کے قیام کا ذکر، لوگوں کی ریڈری اور پروفیسری میں اڑنگے لگنے کے واقعات اکثر شمالی ہند کے اساتذہ کا حیدرآباد میں قیام اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں مخطوطات کا ذکر اور معلوم نہیں کیا کیا۔ زینت صاحبہ نے انہیں دنوں شاہی پر ایک کتاب مرتب کی تھی میں نے اس کتاب کا ذکر کیا تو کتاب لے آئیں۔ میں نے ادھر اُدھر سے پلٹ کر دیکھا۔ پھر خیال آیا کہ یہ مجھے عنایت کر دیں گی تو اطمینان سے دیکھوں گا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد

کتاب اٹھاکر بہت احتیاط سے الماری میں سجادی۔ معلوم نہیں مجھے نااہل سمجھ کر یا کتاب کی یہ آخری جلد تھی اور ہم لوگ...

.... وہاں سے رخصت ہوگئے۔

اردو ہال کے جلسوں میں اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ مگر میں دھیرے دھیرے یہ محسوس کرنے لگا کہ زینت صاحبہ کاروباری انداز میں ملتی ہیں۔ کتابوں اور کتب خانوں کی باتیں شائد انہیں زیادہ پسند نہیں آتیں، کیوں کہ غالباً گرم کتابی قسم کے لوگوں سے انہیں الجھن ہوتی ہے جو ہر محفل میں کتابوں کا ذکر لے کر بیٹھ جاتے ہیں زینت صاحبہ کو ادبی مسائل سے زیادہ دلچسپی ہے اور محض کتابوں اور تحقیق کے کرم قسم کے انداز سے بھڑکتی ہیں شائد انہوں نے مجھے بھی اس قسم کا کوئی محقق سمجھ لیا ہوگا۔

آنے سے ایک دن پہلے اردو ہال میں ملاقات ہوئی۔ حیدرآباد کے نوجوان ادیب عاتق شاہ کے ایک ناولٹ "تار پور تاش" عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ تک کی رسم اجرائی تھی زینت صاحبہ بھی آئی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ پرسوں الہ آباد واپس جارہا ہوں کیا کل شام کو آپ گھر پر مل سکیں گی، انہوں نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن حسب وعدہ شام سے کچھ پہلے میں نے انہیں ٹیلیفون کیا کہ میں آرہا ہوں۔ ٹیلیفون پر کوئی دوسرا آدمی بول رہا تھا۔ میں نے اپنا نام بتایا کہ بتا دیجیے کہ زینت صاحبہ نے مجھ سے اسی وقت ملنے کا وعدہ کیا تھا تو میں آجاؤں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر آدمی نے آکر کہا۔

وہ کہتی ہیں کہ میں نے کسی سے ملنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ مجھے اسوقت فرصت نہیں معافی چاہتی ہوں، حیدرآباد کے کسی ادیب سے مجھے پہلی مرتبہ ایسا جواب ملا تھا ہوگی کوئی بات کہہ نہیں سکتا۔

پھر صبا کا "مخدوم" نمبر نکلا تو اس میں زینت صاحبہ کا ایک بہت ہی دلچسپ اور اچھا مضمون مخدوم کی شخصیت پر شائع ہوا جس سے ان کی ادبی صلاحیتوں، محسوسات اور زندگی کے گہرے مطالعے کا احساس ہوتا تھا۔ اگر زینت صاحبہ نے اپنی صلاحیتوں کو دنی ادیبوں کی طرح معاملات میں ضائع نہ کیا ہوتا تو ان میں ایک اچھے ادیب کی صلاحیتیں تھیں۔

"منصف" حیدرآباد

## غزل

ارشد جمال جگتدل

ہر روز وہ نت نئے خنجر ایجاد کرتے ہیں
ہم ہیں کہ فقط انہیں کو یاد کرتے ہیں

کئے ہیں لاکھوں کو اپنی زلفوں کے اسیر
جسے چاہتے ہیں وہ اسے آزاد کرتے ہیں

ذرا تو اے دلِ ناشاد مہربانیاں تو انکی دیکھ
اپنے چاہنے والوں کو وہ پھر یاد کرتے ہیں

چمن کی حالت دیکھی نہ گئی اہلِ گلشن سے!
اجڑے ہوئے چمن کو وہ پھر آباد کرتے ہیں

لطف و کرم کی بارش کیوں نہ کریں وہ ارشد
جب ہم فقط انہیں کو یاد کرتے ہیں

ہندوستان کو اپنے طالب علموں پر بڑا فخر ہے۔ وہ جانتے ہیں مُلک ایک آزمائش سے گزر رہا ہے۔ اِس آزمائش میں جو فرض اُن پر واجب ہے، اُسے ادا کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ نیشنل کیڈٹ کور میں بھرتی ہو کر، اپنا خون دیکر، شہری بچاؤ کے کام میں ہاتھ بٹا کر اور چندہ اکٹھا کر کے وہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی پڑھائی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں پڑھائی پوری کر کے وہ مُلک کے اور زیادہ کام آسکیں گے۔ ہمارے طالب علم مُلک کی خدمت میں جُٹے ہوئے ہیں۔

سوچیں تو! آپ مُلک کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

# ایک عظیم مُلک ہمارا
# ایک عظیم قوم

# حیاتِ مفلس

راشدہ علوی بی، ایس، سی
چاندپور ڈگری کالج

تجھ سے یارب دعائیں مانگیں
ہاتھ پھیلا کے بھیک مانگی
سر بسجدہ پڑا رہا میں
اے خدا ــــ کیا تجھے خبر ہے
غریب لوگوں کو مفلسوں کو
دانے گندم کے کون دے گا
کون آخر بجھائے گا یہ
بھوک ان کو جو لگ رہی ہے
جنم دیا تھا جب ایک ماں نے
تو لوگ کہتے تھے پھول تھے یہ
نرم و نازک گلاب تھے یہ
گلاب کی پتیوں کو آخر
یہ کس نے پیروں سے روند ڈالا
دل ایک ماں کا سسک رہا ہے
تڑپ رہا ہے
کراہ رہا ہے
ٹپک رہی ہیں لہو کی بوندیں

نکل رہے ہیں لہو کے آنسو
ہزاروں مائیں بلک رہی ہیں
اندھیری قسمت کے دائرے میں
پھر بھی یارب ہے رقص جاری
کسی لمحہ بھی
موت آکر
ہزاروں لاکھوں نحیف ڈھانچوں کو موت کا پیغام دے گی
سانسیں اُن کی اکھاڑ دے گی
روح ان کی نکال لے گی
تب پڑیں گے کفن کے چندے
ہزاروں لاشیں اُٹھا اُٹھا کر
کسی گڑھے میں دبائی جائیں گی
پھر بھی یارب یہ تیرے بندے
تیرے باغی بتلائے جائیں گے
بلا رہا تھا اُدھر موذن
اِدھر یہ آگ میں ملوں کی
جھلس رہے تھے تڑپ رہے تھے

الزام ان پر طرح طرح کے
لگائے جائیں گے اُٹھائے جائیں گے

بہشت اِن کے لئے نہیں ہے
آگ دوزخ کی ہے مقدر
میں نے یارب دعائیں مانگیں
غریب دوزخ میں جائے گا کیوں
اِس کا آخر گناہ کیا ہے
گناہ سے آخر بچے گا کیسے
میں نے یارب دعائیں مانگیں
سر بسجدہ پڑا رہا میں
اے خدا ــــ کیا تجھے خبر ہے
غریب لوگوں کا گناہ کیا ہے
غریب کیا ہے ؟
ایک زہر ہے
ایک زہریلا ثمر ہے

ہزاروں لاکھوں نحیف ڈھانچے
جنم لیتے رہیں گے یوں ہی
آگ دوزخ کی بنے گی
ان غریبوں کا پھر مقدر
تجھ کو یارب خبر نہیں ہے
یہ ہی تو غربت کی زندگی ہے
بہشت ان کے لئے نہیں ہے
بہشت بکتی ہے زر کے بدلے

ارتقا سے اس زمیں کی
یہ ہی تسلسل ہے زندگی کا

●●

## آنکھ

راشد علوی

فریب نہ دے
آنکھ کو نرگسی پھول سے تشبیہ دے کر
آنکھ پتھر ہے
جنم دیتی ہے چنگاری کو۔

# پیاسی آنکھیں

ناصر بھٹی

وہی معصوم سی مسکراہٹ، وہی شرمگیں نظریں، جلدی جلدی کھلتی بند ہوتی ہوئی دراز پلکیں، گٹھیلا جسم، باریک خدوخال اور متوسط قد گورا چٹا رنگ ——— سیما کی نظروں کے سامنے ایک چہرہ بار بار اُبھر رہا تھا اور سیما بھی تو اس کے کتنے قریب تھی گویا اُسی سے باتیں کر رہی تھی انھیں باتوں کے دوران ایک اجنبی ——— مگر جانی پہچانی آواز پر وہ چونک پڑی تھی۔

"پوسٹ مین" خط لے لیجیے۔

---

خط کھولتے ہی سیما کے لبوں پر اُبھری ہوئی مسکراہٹ سنجیدگی میں دب کر رہ گئی اور وہ اُس دنیا میں پہنچ گئی جب پرویز نے اسے پہلا خط لکھا تھا:

سیما صاحبہ!

اَن گنت آنکھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے نیلی پیلی آنکھیں شربتی اور شرابی آنکھیں، بینا اور نابینا آنکھیں ——— سبھی طرح کی آنکھیں دیکھنے کے بعد میں یہی سمجھا تھا کہ ——— یہ صرف دیکھنے کا ذریعہ ہیں لوگ ان سے دیکھتے ہیں اور قوت دید کم ہوتی ہے تو ——— میرے پاس آتے ہیں سائٹ ٹیسٹ کرا کے چشمہ لگا کر پھر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہی اتفاق تمھارے ساتھ ہوا۔ تم نے سب کی طرح اپنا او۔ پی۔ ڈی۔ کارڈ مجھے تھمایا تھا۔ میں نے پوچھا تھا کیا تکلیف ہے یاد ہے ——— تم نے یہی کہا تھا نا کہ "آنکھیں دکھاؤں گی" میری زبان سے نکل گیا تھا "جی تو سب ہی آنکھیں دکھاتے ہیں"۔ معلوم نہیں تم نے اس جملے کو سُن کر کن آنکھوں سے میری طرف دیکھا تھا کہ نگاہیں دل کی گہرائی تک پہونچ گئی تھیں۔ وہ منظر میں نہ بھلا سکوں گا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ تم کہہ رہی ہو میں نظر دکھلانے آئی ہوں تمھیں "آنکھیں نہ دکھاؤں گی" دوسرے ہی لمحے تمھاری لمبی سیاہ گھنیری پلکوں سے میری انگلیاں کھیلنے لگی تھیں۔ میں نے عجیب کیفیت دیکھی تھی تمھاری آنکھوں میں ——— ڈورے اور زیادہ سرخ ہوگئے تھے اور تم ——— بے حس و حرکت پتھر کے بت کی طرح مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار تمھاری آنکھوں میں جانے کیا دیکھا تھا۔ ادھر میں ایک انجانا سُرور ——— برقی رفتار سے دوڑ رہا تھا میں نے تمھیں اپنے کتنے قریب پایا تھا اور کہا تھا کل پھر اور پھر اسی طرح بار بار تمھیں بلاتا رہا گھنٹوں باتیں کرتا رہا ہے نا۔ یقین ہے تم اس یاد کو میری طرح نہ بھلا سکو گی

ھاری آنکھوں کی جھیل میں مجھے اپنی زندگی تھرکتی دکھائی دیتی
ہے اب یہی میرا سہارا ہیں اور چاہتا ہوں ان میں اپنی تصویر
سی طرح ہمیشہ دیکھتا رہوں۔ یہ پرچہ تمھارے قریب گرایا
ہوں کاش تم اسے اٹھالو اور ...... !

پرویز

---

ڈیر ڈاکٹر پرویز

میں نے پرچہ تمھاری موجودگی میں ہی اٹھایا تھا اور فوراً
ہی چھپالیا تھا۔ میری سہیلی میرے ساتھ تھی مگر شاید اس کے
فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی اس جسارت کی ---- وہ تم سے
باتوں میں مصروف تھی۔ میں تمھاری معصومیت پر حیران تھی
کہ اپنے روزانہ کے مریض سے بات کرنے کا سہارا اس کاغذ کے
ٹکڑے کو بنایا۔ کیوں ؟ مختلف سوالات ابھرے اور دب گئے۔
میرے ذہن میں تو مرد کا تصور ہی اور تھا ---- مگر تمھاری پیاری
پیاری باتوں اور جھکی نظروں نے تو ---- مجھے سوچنے پر مجبور
کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں بھی تمھارے لئے ایک
ایک انجانی سی کسک پیدا ہوئی تھی جو تصور کے رُوپ میں
جھلکی رہتی ہے۔

خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ڈاکٹر۔ تم مجھے
نہ پاسکو گے اور نہ ہی شاید میں ---- تمھارے اتنے قریب
آسکوں گی۔ میں اب اس کے بعد کوئی جواب نہ دوں گی۔ کوئی
خط نہ لکھنا۔ جہاں سینکڑوں مریض تمھارے پاس آتے ہیں ایک
میں بھی گئی تھی۔ بس یہی سمجھ لینا۔

تمھاری ایک مریضہ
سیما

---

میری (مریضہ) سیما

"میری" لکھنے پر تمھیں ضرور بُرا لگے گا۔ مگر خدا گواہ ہے
یہ ڈاکٹر نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اس کے اندر ایک پرویز چھپا
ہوا ہے جو اپنے اندر ایک محبت بھرا دل رکھتا ہے۔ تمھیں
ڈاکٹر کی آنکھوں نے نہیں پرویز کی آنکھوں نے دیکھا ہے
تم نے ایک مریضہ لکھ کر پرویز کا دل دکھایا ہے یہ دل تمھیں
اپنی گہرائیوں سے چاہتا ہے ڈاکٹر نے تمھاری آنکھوں کا
معائنہ کیا تھا اور پرویز ---- تمھاری سیاہ گھنیری پلکوں کے
پرے آنکھوں کی جھیلوں میں ڈوب چکا تھا سیما۔ اور وہ
ہمیشہ ڈوبا رہنا چاہتا ہے۔ اُسے اپنی سیما پر بھروسہ ہے
کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے دُور نہ کرے گی اور اپنی پلکوں
کے سائے میں رہنے دے گی۔ یہ اس کی زندگی کا سوال ہے
ورنہ وہ اپنے کو نہ سنبھال سکے گا۔ وہ تمھیں اپنے آغوش
میں لینا چاہتا ہے اس کی باہوں کو سیما سے محروم نہ رکھو۔
تمھیں پناہ مل جائے گی اور اُسے زندگی۔"

تمھارا ڈاکٹر
پرویز

---

میرے پرویز!

بہت چاہا کہ تمھیں کوئی جواب نہ دوں مگر ---- نہ
چاہتے ہوئے بھی تو قلم نہ رک سکا۔ لکھنے بیٹھ گئی۔ جتنا چاہا
تمھیں بھلا دوں اتنے ہی تصور میں سمائے رہے اب یہ
پرچہ لکھ رہی ہوں مگر تم سامنے کھڑے ہو۔ ہر بار چونک
جاتی ہوں قلم رک جاتا ہے اور تم سے باتیں کرنے لگتی ہوں
پھر اچانک تنہائی کا احساس ہوتا ہے تو سوچتی ہوں ایسے
حالات میں کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا مجھے۔ تم سے دور ہو کر
پاگل نہ ہو جاؤں کہیں۔ تم کتنے اچھے ہو پرویز۔ تمھارا شرما
شرما کر باتیں کرنے اور نظریں جھکائے رکھنے کا انداز میرے
دل میں اترتا چلا گیا۔ اور اب ---- یہ دل تمھارا ہی تو ہے
پرویز میری آنکھیں پیاسی ہیں ایک ایسی تمنا کی ---- جو زندگی
کا حاصل ہوتی ہے۔

میں نفسیات کی طالبہ ہوں میں نے پڑھا ہے "جلدی
جلدی پلکیں جھپکانے والا آدمی قابل یقین نہیں ہوتا وہ چالاک
اور مطلب پرست ہوتا ہے" تم بُرا نہ ماننا میرے پرویز
تمھیں دیکھ کر مجھے نفسیات کی ان الجھنوں سے نفرت ہونے
لگی ہے ایسا لگتا ہے وہ سب کچھ غلط ہے جو میں نے پڑھا

ہے یہ تو لوگوں کے تجزیے ہیں غلط بھی ہو سکتے ہیں جس کی ایک مثال تم خود ہو۔ جب تمہارے پاس ہوتی ہوں تو مجھے کتنا غصہ آتا ہے ان کتابوں پر دل چاہتا ہے پھاڑ ڈالوں یہ کتابیں ـــــ جو تمہارے لئے شک و شبہ پیدا کرتی ہیں۔ کتنی ٹھنڈک ملتی ہے مجھے ـــــ اس تپتی ہوئی دنیا میں تمہارے قریب ہو کر ـــــ تمہاری محبت نے تو مجھ پر جادو سا کر دیا ہے پرویز۔ تم میرے وجود پر کس قدر چھا گئے ہو کس طرح بتاؤں کاش تمہارا بھی یہی حال ہو۔

صرف تمہاری
سیما

---

میرے حسین خوابوں کی ملکہ سیما

تمہاری قربت نے مجھے نئی زندگی دی ہے جو میرے خوابوں میں مچلتی رہتی تھی تم تو میری زندگی کا، جسم کا ایک جز بن چکی ہو اور تم نے تو اپنے سبھی ساتھیوں سے میرا تعارف کرا دیا ہے کہ میں تمہارا ہونے والا منگیتر ہوں مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے یہ سن کر۔ مگر کس قدر بزدل ہوں کہ صرف پرچوں کے ذریعہ تم سے دل کی باتیں کرتا ہوں کالج میں، ہوٹلوں اور حسین پارکوں میں۔ جہاں پیار کے افسانے جنم لیتے ہیں ان سبھی جگہ تمہارے ساتھ رہا مگر کبھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ اس مردہ کاغذ کی بجائے پیاسی زبان سے بھی دل کی بات کہتا۔ امید ہے تم میری اس بزدلی پر برا نہ مناؤ گی دراصل یہ بزدلی نہیں میرا ضبط ہے۔ آؤ میں تمہیں اپنے ضبط کے سلسلے میں طبی نکتہ سے آگاہ کر دوں کہ آنکھ میں انجہاری (روشنی) اسی شخص کو زیادہ نکلتی ہیں جو ضبط بھی زیادہ کرتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں میں زبانی طور پر تم سے کہہ نہیں پاتا اور ضبط کرتا رہتا ہوں۔ تم نے دیکھا ہے دنیا کی آنکھیں ٹھیک کرتا ہوں اور میری آنکھیں انجہاریوں سے بھری رہتی ہیں تم نے نفسیات کا سہارا لیا میں نے طبی اصول تمہارے سامنے رکھا ہے۔ تم اس بات کو اس کا بدل نہ سمجھنا بلکہ حقیقت ہے اب، میں تمہارے بغیر ایک پل بھی تو نہ رہ سکوں گا۔ ارے ہاں تم نے یہ سب ملنے جلنے کی باتیں اپنے والدین تک پہونچا دی

ہیں یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ پڑے گی ورنہ میں کس طرح کہہ پاتا تم میری محسن ہو اب تو ہر لمحہ چبھتا ہے تمہارے بغیر۔ بہت سے پیار اور تمنائیں۔

صرف تمہارا ہی
پرویز

---

میرے سنہرے مستقبل بہت سے پیار اور تمنائیں!

کتنا پیار آتا ہے تمہارے بھولے پن پر۔ کس پیار سے بھولے پن کو بزدلی کہا ہے تم نے۔ میں تو ایسے ہی پیار کو ترستی تھی جس میں معصومیت ہو بھولا پن ہو میری آنکھیں پیاسی تھیں ـــــ دیکھنے کے لئے پیار کرنے والے انسان کو۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں جو تم مل گئے۔ جلدی ہی ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں گے اب تو۔ تمہارے والدین کب آ رہے ہیں؟ اور ہاں میں تمہارے طبی نکتہ کو بدل نہیں سمجھتی بلکہ اس میں بھی تمہارا بھولا پن ہی ٹپکتا ہے۔ کئی دن سے میں متجسس سا پاتی ہوں کیا اپنی زندگی سے بھی راز رکھو گے تم۔ مجھے زندگی کا جز کہتے ہو جسم کا حصہ بتاتے ہو پھر بھی اس سے اپنی کسی پریشانی کو چھپائے رہو گے۔ مجھے بتاؤ۔ اگر زندگی کی بازی لگا کر بھی تمہاری پریشانی دور کرنی پڑے گی تو ـــــ خدا گواہ ہے میں گریز نہ کروں گی۔ سارے جہاں کے غم اپنا لوں گی تمہاری خاطر۔ ایک بار موقع تو دو تمہیں میری قسم ہے ضرور بتاؤ کیا بات ہے کیوں اداس اداس رہتے ہو جیسے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔ بتاؤ نا اگر نہیں بتاؤ گے تو میں روٹھ جاؤں گی تم سے۔ خداوند کریم میرے پیار کو تابندہ رکھے۔

منتظر جواب تمہاری بے چین
سیما

---

میری اچھی سہیلی سیما

تو سوچتی ہو گی کہ سسرال جا کر سہیلی کو بھول گئی خدا کی قسم ایسی کوئی بات نہیں کون سی گھڑی تھی جب تو میرے ساتھ نہ رہی ہو۔ ہر وقت کالج کا ماحول آپسی شرارتیں یاد آتی ہیں اور

ں دفعہ تو زور سے ہنسی بھی آجاتی ہے جب تیرے اس مجنوں
ھیان آجاتا ہے۔ کتنا سیدھا اور بھولا ہے وہ —— کیا
ہیں اس کے —— اور کب شادی کر رہا ہے تو نے پہلے
ا تھا کہ جلدی ہی بات پکی ہو جائے گی مگر اس خط میں تو نے
ذکر نہیں کیا ہے اری پگلی میں تو بے چین ہوں اس دن
لئے —— جب میری سہیلی شرمیلے کے ساتھ شرماتی چلے
—— کتنا مزہ آئے گا جب تجھ سے بھی زیادہ شرمارہا ہوگا
بھولا سجن۔ یہاں "اُن" کا رویہ میرے تئیں بہت اچھا ہے۔
گھر والے بھی سبھی محبت کرتے ہیں۔ ہاں ہاں خوش ہوں
خط منگالے اور جواب لکھ میں بڑی بے چینی سے تیرے خط
انتظار کر رہی ہوں۔

تیری پیاری سہیلی
جلیسہ

---

میری بہت پیاری سہیلی جلیسہ
میں امتحان کی تیاری میں مصروف تھی پوسٹ مین نے یہ خط
دیا جو میں تجھے بھیج رہی ہوں اب میری زندگی میں کیا رہ گیا ہے
جھ سے چھپا کر رکھوں گی؟ خط پڑھتے پڑھتے مجھ میں اتنی بھی
لت نہ رہ گئی تھی کہ اس کو انگلیوں سے پکڑے رکھتی۔ میرے
ل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں
جھڑی لگ گئی اور آنکھیں اتنی خشک ہو گئی ہیں کہ اب ان
ں پانی نہیں رہ گیا ہے مگر دل نہیں مانتا جلیسہ۔ کس طرح
حقیقت کو جھٹلا دوں۔ لے پڑھ لے تو بھی اور......

"محترمہ سیما صاحبہ!
میں آج رات کی گاڑی سے سوار ہو رہا ہوں پرسوں
تمھیں یہ خط ملے گا۔ جس میں تمھیں یہ بتلا دینا چاہتا ہوں
کہ میرا تقرر دوسرے شہر میں ہو گیا ہے اور جب تمہارے
پاس یہ خط پہونچے گا میں وہاں چارج لے چکا ہوں گا
تمہارے شہر سے بہت دور کبھی واپس نہ آنے کے لئے
میں دوبارہ لکھتا ہوں کہ جو کچھ ہوتا رہا خواب تھا اور
خواب کو —— بھول جانا ہی بہتر ہے تم بھی کبھی مجھ
سے ملنے کی کوشش نہ کرنا اور مجھے بھلا دینا میرے دل
میں تمہارے لئے اب کوئی نقش باقی نہیں ہے!
اس جگہ یہ میرا تیسرا تقرر ہے اور ہر جگہ میری ذات
سے ایک کہانی منسوب ہے۔ میں خود بھی ایک کہانی
بن کر رہ گیا ہوں اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا ہے
جب تک زندہ ہوں ان گنت کہانیوں کو جنم دوں
گا۔ اب مجھے شادی جیسے بندھن سے سخت نفرت
ہے۔ اور —— عورت کے بغیر مرد کی زندگی بھی
ادھوری سمجھتا ہوں مگر اس کو گلے کا ہار بنانا میرے
نزدیک کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ عورت ایک پھول
کی مانند ضرور ہے مگر اس حد تک جب تک اس میں
ایک مخصوص خوشبو موجود ہو۔ تمہارے پاس اب
وہ خوشبو......! چونکہ نگار کی تلاش میں نکلا
ہوں۔"

ڈاکٹر پرویز

اور میری پیاسی آنکھیں آج بھی اپنے گرائے ہوئے موتیوں
میں پرویز کی تصویر دیکھ رہی ہیں۔ وہی گردن جھکی ہوئی جلدی جلدی
جھپکتی ہوئی پلکیں۔
میز پر پڑی ہوئی نفسیات کی کتاب کا وہی ورق کھلا ہے
جس میں لکھا ہے۔ "پلکیں جلدی جلدی جھپکانے والا آدمی قابل
یقین نہیں ہوتا وہ چالاک اور مطلب پرست ہوتا ہے۔"
مر کر بھی زندگی کا بوجھ اٹھائے ہوئے

تیری سہیلی
سیما

کشور بی، ایس، سی منگلور (یونیورسٹی)

جس تصور کو لئے عزم سفر باندھا تھا
اب اُسی خواہشِ مبہم پہ ہنسی آتی ہے
دل کی ناکام امیدوں پہ پشیماں ہوں میں
ذہن کے خوابِ مقدم پہ ہنسی آتی ہے

اک چھناکے سے گرے خواب تمناؤں کے
جسطرح پھینکدے پتھر پہ کوئی خالی گلاس
دور تک کرچوں کا سیلاب نظر آتا ہے
خون آلود سڑک سوچ کی زخمی احساس

بند کمرے میں یہی سوچ کے بیٹھا ہوں میں
کوئی آہٹ، کوئی آواز یا دستک دیگا
یا کوئی چپکے سے رکھدے گا مری آنکھوں پہ ہاتھ
کوئی چہرہ مرے چہرے کے قریب آئے گا

مری آواز بھی آواز نہیں ہے میری
آج میں اپنے ہی چہرے کو ترس جاتا ہوں
اس زمانے نے مرا لوٹ لیا ہے سب کچھ
آج خود اپنے ہی سائے سے میں گھبراتا ہوں

# بہارِ نو

شہاب عراقی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شام کی چھاؤں تلے جب ہوئی خیمہ زن
رقص کرتی ہوئی تاریک فضا آ پہنچی
لو چراغوں کے لئے تند ہوا آ پہنچی

دلکشی حسن کے سائے سے گریزاں ہو کر
راکھ کے ڈھیر میں دبتی ہی چلی جاتی ہے
جاذبیت کے بکھرتے ہوئے جوبن کی شمع
ہو کے بے نور کسی طاق پہ یوں سوئی ہے
جیسے بے گور و کفن لاش ہو اک مفلس کی

بات کیا ہے کہ پریشان ہے دل اور اب تک
حسرت و شوق کی تشکیل نہ ہونے پائی
مطمئن ہو نہ سکا کوئی "بہارِ نو" سے
بدگمانی کے کنول کھلتے ہیں مرجھاتے ہیں
وہم کے جام چھلکتے ہیں پہ چٹخ جاتے ہیں

جشن نوروز کی محفل سے بہت دور کہیں
روشنی ڈھونڈھ رہا ہے کوئی ویرانے میں
ایک تاریک سیہ فام سے تہہ خانے میں

ریڈیائی ڈرامہ

رخشندہ بہار

# منزل

## کردار

نسرین ........................ ایک ایم اے پاس دوشیزہ
لطیف ..................... نسرین کے والد
آمنہ .................... نسرین کی والدہ
ندیم ............ نسرین کا منگیتر
نجمہ اور شہناز .............نسرین کی سہیلیاں

(گھڑی تین بجاتی ہے۔ پھر آمنہ کی آواز سنائی دیتی ہے)

آمنہ:۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) اُوہ تین بج گئے اور آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے۔

لطیف:۔ (زور سے) لاحول ولاقوۃ۔ کیا مطلب ہے آپ کا۔ ننگے پیر چلا چلوں۔ جوتے نہ پہنوں۔

آمنہ:۔ (جلدی سے) اگر آپ اس اطمینان سے تیار ہوتے رہے تو ہم جہاز آنے کے بعد ہی پہنچیں گے۔

لطیف:۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جہاز چار بجے آئے گا۔

آمنہ:۔ (چیخ کر) ائرپورٹ تک پہنچنے میں بھی کچھ وقت صرف ہوگا۔

لطیف:۔ (ہنستے ہوئے) سمجھ آرہا ہے تو آج آپ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں ورنہ ـــ

آمنہ:۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) جلدی سے شیروانی پہنئے۔ باتیں بعد میں کر لیجئے گا۔

لطیف:۔ (قہقہہ لگا کر) لیجئے میں تو تیار ہوگیا۔ اب بچی صاحبہ کی خبر لیجئے ان کی تیاری میں کیا دیر ہے۔؟

آمنہ:۔ اسے تیار ہونے کی کیا ضرورت۔ وہ تو ائرپورٹ نہیں جارہی۔

لطیف:۔ (تعجب سے) کیا مطلب؟ کیا نسرین نہیں جا

آمنہ:۔ (بیزاری سے) نسرین کے جانے کا کیا تک ہے

لطیف:۔ (سوالیہ لہجہ میں) ندیم جب لندن گیا تھا اس وقت تو وہ اسے رخصت کرنے گئی تھی۔

آمنہ:۔ جب کی اور بات تھی۔ اب سب کو معلوم ہے کہ ندیم شادی کرنے آرہا ہے۔

لطیف:۔ لیکن ابھی تاریخ تو مقرر نہیں ہوئی ہے

آمنہ:۔ (تیز لہجہ میں) آپ تو بعض اوقات بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اگر نسرین جائے گی تو سب نام رکھیں گے خود بھائی اور بھابی جان بھی اس کو پسند نہیں کریں گے

لطیف:۔ (خود سے) ندیم کیا سوچے گا؟

۔ وہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ وہ میرا بھتیجہ ہے تب ہی سمجھ رہا
ہا کہ وہ سات سال میں بدل گیا ہوگا۔
۔۔ (بات کاٹ کر) میری رائے میں تو نسرین کو اتریپٹ
نا چاہئے۔ یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔
۔ (بات کاٹ کر) اب چلئے بھی تقریر راستے میں کر لیجیئے گا
۔۔ (جھلا کر) چل تو رہا ہوں۔ اور کیسے چلوں۔ کیا خود ہوائی
جہاز بن جاؤں (قدموں کی چاپ)
قدموں کی چاپ کار چلنے کی آواز میں تحلیل ہو جاتی ہے)

## منظر بدلتا ہے

بارش کا ہلکا ہلکا شور۔ قدموں کی چاپ۔ پھر شہناز کی
آواز سنائی دیتی ہے)
۔۔ (آہستہ سے) نجمہ دیکھو۔ صاحبزادی تصورات کی دنیا میں
کھوئی ہوئی ہیں۔
۔۔ (آہستہ سے) بڑا اچھا پوز ہے۔ کیمرہ ہوتا تو تصویر
کھینچ لیتی (ہنستی ہے)
۔ (ذرا زور سے) باادب۔ باملاحظہ۔ ہوشیار۔
۔۔ (چونک کر) اوہ۔ تم۔ آؤ آؤ
۔: (ہنستے ہوئے) ارے بھائی کہاں ہو؟
از:۔ (ہنستے ہوئے) یہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو اپنی بھی
خبر نہیں آتی (بجلی کی کڑک)
ین:۔ (ہنستے ہوئے) اس بارش میں جب کہ بجلی بھی چمک
رہی ہے تم دونوں کیسے آ گئیں؟
از:۔ (ہنستے ہوئے) کبھی ہم تو یہ سوچ کر آئے ہیں کہ آج
دل بھر کر باتیں کریں۔ پھر تم کہاں اور ہم کہاں۔
رین:۔ کیا مطلب؟
شہ:۔ (ہنستے ہوئے) کیسی معصوم بن رہی ہیں جیسے انہیں
پتہ ہی نہیں ہے کہ ندیم بھائی کیوں آئے ہیں۔
ناز:۔ (شوخی سے) ارے بیچاری کو یہ معلوم ہے کہ شادی
کے بعد یہ ندیم صاحب کے ساتھ لندن چلی جائیں گی۔
رین:۔ (شرماتے ہوئے لہجہ میں) کبھی اللہ۔ ہمیں کچھ نہیں
معلوم۔
نجمہ:۔ (شرارت سے) کچھ نہ معلوم ہونے میں تو یہ عالم ہے
شہناز:۔ (بات کاٹ کر) کہ ندیم بھائی کا نام آتے ہی سرکار کا
چہرہ سرخ ہو گیا (بادلوں کی گرج)
نجمہ:۔ (جذباتی لہجہ میں) یہ تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔۔۔
نسرین کہ تم اتنی دور چلی جاؤ گی۔
شہناز:۔ تم تو کہا کرتی تھیں کہ ایم۔ اے کرنے کے بعد تم ایک
مثالی اسکول قائم کرو گی۔
نجمہ:۔ کتنے خوبصورت خواب تم نے دیکھے تھے۔
نسرین:۔ (آہستہ سے) مجھے خود یہ بات معلوم نہیں تھی۔
شہناز:۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے (قدموں کی چاپ)
نجمہ:۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) سچ لڑکیاں کتنی مجبور ہوتی ہیں
کچھ بھی تو نہیں کر سکتیں۔ (قدموں کی چاپ قریب آتی ہے)
آمنہ:۔ (ہنستے ہوئے) وہی ہوا نا جو میں نے کہا تھا۔ یہاں
آ کر بیٹھ گئیں اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔
شہناز:۔ (ہنستے ہوئے) باتوں میں یاد ہی نہیں رہا خالہ جان کہ آپ
ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔
آمنہ:۔ (خوشگوار لہجہ میں) بھلا یہ موسم کہیں کمرے میں بیٹھنے کا ہے
باہر چلو۔ بڑے پوریوں کا آٹا گوندھ لیا ہے اور کڑھائی چڑھا
دی ہے (بارش کا شور)
نجمہ:۔ (محبت بھرے لہجہ میں) آپ کتنی اچھی ہیں خالہ جان۔
آمنہ:۔ (کچھ دیکھتے ہوئے) ارے نسرین کیا سوچ رہی ہو۔؟
نسرین:۔ (گھبرا کر) چل رہی ہوں امی۔
(قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے)

## منظر بدلتا ہے

(چائے کی پیالیوں کی کھنک پھر آمنہ کی آواز ابھرتی ہے)
آمنہ:۔ (خوشی کے لہجہ میں) آپ سمجھ رہے تھے کہ ندیم سات
سال میں بدل گیا ہوگا۔ اب تو آپ نے خود دیکھ لیا۔
لطیف:۔ (خوشگوار لہجہ میں) یہ دیکھ کر مجھے واقعی خوشی ہوئی کہ
وہ بالکل نہیں بدلا۔

آصفہ:۔ (فخریہ لہجہ میں) اتنا بڑا ڈاکٹر ہوگیا مگر ذرا غرور نہیں
نوکروں تک سے آپ جناب سے بات کرتا ہے۔
لطیف:۔ (خوشگوار لہجہ میں) یہ ماں باپ کی تربیت کا اثر ہے
(ایک لمحہ کے توقف کے بعد) لیکن اس نے لندن میں
مستقل طور پر رہنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سے میں متفق
نہیں ہوں۔
آصفہ:۔ (جلدی سے) کہیں بھی رہے۔ میری تو بس
خدا میری نسرین کا نصیبہ بلند کرے۔
لطیف:۔ (سنجیدہ لہجہ میں) میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا اور
اب پھر یہ کہہ رہا ہوں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے
ملنے کا موقع دیا جائے۔
آصفہ:۔ (تیز لہجہ میں) واہ یہ کیسے ممکن ہے اگر وہ دونوں ملیں گے
تو دنیا کیا کہے گی؟
لطیف:۔ (جھلا کر) دنیا والے کچھ بھی کہیں جب تک مجھے نسرین
کی مرضی نہیں معلوم ہوگی اس وقت تک میں تاریخ طے
نہیں کروں گا۔
آصفہ:۔ (زور دیکر) کوئی نیا رشتہ نہیں ہے جو نسرین کا عندیہ لیا
جائے۔ بچپن کی منگنی ہے۔
لطیف:۔ (سمجھاتے ہوئے) بچپن کی منگنی ہے اسی لئے اس کی
ضرورت ہے کہ ایک بار پھر اس سے پوچھ لیا جائے۔
آصفہ:۔ نہ جانے آپ کو کیا ہوگیا ہے؟
لطیف:۔ (زور دے کر) بیگم سات سال میں سوچنے کے انداز
بدل بھی سکتے ہیں۔ آپ نے ماں ہوکر یہ نہیں دیکھا کہ جب
سے ندیم آیا ہے نسرین چپ چپ ہے۔
آصفہ:۔ (طنزیہ لہجہ میں) تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ وہ قہقہے لگائے۔
لطیف:۔ (ہنستے ہوئے) قہقہے تو شادی کا نام سن کر آپ نے لگائے
تھے (زور دار قہقہہ)
آصفہ:۔ (برا مان کر) ہائے توبہ میں قہقہے لگاتی۔ میں نے تو جس
دن سے شادی کا نام سنا تھا ایک منٹ کو میرے آنسو
نہیں رکے تھے۔

لطیف:۔ (قہقہہ لگا کر) خیر یہ تو جھوٹ ہے
آصفہ:۔ اے ہے کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ بات نسرین کی ہورہی [illegible]
لطیف:۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) بیگم۔ شادی زندگی کی [illegible]
کا نام ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ دونوں یہ فیصلہ سوچ
سمجھ کر کریں۔ ذرا سی غلطی سے دونوں کی زندگیاں تباہ [illegible]
آصفہ:۔ (زور سے) خدا نہ کرے آپ تو بلا وجہ فضول باتیں سوچ
رہے ہیں۔ اگر آپ کی یہی ضد ہے تو میں [illegible] کے ذریعہ
نسرین سے معلوم کرالوں گی۔
لطیف:۔ (مطمئن لہجہ میں) اچھا تو اب میں چلا۔ حامد صاحب کو
مبارک باد دے آؤں ان کی لڑکی پاس ہوئی ہے۔
(قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے)

منظر بدلتا ہے

بلی کی میاؤں میاؤں پھر ندیم کی آواز ابھرتی ہے
ندیم:۔ (خوشگوار لہجہ میں) شرمائے نہیں۔ ڈبہ کھولئے یہ آپ کے
لئے لایا ہوں۔
نسرین:۔ (بدحواس ہوکر) ہائے اللہ ڈر سے۔ امی جان۔
ندیم:۔ (ہنستے ہوئے) بالکل نہیں بدلیں آپ۔ ماشاء اللہ [illegible]
اے کر لیا۔ مگر چھپکلی سے اب بھی ڈرتی ہیں۔
نسرین:۔ (کانپتے [illegible]) اسے بھگا دیجئے۔ نہیں تو۔ نہیں تو
ندیم:۔ (قہقہہ لگا کر) حضور یہ ربڑ کی چھپکلی ہے یہ دیکھئے [illegible]
یقین آیا (قہقہہ)
نسرین:۔ (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) آپ نے مجھے بری طرح ڈرا [illegible]
ندیم:۔ (ہنستے ہوئے) آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ
لندن میں جو مکان خریدا ہے اس میں کوئی چھپکلی نہیں
نسرین:۔ (تیز لہجہ میں) اگر ہو بھی تو میرا کیا نقصان ہے۔
ندیم:۔ (ہنستے ہوئے) آپ تو بالکل خفا ہو گئیں۔ یعنی میرے اس مذاق [illegible]
برا مان گئیں۔
نسرین:۔ (گھبرا کر) جی نہیں بات یہ ہے کہ ۔۔
ندیم:۔ (بات کاٹ کر) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے جو مکا[illegible]
ہے وہ بہت خوبصورت ہے آپ کو ضرور پسند آئے گا

۔ وابستہ ہے) میری پسند ناپسند سے کیا فرق پڑتا ہے!
۔ زور دیکر) میں نے سے سجانے میں آپ کی پسند کا خیال
ما ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا باغ ہے جس میں گلاب کے
خت ہیں بے شمار پھول لگتے ہیں ایسے خوبصورت کہ بیان
یں کر سکتا (جلدی سے) سچ ان کی مہک سے سرور طاری ہو
تا ہے۔
۔ (سنجیدہ لہجہ میں) لیکن میرے وطن کی مٹی میں جو سوندھی
سوندھی خوشبو ہے۔ وہ ان پھولوں کی خوشبو سے
زیادہ روح پرور ہے۔
۔ (جذباتی لہجہ میں) سچ نسرین لندن ایسا خوبصورت شہر ہے
اس کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔
س یوں سمجھ لو روشنیوں کا شہر ہے۔ ادب کی روشنی۔ علم کی
روشنی۔ آرٹ کی روشنی۔
۔ (سنجیدہ لہجہ میں) وہ روشنی کس کام کی جس سے ہمارے
گھر میں اجالا نہ ہو سکے۔
۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔ تابناک مستقبل۔ روپیہ اور زندگی کی ساری
آسائشیں مجھے اسی روشنیوں کے شہر نے عطا کی ہیں۔
۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ عرض کر دوں کہ روشنیوں کے
اس شہر میں آپ نے اپنے کو گم کر دیا ہے۔
۔ تم غلط سمجھ رہی ہو نسرین ان روشنیوں نے ترقی کی منزل
تک پہنچنے کے راستے روشن کر دیئے ہیں۔ میں تیزی سے منزل
کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اور وہ دن زیادہ دور نہیں جب میرا
شمار بڑے ڈاکٹروں میں ہوگا۔
ین۔ آپ یقیناً بہت بڑے ڈاکٹر بن جائیں گے۔ لیکن یہ بتایئے
کہ اپنوں کے لئے آپ کے پاس کیا ہے مجھے توقع تھی (جذباتی
لہجہ میں) کہ آپ ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگریاں لینے کے بعد اپنے وطن
واپس آکر خلوص و نیت اور فن کے چراغ روشن کریں گے
لیکن ان تیز روشنیوں نے آپ کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا
کر دی (ٹھنڈی سانس لیکر) اور آپ اپنی منزل کھو بیٹھے ہیں
(کربناک لہجہ میں) کاش آپ کو یاد رہتا کہ آپ کے ملک کا بھی
آپ پر حق ہے۔
ندیم۔ (سنجیدہ لہجہ میں) نسرین دنیا میں ترقی کرنے کے لئے انسان کو
جذبات سے ہٹ کر سوچنا پڑتا ہے (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)
نسرین۔ ہیلو۔ کون۔ نجمہ۔ شوق سے آؤ۔ ہاں ہاں چاے ملے گی۔
دس منٹ میں پہنچ رہی ہو۔ کیا کہا شہناز گھر پر نہیں ہے اچھا
میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں (ریسور رکھنے کی آواز)
ندیم۔ شاید آپ کی کوئی سہیلی آ رہی ہیں۔
نسرین۔ (خوشگوار لہجہ میں) جی ہاں میری بچپن کی سہیلی آ رہی ہے۔ اسی
کا فون تھا۔
ندیم۔ (ہنستے ہوئے) اس کا مطلب ہے کہ مجھے اب نو دو گیارہ ہونا
چاہئے۔ اچھا صاحب تو اب اجازت دیجئے (چند لمحے کے توقف
کے بعد) اس موضوع پر آپ سے میں پھر گفتگو کروں گا۔ مگر زبانی
نہیں بلکہ خط کے ذریعہ (ہنستے ہوئے) دراصل آپ کے سامنے
لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی۔ اچھا خدا حافظ۔
(قدموں کی چاپ موسیقی میں ڈوب جاتی ہے)

## منظر بدلتا ہے

(باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں۔ پھر شہناز کی آواز ابھرتی ہے)
شہناز۔ (سمجھاتے ہوئے) تمہارا دماغ خراب ہے۔ اتنی جذباتی نہ ہو
نسرین! ایک بار پھر غور کر لو۔
نسرین۔ (غمگین لہجہ میں) میں نے پورے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ
کیا ہے (کربناک لہجہ میں) میں نے کوشش کی تھی کہ وہ میرے
ہم خیال ہو جائیں لیکن بقول ان کے وہ اپنا مستقبل تباہ نہیں
کر سکتے۔
شہناز۔ (غمگین لہجہ میں) نسرین! ندیم بھائی ہزاروں میں ایک ہیں
ایسا نہ ہو کہ انہیں ٹھکرا کر بعد میں تمہیں افسوس ہو۔
نسرین۔ (تلخ لہجہ میں) اگر وہ اپنے مستقبل کی خاطر مجھے ٹھکرا سکتے ہیں
تو میں اپنے اصول کی خاطر اپنے جذبات کا خون کر سکتی ہوں۔
شہناز۔ (ا سے سمجھاتے ہوئے) میری اچھی بہن۔ ندیم بھائی کی بات
مان لو۔ لڑکیاں بہت مجبور ہوتی ہیں۔ نسرین! مجھے اندازہ ہے
کہ تم اپنے پر ظلم کر رہی ہو تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے انکار

نہیں ہے شہناز۔ وہ ہر وقت چپ چپ رہتی ہے۔

شہناز۔ نہیں خالہ وہ تو خوب قہقہے لگاتی ہیں۔ ہم لوگوں کے ساتھ ٹینس کھیلتی ہیں (قدموں کی چاپ)

لطیف۔ آہستہ سے ندیم کا خط آیا ہے۔ (کاغذ کی سرسراہٹ)

آمنہ۔ (بیزاری سے) ہم لوگوں کو خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب واسطہ ہی کیا ہے؟

شہناز۔ (آہستہ سے) خالو جان کیا لکھا ہے ندیم بھائی نے۔

لطیف۔ (قہقہہ لگا کر) خوب۔ بہت خوب۔ (ذرا زور سے) مبارک ہو بیگم! ندیم آرہا ہے۔

آمنہ۔ (تلخ لہجہ میں) اجڑے گا خط ہے لکھا کیا؟

لطیف۔ (ہنستے ہوئے) خط آپ کے نام ہے۔ لکھا ہے۔

آمنہ۔ (بیزاری سے) مجھے نہیں سننا۔ مجھے اس سے نفرت ہے اس نے میری لڑکی کی زندگی برباد کردی۔

لطیف۔ (خوشگوار لہجہ میں) مجھے معلوم ہے کہ آپ اس سے خفا ہیں۔ لیکن خط تو سن لیجئے۔ لکھا ہے۔

(ندیم کی آواز) پھوپھی جان! آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں مستقل طور پر آرہا ہوں۔ چھ مہینے تک غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی بقول نسرین میں نے منزل کی تلاش میں خود کو گم کر دیا ہے۔ میری منزل میرا وطن ہے، میں نسرین کا شکرگزار ہوں۔ جنہوں نے منزل کی نشاندہی کی۔

شہناز۔ (جلدی سے) میں ابھی آئی خالہ جان (تیز تیز قدموں کی چاپ)

نسرین۔ (تعجب سے) کیا ہوا۔ اتنی بدحواس کیوں ہو!

شہناز۔ (پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان) ندیم بھائی آرہے ہیں خالو جان کے پاس خط آیا ہے (خوشی کے لہجہ میں) لکھا ہے کہ میری منزل میرا وطن ہے۔ سچ۔ لکھا ہے کہ میں نسرین کا شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے راستہ دکھایا۔

نسرین:۔ (خوشی کے لہجہ میں) سچ

شہناز۔ (خوشی کے لہجہ میں) اللہ قسم! تم خود جا کر خط دیکھ لو۔ آج

میں (جذباتی لہجہ میں) بہت خوش ہوں میرا دل تو چاہ رہا ہے آج خوب گاؤں۔ تجھ کو بھی تو یہ خوش خبری سنانا ہے ڈیلیفون

کے ڈائل کرنے کی آواز موسیقی میں مدغم ہوکر تحلیل ہوجاتی ہے (فیڈ آؤٹ)

---

# غزل

## ادیب سہیل

اے شوق رسائی کے لئے چاند نگر میں
کچھ اور بھی وسعت کی ضرورت ہے نظر میں

آنکھوں سے گزرنا تو کسی دل میں ہے آساں
صد سازِ جراحت ہے نہاں راہ گزر میں

اس راز سے واقف ہیں فدایانِ گلستاں
تُل جاتا ہے دل خار پہ بھی پھول کے گھر میں

رخسار پہ ہوتا ہے عیاں رنگِ بہاراں
کھلتا ہے کوئی پھول جو آغوشِ نظر میں

دل اپنا بنا بادرا کس روپ متی کا
بہروپ ہی بہروپ ہے اس روپ نگر میں

عکسِ دلِ خوں ریز نظر آیا کئی بار
عارض پہ ڈھلکتے آتے ہوئے شعلۂ تر میں

تاریکیٔ ہجراں کو جو کرتی ہے ضیا بار
وہ روشنی پنہاں ہے مرے داغِ جگر میں

دلدار کو پا لینے کی بھرپور اُمنگیں
کیا طرفہ تماشہ ہے مرے رختِ سفر میں

اے نالۂ شب گیر بتا دے پتہ تُکمیں
کس بات کی تاخیر ہے گلبانگِ سحر میں

# شاعر کی صدا


خلیل جبران

افضل النساء

ایس ایس گرلز کالج مراد آباد


● سخاوت میرے دل کی گہرائیوں میں بیج بوتی ہے۔ میں فصل کو کاٹتا ہوں اور گیہوں کے بنڈل بنا کر سبھو کے لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔

● میری روح انگور میں جان ڈالتی ہے۔ میں اس کے گچھوں کو دباتا ہوں اور اس کے عرق کو پیاسوں میں بانٹ دیتا ہوں۔

● قدرت نے میرے دئے کو تیل سے بھر دیا ہے۔ میں اندھیرے میں اجنبی کو راستہ دکھانے کے لئے اس کو اپنی کھڑکی میں رکھ دیتا ہوں۔

● میں یہ چیزیں اس لئے کرتا ہوں کیونکہ یہ میری زندگی ہیں۔ اگر قدرت میرے ہاتھ باندھ دے اور مجھے یہ سب کرنے سے روکے تو میری واحد خواہش موت ہوگی ــ کیونکہ میں ایک شاعر ہوں۔ اور اگر میں دے نہیں سکتا تو میں لینے سے بھی انکار کر دوں گا۔

● انسانیت۔ ایک خوفناک طوفان کی طرح ابھرتی ہے، لیکن میں خاموشی سے آہ بھرتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جب آہ خدا کے پاس پہنچتی ہے تو طوفان گذر جاتا ہے۔

● انسان مختلف قبیلوں اور فرقوں میں بٹا ہوا ہے اور مختلف ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتا ہے لیکن میں اپنے آپ کو ہر فرقے میں اجنبی محسوس کرتا ہوں اور کسی بھی جگہ سے متعلق نہیں ہوں۔ تمام دنیا میرا ملک ہے اور انسانی برادری میرا قبیلہ۔

● مرد کمزور ہے ــ اس کا آپس میں تقسیم ہو جانا افسوسناک ہے ــ دنیا تنگ ہے۔ اس کو ملکتوں، صوبوں اور حکومتوں میں بانٹنا عقلمندی کے منافی ہے۔

● بنی نوع انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کے لئے متحد ہوتا ہے ــ جسم خاکی کو آباد کرنے کے لئے وہ عمارت بنانے میں ہاتھ سے ہاتھ ملاتا ہے ــ اور میں اپنی روح کی گہرائیوں سے ابھرتی ہوئی آواز کو اکیلا کھڑا استفسار رہتا ہوں "جیسے کہ محبت انسان کے دل میں درد کو جلا دیتی ہے اسی طرح جہالت اس کو علم کا راستہ دکھاتی ہے ــ"

● درد اور جہالت بے انتہا مسرت اور علم کی طرف نشاندہی کرتے ہیں کیونکہ پروردگار نے اس آسمان کے نیچے کوئی بھی چیز بے کار نہیں بنائی۔

سوویت یونین
سوویت یونین "ایک باتصویر
ماہنامہ ہے جو آپ کو گھر بیٹھے
سارے سوویت یونین کی دلچسپ سیر
کرادیتا ہے، ۵۶ صفحات کے اس
رسالے میں ایک تہائی جگہ رنگین
اور حسین تصویروں سے آراستہ
ہوتی ہے۔ رسالہ "سوویت یونین"
سوویت یونین کی ترقیوں اور
زندگی کے طور طریقوں کے بارے میں
اصلی تصویریں اور مضامین شائع
کرتا ہے جن میں دلچسپی کے علاوہ
سائنسی معلومات کا بڑا ذخیرہ
ہوتا ہے اور اس رسالے کے
باقاعدہ پڑھنے والے گویا سوویت
یونین کی مشرق سے مغرب تک اور
شمال سے جنوب تک سیر کر لیتے ہیں
تحفہ
دو اور تین سال کے لئے خریدار بننے والوں
سوویت یونین
مصوّر ماہنامہ
شرحِ چندہ
ایک سال کے لئے — ۷ روپے
دو سال کے لئے — ۱۱ روپے
تین سال کے لئے — ۱۴ روپے
رسالوں کے نہ ملنے پر یا پتہ میں کسی غلطی یا تبدیلی کی صورت میں اپنے متعلقہ ایجنٹ کو لکھیں
ADMARK

# یہ دلّی ہے پیارے

محمد عتیق صدیقی

## ٹیکسی

دن بھر مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بعد شام کو بالآخر سورج نے ہتھیار ڈال دیئے اور اپنی شکست پر خون کے آنسو بہاتا ہوا تاریکی کے اتھاہ سمندر کی مچلتی لہروں سے ہم آغوش ہوگیا ——— ظلمت نے اپنی کامیابی پر دیوانہ وار قہقہے لگائے اور مفتوحہ علاقے پر قدم جمانے شروع کر دیئے ——— دن اور رات کے امتزاج شام کی سرمئی روشنی میں "اوڈین" کے بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ——— نہیں حور ——— آئی اور اسٹاپ پر کھڑے منتشر مجموعہ میں شامل ہوگئی۔

تنگ اور مختصر سے لباس سے جھانکتا ہوا اس کا سڈول جسم دیکھنے والوں کو دعوت عیش دے رہا تھا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر دو بڑی بڑی آنکھیں اس جھیل کی مانند چمک رہی تھیں جس میں گرا ہوا مشکل ہی سے کنارے پر آپاتا ہو ——— اسٹاپ پر کھڑا ہوا ہر شخص اُس کو اس طرح دیکھ رہا تھا گویا یہ اس کا فرض ہے اور اگر اس نے اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو سزا کا مرتکب ہوگا ——— یا باس کا آرڈر ہے اگر اس نے ایسا نہ کیا تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا ——— اسٹاپ پر کھڑا یہ مجموعہ جو زیادہ تر ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھا جو دن بھر دفتر میں کام کرنے کے بعد اب شام کو اپنے گھر لوٹنے کے لئے بس کے منتظر تھے۔ گھر...... جہاں ان کی ایک عدد بیوی تین چار بچوں کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر رہی ہوگی ——— کھانا کھانے کے لئے نہیں بلکہ صرف کہنے کے لئے کہ آج پیسے نہ ہونے کے سبب راشن نہ منگا سکی ——— جوان بیوی...... جس کی مسکراہٹ، چہرے کی شادابی اور جسم کی توانائی نے اب بھوک، افلاس اور پریشانیوں کے سبب ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کا روپ دھار لیا ہے ——— بھوک سے بلبلاتے میلے کچیلے کپڑوں سے گندے جسم کو ڈھانپے بچے اپنے باپ کے منتظر ہوں گے صرف یہ بتانے کے لئے کہ آج اسکول میں ٹیچر نے کتاب نہ ہونے کی وجہ سے سزا دی اور کہا کہ کل اگر کتاب نہیں لائے تو کلاس میں نہیں بیٹھنے دوں گا ——— ان کے علاوہ اس مجموعے میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کی بیٹیوں اور بہوؤں کی عمر بھی اس لڑکی سے زیادہ ہوگی اور جو اپنی عمر کے اس حصے میں ہیں جس میں کہ لوگ موت کی خواہش کرنے لگتے ہیں اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں ——— اور آوارہ اور من چلے

نوجوان بھی اس مجموعے کا ایک جزء تھے جو بار بار اپنے بالوں اور کپڑوں کو درست کر کے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے اس کے سامنے ایک آن ڈیوٹی سپاہی کی طرح چکر لگا رہے تھے ـــــ کچھ اسٹاپ پر رکنے والی مختلف بسوں کے نمبر زور سے پکار کر کہہ رہے تھے ـــــ "وہ آ گئی" ـــــ تاکہ وہ کسی نمبر کو سن کر چونکے اور یہ جان سکیں کہ اس کو کس بس سے جانا ہے ـــــ اور ـــــ اور پھر وہ بھی اپنی منزل کا تعین کر سکیں ـــــ ایک طرف چند برگزیدہ ہستیاں نوجوانوں کی موجودہ روش پر تنقید و تبصرے میں مصروف تھیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لڑکی کی موجودگی سے بے نیاز تھے بلکہ وہ ایک تجربے کار شکاری کی طرح شکار کو لاپچ دے کر مارنے کے قائل تھے کیونکہ وہ کنکھیوں سے اس لڑکی کی جانب اس بلی کی طرح دیکھ رہے تھے جو حملہ کرنے سے پہلے شکار پر نظر رکھتی ہے کہ وہ اس کی تمام حرکات و سکنات سے واقف بھی رہے اور اس کو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی اُس کو دیکھ رہا ہے ـــــ دوسری کچھ لوگ ڈی، ٹی، یو پر لعنت ملامت کرتے ہوئے بس کے انتظار میں ضائع ہونے والے وقت کا حساب لگا رہے تھے۔ کچھ اپنے چھچھورے پن کا ثبوت دیتے ہوئے اس پر براہ راست آوازیں کس رہے تھے ـــــ مگر وہ شرم و حیا کی پتلی صبر و تحمل کی دیوی ایک مجسمہ بنی کھڑی رہی۔ سب کچھ سنتی رہی۔ دیکھتی رہی اور خاموش ساکت و جامد بُت بنی رہی۔

یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا اگر بس نہ آ گئی ہوتی۔ سب لوگ بس کی طرف دوڑے۔ مجموعے میں مختلف آوازیں ابھریں ـــــ "سالی پورے دو گھنٹے بعد آئی ہے" ـــــ "جلدی سے آ جاؤ دیکھو یہ بس نہیں چھوڑنی ہے۔ دوسری معلوم نہیں کتنی دیر بعد آئے" "ارے یار دھکہ مت مار سب کو جگہ مل جائے گی بس بہت خالی ہے" ـــــ کنڈکٹر نے کہا "بھائی صاحب ذرا نیچے ٹھہریے پہلے اترنے والوں کو اُترنے دیجئے میں سب کو لے لوں گا بس کافی خالی ہو جائے گی۔"

چڑھنے والے رُک گئے اور لوگ اُترنے شروع ہوئے ـــــ جب سب لوگ اتر چکے تو چڑھنے والوں کے قدم یکدم رک گئے جب انھوں نے یہ دیکھا کہ وہ لڑکی اب بھی وہیں کھڑی ہے اور اس کو اس بس سے نہیں جانا ـــــ اور ـــــ پھر ـــــ پھر بس بغیر کسی کو لئے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان نے اپنی کار اسٹاپ پر روکی ـــــ "سنیئے" اس نے لڑکی کو پکار کر تمام لوگوں کو تحیر میں دھکیل دیا ـــــ اور لڑکی نے کار کے پاس جا کر اس کی غرق یابی یقینی کر دی ـــــ مختصر سی گفتگو کے بعد لڑکی کار میں بیٹھ گئی اور کار چلی گئی ـــــ لوگ ابھی تک حیرانی کے سمندر میں غوطہ زن تھے۔

"ٹیکسی ہو گی" ایک آواز گونجی ـــــ نہیں کسی نے ان کو باہر نکالنے کے لئے رسی پھینکی اور سب کنارے پر آ گئے۔

••

**ہم**

اگلے ماہ سے
ایک نیا کالم

**افکارِ نو**

شروع کر رہے
ہیں۔

**اس میں**
آج کے طلبہ و
طالبات
**کے**
**زندگی**
کے مختلف پہلوؤں
پر خیالات و نظریات
شائع ہوں گے۔

**اگلے**
ماہ میوڑھ کی رخسانہ کنول
کے تحریر کردہ خیالات شائع
کیے جائیں گے۔ ادارہ

دلدار جے پوری (مینی تال)

کہاں ڈھونڈوں بتا اے سعی لاحاصل نہیں ملتا
نہیں ملتا کہیں بھی اب دلِ بسمل نہیں ملتا

سنائیں داستانِ غم کسی کو کس طرح، کیسے؟
بجز پتھر کسی سینے میں کوئی دل نہیں ملتا

نہ کر شکوۂ بے مہری یہ سوغاتِ زمانہ ہے!
یہاں نظریں تو ملتی ہیں کسی سے دل نہیں ملتا

جو خود، کرتے نہیں کوشش ابھرنے کی وہی تنکے
بھنور میں ڈوب جاتے ہیں انہیں ساحل نہیں ملتا

گرا دے خرمنِ دل پر لرز کر ایک بجلی سی!
کہیں ایسا کسی چہرے پہ کوئی تل نہیں ملتا

تلاش و جستجو بیکار ہے اے دل یہ دنیا ہے
یہاں ہر چیز ملتی ہے سکونِ دل نہیں ملتا

بڑی کاوش سے اے دلدار وقتِ فکر کہتا ہوں
مرے شعروں میں کوئی لفظ بھی مشکل نہیں ملتا

# غزل

محمود شام

گرداب ہو، زنجیر ہو یا زلفِ دوتا ہو
تسکینِ جنوں کے لئے اک باب تو وا ہو

یوں چاندنی بے ساختہ پابوس ہوئی ہے
اس بزم سے آنے کا اسے جیسے پتا ہو

نے شورشِ پنہاں، نہ وہ آنسو، نہ وہ آہیں
کچھ روز سے چپ چاپ ہے دل دیکھئے کیا ہو

میں شامِ جدائی کا جگر سوز دھواں ہوں
تم صبحِ بہاریں کی جنوں بخش ہوا ہو

ہر چاپ، ہر آواز پہ رک جاتے ہیں جیسے
تیری ہی عنایت کا کوئی بابِ کھلا ہو

سہما ہوا ماحول ہے، افسردہ فضا ہے
اے شام کوئی شعر، کوئی جام عطا ہو

# ایک شام

ذکاء الدین شایاں

وہ کوہ و دشت پہ چادر، وہ رہگذر پہ سکوت
نجانے سوچ میں کیوں پڑ گئے ہیں ویرانے
رکی رکی سی ہیں بادِ نسیم کی سانسیں
جھکے جھکے سے ہیں فطرت کے نازنیں شانے
فرازِ کوہ پہ سمٹے ہوئے وہ کچھ بادل
گنہ پہ جیسے پشیماں ہوں پی کے دیوانے
شفق شہید ہوئی، شام محوِ ماتم ہے
یہ کون آیا فضا کو کفن میں لپٹانے
ادھر جبینِ افق سے اٹھیں سیہ شکنیں
ادھر نجوم کی آنکھوں میں آئے افسانے
وہ دور، گاؤں کی بستی سے اک اذاں گونجی
کہ جیسے ہل سے گئے ہوش و دل کے کاشانے
جسے دبائے ہوئے دل میں اک زمانہ ہوا
وہ درد آج بھی اٹھتا ہے، کیوں؟ خدا جانے!

شاہجہاں پور

# خیالات کے جھروکے سے

قارئین

...... دسمبر ۷۱ کے شاہجہاں میں آپ نے دلی کالج کے لئے ایک مستقل پرنسپل کی مانگ کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی آپ نے طلبہ کے ایک گروپ کی طرفداری کرتے ہوئے یونین کے صدر اور جنرل سیکریٹری کو مطعون کیا ہے — شاید آپ کو یہ علم نہیں ہے کہ جنرل سیکریٹری ہی دلی کالج کے واحد لیڈر ہیں۔ —

ارشاد عثمانی

دہلی

—

...... دلی کالج کے لیے مستقل پرنسپل کی مانگ ایک جائز اور فوری ضرورت ہے۔ جس کی تکمیل میں تاخیر کالج کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دے گی اور اس تباہی کی ذمہ داری صرف کالج کی مینجنگ باڈی پر ہوگی —

کالج کی اسٹوڈنٹز یونین کے عہدیداران محض اپنے سیاسی آقاؤں کی خوشنودی اور اپنی سیاسی پارٹی کی تبلیغ کی خاطر کالج کی روایات کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ ہمہ وقت کالج میں ایسے فنکشن اور ڈرامے کرنے کے خواہاں رہتے ہیں جو نہ صرف کالج کی روایات کے خلاف ہیں بلکہ مشرقی تہذیب و اخلاق کے بھی منافی ہوتے ہیں —

شاہ جہاں لائق مبارکباد ہے جس نے اسکے خلاف آواز اٹھائی۔

— اس مفہوم کے دلی کالج کے بہت سے طلبہ و طالبات سے خطوط

موصول ہوئے ہیں۔ جگہ کی کمی کے سبب خط بھیجنے والے تمام ساتھیوں کے نام نہیں دیے جاسکتے ـــ بہرکیف ادارہ ان تمام ساتھیوں کا شکر گزار ہے جنہوں نے ہماری خدمات کو سراہا ـــــــ ادارہ یقین دلاتا ہے کہ شاہ جہاں مستقبل میں بھی اسی طرح طلبہ کے خلاف زیادتیوں اور ان کو غلط راہ دکھانے والوں کو روکنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا ـــ مدیر

---

..... شاہ جہاں دن بہ دن نکھرتا جارہا ہے ـــ اگر آپ اس کی تزئین کے ساتھ ساتھ اس کے معیار کی طرف بھی توجہ دیں تو بہت اچھا ہو کیونکہ ماہ دسمبر ۸ء میں شاہینہ خاں اور رخسانہ کنول کی غزلیں قاری پر اچھا تاثر نہیں چھوڑتیں ـــ

جاوید اختر
علی گڑھ

---

..... یوں تو شاہ جہاں میں بظاہر کوئی کمی نظر نہیں آتی ـــ لیکن اس میں اگر آپ طالب علموں سے لیے گیے انٹرویو کا سلسلہ شروع کردیں تو ایک نئی چیز ہو۔

محمد اسلم
حیدر آباد

---

..... رخسانہ کنول اور شاہینہ خاں کی غزلوں کی اشاعت ہمارے لیے باعث استعجاب ہے کیونکہ دونوں ہی خارج از بحر اور نا قابل سمجھ ہیں ـــ

سلطانہ ثمینہ
دہلی

---

ـــ اگر ہم شاہ جہاں کے لیے کوئی تصویر بھیجیں تو کیا وہ اس میں چھپ سکتی ہے ـــ

بہت سے ساتھی

ـــ تصویر اگر قابل اشاعت ہوئی تو ضرور چھپ سکتی ہے۔

ادارہ

---

**یاد رکھیے** آپ کی رائے شاہ جہاں کو بہتر بنانے میں ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

ادارہ